بسم اللہ الرحمن الرحیم

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین

تفسیر فتح المنان

المشہور بہ

تفسیرِ حقانی

مقدس

عمدۃ المحدثین فخر المفسرین الشیخ ابو محمد عبد الحق الحقانی الدہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ

ISBN 969-503-775-5
9799695037750

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین

تفسیر فتح المنان

المشہور بہ

تفسیر حقانی

عمدۃ المحدثین فخر المفسرین الشیخ ابو محمد عبد الحق الحقانی الدہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مقدمہ

حصہ اوّل

الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

"تفسیر حقانی" کا یہ ایڈیشن تجرباتی طور پر شائع کیا جا رہا ہے اس میں اگر کوئی غلطی یا آپ کی آرا ہو تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں تا کہ ہم اسے بہتر انداز میں شائع کر سکیں۔

(ادارہ)

297.1227
Quran
Tafseer-e-Haqqani / Tafseer uz Al-Sheikh Abu Muhammad Abdul Haq Haqqani.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2009.
8 vol 4 main(218;264;318;378;368;420;342;310p)

1. Haqqani, Al-Sheikh Abu Muhammad Abdul Haq I. Title card

ISBN 969-503-775-5

اکتوبر 2009ء

محمد فیصل نے

محبوب پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب ۔ والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء محمد الذی اوتی الحکمۃ وفصل الخطاب۔ وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین قطعوا عرق الشک والارتیاب امابعد مقصد سے پہلے چند ضروری باتیں کہ جو تفسیر میں نہایت کارآمد ہیں بطور مقدمہ کے بیان کرتا ہوں۔ اس میں تین باب اور ایک خاتمہ ہے۔

باب اول

فصل اول: وجودِ خدا اور انبیاء کی نبوت میں

ہر ذی عقل یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عالم (کہ جس میں رنگ برنگ کی صنعتیں اور طرح طرح کے استحکام و انتظام ہیں) از خود نہیں بلکہ ضرور اس کا بنانے والا اور عدم سے ہستی میں لانے والا کوئی بڑا حکیم قوی قادر ہے کہ جس کا نہ کوئی شریک' نہ کوئی سہیم ہے۔ سب عیوب سے پاک اور ہر کام میں بے نیاز اپنی ذات وصفات میں ممکنات سے ممتاز ہے۔ ان امور کے ثبوت میں دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ کسی صاحبِ عقلِ سلیم کو انکار کی کوئی صورت نہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ جب ہمارے روبرو کوئی صندوقچہ یا کوئی تخت آتا ہے یا کوئی مکان' کمرہ' حویلی وغیرہ دکھائی دیتا ہے تو ہم کو (بغیر اس بات کے کہ ہم نے اس کے بنانے والے کاریگر کی صورت دیکھی ہو بنتے دیکھنا تو درکنار) کس قدر یقین آتا ہے کہ ضرور اس کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہے اور ہمارا یہ یقین کسی طرح غلط نہیں ہوسکتا۔ اب اس عالمِ حیرت افزا کو دیکھ کر کہ جو صندوقچہ وغیرہ سے بدر جہا عجیب وغریب ہے اس کے کاریگر کے یقین نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور یوں سوفسطائیہ لا ادریہ[1] اور سوفسطائیہ عندیہ کے فضول شکوک اور بیہودہ وسواس کا تو کچھ علاج ہی نہیں۔ اب میں کلام کو اسی بات پر تمام کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ جو صانعِ عالم اور صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے اس کے موجود ہونے کا یقین کرنا ہر شخص کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے والیہ یشیر قولہ تعالیٰ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا پس جس طرح کہ اس کا یقینِ فطری ہے ویسے ہی اس کا رحیم ہونا بھی فطری ہے اسی لیے اس نے ہر نوعِ مخلوقات کا نظام لائق اور بندوبست فائق کر رکھا ہے۔ چونکہ اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کے سوا جس قدر محسوسات ہیں (جیسا کہ حجر، شجر' حیوانات' اعنی گھوڑا' گدھا' گائے' بھینس' درند پرند) بوجہ نہ ہونے عقلِ کلی کے مبدء ومعاد کی فکر سے آزاد ہیں یہ بارِ گران حضرت انسان ہی نے اٹھایا اور یہ حفظِ امانت اسی کے حصہ میں آیا کما قال اللہ تعالیٰ[2] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ الآیہ پس ان کے لیے یہی رحمت ہے کہ ان کو ان کے مناسب دنیاوی امور کے انتظام عطا فرمائے۔ مکڑی کے منہ میں وہ لعاب عطا کیا کہ جس سے وہ اپنا گھر بناتی اور اس میں

---

۱ سوفسطائیہ حکماء کے ایک فریق کا نام ہے ان کی تین قسم ہیں ایک عنادیہ کہ بسبب عناد کے یوں کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز وہم وخیال ہے اصل میں کچھ نہیں دوسرے عندیہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز انسان کے عندیہ پر موقوف ہے جو کچھ ہیں اس کے خیالات ہیں اور اصل کچھ نہیں۔ تیسرا لاادریہ وہ کہتے ہیں ہم کو کوئی چیز اچھی طرح معلوم نہیں ہر بات میں ہم کو شک ہے۔

۲ "ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑ کے آگے امانت پیش کی پس وہ نہ اٹھا سکے اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔"

شکار پھنساتی ہے۔ پرند اونچے اونچے درختوں کی شاخوں اور بلند پہاڑوں کی چوٹیوں میں اپنے مناسب کیسے کیسے گھونسلے بناتے ہیں، حشرات الارض کو یہی تعلیم کیا کہ وہ زمین میں سوراخ بنائیں اور گرمی و سردی سے امن پائیں درندوں کو جنگل اور دانت ملے، پرندوں کو پر دیے۔ درختوں کی صورتِ نوعیہ کو یہ الہام ہوا کہ پانی کے وسیلے سے نرم خاک کو جڑوں کے ذریعہ سے چوس کر اس کے رنگ برنگ کے پتے اور پھول اور پھل بنائے اور ہر درخت اپنے ایک وطیرۂ خاص پر رہے تخالف نہ ہونے پائے۔ جو زمین پر بیل بن کر پھیلتے ہیں وہ بلند نہ ہونے پائیں، بلند ہونے والے زمین پر بیل بن کر نہ پھیل جائیں۔ جس کا گول پتہ ہے وہ ہمیشہ گول رہے اور جس کا لمبا پتہ ہے وہ ہر جگہ ویسا ہی رہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور صدہا انتظامات ہیں کہ جن کا ذکر یہاں ناممکن ہے مگر حضرتِ انسان کو سب میں افضل بنایا اور علوم اور ادراکات کا جامہ پہنایا جس طرح موالیدِ ثلاثہ میں جمادات سے نباتات اشرف ہیں اور نباتات سے حیوانات افضل ہیں اسی طرح سب حیوانات میں انسان اعلیٰ ہے۔ اس کے علو کے سبب اس کو سوا انتظاماتِ معاش کے فکرِ مبدء و معاد بھی دی گئی۔ اس کے افعال میں اس کو اختیار زیادہ ملا کہ جس کی وجہ سے ثواب و عذابِ آخرت کا مستحق ہوا۔ اس رحیم و کریم کو اپنے پیارے انسان کی دنیا و دین، معاش و معاد دونوں کے انتظام کرنے پڑے اور دونوں کے بخوبی انتظام کئے۔

انتظامِ معاش: اس طرح پر کیا کہ قوائے[1] نباتیہ و قوائے حیوانیہ و انسانیہ اس کو عطا کیں کہ جن کے ذریعہ سے ہر انسان خواہ عالم خواہ جاہل، خواہ لڑکا خواہ جوان، اپنے کاروبارِ طبعی کھانا، پینا، ہضم کرنا، پاخانہ پھرنا، جماع کرنا، سونا، جاگنا، مضر چیزوں سے دور رہنا، منافع کی طرف ملتفت ہونا وغیرہ وغیرہ کو پورا کرتا اور بجالاتا ہے اور اس کے بعد دیگر اسبابِ معاش پیدا کرنے کے لیے ہر ایک کو علیٰ حسبِ مراتب قوت بخشی اور اسی نوع کے بعض بعض اشخاص کو ممتاز و خاص کر لیا کہ ان کو اور عمدہ عمدہ چیزوں کے اختراع کی توفیق دی کسی کو بڑھئی کے کام میں ایسا الہام ہوا کہ اس نے لکڑی کی ہزاروں عمدہ عمدہ کارآمد چیزیں بنائیں، کسی کو لوہار کے کام میں الہام ہوا کہ اس نے عجیب عجیب ایجاد کئے، کسی نے تار برقی، ریل گاڑی، دخانی جہاز، کپڑا بننے کی عجائب غرائب کلیں، فوٹوگراف،[2] ٹیلیفون،[3] عمدہ عمدہ توپیں، تارپیڈو[4] وغیرہ صدہا چیزیں ایجاد کیں پھر ان کی وجہ سے تمام نوعِ انسان اس کے فائدے کی مستحق ہوگئی۔ اسی طرح تجارت و زراعت و حرفہ و سپاہ گری کے فنون کے استاد بنائے اور ان کے دل میں

1. انسان چونکہ جمادات، نباتات، حیوانات سب میں فائق ہے (دیکھو اول کمالِ جسم کے لیے نفسِ جمادی ہے پھر ان سے بڑھا تو اس کو نفسِ نباتی عطا ہوا اس سے بھی زیادہ کمال کو پہنچا تو نفسِ حیوانی ملا۔ اس سے بھی زیادہ کامل ہوا تو نفسِ انسانی ملا جیسا کہ کسی عرق کو ایک آتشہ پھر دو آتشہ پھر سہ آتشہ کر کے کامل بناتے جاویں۔ اسی طرح ایک مشتِ خاک کو کمال دیتے دیتے انسان بنا دیا) اس لیے اس کے نفسِ انسانی کو جس طرح قوائے جمادیہ و قوائے نباتیہ بڑھنا، غذا حاصل کرنا وغیر ذلک و قوائے حیوانیہ حس و حرکت کرنا چلنا پھرنا دیا گیا اس طرح قوائے انسانیہ بھی عطا ہوئیں جیسا کہ امورِ کلی کا دریافت کرنا وغیر ذلک ۔۱۲ منہ
2. عکسی تصویر بنانے کا آلہ۔۱۲ منہ
3. دور سے آواز سنائی دینے کا آلہ۔۱۲ منہ
4. سمندر میں جہازوں کے اڑا دینے اور ڈبو دینے کا آلہ۔۱۲ منہ

ان ان چیزوں کے الہام[1] ہوئے پھر ان کی وجہ سے عالم میں سب نے نفع حاصل کیا اسی طرح انسان کے جسمانی معالجہ کے طریقے تعلیم ہوئے طبیبوں اور ڈاکٹروں نے طرح طرح کی فائدہ بخش چیزیں تیار کیں۔

انتظامِ معاد: کا یہ طور رکھا کہ انسان کو ایک قوتِ ملکیہ عطا کی جس کی وجہ سے ہر شخص اپنے خالق کی طرف رجوع کرتا اور نیک و بد باتوں میں حتی المقدور تمیز کرتا ہے اور اس قوت کو عقل کہتے ہیں۔ ہر چند عقلِ سلیم نے امورِ آخرت کو حتی الامکان دریافت کیا چنانچہ فنِ الٰہیات سے یہ بات ظاہر ہے لیکن ان وجوہ سے عقل تنگ آگئی اور الہام کی محتاج ہوئی۔

اول یہ کہ قوتِ وہمیہ اکثر جگہ عقل سے بمقابلہ پیش آتی ہے۔ بس کبھی غالب ہو جاتی ہے۔ دیکھو جب کسی تنہا مکان میں رات کو مردہ دکھائی دیوے تو بعض کو خوف معلوم ہوتا ہے حالانکہ عقل کا ہی فتویٰ ہے کہ جسمِ بے حس سے کچھ ضرر متصور نہیں۔ اسی طرح جب وہ بلند دیواروں کے درمیان ایک تختہ کو جو بالشت برابر چوڑا ہو رکھ دیا جاتے تو اس پر چلتے وقت وہم اس قدر غالب آتا ہے کہ اکثر اوقات لڑکھڑا کر آدمی گر پڑتا ہے حالانکہ بحکمِ عقل اسی تختہ پر بشرطیکہ زمین پر دھرا ہو بخوبی چل سکتا ہے۔

دوم عقل بذریعہ حواس کام کرتی ہے اور جو چیز حواسِ خمسہ سے باہر ہو وہاں اس کے دریافت کرنے میں مقدمات ترتیب دے کر نتیجہ نکالنا پڑتا ہے۔ پس وہاں طرح طرح کی غلطیاں واقع ہوتی ہیں کہ جن کے اہلِ منطق شاہد ہیں۔ الغرض جو چیزیں کہ محسوس نہیں ہوتیں ان کے دریافت کرنے میں عقل کو بڑی دقت پیش آتی ہے عالمِ آخرت کے حالات اور خدا کی ذات و صفات وغیرہا بھی محسوس نہیں ان کے دریافت کرنے میں بھی عقل کا قافیہ تنگ ہے۔

سوم بدن کے حالات صحت و مرض، بھوک اور پیاس، خوشی و غم وغیرہ کے متغیر ہونے سے انسان کی عقل ہر وقت یکساں نہیں رہتی لڑکپن کی عقل اور جوانی کی اور بڑھاپے کی اور تندرستی کے وقت عقل کی اور حالت ہوتی ہے بیماری کے وقت اور خد[ا] تعالیٰ کا یہ قول اس بات پر شاہدِ عادل ہے حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ [2] انہیں وجو[ہ] سے عقلاء کا باہم اختلاف کوئی کسی بات کو اچھا کوئی برا جانتا ہے۔ الٰہیات میں ایک مسئلہ علمِ باری ہی دیکھئے اس میں کس قد[ر] مختلف اقوال ہیں۔ ایک حکیم کچھ کہتا ہے تو دوسرا کچھ اور اس کے بعد عالم کے حدوث و قدم میں کس قدر اختلاف ہے۔ [خ]یر الٰہیات میں تو اختلاف ہونا کچھ بعید نہیں آپ طبیعات اور عنصریات ہی کے مسائل کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر مخالف اقوال ہیں مدت تک قدماء کا یہی قول مانا جاتا تھا ہر ایک مرکب کے یہ چار اصل الاصول عنصر تسبیط ہیں۔ آگ، پانی، ہوا، خاک

1. بعض جاہلوں نے اس الہام کو الہامِ انبیا سمجھ کر بڑھیوں کو نبی فرض کر کے مصنف علامہ پر اعتراض کر دیا۔۱۲ حقانی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ پتھر کو انسا[ن] کر دیا بلکہ انسان میں جو جمادیت و حیوانیت ہے اس کے مراتب میں ترقی کرنا۔ ابوالحسن حقانی
2. ''جب آدمی چالیس برس کو پہنچتا ہے تو یہ دعا کرتا ہے کہ اے رب مجھ کو یہ توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا کہ جو مجھ کو اور میرے ماں باپ کو د[ی] شکریہ ادا کروں اور ایسے اچھے کام کروں کہ جو تجھ کو پسند ہوں۔ اے رب میری ! اولاد میں صلاحیت دے میں نے تیری طرف رجوع کیا اور [...] تیرے حکم برداروں میں سے ہوں '' ۱۲ ترجمہ

اس کے بعد حکمائے حال نے اور بہت سے بسائط اپنے دلائل سے ثابت کر دیے۔ حکماء کا ایک فریق ہفت افلاک' عرش و کرسی کا قائل ہے اور فلک الافلاک کی گرش سے رات اور دن کا پیدا ہونا مانتا ہے۔ ایک گروہ اس کا منکر اور زمین کی حرکت کا قائل ہے۔ خود حال کی تحقیقات میں روز بروز کس قدر غلطیاں ثابت ہوتی رہی ہیں بلکہ بسا اوقات خود ایک عاقل کی رائے میں اختلاف پڑ جاتا ہے کبھی کسی بات کو صحیح کہتا ہے پھر آپ ہی دوسرے وقت اس کو غلط بتاتا ہے۔ آپ کو اس بیان سے یہ تو بخوبی معلوم ہو گیا کہ انسان کی عقل (کہ جس کو آفتابِ جہاں تاب کہیں تو بجا ہے اور جس کو غیب دانی کی دور بین کہیں تو روا ہے) غلطی سے محفوظ نہیں[1] بالخصوص ان چیزوں میں کہ جہاں حواس کی رسائی نہیں جیسا کہ عالمِ آخرت کے حالات یا باری تعالیٰ کی ذات و صفات یا خود نفسِ ناطقہ کے حالات و اسبابِ کمالات۔ یہاں سے آپ کو یہ بھی خوب معلوم ہو گیا کہ جس طرح ہنود کے بعض علماء کا یہ قول غلط ہے کہ مخلوقات کو اپنے خالق کی طرف کچھ حاجت باقی نہیں رہی۔ ان کی یہ رائے بھی محض غلط ہے کہ تنہا عقل کافی ہے اس کو مددِ الہام کی کچھ ضرورت نہیں۔ اگر عقل کافی ہوتی تو ضرور تھا کہ وہ غلطی سے محفوظ ہوتی اور جب اس کا غلطی میں پڑنا ان مواضع میں یقیناً ثابت ہو گیا تو پھر کافی ہونا کہاں؟ اور ان مواضع میں غلطی کرنا تو اظہر من الشمس ہے کیونکہ اگر غلطی نہ ہوتی تو مسائلِ مذکورہ میں اختلاف نہ ہوتا۔ جب آپ کو خوب یقین ہو گیا کہ عقل تنہا کافی نہیں تو رحمتِ الٰہی (کہ جس نے اس عالم میں ہر چیز کے ضروری اسباب مہیا کر دیے چنانچہ اس کا ذکر آچکا ہے) انسان کو حالتِ تباہ میں کیونکر دیکھ سکتی تھی۔ پس جس طرح اس نے معاش کی اصلاح کے واسطے سامان مہیا فرمائے اور ان کی تکمیل کے لیے چند لوگ مستثنیٰ کئے کہ جو بذریعہ الہامِ الٰہی طرح طرح کے ایجادوں پر قادر ہو کر استادِ زمانہ کہلائیں اور ان کا امرِ معاش میں فیضِ عام جاری ہوا۔ اسی طرح انسان کی اصلاح و تہذیبِ نفس و نفعِ آخرت کے واسطے ایک جماعت برگزیدہ لوگوں کی قائم کی کہ جن کو فہیم[2] کہتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی قوتِ ملکیہ نہایت علو پر ہوتی ہے ان کے دلوں سے حجابِ جسمانی اٹھائے جاتے اور ان کو عالمِ ملکوت کے عجائب اسرار دکھائے جاتے ہیں۔ ان کو اس عالم کے علوم اور احوال عمدہ شوق و تجرید سے آراستہ اخلاقِ حسنہ سے پیراستہ بنایا جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے انسان کے نفس کی اصلاح اور دارین کی فلاح ہوتی ہے۔ پھر ان کے بھی بلحاظ ایک صفتِ خاص مختلف اقسام ہیں جو تزکیۂ نفس کے علوم ہیں ان کو کامل کہتے ہیں اور جن میں حقائق الاشیاء کے ادراک اور معاملات کے اصولِ کلیہ کے انکشاف کا زیادہ رجحان ہوتا ہے ان کو حکیم کہتے ہیں اور جن کو علومِ سیاست اور نظامِ ملت و قوم کی طرف میلان ہوتا ہے ان کو خلیفہ کہتے ہی اور جن پر روحانی اور غیر محسوس عالم کا انکشافِ کامل ہوتا ہے ان کو مویدِ روح القدس کہتے ہیں اور جن میں انجذابِ عالم اور قلوبِ بنی آدم کی کشش کا زیادہ مادہ ہوتا ہے ان کو ہادی کہتے ہیں اور جن کو ملت و مذہب کی اصلاح کے علوم اور ان کے زندہ کرنے کے طریقے سکھائے جاتے ہیں وہ امام کہلاتے ہیں اور جن کا یہ حال ہے کہ وہ علائقِ جسمانی سے مجرد ہو کر عالمِ غیب پر مطلع ہو جاتے یا کسی قوم کی آفات و بلیات پر واقف ہو کر لوگوں کو اس سے متنبہ کرتے ہیں ان منذر یا

---

1. اور اسی لیے سائنس بدلتا رہتا ہے کبھی ایسا مرتبہ حاصل نہیں ہوتا کہ یقین کر لیا جاوے کہ یہ سائنس نہیں بدلے گا۔ یا آج کی تحقیقات میں دس بیس برس بعد کوئی غلطی ثابت نہ ہوگی۔ حاشا و کلا۔ ۱۲ منہ

2. فہیم ایک اصطلاحِ خاص ہے جس سے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاءِ کرام مراد ہیں۔ ۱۲ منہ

نذیر کہتے ہیں اور جب حکمتِ الٰہی اور رحمتِ نامتناہی خلق کی اصلاح چاہتی[1] ہے تو ان سب میں اعلیٰ شخص کو (کہ جس کی نافرمانی پر خدا کی ناراضی اور اطاعت پر خوشنودی مرتب ہو اور جس کے موافق کو ملاءِ اعلیٰ میں محبوب اور مخالف کو ملعون سمجھتے ہوں) پیدا کرتا ہے کہ وہ خلق کو تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے اور اس کا نفسِ قدسی اس درجہ صاف ہوتا ہے کہ جو اوروں کو بڑی ریاضت سے مکاشفہ یا تجلیِ عالمِ جبروت و ملکوت ہوتی ہے تو اس کو ادنی توجہ سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے اور اس کا نفسِ قدسی آفتابِ جہاں تاب کی مانند روشن ہوتا ہے کہ اس کی روشنی سے لوگ منور ہوتے ہیں اور یہ شخص عقل کو غلطیوں کی سخت دلدل سے نجات دیتا ہے اور یہ شخص جب حظیرۂ قدس کی طرف متوجہ ہو کر ہمت کرتا ہے تو عالمِ اجسام بلکہ عالمِ ملکوت میں اس کا تصرف ہو جاتا ہے جو باتیں عادت کے خلاف ہیں وہ اس سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں وہ چیزیں کہ جو حسِ بصر سے خارج ہیں اس کو دکھائی دیتی اور اس سے کلام کرتی ہیں روحانی لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں (ان امور کو معجزات کہتے ہیں)۔

نبی اور رسول اور اولیاء میں فرق: ایسے شخص کو نبی ﷺ کہتے ہیں اگر اس کو شریعتِ جدید اور کتابِ آسمانی بھی ملتی ہے تو اس کو رسول کہتے ہیں اور اس کے پیرووں میں جس کو وہ نفسِ قدسی عطا ہوتا ہے کہ اس میں اس کے انوار اس طرح منعکس ہوتے ہوں کہ جس طرح آفتاب کے انوار آئینہ میں اور پھر کبھی اس سے بھی خوارقِ عادات سرزد ہونے لگتے ہیں (کہ جن کو کرامت کہتے ہیں) تو اس شخص کو ولی کہتے ہیں پھر اولیاء کے بہت سے اقسام ہیں غوث' قطب وغیرہ کہ جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، یہاں سے آپ کو یہ بھی خوب معلوم ہو گیا کہ نبی ایسے برگزیدہ کو کہتے ہیں کہ جس کو یہ کمالات حاصل ہوں نہ یہ کہ نبوت کسی جسمانی قوت کا نام[2] ہے کہ جو انسان کے اعضاء دل و دماغ کے مانند اور قویٰ سے تعلق رکھتی ہو اور نہ یہ کہ جس میں اخلاقِ انسانی کی تعلیم و تربیت کا ملکہ بمقتضی اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے جیسا کہ مصنف تفسیر القرآن کے صفحہ ۲۸ میں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا ملکہ بتلاتے ہیں کہ جیسا لوہار بڑھئی کو اپنے فن کا ملکہ ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اپنے فن کا پیغمبر کہلاتا ہے۔ اب ہم اصل مدعا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ الغرض جو شخص اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس عالمِ حادث کا کوئی موجد (کہ جس میں سب صفاتِ کمال پائے جاتے ہیں) ضرور ہے تو وہ اس بات پر بھی ضرور ہی یقین رکھتا ہے کہ جس رحیم نے اپنی رحمتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے ہر چیز کا انتظام لائق اور اصلاح فائق فرمائی ہے۔ کما قال اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی[3] اس نے انسان کی اصلاحِ نفس کی بھی کوئی نہ کوئی تدبیر کی ہے اور وہ مدبرِ انسان تنہا عقل

---

1. حضراتِ انبیاء علیہم السلام میں خدا نے گوناگوں ملکاتِ فاضلہ ودیعت کر رکھے ہیں جو مخلوق کی ہدایت میں کارآمد ہیں۔ اسی اعتبار سے کامل خلیفہ موید ہادی منذر کے القاب سے ملقب کئے جاتے ہیں ہر ایک پھول میں ایک قسم کی خوشبو ہوتی ہے مگر نبیِ آخر الزماں فداہ ابی و امی میں یہ جملہ ملکات موجود ہیں اس لیے آپ جملہ القاب سے ملقب ہوئے ہیں اور کبھی ان انبیاء علیہم السلام کے اتباع اور جانشینوں میں بھی وہ وصفِ خاص منتقل ہوتا ہے جیسا کہ شاگردِ رشید میں استاد کے کمالات کا جلوہ ہوتا ہے اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم بالخصوص خلفائے اربعہ و اہلِ بیت میں ان اوصاف کے مختلف جلوے نمایاں تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں تہذیبِ نفس کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں سیاست و نظامِ ملت کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں مروت اور حیا کے' حضرت علی رضی اللہ عنہ میں انکشافِ اسرار' علمِ غیب اور حقائق الانبیاء کے ادراک کے علوم کی تجلی تھی حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی بعض ذریاتِ طیبات میں قلوبِ بنی آدم کے لیے جذبِ مقناطیسی ودیعت تھا۔ دراصل یہ ملکات خداداد ہے جس طرح قوائے جسمانی اور حسن صورت ذالك فضل الله يعطى من يشاء۔ ۱۲ ابو الحسن حقانی

2. ان اقسام میں منافات کلی نہیں فرق اعتباری بھی کافی ہے بعض جہال اس کو نہیں سمجھتے۔ ۱۲ منہ

3. ''ہر چیز کو اس کے لائق طور پر پیدا کیا پھر اس کو اصلاح کے اسباب کی طرف رہنمائی کی۔''

ہو نہیں سکتی جیسا کہ اس کا بیان گذرا۔ پھر اس کی تدبیر یہی ہے کہ وہ ایسے اشخاص پیدا کرے کہ جو اوہام و اغلاط سے خود پاک ہوں اور ان کی روح نفسانی خواہشوں کے ظلمات سے بالکل صاف ہو اور ان پر حقائق الاشیا منکشف ہوں کہ عالمِ غیب کے اسرار اور ایک آنے والی نئی زندگی کی کیفیت اور اس کے مفید و مضر اسباب بھی اس پر منکشف ہوں اور اس کی روح میں انجذابِ قلوبِ بنی آدم کی کششِ مقناطیسی بھی ہو اور اس پر روحانی ترقی کی راہیں بھی منکشف ہوں تا کہ وہ بنی آدم کو سیدھی راہ پر چلاوے۔ ایسے شخص کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ ایسے اشخاص کو وہ رحیم بھیجتا رہا ہے (پھر انبیاء بھی درجہ میں کم زیادہ ہیں) سب سے درجہ میں زیادہ وہ نبی ہے کہ جس کے نورِ نبوت نے زیادہ عالم کو منور کیا ہو اور جس کے فیض و برکت سے زیادہ لوگوں نے نفع اٹھایا ہو جیسا کہ حضرت محمد ﷺ نبی کی یہ شان ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم فرمائے کہ جو اصل فطرت میں داخل ہیں اور اپنے کلام میں وہ رعایت رکھے کہ جس کو خاص و عام سمجھیں اور لوگوں سے ان کی عقل کے موافق کلام کرے۔ دلائلِ فلسفیہ و براہینِ منطقیہ سے جو مخاطبوں کی فہم میں نہ آسکیں پرہیز کرے۔ جو جو خرابیاں اس وقت لوگوں میں شیوع پا گئی ہوں ان کو مٹا دے، جو اصل فطرت کی باتیں ہوں ان کو قائم رکھے، کیونکہ جس قوم میں نبی مبعوث ہوتے ہیں گو ان کی بداعمالی اور خلاف فطرتی ہی ان کی بعثت کا سبب ہوتی ہے لیکن ان کے کل باتیں بری نہیں ہوتیں۔ پس جو باتیں اچھی ہیں نبی ان کو قائم رکھتا ہے۔ شرک و بدعت، جور و ظلم وغیرہ قبائح مٹاتا ہے۔ عدل و انصاف، صلہ رحمی، تواضع، حلم، راست بازی کو قائم کرتا ہے۔ خدا کے اوصافِ حمیدہ خلق پر ظاہر کرتا اور اس کی نسبت شرک وغیرہ جو جو عیوب لوگوں نے اپنی نافہمی سے لگا رکھے ہیں ان کو دور کرتا ہے۔ انسان کے اعمال کی جزاء و سزا، حسن و قبح کو وہی ترازو و بیان میں تولتا ہے۔ عالم آخرت میں جو کچھ انسان[1] پر بعد مفارقتِ جسم کے پیش آتا ہے وہی اس کا عقدہ کھولتا ہے اس عالم کی ابتداء و انتہا کو وہی پورے طور پر بتلاتا ہے۔ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ ریاضیات و طبعیات کے مسائل تعلیم فرماوے اور نہ یہ کہ وہ ہوا بادل بجلی آسمان و زمین بارش زلزلہ وغیرہ امور کی ماہیت اور ان کے اسباب[2] بیان کیا کرے اور نہ یہ کہ وہ اگلے لوگوں کی بے نتیجہ تاریخ بیان کیا کرے اور ان کے قصے و کہانی سنایا کرے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ کچھ وعظ و پند کے طور پر اگلے لوگوں کے حالات مجمل طرح سے بیان کرے کہ جسے سن کر عبرت ہو نہ یہ کہ اول سے آخر تک بالترتیب[3] کسی کی سرگذشت یا وقائع عمر یہ بیان کرے اور اسی وجہ سے ایک شخص کے

[1] انسان اصلی روح ہے جو ایک معین وقت پر اس جسمِ عنصری سے جدا ہو جاتی ہے جس کو موت کہتے ہیں جدا ہو کر وہ اپنی ایک خاص شکل یعنی نورانی پیکر میں قائم رہتی ہے۔ سب طرح کی لذتیں اور تکلیفیں جو اس عالمِ عنصری کے اعمال و عقائد کا نیک و بد نتیجہ ہے محسوس کرتی ہے اس کو اس زندگی کی باتیں یاد رہتی ہیں جب تک وہ اس جسمِ عنصری کے ساتھ وابستہ ہے اس وقت تک اس پر جسمانی خواہشوں اور جسمانی آثار کی تاریکیاں محیط رہتی ہیں اس لیے اس روح کی حقیقی خواہشوں اور اس کے حقیقی علوم میں قوتِ مخیلہ و قوتِ متوہمہ جو جسمانی آثار ہیں حارج رہتی ہیں۔ اس پر قومی رسوم و عادات کی اور بھی تاریکیاں گھیرے رہتی ہیں مگر وہ رحیم اپنے کرم سے ایک گروہ ایسا پیدا کرتا ہے جو فطرتاً جن کے ارواح ان ظلمات سے محفوظ ہوتے ہیں یہ گروہِ انبیاء ہے اس لیے یہ ہی روحانی ڈاکٹر ہیں ان اندھیریوں میں اس باریک رستہ کے لیے انہیں کے ہاتھ میں برقی روشنی ہوتی ہے یہی انسان کو اس راہ پر چلاتی ہیں جو اس کی دونوں زندگانیوں کی فلاح تک پہنچاتی ہے۔ ۱۲ منہ

[2] کس لیے کہ عالمِ عنصری کے حقائق کا انکشاف کوئی بڑا کمال نہیں اس کے لیے عوام عقلاء اور ان کے تجارب و تحقیقات کافی ہیں۔ اس کے سوا ان علوم پر انسان کی روحانی ترقی بھی موقوف نہیں۔ ۱۲ ابوالحسن حقانی

[3] بلکہ قرآن مجید میں جہاں حسبِ ضرورت کوئی قصہ آیا ہے یا تو وہاں بندوں کو عبرتِ دینی مقصود ہے یا قصہ بیان کرنے کے بعد حکم کیا کہ یہ فعل برا ←

قصے کو حسبِ وقت بلا ترتیبِ تقدیم و تاخیر کئی بار ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کرنے کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ قرآن مجید میں اسی لیے موسیٰ علیہ السلام و فرعون وغیر ہما کے قصوں کو بلا لحاظِ ترتیبِ وقوع چند جگہ ذکر کیا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ قوموں کے آیندہ حالات یا ان پر آنے والے مصائب یا انعماء بطور پیشین گوئی کے ذکر کر دے تا کہ اس وقت کے لوگوں کو کار آمد ہوں چنانچہ حضرت محمد ﷺ نے اسی غرض سے بہت سی چیزوں کی خبر دی ہے۔ اس فصل میں یہ چند چیزیں خوب طرح ثابت ہو گئیں۔ (۱) خدا تعالیٰ کا وجود۔ (۲) اس میں صفاتِ کمالیہ کا پایا جانا۔ (۳) عیوب سے پاک ہونا۔ (۴) نبی کا مبعوث کرنا۔ (۵) نبی وہ شخص ہے کہ جس میں وہ کمالات ہوں کہ جن کا ہم نے ذکر کیا۔ (۶) نبی کا معصوم ہونا اور رذائل خصائل سے پاک و صاف ہونا۔ (۷) اس کو تہذیبِ نفس کے متعلق کلام کرنا۔ (۸) اور غیر ذلک باتوں سے سکوت فرمانا الا بقدرِ ضرورت۔

فصل دوم: معجزات

شاید آپ کو ہمارے بیانِ سابق سے کچھ تردد پیدا ہوا ہو کہ نبی کا کام تو ہدایت و رہنمائی ہے۔ یہ عالم میں تصرفات اور معجزات کے جو بظاہر قانونِ قدرت کے برخلاف ہیں کیا چیز ہیں؟ غالباً یہ پرانے خیالات ہیں کہ جو ابتداءِ عمر سے سنتے سنتے دلوں میں ایسے راسخ ہو گئے ہیں کہ ان کا منکر کافر شمار کیا جاتا ہے اور آج کل کے اہلِ یورپ (کہ جن کی تحقیقات کے آگے افلاطون و ارسطو طفلِ مکتب ہیں ان پر قہقہہ مار کر ہنستے ہیں)۔ اس لیے اب مجھ کو اس مقام پر چند باتوں کی تحقیق ضروری ہوئی: (۱) یہ کہ معجزہ کیا چیز ہے۔ (۲) وہ ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ (۳) وہ نبی سے کس حکمت کے لیے صادر ہوتا ہے آیا نبی کی نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے یا نہیں۔ پہلی بات کی تحقیق: جو چیز کہ خلافِ عادت اور برخلاف قانونِ قدرت یعنی بغیر اس بات کے کہ وہ اپنے اسبابِ عادیہ پر مبنی ہو کسی شخص سے سرزد ہو تو اس کو خارقِ عادت کہتے ہیں مثلاً عادت یوں جاری ہے کہ بھوک پیاس کھانے پینے سے دور ہوتی ہے یا درخت اور پتھر اور حیوانات گائے بھینس وغیرہ انسان سے کلام نہیں کرتے، کوئی درخت یا پتھر کسی کے بلانے سے بحرکتِ ارادیہ نہیں آسکتا یا کوئی شخص دریا پر زمین خشک کی طرح نہیں چل سکتا یا ایک آدمی کا کھانا صدہا آدمیوں کو سیر نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی شخص ایک مشتِ خاک سے صدہا آدمیوں کو اندھا کر سکتا ہے وغیر ذلک۔ پس جو کوئی ایسا کر دے تو یہ کام اس کا خارقِ عادت ہے اب یہاں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جو کام بذریعہ آلات و اسباب ہوں خواہ وہ اسباب مخفی ہوں یا ظاہر جیسا دوا سے بیمار کا تندرست کرنا، کشتی کے ذریعہ سے دریا کو عبور کرنا خارقِ عادت نہیں۔ پس جو باتیں کہ سحر اور طلسم کے ذریعہ سے ہوں یا نیرنجات کے شعبدے ہوں وہ بعض محققین کے نزدیک خارقِ عادت نہیں کیونکہ ان کے اسباب مخفی ہیں کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ لیکن میں نے جو تحقیق کیا تو یوں معلوم ہوا کہ سحر کا ایک طور یوں بھی ہے کہ بذریعہ ارواحِ خبیثہ و شیاطین کام کئے جاتے ہیں ان کے لیے اسبابِ عادیہ میں سے کوئی سبب نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اس کو خارقِ عادت کہہ سکتا ہوں۔ ہاں اگر ان شیاطین و ارواحِ خبیثہ کو سببِ مخفی قرار دیا جاوے تو خارقِ عادت نہیں۔ **معجزہ:** پھر یہ خارقِ عادت اگر مدعیِ نبوت سے ظاہر ہو تو اس کو معجزہ کہتے ہیں کہ مخالف کو اس کے مثل کام کرنے سے عاجز کر دیتا ہے۔ اب خواہ

← ہے تو ویسے اس فعل کی ممانعت ہوگی یا قصہ کے بعد یوں فرمایا کہ یہی حکم تمہارے لیے ہے تو اس کی فرضیت ہوگی قرآن مجید میں قصوں سے احکام ثابت ہیں بخلاف انجیل کے کہ وہاں محض فسانہ اور تاریخ مقصود ہے اس لیے عیسائیوں کا اعتراض سرے ہی سے غلط ہے۔ ۱۲ ابوالحسن حقانی

مدعیِ نبوت سے یہ معجزہ ایک معمولی طور سے صادر ہو یا اس وقت نبوت کا دعویٰ بھی ہوا گر یہ خارقِ عادت نبی کے پیرو سے صادر ہوا گر وہ ولی ہے تو اس کو کرامت کہتے ہیں اور اگر غیر ولی مومن صالح سے صادر ہو تو اس کو معونت کہتے ہیں۔ ارہاص و استدراج جو نبی سے قبلِ نبوت سرزد ہو تو اس کو ارہاص کہتے ہیں اور اگر بدشخص سے صادر ہو تو اس کو استدراج کہتے ہیں۔

دوسری بات کی تحقیق: کہ کسی کام کا کرنا اس کے فاعل کی قوت پر موقوف ہے پس جس قدر فاعل کی قوت ہوگی اسی قدر اس سے قوی فعل سرزد ہوگا یہ مقدمہ بدیہی ہے۔ اس پر دلیل کی حاجت نہیں۔ اور اصل مبدءِ قوت کا اجسام اور جواہرِ مجردہ میں لطافت اور کثافت کے لحاظ سے قوی اور ضعیف ہوتا رہتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ خاک کی قوت سے پانی کی قوت اور پانی سے ہوا کی قوت زیادہ ہوتی ہے اور آگ کی قوت اس کی لطافت کی وجہ سے سب سے زیادہ ہوتی ہے اگرچہ ہوا بھی اس قدر لطیف ہے کہ حسِ بصر سے محسوس نہیں ہوتی نہ بغیر آمیزشِ غبار کے دکھلائی دیتی ہے لیکن آگ اس سے بھی لطیف ہے ہم کو اس دعویٰ پر دلیل لانے کچھ ضرورت نہیں جس نے علم العناصر کی دو ایک کتابیں بھی پڑھی ہوں گی وہ اس بات کی خوب تصدیق کرے گا لیکن ناظرین کے سمجھانے کو دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے ریل گاڑی جو ہزارہا من بوجھ ایک دن میں کہاں سے کہاں لے جاتی ہے یا دخانی جہاز کس قدر بوجھ کس قدر مسافت پر پہنچاتا ہے یا کلیں کہ کیسا جلد جلد کام کرتی ہیں یہ سب انجن کی بدولت ہے کہ جو بھاپ کے زور سے چلتا ہے اور وہ بھاپ اجزاءِ مائیہ اور اجزاءِ ہوائیہ ہیں کہ جو آگ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ان ابخرات کی قوت ہے کہ جو آگ اور ہوا سے پیدا ہوتے اور پھر زمین میں کسی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں کہ جس سے وہ زلزلہ پیدا ہوتا ہے کہ جو تختۂ زمین کو ہلا دیتا اور بڑے بڑے پہاڑوں اور مکانوں کو گرا دیتا ہے۔ اسی کی وجہ سے سمندر ایسا الٹ پلٹ ہوتا ہے کہ صدہا کوس کی خشک زمین پانی میں ڈوب جاتی ہے اور بہت ٹاپو سمندر میں سے اوپر نکل آتے ہیں۔ بعد اس کے قوتِ برقیہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اور بھی غضب ہے۔ بادلوں میں سے نیچے گر کے جو کچھ آفت برپا کرتی ہے اس کو تو ہر ایک جانتا ہے مگر اس کی کسی قدر قوت کو جب آلۂ برقی میں جمع کر کے کسی تار کو حرکت دی جاتی ہے تو اس کی حرکت صدہا کوس آن کی آن میں پہنچتی ہے کہ وہاں تک اتنی دیر میں بھانپ[1] کی کل کبھی نہیں جاسکتی۔ پھر اس حرکت کے اشاروں یا اس کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سے (کہ جس سے حروف واصوات مصطلح[2] پیدا ہوتے ہیں) کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے جن کے قوامِ بدن میں جزوِ ہوائی غالب ہوتا ہے (جیسا کہ غولِ بیابانی وغیرہ مخلوقات کہ جو ہر وقت دکھلائی نہیں دیتے) کہ جن کو اہلِ ہند پون کہتے ہیں ان کے افعال خاکی چیزوں سے بہت قوی ہوتے ہیں یا جن کے قوام میں جزءِ ناری غالب ہوتا ہے تو ان کے افعال اور قوی ہوتے ہیں جیسا کہ جن وغیرہ مخلوقات۔ اسی طرح ملائکہ یعنی فرشتے کہ ان کا مادہ اور بھی زیادہ لطیف ہوتا ہے ان کے افعال ان سے زیادہ قوی ہوتے ہیں اسی طرح نفسِ ناطقہ کہ جس کو روح بھی کہتے ہیں لطافت کی وجہ سے بشرطیکہ کثافتِ جسمانی اس پر غالب نہ ہو بڑے قوی اور نہایت عجیب وغریب کام کرتی ہے۔ طور اول: روحانی قوت کے آگ عالمِ عناصر و عالمِ اجسامِ علویات' آفتاب' ماہتاب' ستارے وغیرہ سب مسخر ہیں اس روحانی قوت ہی کی وجہ سے چاند[3] پھٹ گیا۔ درخت[4] بلانے سے چلے آئے اور دو ....

---

[1] یعنی انجن۔ ۱۲ منہ [2] فن جوالجی میں اس کی تصریح ہے۔ ۱۲ منہ

[3] اشارہ ہے معجزۂ شق القمر کی طرف۔ منہ [4] آنحضرت ﷺ کے اس معجزہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو درخت آپ کے بلانے سے چلے آئے تھے۔ ۱۲ منہ

چار قطرے[1] یا سیر ادھ سیر پانی نے اس کے ہاتھ لگانے سے لشکر کو سیراب کر دیا۔ حجر[2] و شجر اس سے کلام کرتے اور اس کے شوق میں روتے ہیں۔ ایک عالم کے قلوب اس کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ عصا[3] مارنے سے پتھر پانی بہاتا ہے۔ اس کی دعا[4] سے مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اندھے[5] اور جذامی شفاء پاتے ہیں اس کی ذرا سی نظیر مسمریزم ہی کو دیکھئے کہ قوتِ روحانی سے کیا کیا عجائب ظاہر ہوتے ہیں۔ اور جو فقراء کے حلقۂ توجہ میں بیٹھ کر فیض یاب ہوا ہے وہ تو اس قوتِ روحانی کا مزہ اٹھائے اور اس پر ایمان لائے بیٹھا ہے للہ در من قال ع ذوقِ ایں مے نشناسی بخدا تانہ چشی۔ مگر اس قوتِ روحانی کے دو طور ہیں ایک تو یہ عام طور عادت کے موافق اور قانونِ قدرت کے مطابق جیسا کہ یہ پھرنا چلنا' عمدہ عمدہ کلیں بنانا' طرح طرح کی صنعتیں ایجاد کرنا۔ الغرض یہ سب کاروبار جو عالمِ اسباب میں انسان سے واقع ہوتے ہیں قوتِ روحانی کے کام ہیں۔ یہ کسی شرطِ تجرد وغیرہ پر موقوف نہیں بلکہ اس کو جسمی کثافت کے ساتھ ہی خوب کر سکتا ہے بلکہ بعض کام تو عالمِ اسباب میں جس میں کثافت ہی کی وجہ سے ظہور کرتے ہیں کیونکہ جسم ان کے لیے شرط ہوتا ہے اور اسی لیے اکثر طبعیات وغیرہا کے متعلق عجائب عجائب اختراع و ایجاد انہیں لوگوں سے ظہور میں آتے ہیں جو سوائے نفسانی خواہشوں کھانے پینے' جماع کرنے کے اور کچھ کمالِ انسانی نہیں رکھتے۔ یہ سب کام گو بظاہر جسم اور اس کے قویٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں مگر درحقیقت یہ سب روح کے طفیل سے ہوتے ہیں۔ جب روح جسم سے تعلق اٹھا لیتی ہے جس کو عرف میں موت کہتے ہیں تب کوئی کام نہیں ہوتا۔ کام تو درکنار وہ جسم ہی اس کی محافظت بغیر گل سڑ جاتا ہے اور یہاں سے یہ بھی خوب ثابت ہو گیا کہ ان اعمال کا مبدء روح ہے اور جسم ایک آلہ ہے کیونکہ جسم کو قدرت کہاں؟ اس مقام پر اعتقادِ مذکور کے بطلان پر فقط دو ہی دلیلوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

دلیل اول: اگر یہ اعمال جسم ہی کے ہوں تو چاہیے کہ کسی معاملۂ نیک و بد میں کوئی شخص دنیا میں بھی ماخوذ نہ کیا جاوے نہ چور کو سزا دی جاوے نہ قاتل سے قصاص لیا جاوے کیونکہ جب اس نے وہ کام کیا تھا وہ اور تھا اب یہ جسم اور ہے اس لیے کہ ہر آن میں حرارتِ بدن سے انسان کے اجزاءِ بدن تحلیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کے بدل غذاء سے دوسرے اجزاء قائم ہوتے رہتے ہیں اس لیے اگر کسی کی لڑکپن اور جوانی پھر بڑھاپے کی تصویروں کو روبرو رکھ کے دیکھا جاوے تو ایک دوسرے سے غیر معلوم ہوگی علاوہ اس کے ناخن اور بالوں ہی کو دیکھ لیجئے کہ ہر روز نئے نکلتے اور پہلے کس قدر قوتِ منعقدہ کی وجہ سے لگے رہتے ہیں پھر بھر جاتے ہیں بلکہ نباتات میں بھی یہی حال ہے اور اگر اس بات پر باور نہ آوے تو غذا کو روک کر اس کے قوام اور بالیدگی کو ملاحظہ فرمالیجئے۔

دلیل دوم: کسی فعلِ ارادی کا کرنا (بالخصوص ایسے افعال کا کہ جن سے انسان قابلِ مدح اور ذم اور مستحقِ ثواب و

---

[1] اس معجزۂ آنجناب علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ جو دو دفعہ آپ سے ظاہر ہوا۔ ۱۲ منہ

[2] جیسا کہ آنحضرت علیہ السلام سے واقع ہوا اور ستونِ حنانہ آپ کے شوق میں رویا۔ ۱۲ منہ

[3] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ

[4] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ

[5] یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ

عقاب ہو) بغیر علم اور ارادے کے ناممکن ہے کمالا یخفٰی علی صاحب البصیرۃ اور جسمِ انسان میں نہ علم ہے نہ ارادہ بلکہ یہ بحرکت قسر یہ روح کے ہلانے جلانے سے پتلی کی طرح ہلتا ہے جب وہ الگ ہو جاتی ہے تو بے حس وحرکت ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ آنکھ دیکھتی ہے یا آنکھ کے ذریعہ سے کوئی اور شخص؟ آیا کان سنتے ہیں یا اس کھڑکی کے ذریعہ سے کوئی اور؟ اگر خود آنکھ دیکھتی ہوتی تو جو چیز کہ آنکھ کے بالکل پاس رکھی جاتی اس کو تو اور بھی زیادہ دیکھتی حالانکہ نہیں دیکھتی یا جس وقت کوئی مخدر کلورا فارم سنگھایا جاوے تو چاہیے کہ آنکھ کان اس وقت میں بھی برابر دیکھیں اور سنیں کیونکہ وہ اسی طرح صحیح و سالم ہیں حالانکہ اس وقت روح کی عدم توجہی کی وجہ سے کچھ بھی نہیں دیکھتے سنتے اور اسی طرح بعد موت کے آنکھ کان بدستور بلکہ جمیع مواضعِ حس ویسے کے ویسے رہتے ہیں مگر مفارقتِ روح کی وجہ سے معطل ہو جاتے ہیں اور اسی سر کے واسطے حکماء فلاسفہ کا یہ فتویٰ ہے۔ میزان العاقلیۃ[1] کون الشیء مجردا۔

دوسرا طور: خاص ہے اور وہ یہ کہ روح کو جب کثافتِ جسمانیہ اور ظلماتِ ہیولانیہ سے نجات ہوتی ہے اور آثارِ تجرد اس پر غالب آتے ہیں تو اس کی قوت نہایت ہی قوی ہو جاتی ہے۔ پھر اس سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں کہ جو ظاہر اسباب اور قانونِ قدرت کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اسباب کی احتیاج ضعف کے وقت ہوتی ہے۔ لنگڑے آدمی کو سواری کی ضرورت ہے یا جس کی بینائی کم ہو اس کو چشمہ کی حاجت ہے اس روح کی قوت اور تجرد کی دو صورت ہیں ایک کم دوسری زیادہ۔ کم یہ ہے کہ بسبب ریاضات ومجاہداتِ شدیدہ کے بدن کو پژمردہ اور روح کو تازہ کیا جاتا ہے اس میں مومن کافر سب شریک ہیں اس لیے بعض ان شخصوں سے کہ جو نہ نبی ہیں نہ نبی کے مطیع جوگی وغیرہ اور آج کل بھی ایسے لوگ بعض جگہ سنے جاتے ہیں ان سے بھی یہ خوارقِ عادات سرزد ہو جاتے ہیں کما فشاہدہ فی المرتاضین لیکن یہ خوارقِ عادات نبی کیا بلکہ اس کے متبع کے خوارق کے بھی برابر نہیں اور ان کے مساوی یا مشابہ ہونے کا تو کیا ذکر؟ البتہ ایسی مماثلت اور مشابہت ہوتی ہے کہ جیسی پیتل اور سونے میں یا چاندی اور قلعی میں یا بلور اور ہیرے میں۔ پس باوجود اس مشابہت کے کبھی کسی عاقل کو پیتل اور سونے میں یا قلعی اور چاندی میں اور ہیرے اور بلور میں اشتباہ نہ ہوگا۔ زیادہ قوتِ روح کی یہ صورت ہے کہ روح ہمہ تن عالمِ قدس اور ذاتِ باری کی طرف متوجہ ہو جاوے اور پھر اس پر وہاں کے انوار ایسے فائز ہوں کہ جس طرح آئینہ میں آفتاب کے انوار چمکتے ہیں تب اس کو مبدءِ فیاض سے ایک ایسی خاص مناسبت پیدا ہوتی ہے کہ جس طرح آگ کی صحبت سے لوہا سرخ ہو کر جلانے کے قابل ہو جاتا اور پھول کی صحبت سے مٹی دماغ کو معطر کرنے کے لائق ہو جاتی ہے۔ع

جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

تب تو عارف کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور اس کی زبان خدا کی زبان اور اس کی آنکھ خدا کی آنکھ ہو جاتی ہے (اور خدا تعالیٰ درحقیقت ان اعضاء سے پاک ہے) چنانچہ اس حدیث میں فکنت سمعہ الذی یسمع بی اسی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی

[1] یعنی عاقل ہونے کا اس بات پر مدار ہے کہ وہ شے مادہ سے مجرد ہو جیسا کہ روح وملائکہ والہ حق

مرتبہ میں وحدتِ[1] وجود کا راز کھلتا ہے اگرچہ خدائے پاک اپنی ذات اور صفات میں جمیع کائنات سے الگ اور ممتاز ہے کوئی ممکن واجب نہیں ہو سکتا۔ لیکن عارف پر وجوب کا ایک ایسا پرتو اپڑتا ہے کہ اس کے آثار اس میں ظہور کرنے لگتے ہیں تب اس کا تصرف عالم میں ہونے لگتا ہے اور وہ شخص فنا فی اللہ اور باقی باللہ ہو جاتا ہے۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

پس یہ انسان کا کمالِ انتہائی ہے اور یہ مرتبہ خاص انبیاء علیہم السلام کو اور ان سے کچھ اتر کران کے متبعین اولیاءِ کرام کو نصیب ہوتا ہے۔ ہماری اس تحقیق سے آپ کو خوارق کا امکان تو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا اور اگر اب بھی دل نہ مانے تو یوں سمجھئے کہ ممکن اس کو کہتے ہیں کہ جس کے فرضِ وقوع سے کچھ محال لازم نہ آوے اور ان امورِ خوارقِ عادات کے واقع ہونے سے کوئی محال لازم نہیں آتا۔ ہاں ایک عادت کے مخالف اسباب کے برخلاف ہونے کی وجہ سے بالخصوص اس شخص کو کہ جس کی عقل پر انوارِ قدس فائز نہیں اور سوائے محسوسات کے اس کے تنگ فکر میں کچھ اور ہی نہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ کبھی اس کی تنگ عقل اس نورِ گیتی افروز سے خیرہ ہو کر انکار کر بیٹھتی ہے اور کبھی اس کو سحر مبین کہتی ہے اور کبھی ڈھڈ بندی اور شعبدہ بازی بتلاتی ہے اگر اس بیان کے بعد بھی کوئی شخص نہ مانے اور اس کو بڑھیوں کی کہانی بتلائے اور یہ دلیل مقابلہ میں لائے کہ ہمارے رو برو کوئی کر کے دکھائے تو جانیں[2] تو بلاشک اس کی روح کثافتِ جسمانی اور تاریکی ہیولانی میں غرق ہے۔ عیسائیوں کو تو اس میں کچھ چون و چرا ہی نہیں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں سے ایسے ایسے خوارقِ عادات سرزد ہونے کے قائل ہیں اور اسی طرح یہود بھی انبیاء علیہم السلام سے معجزات کا ظاہر ہونا تسلیم کرتے۔ بلکہ ہنود بھی اپنے اُتاروں اور رشیوں کے ایسے خوارق بیان کرتے ہیں اور حکماءِ فارس و یونان بلکہ کل فلاسفہ اپنے الٰہیات میں اس مسئلہ کو بدلائل ثابت کر چکے ہیں اب اگر اس کا کوئی منکر نکلے گا تو غالباً وہی صاحبِ کثافتِ جسمانی کہ جس کی بڑی تحقیق انجن میں کوئلہ جھونکنا اور دو چار مسائل فنِ طبیعیات وریاضیات میں مہارت رکھنا یا بعض کلوں کے کل پرزے درست کرنا ایسا شخص خدا کا بھی پورا قائل نہ ہو تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ وہ باعتبارِ کمال انسانیت کے وحوش میں داخل ہے۔

تیسری بات کی تحقیق اس طرح پر ہے کہ خدا کی رحمتِ عامہ کا یہ مقتضی ہے کہ وہ اس نبی سے اپنی مخلوق کو بہرہ مند کرے

[1] بعض ناواقف اس سے خالق ومخلوق کا اتحادِ ذاتی سمجھ گئے۔ ۱۲ منہ

[2] آج کل یورپ تجربہ کر رہا ہے کہ برقی طاقت کی رو عالمِ ارواح تک جا سکتی ہے چنانچہ تجربہ شروع بھی ہو گئے اور بعض ارواح سے گفتگو ہوئی جو سمجھ سے باہر تھی ابوالحسن حقانی۔ فائدہ: قانونِ قدرت کا بھی ایک وسیع المعنی مسئلہ ہے اول تو قدرتِ الٰہی کا کوئی مرتب قانون کسی کے پاس نہیں اپنی عمر بھر کے تجربے یا تاریخی دنیا کے تجربے کہ جس کے برخلاف پاتے ہیں اس کو قانونِ قدرت کے خلاف کہہ بیٹھتے ہیں گویا قدرتِ غیر محدود ان کے تجربے میں بند ہے اور اس کا یہی قانون ہے کیا ممکن نہیں کہ بعض اشیاء خصوصاً ستاروں کا طلوع وغروب ہزاروں برسوں کے بعد ہو پھر نہ ہزاروں برس کی کسی کی عمر ہے نہ ہزاروں برس کی کوئی تاریخ ہے کہ وہ جملہ واقعاتِ دہر کا دفتر ہو۔ اب اس کو جو نئی بات معلوم ہوگی یا اسبابِ عادیہ پر مبنی نہ ہوگی اس کو خلافِ قانونِ قدرت کہنے میں ذرا دریغ نہ ہوگا۔ اسبابِ عادیہ ہی پر اسباب کے سلسلہ کو تمام کر دینا یہ بھی کم فہمی ہے (دوم) اگر بغور دیکھا جائے تو جن کو کہ اسباب کہا جاتا ہے ان کا اسبابِ حقیقی ہونا بھی محض اس لیے مانا گیا ہے کہ اکثر سبب اس پر مرتب ہوتا ہے۔ انسان کا تنگ دماغ قدرتِ غیر متناہی کو اگر کسی قانون میں منحصر کرے تو ایسا محدود القدرت خدا کیا خدا ہے۔ ۱۲ ابوالحسن حقانی

اور اس کا نفع عام لوگوں کو پہنچاوے جو لوگ کہ طبیعتِ سلیمہ اور قوائے فطریہ رکھتے ہیں وہ تو اس نبی کو اس طرح پہچان جاتے ہیں کہ جس طرح بچہ بغیر کسی کے کہے سنے اپنے ماں باپ کو جان جاتا ہے کما قال تعالیٰ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ پس جو شخص مبدءِ ولادت میں بچہ کہ ماں کی چھاتیاں[1] بتلاتا ہے وہی لوگوں کو مربیِ روحانی نبی کی خبر دیتا ہے لیکن بعض وہ لوگ کہ جن کی طبیعت میں کچھ کجی ہوتی ہے بغیر کسی علامت دیکھنے کے تصدیق نہیں کرتے جیسا کہ بعض بیمار دوا کو بغیر شیرینی ملائے نہیں پی سکتے۔ پس جس طرح طبیبِ شفیق اس میں شیرینی ملا دیتا ہے اسی طرح وہ حکیم رحیم بھی نبی کے ہاتھ کوئی امر خارقِ عادت کہ جس کو معجزہ کہتے ہیں ان کے لیے صادر کراتا ہے اور اس معجزہ سے بہت فوائد ظاہر ہیں۔ (۱) ان منکروں کو نبی کی تصدیق نصیب ہو جاتی ہے۔ (۲) غالباً وہ معجزہ فی نفسہا کوئی خیر اور عام فائدہ کی چیز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا اپنی انگلیوں سے پانی جاری کر کے ایک جمِ غفیر کو اس پانی مبارک سے سیراب کرنا پھر لوگوں کے دلوں میں اس سے نور پیدا ہونا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بغیر پل کے بنی اسرائیل کو پار اتار کر موذی سے نجات دینا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مائدہ سے لوگوں کو تقویت دینا۔ (۳) اس معجزہ سے مومنوں کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ (۴) خدا اور اس کے رسول کی عظمت لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے اور یہی حکمت ہے کہ معجزہ کو آیت کہتے ہیں جس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ (۵) کبھی منکروں کی تہدید و تعذیب اس سے مقصود ہوتی ہے کہ جس سے اور لوگ عبرت پکڑیں گو ان کے حق میں یہ معجزہ قہرِ الٰہی ہے مگر اوروں کے لیے رحمتِ الٰہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء کی دعا سے صورتوں کا مسخ ہو جانا یا ایک مٹھی کنکریوں سے صدہا لوگوں کی آنکھیں بند ہو جانا۔ علاوہ اس کے اور بہت سی مصلحتیں ہیں کہ جن کو وہ حکیم ہی خوب جانتا ہے۔ دوسری اور تیسری اور چوتھی بات میں تو کوئی کلام نہیں کرتا۔ ہاں اول بات میں بعض نے بزورِ فلسفہ کلام کیا ہے اور پھر تاویلاتِ رکیکہ کے ذریعہ سے قرآن اور مسلمانوں کی کتابوں سے استدلال کیا ہے جو سراسر ملمع کاری ہے مسلمانوں میں پابندِ فلسفۂ قدیمہ ایک فرقہ پیدا ہوا تھا جس کو معتزلہ کہا جاتا تھا ان کے نزدیک قرآن اور اسلام کی یہی خیر خواہی اور بڑی خدمت تھی کہ وہ قرآن اور پیغمبر علیہ السلام کی حدیثوں کو تاویلات کے ذریعہ سے فلسفۂ یونانی کے موافق کیا کرتے تھے اور جہاں اور موافقت نہ ہو سکتی تھی وہاں اس حدیث کا انکار کر دیتے تھے۔ یہ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس وقت کا فلسفہ سراسر حق ثابت ہو گیا تھا۔ پھر ایسا کرنے میں اسلام فلسفہ کی ٹکر سے محفوظ رہتا تھا ورنہ ان کے نزدیک چورا ہو جاتا۔ آج کل بعض ہندوستان کے مسلمان فلسفۂ حال کے مطابق کرنے میں وہی طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے ہیں مگر مسلمانوں نے معتزلہ کی تمام کوشش کو بے کار جانا اور بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا اور خوب ہی کیا کس لیے کہ جب پرانے فلسفہ کا آج نئے فلسفہ کی ٹکر سے چورا ہو گیا تو اس کے مطابق اسلام کا بھی چورا ہو جاتا۔ اسی طرح موجودہ فلسفہ کا اگر آگے چل کر غلط ہونا ثابت ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے تو پھر اس کے مطابق اسلام کا کیا حشر ہو گا۔

دوم انبیاء علیہم السلام کے انکشافِ روحانی کے مقابلہ میں فلسفی انکشاف جو محدود ہے کیا اصل رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں خود بہت سی جگہ ایسی ہیں کہ جہاں معجزہ کو آیت کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ اس مقام پر آیتِ قرآنی مراد

[1] کما قال تعالیٰ وھدینٰہ النجدین الآیۃ۔۱۲ منہ

ہو نہیں سکتی از انجملہ یہ ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً "یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی (معجزہ) ہے" دیکھئے یہاں صاف طور پر فرما دیا کہ یہ اونٹنی آیت ہے۔ اس مقام پر جب سید صاحب سے کچھ بن نہ آیا تو غلط توجیہ کی کہ "قومِ ثمود کو جو احکام حضرت صالح علیہ السلام نے نسبت ناقہ کے بتائے اس سبب سے اس پر بھی آیت کا لفظ اطلاق ہوا" انتہیٰ۔ خواہ کسی سبب سے ہو مگر یہ تو آپ نے بھی لاچار ہو کر تسلیم کر ہی لیا کہ یہاں آیت کا لفظ ناقہ پر بولا گیا کہ جو نہ آیتِ قرآنی تھی نہ کوئی حکمِ رحمانی اور آپ کا یہ قول (کیونکہ وہ اونٹنی فی نفسہٖ کوئی معجزہ نہ تھی) بالکل غلط ہے کیونکہ وہ اونٹنی بڑا معجزہ حضرت صالح علیہ السلام کا تھا کہ جو ان کی دعا سے خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کا بھی ذکر آوے گا از انجملہ یہ آیت ہے وَمَا مَنَعْنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ "ہم اس لیے نشانیاں نہیں بھیجتے کہ ان کو پہلی امتوں نے جھٹلا دیا تھا" دیکھئے اس مقام پر آیات سے قرآن کی یا کسی اور کتاب کی آیتیں مراد ہو نہیں سکتیں چند وجہ سے:

اول یہ کہ اگر آیات سے معجزات مراد نہ ہوں بلکہ آیاتِ قرآنیہ یا اور احکام جیسا کہ سید صاحب فرماتے ہیں تو لازم آوے کہ خدا نے حضرت ﷺ پر نہ کوئی آیتِ قرآنیہ نازل فرمائی نہ کوئی حکم بھیجا و فسادہ مما لا یخفی۔

دوم اس سے پیشتر کی آیت میں یہ ذکر ہے کہ کفارِ مکہ آنحضرت علیہ السلام سے یوں کہتے تھے

قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ وَمَا مَنَعْنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ط "کہ ہم تجھ پر جب تک ایمان نہ لاویں گے (۱) جب تک آپ لیے زمین پھاڑ کر چشمے نہ نکالیں یا (۲) کھجور اور انگور کا ایسا باغ نہ بناویں کہ اس میں سے نہریں بہتی ہوں یا (۳) آسمان کے ہم پر ٹکڑے نہ گرا دیں یا (۴) خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس نہ لاویں یا (۵) ایک گھر مزین نہ بناویں (۶) یا آسمان پر چڑھ نہ جاویں یا (۷) کوئی ایسی کتاب نازل ہم پر نہ کریں کہ اس کو ہم پڑھ لیا کریں۔ ان باتوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو یوں فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میں فقط رسول ہوں (خدائی اختیار مجھ کو حاصل نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی خواہش کے موافق معجزات ظاہر نہ کرنے کا یوں سبب بیان فرماتا ہے کہ اگلے لوگوں نے انبیاء کے معجزوں کو جھٹلا دیا تھا کہ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئے پس اس لیے ہم تمہارے کہنے کے موافق یہ معجزے کہ جو تم مانگتے ہو نہیں ظاہر کرتے' چونکہ یہ آیت کفار کے جواب میں واقع ہے اور وہ ان سات چیزوں کا سوال کرتے تھے تو اس کے جواب میں الآیات سے بسبب لام عہدی کے یہی سات چیزیں مراد ہونی ضرور ہیں نہ کہ مطلق معجزات۔ سید صاحب اس مقام پر قاضی ابن رشد کا قول در بارۂ نفیِ معجزات نقل کر کے یوں کہتے ہیں اور اس کا ثبوت خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے۔ انتہیٰ۔

اور اس دعویٰ کی دلیل میں یہی آیات ذکر فرماتے ہیں۔ میں سید صاحب کی پریشان بیانی سے سخت حیران ہوں کیونکہ جب آیات سے (اس مقام پر جس کے آنحضرت علیہ السلام پر حسبِ استدعاءِ کفار نازل نہ ہونے کی وجہ خدا فرماتا ہے) قرآن کی آیتیں مراد ہوویں جیسا کہ سید صاحب کہتے ہیں تو غایۃ الامر یہ لازم آیا کہ آنحضرت ﷺ پر وہ آیات کہ جن کو کفار

چاہتے تھے نازل نہ ہوئیں۔ معجزات کے نازل ہونے یا نہ ہونے کا تو کچھ ذکر ہی نہ رہا پھر یہ کہنا کہ یہاں سے نفیِ معجزات ثابت ہوتی ہے محض لغو ہے۔

دوم آپ جب بغرض اس بات کے آنحضرت ﷺ کیا بلکہ کسی نبی سے کوئی معجزہ ثابت نہیں ہوا۔ لفظ آیات سے معجزات مراد لینا پڑا (حالانکہ یہ آپ کے قول کے صریح مخالف ہے) تو پہلے انبیاء سے تو ضرور معجزات[1] کا سرزد ہونا تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن کو پہلے لوگوں نے جھٹلایا تھا اور آنحضرت ﷺ سے مطلقاً معجزات کی نفی نہ ہوگی بلکہ بقرینۂ جواب وبقرینۂ لام عہدی ان معجزات کی نفی کہ جن کا عناداً وہ سوال کرتے تھے اس مقام پر جیسا کہ سید صاحب کو صریح مغالطہ ہوا اسی طرح پادری فنڈر وغیرہ معاندین نے بھی منہ کی کھائی۔ اگر یوں کہئے کہ سید صاحب کی مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بوقتِ دعوتِ اسلام کوئی معجزہ ثابت نہیں ہوا تو میں اس کے جواب میں یوں کہتا ہوں کہ اگر یہ آپ کی مراد تسلیم بھی کی جائے تو اس کا ثبوت اس آیت سے جب ہی ہوسکتا ہے کہ آیات سے معجزات مراد لیے جاویں اور پھر بعد اس کے یہ بھی کسی دلیلِ قوی سے ثابت کر دیا جاوے کہ الآیات سے بقرینۂ جواب لام عہدی وہ معجزات مسئولہ کے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا اور ان باتوں کا ثبوت محال ہے۔ (علاوہ اس کے) یہ تو پھر بھی ماننا ضرور ہوگا کہ اور انبیاء علیہم السلام سے وہ معجزات کہ جن کا کفار نے انکار کیا تھا ضرور صادر ہوئے ہیں۔ اب کسی اہلِ اسلام کی تو کیا جرأت ہے کہ وہ یوں کہے کہ اور انبیاء علیہم السلام سے تو[2] معجزات صادر ہوئے مگر آنحضرت سے نہ ہوسکے اور یہ بھی کسی اہلِ عقل کی شان نہیں کہ یوں کہے کہ آنحضرت علیہ السلام سے دعوتِ اسلام کے وقت کوئی معجزہ صادر نہ ہوا اور دیگر اوقات میں صادر ہوئے ازانجملہ یہ آیت ہے وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ط وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا[3] سورۂ بنی اسرائیل۔ یہاں صاف تصریح ہے کہ آیات کا اطلاق ان معجزات پر ہوا ہے کہ جن کو لوگوں نے جھٹلا دیا تھا منجملہ ان کے ناقۂ ثمود تھی کہ جس کی انہوں نے بےحرمتی کی تھی اس مقام پر سید صاحب فرماتے ہیں قولہ اس آیت سے قاضی ابن رشد نے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ادعاءِ نبوت کے ساتھ کوئی معجزہ کسی کو نہیں دکھلایا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اقوالِ قاضی ابن رشد۔ اگر کوئی ذی علم شخص ہیں تو اس آیت سے کاہے کو استدلال کریں گے اور اگر کوئی ایسی ہی موٹی سمجھ کے ہیں تو وہی جواب پاویں گے جو

---

1. خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر آیات سے اس مقام میں قرآن کی آیتیں مراد لی جاویں تو پھر اس آیت کا مامنعنا سے معجزات کی نفی کرنا نادرست ہے اور اگر معجزات ہی مراد ہوں اول تو سید صاحب کا قول آیات کا اطلاق معجزات پر نہیں ہوتا غلط ہوگا۔ دوم اگلے انبیاء سے تو ضرور معجزات کا صادر ہونا پایا گیا کہ جن کی تکذیب سے ان کو عذاب ہوا۔ اب رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ سے ثبوتِ معجزات کو یہ آیت معارض ہے سو یہ بھی غلط کیونکہ اس میں یہ کہیں نہیں کہ آنحضرت ﷺ سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا یا آیندہ نہ ہوگا بلکہ وہ چند معجزات کہ جن کی کفار محض عناد سے استدعا کرتے تھے وہ آپ سے صادر نہیں ہوئے جیسا کہ لام عہدی اور قرینۂ جواب اس کا شاہد ہے۔ ۱۲ حقانی
2. سوائے اس کے قرآن مجید میں اور پہلی کتابوں میں انبیاء کے معجزات کی تصریح ہے۔ آنحضرت ﷺ کے معجزات بھی مذکور ہیں پھر ان کے انکار کی سوا اس بات کے کہ قرآن اور کتبِ سابقہ کا انکار کیا جاوے اور کیا صورت ہے
3. ہم اس لیے نشانیاں (معجزات) نہیں بھیجتے کہ پہلوں نے ان کو جھٹلا دیا تھا اور ثمود کو ہم نے بصارت دینے والی ناقہ دی تھی کہ جس پر انہوں نے ظلم کیا اور ہم نشانیاں (معجزات) نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کو۔ ۱۲

آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ اس کے بعد سید صاحب فرماتے ہیں قولہ اور اس سے پایا جاتا ہے کہ قاضی ابن رشد نے اس آیت میں جو لفظ آیات ہے اس سے معجزات مراد لیے ہیں۔ صاحبِ تفسیر بیضاوی نے بھی یہی سمجھا ہے الخ۔ لو سید صاحب اب تو آپ کے قاضی ابن رشد بھی آپ کے مخالف ہو گئے اور بیضاوی کیا بلکہ کوئی اہلِ علم بھی کہ جس کو کچھ بھی عربیت کی استعداد ہوگی یہ نہ فرماوے گا جو آپ تمام اہلِ عقل و نقل کے مخالف ہو کر فرماتے ہیں۔

یہاں سے ہماری تیسری بات (کہ تمام اہلِ عقل و نقل اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ آیت کا اطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے) ثابت ہوگئی۔ سید صاحب قاضی ابن رشد اور بیضاوی وغیرہ جمہور کی تفسیر کو یوں رد فرماتے ہیں اور تھک کر اس آیت کا یہ جواب دیتے ہیں قولہ صفحہ ۱۳۹۔ مگر اس تفسیر میں چند نقصان ہیں اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے لوگوں کے نہ ماننے یا جھٹلانے سے کیوں معجزوں کا بھیجنا بند کر دیا۔ الخ۔ تحقیقی جواب تو یہ ہے کہ کل معجزات کا بھیجنا بند نہیں کیا بلکہ خاص ان کا کہ جن کی ضد کر کے طلب کرتے تھے تاکہ پھر تکذیب اور مقابلہ سے بلا نازل نہ ہو۔ اور الزامی یہ جواب ہے کہ اگر اس سے احکامِ مخصوصہ ہی مراد ہیں جیسا کہ آپ آگے چل کر فرماتے ہیں۔ قولہ تو یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا نے لوگوں کو نہ ماننے یا جھٹلانے سے کیوں احکامِ مخصوصہ کا بھیجنا بند کر دیا۔ دوسرے آدم سے عیسیٰ علیہ السلام تک برابر کیوں بھیجتا رہا اور کیوں ایسی بےرحمی سے اگلوں کو غارت کرتا رہا۔ ازانجملہ یہ آیت ہے وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً یہاں سے صاف صاف لفظ آیت کا اطلاق رات اور دن پر ہوتا ہے۔ ازانجملہ یہ ہے لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا کہ پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے محمد (ﷺ) کو رات کو مکہ سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کرائی تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔ یہاں سے بھی آیات سے مراد عجائباتِ قدرت ہیں کیونکہ اگر آیتِ قرآنی مراد ہوتیں تو ان کو مسجدِ اقصیٰ میں لے جا کر سنانا تھا نہ کہ دکھانا۔ ازانجملہ یہ ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ الآیہ کہ ہم نے موسیٰ کو ۹ نو نشانیاں عصا، یدِ بیضا وغیرہ دیں یہاں بھی احکام مراد نہیں ہوسکتے۔ بلکہ یہاں تو صفتِ بینات بھی معجزات کی ظاہر کر دی۔ ازانجملہ یہ ہے ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ سورہ کہف دیکھئے یہاں اصحابِ کہف کو آیت اللہ کہا ہے۔ ازانجملہ یہ ہے قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ الآیہ۔ یہاں بھی لفظ آیت زکریا علیہ السلام کے کلام نہ کرنے پر بولا گیا علاوہ اس کے اور بہت سے[1] ایسے مواقع ہیں کہ جہاں لفظ آیت بلکہ بصفت بینات معجزات پر بولا گیا ہے۔ سید صاحب اگر آپ کو قرآن پر آگاہی نہ تھی تو کیوں اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھے کہ قرآن میں لفظ آیت کا سوائے احکام یا آیاتِ قرانیہ کے اور کسی پر اطلاق نہیں ہوا ہے۔ افسوس آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ اہلِ علم میری بےاصل باتوں پر ہنسیں گے؟ اب یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ آیات کا اطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ محض جاہل ہے۔

امرِ دوم کی تحقیق: امرِ دوم کی تحقیق اس طرح پر ہے:

اول لفظ آیت کے اطلاق کرنے کے واسطے نشانی کے معنی پایا جانا ضرور ہے سو وہ معجزہ میں پائے جاتے ہیں۔

---

1. سب سے زیادہ خود سید صاحب کا قول جو تفسیر آل عمران کے صفحہ ۳۴ میں واقع ہے ہمارے واسطے بڑی دلیل ہے قولہ آیت کا لفظ قرآن مجید میں فرعون، اصحابِ کہف والرقیم قومِ نوح واصحابِ سفینہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ انتہیٰ ابوالحسن حقانی

دوم اس کا نبی کی نبوت پر دلالت کرنا بھی اہلِ عقلِ سلیم کے نزدیک ظاہر ہے کیونکہ معجزہ کے بعد وہ خدا کہ جس نے نبی کو خلق پر رحم فرما کے بھیجا ہے خلق کے دل میں اس نبی کے برحق ہونے کا القا کرتا ہے اور علماءِ کلام نے محض تفہیمِ عام کے لیے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ چنانچہ شرحِ مواقف کے چھٹے موقف لول مرصد میں یوں لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کے روبرو لوگوں سے یوں اظہار کرے کہ میں اس بادشاہ کا سفیر ہوں اور بادشاہ سے یوں کہے کہ اگر میں سچا ہوں تو حضور اپنی عادت کے خلاف میرا کہا کریں کہ اس جگہ سے اٹھیں اور دوسری جگہ اسی تخت کے کنارے پر بیٹھ جائیں اور پھر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ جائیں اور پھر وہ بادشاہ ایسا ہی کرے تو بلاشک ان قرائن سے ہر ذی عقل کو اس مجمع میں ایسا یقین آجائے گا کہ جیسا وہ بادشاہ اپنی زبان سے یوں کہے کہ یہ میرا سفیر ہے اور کوئی یوں نہ کہے کہ بادشاہ کا قیاس خدا پر کرنا نادرست ہے کیونکہ یہ قیاس بادشاہ کا خدا پر نہیں بلکہ ایک حال کی تمثیل محض سہولتِ فہم کے لیے دی ہے۔

اب غور کرو کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے کسی پہاڑ کو اپنے اشارہ سے اٹھا کے لوگوں کے سروں پر کھڑا کر دے اور یہ کہے کہ تم میری تصدیق کرو گے تو یہ تم سے ٹل جائے گا ورنہ تم پر گر پڑے گا۔ پس جب وہ اس کی تصدیق کریں تو وہ ان سے دور ہو جاوے اور جب تکذیب کریں تو ان کے سر کے قریب ہونے لگے۔ پس اس وقت ہر شخص کو یقینِ کامل ہو جائے گا۔ اگر یہ وجہ یقین کی نہ ہو تو پھر وہ کون سی وجہ ہے کہ جس سے نبی کی تصدیق ہو؟ کیا اس کے کہنے سے کہ میں نبی ہوں۔ کیا اس کی کتاب سے۔ کیا اس کے احکامِ شریعت سے؟ اگر ان چیزوں سے نبوت کا یقین ہو سکتا ہے تو معجزہ سے جس کی تمثیل اور دلیل ابھی بیان ہوئی بدرجۂ اولیٰ یقین ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے ایک لغوی دلیل متکلمین کی طرف سے اس مضمون پر بیان کر کے آپ ہی پھر اس پر چند اعتراض ایسے کئے کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو اس عمر میں وہ جو کچھ ابتداء میں پڑھا تھا یاد نہیں رہا اور درحقیقت وہ اعتراضات منکرینِ نبوت کے ہیں مگر سید صاحب نے نہایت برے طور سے بیان کئے ہیں۔ شرح مواقف کے اسی موقف میں یوں لکھا ہے منهارد شبهة المنكرين للبعثة وهم طوائف الاولى من احالها الثانية من جوزها ولكن قال لا يخلوالبعثة عن التكليف الثالثة من جوز المعجزات وقال فى العقل الكفاية والرابع من قال بامتناع المعجزة لان خرق العادة محال والخامسة من جوز وجود المعجزة لكن منع الدلالة على الصدق الخ ملخصًا یعنی یہاں منکرینِ نبوت کا رد کریں گے اور ان کے چند فرقے ہیں پہلا فرقہ نبوت کو محال جانتا ہے لیکن کہتا ہے کہ نبوت سے امر ونواہی کا پابند ہونا پڑتا ہے اور یہ تکلیف ہے۔ تیسرا فریق معجزات کا صادر ہونا ناممکن کہتا ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ عقل کافی ہے پس نبوت کی کیا ضرورت ہے؟ چوتھا فریق معجزات کا صادر ہونا محال کہتا ہے اس لیے کہ خرقِ عادت محال ہے۔ پانچواں فریق معجزات کا وجود مانتا ہے لیکن ان کا نبوت پر دلیل ہونا نہیں مانتا۔ اگرچہ سید صاحب چوتھے فریق میں داخل ہیں کہ وجودِ معجزہ کے منکر معلوم ہوتے ہیں لیکن پانچویں فریق میں ہونے کا تو آپ خود اقرار کرتے ہیں اور یہ دلیل بیان فرماتے ہیں قولہ ص ۱۲۹ معجزہ نبوت کے ثبوت کی کیونکر دلیل ہو سکتا ہے الخ۔ بعد اس کے سید صاحب یوں فرماتے ہیں رسولوں کے آنے میں دو چیزیں غور طلب ہیں۔ اول رسول کے ہونے کا ثبوت۔ دوسرے وہ چیز جس سے معلوم ہو کہ یہ شخص جو رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے رسولوں میں ایک رسول ہے۔ ہم نے پہلی بات کا ثبوت بخوبی کر دیا ہے اور دوسری بات کا ثبوت کرنے

والی چیز معجزہ ہے جس کا بیان ابھی ہو چکا۔ اگر منکرِ رسالت ضد کرے تو یہ اور بات ہے۔ قولہ انسانوں میں سے ایسے انسان کے ہونے پر متکلمین نے دنیا کے حالات پر قیاس کر کے استدلال کیا ہے۔ جناب دنیا کے حالات پر ہرگز قیاس نہیں بلکہ تفہیمِ عام کے لیے ایک مثال دیتے ہیں جس کا بیان گزرا۔ اور یہ استدلال متکلمین کی طرف سے نہیں یہ محض آپ کا یہ آپ کے قاضی ابن رشد کا اختراع ہے گو ہم اس استدلال کو پسند نہیں کرتے مگر انصاف یہ ہے کہ اس پر جو کچھ رد کیا ہے وہ محض سینہ زوری ہے۔ قولہ۔ وہ دو کہتے ہیں یعنی متکلمین بوقتِ استدلال کہ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور صاحبِ ارادہ اور بندوں کا مالک اور دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص مجاز ہے کہ بندوں کے پاس اپنا ایلچی بھیجے تو خدا کی نسبت بھی ممکن ہے کہ مملوک بندوں کے پاس اپنا رسول بھیجے۔ یہ دلیل بعثت کی ہے اور یہ بھی بات دنیا میں دیکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں بادشاہ کا ایلچی ہوں اور بادشاہی نشانیاں اس کے پاس ہوں تو واجب ہوتا ہے کہ اس کا ایلچی ہونا قبول کیا جاوے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ معجزہ نبوت کی دلیل ہے۔ اس کے بعد سید صاحب قاضی ابن رشد کو مددگار بنا کے ان دونوں دلیلوں کو رد کرتے ہیں۔ قولہ ابن رشد فرماتے ہیں کہ یہ دلیل عام لوگوں کے لیے کسی قدر مناسب ہو مگر جب غور سے دیکھا جاوے تو ٹھیک نہیں ہے۔ الخ اس کے بعد سید صاحب نے جو اعتراض کیا ہے وہ دو غیر مربوط تقریر دو ورق میں ہے لیکن اس کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے: یہ دلیل جب صحیح ہو سکتی ہے کہ اول یہ مان لیا جاوے کہ وہ نشانیاں جو ایلچی لاتا ہے وہ بادشاہ کے ایلچی ہونے کی ہیں یا اس طرح سے کہ بادشاہ خود کہہ دے کہ یہ نشانیاں جس کے پاس ہوں وہ میرا ایلچی ہے یا یوں کہ بادشاہ کی عادت سے معلوم ہو گیا ہو کہ وہ یہ نشانیاں بجز اپنے ایلچی کے اور کو نہیں دیتا۔ (دوم) یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ معجزہ کا صادر ہونا کسی انسان سے ممکن ہے۔

سوم رسول کا وجود بھی تسلیم کر لیا جاوے۔

اول بات ثابت ہو نہیں سکتی کیونکہ شرع سے تو ثبوت کرنا فضول ہے کہ ہنوز شرع کا وجود ہی نہیں اور عقل سے معلوم ہو نہیں سکتا۔

دوسری بات یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی شے کا امکان جب ثابت ہوتا ہے کہ جب اس کا وقوع بار بار مان لیا جاوے کہ کبھی وہ شے ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور اگر یہ امکان تسلیم بھی کر لیا جاوے تو اس سے وقوع لازم نہ آئے گا اور نظر بندی اور ڈھڈ بندی کا احتمال قائم رہے گا اور تجربہ اور عادت سے بھی اس کے رسول ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکے گا بجز اس کے کہ معجزے رسول ہی دکھایا کریں اور کوئی نہ دکھا سکے حالانکہ خرقِ عادت جس کا ایک نام معجزہ بھی ہے رسول اور غیر رسول دکھا سکتے ہیں اور متکلمین اس بات کے قائل ہیں کہ شے معجز کبھی جادوگر سے اور ولی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

تیسری بات بھی ثابت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ جو امکان موجودات کی طبیعت میں پایا جاتا ہے وہ اس لیے پایا جاتا کہ وہ شے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی جیسا کہ مینہ کا حال ہے کہ کبھی برستا ہے کبھی نہیں برستا۔ پس جو شخص کسی ایک رسول ہونے کا بھی قائل ہو گیا ہو تو اس کے مقابلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ رسولوں کا ہونا ممکن ہے مگر جو شخص رسول ہونے کا قائل ہی نہ ہو تو اس کے مقابلہ میں اس کا امکان رکھنا جہالت ہے اور چونکہ لوگوں کی طرف سے ایلچی کا ہونا ممکن مانا گیا ہے تو اس سبب

سے مانا گیا ہے کہ ان کے ایلچیوں کا وجود ہم نے پایا ہے۔ پس زید پر قیاس کر کے عمرو کے لیے ایلچی ثابت کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں دونوں کی طبیعتوں کا مساوی ہونا ضروری ہے اور یہ مساوات خدا اور بندوں میں نہیں ہے۔ یہ حضرت کی تمام گفتگو کا خلاصہ ہے بلکہ جو فقرے کہ ان پر خط کھینچا ہوا ہے لفظ بلفظ انہیں کے ہیں۔ اب ہر بات کا جواب بھی سنئے اور ذرا انصاف بھی فرمایئے اور اس بات کی طرف کچھ خیال نہ کیجئے کہ سید صاحب سرکارِ انگریزی میں بڑے آدمی شمار کئے گئے ہیں ان کی ہر بات حق اور بجا ہے۔

پہلی بات کا جواب یوں ہے کہ یہ بات نبی کی حقیقت اور معجزہ کی حقیقت سے خوب معلوم ہوگئی کہ نبی کی روحانی قوت کے مقابلہ میں کسی کی نہیں پھر ایسے ایسے خوارقِ عادت سوائے نبی کے اور کس کی طاقت ہے کہ ظاہر کر سکے اور آپ کا یہ کہنا کہ متکلمین کے نزدیک معجزہ جادوگر سے اور ولی سے بھی ظاہر ہو سکتا ہے بالکل غلط ہے۔ کسی کا بھی متکلمین سے یہ عقیدہ نہیں اور جو کوئی ہو بھی تو اس کا اعتبار کیا ہے۔ دیکھئے شرح مواقف کے موقف ششم بحث دوم میں یوں لکھا ہے قالت المعتزلہ خلق المعجزۃ علی ید الکاذب مقدور اللہ تعالیٰ لکنہ ممتنع وقوعہ فی حکمتہ لان فی ابہام صدقہ وھو اضلال قبح من اللہ تعالیٰ فیمتنع صدورہ کسائر القبائح قال الشیخ وبعض اصحابنا انہ ای خلق المعجزۃ علی ید الکاذب غیر مقدور فی نفسہ لان لھا دلالۃ علی الصدق قطعا فان دل المعجز المخلوق علی ید الکاذب علی الصدق کان الکاذب صادقا ھو محال یعنی معتزلہ کے نزدیک کاذب سے معجزہ ظاہر کرانا خدا کی قدرت میں تو ہے لیکن اس کی حکمت کی رو سے اس کا واقع ہونا محال ہے کیونکہ اس کے ظاہر ہونے میں جھوٹے کے سچا ہونے کا خیال ہوتا ہے اور یہ قبیح ہے۔ خدا سے قبیح کا سرزد ہونا ممکن نہیں۔ شیخ ابوالحسن اشعری اور اس کے پیرو یہ کہتے ہیں کہ کاذب کے ہاتھ سے معجزہ کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں کس لیے کہ معجزہ قطعی دلیل ہے پس وہ معجزہ جو کاذب کے ہاتھ سے ظاہر ہوا اس کی سچائی پر دلالت کرے تو جھوٹا سچا ہو جاوے اور یہ محال ہے۔

لو سید صاحب ہم نے دوسری شق اختیار کی اعنی اس کی عادت سے معلوم ہو کہ وہ غیر نبی کے کسی اور کو معجزہ پر قادر نہیں کرتا اور عقل اس کی گواہ ہے۔ اور جادوگر کو سرے سے بعض لوگوں نے کسی خرقِ عادت پر قادر ہی نہیں سمجھا ہے۔ معجزہ تو درکنار اب اس معجزہ کو دیکھ کر یہ شبہ پیدا کرنا کہ یہ کوئی طلسم نہ ہو یہ کوئی نظر بندی تو نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ اہلِ عقل اور صاحبِ طبیعتِ سلیمہ سے تو نہایت بعید ہے بلکہ عادت یوں ہی جاری ہے کہ سب کو یقین ہو جاتا ہے پھر جو کوئی نہیں مانتا تو عمداً ضد کرتا ہے حجیتِ الٰہی اس پر تمام ہو چکتی ہے۔ ہم جب کسی کمشنر یا کسی حاکمِ جلیل القدر کو دیکھتے ہیں تو بغیر اس کے ہم اس کی اس سند اور فرمان کو دیکھیں جو اس کو گورنمنٹ کی طرف سے ملا ہے یا پھر اس کی بھی تحقیق کریں کہ آیا یہ فرمان صحیح ہے یا جعلی محض قرائن سے ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کمشنر یا فلان حاکم ہے۔ حالانکہ یہاں بہت سے احتمالاتِ عقلی ہو سکتے ہیں اور نبی میں تو بعد معجزہ کے کوئی احتمال ہی نہیں رہتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صاحبِ کمشنر کا کچہری میں بیٹھنا اور دو چار چپراسیوں کا اس کی اردل میں ہونا وغیر ذلک اس کے کمشنر ہونے کی دلیل ہو جاوے اور معجزہ جو ایسی بڑی چیز ہے اور ایسے شخص کے ہاتھ سے ظاہر ہو کہ جس کے منہ دیکھے سے خدا یاد آوے اس کی نبوت کی دلیل نہ ہو؟ اور اس کے دل میں یقین نہ آوے؟ حالانکہ یہاں رحمتِ خدائی نے اس بات کا ذمہ بھی لے لیا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اس کے رسول ہونے کا یقین پیدا کرے گی ورنہ اس کا رسول

بھیجنا ہی فضول ہو جائے گا۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ رسول کا ہونا ممکن کیا بلکہ بنظرِ اصلاحِ عالم ضروری ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں اور آپ کا یہ فرمانا کہ امکان شے کے کبھی ہونے اور کبھی نہ ہونے سے ثابت ہوتا ہے محض غلط ہے کیونکہ تمام اہلِ عقل اس بات پر متفق ہیں کہ ممکن اس کو کہتے ہیں کہ جس کے فرضِ وقوع سے محال نہ لازم آوے اور یہ صفتِ امکان وجود پر ہمیشہ مقدم ہوئی ہے جیسا کہ صدرا اور میبذی وغیرہ کتبِ حکمت میں بھی مذکور ہے (لآن مکان وجودہ سابق علی وجودہ والالما کان قبلہ ممکناً بل ممتنعالذاتہ ھدایۃ الحکمۃ) کیونکہ اگر شے کے موجود ہونے کے اول اس کا امکان نہ ہوگا تو ممتنع ہو جاوے گی اور وجود میں نہ آوے گی۔ پس اگر امکان اس بات پر موقوف ہو کہ شے کبھی پائی جائے اور کبھی نہیں تو وہ شے کبھی پائی ہی نہ جائے گی اب جو شخص ایک رسول کے ہونے کا بھی قائل نہ ہو (جیسا کہ اس وقت کے بعض ہنود[1]) تو ان کے مقابلہ میں اس دلیلِ مذکور کے ذریعہ سے رسول کے امکان (بلکہ فعلیت) کا مقر ہونا عین علم اور کمالِ فطانت ہے جو اس کو جہالت کہے خود اس کی نادانی ہے۔

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ مطلق رسالت کا ثبوت ظہورِ معجزہ پر موقوف نہیں جیسا کہ آپ اور آپ کے قاضی ابن رشد غلط فہمی سے سمجھ کر اس کے رد میں قیل و قال کرتے ہیں کیونکہ یہ تو وجہِ ضرورتِ رسالت سے ثابت ہے اور دلائل سے تسلیم کرا دیا گیا ہے کہ اس عالم کی اصلاح رسول بغیر نہیں ہو سکتی ہاں تعیین و تشخیص اس بات کی کہ اس مطلق رسالت کا کون مصداق ہے؟ آیا زید رسول ہے یا نہیں؟ البتہ یہ بات معجزہ کے ظاہر ہونے سے معلوم ہوتی۔ پس جس شخصِ نیک عادت ہادیِ سیرت نے نبوت کا دعویٰ کر کے معجزہ دکھا دیا خواہ اسی وقت یا بعد اس کے یا تعلیمِ امت کے یا اور وقت میں بلاشک و شبہ یہ بات ثابت ہو جاوے گی کہ یہ شخص بھی نبی ہے۔ الغرض عہدۂ نبوت کی تصدیق کے واسطے معجزہ فرمانِ خداوندی ہے کہ جس کے دیکھتے ہی قلوب اس کی طرف اس طرح کھچ آتے ہیں کہ جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف۔ اب جو شخص برخلاف مشاہدہ اس جذبِ مقناطیس کا انکار کرے تو وہ نہ تنہا کج فہم بلکہ بڑا ضدی ہے

تیسرے امر کی تحقیق اس طرح پر ہے کہ جب یہ بات بخوبی ثابت کر دی کہ معجزہ نبوت کی بڑی واضح اور روشن دلیل ہے تو اس میں وضاحت اور مبین ہونے کا وصف آیت سے بھی زیادہ پایا جاتا ہے بلکہ یہ لفظ آیت یا بلفظِ آیتِ بینہ یا محض بلفظِ بینہ بلحاظِ مراتبِ معجزات۔ اصل و بالذات معجزات و عجائباتِ قدرت ہی کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور بالتبع آیاتِ قرانیہ کو امر کی یہ تحقیق ہے کہ جب یہ وصف وضاحتِ معجزات میں بھی پایا جاتا ہے کما عرفت تو یہ تخصیصِ دعویٰ بلا دلیل ہے:

فصل سوم الملائکہ: کل حکماء و عقلاء کہ جن کو قوتِ اشراق و انکشاف مبدءِ فیاض سے عطا ہوئی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ اس عالمِ حس کے علاوہ (کہ جس میں ہماری آنکھوں سے ہم کو یہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں) ایک اور عالم بھی ہے کہ جس کو عالمِ ملکوت کہتے ہیں اور کبھی اس کو عالمِ غیب بھی کہتے ہیں۔ اور جب یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ عالمِ مجرداتِ محضہ اور عالمِ حس کی وہ درمیانی حالت ہے تو اس کو عالمِ برزخ اور کبھی عالمِ مثال کہتے ہیں اس عالم میں صدہا مخلوق ہے جن میں فرشتہ بھی ہے ہر ایک

[1] یعنی آریہ سماج۔۱۲

قوم کے نزدیک اس کا ایک نام ہے کل اہلِ ادیان بلکہ حکماءِ روم و ہندو ایران و یونان اور کل بیبل کے ماننے والے فرشتوں کے قائل ہیں۔ بیبل میں صدہا جگہ ان کا بصراحت ذکر ہے۔ اہل ہند کے بید اور پوران بھی ذکرِ[1] ملائکہ سے پر ہیں۔ اہلِ اسلام میں سلف سے خلف تک ملائکہ کا وجود مانتے ہیں آئے ہیں۔ قرآن مجید میں بے شمار جگہ فرشتوں کا ذکر ہے۔ حکماءِ قدیم کی کتابیں ان کے حالات سے بھری پڑی ہیں چونکہ یہ مسئلہ سب کا متفق علیہ ہے لہٰذا مجھ کو اس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی علاوہ اس کے میرا کلام اہلِ ادیان سے ہے۔ سو اس کی تسکین کے لیے ان کی کتبِ الہامیہ سے ثبوت کافی ہے لیکن ان بعض لوگوں کے لیے جو نئے فلسفہ کے اعتماد پر منکر بن بیٹھے یہ چند ادلہ بیان کرنی پڑیں :

دلیل اول : غالباً یہ چار عنصر خاک ' پانی ' ہوا ' آگ اس عالمِ حس کی بنیاد ہیں۔ اور ان چار کے سوائے اور بھی ہوں تو کچھ تعجب نہیں چنانچہ اس وقت کے حکماء نے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ بیان کی ہے۔ اب یہ جس قدر ذی روح ہیں۔ جیسا انسان ' گدھا ' مچھر ' مکھی وغیرہ ان سب کے اندر عنصرِ خاک زیادہ ہے اسی لیے یہ چیزیں زمین پر رہتی ہیں اور ان کے پیدا ہونے کے مختلف طور ہیں۔ بعض چیزیں توالدو تناسل سے انثی کے رحم میں اس طرح پیدا ہوتی ہیں کہ خاک اور پانی کی ترکیب سے نباتات پیدا ہوتے ہیں پھر ان کو کھا کر بدن میں خون پیدا ہوتا ہے پھر وہ خون منی بن جاتا ہے پھر وہ منی انثیٰ کے رحم میں جا کر گوشت کا ٹکڑا بن کر ہڈی اور چمڑا وغیرہ اعضاء اس میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ الغرض وہ غذا بعد استحالات کے اس قابل ہو جاتی ہے کہ پھر مبدءِ فیاض سے اس پر نفس فائض ہوتا ہے تب وہ قوت پا کے رحم سے باہر آتی ہے اور بعض کے توالد کی یہ صورت ہوتی ہے کہ بعض عناصر باہم ترکیب پا کے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ان پر نفس فائض ہو جاتا ہے دیکھئے جب غذا یا گوبر یا کوئی اور چیز حرارتِ غریبہ کی وجہ سے نیا مزاج حاصل کرتی ہے تو اس کے کیڑے بن جاتے ہیں یعنی خاص اسی مادہ پر نفس اس کے قابل فائض ہو جاتا ہے۔ حیوان میں اور غیر چیزوں میں صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں فیضانِ نفس رحم سے تعلق رکھتا ہے یہاں نہیں اور کبھی نفس فائض ہونے کے بعد ایک نوع کی چیز دوسری نوع میں آ جاتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بونٹ (چنے) میں کیڑا سبز رنگ کا ہوتا ہے اس کو کسی ڈبیا میں کسی قدر سبز پتے ڈال کر بند کر دیجئے وہ چند روز کے بعد پر دار جانور ہو کر پھر سے اڑ جاتا ہے (میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے)۔ اسی طرح پانی کے گھڑے میں یہ جو کیڑے ہوتے ہیں چند روز کے بعد مچھر بن جاتے ہیں۔ اور گو کا کیڑا ایک جانور سرخ پر کا ہو جاتا ہے (جس کو لال بیگ کہتے ہیں) ایک دوست نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ جوار کا ایک خوشہ تھا چند روز کے بعد وہ دانے مکھیاں بن کر میرے روبرو اڑ گئیں (یہ صحیح ہے کیونکہ وہ مرطوب ہوں گی جس طرح کہ گوبر اور گو کے کیڑے بن جاتے ہیں اسی طرح بعد مزاجِ جدید کے اس پر نفسِ مگسی فائض ہو گیا)۔

قصہ مختصر اس عالمِ حس میں یہ حیوانات بلکہ نباتات عناصر کی ترکیب اور مزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور جو عناصر غالب ہوتا ہے اسی کے خواص اس میں آتے ہیں جس میں خاک غالب ہے وہ شے مکدر اور بوجھل ہوتی ہے اور دکھائی دیتی ہے اسی طرح جزءِ ہوائی یا ناری غالب ہے تو اس میں وہی آثار پائے جاتے ہیں۔ پس جس طرح کہ ہوا لطیف نظر نہیں آتی ہاں بدن پر محسوس ہوتی ہے اور اس لطیف عنصر میں جو دکھائی نہیں دیتا بڑا زور ہے۔ ہوا درختوں کو اکھیڑ دیتی ہے جہازوں کو زیر و زبر کر

[1] ہنود موت کے فرشتے کو جمراج اور عام فرشتوں کو ددت یا دیوتا کہتے ہیں یونانی محافظ فرشتے کو ذمن اور رومی جینس کہتے ہیں اور ایرانی عام کو فرشتہ کہتے ہیں۔۱۲

ڈالتی ہے۔ وہ چیز کہ جس میں یہ ہوا غالب ہوگی نظر نہ آوے گی یوں سب کچھ کرے گی۔ یا جس میں آگ غالب ہوگی وہ بھی دکھائی نہ دے گی۔ اور علاوہ ان چاروں عنصروں کے جو چیز اور عناصر سے مرکب ہیں وہ بھی دکھائی نہ دے گی۔ کیونکہ کل دو عناصر (ایک خاک دوسرا پانی) نظر آتے ہیں باقی اور کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا۔ پس باقی دو اور عنصر ہوا اور آگ جو کل کے نزدیک مسلم الوجود ہیں اور اسی طرح زائد عناصر جو محققینِ حال نے دریافت کئے ہیں دکھائی نہیں دیتے اور ممکن ہے کہ اس بے نہایت دریاءِ ہستی میں اور بہت سے عناصر ایسے ہوں کہ جن کی خبر اب تک نہ ہوئی ہو اور آیندہ ہو۔ پس میں کہتا ہوں کہ عقلِ سلیم کے نزدیک یہ بات نہایت بعید ہے کہ وہ یوں کہے کہ انہیں دونوں عنصر خاک اور پانی سے اشیاء مرکب ہوتے ہیں یا ان کی ترتیب میں بھی دونوں جز غالب ہوتے ہیں اور دیگر عناصر کا غالب ہونا محال ہے یا علاوہ ان دو کثیف (خاک اور پانی) عنصر کے اور دیگر عناصر سے ترکیب پانا اور ان کا مخلوط ہو کر ایسا مزاج حاصل کرنا کہ جن پر ان کے موافق کوئی نفس (یعنی روح) فائض ہو غیر ممکن ہے۔ پس جب عقلِ سلیم کے نزدیک یہ باتیں محال نہیں بلکہ واقع ہیں۔ تو نورِ فطرت اور عقلِ سلیم کے نزدیک یہ بات (کہ سلسلۂ موجودات انہیں دونوں کثیف عنصر کی چیزوں میں ختم ہو گیا۔ یا جو چیز تم کو نظر نہیں آتی وہ موجود نہیں) محال نہیں تو محال سے کم بھی نہیں۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس طرح ان دونوں عنصر خاک اور پانی سے اور عناصر بہت زیادہ ہیں بلکہ تمام عالم انہیں سے مالا مال ہے اور یہ دونوں ان کی نسبت ایسے ہیں کہ جیسا بحرِ ذخار کی نسبت قطرہ تو اسی طرح ان عناصر کی مخلوقات اس عالمِ حس کی مخلوقات سے کہیں زیادہ اور قوی ہے اور جس طرح وہ عناصر نظر نہیں آتے (بسبب لطافت کے) اسی طرح وہ مخلوقات بھی نظر نہیں آتی اور اس مخلوقات کی صدہا اقسام ہیں جیسا کہ یہاں کی مخلوقات کی صدہا اقسام ہیں اور وہاں کی مخلوقات جہاں تک کہ اہلِ صفاء اور اربابِ کشف کو معلوم ہوئی یا دکھائی دی ہے اس کے نام باعتبار ہر نوع کے جدا جدا ہیں کسی کو جن اور کسی کو شیطان اور کسی کو ملک یعنی فرشتہ کہتے ہیں۔

دلیل دوم : بہت سے آدمیوں کو جن اور ملائکہ[1] اور شیطان عیاناً دکھائی دیے ہیں اور ان سے بات چیت کی ہے اور اسی طرح ان کے آثارِ خارجیہ (حرکات و سکنات یا کوئی بڑا بھاری کام کرنا جیسا کہ چھت کو توڑ ڈالنا یا کسی چیز کو صدہا کوس کے فاصلہ سے ذرا سی دیر میں حاضر کر دینا یا جنگل میں بھولے کو راہ دکھا کے پھر آنکھوں کے سامنے وہیں غائب ہو جانا یا کسی شخص سے دور دراز کے حالات کہہ دینا وغیرہ وغیرہ باتیں ظہور میں آئی ہیں اور آتی ہیں اور جن جن لوگوں سے یہ ماجرے پیش آئے ہیں بہت سے میں نے دیکھے ہیں اگر ان کی تفصیل لکھوں تو یہ کتاب دراز ہو جائے۔ میری کتاب کے دیکھنے والوں میں سے بھی صدہا آدمی ایسے ہوں گے کہ جن کے روبرو ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ اب اگر کوئی وہم دوڑائے اور ان سب باتوں کو وہمی اور خیالی بتائے اور ان لوگوں کی خبرِ متواتر کو جھوٹے قصے سمجھے اور اپنی وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہے جائے تو یہ اور بات ہے۔ اس مرضِ سوداوی کا علاج ہی اور ہے۔ خیر اس کو بھی جانے دیجئے۔ اب میں چند ایسے ثقات سے یہ واقعات نقل کرتا ہوں کہ جو تمام جہان کے مسلم ہیں اور جن کی بات کو جھوٹ سمجھنا (تو درکنار بلکہ اس کا گمان بھی کرنا) کفر اور بے ایمانی بلکہ حماقت اور نادانی ہے۔

[1] جیسے انبیاء اولیاء اور صاحبِ نفوسِ قدسی۱۲

ازانجملہ وہ قصہ جن جس کو سورۂ جن میں تمام جہان کے سردار اور سب صادقوں کے صادق نے نقل فرمایا ہے۔ ازانجملہ وہ قصہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس رات جن پیغمبر علیہ السلام سے تعلیم پانے کے واسطے حاضر ہوئے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر جنگل میں مجھ کو بھی لے گئے تھے اور مجھ کو خاص ایک جگہ میں بیٹھنے کا حکم دے کر آنحضرت علیہ السلام نے ان کو کچھ آیاتِ قرآنی اور نماز روزے کے مسائل تعلیم فرمائے اور مجھ کو بجز آوازوں کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا (کیا تعجب ہے کہ شیخِ بے خبر اس کو بھی جھوٹ کہہ دیں یا جن سے مراد کوئی پہاڑی قوم بتا دیں)۔
ازانجملہ وہ قصہ ہے کہ جس کو امام بخاری وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام ایک بار نماز پڑھنے میں دفعۃً کئی قدم پیچھے ہٹے اور پھر آگے بڑھے اور کسی چیز کے پکڑنے کے لیے ہاتھ دراز کیا۔ بعد فراغت نماز کے لوگوں سے بیان کیا کہ شیطان میری نماز میں خلل انداز ہوا تھا ایک لکڑی جلا کر میرے بدن کو لگانا چاہتا تھا میں پیچھے ہٹا پھر میں نے اس کو پکڑنا چاہا کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دیکھو تب سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آئی۔ نہ پکڑا ورنہ اس کو پکڑ کر باندھ دیتا۔ ازانجملہ سورۂ نجم میں جبرئیل علیہ السلام کا وہ قصہ کہ جبرئیل علیہ السلام کو آنحضرت علیہ السلام نے آسمان کے کناروں پر دیکھا اور پھر اتنا فاصلہ باقی رہ گیا کہ جیسا دو کمانوں میں یا اس سے بھی کم۔ کما قال تعالیٰ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْمِرَّةٍ ط فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى○ ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى ۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ[1] مَا رَاٰى الْاٰيَات۔ اس کے بعد چونکہ خدا کو معلوم تھا کہ منکر اس کی تکذیب و تاویل کریں گے تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے آخر یہ بھی فرما یا ہی دیا مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى یعنی یہ دیکھنا کچھ وہم و خیال کے طور پر نہ تھا کہ جس کو قصورِ نظر سمجھا جاوے جیسا کہ ماؤف البصر کو کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اس آیت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا یہاں ذکر ہے (کہ اس نے حضرت کو سکھلایا (۱) اور وہ (۲) بڑا قوت مند ہے اور وہ (۳) اپنی اصلی صورت پر قائم ہوا (۴) اور وہ آسمان کے بلند کنارہ پر تھا پھر وہ قریب ہوتے ہوتے دو کمانوں کے فاصلہ پر آ رہا پھر اس نے قریب ہو کر آنحضرت علیہ السلام کو وحی پہنچائی) یہ کوئی قوتِ انسانی نہیں کیونکہ قوتِ انسانی خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ کیسی ہی قوی اور زائد ہو ایک صفت ہے جو اپنے موصوف سے ایک قدم کے فاصلہ تک بھی جدا نہیں ہو سکتی ہے۔

بائبل میں متعدد جگہ فرشتوں کا ذکر ہے۔ توریت کتاب پیدائش کے سولہویں باب میں فرشتہ کا ہاجرہ ابراہیم کی بیوی کو دکھائی دینا اور ان سے کلام کرنا مذکور ہے۔ پیدائش کتاب میں لوط کو فرشتوں کا نظر آنا اور ان کے گھر مہمان رہنا اور بستیوں کا الٹ دینا مذکور ہے اسی کتاب میں فرشتوں کا اسرائیل کی کشتی کرنا مذکور ہے۔ اس طرح کتاب زکریا کے اول باب میں ایک فرشتہ سب سے اعلیٰ ہے جو خدا کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ انجیلوں میں اکثر مقامات پر فرشتوں کا ذکر ہے۔ اور مکاشفاتِ یوحنا میں تو بے شمار جگہ فرشتوں کا ذکر ہے اور ان کے کاروبار مذکور ہیں۔

تیسری دلیل: خدائے ذوالجلال والاکرام اور اس کائناتِ عالمِ حس یا عالمِ ناسوت میں (کہ جو محض کثیف اور تاریک اور بے ثبات ہے) کچھ بھی مناسب نہیں وہ نورِ محض یہ تاریک و تار، وہ لطیف یہ کثیف، وہ غایت علو میں یہ نہایت سفل میں، وہ باقی یہ

[1] سکھایا یہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑے قوت والے (جبرئیل) نے۔ پس وہ کنارۂ بلند میں اپنی صورت پر قائم ہوا پھر نزدیک ہوتا گیا پس نیچے اتر آیا۔ پھر ان میں دو کمان کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا بس ہمارے بندے (محمد علیہ السلام) کو جو پہنچانا تھا سو پہنچا دیا۔ نہ جھوٹا سمجھا دل نے جس کو دیکھا۔ ۱۲

فانی، وہ قدیم محض یہ حادث، وغیر ذلک من التفاوت والتباین مما لا تخفی علی ارباب البصیرۃ۔ پس جس طرح اس نے اس عالم میں طرح طرح کے انتظامات و تدبیرات کر رکھے ہیں اسی طرح اس نے تکمیلِ انتظام کے لیے وسائط پیدا کئے ہیں کہ وہ من وجہ اس عالم کے مناسب من وجہ اس ذاتِ قدس کے مناسب ہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ بات مسلم ہے کہ اس تمام کائنات کے جس قدر آثار و حالات ہیں وہ سب اپنے نہیں بلکہ کسی غیر کی طرف سے آئے ہیں نہ یہ وجود اپنا ہے نہ یہ بقا اپنی ہے، نہ اس کے اوپر جس قدر باتیں پیش آتی ہیں وہ اپنی ہیں کیونکہ اگر یہ ہو تو پھر بتدریج ہونے کی کیا وجہ؟ اور زوال و تغیر کا کیا سبب اور حدوث کا کیا باعث اور پھر ان کے ممکن ہونے کا کیا طریق؟ خدا کی ذاتِ پاک کا ثبوت تو اسی لیے ضرور مانا گیا کہ یہ چیزیں جمیع کمالات بلکہ حالات بلکہ وجود و ذات میں محتاج ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان کا کوئی واجب الوجود محتاج الیہ ہے کہ جس کی طرف سے یہ فیضان ہوتا ہے ورنہ یہ لازم آوے کہ مابالعرض بغیر مابالذات کے پایا جاوے اور یہ محالِ عقلی ہے۔ پس یہ ضرور تسلیم کرنا پڑا کہ یہ تمام فیضان اسی مبدءِ فیاض کی طرف ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ مؤثر اور مؤثر میں مناسبت ہونی ضرور ہے اور ابھی آپ جان چکے ہیں کہ خدائے پاک اور اس عالمِ حس میں کچھ بھی مناسبت نہیں۔ پس یہ ضرور تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے درمیان اور عالمِ حس کے درمیان وسائط ہیں کہ جو من وجہ اس عالم سے اور من وجہ اس قدوس سے مناسبت رکھتے ہیں اور ہم ان کو[1] ملائکہ کہتے ہیں اور یہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ اس سلسلۂ موجودات کے ذاتِ قدوس تک منتہی ہونے میں زیادہ بعد کی وجہ سے بے شمار وسائط ہیں کیونکہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس قدر زیادہ بعد ہوگا زیادہ واسطے ہوں گے۔ (فرض کرو کہ ایک شخص ہزار قدم کے فاصلہ پر ہم سے دور ہے اور وہ بوسائط کوئی چیز ہم کو دیا چاہتا ہے۔ پس وہ اول اپنے پاس والے کو یہاں تک کہ جو ان سب میں اخیر ہے اور جس پر وہ سلسلہ ختم ہوا ہے وہ ہم کو دے گا۔ اب اسی پر خیال کر لیجئے پس اول موردِ تجلیات و فیوضات وہ قدوسی اشخاص ہیں کہ جو ہم سے نہایت بعید المناسبت اور حق تعالیٰ جل جلالہ سے نہایت قریب اور بہت ہی مناسبت رکھتے ہیں۔ جن کو حاملانِ عرش اور ملاءِ اعلیٰ کہتے ہیں پھر ان سے نیچے اور پھر ان سے نیچے ہلم جرا اور ہمارے اس بیان کی تائید قرآن[2] اور کلام پیغمبر علیہ السلام سے ہوتی ہے۔

[1] صوفیہ کرام ان کو قوائے عالم کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ عالم میں جملہ تصرفات ان کے ذریعہ سے ہوتے ہیں جیسا کہ انسان کے کاروبار انسان کے قویٰ بغیر نہیں ہوتے۔ سید صاحب غلط فہمی سے یہ سمجھ گئے کہ ملائکہ قویٰ ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] قال اللہ تعالیٰ حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ○ اس کی تفسیر میں پیغمبر علیہ السلام یوں فرماتے ہیں اِذَا قَضَى اللّٰهُ تَعَالٰى اَمْرًا فِى السَّمَآءِ ضَرَبَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهٖ كَاَنَّهٗ صَلْصَلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ رواہ البخاری وغیرہ من کبار المحدثین وفی روایۃ اِذَا قَضٰى اَمْرًا سَبَّحَ حَمَلَةُ الْعَرْشِ ثُمَّ يُسَبِّحُ اَهْلُ السَّمَآءِ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ التَّسْبِيْحُ اَهْلَ هٰذِهِ السَّمَآءِ الدُّنْيَا ثُمَّ قَالَ الَّذِيْنَ يَلُوْنَ حَمَلَةَ الْعَرْشِ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ فَيُخْبِرُوْنَهُمْ مَاذَا قَالَ رَبُّهُمْ فَيَسْتَخْبِرُ بَعْضُ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ بَعْضًا حَتّٰى يَبْلُغَ الْخَبَرُ اَهْلَ هٰذِهِ السَّمَآءِ۔ انتہی۔ یعنی جب آسمان میں خدا کوئی حکم صادر فرماتا ہے تو ڈر کے مارے حاملانِ عرش سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہیں پھر ان کے نیچے کے آسمانوں والے یہاں تک کہ اس آسمان والے تسبیح کرتے ہیں۔ پھر جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ کم ہوتی ہے تو جو فرشتے کہ حاملانِ عرش کے قریب ہیں ان سے نیچے پوچھتے ہیں کہ خدا نے کیا حکم صادر فرمایا ہے پس وہ ان کو بتلا دیتے ہیں یہاں تک کہ ان سے نیچے کے فرشتے ان سے پھر ان کے نیچے کے فرشتے ان سے پوچھتے ہیں حتیٰ کہ اس آسمان کے فرشتوں تک وہ خبر پہنچتی ہے۔

الغرض اسی ترتیب سے صدہا بلکہ کروڑہا ملائکہ ہیں کہ جن کی تفصیل سوائے اس کے کوئی نہیں جان سکتا کماقال تعالیٰ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ان کی کسی قدر تفصیل جو ہم کو قرآن سے یا احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوئی یہ ہے:

اقسامِ ملائکہ: (اول) حاملانِ[1] عرش جن کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وقولہ تعالیٰ وَیَحْمِلُ[2] عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ۔ (دوم) عرش کے ارد گرد طواف کرنے والے قال تعالیٰ وَتَرَی الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔[3]

(سوم) اکابر ملائکہ ہیں منجملہ ان کے جبرئیل و میکائیل ہیں کہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ قال تعالیٰ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ جِبْرِیْلَ وَ مِیْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ۔[4] حضرت جبرئیل کے قرآن مجید میں چند اوصاف مذکور ہیں ازانجملہ یہ کہ وہ انبیاء اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اس کے ذریعہ سے وحی آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ○ وقال تعالیٰ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ[5] ○ ازانجملہ یہ کہ وہ قوی ہیں۔ ازانجملہ یہ ہے کہ ان کو خدا نے روح القدس فرمایا ہے کما قال اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ[6] منجملہ ان کے اسرافیل ہیں جن کا نام احادیثِ صحیحہ میں بکثرت وارد ہے اور جن کا فعل صور پھونکنا ہے وقال تعالیٰ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ[7] منجملہ ان کے عزرائیل ہیں جن کا نام احادیثِ صحیحہ میں بکثرت ہے اور قرآن میں ان کو ملک الموت کہا ہے قال تعالیٰ[8] قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ۔

(چہارم) وہ ملائکہ ہیں جو ارواح قبض کرتے ہیں قال تعالیٰ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا[9] وقال تعالیٰ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ[10] اس جماعت کے سردار عزرائیل ہیں۔

(پنجم) ملائکۂ جنت ہیں قال تعالیٰ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ○ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ۔[11]

(ششم) ملائکۂ جہنم ہیں اہلِ دوزخ کو عذاب انہیں کے ہاتھ سے ہوتا ہے قال تعالیٰ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ[12] وقال تعالیٰ وَمَا جَعَلْنَاۤ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةًط[13] اور اس فریق کے سردار مالک ہیں۔ قال تعالیٰ وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا[14]

---

[1] وہ جو عرش اٹھاتے ہیں۔۱۲ منہ [2] اس روز تیرے رب کا عرش آٹھ (فرشتے) اٹھائیں گے۔۱۲ منہ

[3] اور تو فرشتوں کو عرش کے ارد گرد خدا کی تسبیح کرتے دیکھے گا۔۱۲ منہ

[4] جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے خدا اس کا دشمن ہے۔۱۲ منہ

[5] اس قرآن کو روح الامین لائے ہیں۔۱۲ منہ [6] جب مدد کی ہم نے تیری (اے عیسیٰ) بسبب روح القدس کے۔۱۲ منہ

[7] جس دن صور میں پھونکا جاوے گا۔۱۲ منہ

[8] تو کہہ کہ تمہاری روح وہ ملک الموت قبض کرے گا جو تم پر موکل ہے۔۱۲ منہ

[9] جب تم میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو اس کو ہمارے رسول (یعنی فرشتے) قبض کرتے ہیں۔۱۲ منہ

[10] اور جو تو دیکھے کہ جب کافروں کی روح کو فرشتے قبض کریں گے۔۱۲ منہ

[11] اور فرشتے آویں گے ان کے پاس ہر دروازے سے (کہیں گے) تم پر سلام ہو تمہارے صبر کے بدلے۔ پس کیا اچھا ہے آخرت کا گھر۔۱۲ منہ

[12] اس دوزخ پر انیس شخص مقرر ہیں۔۱۲ منہ

[13] اور دوزخ کے محافظ اپنے فرشتے ہی بنائے ہیں۔۱۲ منہ

[14] پکاریں گے اے ملک الموت دے چکے ہم کو تیرا خدا۔۱۲ منہ

رَبُّكَ اور اس کل فریق کا نام زبانیہ ہے قال تعالیٰ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ[1]

(ہفتم) وہ ملائکہ ہیں کہ جو بنی آدم پر موکل و محافظ ہیں۔ قال تعالیٰ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ[2] وقولہ تعالیٰ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ[3] ○ وقولہ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ[4] ○ وقولہ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةًط[5] (ہشتم) وہ ملائکہ ہیں جو آدمی کے اعمال لکھتے ہیں۔ قال تعالیٰ وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○[6]

(نہم) وہ ملائکہ ہیں کہ جو اس عالم کے احوال پر موکل ہیں خدائے پاک کے اس قول میں یہی لوگ مراد ہیں وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا الی قولہ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا[7] وقولہ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا[8] ○ اسی طرح قرآن مجید و احادیثِ صحیحہ میں ملائکہ کے اوصاف مختلف مذکور ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور خدائے تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور رسول ہیں۔ قال تعالیٰ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا[9] وقال تعالیٰ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا[10] منجملہ ان کے یہ کہ وہ عابدین و ساجدین ہیں قال تعالیٰ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ[11] ○ وقال تعالیٰ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ[12] ○ منجملہ ان کے یہ کہ وہ خدا کی نافرمانی نہیں کرسکتے۔ قال اللہ تعالیٰ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ[13] منجملہ ان کے یہ کہ وہ نہایت خائف اور ترسان خدا سے رہتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ وَقَالَ مِنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ[14] منجملہ ان کے یہ کہ وہ خدا کے دوستوں کی مدد کرتے اور مسلح ہو کر لڑتے ہیں جیسا کہ جنگِ بدر میں واقع ہوا۔ قال تعالیٰ یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ[15] منجملہ

---

[1] وہ بلائے اپنی محفل کو ہم بلاتے ہیں زبانیہ کو۔۱۲ منہ

[2] اور اس کے دائیں اور بائیں ایک محافظ بیٹھا ہے۔۱۲ منہ

[3] آدمی کی ہر بات پر ایک سخت نگہبان ہے۔۱۲ منہ

[4] اس کے لیے آگے اور پیچھے سے گماشتے ہیں کہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔۱۲ منہ

[5] اور بھیجتا ہے تم پر محافظ فرشتے۔۱۲ منہ

[6] تم پر (برکت کے فرشتے) محافظ لکھنے والے ہیں تمہارے ہر کام کو جانتے ہیں۔۱۲ منہ

[7] ہم کو قسم ہے ان فرشتوں کی جو آندھی چلاتے ہیں پھر بادل اٹھاتے پھر نرم نرم ہوائیں چلاتے پھر حصے تقسیم کرتے ہیں۔۱۲ منہ

[8] قسم ہے ان فرشتوں کی جو اندر گھس کے روح کھینچتے ہیں۔۱۲ منہ

[9] خدائے تعالیٰ نے فرشتوں کو رسول (یعنی پیغمبر اور واسطہ) بنایا۔۱۲ منہ

[10] خدا تعالیٰ فرشتوں کو اپنی رسالت کے لیے برگزیدہ کرتا ہے۔۱۲ منہ

[11] فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں۔۱۲ منہ

[12] فرشتے اس کی رات دن تسبیح پڑھتے نہیں تھکتے۔۱۲ منہ

[13] فرشتے خدا سے بات کرنے میں پیش قدمی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔۱۲ منہ

[14] ''خدائے برتر سے ڈرتے ہیں اور فرشتے ہمیشہ اس سے ہی ڈرتے ہیں''۔۱۲ منہ

[15] ''تمہارے رب نے تمہاری مدد کی پانچ ہزار فرشتوں سے''۔۱۲ منہ

ان کے یہ ہے کہ ان کے لیے بازو اور پر ہیں قال اللہ تعالیٰ اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ[1] ط الآیہ علاوہ ان آیات کے اور بہت سی آیات فرشتوں کے ایسے حالات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ کوئی ایسی مخلوقِ الٰہی اور قسم کی ہے کہ جو جسم اور افعال میں ہم لوگوں سے بالکل مغائر ہے۔

اب سید احمد خان صاحب ان آیات کی کہاں تک توجیہ کریں گے اور کہاں تک تاویل کر کے اصلی کے معنی بدل کر ان کو قوئی بتلائیں گے۔ قرآن (بلکہ تورات و انجیل و وید و دساتیر) کے ماننے والے سے یہ امر ناممکن ہے کہ وہ فرشتوں کا انکار کرے اور ان کو قوئی بتلاوے۔ ہاں جو شخص ان کتابوں میں سے کسی کا بھی قائل نہ ہو اور حکماءِ قدیم و حال کے بھی برخلاف ہو تو وہ جو چاہے سو کرے۔ سید صاحب یا قرآن کا انکار کیجئے یا فرشتوں کے قائل ہو جائیے۔

سرمد گلۂ اختصار مے باید کرد
یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یا تن برضائے دوست مے باید داد
یا قطع نظر زیار مے باید کرد

ملائکہ کی حقیقت: ملائکہ کی حقیقت[2] میں مختلف اقوال ہیں لیکن اس بات میں سب متفق ہیں کہ ملائکہ ذواتِ موجودہ قائم بذاتِ خود ہیں۔ کسی کی صفت یا عرض نہیں۔ اکثر اہلِ اسلام یہ کہتے ہیں کہ وہ اجسامِ لطیفہ ہیں کہ جو اشکالِ مختلفہ میں ظاہر ہو سکتے اور بڑے قوی کام کر سکتے ہیں کس لیے کہ انبیاء اور دیگر لوگوں نے ان کو مختلف اشکال میں دیکھا ہے۔ جمہور اہلِ کتاب یہود اور سامری[3] اور عیسائی بھی یہی کہتے ہیں اور بعض نصاریٰ کا یہ قول ہے کہ اچھے لوگوں کی ارواح بعد موت کے ملائکہ بن جاتی ہیں۔ یہ قول صحیح نہیں کیونکہ بنی آدم سے پہلے بھی ملائکہ تھے ہاں اگر یہ کہیں کہ ابرار لوگوں کی ارواح بعد مفارقت بدن ان میں جا ملتی ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ حکما کہتے ہیں کہ وہ جواہرِ مجردہ ہیں اور نفوسِ ناطقہ سے مخالف الحقیقت ہیں۔ عالم میں جس قدر تصرفات ہیں انہیں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اور یہ لفظ ملک[4] کہ جس کی جمع ملائکہ آتی ہے مالک سے مقلوب ہوا ہے کہ جو الوکہ بمعنی رسالت سے مشتق ہے کیونکہ فرشتوں پر اس لفظ کا اطلاق اسی لحاظ سے ہے کہ وہ عالم میں وسائط ہیں جن کی لغت میں معنی پوشیدہ کے ہیں اور جس لفظ میں یہ مادہ جیم و نون جمع ہوگا اس میں پوشیدگی و استتار ملحوظ ہوگا۔ اسی لیے جنت کو جنت کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور جنون کو اس لیے جنون کہتے ہیں کہ وہ عقل کو پوشیدہ کر لیتا ہے اور جنین چونکہ ماں کے پیٹ میں پوشیدہ ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ رحم کے بچے پر بولا گیا اور جنان کا اطلاق اس لیے دل پر ہوتا ہے کہ وہ پوشیدہ اور اس کے خیالات مستتر ہوتے ہیں اور ڈھال کو اس لیے جُنّہ بولا گیا کہ وہ اپنی آڑ میں پوشیدہ کرتی ہے۔ اسی طرح لفظ

[1] ''خدا نے فرشتوں کو بازو دار بنایا پھر کسی کے دو دو اور کسی کے تین تین اور کسی کے چار چار بازو ہیں''۔ ۱۲ منہ

[2] یہ مسلم ہے کہ ملائکہ ان سے لطیف تر ہیں۔ اس لیے یہ محال ہے کہ بشر اس کی ماہیت دریافت کرے کہ وہ اپنی ذات میں کیا ہے؟ ۱۲ منہ

[3] ایک فرقہ اہلِ کتاب کا ہے کہ وہ تورات کو مانتا ہے اور یہود سے مخالف اور عیسائیوں سے بھی مخالف ہے۔ ۱۲ منہ

[4] اصل اس لفظ کی ملائک ہے اور اسی کے لحاظ سے ملائکہ جمع ہمزہ کے ساتھ آتی ہے جیسا کہ شمئل کی شمائل آتی ہے اور تاء جمع کے لحاظ سے زائد کر دی ہے بیضاوی۔ ۱۲ منہ

جن اس مخلوقِ الٰہی پر بولا جاتا ہے کہ جو (بسبب لطافتِ مادہ کے) حسِ بصر سے پوشیدہ رہتی ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی مخلوق پر کئی جگہ یہ لفظ بولا گیا ہے قال تعالیٰ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ الآیہ کہ ہم نے جن کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا' اور اسی طرح اور کئی جگہ یہ لفظ آیا پس جن وہ مخلوقِ الٰہی ہے کہ جس کا مادہ غالب آگ[1] یا ہوا ہو اور چونکہ آگ ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہے اس لیے وہ نظر نہیں آتی۔ وہ جو چیزیں اس سے مرکب ہوتی ہیں وہ بھی محسوس نہیں ہوتیں۔ پھر نار کی لطافت اور کثافت کے لحاظ سے (جو بسبب کسی دوسرے جزء کی آمیزش کے ہوتی ہے)۔ جنوں کے چند اقسام ہیں جو خالص نار اور اس کے صاف شعلہ سے مرکب ہیں ان میں اور ملائکۂ ارضیہ میں نہایت مناسبت ہے بلکہ بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کے ملائکہ ہیں اور قرآن میں جو شیطان کو ملائکہ میں شامل کر کے سجدہ کا حکم دیا اور پھر اس کو کَانَ مِنَ الْجِنِّ کہہ دیا اس لیے کہ وہ جن بھی تھا اور فرشتہ بھی تھا کیونکہ ملائکۂ ارضیہ اور جن قسمِ اعلیٰ ایک ہی چیز ہیں۔ پس اسی لحاظ سے کبھی اس کو جن اور کبھی فرشتہ کہا۔ اور جن میں کہ مادہ بخاریہ یا دخانیہ غالب ہے وہ شر کی طرف اکثر مائل ہیں اور ان کے مادّہ صورتِ نوعیہ کے موجب ان سے آثار اور افعال سرزد ہوتے ہیں۔ اسی نظر سے بعض محققین نے جن اور ملائکہ میں عموم اور خصوص میں وجہ قرار دیا ہے۔ پس جن وہ چیز کہ جو اپنے مادۂ متوسطہ (بین اللطافۃ والکثافۃ المحضۃ) کی وجہ سے خیر و شر دونوں چیزوں کے سرزد ہونے کی لیاقت رکھے اور ملک[2] یعنی فرشتہ وہ ہے کہ جو خیر کی صلاحیت رکھے (بسبب لطافتِ مادہ کے) اور بدی اس سے سرزد نہ ہوئے اور شیطان وہ ہے کہ جو بسبب ظلمانیتِ مادہ کے شر ہی کی استعداد رکھے مگر ناریت سب میں غالب ہے۔ اسی لیے ابلیس نے آدم کے مقابلہ میں خدا سے کہا تھا کما حکی اللہ تعالیٰ عنہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ط ۝ ''کہ آپ نے مجھ کو آگ سے اور آدم کو خاک سے بنایا''۔ عرب کے محاورہ میں جنون پر باعتبار اوصاف کے چند الفاظ بولے جاتے تھے جو جن کہ آدمیوں کے ساتھ رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے کہ جن کو ہماری زبان میں ہم زاد کہتے ہیں اور جو کہ لڑکوں بالوں کو ستاتے ہیں ان کو ارواح کہتے تھے کہ جس کو اہلِ ہند بھوت یا آسیب کہتے ہیں اور جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہوتے ہیں ان کو شیطان کہتے ہیں اور جو ان سے بھی زیادہ سرکش ہوتے تھے ان کو مارد کہتے تھے اور جو اس سے بھی بڑے قوی ہوتے ہیں ان کو عفریت کہتے تھے اور جو جنگل میں آواز دیتے اور چیختے ہیں ان کو ہاتف کہتے ہیں اور بعض جو مسافروں کو راہ بھولی بتلا دیتے ہیں ان کو رجال الغیب کہتے ہیں اور جو بیابانوں میں کبھی ایک لشکر اور مشعل وغیرہ سی چیزیں دکھائی دیتی ہیں تو ان کو شہابہ کہتے ہیں اور جو رات میں یا بعض اوقات دن میں اجاڑ جنگلوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھلائی دیتے اور پھر دفعۃً کسی اور شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں الغرض طرح طرح کی صورتیں بدلتے ہیں ان کو چھلاوا کہتے ہیں۔ الغرض ایسی مخلوقات الٰہی کی (کہ جن میں جزءِ ہوائی یا جزءِ ناری غالب ہے اور اس وجہ سے وہ دکھائی نہیں دے سکتیں) ہزارہا اقسام ہیں کہ جن پر مطلع ہونا اسی علیم و خبیر کا کام ہے۔ لیکن اہلِ عقل جو حقیقت میں اس بات پر اکثر متفق ہیں کہ جسم ناری یتشکل باشکال مختلفۃ اسی وجہ سے

[1] اگر کوئی شبہ کرے کہ آگ دکھائی دیتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آگ خالص نہیں بلکہ اس میں آمیزش ہے جس طرح کہ ہوا غبار آلود جس کو آندھی کہتے ہیں نظر آتی ہے خالص نہیں نظر آتی۔ ۱۲ منہ

[2] یہاں ملک سے مراد ملائکۂ سفلیہ ہیں اور اسی لحاظ سے کہ اس قسم کے ملائکہ جن ہیں ان سے کبھی اگر کوئی شر سرزد ہو تو تعجب نہیں جیسا کہ شیطان سے یا ہاروت و ماروت کا قصہ مشہور ہے لیکن ملائکۂ علویہ اس سے بالکل بری ہیں وہ محض تقدیس و تسبیح میں غرق ہیں۔ حقانی

جنوں کا آدمیوں کے ساتھ باتیں کرنا اور کبھی عجائب غرائب حرکات سے پیش آنا مشاہدہ میں آچکا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ کہ جن کی زبان میں قرآن اترا ہے ایسی چیزوں کے قائل تھے اور کبھی ان کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اور کبھی ان کی پرستش کرتے تھے۔ قال تعالیٰ وَجَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ط الآیہ ''کہ کفار نے خدا اور جنوں میں رشتہ قائم کیا'' اور قرآن مجید میں بھی بہت جگہ انسانوں کے مقابلہ میں جنوں کا ذکر ہے۔ سورۂ جن میں ان کا ذکر ہے اور علاوہ اس کے بہت جگہ ذکر ہے قال تعالیٰ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ' قال اللہ تعالیٰ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس ○ وقال تعالیٰ یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ الآیہ

(اب) قبل اس کے کہ منکر کے دلائل کی طرف رجوع کروں پیشتر چند امور ضروری بیان کرتا ہوں:

(۱) یہ کہ قرآن مجید کی بے شمار آیات سے یہ بات صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ کسی کے قوائے بدن نہیں نہ کسی کے اعراض و صفات ہیں بلکہ (۱) متحیز بالذات (۲) اور کلام کرتے اور (۳) چلتے پھرتے اور (۴) ڈرتے اور (۵) عبادت کرتے ہیں بلکہ ان کے لیے (۶) بازو اور پر بھی ہیں اور (۷) وہ آدمیوں سے کلام بھی کرتے ہیں۔ (۸) اور خدا کا عرش[1] بھی اٹھاتے ہیں اور (۹) لوگوں کی ارواح بھی قبض کرتے ہیں اور (۱۰) بعض کفارِ عرب ان کو خدا کی بیٹیاں بھی کہتے تھے۔ کما قال تعالیٰ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا○ بلکہ اسی آیت میں اور اسی کے علاوہ اور آیات میں صاف تصریح ہے کہ (۱۱) وہ عباد الرحمٰن یعنی خدا کی مخلوق بندے ہیں کہ جو ہمیشہ تسبیح و تہلیل کرتے ہیں اور عالم کے ہر جزء پر تدبیر و تصرف کرتے رہتے ہیں۔ یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ وہ قویٰ یا کسی شے کے اوصاف نہیں کیونکہ قویٰ اور اوصاف کا موصوف سے متصل ہو کر چلنا پھرنا' کلام کرنا' مجسم ہو کر ظاہر ہونا' کفار سے مسلح ہو کر جنگ کرنا' صاحبِ بازو ہونا' شب و روز عبادت کرنا' عرش اٹھانا' خدا سے ہر وقت ڈرتے رہنا' قرآن کو لے کر نازل ہونا' جنت و دوزخ کے لوگوں سے کلام کرنا' عرش کے گرداگرد حلقہ باندھ کر کھڑا ہونا' قال تعالیٰ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بشر کی صورت میں آکر کلام کرنا' قال تعالیٰ فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا (مریم کے پاس ہم نے اپنی روح یعنی جبرئیل کو بھیجا تو اس کو خوبصورت بشر کی صورت میں دکھائی دیا) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنا اور پھر لوط کی قوم پر پتھر برسانا اور ان کو غارت کر دینا۔ جیسا کہ سورۂ ہود وغیرہ میں اور تورات سفر خلیقہ میں مذکور ہے وغیر ذلک عقلاً محال ہے اور نقل بھی اسی کی شاہدِ عادل ہے۔

(۲) قومِ جن کا ثبوت بھی قرآن مجید کی آیات سے اس صفت کے ساتھ ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئے ہیں۔

(۳) اور جو آسمانوں میں اڑ کر پہنچتے ہیں کما فی القرآن وَ اِنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا یعنی جن کہتے ہیں کہ ہم نے آسمان جا چھوا تو اس کو بڑے بڑے سخت پاسبانوں سے بھرے ہوئے پایا یعنی ملائکہ سے اور کفار ان کی عجائب حرکات سے ان کی عبادت کرتے تھے کما قال تعالیٰ یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اور مشرکین جنات کے نام کی دہائی دیا کرتے تھے۔ قال تعالیٰ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ اور جن آسمانوں کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سن آیا کرتے تھے قال تعالیٰ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ○ ط یعنی جن

[1] اس کی حقیقت کیا ہے اس کے سمجھنے سے بشر قاصر ہے نہ ظاہر کا انتظار کیا جائے نہ اس اقرار پر احکامات لگانا چاہیے۔ ۱۲ حقانی

کہتے ہیں کہ ہم پہلے آسمانوں کے پاس خبر سننے کے مواضع میں جا بیٹھا کرتے تھے اور اب جو کوئی وہاں جاتا ہے تو اس کے لیے شعلہ آگ کا (جس کو ستارا ٹوٹا کہتے ہیں) گھات لگائے ہوئے ہیں (یعنی اب آسمانی خبریں نہیں لا سکتے اور جو کوئی وہاں جاتا ہے تو اس پر فرشتے انگارے برساتے ہیں۔ پس اب جو کوئی محض لغوی معنی جن پر (کہ جو پوشیدہ ہوتا ہے) خیال کر کے جن کی نوع کا انکار کرے اور کسی پہاڑی قوم جنگل باش کو جو لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہوگی (بقول منشی چراغ علی صاحب) نوعِ جن کا مصداق بنا دے تو وہ ان آیات کا صریح منکر ہے کیونکہ اگر ہم کوئی ایسی قوم بھی فرض کر لیویں جو بقول منشی صاحب و سید صاحب لوگوں سے پوشیدہ رہتی تھی تو عرب کا اس کی عبادت کرنا اور اس سے عقلاء کا دہائی دے کر مدد مانگنا اور پھر اس قوم کا اڑ کر آسمانوں تک جانا اور ان کا برخلاف انسان کے مادۂ آتش سے پیدا ہونا کما قال تعالیٰ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ اور قرآن میں اس قوم سے ہر جگہ انسانوں کے مقابلہ میں خطاب کرنا کما قال مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ وقال تعالیٰ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اور ان کے لیے کوئلہ اور ہڈی[1] کا غذا ہونا (جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت نبی علیہ السلام کے پاس ایک قوم جن کی اسلام لانے اور مسائل سیکھنے آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر جنگل میں گئے اور کہہ دیا یہیں بیٹھے رہنا اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سوائے آوازوں کے اور کچھ محسوس ہوتا تھا اور جنوں نے کہا کہ اپنی امت کو ارشاد فرما دیجئے کہ ہڈی اور کوئلہ سے استنجا نہ کریں کیونکہ یہ ہماری غذا ہے) انسان کی کسی قوم پر صادق نہیں آسکتا کما یشہد بہ العقل والنقل اور اسی طرح انجیل متی و لوقا وغیرہما میں بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کئی آدمیوں میں سے جن نکالا اور اس جن نے نکلتے وقت کلام کیا اور اب بھی ایسے واقعات اکثر مشاہدہ میں آتے ہیں بلکہ ایک شخص جنوں کے بڑے عامل تھے بہت سے لوگوں کے روبرو انہوں نے عجائب غرائب باتیں دکھائیں کہ جو شعبدہ اور نیرنجات سے غیر تھیں اور میرے ایک دوست کے ساتھ جن کا عجیب ماجرا گذرا ہے کہ جس کے سننے سے حیرت ہوتی ہے۔

(۳) **تحقیقِ شیطان:** شیطان کے لغت میں معنی باطل کے ہیں۔ بعض علماءِ لغت کہتے ہیں کہ نون اس کا اصلی ہے پس شیطان بوزن فیعال شطن سے مشتق ہے کہ جس کے معنی دور از صلاح و خیر ہیں۔ بس جو شخص خیر و صلاح سے دور ہوا اس کو بھی شیطان کہتے ہیں اور بعضے کہتے ہیں کہ نون زائد ہے شاط معنی بطل سے مشتق ہے جس کے معنی باطل کے ہیں بہرحال بد شخص کو شیطان کہتے ہیں اس لحاظ سے اس کا اطلاق انسانوں میں سے بدکاروں پر بھی ہوتا ہے کما قال تعالیٰ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ اور اسی طرح ابلیس بھی بلس سے مشتق ہے (کہ جس کے معنی ناامید یا مکار) کے ہیں ہر مکار پر بولا جاتا ہے خواہ وہ انسان ہو خواہ کوئی اور۔ لیکن اب کلام اس میں ہے کہ جس پر یہ لفظ ابلیس اور شیطان قرآن میں جا بجا بولا گیا ہے آیا وہ کوئی آدمی ہے یا آدمی کی قوتِ بہیمیہ اور نفسِ امارہ ہے یا کوئی اور شخص مخالف الحقیقت ہے؟ جمہور اہلِ اسلام اس کے قائل ہیں کہ وہ ایک شخصِ خاص از قسم جن ہے کہ جس نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں نافرمانی کی اور راندہ گیا۔ اہلِ کتاب یہود و عیسائی بلکہ مجوسی اس

[1] یہاں ایک مشکل ہے کہ کوئلہ یا ہڈی اجنا کی غذا ہونے پر ایک اعتراض واقع آتا ہے کہ جسم غیر مرئی کی غذا مرئی کیسے ہوسکتی ہے؟ اور اگر مان بھی لیا جائے تو چاہیے کہ دنیا پر ہڈی کا وجود نہ رہے نہ کہیں کول فیلڈ رہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امکان ہے کہ ان میں سے کوئی ایسی لطیف گیس ان کی غذا ہو جو غیر مرئی ہو اب درست ہو جائے گا کہ غیر مرئی کی غذا غیر مرئی ہوئی۔ ۱۲ حقانی

کا ایک وجودِ جداگانہ مانتے ہیں چنانچہ انجیل متی کے چوتھے باب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان سے آزمایا جانا لکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ تو عیسائی لوگ اس شیطان سے کوئی آدمی مراد رکھتے ہیں نہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوتِ بہیمیہ یا نفسِ امارہ۔ اور اسی طرح تورات سفر خلیقہ میں بھی ہے کہ سانپ نے حوا کو بہکا کر وہ درخت کھلوا دیا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ شیطان ہی تھا کہ جو سانپ کی صورت میں ظاہر ہوا تھا ورنہ سانپ کیا بہکاتا؟ اور اسی طرح دساتیر میں ہر جملہ کے اول اعوذ باللہ کا ترجمہ (یعنی پناہ مانگتے ہیں ہم دیو گمراہ کرنے والے سے) لکھ رکھا ہے کہ جس سے یہی مدعا سمجھا جاتا ہے اور قرآن مجید کی تو بہت سی آیات سے یہ ثابت ہے کہ وہ نہ آدمی ہے نہ آدمی کی قوتِ بہیمیہ یا نفسِ امارہ بلکہ وہ ایک چیز جداگانہ مخلوق مادۂ ناری سے ہے کہ جس کا نام مشہور عزازیل ہے۔ ازانجملہ یہ آیت ہے ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ترجمہ ”جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ (تعظیم) کرو تو سب نے کیا مگر ایک ابلیس نے نہ کیا خدا نے اس سے کہا کہ جب ہم نے تجھ کو حکم کیا تو تو نے کیوں نہ سجدہ کیا۔ بولا میں آدم سے کہیں بہتر ہوں تو نے اس کو خاک سے مجھ کو آگ سے بنایا۔“ اس آیت سے صاف ظاہر ہوا کہ اس کا مادہ ناری ہے اور نار چونکہ لطیف ہے اس لیے وہ محسوس بحسِ بصر نہیں ہو سکتا کما قال تعالیٰ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ○ الآیہ ”کہ وہ شیطان اور اس کی ذریت تم کو دیکھتی ہے اور تم کو وہ نظر نہیں آتے“ اور اسی لیے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب تم بیت الخلاء میں جایا کرو تو یہ کہہ لیا کرو اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ کیونکہ شیاطین بنی آدم کو ننگا دیکھتے ہیں رواہ الترمذی۔ ازانجملہ یہ آیت ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ الآیۃ ”کہ شیطان قومِ جن سے تھا“ اور جن کی پیدائش آگ سے ہے کما قال تعالیٰ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ○ (سید صاحب کہتے ہیں کہ شیطان قوتِ بہیمیہ یا نفسِ امارہ کے سوائے اور کوئی چیز نہیں ان کے اس خیال کے غلط کرنے کے لیے تو یہی آیات کافی ہیں کیونکہ قوتِ بہیمیہ آدمی کی ایک صفت ہے اس کا سجدہ سے انکار کرنا اور مادۂ آتشی سے پیدا ہونا اور اس کا جن کی قوم سے ہونا اور اس کا اور اس کی ذریت کا بنی آدم کو دیکھنا پھر اس کا سوال و جواب کرنا اور اپنے آپ کو آدم سے بہتر بتلانا اور وجہ امتیاز کی یہ بیان کرنا کہ میرا مادہ آتش اور آدم کا مادہ خاک ہے اور پھر اس کا جنت سے نکالا جانا اور اپنے لیے دعا کرنا کہ مجھ کو حشر تک زندہ رکھ کہ آدم کی اولاد کو بہکا کر اپنا دل ٹھنڈا کروں اور پھر خدا کا اس کو اور اس کے متبعین کو جہنم میں ڈالنا قوتِ بہیمیہ پر ہرگز صادق نہیں آتا اور کوئی تاویل ہو نہیں سکتی۔ ہاں اگر ہنود کے طرز کو اختیار کر لے اور جس طرح وہ برہما' بشن' مہادیو کو خدا کی تین صفات کہتے ہیں اور پھر ان کو مجسم ہو کر جداگانہ متحیز بالذات اور کھاتا پیتا' جماع کرتا بھی مانتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ گنگا جمنا کو عورت بھی کہتے ہیں اور دیبی بتلاتے ہیں پھر دریا بھی سمجھتے ہیں یا عیسائی طور کو پسند کر لے کہ باپ خدا' بیٹا خدا' روح القدس خدا' پھر ایک خدا۔ الغرض جو ایسے ایسے محالاتِ عقلیہ کا قائل ہو جائے تو پھر اس سے ہمارا کلام نہیں وہ جو دل چاہے سو کہے۔ ازانجملہ یہ آیت ہے قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ یعنی اتر جنت سے تجھ کو یہاں رہ کر تکبر کرنا شایاں نہیں نکل یہاں سے او ذلیل و خوار۔ ازانجملہ یہ ہے قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ شیطان نے عرض کیا کہ الٰہی مجھ کو قیامت تک زندہ رکھ جواب آیا کہ جا تجھ کو ایک وقتِ معین تک مہلت ہے قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ

صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ یعنی ”شیطان نے کہا کہ تو نے مجھ کو گمراہ تو کیا ہی ہے میں بھی آدم کی اولاد کو تیری سیدھی راہ سے بہکاؤں گا۔“ ازانجملہ یہ ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ کہ میں بھی تجھ سے اور تیرے سب پیروؤں سے جہنم ہی بھر دوں گا۔ سید صاحب فرمائیے اگر شیطان آدم کی قوتِ بہیمیہ تھی تو وہ آدم کا وصف تھا پھر اس نے کیا سمجھ کر کہہ دیا کہ میرا مادہ آتش ہے؟ اچھا اس نے کہا تھا خداءِ پاک نے کیوں اس کو جن کہا اور مادۂ آتشی اس کی اصل قرار دیا؟ پھر آپ فرماتے ہیں کہ ”فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور شیطان کا نہ کرنا ایک معما ہے کہ جس کے یہ معنی کہ قوائے ملکیہ نے آدم کی اطاعت کی اور بہیمیہ نے نہ کی۔ الخ“ اے جناب یہ اجتماع الضدین نہیں تو اور کیا ہے کیونکہ جب آپ نے ملائکہ سے مراد قوائے ملکیہ لی اور ان کو آدم کے لیے مسخر بنایا تو اب آدم کی قوتِ بہیمیہ کیا سرکشی کر سکتی ہے؟ اور اگر قوتِ بہیمیہ نے سرکشی کی کہ جس کو آپ شیطان کہتے ہیں (حالانکہ یہ خلاف ہے اس آیت کے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ کیونکہ اس آیت کے حسبِ قرارداد آپ کے معنی ہوئے کہ خدا کے بندوں پر قوتِ بہیمیہ غالب نہیں آتی) تو پھر قوتِ ملکیہ کی اطاعت چہ معنی دارد۔

خرابی میں پڑا ہے سینے والا جیب و داماں کا
جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا جو وہ ادھڑا تو یہ ٹانکا

پھر وہ قوتِ بہیمیہ جہنم میں کیوں کر جائے گی اور وہ جنت سے کیونکر نکالی گئی؟ الغرض، قافیہ تنگ ہے۔

(۴) امرِ چہارم: جس کلام کے جب تک حقیقی معنی مراد ہو سکیں ان کو چھوڑ کر مجازی معنی مراد لینا عقل و نقل کے خلاف ہے کیونکہ اس تقدیر پر نہ تو شارع کے کلام سے کوئی مدعا ثابت ہو سکے گا اور نہ کسی کی بات چیت کسی کو کچھ فائدہ بخش سکے گی ایک اندھیر مچ جائے گا مثلاً کسی نے کہہ دیا کہ ان کی مراد آگ ہے بعلاقۂ ضدیت یا کسی نے حکم دیا کہ اس کو قصاص میں قتل کرو۔ اس نے کہہ دیا کہ یہ مراد ہے کہ مجھ کو ملامت کر کے چھوڑ دو کیونکہ ملامت کرنا بھی ایک قسم کا قتل کرنا ہے یا کسی نے کہا کہ زید بلباسِ فاخرہ کل ہمارے پاس آیا تھا ہم اس کے گواہ ہیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ کلام مقصودی نہ تھا بلکہ مخالف کے خیال کے موافق یوں ہی کہہ دیا۔ بہر طور دنیا میں انتظام نہ رہے۔ پس ان خرابیوں کے دفع کرنے کے لیے اہلِ عقل نے یہ بات مقرر کر دی کہ ہر کلام کو اس کے ظاہری معنی سے بدل کر مجازِ مرسل یا استعارہ یا کلام غیر مقصودی جب کہیں گے کہ اس کے اصلی معنی درست نہ ہو سکیں اور کوئی مجازی معنی کے لیے قرینہ بھی ہو کہ جو اصلی معنی کو قائم ہونے سے منع کرے مثلاً شیر کے اصلی معنی وہ جنگلی درندہ ہے ہم اس کے معنی بہادر جب قرار دیں گے جب کوئی قرینہ ہو گا مثلاً یوں کہیں کہ شیر لکھ رہا ہے اب لکھنا قرینہ ہے کہ یہاں شیر سے مراد بہادر آدمی ہے کیونکہ جنگلی درندہ سے لکھنا متصور نہیں۔ ان باتوں کی زیادہ تشریح علمِ معانی و بیان میں ہے۔ اس سے زیادہ کی یہاں گنجائش نہیں فمن شاء فلیرجع الیہا۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ جہاں کہیں سید صاحب قرآن کے معنی متعارف چھوڑ کر برخلافِ سلف و خلف الگ راہ چلے ہیں اور دل کھول کر کلامِ الٰہی میں اپنے آزادانہ خیالات کو دخل دیتے ہیں وہاں کیا قرینہ ہے اور کون سا امر ہے جو معنی متعارف کو (کہ جس کو پیغمبر علیہ السلام کی ہم زمان و ہم زبان سمجھتے آئے ہیں) صحیح نہیں ہونے دیتا؟ اور کون سی مشکل سید صاحبؒ کو پیش آئی جس نے نہ تنہا جمہور اہلِ اسلام بلکہ کل اہلِ ادیان یہود و عیسائیوں کے مخالف ہو کر ملائکہ اور جن اور شیطان کے معنی میں

یہاں تک تغیر کیا کہ سرے سے کلام ہی کو الٹ پلٹ کر دیا۔ جس طرح کسی صوفی نے کافیہ کی ایسی شرح لکھی کہ اس کو کچھ اور ہی کر دیا۔ یا کسی نے مولانا روم کے اس شعر کے معنی بیان کئے۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند
وز جدائی ہا شکایت میکند

کہ سری مہاراج بشنو کہ جس کو بشن بھی کہتے ہیں یعنی بنسری سے کتھا کہتے ہیں اور لوگوں کو اپنے سے جدا جدا رہنے کی شکایت کرتے تھے: اسی طرح ایک مداری فقیر نے میرے روبرو ایک روز اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ کے یہ معنی بیان کئے کہ بی بی امنت کا ایک بلا تھا وہ اس کی ملائی کھا گیا اس نے اس کو کتوں سے پکڑوا دیا۔ اور رسیوں سے باندھا العیاذ باللہ۔ حضرت سلامت یوں تو قرآن کو آج تک کچھ کا کچھ بدل دیا ہوتا اگر علماء اس کی محافظت نہ کرتے۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں ایک صوفی نے اس قصہ کو نفس اور روح پر ایسا چسپاں کیا ہے کہ شاید و باید۔ پھر اس سے کوئی یوں کہہ سکتا ہے کہ دراصل یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کوئی شخص نہ تھے بلکہ یہی دو نفس اور روح مراد ہیں؟

(۵) امرِ پنجم: کبھی بطور استعارہ کے ایک چیز بول کر دوسری چیز مراد لیا کرتے ہیں اور یہ بات کچھ اہلِ اسلام اور عرب ہی کی زبان پر منحصر نہیں بلکہ ہر زبان میں یہ بات پائی جاتی ہے کبھی چاند بولتے ہیں اور اس سے کوئی حسین صورت مراد رکھتے ہیں۔ اور مصری اور شہد سے کلامِ شیریں مراد لیتے ہیں۔ البتہ مشبہ بہ ذکر کرتے ہیں اور مشبہ اس کے قرائن کی وجہ سے مراد رکھتے ہیں مگر اس سے کوئی ذی عقل یہ مراد نہیں لے سکتا کہ یہاں وہ دونوں متحد ہیں یا مشبہ بہ کا وجود ہی نہیں۔ اسی طرح عرفاء و عقلاء انسان کی عمدہ چیزوں یعنی ملکوتیہ کو یا خود اس انسان عمدہ کو ملائکہ سے تشبیہ دیا کرتے اور مشبہ کو ذکر نہیں کرتے بلکہ مبالغہ کے لیے صرف مشبہ بہ کو ذکر کرتے ہیں مگر مراد مشبہ ہی رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی کو کہیں کہ فرشتہ بیٹھا ہے تو دراصل مراد وہ شخصِ خاص ہے نہ یہ کہ فرشتہ کا کوئی وجود نہیں یہی فرشتہ ہے اور اسی طرح قوائے بہیمیہ کو یا نفسِ امارہ کو اور کبھی کسی خراب آدمی کو شیطان سے تشبیہ دیتے ہیں اور قرائنِ صارفہ کے ذریعہ سے مراد وہ مشبہ لیتے ہیں اب جو کسی نے شیطان بول کر قوتِ بہیمیہ یا نفسِ امارہ مراد لیا ہے کہ یہ شیطان کا مصداق یہی قوتِ بہیمیہ یا نفسِ امارہ ہے اور دراصل شیطان کوئی وجود جدا گانہ نہیں رکھتا؟ لیکن سید صاحب اس نکتہ سے واقف نہیں انہوں نے یہی سمجھ لیا کہ انہیں قوائے ملکوتیہ و بہیمیہ کو ملائکہ اور شیطان کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ نہ وہ اس نکتہ کو سمجھے نہ قرائن پر نظر کی نہ اور آیات کو دیکھا جہاں مشبہ بہ کا جدا گانہ وجود مذکور ہے۔ سچ ہے انسان اپنے خیال میں ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ پھر اور کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ حبك الشیء شئی یعمی ویصم۔

تنبیہ: افراط و تفریط سے کمتر انسان محفوظ رہتے ہیں۔ پس کبھی قوتِ وہمیہ اس قدر پست ہوتی ہے کہ احکام عقل صرف کو قابل العمل نہیں رہنے دیتی۔ اسی لیے کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہمی لوگ جن و ملائکہ اپنی وہمی باتوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔ صدہا عورات بلکہ بہت سے سادہ آدمی اپنی قوتِ وہمیہ کے زور سے کسی شے کو جن و بھوت فرض کر لیتے ہیں پھر اس کے موجب اس کا اثر متوہم ہوتا ہے اور دراصل سوائے ان کے وہم کے اور کچھ نہیں ہوتا اور کبھی اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہمی لوگ ان امور کو بے اصل سمجھ کر یہاں تک وہم کے گھوڑے دوڑاتے ہیں کہ درحقیقت ان چیزوں کا صفحۂ عالم پر وجود ہی نہیں سمجھتے اور جو چیز محسوس

نہ ہو اس کو لاشے محض کہتے ہیں۔ پھر اس خیال کو جو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے تو جو چیزیں ان کے نزدیک اسبابِ ظاہرہ پر مبنی نہ ہوں سب غلط ہو جاتی ہیں۔ نہ پھر وہ اثرِ دعاء کے قائل رہتے ہیں اور نہ کبھی کسی نبی یا ولی کے اعجاز یا کرامت کو حق مانتے ہیں نہ جن و ملائکہ و شیطان کے جداگانہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں' نہ وہ خدائے قدیر کی بے انتہا قدرتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس سے بھی نمبر بڑھ جاتا ہے تو وہ کوچۂ الحاد کی سیر کرتے ہیں۔ پھر نہ خدا کے قائل نہ رسول کے مقر۔ چنانچہ آج کل یورپ میں ان خیالات کے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ چند روز کا ذکر ہے کہ لندن میں ایک شخص سے پارلیمنٹ میں داخل کرتے وقت حلف حسبِ دستور لینا چاہا۔ اس نے کہا خدا کوئی چیز نہیں۔ الغرض یہ مقدمہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ بہت سے لوگ اس کی رائے کے موافق نکلے۔ بہت سے دہریے لوگ یہی کہتے ہیں کہ نہ کوئی خدا نہ کوئی رسول' کوئی چیز حلال نہ حرام' نہ قیامت نہ آخرت کی کچھ جزاء و سزا۔

پس ہر زمانہ کے اہلِ عقل نے کہ جس کو پیغمبر کہتے ہیں ایک فرضی جزاء و سزا قرار دی ہے اور اس وقت کی مناسب چیزوں کو فرض کیا اور فرضی جنت کا وعدہ دیا اور اس وقت کی نامناسب چیزوں کو حرام کیا اور اس فرضی دوزخ اور سزا سے ڈرایا۔ کم عقل ان باتوں کو خدا کی باتیں سمجھتے ہیں اور بعض لوگ رسالت کا کوئی بڑا بھاری رتبہ فرض کرتے ہیں کہ پھر اس کا مثل کسی کو نہیں مانتے اور بعض اس رسالت کو ایک شخص پر ختم کر دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ خیالاتِ فاسدہ ہیں کیونکہ نبی وہ ریفارمر ہے جو اپنی قوم کی ترقی اور خیرخواہی اور بھلائی کی فکر کرے نہ اس کے لیے کوئی معجزہ شرط ہے اور نہ معجزہ ممکن ہے بلکہ جس میں یہ ملکہ ہو وہی نبی ہے اور اسی کے خیالات کا زور و شور اس کا الہام ہے اور وہ خیالی صورتیں جیسا کہ مجنونوں کو نظر آتی ہیں اس کا جبرئیل اور ملائکہ اور رجال الغیب ہیں۔ پھر یہ نبوت کسی پر ختم نہیں۔ ہر زمانہ میں ہر ملک' ہر شہر' ہر قوم میں ایک نبی ہے وہ جن باتوں کو حسبِ زمانہ بہتر بتلاوے وہ فرض ہیں اور جن کو نامناسب سمجھ کر منع کرے وہ حرام ہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے واجبات اور محرمات کے احکام الگ ہیں۔ جو احکام نیچر کے موافق ہیں وہ فرض ہیں ورنہ حرام ہیں۔ انتہٰی۔ العیاذ باللہ من ہذہ الکفریات۔

الغرض یہ سب باتیں اسی قوتِ وہمیہ کی بدولت ہیں اور میں اس وقت بلاتعصب کہتا ہوں کہ سید صاحب بہادر اور ان کی ذریات کے خیالات ایسے ہی ہیں چنانچہ ان کی تصانیف بالخصوص اس تفسیر میں صراحۃً مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس مرض سے شفاء عطا فرمائے اور ان خیالات کے نتیجہ (ابدی جہنم) سے بچاوے۔

جواب سید احمد خان صاحب کے دلائل کا: اب میں سید صاحب کے دلائل کو دیکھتا ہوں کہ جن کے اعتماد پر حضرت نے ضروریاتِ دین کا انکار کیا ہے کہ وہ کیسے ہیں؟ سردست تو ملائکہ و شیطان کی بابت جو کچھ آپ نے فرمایا ہے ہم اس کو دیکھتے ہیں اور آئندہ جہاں جہاں آپ نے اپنے وطیرہ کے موافق یہ انکار یا تاویل (جو بمنزلۂ انکار ہے) کی ہے اس کو بھی دیکھیں گے۔

قولہ صفحہ ۱۴۰ جبرئیل و میکائیل یہودیوں نے فرشتوں کے لیے مقرر کئے تھے اور ان کے ہاں سات فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں مگر اس کا ثبوت نہیں کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفت

انبیاء میں کوئی صفت صفاتِ باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا الخ‘‘ اقول: دیکھئے کتاب دانیال ۸ باب میں یوں ہے۔ ایک آواز آئی کہ اے جبرئیل اس شخص کو اس رویاء کا مطلب سمجھا دے انتہی۔ اگر دانیال آپ کے نزدیک نبی نہیں ہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ دانیال پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جبرئیل کا نام صاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح انجیل باب ۱۹ میں یوں ہے۔ فرشتے نے خواب میں اس سے کہا میں جبرئیل ہوں جو خدا کے حضور حاضر رہتا ہوں۔ انتہیٰ

دوم آپ کا یہ فرمانا کہ صحفِ انبیاء الخ دعویٰ بلا دلیل ہے وہ کون سا صحیفہ ہے کہ جس میں جبرئیل و میکائیل کو صفتِ باری لکھا ہے ذرا اس کا تو حوالہ دیجئے۔

سوم یہ قول آپ کا کہ رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔ آپ کے ہی لیے مضر ہے کیونکہ جب بقول آپ کے فرشتہ کوئی جداگانہ وجود ہی نہیں رکھتا تو پھر ان اہلِ کتاب یہود نے کس شے کا نام فرشتہ رکھا تھا؟

چہارم اگر بالفرض اس صفت کو فرشتے کا نام مقرر کر لیا تھا تو اس سے فرشتے کے وجودِ جداگانہ کی نفی کیونکر سمجھی گئی؟ غایۃ الامر یہ بات کہ وہ نام منقول ہوگا کسائر الاسماء المنقولۃ مثلاً ریل کسی شخص کا نام رکھا جاوے تو یہ نہ لازم آئے گا کہ سوا اس کے ریل گاڑی کا وجود نہ ہو۔ قولہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اسی طرح پر ہوا ہے کہ جس طرح یہودی خیال کرتے تھے۔ اقول پس جب قرآن مجید میں لفظ ملائکہ کا انہی معنی میں استعمال ہوا کہ جن معنی میں یہودی استعمال کرتے تھے تو الحمدللہ آپ ہی کے اقرار سے فرشتوں کا وجودِ جداگانہ قرآن سے ثابت ہوگیا کیونکہ بقول آپ کے یہودی فرشتوں کا جداگانہ وجود اہلِ اسلام کے عقیدہ کے موافق سمجھتے تھے۔ اب آپ کا اس معنی سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے۔ ہمارے لیے تو اسی قدر کافی ہے کہ قرآن میں لفظ ملائکہ انہیں معنی پر وارد ہے کہ جس کو اہلِ اسلام اور یہود مسلّم رکھتے ہیں۔ اب یہ آپ کو اختیار ہے آپ قرآن کو صحیح مانیں یا یہود کی تقلید کریں جیسا کہ آپ اس قول میں فرماتے ہیں۔

قولہ مگر ہمارے ہاں کے علماء نے بھی یہودیوں کی تقلید سے ان کو فرشتوں کے نام قرار دیے ہیں الخ‘‘

اقول سید صاحب یہ پردے کی بات اچھی نہیں۔ علماء بے چاروں کو یہود کے مقلد کیوں کہتے ہو۔ منزل قرآن ہی کو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ جس نے اپنے قرآن میں ان الفاظ کو یہود کے استعمال اور خیال کے موافق استعمال کیا۔

قولہ (جبرئیل) عبری میں اس کے معنی قوت اللہ یا قدرت اللہ کے ہیں یہ لفظ دانیال پیغمبر کی کتاب میں آیا ہے الخ لوقاء نے جو انجیل لکھی ہے اس کے پہلے باب میں جبرئیل کا ذکر ہے۔

اقول اس سہو و نسیان کا کیا ٹھکانا ہے۔ ابھی ابھی تو آپ فرما چکے ہیں کہ اس کا ثبوت نہیں کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں۔ آپ کو لازم تھا کہ اس پیرانہ سالی میں کہ انسان کے حواس بجا نہیں رہتے اس بڑی بھاری بات کا بیڑا نہ اٹھاتے کہ تیرہ سو برس کے بعد میں ہی تو ایک ہوں کہ جو قرآن کے اصلی معنی سمجھا ہوں اور سب اگلے پچھلے غیر محقق تھے۔

قولہ ص ۱۴۱ علماءِ یہود یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جبرئیل بڑے زباں داں ہیں الخ غالباً اسی سبب سے مسلمانوں نے تصور کیا

ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیتیں خدا سے سن کر یاد کرتے تھے اور آنحضرت کو آ کر سناتے تھے۔

اقول مسلمان بے چاروں نے کیا خود خدا نے یہ فرمایا ہے کہ جبرئیل وحی لاتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ عَلَّمَهٗ شَدِ[...] الْقُوٰی وقال نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ پھر یہ تقلیدِ یہود کی بدگمانی آپ خدائے پاک پر کریں آپ کو اختیار ہے۔ مگر اس ق[...] عرض باقی ہے کہ جب قرآن مجید بلکہ اس کا منزل آپ کے نزدیک ایسا لچر ٹھیرا کہ جس نے ایک غلط امر میں یہودیوں [...] تقلید کی پھر اس کی تفسیر لکھنا اور اس کو کلامِ الٰہی لکھنا اور بے دیکھے خدا کا قائل ہونا محض بے فائدہ ہے۔

قولہ میکائل کے معنی عبری میں من کاللہ کے ہیں۔ دانیال کی کتاب میں اور ان کے خوابوں میں یہ لفظ آیا ہے [...] مشاہداتِ یوحنا میں بھی یہ لفظ آیا ہے الخ۔

اقول باوجود اس اقرار کے کہ انبیاءِ سابقین ان الفاظ کو انہیں معانی پر استعمال کرتے ہیں پھر انکار کی کیا وجہ؟

قولہ بہرحال ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ الفاظ صفاتِ باری پر مستعمل تھے آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے [...] الخ۔

اقول کاش آپ ایک آدھ جگہ بھی قرآن مجید یا تورات و انجیل سے ان الفاظ کا جو فرشتوں پر بولے جاتے ہیں صفا[...] باری پر استعمال ہونا ثابت کر دیتے تب تو کسی قدر آپ کا یہ بہرحال کہنا اور شک نہ کرنا کچھ اعتبار رکھتا مگر جبکہ آپ نے خود ا[...] کے برعکس ثابت کیا پھر اس پر یہ تفریع کرنا بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی شخص زید کے بالفعل موجود ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ دلیل بیا[...] کر کے کہ زید بیمار تھا اور اس کی بیماری تمام شہر میں مشہور تھی آخر وہ مر گیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس کو دفنایا انہوں نے ہم [...] بیان کیا پھر اس پر یہ نتیجہ قائم کرے۔ بہرحال ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ زید بالفعل زندہ موجود ہمارے سامنے بیٹھا [...] اور اس کا کوئی ہمسایہ مر گیا ہوگا۔ سید صاحب آپ نے تو نفیِ وجودِ ملائکہ میں بڑی معقول صرف کر دی۔ ذرا فرمایئے تو سہی [...] یہ کون سی برہان ہے جو آپ نے قائم کی آیا انی یا لمی؟ اور آپ جو صفاتِ باری پر ان الفاظ کا مستعمل ہونا فرمائے چلے جا[...] ہیں وہ آپ کو حضرت شیخ محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے مغالطہ پڑ گیا۔ ذرا آگے چلیے ہم آپ کو وہ مقام بھی سمجھا[...] دیتے ہیں۔ اس لیے شیخ نے فرمایا تھا کہ ہر شخص میری کتاب کو نہ دیکھے اس کے مطالب پر مطلع ہونا ہر کسی کا کام نہیں اس مقا[...] پر جبرئیل و میکائیل بلکہ جملہ ملائکہ کے وجودِ جداگانہ کی نفی پر آپ نے دلیل قائم کی وہ قطع نظر اس کے مقدمات کے یہ کہ ہم [...] کچھ شک نہیں کہ جو الفاظ صفاتِ باری پر مستعمل تھے آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔ الخ

اقول یہ تو آپ کا دعویٰ ہے اگر یہی دلیل ہے تو مصادرہ علی المطلوب لازم آوے گا جو عقلاء کے نزدیک بالاتفاق مرد[...] ہے۔

قولہ مگر جبرئیل و میکائیل آیت قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُ[...] لِّلْكٰفِرِيْنَ میں حکایتاً نام ہونے سے ان کو ایسے واقعی پر جیسا کہ یہود نے اور ان کی پیروی سے مسلمانوں نے تصور کیا [...] استدلال نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ہم فرشتوں کی بحث کے بعد اس کو بیان کریں گے۔

اقول اس بے اصل گفتگو کا ابھی غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ مگر بڑی خیر گزری کہ آپ نے جس طرح فرشتوں کے وجو[...]

کا انکار (ان کا حکایتاً نام آنے کی وجہ سے) کر دیا خدا کا نہ کر دیا ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ کچھ عجب نہیں کہ آپ کی ذریت میں سے کوئی کوٹ پتلون پوش جنٹلمین خدا کا نام بھی یہاں حکایتاً بیان کر کے اس کے وجودِ حقیقی کی نفی کر دے اور شاید اس وقت اس کے وجودِ حقیقی کی نفی یوں نہ کی گئی کہ اگر خدا نہیں تو اس کے رسول کہاں؟ اور جب رسالت کوئی چیز نہیں تب اس تدبیر سے کہ رسول سے معجزات تو ممکن ہی نہیں پھر ہر شخص پکا دنیا دار' شراب نوش' چرب زبان کہ جس میں لوہار بڑھئی کے کام کی مانند ملکۂ چرب زبانی (یعنی رفارمری) ہو پیغمبر ہو جاوے اور اپنی امت جدا بناوے کہ جس پیغمبر کا مصداق بقول سید احمد خاں صاحب بابو کشیب چندر اور دیانند سرستی اور خود سید صاحب ہیں (اور من بعدان کے اور بھی ان کے جانشین ہوں گے) ممکن نہ ہوگا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ سید صاحب بحثِ ملائکہ میں اپنے وعدہ کو کیسا پورا کرتے ہیں:

قولہ ص ۱۴۲ فرشتوں کی نسبت بھی جو بحث ہے وہ نہایت ہی غور طلب ہے''۔

اقول اس میں کیا شک ہے بہت سے لوگ پہلے بھی انکار کر چکے ہیں کماسیاتی۔ ذرا آپ بھی سنبھل کے قدم رکھئے گا۔

قولہ قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر آیا ہے اور اس لیے ہر ایک مسلمان کو جو قرآن پر یقین رکھتا ہے فرشتوں کے موجود اور ان کے مخلوق ہونے پر یقین کرنا ضروری ہے۔

اقول پھر کیا وجہ کہ آپ باوجود ادعاءِ ایمان کے فرشتوں کو موجود اور مخلوق نہیں مانتے یہاں سے ثابت ہوا کہ آپ نہ مسلمان ہیں نہ قرآن پر یقین رکھتے ہیں کہ جو فرشتوں کو موجود اور مخلوق نہیں کہتے۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ میں موجود اور مخلوق کہتا ہوں مگر ان کی حقیقت میں بحث کرتا ہوں کما قلت۔

قولہ جہاں تک بحث ہے اس پر بحث ہے کہ وہ کیسی مخلوق ہے الخ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ فرما چکے کہ ملائکہ خدا کی صفات ہیں تو اب ان کا موجود و مخلوق ہونا کہاں؟ کیونکہ خدا کی صفات بقول اکثر عین ذات ہیں اور اگر لاعین ولا غیر بھی ہوں تو ان کو مخلوق اور حادث کوئی نہیں کہہ سکتا اور آپ بھی صفاتِ باری کو مخلوق اور حادث نہیں کہتے بلکہ آپ تو عین ذات کہتے ہیں۔ پھر جب آپ نے ان کو صفاتِ باری کہا تو بلاشک ان کے مخلوق ہونے کا انکار کیا۔

اب آپ کو اختیار ہے خواہ مسلمان قرآن پر یقین رکھنے والے ہو جایئے یا فرشتوں کے موجود اور مخلوق ہونے سے انکار کیجئے۔

قولہ عام خیال مسلمانوں کا اور علماءِ اسلام کا یہ ہے کہ جس طرح انسان و حیوان جسم و صورت و شکل رکھتے ہیں اسی طرح وہ بھی الخ اور ان کے پر بھی ہیں جن سے وہ اڑ کر آسمان پر جاتے اور زمین پر اترتے اور خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں الخ۔

اقول یہ خیال اہلِ اسلام کا صحیح اور قرآن کے مطابق ہے بلکہ جو قرآن پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے اس خیال کا پابند ہونا ضروری ہے جیسا کہ آپ بھی ابھی فرما چکے ہیں مگر آپ کو کیا دشواری پیش آئی جو آپ زمرۂ اہلِ اسلام سے خارج ہو گئے اور قرآن کا انکار کر بیٹھے۔ قولہ ہمارے پاس کسی ایسی مخلوق کے ہونے سے جو کسی قسم کا جسم و صورت بھی رکھتی ہو جو ہم کو دکھائی

نہ دیتی ہو (جیسا کہ ملائکہ) انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ایسی مخلوق کے ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔

اقول ثابت ہوا کہ جو آپ انکار کرتے ہیں تو محض بلا دلیل کرتے ہیں۔

قولہ کیونکہ ان باتوں کے اثبات کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں قرآن مجید سے فرشتوں کے اس قسم کے وجود اور ان کے اس قسم کے جسم کا اور ان کے ان افعال کا جن کا ذکر اوپر ہوا کچھ ثبوت نہیں۔ اقول وہ دلائلِ عقلیہ جو ہم نے بیان کئے اور الٰہیات میں حکماء نے بیان کئے آپ کو کیوں نہ معلوم ہوں گے اور قرآن مجید کی آیات سے یہ باتیں ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔ پس آپ کا یہ دعویٰ کرنا اہلِ قرآن کے روبرو قہقہہ اڑانا ہے۔ ذرا ان آیات کو تو دیکھئے کہ جن میں پر اور مجسم ہو کے نظر آنا وغیرہ وغیرہ اوصاف مذکور ہیں پھر آپ کس دلیری سے انکار کرتے ہیں؟ ذرا شرم بھی چاہیے۔

قولہ فرشتوں کے اس قسم کے وجود اور افعال کا ثبوت ضرور ہے کہ دلیلِ نقلی سے ہوگا۔

اقول بلکہ ادلۂ عقلیہ سے بھی ہے جیسا کہ ہم نے ان کو صدر فصل ہذا میں بیان کیا دیکھ لو۔

قولہ اور اس لیے قبل شروع کرنے اس بحث کے ہم کو مناسب معلوم ہوا کہ علماءِ کلام نے جو بحث نسبت دلیلِ نقلی کے کی ہے اس مقام پر اس کو نقل کریں۔

اقول وہ بحث جو ادلۂ نقلیہ پر کی ہے علماءِ کلام نے نہیں کی بلکہ معتزلہ کے احتمالاتِ عقلیہ ہیں کہ جن کا جواب دندان شکن بھی علماءِ کلام نے دیا ہے جیسا کہ آپ نے بھی نقل کیا ہے۔ قولہ شرح مواقف میں اس بات پر ایک بحث لکھی ہے کہ دلائلِ نقلیہ جن سے مطالب پر استدلال کیا جاتا ہے مفیدِ یقین ہیں یا نہیں معتزلہ اور جمہور اشاعرہ کا یہ مذہب ہے کہ مفید نہیں اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ الخ۔

اقول جواب یہ ہے قولہ صاحب شرح مواقف نے ان دلیلوں کے لکھنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ یہ دلیلیں ٹھیک نہیں ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ دلائلِ نقلی شرعیات میں ان قرائن سے جو منقول میں مشاہدہ ہوتے ہیں اور بطور تواتر کے ہم تک پہنچے ہیں اور جن سے تمام احتمالات جاتے رہتے ہیں مفیدِ یقین ہوتے ہیں۔ الخ

اقول کیوں جناب آپ نے جو کچھ اپنے ادلۂ نقلیہ پر شبہات قائم کئے تھے ان کا جواب یہی آپ نے تسلیم کر لیا۔ پھر کس اعتماد پر آپ ادلۂ نقلیہ کا جو وجودِ ملائکہ پر اور ان کے افعال پر بالصراحۃ دال ہیں' انکار کرتے ہیں' غایۃ الامر آپ معتزلہ کے مذہب کے موافق ظن کا مرتبہ تسلیم کرتے نہ کہ انکار ہی کر بیٹھتے۔

قولہ ص ۱۴۰ ان سب سے زیادہ ایک اور امر ہے جس پر شارح مواقف اور صاحب مواقف اور کسی نے بھی غور نہیں کیا (کیوں نہ ہو وہ آپ کا ہی حصہ تھا) اور وہ کلام غیر مقصود ہے۔ الخ

قولہ قرآن مجید میں اس قسم کا کلام غیر مقصود نہایت کثرت سے ہے۔ مشرکین و اہلِ کتاب کے عندیہ میں بہت سی ایسی باتیں سمائی ہوئی تھیں جن کا در اصل کچھ وجود نہ تھا یا وجود تھا مگر اس کی جو حقیقت کہ وہ سمجھتے تھے در اصل وہ نہ تھی یا وہ بات ظاہر میں دکھائی دیتی تھی اور بطور غلط العام یا باعتمادِ مشاہدہ اسی کو واقعی سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت اور اصلیت برخلاف اس کے تھی اور قرآن مجید کو اس سے بحث مقصود نہ تھی اس لیے اس کو اسی طرح بیان کیا جس طرح مشرکین اور اہلِ کتاب خیال کرتے تھے

الخ

اقول اس تمہید کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں تبعاً ایسی بہت سی باتیں (کہ جن کا دراصل کچھ وجودِ واقعی نہیں لیکن ان کو مخاطب تسلیم کرتے تھے) مذکور ہیں لیکن اس سے سید صاحب یہ تو کہیں بھی لازم نہیں آتا کہ ملائکہ اور اعجازِ انبیاء بھی اسی قبیل سے ہیں تاکہ آپ کا مدعا ثابت ہو۔ کیونکہ اس قسم کی باتیں کلامِ غیر مقصود میں واقع ہوتی ہیں مگر جو کلام کہ اس کو خاص مقصود کے لیے چلایا جاوے اس میں ان احتمالات کا کہیں گزر ہی نہیں ہوتا۔ اس تمہید کے بعد آپ پر ضرور تھا کہ ان آیات کو (کہ جن میں ملائکہ کے وجودِ جداگانہ اور ان کے افعال کا ذکر ہے) کلامِ غیر مقصود ہونا ثابت کر دیتے مگر اس بات سے تو آپ کانوں پر ہاتھ دھر کر اور ہی طرف چل دیے کبھی یہود کے عقائد کو، کبھی نصاریٰ کے عقائد کو، کبھی مشرکین کے عقائد کو ملائکہ کی نسبت بیان کرنا شروع کر دیا اور ورق کے ورق اسی میں سیاہ کر دیے اور کبھی دو چار جملے تمسخر کے ملائکہ کی نسبت بول گئے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ جل جلالہ نے اپنی کتاب مجید میں انہیں یہودیوں یا عیسائیوں یا مشرکین کی تقلید سے ان غلط اور بے اصل مضامین کو بھر دیا تعالی اللہ عن ذلک علواً کبیراً مگر ان آیات کا کلامِ غیر مقصودی ہونا آپ سے قیامت تک بھی ثابت نہ ہو سکے گا۔ یوں ٹکر لیس رجماً بالغیب ضعیف الایمان والوں کے دل میں شبہ ڈالنے کے لیے آپ جو چاہے کہے جایئے بلکہ وہ آیات کلامِ مقصودی ہیں چند وجہ سے:

اول یہ کہ ہر کلام کے مقصودی یا غیر مقصودی سمجھنے کے لیے متکلم کے ہم زمان و ہمزبان ہی لائق ہوتے ہیں پس پیغمبر علیہ السلام کے صحبت یافتوں اور ہر وقت کے پاس بیٹھنے والوں اور عرب العرباء کو (کہ جن کے محاورہ میں قرآن اترا) کبھی غیر مقصودی ہونا معلوم نہ ہوا اور ان کے بعد سے اب تک کسی ملک میں کسی زبان دان کو یہ بات نہ معلوم ہوئی، نہ کسی مفسر کو سوجھی۔ تو تیرہ سو برس بعد ایک ہندی کو سوجھی کہ نہ جس کو صرف نحو سے آشنائی، نہ لغت سے تعارف، نہ زبانِ عربِ قدیم و جدید سے کچھ مس اور جس کی عقلِ سلیم کا یہ حال کہ نہ اس کی دلیل و دعوے میں کچھ ربط نہ اس کو یہ تمیز کہ یہ دلیل میرے دعوی کے لیے مفید ہے یا مضر۔

(دوم) ہر کلام کا مقصودی یا غیر مقصودی ہونا اس کے سباق و سیاق سے معلوم ہو جاتا ہے جب ان آیات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں غیر مقصودی ہونے کی بو بھی نہیں آتی بلکہ متعدد جگہ میں نئے نئے اسلوب سے وجودِ ملائکہ کو بلکہ اعجازِ انبیاء کو بیان کیا ہے اور کوئی قرینہ غیر مقصودی ہونے کا ہے نہیں۔

(سوم) یہ چیزیں کچھ قرآن ہی میں مذکور نہیں بلکہ ہر کتبِ سماویہ میں اور ہر نبی کی زبان سے ان کا بیان منقول ہے۔ پھر اس اتنی بڑی غلطی کو خدائے پاک نے اپنی ہر کتاب میں کیوں دخل دیا؟ اور اس کے انبیاء علیہم السلام نے کیوں غلط وجود کو ثابت کیا۔ کیا لوگوں کو دھوکا دینا منظور تھا، کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ تیرہویں صدی میں سید احمد خانصاحب بہادر دنیا سے نرالے محقق اور فلاسفر ہماری اس دھوکا بازی کو طشت ازبام کر دیں گے؟

(چہارم) اگر یوں ہی بغیر قرائن ہر کلام کو غیر مقصودی اور مجازی کہہ دیا کریں تو پھر اب سید صاحب کے انکار کا بھی کیا اعتبار ہے کچھ عجب نہیں کہ ملحدوں کے لیے انہوں نے بطورِ کلامِ غیر مقصودی انکار کر دیا ہو۔

(پنجم) ایمان بالغیب میں اول درجہ میں خدا بجمیع صفاتہ دوم درجہ میں ملائکہ ہیں کما قال تعالی كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ پس جب ملائکہ کا وجود کلامِ غیر مقصودی سے آپ نے اڑا دیا تو اب اگر کوئی آپ کا شاگردِ رشید خدائے پاک کی نسبت بھی یہی احتمالات قائم کر کے دہریا پراکرتی کا قائل ہو جاوے تو اس کو آپ کیا جواب دیں گے۔ ذرا ارشاد تو ہو۔ پس جو آپ اس کو جواب عنایت کریں گے وہی جواب بجنسہٖ سربمہر ہم آپ کے آگے پیشکش کر دیں گے۔

قولہ صفحہ ۱۴۷ زمانہ کی تمام قوموں کا یہ حال تھا کہ جو امور عجیب و غریب ان کے سامنے ایسے پیش آتے تھے جس کی علت ان کی سمجھ سے باہر تھی اس کو کسی ایسی قوت یا ایسے شخص سے منسوب کرتے تھے جو انسان سے برتر اور خدا سے کمتر تھی الخ۔

اقول اس بے معنی کلام کا مطلب کچھ سمجھ میں نہ آیا عجیب و غریب امور سے مراد خوارقِ عادات ہیں یا کچھ اور؟

شق اول میں ان کا یہ انتساب بجا نہیں بلکہ عین عقل ہے اور یہ قوتِ اعجاز اور وجودِ مخلوقات غائب عن الحس کے لیے اچھا قرینہ ہے۔ شق دوم میں یہ آپ کا حصر باطل ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کا حال آپ پر منکشف ہو گیا پھر آپ خرقِ عادات و کرامات و اعجاز کا انکار کیوں کرتے ہیں اور آپ کی رفارمری بلکہ پیغامبری کے لیے آپ کی امت کے روبرو یہ بڑی شہادت ہے کہ آپ غیب دان ہیں۔ استغفر اللہ من ہذا الہزل۔ قولہ توریت اور صحفِ انبیاء اور انجیل میں فرشتہ کے لفظ کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں آیا ہے کتاب ۲ سموئیل باب ۲۴ ورس ۱۶ و ۱۷ میں اور کتاب ۲ ملوک باب ۱۹ الخ اور زبور داؤد میں وباء پر فرشتہ کا اطلاق ہوا ہے اور زبور داؤد باب ۴ میں ہواؤں پر فرشتہ کا اطلاق کیا ہے الخ۔

اقول یہ دوسری دلیل نفیِ وجودِ ملائکہ پر آپ نے قائم کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظ فرشتہ مشترک ہے اس کے ایک معنی معین نہیں ہو سکتا۔ جناب عالی کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم کہ اشتراک لفظ کی صفت ہے کہ معنی کی۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ کون سا لفظ مشترک ہے آیا ملک یا فرشتہ یا کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تورات و انجیل کی اصلی زبان عبرانی ہے جو فارسی اور عربی سے غیر ہے اور ملک لفظ عربی اور فرشتہ فارسی ہے میں حیران ہوں کہ عبرانی میں ان دونوں میں سے کون سا لفظ مشترک قرار دیا گیا ہے؟ اگر لفظ فرشتہ تو کچھ پروا نہیں ہم کو اس لفظ سے بحث نہیں اگر کہو لفظ ملک تو یہ مسلم نہیں کہ عبرانی میں یہ لفظ انہیں معنی میں مستعمل ہے۔ معلوم ہوا کہ مسمّٰی ملک کے ساتھ عبرانی یا کسی اور زبان میں ہوا یا وباء کو تشبیہ دی ہوگی اور استعارہ بالکنایہ مراد رکھا ہوگا۔ جس طرح کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ کہا ہے۔ لیکن اس سے نفیِ ملائکہ نہ سمجھی گئی بلکہ اس سے تو ان کا وجود جداگانہ پایا گیا ورنہ تشبیہ ٹھیک نہ رہتی اور آپ کا یہ کہنا کہ کتاب ایوب باب ا کتاب اول سموئیل باب ۱۱۔ اور انجیل لوقا باب ۷ میں فرشتہ کا لفظ عام ایلچیوں پر بولا گیا ہے الخ۔ آپ کے تبحر کی دلیل واضح ہے جن مقامات کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہاں لفظ فرشتہ بولا ہی نہیں گیا۔

قولہ تورات میں بہت جگہ اس طرح بیان کیا ہے جیسے کہ انسان دوسرے انسان کے پاس آئے اور ملاقات کرے الخ۔

اقول یہاں سے لے کر صفحہ ۱۵۰ تک سید صاحب نے تورات و انجیل کی وہ آیات نقل کیں کہ جن سے ہمارے مدعا کی تائید ہوتی ہے چونکہ خصم ہماری بات کو تسلیم کرتا ہے تو ہم کو خواہ مخواہ ان سے تعرض کرنا ضروری نہیں گو بعض بعض باتیں خلافِ

تحقیق ہیں۔

قولہ صفحہ ۱۵۰ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ یہودیوں کا یہ دستور ہے کہ خدا کی عظمت اور قدرت کے ہر ظہور کو فرشتوں کی وساطت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اقول یہ تسلیم ہے مگر اس سے تو فرشتوں کے وجود کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ نفی

قولہ اسی لیے وہ فرشتوں کے وجودِ اصلی کو نہیں مانتے اور یہ سمجھتے ہیں خدا کی قدرت کی غیر معلوم قوتوں کا نام فرشتہ رکھ دیا ہے۔

اقول یہ کس بیوقوف یہودی کا قول ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو وسیلہ اور مظہرِ قدرت وعظمت تسلیم کرنا پھر ان کا وجودِ اصلی نہ ماننا اجتماع النقیضین نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کی قدرت کی غیر معلوم قوتوں کے کیا معنی ہیں؟ قدرت کی قوت ہم نے آج ہی سنی ہے واہ رے معقولیت!

قولہ ص ۱۵۱ اب ہم کو اس بات کی تلاش کرنی ہے کہ قدیم مشرکینِ عرب کا یعنی اس زمانہ کے عربوں کا جبکہ یہودیوں کا میل جول عرب میں نہ تھا فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا اور آیا وہ لفظ ملک اور ملائکہ[1] کو انہیں معنوں میں خیال کرتے کہ جن میں یہودی کرتے تھے یا نہیں۔ جہاں تک کہ ہم نے تفتیش کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور ملائکہ کی نسبت ایسا خیال نہیں جیسا یہودیوں[1] کا ہے ثابت نہیں ہوا۔

اقول آپ کا کلام یہاں تک تو مفیدِ مدعاءِ جناب ہے۔ سو اس کا جواب دیتا ہوں مگر یہ جو آگے آپ نے ایک طویل گفتگو کی ہے قولہ مشرکینِ عرب بلاشبہ ارواحِ فلکی کو یا ارواحِ فرضی کو (ارواحِ فلکی کیا چیز ہیں اور ارواحِ فرضی سے کیا مراد ہے وہ کیا فرض کر رکھا تھا) یا ارواحِ اشخاصِ متوفی کو بطور خدا کے پوجتے تھے الخ۔ مگر ان پر کبھی لفظ ملک یا ملائکہ کا اطلاق نہیں کرتے جہاں تک کہ ہم سے ہو سکا ہم نے اشعارِ جاہلیت پر بھی جس قدر کہ ہم کو دستیاب ہوئے غور کیا ہم کو کوئی شعر بھی ایسا نہیں ملا جس میں لفظ ملک یا ملائکہ کا ان ارواحوں پر اطلاق ہو کہ جن کو وہ پوجتے تھے الخ۔ محض لاطائل ہے نہ آپ کو مفید نہ ہم کو مضر کیونکہ ہم کب اس بات کے قائل ہیں کہ عرب کے لوگ ارواحِ متوفی پر یا اپنے معبودوں پر لفظ ملک بولتے تھے پھر آپ نے ابوعبیدہ کے اشعار بلا فائدہ نقل کر کے کیوں کتاب دراز فرمائی۔ اب اپنے کلامِ مفید کا جواب سنئے یہ آپ کی تیسری دلیل نفیِ ملائکہ پر ہے یہ غلط ہے چند وجہ سے۔

اول تو آپ کا یہ کہنا (کہ قدیم عرب لفظ ملائکہ کو ان معنی پر کہ جس کے اہلِ ادیان قائل ہیں استعمال نہیں کرتے) صریح غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ○ الآیہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکین ان ملائکہ کو کہ جن کی مدح خدا عباد الرحمٰن کے ساتھ کرتا ہے خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اب وہ عباد الرحمٰن وہی اشخاص تو ہیں کہ جن کو اہلِ ادیان ملائکہ کہتے ہیں اور اگر یہ نہیں تو وہ اور کیا چیز ہیں کہ جس کو وہ بنات الرحمٰن یا اناث الرحمٰن

[1] اس سے مراد اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کیونکہ یہود اور اہلِ اسلام میں ملائکہ کی نسبت چنداں اختلاف نہیں۔ لیکن سید صاحب یہود کے نام سے حقارت دلانے کے لیے تعبیر کرتے ہیں۔ ۱۲ منہ

کہتے تھے؟ ارواحِ فلکی ومتوفی پر تو بقول آپ کے وہ یہ لفظ اطلاق ہی نہیں کرتے تھے اور جن کے آپ قائل نہیں اور صفحہ ۱۵۲ میں جو آپ نے بلا فائدہ ابی عثمان جاحظ کا قول نقل فرما کر ایک روایت بے اسناد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ قریش جن کے سرداروں کو بنات الرحمٰن یعنی خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اس آیت کے معارض نہیں ہو سکتی کیونکہ ممکن ہے کہ عرب کے لوگ جن کے سرداروں کو بھی خدا کی بیٹیاں کہتے ہوں اور ملائکہ کو بھی۔

(وجہ دوم) آپ کا یہ قول اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عرب ان غیر مرئی چیزوں کو جن کو نیک و پاکیزہ سمجھتے تھے اور جن سے خلقت کو بھلائی اور نیکی پہنچنے کا خیال کرتے تھے ان کو ملک کہتے تھے انتہیٰ۔ اس قول کی صریح نقیض ہے کیونکہ یہود یا اہلِ اسلام بھی تو ملائکہ کو غیر مرئی پاکیزہ سمجھتے ہیں پھر وہ کون سی مباینت ہے کہ جس کی وجہ سے آپ فرماتے ہیں۔ قولہ مگر وہ معنی اور مراد جو ملک کے لفظ سے یہودیوں نے مقرر کئے تھے یا جو زمانۂ اسلام کی کئی صدی بعد کی مصنفہ کتبِ لغت میں لکھ دی گئی ہیں اس معنی و مراد میں عرب لفظ ملک کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ انتہیٰ۔

(وجہ سوم) آپ کے اختراعی معنی پر تو لفظ ملک کا اطلاق ہونا کہیں سے ثابت نہیں ہوا۔ نہ زمانۂ جاہلیت کے عرب سے نہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سے نہ کسی اور قوم سے پھر وہ کون سے معنی ہیں کہ جن پر لفظ ملک قرآن میں بولا گیا۔

(وجہ چہارم) بالفرض اگر یہ بھی صحیح مانا جاوے کہ زمانۂ جاہلیت کے وہ عرب کہ جن سے یہود و نصاریٰ کا میل جول نہ ہوا تھا لفظ ملک کو معنی مروجۂ اسلام پر نہ بولتے تھے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ زیادہ رعایت اس زمانہ کی ہے کہ جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس زمانہ کے لوگ خواہ یہود کے میل جول سے یا کسی اور طور سے بلاشک ملک کے یہی معنی مراد رکھتے تھے کہ جو اہلِ اسلام کے نزدیک معتبر ہیں۔

(وجہ پنجم) اگر یہ بھی نہ ہوتا اور فرض کیا جاتا کہ عرب کے لوگ ملک کے معنیِ مروجہ سے بالکل نا آشنا تھے مگر اس قدر جانتے تھے کہ غیر مرئی پاکیزہ چیز کو ملک کہتے ہیں۔ تب بھی مدعاء ثابت ہے کیونکہ عرفِ شرع میں معنی لغوی کی پوری رعایت کچھ ضروری بات نہیں گو قرآن محاورۂ عرب میں نازل ہوا ہے مگر بہت سے الفاظ کے معنی شرع نے منقول کر کے ایک نئے طور پر رکھے ہیں۔ دیکھئے زکوٰۃ اور صلوٰۃ اور صیام کے معنی اور شرعی معنی میں کس قدر فرق ہے۔ لغت میں زکوٰۃ پاکی اور صلوٰۃ دعا کو اور صیام مطلق بند رہنے کو کہتے ہیں۔ شرع میں زکوٰۃ مالِ معین کا چالیسواں حصہ ادا کرنا اور صلوٰۃ ارکانِ مخصوصہ کا بجا لانا اور صیام اکل وشرب و جماع سے طلوعِ صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک باز رہنے کو کہتے ہیں اسی طرح شرع نے ملک کے معنی میں تصرف کیا ہو تو کیا محال ہے؟ کیا کوئی زکوٰۃ وصلوٰۃ وصیام کے لغوی معنی پر عمل کر کے شرعی فرض سے بری الذمہ ہو سکتا ہے؟
جناب عالی یہی نکتہ تو آپ کی سمجھ میں نہ آیا ع سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔

(وجہ ششم) ص ۴۸ میں آپ خود فرماتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے جو عرب کے بت پرستوں کا تھا الخ اب معلوم نہیں کہ آپ کی دونوں باتوں میں سے کونسی غلط ہے؟

قولہ ص ۱۵۳ قرآن مجید میں کلامِ مقصود میں کسی جگہ لفظ ملک یا ملائکہ کا اس مراد سے استعمال نہیں ہوا ہے جو مراد کہ یہودیوں نے قرار دی تھی۔ جس کی تفسیر ہم ہر ایک مقام پر لکھیں گے الخ۔

اقول اگر یہودیوں نے وہی معنی قرار دیے ہیں کہ جو اہلِ اسلام نے بلکہ قرآن اور پیغمبر علیہ السلام نے تو اس معنی پر ملک یا ملائکہ کا اطلاق کلامِ مقصودی میں مع ان کے صفات و حالات کے اس تفصیل سے مذکور ہے کہ جس کے انکار کی مسلمان کو گنجائش نہیں۔ چنانچہ اس فصل کے اول میں ہم نے وہ آیات نقل کردی ہیں، ملاحظہ فرما لیجئے! پھر آپ کا یہ کہنا کہ قرآن میں کہیں نہیں البتہ بڑی دلیری اور بہادری کا کام ہے اگر آپ کو قرآن یاد نہ تھا اور ایک مدت سے آپ نے اس کی تلاوت فضول جان کر چھوڑ دی ہے (اور آپ کیا آپ کے مقلدین بھی اس دولت سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں) تو کوئی پانچ چھ روپیہ ماہوار کا حافظ ہی رکھ لینا تھا۔ اور اگر یہود نے کچھ اور معنی قرار دیے ہیں تو آپ جانیں اور آپ کے یہود۔ ماراچہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خررفت۔ آپ دل کھول کر یہود غریبوں کا رد کیجئے۔

چوتھی دلیل: قولہ ملائکہ کا اطلاق ان قدرتی قویٰ پر جن سے انتظامِ عالم مربوط ہے اور ان شئونِ[1] قدرتِ کاملۂ پروردگار پر جو اس کی ہر ایک مخلوق میں بہ تفاوتِ درجہ ظاہر ہوتی ہیں ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے۔ سورۂ والنازعات سے اس کا بخوبی ثبوت ہے اس کے چار جملوں میں مفسرین میں اختلاف ہے مگر پانچواں جملہ فالمدبرات امرًا کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ مدبرات سے ملائکہ مراد ہیں۔ پس غور کرنا چاہیے کہ مدبرات سے کیا مراد ہے یہی قویٰ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے تمام امورِ عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔

اقول یہ آپ کی چوتھی دلیل ہے مگر یہاں سب سے زیادہ غلطیاں ہیں:

اول یہ کہ آپ نے اپنے پہلے دعویٰ کو ترک کر دیا پیشتر آپ قائل ہوئے تھے کہ ملائکہ سے مراد خدا تعالیٰ کی صفات ہیں۔ یہاں آپ اس سے اعراض کر گئے اور ملائکہ کو قوائے مدبرۂ عالم کہنے لگے اور ایک جگہ بلکہ اس سے اگلے صفحہ میں جبرئیل کو ملکۂ نبوت کہہ دیا جس سے یہ لازم آیا کہ جبرئیل نبی کی ایک صفت قائم بالغیر کا نام ہے۔ اب آپ ہم سے بیان فرمائیے کہ ان تینوں باتوں میں سے کون سی صحیح ہے؟ اگر کوئی کہے کچھ بات نہیں تینوں سے ایک ہی مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تینوں معنی (۱) ملکۂ نبوت (۲) صفاتِ خدا تعالیٰ (۳) قوائے مدبرِ عالم۔ آپس میں غیر اور مخالف ہیں ملکۂ نبوت جس کو آپ جبرئیل کہتے ہیں نبی کی صفت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی صفات جو قدیم اور عین ذات ہیں بندہ کے سب صفات سے جو حادث اور غیر ذات ہیں بالکل غیر ہیں اور اسی طرح قوائے مدبراتِ عالم نباتات، جمادات، حیوانات وغیرہا میں پائے جاتے ہیں ان دونوں سے غیر ہیں اس پریشان بیانی کا کیا ٹھکانا ہے۔

(دوم) آپ کا کبریٰ دلیل مسلم نہیں۔ اعنی یہ مسلم کہ مدبرات سے مراد ملائکہ ہیں لیکن یہ بات کہ مدبرات قویٰ ہیں غیر مسلم، اس کا کچھ ثبوت آپ نے نہیں دیا بلکہ اصل بات یہی ہے کہ مدبراتِ عالم وہی ملائکہ ہیں جو عالم کے لیے ایسے ہیں کہ جس طرح جسم کے لیے روح مدبر ہے۔ (سوم) اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ اس جگہ ملائکہ کا اطلاق قوائے مدبراتِ عالم پر ہوا ہے تو اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ یہ لفظ حقیقی طور پر بولا گیا ہے بلکہ جائز ہے کہ استعارۃً اطلاق ہوا ہو اور اگر یہ بھی تسلیم کیا جاوے کہ حقیقتاً اطلاق ہوا ہے تو غایۃ الامر یہ لفظ ملائکہ مشترک سمجھا جاوے گا۔ جیسا کہ لفظ عین کہ جس کے معنی آفتاب اور آنکھ

1. شیئونِ قدرت تو آپ نے صوفیہ کے ہاں سے خوب اڑایا انہیں لفاظیوں سے تو بہت سادہ لوح آپ کو اس صدی کا پیغمبر سمجھنے لگے۔ ابوالحسن حقانی

اور ذات الشی اور گھٹنا ہیں۔ ایک معنی میں ایک جگہ استعمال ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ پھر اس کے دوسرے مسمیٰ کا وجود ہی نہ مانا جاوے کیا کوئی شخص عینِ جاریہ میں چشمہ کے معنی لے کر یہ کہہ سکتا ہے کہ آنکھ اور آفتاب اور گھٹنے کا وجود ہی نہیں؟ حاشاو کلا۔

پانچویں دلیل: قولہ ان آیتوں میں جن کی ہم تفسیر لکھتے ہیں کلامِ مقصود اس قدر ہے کہ جو شخص اس وحی کا عدو ہو جو خدا نے محمد رسول اللہ ﷺ کے دل میں ڈالی ہے الخ۔

اقول یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے علاوہ اس کے آیت (مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ) میں جبرئیل سے وحی[1] مراد لینا آپ کے اس قول کے مخالف ہے۔ قولہ اس سے پایا جاتا ہے کہ دونوں قولوں میں سے کون سا غلط ہے قولہ فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل سے تعبیر کرتے تھے اور کوئی جداگانہ مخلوق مع تشخصہ نہ تھی کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ بے شبہ اس نے (یعنی جبرئیل نے) ڈالا ہے تیرے دل[2] پر اللہ کے حکم سے (وہ کلام) جو سچ بتاتا ہے اس چیز کو جو اس سے پیشتر الخ۔

کیونکہ وحی اور باعثِ وحی ایک چیز نہیں ہو سکتی اب معلوم نہیں کہ آپ کے دونوں قولوں میں سے کونسا غلط ہے۔

قولہ فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل اور میکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہود کے خیالات کا اعادہ ہے اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں کیونکہ اگر یہودیوں کا خیال نہ ہوتا تو غالبًا وہ نام نہ لیے جاتے۔ اقول یہ آپ کی پانچویں دلیل ہے۔ قیاسِ استثنائی سے آپ نے یہاں کام لیا۔ واہ کیا کہنے ہیں استدلال کے! اسی کا نام ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ تعمیم کے بعد تخصیص کرنا ملزوم اور اعادۂ خیالِ یہود لازم مقدم پایا گیا۔ تالی بھی پائی گئی مگر یہ تو فرمائیے کہ یہاں کون سا ملازمہ ہے؟ عقلیہ یا عادیہ؟ یا کوئی جدید ملازمہ ہے۔ اے جناب ہزار ہا بار آپ نے بھی اپنے کلام میں عام لوگوں کا ذکر کر کے پھر تخصیص کی ہوگی۔ پھر کیا آپ نے بھی یہود کے خیال کا اعادہ کیا تھا؟ اب ذرا گوشِ ہوش سے سنیے۔ عام کے بعد خاص لوگوں کا ذکر کرنا ان کے شرف اور فضیلت کے لیے فصحاء کے کلام میں اکثر وارد ہوتا ہے وہاں یہود کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ اعادۂ خیال چہ معنی دارد؟ مگر آپ کے دل میں یہود ایسے بسے ہیں کہ جدھر دیکھئے یہود ہی دکھائی دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں جس قدر انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور غیر مرئی چیزوں کا ذکر جبرئیل و میکائیل، ملائکہ اور شیطان اور جن اور جنت و دوزخ کی کیفیت، ثواب و عذاب بلکہ آسمان اور وجودِ آدم علیہ السلام جو کچھ مذکور ہے آپ کے زعم میں یہود کے خیالات کا اعادہ ہے اور اسی طرح جو کچھ قرآن کی تفاسیر میں مذکور ہے وہ بقول منشی[3] چراغ علی صاحب یہود کے بے اصل قصے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ گویا قرآن اور

1. الحاصل جبرئیل کو وحی ڈالنے اور پہنچانے والا قرار دے کر پھر اس کو وحی کہنا (یعنی کلامِ منزل) عاقل کی شان سے بعید ہے اور پھر جبرئیل کو ملکۂ نبوت کہہ دینا ان دونوں معنی کے خلاف ہے۔ جبرئیل کے آپ نے تین معنی بیان کئے نمبر ۱ وحی نمبر ۲ وحی کا پہنچانے والا نمبر ۳ ملکۂ نبوت۔ حضرت سلامت کسی بات پر قرار بھی ہے۔ ۱۲ منہ
2. اس آیت میں آپ کو قلب پر ڈالنے کے لفظ سے مغالطہ ہو گیا اور آپ یہ سمجھ بیٹھے کہ فرشتے یا جن کو قلب تک رسائی نہیں حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے لطیف چیزوں کی ہر جگہ رسائی ہے تسلیطِ جن کی صورت میں جاہل لوگوں کو عالمانہ باتیں کرتے دیکھا ہے
3. منشی چراغ علی صاحب لکھنوی خلیفہ سید صاحب تہذیب الاخلاق مطبوعہ یکم ربیع الاول ۱۲۹۳ ہجری جلد ہفتم نمبر ۳ صفحہ ۲۶ و ۱۷ وغیرہا میں فرماتے ←

اس کی تفاسیر لغو اور بے اصل قصوں کی پوٹ ہیں سچے ایماندار کی شان سے ایسے خیالاتِ فاسدہ نہایت بعید ہیں۔

قولہ پس ان دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخصہما علیحدہ علیحدہ ایسے ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید و عمرو۔ اقول یہ پس تو آپ کا جب صحیح ہوتا کہ پیشتر کچھ ثابت کر چکتے ورنہ اس پس سے جبرئیل و میکائیل جملہ ملائکہ کے وجود کی نفی نہیں ثابت ہوتی ہاں آپ کا منکرِ ملائکہ و منکرِ جبرئیل و میکائیل ہونا ثابت ہوگیا۔

قولہ ص ۱۵۲ پس درحقیقت یہودی جس کو جبرئیل کہتے تھے اور جس کا نام حکایتاً خدا نے بیان کیا ہے وہ ملکہ[1] نبوت خود آنحضرت ﷺ میں تھا جو وحی کا باعث تھا۔ اقول اگر آپ کا یہ قول سچ ہے تو اس سے پہلا یہ قول قولہ ان آیتوں میں جن کی تفسیر ہم لکھتے ہیں کلامِ مقصود صرف اس قدر ہے کہ جو شخص اس وحی کا عدو ہو الخ۔ بالکل غلط ہے کیونکہ جب اس کلام من کان الخ میں آپ نے جبرئیل سے وحی مراد لی تو ملکۂ نبوت جو بقول آپ کے باعثِ وحی ہے مراد لینا صاف غلط ہوا۔ کجا وحی کجا ملکۂ نبوت باعثِ وحی ایک سبب دوسرا سبب یا علت دوسرا معلول' دونوں میں تغایرِ ذاتی۔ یہ پس بھی آپ کا پہلے پس کا بھائی ہے۔ قولہ ان وجوہات سے یہ بات (کہ جبرئیل درحقیقت کسی فرشتے کا نام ہے) ثابت نہیں ہوتی۔

اقول وہ کون سے وجوہات ہیں ذرا بیان تو کیجئے ورنہ آپ ہی پس پس کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔

چھٹی دلیل: قولہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں ...... مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں کیونکہ اور کسی کا نام قرآن میں نہیں الخ۔ ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قویٰ کی تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لیے تھے۔

اقول یہ آپ کی چھٹی دلیل ہے یہ سب سے زیادہ غلط ہے۔

(اول) یہ کہ قرآن میں علاوہ ان کے اور فرشتوں کے بھی نام ہیں جیسا کہ زبانیہ اور ملک۔

(دوم) قرآن میں اگر یہ ملائکہ کے نام کی فہرست ہوتی تو آپ کا یہ اعتراض کہ اس فہرست میں دو کے سوا اور کا کیوں نام نہیں کچھ وقعت رکھتا بلکہ یہ چند اسماء بھی اس وجہ سے مذکور ہوئے کہ ان کے ذکر کا موقع آ گیا تھا یا یہ کہ لوگوں میں متعارف اور مشہور تھے اور اگر کل ملائکہ کا نام ذکر کرتے تو (علاوہ) تو اس بات کے کہ قرآن کی صدہا جلدیں ہو جاتیں اور قرآن سے جو ہدایتِ خلق مقصودِ اصلی ہے فوت ہو جاتا) لوگوں کو نئے نئے نام سن کر عجیب وحشت ہوتی۔

← ہیں وہ (مفسرین) کبھی تاریخانہ تحقیقات پر متوجہ نہیں ہوتے وہ جو شام کی کسی لڑائی میں ایک بارِ شتر یہود کے قصہ کہانیوں کا مل گیا تھا وہی ان کا مایۂ بساط ہے۔ انتہیٰ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ اوراق تورات کے لائے تھے ان کا پڑھنا تو اسلامیوں کو گوارا ہی نہ ہوا چہ جائیکہ اس بارِ شتر کو مایۂ دین بنا دیں ولو سلم۔ پھر آپ کو یہ کیونکر معلوم ہوگیا کہ اس میں سراسر بے اصل قصے تھے کیا یہ ممکن نہیں کہ اصل نسخے تورات و انا جیل و نامہ حواریوں کے وہی ہوں کہ جن کی وجہ سے آج تک اہلِ کتاب کو تورات و انجیل کا ہزار برس کا لکھا ہوا نسخہ بھی نہیں دستیاب ہوا۔ پس اس بنا پر تو مفسرین صحابہ بڑے محققین تھے نہ کہ آپ جن کے عہد میں کوئی صحیح نسخہ بھی بائیبل کا نہیں۔ حقانی

[1] سر سید احمد خان صاحب کے اقوال کہ (۱) جبریل ملکۂ نبوت ہے جو باعثِ وحی ہے ۔ جبریل وحی کا نام ہے ۔ جبریل درحقیقت کسی فرشتے کا نام نہیں ۔

(سوم) کسی چیز کے نام مذکور نہ ہونے سے اس کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی فوجی دفتر میں آپ کا نام مرقوم نہیں۔
کیا اس سے آپ کے وجود میں کچھ خلل آ گیا؟

(چہارم) اگر آپ کا نتیجہ اور تعجب بھی صحیح تسلیم کیا جاوے تو یہ لازم آوے کہ جبرئیل و میکائیل یہودی لوگوں کی زبان کے نام ہیں (یعنی عبرانی کے) لیکن یہ نہیں لازم آتا کہ ان اسماء کے مسمیات کا وجودِ اصلی یہود کے نام رکھنے سے پیشتر نہ تھا بلکہ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ قدیم[1] چیزوں کے نام ہر زمانے اور ہر قوم میں بدلتے رہتے ہیں۔ دیکھئے پرانے شہروں اور پہاڑوں کے نام کس طرح بدلتے جاتے ہیں (دہلی کا نام قدیم اندر پت تھا پھر دہلی ہوا پھر شاہجہان آباد مشہور ہوا۔ اسی طرح الہ آباد کو پہلے زمانہ میں پراگ اور بنارس کو کاشی کہتے تھے اور اسی طرح آگ اور پانی وغیرہ عناصر کے ہر زبان میں جدے جدے نام ہیں) پس اسی طرح ممکن ہے کہ جملہ ملائکہ اور جبرئیل و میکائیل[2] شہرت پا گیا ہو۔ پھر اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ یہود سے پیشتر ان کا وجود ہی نہ تھا۔

(پنجم) یہ بیان آپ کا کہ (فرشتوں کے نام یہودیوں نے مختلف قویٰ کی تعبیر کرنے کو رکھ لیے) مخالف ہے آپ کے اس قول کے قولہ ص ۱۴۱۔ بہر حال ہم کو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو الفاظ صفاتِ باری پر مستعمل ہوئے تھے آخر کو انہیں الفاظ کو فرشتوں کا نام سمجھنے لگے۔ انتہیٰ۔ اب دونوں میں سے ایک قول کو ضرور غلط ماننا پڑا۔ معلوم نہیں کہ کونسی تحقیق آپ کی درست ہے؟

(ششم) اگر یہ دونوں مخالف قول آپ کے تسلیم علی سبیل فرضِ محال کر لیے جائیں تو آپ کی یہی دلیل آپ کے مدعا کی نفی کے واسطے کافی ہے یعنی ہم آپ کے کلام سے آپ پر یوں معارضہ کرتے ہیں اگر ان الفاظ سے خدا کی صفات کو یا قوائے مدبرۂ عالم کو تعبیر کیا ہے تو کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ باوجودیکہ خدا کی بے نہایت صفات اور عالم کے بے نہایت قویٰ ہیں۔ مگر بجز دو صفات یا دو قویٰ کے اور سب بے نام ہیں کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا۔ ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ نام ملائکہ کے ہیں کتبِ مقدسہ میں ان کو حسب موقع ذکر کیا ہے۔ اب دہریے ناحق انکار کرتے ہیں۔ اب ہم صفحہ ۴۶ وغیرہا میں جو کچھ آپ نے قصۂ آدم کی نسبت ارشاد فرمایا ہے اس کو میزانِ صحت میں تولتے ہیں:

قولہ ص ۴۶ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اس آیت سے وہ ذکر شروع ہوا ہے جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا ہے الخ۔

اقول یہ آپ کا بہتانِ صریح ہے۔ اہلِ اسلام میں سے کوئی مفسرِ ذی علم تو کیا ادنیٰ مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتا کہ فرشتوں نے خدا سے مباحثہ یا جھگڑا کیا تھا کیونکہ خدا تعالیٰ فرشتوں کی نسبت فرماتا ہے لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ کیا فرشتوں کا استفہام کرنا جھگڑا ہے؟ آپ ایسی بے بنیاد باتوں سے جملہ علماءِ اہلِ اسلام کو بے اعتبار بنایا چاہتے ہیں۔

[1] قدیم سے مراد یہاں قدیمِ عرفی ہے نہ قدیمِ ذاتی نہ قدیم زمانی۔ ۱۲ منہ

[2] جو الفاظ خدا کی صفات پر بولے جاتے تھے انہیں کو فرشتوں کے نام سمجھنے لگے۔ سید احمد خان صاحب جس کی تحقیق۔

قولہ ص ۴۷ یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہے ان کو نوری سمجھ کر گورا گورا' سفید برف کا رنگ' نوری شمع کی مانند باہیں' بلور کی سی پنڈلیاں' ہیرے کے سے پاؤں ایک خوبصورت انسان کی شکل نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے الخ۔

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں کو نادیدہ جسمانی چیزوں پر خیال کر لیا ہے اور وہ خیال نسل در نسل چلا آیا ہے دراصل فرشتے کوئی وجود نہیں رکھتے۔

اقول یہ تمام گفتگو آپ کی ایک شاعرانہ تک بندی ہے نہ کوئی مسلمان ان کو بلور کی مانند نہ ہیرے کی مانند سمجھتا ہے ہاں آپ نے ابتداءِ عمر میں سمجھا ہو تو سمجھا ہو۔

قولہ آسمان ان کے رہنے کی جگہ قرار دی آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لیے ان کے پر لگائے ہیں۔ الخ۔

کسی کو صور پھونکتا خیال کیا ہے اب یہ اعتراض آپ کا خدا پاک پر ہے کہ جس نے ان کو اُولِیۡ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ بتایا ہے۔

قولہ بعض اقوام نے جو زیادہ غور وفکر کی ہے تو ان کے لیے نہ جسم مانا ہے اور نہ ان کا متحیز ہونا تسلیم کیا ہے۔ الخ

اقول البتہ بعض فلاسفہ بے دین اس بات کے قائل ہوئے ہیں جیسا کہ اس کا ذکر آتا ہے لیکن اہلِ اسلام بلکہ اہلِ کتاب میں سے یہ کسی کا عقیدہ نہیں۔ اسلامیوں میں سے ان کی تقلید اول آپ ہی نے کی ہے۔

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

قولہ ص ۴۸ عام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بت پرستوں کا تھا۔

اقول اگرچہ یہ تشبیہ آپ کی اس مقام پر بغرضِ اہانتِ عقیدۂ اہلِ اسلام ہے مگر یہ قول آپ کے اس قول کے رد کے لیے کافی ہے جو آپ نے صفحہ ۱۵۱ میں فرمایا ہے اب ہم کو اس بات کی تلاش کرنی ہے کہ قدیم مشرکین عرب کا الخ فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا الخ جہاں تک کہ ہم نے تفتیش کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور ملائکہ کی نسبت ایسا خیال جیسا کہ یہودیوں کا ہے ثابت نہیں ہوا الخ اور صفحہ ۱۴۰ میں آپ اہلِ اسلام اور یہود کا عقیدہ فرشتوں کی بابت یکساں فرماتے ہیں۔ قولہ قرآن مجید میں بھی ان کا استعمال اسی طرح پر ہوا ہے جس طرح کہ یہودی خیال کرتے تھے الخ۔ جب اہلِ اسلام اور یہود کا ملائکہ کی نسبت یکساں اعتقاد ہوا اور مسلمانوں کا اعتقاد عرب کے بت پرستوں کی مانند ہو تو تینوں گروہوں کے اعتقاد یکساں ہوئے پھر لفظ ملک کہ مروج تھا کہ جس سے وہ اپنے عقیدہ کو ملائکہ کے بارہ میں اہلِ اسلام کے عقیدہ کی مانند تعبیر کرتے تھے۔ الغرض ہم کو تو آپ کی اب کسی تحقیق کا اعتبار نہ رہا کبھی آپ کچھ کہتے ہیں کبھی اس کے برخلاف فرماتے ہیں۔ آپ کے تیرہویں صدی کے بڑے محقق ہونے کے لیے یہی دلیل کامل ہے۔

دوم یہ قول آپ کا (مشرکین کے اعتقاد کی مانند اہلِ اسلام کا اعتقاد فرشتوں کی نسبت ہے) قرآن مجید کے برخلاف ہے قال اللہ تعالیٰ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا دیکھئے مشرکین ملائکہ کو اناث کہتے تھے اہلِ اسلام نہیں

کہتے یہ کس قدر مخالفت ہے۔ قولہ ص ۴۹ قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں الخ

اقول یہ قول آپ کا دو گواہوں سے رد ہے

(اول) تو قرآن مجید کی وہ بیشمار آیات کہ جن کو ہم نے صدرِ فصل میں نقل کیا مسلمانوں کے عقائد پر بعبارۃ النص دال ہیں۔

(دوم) آپ خود فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ملائکہ کا استعمال اسی طرح ہوا ہے کہ جس طرح یہودی خیال کرتے تھے اور ہمارے ہاں کے علماء نے یہودیوں کی تقلید کی۔ اب معلوم نہیں کہ آپ کے دونوں قولوں میں سے کونسا قول غلط ہے؟

قولہ ص ایضاً بلکہ برخلاف اس کے پایا جاتا ہے خدا فرماتا ہے وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ لَا يُنْظَرُوْنَ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ یعنی کافروں نے کہا کیوں نہیں بھیجا پیغمبروں کے ساتھ فرشتہ اور اگر ہم فرشتے بھیجتے تو بات پوری ہو جاتی اور اگر ہم فرشتہ ہی پیغمبر کرتے تو اس کو آدمی ہی بناتے اور بلاشبہ ان کو ایسے شبہ میں ڈالتے جیسے کہ اب شبہ میں پڑے ہیں۔ اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ فرشتے نہ کوئی جسم رکھتے ہیں اور نہ دکھائی دے سکتے ہیں ان کا ظہور بلاشمولِ مخلوق موجود کے ہو نہیں سکتا الخ۔

اقول ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بترکستانست

جنابِ عالی اس آیت سے تو بچند وجوہ ملائکہ کا مجسم ہو کر ظاہر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اول یہ کہ کفار کا یہ درخواست کرنا کہ پیغمبر کے پاس فرشتے وحی لاتے ہوئے دکھائی کیوں نہیں دیتے۔ پھر خدا پاک کا یہ سبب بیان کرنا (کہ فرشتے کا دکھائی دے جانا تمہارے حق میں بہتر نہیں) صاف دلالت کرتا ہے کہ فرشتے مجسم ہو کے دکھائی دے سکتے تھے اور اگر ممکن نہ ہوتا تو آسان جواب یہی تھا کہ ارے احمقو! فرشتہ بھی کوئی دکھائی دینے کی چیز ہے؟

(دوم) یہ قضیہ شرطیہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا بہت اچھی طرح پر دلالت کرتا ہے کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے چنانچہ خود آپ فرماتے ہیں کہ ظہور بلاشمولِ مخلوق نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بشمولِ مخلوق تو ظہور ہوسکتا ہے۔ آپ نے کہاں سے یہ بات اس آیت سے ثابت کر لی کہ فرشتہ کوئی جسم نہیں رکھتا یا دکھائی نہیں دے سکتا۔ ذرا اس ثبوت کی تشریح تو فرما دیجئے۔

قولہ جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہوسکتا ہے بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے مخلوق میں رکھی ہے ملک یا ملائکہ کہتے ہیں۔

اقول یہاں اور معنی آپ نے بیان فرمائے۔ ظہورِ قدرت اور قدرت میں بڑا فرق ہے۔ قدرت کو صفاتِ باری نہیں کہتے۔ آپ کے نزدیک ملائکہ صفاتِ باری نہیں پھر صفات کہنا اجتماع النقیضین ہے آپ نے زور لگا کر قرآن سے یہ آیت نفی

وجودِ ملائکہ کے لیے نکالی تھی الٹی وہی دلیل آپ کے برخلاف نکلی۔

دل و دیدہ اپنے جو یار تھے ہمیں بحرِ غم میں ڈبا گئے
ہمیں جن سے چشمِ امید تھی وہی آنکھ ہم سے چرا گئے

آپ صوفیہ علیہ الرحمۃ کے کلام سے مدعا ثابت کیجئے کیونکہ ان کے کلام میں تاویل کو بڑی گنجائش ہوتی ہے۔

قولہ بعض اکابر اہل اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں اور امام محی الدین ابن العربی نے نصوص الحکم میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ الخ

اقول حاشا و کلا کسی اکابر اہلِ اسلام کا ایسا عقیدہ نہیں نہ حضرت شیخ محی الدین نے یہ مسلک اختیار کیا ہے نہ کسی اور نے۔ حضرت شیخ نے نصوص الحکم اور دیگر تصانیف میں ملائکہ کا وہی وجود تسلیم کیا ہے جس طرح کہ جمہور اہلِ اسلام نے تسلیم کیا۔ بالفعل میرے سامنے فتوحاتِ مکیہ حضرت شیخ کی تصنیف رکھی ہے اس میں بیشمار مواقع میں شیخ نے ہمارے موافق بیان کیا ہے چنانچہ جلد سوم باب ۳۶۹ صفحہ ۴۸۲ و ۴۸۳ میں یوں فرماتے ہیں۔ ان اللہ لما خلق الارواح الناریة والنوریة اعنی الملائکة والجان شرك بینهما فی امر وهو الاستتار عن اعین الناس مع حضورهم معهم فی مجالسهم وحیث کانوا وقد جعل اللہ بینهما وبین اعین الناس حجابا مستورا فلا نراهم الا اذا شاء وا ان یظهر والنا الخ والملائکة رسل من اللہ الی الانسان مؤکلون به کاتبون افعالنا والشیاطین مسلطون علی الانسان بامر اللہ الخ ولا یطلق علی الارواح اسم جن الا لاستتارهم فالجنة من الملائکة هم الذین یلازمون الانسان ویتعاقبون فینا باللیل والنهار ولا نراهم عادة فاذا اراد اللہ عزوجل ان یراهم من یراهم من الانس من غیر ارادة منهم لذلك رفع اللہ الحجاب عن اعین الذین یرید اللہ ان یدرکهم فیدرکهم وقد یامر اللہ الملك والجن بالظهور لنا فتیجسدون لنانرهم اویرفع اللہ الغطاء منافراهم رای العین وقد نراهم اجسادا علی صور قد نراهم لا علی صور بشریة بل نراهم علی صورهم فی انفسهم کما یدرك کل احدمنهم نفسه وهو صورته التی هو علیها فان الملائکة اصل اجسامها نور والجان نار مارج والانس ماء وتراب ولکن کما استحال الانس عن اصل ما خلق منه کذلك الملك والجان عن اصل ماخلق منه الی ماهما علیه من الصور وفی صفحه ۵۰۶۔ اعلم ان اللہ ما جعل للارواح اجنحة الا للملائکة منهم لانهم السفراء من حضرة الامر الی خلقه فلا بدلهم من اسباب یکون لهم بها النزول والعروج فان موضع الحکمة تقتضی هذا فجعل لهم اجنحة علی قدر مراتبهم فی الذین یسیرون به من حضرة الامر اویعرجون الیه من حضرة الخلق فهم بین الخلق والامر ینزلون ولذلك قالوا ما نتنزل الا بامر ربك انتهٰی

ترجمہ: ''خدا نے جبکہ ارواحِ ناریہ اور نوریہ اعنی جن اور ملائکہ کو پیدا کیا تو دونوں کو پوشیدہ ہونے میں شریک کر دیا کہ وہ باوجودیکہ لوگوں کی مجالس میں آتے اور ان کے ساتھ ہر وقت حاضر رہتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے اور خدا نے ان میں اور لوگوں کی نظروں میں پردہ ڈال دیا ہے۔ پس ان کو ہم دیکھ نہیں سکتے مگر جبکہ وہ خود دکھانا چاہیں الخ۔ اور ملائکہ خدا کی طرف سے بندوں کے لیے پیغامبر اور محافظ ہیں کہ ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور شیاطین بھی انسان پر بحکمِ الٰہی مسلط ہیں الخ۔ ارواح پر لفظ جن اطلاق نہیں ہوتا مگر پوشیدہ رہنے کی وجہ سے پس ملائکہ میں سے وہ جن ہیں کہ جو آدمی کے ساتھ ہر وقت رہتے اور رات دن میں یکے بعد دیگرے اس کے پاس آتے جاتے ہیں اور ہم ان کو عادتاً دیکھتے نہیں۔ پس جب خدا کسی آدمی کو دکھانا چاہتا ہے تو حجاب اٹھا دیتا ہے پس وہ شخص ان کو دیکھ لیتا ہے اور کبھی ملائکہ اور جن کو حکم دیتا ہے تو وہ ہم کو مجسم ہو کر عیاناً دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ہم ان کو انسان کی صورت میں دیکھتے ہیں اور کبھی ان کی اصلی صورت میں جس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اپنی اصلی صورت میں دیکھتے ہیں کیونکہ ملائکہ کا اصل جسم نورانی اور جن کا آتشی ہے اور آدمی کا خاک اور پانی ہے لیکن جس طرح آدمی اپنی اصل سے مستحیل ہو کر اس صورت میں آ گیا اسی طرح جن اور فرشتہ اپنے اصلی مادہ سے مستحیل ہو کر اس صورت پر آ گیا۔ واضح ہو کہ بعض ملائکہ کے لیے خدا نے بازو بنائے ہیں کیونکہ حضرتِ امر سے حضرتِ خلق کی طرف سفیر ہیں تو ان کے لیے وہ اسباب ضرور ہونے چاہییں کہ جن سے چڑھ اور اتر سکیں کیونکہ حکمت کا یہی مقتضٰی ہے پس ان کے لیے بازو ان کے مراتب کے موافق بنا دیے کہ جن کی وجہ سے چڑھتے اور اترتے اور آتے جاتے ہیں اور اسی لیے کہتے ہیں کہ ہم خدا کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔'' اب آپ نے جس قول سے سند پکڑی ہے چلیے اسی میں ہمارا آپ کا فیصلہ ہے دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں ان کا قول آپ نقل کیجئے قولہ ص ۵۰ قال الشیخ رحمۃ اللہ علیہ فی نصوص الحکم وکانت الملائکة من بعض قوی تلك الصورة التی هی صورة العالم المعبر عنه فی اصطلاح القوم بالانسان الکبیر انتهٰی اقول حضرت شیخ کا یہ قول آپ کی سند ہے آپ غور فرمائیے کہ یہ سند آپ کے مدعاء کو ثابت کرتی ہے یا مٹاتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ صورتِ عالم کہ جس کو صوفیہ کرام اصطلاح میں انسانِ کبیر کہتے ہیں اس کے لیے ملائکہ مجموعۂ قوٰی میں داخل ہیں یعنی عالم کے تمام کاروبار بغیر ملائکہ کے نہیں ہو سکتے جس طرح کہ انسان کے کاروبار اس کے قوٰی بغیر نہیں انجام پاتے۔ پس ملائکہ عالم کے لیے بمنزلہ قوٰی کے ہیں۔ چنانچہ اس قول میں اس کی تصریح ہے۔ قولہ قال الشیخ رضی اللہ عنہ فکانت الملائکة له کالقوی الروحانیة والحسیة التی فی نشاة الانسان الخ یعنی شیخ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ملائکہ عالمِ کبیر کے لیے ایسے ہیں کہ جس طرح قوٰی روحانیہ وحسیہ ہیں انسان کے لیے۔ جس طرح انسان کے لیے قوائے روحانیہ وحسیہ مدبر و متصرف ہیں اسی طرح ملائکہ عالم کے لیے۔ جس قدر قول حضرت شیخ کا اس بارہ میں آپ نے مفیدِ مدعا جان کر نقل کیا وہ یہی دو جملے ہیں باقی تو انسان کے قوٰی کی تشریح ہے ان دونوں جملوں کا مطلب آپ نے جو لکھا ہے اس میں آپ نے تصرف[1] بھی کیا مگر پھر بھی آپ کا مدعا ثابت نہ ہوا کیونکہ کاف تشبیہ (جس کا ترجمہ آپ نے بھی یوں لکھا ہے)۔ قولہ ص ۵۱ شیخ رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں کہ وہ قوٰی جن کو ملائکہ کہتے ہیں انسانِ کبیر یعنی عالم کے لیے ایسے ہیں جیسے انسان کے لیے قوٰی ہیں انتہٰی۔ صاف کہہ رہا ہے کہ ملائکہ عالم کے لیے بمنزلہ قوٰی کے ہیں، نہ یہ کہ دراصل ملائکہ کا کوئی وجود جداگانہ نہیں۔ خود عالم کے قوٰی جاذبہ و نامیہ وغیرہا ہی ملائکہ ہیں۔ سید بہادر یہ

[1] وہ تصرفِ بیجا یہ ہے کہ شیخ نے یوں فرمایا کہ فکانت الملائکة کالقوی الروحانیة والحسیة۔ آپ نے یہ جملہ اپنی طرف سے شیخ کے کلام کو اپنے موافق کرنے کے لیے بڑھا دیا وہی ہذہ قولہ وہ قوٰی جن کو ملائکہ کہتے ہیں انتہٰی۔ حالانکہ شیخ کے کسی جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قوٰی جن کو ملائکہ کہتے ہیں علاوہ اس کے شیخ ملائکہ کو قوٰی سے تشبیہ دیتے ہیں پھر اگر وہ ملائکہ کو قوٰی کہہ دیں تو مشبہ مشبہ بہ کا ایک ہونا لازم آ جاوے۔ جو بدیہی البطلان ہیں۔ حقانی

قول شیخ کا اس دلیل ثبوتِ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا ہم نے شروع فصل میں ذکر کیا تھا اعنی اس عالم کو مبدءِ فیاض سے بتوسط ملائکہ فیضان ہوتا ہے اور ہر جزءِ عالم پر ایک فرشتہ مؤکل ہے کہ جس کو رب النوع کہتے ہیں جو کچھ عالم میں تصرفات ہورہے ہیں وہ سب ملائکہ کی معرفت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت شیخ ملائکہ کو انسانِ کبیر یعنی عالم کے لیے بمنزلہ ارواح کے کہتے ہیں۔ اب اس سے ملائکہ کا ثبوت پایا گیا نہ کہ نفی۔ آپ نے شیخ کے کونسے جملے سے یہ سمجھ لیا کہ ملائکہ کے لیے وجود جداگانہ نہیں؟ اب کان کھول کر سنیئے یہ کلام ہمارے مدعا کو مفید ہے چند وجہ سے: (اول) یہ کہ حضرت شیخ انسانِ کبیر یعنی عالم کو انسان کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور جس طرح اس میں قوٰی ہیں اسی طرح ملائکہ کو عالم کے لیے بمنزلہ قوٰی کے کہتے ہیں۔

(دوم) اگر ملائکہ سے مراد قوٰی ہوں تو مشبہ اور مشبہ بہ کا اتحاد لازم آوے جو بدیہی البطلان ہے اور یہ قول حضرت شیخ کا فالملائکۃ کالقوٰی درست نہ ہوئے۔

(سوم) اگر یہ تشبیہ بھی لحاظ نہ کی جاوے تب بھی یہ کوئی قرینہ صارفہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ جس سے ان آیات کو (کہ جن میں ملائکہ کا وجود جداگانہ اور ان کے افعال مذکور ہیں) مجاز پر محمول کیا جاوے اور تمام کتبِ سماویہ اور احادیثِ نبویہ کو تحریف کیا جاوے۔

(چہارم) صوفیہ کرام بعد تسلیم کرنے معانی ظاہرہ قرآن مجید کے اس میں سے اشارۃً حقائق و معارف پیدا کرتے ہیں ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کے معنیِ ظاہرہ مراد نہیں۔ کیا حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے قصہ کو روح و نفس پر محمول کرنے سے حضرت یعقوب و یوسف کے وجود کی نفی ہوسکتی ہے؟ حاشا و کلا۔ اور اگر یہی ہو تو پھر قرآن و احادیث کا کچھ بھی اعتبار نہ رہے شریعت کا کوئی مسئلہ ثابت نہ ہوسکے۔

(پنجم) اگر ہم سید صاحب کی فہمِ رسا کے موافق حضرت شیخ کے کلام کا یہی مطلب تسلیم کرلیں تو پھر سید صاحب کے حق میں اچھا نہ ہووے کیونکہ بڑے زور شور سے سید صاحب ملائکہ کو صفاتِ باری کہہ چکے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کبھی وحی اور کبھی ملکۂ نبوت باعثِ وحی بنا چکے ہیں۔ پھر اب ان کو قوائے عالم کہنا (جو صفاتِ[1] باری سے مغائر ہیں) اجتماع الضدین کا قائل ہونا ہے۔

قولہ ص ۵۱ پس شیخ اور ان کے متبع بھی ملائکہ کا اطلاق صرف قوائے عالم پر کرتے ہیں الخ۔

اقول سید صاحب اب بھی ایسی بات منہ سے نکالنا بڑی شرم کی بات ہے۔ ضد کرنا اہلِ انصاف کی شان سے بعید ہے۔

قولہ ص ۵۱ شیطان کی نسبت تو قیصری شرح فصوص میں نہایت صاف صاف وہی بات لکھی ہے جو ہم نے کہی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بعض نے یہ بات کہی ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم میں جو قوتِ وہمیہ کلیہ ہے وہی ابلیس ہے اور ہر ایک انسان

[1] کس لیے کہ صفاتِ باری اور قوائے عالم کبھی ایک چیز نہیں ہوسکتی۔ مثلاً منجملہ قوائے عالم کے نباتات میں ایک قوتِ غازیہ یا مولدہ پائی جاتی ہے کہ جس سے ہر درخت اپنی غذا حاصل کرسکتا اور اپنا بچہ دوسرا درخت اپنے تخم سے پیدا کرتا ہے اب کوئی ذی شعور اس قوتِ غاذیہ اور مولدہ کو صفاتِ باری نہ کہے گا۔ ورنہ لازم آوے کہ خدا تعالیٰ غذا کھاتا اور بچے جنتا ہے تعالیٰ اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔ ۱۲ منہ

میں جو قوتِ وہمیہ ہے وہی ابلیس کے ذریات ہیں۔

اقول اس کا وہی جواب ہے جواب بیان ہوا۔ اس کو غور سے پڑھ لیجئے۔

قولہ[1] خدا نے فرمایا کہ جو وسوسے دل میں آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔

اقول اس سے شیطان معہود کی نفی کیونکر سمجھی گئی؟

قولہ اور فرمایا ہے نفس ہی برائی کرنے کو کہتا ہے۔

اقول یہ لفظ ہی جو نفس کے بعد آپ نے زیادہ کیا وہ بے اصل ہے اس سے بھی نفی شیطان کی نہیں ہوتی۔

قولہ آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا ہے کہ سب دشمنوں سے زیادہ دشمن بڑا نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے اور آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شیطان انسان میں خون کی طرح چلتا ہے۔

اقول ان احادیث سے بھی کسی طرح نفی نہیں پائی جاتی علاوہ پہلے جواب کے یہاں ایک اور بات زائد ملاحظہ فرمایئے کیا ان احادیث و آیات و کلامِ قیصری کا دوسرا محمل صحیح نہیں نکل سکتا کیا ان سے مراد قوتِ وہمیہ نہیں ہوسکتی؟ یا قوتِ بہیمیہ کو شیطان اور ابلیس اور ہر شخص کی قوتِ بہیمیہ کو ذریاتِ ابلیس استعارہ کے طور پر نہیں کہہ سکتے؟ کیا اس استعارہ کے لیے وصف جامع اضلال و اغواء نہیں پایا جاتا یا قرنیہ صارفہ آیاتِ مذکورہ بالا نہیں ہوسکتیں؟ اگر اس علاقۂ تشبیہ سے قوتِ بہیمیہ کو شیطان کہنے سے آپ حقیقی شیطان یعنی شخصِ معہود سمجھ بیٹھے تو آپ کو لازم ہے کہ ہم جب زید کو شیر کہیں تو آپ حقیقی شیر کے وجود کی نفی کریں اور زید ہی کو حقیقی شیر قرار دیویں۔

قولہ ص ۵۲ غرضیکہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں قوٰی کو جو انسان میں ہیں اور جن کو نفسِ امارہ یا قوائے بہیمیہ سے تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے۔

اقول تمام محققین سے آپ کی مراد حقہ پینے والے ہوں گے ورنہ اہلِ تحقیق تو کیا ذرا سی عقل والے بھی ایسی بے اصل بات نہ کہیں گے پھر ایسی ہی بے بنیاد بات پر یہ غل تھا کہ تہذیب الاخلاق کے پرچے کے پرچے اس بارہ میں سیاہ کردیے اور تفسیر القرآن کو انہیں مضامین سے بھر دیا۔ جناب عالی یہ تو آپ کا پرانا [illegible] راسخ ہے۔ آپ اس غلطی سے کاہے کو باز آئیں گے۔

قولہ ص ۵۲ اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدا تعالیٰ انسان کی فطرت کو اور اس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جو قوائے بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یا ان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے مگر یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ

[1] شاید آپ کو اس بات سے مغالطہ پڑ گیا کہ شیطان اور جبرئیل کی نسبت دل میں القاء کرنا اور خون کی مانند بدن میں سرایت کرنا اور ملائکہ کی نسبت تدبیرِ عالم کرنا مذکور ہے اور یہ باتیں آپ کے ذہنِ سلیم میں قوی کے خواصِ مختصہ میں سے شمار کی گئی ہیں۔ اس لیے آپ کو شبہ ہوا کہ شیطان اور جبرئیل اور ملائکہ قوٰی ہی کا نام ہے۔ پھر اس خیال کو آپ نے یہاں تک پکایا کہ جن آیات میں ان چیزوں کا بصراحت ذکر ہے ان کو آپ نے یہود کی تقلید سمجھا حالانکہ آپ کا خواصِ مختصہ سمجھنا غلط ہے کیونکہ مجردات ہالطیف الجسم چیزوں سے یہ سب باتیں ممکن ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر کس طرح روح القدس کا ظہور ہوتا تھا کہ وہ غیر زبانوں میں کلام کرنے لگتے تھے۔ ۱۲ منہ

چرانے والوں کی فہم سے بہت دور تھا۔ الخ۔

آپ ان چیزوں کے منکر اور ماؤل ہو کر دل میں خوش ہو گئے کہ یہ خیالات پیدا کرنا میرا ہی حصہ ہے کسی اہلِ اسلام کو یہ باتیں کبھی نصیب نہ ہوئی ہوں گی۔ اور آپ کے معتقد بھی یہی خیال کر کے آپ کے خیالات کو واجب الایمان سمجھتے ہیں ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
خواجہ را حاصل بجز پندار نیست

عمدہ تحقیقاتِ جناب کا حال یہ ہے کہ وہ ملحدوں اور دہریوں اور بعض حکماءِ بیدین کے پرانے خیالات ہیں کہ جو ان کی کتابوں میں اب تک موجود ہیں اور کچھ اس وقت کے پادریوں اور لامذہبوں کے اعتراضات ہیں مگر آپ نے ان کو ذرا بدل کر لکھا ہے اور ان کے ثبوت میں یہ کمال ضرور کیا ہے کہ قرآن و احادیث و کلامِ قدماء کو محرف کر کے کم علم لوگوں کو شک میں ڈال دیا ہے۔ حالانکہ یہ الحاد اور بے دینی کی باتیں آپ سے صدہا سال پیشتر مشہور ہو چکی ہیں۔ علماءِ اسلام نے ان کے جواب شافی دیے ہیں اور اس زمانہ میں جو کچھ دہریوں کے خیالات انگریزی اور فرانسیسی اور جرمنی اور عربی زبان میں بذریعہ کتب و اخبارات جو کچھ یورپ میں مشتہر ہوئے اور ہو رہے ہیں ان سے بھی اہلِ اسلام غافل نہیں ان کے دندان شکن جواب جو اسلامیوں نے دیے ہیں ان کا عُشرِ عشیر بھی حضور کے کان تک نہیں پہنچا کچھ تنہا آپ ہی نے یورپ کی سیر نہیں کی ہے اور آپ اچھی طرح نہ عربی قدیم جانتے ہیں نہ جدید، نہ یونانی نہ عبرانی، نہ یورپ کی اور زبانوں میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ پھر جو کچھ آپ کا مایۂ تحقیقات ہے وہ خود پسندی اور عجب ہو اس وقت آپ جن جن چیزوں کا انکار کر رہے ہیں ان کا بے دینوں کے اقوال میں نشان بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو یہاں ان چیزوں کا انکار ہے:

(۱) وجودِ ملائکہ کا عموماً جبرئیل و میکائیل کا خصوصاً اور ان کے افعال اور متحیز ہونے وغیرہ باتوں کا۔

(۲) شیطان کا انکار۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام کا انکار (آپ آدم سے مراد نوعِ انسانی رکھتے ہیں)۔

(۴) حضرت آدم کو ملائکہ کے سجدہ کرنے اور شیطان کے تکبر کرنے کا انکار بلکہ اس قصہ کو آپ انسان کے قوٰی کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ کے تمرد پر محمول کرتے ہیں۔

(۵) حضرت آدم علیہ السلام کے جنت میں رہنے پھر بسبب گناہ کے وہاں سے نکالے جانے کا انکار۔

(۶) جنت اور اس کے نعماء کا انکار علاوہ ان کے اور خاص خاص چیزوں کا بھی آپ نے انکار کیا ہے جیسا کہ کل انبیاء کے معجزات اور ان کے خرقِ عادات۔

چنانچہ ان باتوں کا ہم اپنی تفسیر میں ہر موقع پر ذکر کر کے جواب باصواب دیویں گے۔ اول تو یہ یاد رکھئے کہ صدہا برس سے اہلِ اسلام میں یہودی اور مجوسی اور دیگر مذاہب کے لوگ بہ لباسِ اسلام ملے جلے رہتے ہیں اور پیرایۂ اسلام میں ہزاروں بدعتیں ایجاد کرتے اور قرآن و حدیث کے عمدہ مطالب کا انکار تاویلات کے پیرایہ میں کرتے ہیں اور اسی طرح بہت سے ملحد لوگ فلسفی تقریروں میں مسلمان کہلا کر اصولِ اسلام کے قلع و قمع میں دریغ نہیں کرتے اور ہمارے اس دعوے کے دو شاہدِ عدل

ہیں۔

(اول) یہ کہ جب سے ایسے لوگ اسلام میں آئے تب ہی سے مسلمانوں میں اختلاف واقع ہوا اور مذاہبِ مختلفہ پیدا ہو گئے۔ اب ہر ایک فریقِ غالی کے اعتقادات کو دیکھ لیجئے کہ ان میں اب تک الحاد اور مجوسیت اور یہودیت اور تنصر اور فلسفے کی بو آتی ہے کہ جس سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ان مذاہب کے موجد برائے نام مسلمان تھے۔

(دوم) بعض کتب سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ دبستان المذاہب کے صفحہ ۸۳ میں آخشون کی نسبت یوں لکھا ہے کہ ''صاحبان این مذہب ہمہ با اہلِ اسلام آمیختہ اند و بکسوتِ ایشان جلوہ گر اند نام مسلمانان ہم دارند و نام دیگر بر کیش خویش۔'' اور اسی طرح مژدکیوں کی نسبت صفحہ ۱۳۴ میں لکھا ہے کہ اکنوں مژدکیاں درلباس گری نیستند درمیانِ اہلِ اسلام پنہاں شدہ رہ سپر کیش خویش اند۔ اور کتاب دساتیر کے چودھویں نامہ میں اس بات کی پیشین گوئی ہے کہ مسلمانوں میں جب باہم خصومت پیدا ہو گی تو ایرانی لوگ مذہبِ اسلام میں داخل ہو کر اپنے قدیم مذہب کی باتوں کو یہاں تک رواج دیں گے کہ اصل اسلام برائے نام باقی رہ جائے گا۔ یہ بات تو ہم نے بھی آنکھ سے دیکھ لی۔

جب آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی تو میں اب خاں صاحب کے عقائدِ مذکورہ کا حوالہ دیتا ہوں۔ دبستان المذاہب کی تعلیم اول قواعد زردشتیوں کے بیان میں لکھا ہے کہ ملائکہ سے مراد صفاتِ حمیدہ ہیں صفحہ ۱۲۶۔ اور اسی طرح اعمالِ متشرعہ ہنود کے بیان میں لکھا ہے کہ جہنم کے طبقات اور جنت کے درجات اور اعمال کی جزاء و سزا محض خیالی باتیں ہیں۔ صفحہ ۱۶۷ دبستان المذاہب کے صفحہ ۳۴۳ نظر اول میں عقائدِ حکماء کے بیان میں یوں لکھا ہے کہ ''پیوستنِ روح بہ بدن راندن آدم ست از بہشت و میل بہ بدن فرمان بردن حوا و کردار نکوہیدہ خوردن شجرہ منہیہ مار خشم و طاؤس شہوت است و گفتہ اند ابلیس عبارت از قوتِ وہمی کہ پیرو محسوسات است و عالمِ معقولات را منکر است و با قوتِ عقلی در ستیزد۔ و آنچہ در شرع آمدہ کہ ہمہ فرشتگان آدم را سجدہ کردند مگر ابلیس اشارت است بایں معنی کہ ہمہ قوائے جسمانی کہ فرشتگانِ ارضی اند مطیع روح آدم اند مگر قوتِ وہمی کہ سرکش است انتہیٰ۔ یعنی آدم کا جنت سے نکالا جانا رمز ہے اس بات کی طرف کہ ان کی روح بدن میں ڈالی گئی یعنی آدم کی روح کا ان کے بدن میں پھونکنا جنت سے نکالا جانا ہے اور مراد حوا کی نافرمان برداری سے بدن کی طرف میلان کرنا ہے۔ شجرۂ منہیہ کھانے سے مراد بد خصلتیں ہیں اور سانپ سے مراد غصہ اور مور سے مراد شہوت ہے اور شیطان سے مراد قوتِ وہمیہ ہے جو عالمِ معقولات کی منکر اور محسوسات کی پیرو اور عقل سے معارضہ کرنے والی ہے اور یہ جو شرع میں آیا ہے کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے نہ کیا تو اس سے یہ مراد ہے کہ قوائے جسمانی جو زمین کے فرشتے ہیں آدم کی روح کے مسخر ہو گئیں اور قوتِ وہمیہ نے سرکشی کی۔

اسی طرح فرقہ صادقیہ جو مسیلمہ کذاب کا پیرو ہے ان کے حالات دبستان المذاہب کے صفحہ ۲۹۹ میں یوں لکھے ہیں۔ مسیلمہ کذاب جس کو کتابِ آسمانی کہتا تھا اس کی دو جلد ہیں پہلی کا نام فاروق اول اور دوسری کا نام فاروق دوم ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کوئی شیطان نہیں ہے اور نہ خدا کسی کو غیر اللہ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا ہے انتہیٰ۔

کتاب الملل والنحل محمد[1] بن عبد الکریم شہرستانی مطبوعہ مصر کی جلد دوم صفحہ ۸۶ میں عقائد حکماءِ مشائین کے بیان میں

[1] یہ شخص بڑا فاضل بلکہ حکماءِ اسلام میں شمار ہے، اس کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی ہے۔ ۱۲ منہ

یوں لکھا ہے کہ ''جن لوگوں کو قوتِ قدسیہ نصیب ہوتی ہے (یعنی انبیاء) ان کی قوتِ خیالیہ اس درجہ کی قوی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ادراکات کو بصورتِ جمیلہ دیکھتے اور ان کا عمدہ کلام سنتے ہیں یعنی در اصل نہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے نہ کوئی آواز یا کلام ان کو سنائی دیتا ہے بلکہ محض ان کے وہ معلومات (جو ان کو مبدءِ فیاض سے عطا ہوئے ہیں) کسی عمدہ شکل میں نظر آتے اور نہایت عمدہ دلچسپ کلام کرتے ہیں۔ پس وہ فرشتہ جو نبی (علیہ السلام) کو دکھلائی دیتا تھا وہ یہی تھا اور وہ وحی اور الہام یہی آواز تھی۔

''سید صاحب نے اسی بات کو کس برے عنوان سے بیان کیا ہے اور انبیاء کو مجنونوں سے تشبیہ دے کر کس گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں؟ اسی طرح کتاب الملل والنحل کی جلد دوم ص ۶۷ میں بعض حکماء کا جنت کی نسبت یوں عقیدہ لکھا ہے کہ ''نبی لوگوں کو آخرت کی ترغیب دیا کرتے ہیں اور وہاں کے ثواب و عقاب مثالوں میں لوگوں کے اطمینانِ قلب کے لیے بتلاتے ہیں اور درحقیقت وہ ایک امرِ محل ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور ''اول جلد کے صفحہ ۱۰۴ میں بعض اہلِ ہواء کا یہ عقیدہ لکھا ہے کہ ان کے نزدیک سوائے عالمِ محسوس کے اور کوئی عالم نہیں۔ ان کا ہر بات میں اپنے ذہنِ صافی اور فطرتِ سلیمہ پر (جس کو سید صاحب نیچر کہتے ہیں) اعتمادِ کلی ہے (نہ وہ جن کے قائل ہیں نہ فرشتوں کے نہ کسی امرِ خارقِ عادت کے) اور اس گروہ کا نام طبیعہ دہریہ ہے۔ اور ان میں جو بعض لوگ کسی قدر ترقی یافتہ ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت اور اس کے احکام، حرام و حلال، مصلحتِ عباد اور رفاہِ بلاد کے لیے رفارمر[1] لوگوں نے اپنی طبیعتِ صافیہ سے مقرر کر دیے ہیں اور وہ جن روحانی چیزوں کی خبر دیتے ہیں جیسا کہ لوح و قلم و عرش و کرسی ملائکہ وغیرہا سو وہ درحقیقت ان کے خیالات ہیں کہ جن کو وہ جسمانی صورتوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور اسی طرح آخرت کے احوال، جنت اور حور و قصور اور نہر و میوہ جات جو وہ بیان کرتے ہیں محض عوام کی طبیعتوں کو رجوع کرنے کی باتیں ہیں اور اسی طرح دوزخ اور اس کے عذابِ طوق وغیرہ بھی لوگوں کو ڈرانے کے لیے بیان کرتے ہیں کہ ان سے ڈر کر ان امورِ مصلحت پر کہ جن کو انہوں نے واجب و فرض بتایا ہے چلیں اور جن نامناسب چیزوں سے کہ مصلحتِ وقت جان کر منع کیا اور حرام و مکروہ کہا ان سے بچیں۔ ورنہ عالمِ آخرت میں جو کہ علوی عالم ہے صورِ جسمانی اور اشکالِ جرمانی کہاں؟ اور یہ تو عام حکماءِ مشائین کا عقیدہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور اس میں جس قدر انواع ہیں وہ بھی سب قدیم ہیں چنانچہ نوعِ انسانی بھی قدیم ہے۔ ان کے نزدیک یہ بات (کہ ابتدا نوعِ انسان کی حضرت آدم علیہ السلام سے ہے) محض غلط ہے چنانچہ اسی کتاب ملل والنحل کی اخیر جلد میں اور اس کے سوائے اور کتبِ الٰہیات میں اس کی تصریح ہے۔

اب رہے انبیاء علیہم السلام کے معجزات تو ان کے تو صدہا آدمی منکر ہیں ایسے لوگوں کے حالات سے یہی کتاب اور دبستان المذاہب وغیرہ بھری پڑی ہیں۔ اور جلال الدین اکبر بادشاہ دہلی کے روبرو تو بڑے زور کے ساتھ ایک بڑے دہریہ نے بمقابلہ اہلِ اسلام و اہلِ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عبورِ قلزم کا انکار کیا تھا۔ چنانچہ دبستان المذاہب میں اس کی خوب تصریح ہے۔ اب فرمائیے سید صاحب آپ نے وہ کونسی نئی بات ایجاد کی ہے؟ ایسے ایسے خیالات کے لوگ ہر زمانہ میں کتبِ سماویہ کی نسبت اعتراضات کرتے آئے ہیں اور ان میں سے مہذب لوگوں نے ان اعتراضات کو تاویلات کے پیرایہ

۱ ناصحین و واعظین۔ ۱۲ منہ

میں بیان کیا ہے بہر طور مدعا واحد ہے۔

اب ہم آپ کے اس قول کی شرح کرتے ہیں: قولہ اصل یہ کہ ان آیات میں الخ؟ جناب عالی اگر آپ کی یہ مراد ہے کہ قرآن مجید کی عبارت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہر دوسرا باطن جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور آپ باطنی پہلو سے اس رمز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسا کہ صوفیہ کرام قصۂ یوسف و زلیخا سے اور اور نکات مراد لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں ایسے ایسے حقائق و دقائق نکالے ہیں تو آپ کا یہ فرمانا کہ یہ ایک نہایت دقیق راز تھا جو عام لوگوں کے اور اونٹ چرانے والے لوگوں کی فہم سے بہت دور تھا الخ بجا ہے۔ ہمارا بھی اس پر صاد ہے۔ اور اگر یہ مقصود ہے کہ اس کلام کے محض یہی معنی ہیں اور ظاہر عبارتِ قرآن سے جو کچھ مفہوم ہوتا ہے (کہ آدم کو خدا نے پیدا کر کے طرح طرح کے علوم سے آراستہ کیا اور پھر فرشتوں کو سجدۂ تعظیم کا حکم دیا شیطان کے سوا سب نے سرِ تعظیم جھکایا اور آدم کو مع اس کے زوجہ کے جنت میں رہنے کا حکم دیا پھر وہ بسبب اغواءِ شیطان کے جنت سے نکالے گئے (الخ) وہ بے اصل باتیں اور یہود کے خیالات کا اعادہ ہے تو یہ کلام آپ کا سراسر غلط ہے بچند وجہ:

(۱) یوں کہ آپ خود تفسیر سورۂ آل عمران کے صفحہ ۳ میں فرماتے ہیں: قولہ قرآن مجید تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ذی علم دانشمند اس سے ہدایت پاویں اسی طرح جاہل و نادان عوام بھیڑوں اور بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے بھی ویسی ہی ہدایت پاویں۔ (الخ) قولہ جن پر آیاتِ متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے اگر اس کے ایک پہلو پر خیال کرو تو اس سے وہ مطلب پایا جاتا ہے جو عوام کے خیالات الخ۔ کے مناسب ہوتا ہے الخ اب ذرا آپ ہی انصاف فرمادیں کہ جب آپ کے نزدیک آیاتِ متشابہات میں بھی ظاہر معانی ہر ایک کی سمجھ کے موافق ہونے ضرور ہیں تو آیاتِ محکمات کو بالخصوص ان مضامین کو کہ جن کو بیشمار مواضع میں نئی نئی عبارتوں سے بیان کیا گیا ہے یہ امر از حد ضرور ہے کہ اس کو عوام لوگ بھیڑ اور بکری اور اونٹ چرانے والے بھی سمجھیں۔ پھر جب وہ معماء جو آپ نے قرار دیا ہے اس کو سوائے آپ کے کوئی بھی نہیں سمجھتا نہ عالم نہ جاہل تو اس کے غلط ہونے میں کیا شبہ باقی ہے؟

(۲) یہ معما جو آپ نے قرار دیا ہے اس کو قرآن میں تخمیناً دس بارہ سورتوں میں مختلف طور پر مختلف الفاظ سے بیان کیا ہے اور ایک آیت نہیں رکوع کے رکوع اسی بیان میں ہیں۔ حالانکہ ان میں کسی جگہ سے کوئی ایسا قرینہ لفظیہ یا معنویہ آپ نے نہیں بیان کیا کہ جو ان عبارات کے حقیقی معنی پر محمول کرنے سے مانع آوے۔ پس جب ایسا کوئی قرینہ نہیں تو حقیقی معنی کا انکار کرنا محض سینہ زوری بلکہ خدا پاک کے کلام کی تکذیب ہے۔

(۳) اس قدر آیات میں خدا نے اس قصہ کو طول دیا اور پہلی کتابوں میں بھی پہلے انبیاء کی معرفت اسی طرح بیان کرتا گیا۔ پھر کیا خدا کو وہ صاف مطلب (جو آپ کے سے انسانِ بے بنیان نے تھوڑی سی عبارت میں اس طرح بیان کر دیا کہ جس کو عالم و جاہل سب سمجھنے لگے) بیان کرنا نہ آیا؟ پھر آپ کس بنیاد پر قرآن کو فصیح و بلیغ کہتے ہیں؟ اس کے مصنف سے تو معاذ اللہ آپ ہی زیادہ فصیح و بلیغ ہیں کہ جس نے ہزار ہا سال کے ایک ایسے معما کو جو خدا سے کبھی بیان نہ کیا گیا تیرھویں صدی میں بیان کر دیا تعالی اللہ عن ذٰلک علوًا کبیرًا

(۴) اس بات کو ہر ذی عقل تسلیم کرتا ہے کہ ہر کلام کو کما ینبغی اس کا متکلم سمجھتا ہے کیونکہ اپنے کلام میں صراحۃً یا اشارۃً جو کچھ اس نے مراد رکھی ہے اس کو وہی خوب جانتا ہے اور یہ بات اور ہے کہ اس کے مقصودِ اصلی کے علاوہ کوئی طبّاع آدمی اور نئے نئے احتمالات اپنی طرف سے پیدا کر دے۔ بعد اس کے وہ خوب سمجھتا ہے کہ جو اس کلام کا مخاطب ہے بشرطیکہ اس کو فہمِ سلیم ہو اور زبان دان بھی ہو پھر اس کے ہمزبان خصوصاً وہ لوگ کہ جو کلام کے خارجی احوال پر بھی واقف ہوں اور متکلم کے عادات وخو بو و طرزِ سخن سے ماہر ہوں اس کے بعد عام اہلِ زبان سمجھتے ہیں۔ اب ہم ہیں کہ قرآن مجید کلامِ خداءِ پاک ہے اور مخاطب بالذات حضرت پیغمبر علیہ السلام اور ہمزبان و ہمزماں صحابہ کبار اور اہلِ زبان عرب العربا۔ آپ انصاف کی نظر سے فرمایئے کہ یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں صحیح ہیں یا نہیں؟ پس جب صحیح ہیں تو آپ کو بعد دعویٰ کرنے اس معماء کے یہ ضرور تھا کہ ان مطالب کا ثبوت کہ جن کے آپ قائل ہیں یا تو خود خدا پاک کے کلام سے بصراحت ثابت کرتے یا اس کے مخاطب بالذات پیغمبر علیہ السلام سے بروایتِ صحیحہ ثابت کر دیتے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان آیات کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں ادنیٰ درجہ ہے کہ ساری عمر میں کبھی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اس معماء کی خبر دی ہو یا آپ کسی صحابی کی تفسیر سے یہ معنی ثابت کر دیتے ورنہ خیر کسی محقق زبان دان عرب العرباء مفسر ہی کے قول سے ثبوت پہنچا دیتے۔ جب یہ نہیں تو زید وعمرو کی تاویلات کی نصوصِ قرآنیہ کے مقابلہ میں کیا وقعت ہے؟

قولہ ص ۸۲ تا کہ ہر کوئی خواہ اس کو فطرت کا راز سمجھے خواہ فرشتوں اور خدا کا مباحثہ خواہ شیطان و خدا کا جھگڑا، اصلی مقصد حاصل کرنے سے محروم نہ رہے الخ۔

یہاں تو آپ صاف اقرار کرتے ہیں کہ جو اس آیت کے ظاہری معنی سمجھے گا اس کا بھی مقصد حاصل ہو جائے گا۔ پس جب آپ نے ظاہری اور حقیقی معنی کو مقصدِ قرآن کہا تو پھر یہ کہنا قولہ اذ قال الملائکۃ کو بھی انہوں نے ویسا ہی سمجھا اور آدم و شیطان کا قصہ بنا لیا الخ اقرار کر کے انکار کرنا ہے مگر اس خود پسندی کا کیا ٹھکانا ہے تمام عالم کا خلاف بلا دلیل کرنا اور پھر اس کو حق الیقین سمجھنا آپ ہی کا کام ہے۔

قولہ ص ۵۵ آدم کے لفظ سے وہ ذاتِ خاص مراد نہیں ہے جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملا باوا آدم کہتے ہیں بلکہ اس سے نوعِ انسانی مراد ہے جیسا کہ تفسیر کشف السرار وہتک الاستار میں لکھا ہے وما المقصود بآدم آدم وحدہ الخ۔

اقول یہاں سے یہ تو معلوم ہوا کہ آپ کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ جہاں آپ کے خیالات کی تائید میں کوئی قول بھی کسی شخص کا آپ کو ملتا ہے خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور خواہ آپ کے مدعا کے لیے بنظرِ غور مخالف ہی کیوں نہ ہو مگر ذرا سا لگاؤ ہونا چاہیے آپ بے سمجھے بوجھے اس کو نقل کر دیتے ہیں اور جہاں آپ کو کوئی قول بھی نہیں ملتا تو آپ وہاں تنہا رہ جاتے ہیں اور اگر آپ کے برخلاف اسی قائل کا قول بلکہ صریح آیت واحادیث بھی ہوں تو نہیں مانتے۔ یہ بات انصاف سے نہایت بعید ہے۔ جنابِ عالی آپ نے جو یہاں وجودِ آدم علیہ السلام کا انکار کیا کس دلیل سے مگر دلیل کہاں محض اپنا خیال۔ اور اس قول کا یہ جواب ہے کہ اول تو یہ بات خوب معلوم نہیں کہ صاحبِ کشف الاسرار کس مرتبہ کے شخص ہیں۔ آیا ایسے بھی ہیں کہ ان کے قول سے قرآن کی آیت متروک ہو سکتی ہے؟

دوم صاحبِ کشف الاسرار حاشا وکلا یہ نہیں کہتے کہ جو تم سمجھتے ہو یہ انکارِ آدم اہلِ اسلام میں بتقلیدِ فلاسفہ آپ ہی کا ایجاد ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ما المقصود بآدم آدم وحدہ کہ اس جگہ لفظ آدم سے صرف آدم نہ مراد لینا چاہیے بلکہ اس کی ذریت بھی۔ اب یہاں سے آدم کی نفی کیونکر سمجھی گئی؟ آپ کو کوئی یوں کہے کہ آپ اکیلے مراد نہیں بلاشک آپ اس کلام سے یہ سمجھیں گے کہ آپ بھی اور آپ کے ساتھ اور بھی مراد ہیں نہ یہ کہ آپ مراد ہی نہیں۔ آپ وجودِ آدم کا کہاں تک انکار کریں گے۔ قرآن مجید میں بہت آیات سے حضرت آدم کا وجود جداگانہ پایا جاتا ہے منجملہ ان کے یہ آیت ہے

(۱) وَبَدَءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ اس میں صاف تصریح ہے کہ آدم کو مٹی سے بنایا اور اس کی اولاد کو منی سے بنایا اگر حضرت آدم علیہ السلام کوئی شخصِ خاص نہیں تو پھر یہ نوعِ انسانی پر کیونکر صادق آ سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کو مٹی سے اور اس کی نسل کو نطفہ سے پیدا کیا۔ کس لیے کہ تمام نوع اس بات میں برابر ہے اور پھر نوع کی نسل کیا معنی رکھتی ہے؟

(۲) يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ الآية اگر آدم سے مراد نوعِ انسانی ہے تو اس میں مرد وعورت دونوں شریک ہیں لفظ آدم اس تقدیر پر دونوں کو شامل ہے پھر اس نوعِ انسانی کی وجہ کیا ہے کہ جس کو انسان کے برابر خطاب میں ملحوظ رکھ کر ہر جگہ تثنیہ کا صیغہ بولا ہے۔

(۳) اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ اس آیت میں بھی تصریح کی ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے حضرت آدم علیہ السلام بھی۔ اب سب سے زیادہ اس بارہ میں آپ کے مقابلہ میں خود آپ کا قول (جو تفسیر سورہ آل عمران کے صفحہ ۴ میں ہے) کافی ہے قولہ کیونکہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں الخ۔

(سوال) اگر آپ یہ فرماویں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وجود کا ہم کو انکار نہیں البتہ اس قصہ میں تنہا آدم مراد نہیں۔

(جواب) یہ کہ پھر وہ کونسی وجہ ہے کہ جس سے آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کا مقصود ہونا اس قصہ میں رد کیا؟ پس اب آپ اس قصہ میں کسی طرح آدم علیہ السلام کا انکار نہیں کر سکتے اب آگے اس قصہ کی نسبت فرمایئے کیا فرماتے ہیں؟ قولہ ص ۷۵ مگر میرے نزدیک ہُم کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے الخ گویا خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کے جاننے کی قوت انسان میں اور اس کی ذریت میں ودیعت رکھ کر تنزلاً[2] فرشتوں سے کہا کہ تم سب باتیں تو کیا بتاؤ گے۔ یہاں چند غلطیاں آپ سے سرزد ہوئیں۔

(۱) یہ کہ اگر ہُم کا مرجع آدم ہیں۔[3] باعتبار نوعیت کے تو کیا ضمیر مفرد مناسب نہ تھی؟ پس عرضہم کہنا تطویل بلا فائدہ تھی

---

۱ جب آپ کے نزدیک فرشتے سے قوائے ملکوتیہ مراد ہیں تو پھر ان سے سوال کرنا فضول ہے۔ ۱۲ منہ

۲ اس آیت نے پہلے شک کو بالکل دور کر دیا اور آدم سے مراد نوعِ انسانی نہیں ہے چونکہ آیت میں لفظ کلا کا جو تثنیہ کے واسطے آتا ہے آیا ہے اگر آدم سے مراد نوع ہوتی تو تثنیہ کا صیغہ مستعمل نہ ہوتا۔ ابوالحسن حقانی

۳ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات معترض علمیت سے عاری ہیں قیاسی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ حقانی

بجائے اس کے لیے لفظ عرضہ نہایت مناسب تھا۔ اگر آپ یوں کہیں کہ معنی کی رعایت بلحاظ افرادِ نوع ضروری تھی تو آپ یا آدم اسکن انت میں کیا جواب دیں گے پھر وہاں کیوں ان انواع کی رعایت کر کے اسکنوا نہ فرمایا؟ اور بالفرض اگر افراد کا لحاظ تھا تو کیا آدم کے ساتھ ایک فرد اس کی زوجہ ہی تھی جو لفظ تثنیہ بولا گیا جس سے صاف معلوم ہوا کہ جنس یا نوع قطعاً مراد نہیں ہوسکتی۔

(۲) اسماء سے مراد آپ کے نزدیک قوٰی ہیں قولہ ان قوٰی کو جو اسماء کے لفظ سے تعبیر کیا الخ اور قوٰی کی آپ کے نزدیک دو قسم ہیں ایک قوائے ملکوتیہ جن کو آپ فرشتے کہتے ہیں دوسرے قوائے بہیمیہ جن کو آپ شیطان کہتے ہیں اور انسان سے مراد ان قوٰی کا مجموعہ لیتے ہیں تو اس تقدیر پر ثم عرضھم علی الملائکۃ کی یہ معنی ہوئے کہ مجموعۂ قوائے ملکوتیہ اور بہیمیہ کو قوائے ملکوتیہ کے سامنے کیا جس سے یہ لازم آیا کہ قوائے ملکوتیہ کو قوائے ملکوتیہ کے سامنے کر کے مباحثہ کرایا و فسادہ ممالا یخفی۔

(۳) یا آدم انبئھم باسمائھم کے یہ معنی ہوئے کہ اے مجموعۂ قوائے ملکوتیہ و بہیمیہ تو ان کو یعنی قوائے ملکوتیہ کو قوائے ملکویۃ بتلاوے کیونکہ آپ فرما چکے ہیں کہ انبئھم اور اسمائھم میں جو ھم ضمیر ہے وہ فرشتوں کی طرف راجع ہے الخ اب اس کلام کے مہمل ہونے میں کیا شک باقی رہ گیا؟

(۴) انبئونی باسماء ھولاء کے یہ معنی ہوئے کہ اے قوائے ملکوتیہ تم مجھ کو قوائے ملکوتیہ ان چیزوں کی بتلا دو۔ اب ھولاء جو اسماء کا مضاف الیہ وہ کیا چیز ہیں؟

(۵) جب آدم مجموعۂ قوٰی ہے تو اس کو اس کے قوٰی سکھلانے کے کیا معنی ہیں؟ پھر یہ قول و علم آدم الاسماء کلھا محض بے معنی ہے۔

(۶) جب فرشتے جزءِ آدم ٹھیرے اور اس کے قوٰی میں شمار کئے گئے تو پھر آپ کا یہ فرمانا کہ فرشتوں سے کہا گیا الخ محض بے معنی کلام ہے کیونکہ قوٰی کا امتحان کرنا اور پھر ان قوٰی کا حال انہیں سے دریافت کرنا اور ان کا اپنی ذات کے علم سے عاجز آجانا جو علمِ حضوری ہے کہ جس سے کوئی ذی عقل محروم نہیں اور پھر آدم سے اس کے قوٰی کا حال دریافت کر کے پھر اسی کے قوٰی کو ملامت کرنا اور الم اقل لکم انی اعلم کہنا اور ان قوٰی کا نحن نسبح بحمدك ونقدس لك کہنا ایک مجذوبوں کی بڑ ہے کہ جس کو کوئی ذی عقل پسند نہیں کرتا۔

(۷) یہ آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ باواز بلند کہہ رہی ہے کہ ملائکہ آدم کے وجود سے پیشتر تھے کیونکہ جب خدا پاک نے یہ فرمایا کہ ہم زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنا چاہتے ہیں ملائکہ نے بوجہ اس بات کے کہ وہ سرشتِ آدم سے واقف تھے۔ یہ کہا کہ حضور ایسے شخص کو کہ جس کی سرشت میں فساد ہو اس کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اور ہم جو حضور کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں ہم کو نہیں بناتے' اس میں کیا مصلحت ہے؟ پھر خدا نے آدم کو پیدا کیا اور اس کو ہر طرح کے علوم سے مشرف کر کے ملائکہ کے مقابلہ میں پیش کیا ملائکہ عاجز آ کر اپنے قصورِ فہم کے معترف ہوئے۔ اس عنوانِ کلام سے

جس کو ادنیٰ سلیقہ عبارت فہمی کا ہو گا صاف جان جائے گا کہ ملائکہ آدم کی قوٰی نہیں کیونکہ قوٰی کسی شخص کے اس کے وجود سے پیشتر نہیں ہو سکتے۔ دوم قوٰی خواہ زبانِ حال یا کلامِ فطرت سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں خیر ہے ہم کو خلیفہ بنائیے اور جس کا ہم جزء ہیں وہ مفسد ہے اس کو نہ بنائیے۔ کیونکہ آدم کا مفسد ہونا اس کے قوٰی کا مفسد ہونا ہے اور آدم کو خلیفہ بنانا اس کے قوائے ملکوتیہ کا بنانا ہے۔ سوم وہ قوائے ملکوتیہ کہ جس کی وجہ سے آدم کو شرف ہے اور جو اس کی خلافت کا باعثِ اعظم ہے جب وہ آدم سے بحیثیتِ غیریت علوم میں زائد نہ ہوسکیں اور کچھ بھی نہ بتا سکیں تو پھر زبانِ حال سے کیا خاک قوائے ملکوتیہ نے استحقاقِ خلافت جتلایا؟

آدم کے جب مقابل ہرگز نہ ہو سکے تو
اے عقلِ بے حقیقت دیکھا کمال تیرا

اسی طرح اگلی آیات ہمارے بیان کے لیے شاہدِ عدل ہیں۔

قولہ ص ۶۳ اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں ایک خدا' دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی)' تیسرے ابلیس یا شیطان یعنی قوائے بہیمی' چوتھے آدم یعنی انسان جو مجموعہ ان قوٰی کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں الخ۔

ذرا ان چاروں باتوں کا خیال رہے قولہ ص ۶۳ مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبانِ حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے الخ یعنی فطرتِ انسانی زبانِ حال سے اپنا دکھڑا رو رہی ہے یہاں ایک بات اور آپ سے رہ گئی شاید دوبارہ جب آپ کی تفسیر چھپی (خدانخواستہ) آپ اس کی اصلاح کر دیں یا آپ کے بعد کوئی آپ کا سجادہ نشین اس کو پورا کر دے۔ وہ یہ بات ہے کہ آپ نے یہاں چار فریق بتائے۔ خدا' آدم' ملائکہ' شیطان' آدم اور ملائکہ اور شیطان کی تو آپ نے تاویل کر دی اور کچھ کا کچھ مراد لے لیا ہے مگر چوتھے فریق خدا میں آپ نے کیوں تاویل نہ کی؟ یہاں بھی دہریا پراکرتی کہہ دیتے۔ سارا جھگڑا ہی مٹ جاتا

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

کوئی مصلحت ضرور ہے کہ جس سے تاویل نہ کی۔

اچھا آگے چلیے قولہ خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے گویا (یہ گویا اب کیا ہے) قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے کو ہوں وہی میرا نائب ہونے کے قابل ہے جب میں اس کو پیدا کر چکوں تم سب اس کو سجدہ کرنا الخ۔ یہاں آپ کی توجیہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آدم سے پیشتر وہ قوائے ملکوتی موجود تھیں کہ جن سے خدا نے کلام کیا اور آدم کے پیشتر ان سے یہ فرمایا کہ جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو اس کو سجدہ کرنا۔ آپ انصاف سے فرمائیے کہ وہ قوٰی ملکوتی آدم کا جزء کیونکر ہو سکتی ہیں۔ آدم کے جملہ قوٰی خواہ ملکوتی یا بہیمی اس کے پیدا ہونے کے بعد یا ساتھ اس میں ودیعت رکھی گئی تھیں نہ کہ قبلِ پیدائش۔ پس آپ کا چوتھا فریق کہ ملائکہ سے مراد قوائے ملکوتی ہیں شیخ چلی کے گھر کی مانند بن بنا کر بگڑ گیا یا نہیں؟

قولہ اس مقام پر مخاطبین کو اس بات کا کہ اس مخلوق میں قوائے بہیمی ہوں گے عالم قرار دیا گیا ہے (کیا ان مخاطبین کو یہ

علم نہ تھا کہ اس مخلوق میں قوائے ملکوتی بھی ہوں گے) اب وہ مخاطبین کون لوگ ہیں؟ آدم تو بجمیع اجزائه وقوائه ہنوز پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ قولہ اور بمقتضائے فطرت ان قویٰ کے انہوں نے کہا کہ کیا ایسے کو خلیفہ کرے گا جو زمین پر فساد مچائے اور خون بہائے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں الخ مگر جس تقدیر پر کہ یہ قوائے ملکوتی آدم کا جزء ہیں تو کیا یہ جملہ اوصاف جو قوائے ملکوتی کے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کے اوصاف نہیں ہو سکتے؟ پھر یہ کہنا کہ ہم ایسے اور آدم ایسا اور ناحق کا تفوق ظاہر کرنا ان قوائے ملکوتی کی حماقت کی صریح دلیل ہے۔ آپ قوائے ملکوتی کی تسبیح وتہلیل کے یہ معنی کرتے ہیں۔ قولہ جو قویٰ جس کام کے لیے ہیں وہی کام کرتے ہیں کہ وہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے قوت نامیہ نما اور قوتِ ناطقہ نطق الخ کے سواء اور کچھ نہیں کر سکتی الخ۔ جب تسبیح وتقدیس کے یہی معنی ہیں تو قوتِ بہیمی کہ جس کو آپ شیطان کہتے ہیں وہ کیا تسبیح وتقدیس نہیں کرتی کیا قوائے بہیمی غضبیہ وشہویہ غضب وشہوت کے سوا اور کچھ کر سکتی ہیں؟ اس صورت میں ان فرضی ملائکہ کی تسبیح وتقدیس میں خصوصیت دعویٰ بلا دلیل ہے اور ان کا یہ قول نحن نسبح الخ کہ ہم ہی تیری تسبیح وتقدیس کرتے ہیں جھوٹا دعویٰ ہے۔

قولہ انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطرتی تفوق ظاہر کرنے کو تمام کمالاتِ نفسانی وروحانی وحقائق ومعارف کو اسماء سے تعبیر کیا ہے انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا قوائے ملکوتی تو اس وقت انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے (ان تمام کی مدت انسانی وروحانی میں قوائے ملکوتی بھی ضرور شامل ہیں کیونکہ بقول آپ کے یہ مجموعہ میں داخل اور ایک جزء ہیں) جس کو تعلیمِ اسماء سے تعبیر کیا ہے۔ انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا قوائے ملکوتی تو اس وقت انسان میں جملہ کمالات کی ودیعت رکھنے کی وجہ سے داخل ہیں پھر وہ مخاطبین کون لوگ ہیں؟ اب تو کہئے وہ فرشتے ہیں ورنہ فرمائیے اور کیا چیز ہے؟

قولہ کہ جو حقائق ومعارف ان میں ہیں ان کو بتلاؤ قوائے بسیط کی فطرت میں (قوائے بسیط سے مراد اگر قوائے ملکوتی ہیں تو آپ نے وہ لفظ کیوں بدلا؟ اور اگر کوئی اور چیز مراد ہے تو یہاں کلام چوتھے فریق ملائکہ میں نہ رہا یہ پانچواں فریق کہاں سے آ گیا؟ قصہ میں اس کا نشان کسی آیت سے کیوں نہ دیا؟

قولہ پس گویا وہ بولے کہ ہم تو ان کے کمالات کو نہیں جانتے وہ کمالات تو یہی قوائے ملکوتی ہیں کہ جن کو آپ ملائکہ کہتے ہیں پھر کیا وہ اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے تھے؟ جب ان کو علمِ حضوری اپنی ذات وصفات کا نہ تھا تو ایسے جہلاء کو مخاطب بنانا اور ان سے اسماء کلھا کا سوال کرنا اور حقائق الاشیاء دریافت کرنا خدا تعالیٰ کی شان سے نہایت بعید ہے۔

قولہ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے یعنی جس محمود فطرت پر پیدا کیا ہے اس کے سوائے کچھ نہیں کر سکتے آخر آپ کو تنگ آ کر جاننے کے معنی کرنا بیان کرنا پڑا مگر یہ معنی آج تک کسی سے نہ سنے تھے۔

قولہ مگر انسان کی زبانِ حال نے جس کی فطرت میں ادراکِ کلیات وجزئیات تھا مخاطبین کی حقیقت کو بتلا دیا بڑا کمال کیا جو آپ نے حالات کو بتلا دیا وہ مخاطبین تو بقول آپ کے قوائے ملکوتی ہیں سو وہ آدم میں حاصل تھیں۔ کیا اس بات سے آدم خلافت کا مستحق ہو گیا؟ آپ تو صفحہ ۵۶ میں یہ فرما چکے ہیں۔ ان قویٰ کو جو اسماء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس میں بڑا دقیقہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز کی حقیقت وماہیت کو نہیں جانتا جو کچھ وہ جانتا ہے وہ صرف اسماء ہی اسماء ہیں الخ مگر اب آپ نے کیا

سمجھ کر لکھ دیا کہ انسان نے مخاطبین کی حقیقت کو بتلا دیا۔ اب معلوم نہیں کہ آپ کی دونوں باتوں میں سے کونسی غلط ہے؟

قولہ ص ۶۶ اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ان قوائے متضادہ کہ جن سے انسان مرکب ہے اسی طرح پر فطرت بتائی ہے (یہ لفظ فطرت آپ کو خوب رواں ہے) کہ قوائے ملکوتی اطاعت پذیر وفرمانبردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں الاقوائے بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرمانبردار ہیں الخ ان کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہو کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا کہیں یوں فرماتا ہے کہ اس کافر نے غرور کیا الخ آپ نے ابھی تو یہ فرمایا تھا کہ خدا نے قوٰیِ ملکوتی کو مخاطب کر کے فرمایا جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔ اب یہ قابلیت رکھنا چہ معنی دارد؟ بلکہ صاف یوں فرمائیے کہ قوائے ملکوتی نے اطاعت کی اور بہیمیہ نے نہ کی علاوہ اس کے قرآن مجید خود کہہ رہا ہے فسجد الملائكة كلهم اجمعون الا ابليس میدانِ سخن چھوڑ کر گریز کیوں کرتے جاتے ہو۔ قرآن کے الفاظ کے بموجب تاویل کیجئے۔ شیطان کا آگ سے پیدا ہونا چونکہ قرآن مجید میں مذکور تھا اور وہ معنی قوائے بہیمیہ پر صادق نہیں آ سکتے تھے لہٰذا آپ کو اس کی تاویل کی بھی ضرورت پڑی۔

پس فرماتے ہیں قولہ ص ۶۷ قوائے بہیمیہ کو جن کا مبدء حرارتِ غریزی وحرارتِ خارجی ہے آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک ان کی فطرت کا بتلانا ہے۔ اچھی فطرت بتلائی۔ کیا قوائے ملکوتی کا مبدء حرارت غریزی نہیں اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ حرارتِ خارجی جیسا کہ دھوپ اور آگ اور حرکت کو لازم ہے وہ انسان کی قوائے بہیمیہ کا کیونکر مبدء ہے؟ اب فرق بتلائیے کہ جس صورت میں قوائے ملکوتیہ وقوائے بہیمیہ دونوں کا مبدء انسان کی حرارتِ غریزی ہے پھر قوتِ بہیمیہ کا یہ کہنا کہ خلقتنی من نار وخلقته من طين کن معنی پر محمول ہو سکتا ہے؟ اور جب کہ قوتِ بہیمیہ یہ تفاخر آدم کی نسبت کرتی ہے تب تو اس کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کیونکہ وہ جزءِ آدم ہے اگر وہ آگ سے پیدا ہوئی ہے خواہ وہ کیسی ہی آگ ہو تو وہ کل جس کا نام انسان ہے وہ بھی فی الجملہ آگ سے پیدا ہوا ہے کیونکہ جزء کل کی حقیقت میں داخل ہے البتہ یہ تفاخر اگر ملائکہ پر کرتی (حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں کمامر) تو کرتی۔

قولہ پھر جو فطرتی تضاد ان دونوں قسم کی قویٰ میں ہے اس کے اظہار کے لیے قوائے بہیمیہ کو بطور ایک سخت دشمن کے قرار دیا ہے اور زبانِ حال سے اس کی فطرت بیان کی ہے کہ میں ہمیشہ جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک کہ اس کی اولاد رہے گی (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت بھی آپ کے نزدیک مسلم نہیں) اس کو بہکاتا رہوں گا الخ۔ پھر خدا تعالیٰ نیک آدمیوں کی فطرت کو اور اس کے دشمن کے فریب میں نہ آنے والوں کے فطری نتیجہ کو بتلاتا ہے الخ مگر نیک آدمیوں پر تیرا قابو نہ ہو گا۔ پھر وہ کون سے نیک ہیں کہ جن پر شیطان کا قابو نہ چلا اور وہ جنت سے نہ نکالے گئے حالانکہ آپ کی تاویل کے موجب جنسِ انسان پر اس کا قابو چلا۔ کیونکہ آدم سے مراد آپ کے نزدیک جنس ہے سو اس کو تو شیطان نے بہکایا اور پھر وہ اس گناہ سے جنت سے (خواہ جنت کے کوئی معنی آپ لیجئے) نکالا گیا اور آپ کے اس بیان کے موجب نیک لوگ اس سے آزاد رہنے چاہییں۔

قولہ ص ۶۷ اور دونوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کریں گے اور دوسرے دوزخ میں بھرے جائیں گے۔ دونوں سے مراد قوائے بہیمیہ وملکیہ کے تابع لینا اور جہنم میں خاص قوائے بہیمیہ کے تابع لوگوں کا داخل کرنا اور شیطان کو

چھوڑ دینا قرآن کے نص کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید میں تصریح ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ الآیہ کہ شیطان اور اس کے متبعین جہنم میں داخل ہوں گے پس جب شیطان سے آپ نے قوتِ بہیمیہ مراد لی اور ہر انسان کا جزء اس کو قرار دیا تو لازم آیا کہ ہر انسان جہنم میں جاوے گا کیونکہ تنہا اس کا ایک جزء قوتِ بہیمیہ جو عرض قائم بالغیر ہے بے محل کے جہنم میں جا ہی نہیں سکتا حالانکہ نہ اس کے آپ قائل ہیں نہ کوئی اور کہ ہر انسان جہنم میں رہے گا۔ یہاں جب آپ سے کوئی تاویل ہی نہ ہو سکی تو اس کو چھوڑ کر چل دیے تھے مگر ہم کب جانے دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے شیطان کے لیے فاخرج منہا فرمایا ہے کہ جنت سے نکل جا۔ اس کی کیا تاویل کیجیے گا؟ اب فرمایئے قوائے بہیمیہ کہاں سے نکالی گئی ہیں؟ جب آپ اس قصہ سے فارغ ہوئے تو حضرت آدم علیہ السلام کا اور شیطان کا جو جنت سے نکالا جانا مذکور ہے اس کی تاویل کے درپے ہوئے مگر ذرا سوچ سمجھ کر تاویل کرنا ۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار پر مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

قولہ ص ۶۸ اس کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصوں کو بتایا ہے پہلے حصے کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلّف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میووں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک جنت اسی کا نام ہے۔ اور جنتِ الٰہی آپ کے نزدیک اہلِ اسلام کے خیالات ہیں۔ مگر ہم کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ تمام قیود سے مبرا رہنے کے کیا معنی ہیں؟ اگر یہ مراد ہے کہ زمانہ بے عقلی اور نابالغی، تو اہلِ عقل وادراک کے نزدیک یہ نہایت پستی کا زمانہ ہے کہ اس وقت میں نفس کمالاتِ علمیہ وعملیہ سے خالی بلکہ عقلِ ہیولانی کے مرتبہ میں ہوتا ہے۔ اس زمانہ کو جنت کہنا سیدھے لوگوں کا کام ہے۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ بالغ ہونے کے بعد بے قید ہو کر چین کرنا اور دل کھول کر شہوت رانی کرنا جنت ہے کہ جس کو شعراء جنت باندھتے ہیں تو یہ ناپاک لوگوں کی جنت ہے انہیں کو مبارک رہے اور تیسرے معنی غیر مکلّف اور تمام قیود سے مبرا رہنے کے بحکم المعنی فی بطن الشاعر آپ کے ہی ذہن میں ہوں تو ہوں۔

قولہ اور جب دوسرا حصہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہوتا ہو تو اس کے قدیم دشمن کو پھر بلایا ہے۔ جس نے اس کو بہکا کر درختِ ممنوعہ (بلکہ ممنوع) کو کھلایا ہے یہ نہ فرمایا کہ وہ درختِ ممنوعہ کیا چیز ہے؟ اور نہ دشمن قدیم کے پھر آنے کے معنی معلوم ہوئے دشمن قدیم تو شیطان ہے اور وہ آپ کے نزدیک قوائے بہیمیہ ہیں۔ اب اس کے پھر آنے کے کیا معنی؟ کیا وقتِ ولادت قوتِ بہیمیہ تھی اور درمیانی عرصہ میں کہیں چلی گئی تھی رشد اور عقل کے زمانہ میں پھر آ گئی؟ وفسادہ مما لا یخفی۔ علاوہ اس کے دوسرا حصہ زندگی کا (کہ جس کو اپنے ذہن میں آپ نے دوزخ ٹھیرایا ہے) آپ کے نزدیک یہ ہے۔

قولہ یہ وہ حصہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ رشد ہوتا ہے اور عقل وتمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلّف اور اپنے تمام اقوال وافعال وحرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پس اس حصہ میں کہ عقل وتمیز کا حصہ ہے دشمنِ قدیم کے آنے کی کیا طاقت ہے۔ حکماء کا قول ہے کہ عقل اور شہوت وغضب باہم ایک دوسرے کی ضد ہے اور اگر آپ کی یہ بھی مراد تسلیم کی جائے کہ وقتِ بلوغ مراد ہے کہ جس میں شہوت زور کرتی ہے اور قوائے بہیمیہ غالب ہو جایا کرتی ہیں تو پھر آنے کے کیا معنی؟ یہ زمانہ پہلے کہاں تھا

جو دوبارہ آنا کہا جائے؟ معلوم ہوا کہ درختِ ممنوع آپ کے نزدیک عقل وتمیز ورشد کا درخت ہے اس تقدیر پر یہ مشکل پیش آئے گی کہ یہ ممنوع نہیں ہو سکتا بلکہ عقل وتمیز ورشد انسان کے لیے مقصودِ اصلی ہے اور اسی کو آپ فطرت اور نیچر کہتے ہیں۔ یہ ممنوع کیا بلکہ مامور بہ ہے۔ پھر یہ بھی سہی مگر اس درخت کو شیطان (قوائے بہیمیہ) نے کیونکر بہکا کر کھلوایا بلکہ یہ تو خدا تعالیٰ نے اپنی عنایتِ خاص سے مرحمت فرمایا علاوہ اس کے اس درخت کے کھانے سے پیشتر تو شیطانی قوائے بہیمیہ کا وجود بھی نہ تھا بلکہ اس کے بعد پھر شیطان کیونکر کھلوا سکتا ہے؟ سچ بات وہ منہ سے کہی ہے کہ بنائے نہ بنے۔ بوجھ وہ سر پہ لیا ہے کہ اٹھائے نہ بنے۔

قولہ اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ (یہ تو کہو کہاں سے) اور جا کر زمین پر رہو
یہاں تو آپ نے صاف اقرار کر لیا کہ آدم جنت سے نکالے گئے ورنہ آپ زمین اور جنت کی بھی کچھ تاویل کرتے۔

قولہ ص ۶۹ تمہاری بدیوں کا علاج بھی وہیں ہے وہ بدی انسان نے بجز درختِ عقل کے پھل کھانے کے کیا تھی؟ جس سے وہ توبہ کریں خدا سے پکا اقرار کرنا کہ پھر نہ کریں گے اور پھر مت کرنا الخ حضرت سلامت وہ گناہ تو آپ کے نزدیک عقل کے درخت کا پھل کھانا ہے پھر اس سے توبہ کے یہ معنی کہ آئندہ عقل کی بات نہ کریں گے ہمیشہ بے قید رہ کر چین کریں گے۔ کیا عمدہ تاویل اس قصہ کی فرمائی ہے کہ جس کو اصل قصہ سے ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ تھوڑی دیر انصاف سے غور کر کے دیکھئے ان شاء اللہ آپ اپنی تاویل پر نادم ہو جائیں گے۔

اب آپ کا یہ قول قولہ ص ۵۸ تین لفظ اس قصہ میں اور ہیں جنت، شجر، ہبوط (آپ نے تو ان کی کچھ بھی تاویل نہ کی مقطع کلام کو دھم سے زمین پر دے مارا) علماءِ اسلام نے اس کے بیان میں عجب باتیں کہیں ہیں جو لوگ کہ صرف لفظوں ہی پر چلتے ہیں انہوں نے تو جنت ایک خیالی بہشت عالمِ بالا پر مان لیا (آپ کے نزدیک تو جنت بے قید ہو کر چین کرنا ہے) اور درخت سے بھی سچ مچ کا کوئی درخت گیہوں کا یا انگور کا یا انجیر کا مان لیا اور ہبوط سے عالمِ بالا سے زمین پر گرنا (آپ نے بھی تو آخر الامر یہی مانا) توریت میں بھی یہی ہے الخ آپ کی ہٹ دھرمی پر دلالت کرتا ہے یا نہیں؟

قولہ ص ۵۸ بہت سے علماءِ اسلام نے جن کو اس قسم کے قصص میں یہودیوں کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ان کی پیروی کر کے انہوں نے کہا کہ یہ جنت زمین پر تھی الخ جناب وہ بہت سے علماءِ اسلام کیا خاک تھے دس بیس معتزلہ تھے ان کو بقول آپ کے یہود کی پیروی کرنے کی عادت تھی جس طرح کہ آپ کو یورپ کے لامذہبوں اور دہریوں کی پیروی کرنے کی عادت ہے۔ پس جس طرح کہ انہوں نے خلاف اہلِ سنت یہود کی تقلید سے جنت کو دنیا میں پھر کہیں رجما بالغیب مان کر کبھی فلسطین میں قرار دیا آپ نے دہریوں کی تقلید میں آ کر سرے سے جنت ہی کا انکار کر دیا جس طرح یورپ میں بعض دہریوں نے توریت وانجیل کی تفسیر لکھ کر اپنے الحاد کو زور دیا ہے اور قرآن کی تفسیر لکھ کر اپنے آزادانہ خیالات کو ظاہر کیا ہے طابق النعل بالنعل

فصل چہارم جنت کے بیان میں

یہ بات بھی فطری الیقین ہے کہ ہر چیز پر بالخصوص انسان کے ہر ایک فعل ارادی پر ایک اثرِ خاص مرتب ہوتا ہے کہ جس کو جزاء کہتے ہیں آگ کی صورتِ نوعیہ کا مقتضی گرمی اور پانی کی صورت کا اثر خنکی ہے جو شخص کہ سنکھیا کھائے گا ضرور ہے کہ اس کو حرارت و یبوست بافراط عارض ہوگی۔ نمک کھانے کے بعد زبان پر نمکینی اور مٹھاس کے بعد شیرینی ضرور پیدا ہوگی۔ اسی طرح انسان کے عمل کا ایک اثر خاص ہے ہر نیک یا بدکام کرنے کے بعد اس کا رنگ[1] انسان کی روح پر جمتا ہے اور عالمِ مثال[2] میں وہ اپنی مناسب کسی صورت میں متشکل ہوتا ہے اور قیامت تک اور بعد اس کے جو کچھ صورتیں بنا کے وہ عمل ظاہر ہوگا وہ سب باتیں اس عمل میں بالقوہ اس وقت موجود ہوتی ہیں جس طرح کہ درخت کے تخم میں پھول و پھل، پتے شاخیں تمام بالقوہ موجود ہوتی ہیں اور آناً فاناً وہ سب ظاہر ہوتی ہیں۔ جس طرح کہ درخت کے وہ حالات جو کہ اس تخم سے برآمد ہونے میں خیالی نہیں اسی طرح اعمال کا اپنی مناسب صورتوں میں ظاہر ہونا بھی خیالی باتیں نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اول ہر چیز کی اصل عالمِ مثال میں پیدا ہو جاتی ہے پھر اس عالمِ حس میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس کا ظل اور اسی کے مطابق ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ مؤثر اور متاثر میں مناسبت ہونی چاہیے۔ پس باری تعالیٰ کا اثر ادنیٰ سلسلۂ موجودات ہے اور اسی جگہ سے اہلِ تحقیق نے تنزلاتِ ستہ قرار دیے ہیں کہ

اول مرتبہ ذاتِ بحت پھر مرتبہ صفات الی ان ینتھی الی المحسوسات۔ الغرض یہ محسوس چیزیں وہیں کے اظلال و آثار ہیں اور اسی لیے جو بات کہ عالمِ ظہور میں آنے والی ہوتی ہے کبھی ظاہر ہونے سے پہلے خواب میں یا کبھی اصحابِ نفوسِ قدسیہ کو حالتِ بیداری میں اصلی صورت[3] پر دکھائی دے جاتی ہے۔ اور کبھی عالمِ بیہوشی یا غشی یا نزعِ روح کے وقت جب کہ روح کی توجہ جسم سے کم ہو جاتی ہے اور عالمِ بالا کی طرف رجوع کرتی ہے تو وہ وہاں کی چیزیں اس کے آئینۂ دل پر منعکس ہو جاتی ہیں۔ عمل مسمریزم اور مراقبۂ اہلِ تصوف میں بھی اسی لیے انکشافِ مغیبات ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بعض آیات اور

---

۱ چنانچہ اس حدیث میں (کہ جب انسان بدی کرتا ہے تو ایک نقطہ اس کے دل پر ہو جاتا ہے پھر وہ تمام دل کو گھیر لیتا ہے (الحدیث) اسی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ

۲ چنانچہ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی صدقہ دیتا ہے تو اس کو خدا اس طرح پالتا ہے کہ جس طرح کوئی اونٹ یا گھوڑے کے بچہ کو پالتا ہے پھر قیامت کو احد پہاڑ کی مانند بنا کے لائے گا۔ رواہ البخاری۔ ۱۲ منہ اور مال غیر مزکی کا قیامت میں سانپ بن کر انا کنزک انا مالک کہنا کما فی صحیح البخاری اسی طرح اشارہ کرتا ہے۔ ۱۲ منہ

۳ وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے لوح اور قلم کو پیدا کر کے حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں ارشاد ہوا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب لکھ اس سے اسی طرف اشارہ ہے کہ اس عالم کی کل چیزیں یہاں ظاہر ہونے سے پیشتر جو کچھ کہ کائن ہیں الی یوم القیامہ سب کو ہستی میں لایا پھر اسی کے مطابق یہاں ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو چکتا ہے پھر اسی عالم میں جا کر قرار پاتا ہے اور وہ عالم کہیں آسمان و زمین پر کسی خاص جگہ نہیں بلکہ اس عالمِ حسی کا دوسرا پہلو ہے۔ اور آپ لوح کو کوئی تختی اور قلم کو بھی واسطی قلم نہ سمجھئے گا۔ اور اسی جگہ سے تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہوا کہ جو کچھ ظاہر ہونے والا ہے وہ ہو چکا۔ اسی کے مطابق ظاہر ہو کر رہے گا بندہ محض کا سب یا سبب ہے کہ جس کی وجہ سے ثواب و عقاب، مدح و ذم کا مستحق ہوتا ہے۔ ۱۲ منہ

بہت سی احادیثِ صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس عالمِ عنصری کے سوائے ایک اور عالم ہے کہ جس میں اعمال واقوال وغیرہا اشیاء اپنی مناسب ایک صورتِ خاص میں متشکل ہوتے ہیں اور اس عالم میں پیشتر اشیاء موجودہ ہو چکتی ہیں تب اس عالمِ عنصری میں اسی کے مطابق ظاہر ہوتی ہیں اور بہت سی چیزیں اس عالم میں یہاں سے نقل کر جاتی ہیں۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز سورہ بقرہ اور آل عمران بادل کی صورت میں ظاہر ہو کر اپنے قاری کے حق میں شفاعت کریں گی۔ اور فرمایا کہ قیامت کے روز اعمال حاضر کئے جائیں گے نماز پھر زکوٰۃ پھر روزے آئیں گے۔ اور فرمایا کہ قیامت کے دن دنیا کو بڑھیا عورت کی شکل میں لائیں گے۔ اور فرمایا کہ شبِ معراج میں مجھ کو چار نہریں نظر آئیں دو ظاہر میں اور دو باطن میں جاری تھیں۔ پس میں نے جبرئیل سے پوچھا تو بتلایا کہ یہ باطن کی دو نہریں جنت میں بہتی ہیں اور یہ ظاہری دو نہریں نیل اور فرات ہیں۔ اور حدیثِ صلوٰۃِ کسوف میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ دوزخ اور جنت مجھ کو دکھائی گئی اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ مصلیٰ اور محراب کے درمیان جنت دکھائی دی اور آپ نے ہاتھ بڑھایا کہ اس کا ایک خوشہ لیویں۔ اور فرمایا کہ قیامت کے روز موت کو مینڈھے کی شکل میں لا کر لوگوں کے روبرو ذبح کر دیا جائے گا۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کہ جبرئیل حضرت مریمؑ کو آدمی کی صورت میں نظر آئے۔ اور حدیث میں ہے کہ جبرئیل حضرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھائی دیتے تھے اور آپ سے کلام کرتے تھے مگر اور کسی کو دکھائی نہ دیتے تھے اور فرمایا کہ موت کے وقت ہر شخص کو ملائکہ نظر آتے ہیں ان کے ہاتھ میں حریر یا ٹاٹ ہوتا ہے۔ اور قبر میں میت کو ملائکہ دکھائی دیتے ہیں اور سوال کرتے ہیں۔ اور انسان کے اعمال متشکل ہو کر سامنے آتے ہیں۔ علاوہ ان کے اور بیشمار صحیح احادیث اس بارے میں وارد ہیں۔ چنانچہ کتبِ صحاح ستہ وغیرہا ان امور کے ذکر سے مالا مال ہیں پس جب یہ ثابت ہو چکا تو انسان کی جزاء و سزاءِ اخروی کی یہ صورت ہے کہ جب انسان لباسِ جسمانی اتارتا ہے تو اس کے اعمال اچھی یا بری صورتوں میں آ کر دکھائی دیتے ہیں پھر جب جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو خطیرۂ قدس میں روحِ اعظم کی طرف اس طرح کھینچ کر جاتا ہے کہ جیسا لوہا مقناطیس کی طرف کھینچتا ہے اور اس خطیرۂ قدس کو علیین بھی کہتے ہیں پس وہاں اس کو ملائکہ مقربین اور ارواحِ طیبین سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کی جسمانی باتیں مٹ جاتی ہیں اور اس کے اعمال و ادراکات و اخلاص نہایت عمدہ صورتوں میں[1] اس کو دکھائے جاتے ہیں جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آتی ہیں اور اس کی خواہش کے موافق نعمائے الٰہی اس کے لیے متشکل ہو جاتی ہیں اور جو بد شخص ہے تو اس کے اعمال منکر نکیر کی نہایت بری شکل میں اس کو عذاب کرتے ہیں اس کا بخل اور شہوت اور دیگر اخلاقِ رذیلہ سانپ بچھو کی صورت میں ظاہر ہو کر ڈستے ہیں اس پر گرز پڑتے ہیں اور طبقۂ ظلماتی میں کہ جس کو سجین کہتے ہیں اس کو محبوس کیا جاتا ہے اور یہ وہاں اپنی نازیبا باتوں سے نہایت رنج اٹھاتا رہتا ہے اور اس سجین اور علیین کو عالمِ قبر کہتے ہیں۔

اگر آپ کو قبر کے ثواب و عذاب کا سر اچھی طرح معلوم نہ ہو تو آپ کے لیے اس عالم میں خواب کی نظیر پیش کرتا

ہے بلکہ بعض کی چیخ نکل جاتی ہے اور رونے کا اثر آنکھوں میں آنسو پاتا ہے اور بیداری میں طبعی بدن کانپتا رہتا ہے اور اسی طرح بلغمی المزاج دریا اور ہوائے سرد دیکھتا اور اس سے تکلیف پاتا ہے۔ اور درندہ سیرت خواب میں درندے کو دیکھتا ہے۔

المختصر اس کی کیفیات متشکل ہو کر خواب میں دکھائی دیتی ہیں اور اس عالم خواب میں وہ چیزیں اصلی طور پر اثر پہنچاتی ہیں۔ ہاں ان کو خیالی باتیں جو ہم کہتے ہیں تو اس حالتِ بیداری میں کہتے ہیں اگر عالمِ بیداری نہ ہوتا تو یہ راز نہ کھلتا نہ کبھی ان کو خیالی باتیں کہا جاتا۔ پس اسی طرح عالمِ مثال ہے کہ یہ کیفیات وہاں متمثل ہوتی ہیں وہ بھی گویا ایک عالمِ خواب ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ اس سے حشر تک بیداری نہیں ہوتی۔

دوم وہاں اس قدر جسمانی تعلق باقی نہیں رہتا گو کسی قدر جسم کا اثر کچھ مدت باقی رہتا ہے۔ اس عالمِ برزخ میں لوگوں کے مختلف حال میں اکثر ان لوگوں کو (کہ جن کا جسم سے نہایت تعلق ہے اور وہ جسم اور روح کو ایک ہی سمجھتے ہیں جسم کا کوئی عضو کٹنا اپنا عضو کٹنا سمجھتے ہیں) تو یہی صورت پیش آتی ہے۔ اور بعض لوگ کہ جن کی قوتِ بہیمیہ اور ملکیہ دونوں ضعیف ہیں لیکن ملکیہ میں بہیمیہ کا اثر نہیں پہنچا اور ان میں ملائکہ سافلہ سے مل جانے کی بڑی قابلیت ہوتی ہے تو وہ بعد مردن ملائکہ سافلہ میں جا ملتے ہیں اور انہیں کے سے کام کرتے ہیں۔ اور ایک نوع سے دوسرے نوع میں منتقل ہو جانا اس عالمِ حس میں بھی مشاہد ہے۔ پانی کے کیڑوں کا چھلکا اتار کر مچھر بن جانا بہت بار تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ اور بعض لوگ کہ جن کے قوائے بہیمیہ مغلوب اور قوتِ ملکیہ نہایت علو پر ہوتی ہے۔ وہ ملائکۂ عالیہ میں جا ملتے ہیں اور یہ حدیث کہ جس میں آنحضرت علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے جعفر کو جنت میں ملائکہ کے ساتھ اڑتے دیکھا اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ لوگ کبھی خدا کی جماعت کو مدد اور اس کے اعداء کو ہزیمت بھی دے جاتے ہیں بعض اہلِ بصیرت کا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام وصحابہ کرام کو بعض مواقع میں تشریف لاتے دیکھنا بھی اسی سے مطلع کرتا ہے اور جن کے روح ہوائی (جو روحِ حقیقی کا مرکب ہے) نہایت قوی ہوتی ہے تو وہ لوگ مرنے کے بعد مقتضی صورتِ نوعیہ کے موجب طعامِ لذیذہ اور بعض لذات وشہوات کی خواہش[1] بھی کرتے ہیں تو ان کی خواہش پوری کی جاتی ہے چنانچہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ اور بعض لوگ کہ جن کی نورانیت نہایت غالب ہوتی ہے ان کا اس عالم سے نہایت تعلق رہتا ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام بلکہ وہ نورانیت ان کے جسمِ اطہر پر سرایت کر جاتی ہے اس لیے وہ گلتا سڑتا نہیں اور اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ میں نے موسیٰ کو نماز پڑھتے اور یونس کو لبیک کہتے دیکھا۔ اسی لحاظ سے انبیاء کے لیے بعد موت کے حیات ثابت کی جاتی ہے اور حیات النبی مشہور ہیں الجمہور ہے۔ اور بعض لوگ کہ جن کی قوتِ بہیمیہ نہایت غالب

[1] بعض نہفتہ کوڑ مغز کرسٹانوں نے اس پر طعن کیا ہے اور اس کو اسلام کے حق میں دھبہ سمجھا ہے مگر ان کو نہ ان اسرار سمجھنے کی لیاقت ہے جو یہاں اور دیگر مواقع میں بیان ہوئے ہیں نہ قرآن مجید کی ان آیات کا علم ہے کہ جہاں انار اور انگور اور حور وقصور سینکڑوں جسمانی نعماء ملنے کا وعدہ ہے۔ نہ انجیل متی کے اس فقرہ پر دھیان ہے کہ جہاں اس عالم میں انگور کا شیرہ پینا آیا ہے۔ آنکھ بند کر کے اعتراض کر دینا اپنی مشیخت سمجھتے ہیں اپنے جہلِ موروثی سے ناچار ہیں ١٢۔ ابو الحسن حقانی یہ بار بار بیان کر دیا کہ وہ عالم جس میں نعمات ہیں اس عالم سے جس میں ہم ہیں قدیم ہے لہٰذا وہ نعمات اصل میں کیا ہیں اس کو اس عالم میں کما حقہ ادراک نہیں کر سکتے البتہ اگر اس عالم میں رفعِ حجاب ہو اور وہ نعمات مشاہدہ ہوں تو وہاں کے انگوروں کی صورت ہمارے انگوروں کی صورتِ جسمہ کے موافق ہوگی لیکن اس کی حالت اس عالم میں معلوم نہیں ہو سکتی اس لیے اس پر اعتراض ہی غلط ہے۔ حقانی

ہے اور ان کی ملکیہ قوت بالکل مستور ومقہور ہے تو وہ بعد موت کے اپنی قابلیتِ اصلیہ یا کسبیہ سے شیاطین میں جا ملتے ہیں۔ الغرض ایک مدت تک عالمِ برزخ میں یہ چیزیں متشکل ہو کر نظر آتی ہیں اور ہر شخص کا ایک خاص حال ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ تمام عالمِ حسی فنا ہو جائے گا یعنی کثافت کی چادر اتار کر لطیف ونورانی بن جائے گا کہ جس کو عالمِ حشر یا روزِ قیامت کہتے ہیں تب ان متشکل چیزوں کے دیکھنے میں سب مساوی ہوں گے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حشرِ اجساد نئی زندگانی نہیں ورنہ پھر کوئی شخص اپنے اعمالِ سابقہ کی جزاء وسزا نہ پاوے بلکہ یہ پہلی زندگانی کا تکملہ اور تتمہ ہے پس جب نفوس مبعوث ہوں گے تو ان کا بخل اور تکبر کسی بری شکل میں ظاہر ہو کے ان کی پشت پر سوار ہوگا اور نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ اور حسابِ یسیر یا عسیر لیا جائے گا۔ اور شریعت پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگی اور جو لوگ اس پر دنیا میں جس طرح چلتے تھے اسی طرح وہاں اس پر چلیں گے پورا پورا عمل کرنے والے خلوص والے برق کی طرح پار ہو جائیں گے اور پھر درجہ بدرجہ اور شرع میں قصور کرنے والے اور فطرت کے برخلاف چلنے والے اس پر نہ چل سکیں گے کٹ کر گر پڑیں گے۔ اور خلوصِ قلب وہاں نور بن کر ظاہر ہوگا اور اعمالِ صالحہ سواری بن جائیں گے۔ چنانچہ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے قال النبی علیہ السلام سمنوا ضحایاکم فانها علی الصراط مطایاکم کہ اپنی قربانیوں کو فربہ کرو کس لیے کہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی اور اسی طرح آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوتِ عامہ حوضِ کوثر کی صورت میں ظاہر ہوگی جس نے یہاں اس سے کچھ فیض اٹھایا وہ وہاں بھی اس سے سیرابی حاصل کرے گا اور فطرت وشریعت پر استقامت ترازو عمل ہو جائے گی۔ اور اسی طرح قرآن اور رمضان وغیرہ اشیاء اپنی اپنی مناسب صورتوں میں ظاہر ہوں گی۔ اور ملائکہ بھی عالمِ حشر اور برزخ میں عذاب وثواب پر مؤکل کئے جائیں گے اور وہاں ہر شخص کو دکھائی دیں گے۔ اور اسی طرح رحمتِ الٰہی اور نعمتِ غیر متناہی جنت کی شکل میں ظہور کرے گی بلکہ اب[1] بھی متشکل ہے۔ حورِ عین اور عمدہ عمدہ مکانات اور انار اور انگور اور غلمان اور نہایت عمدہ ظروف کہ جن کو چاندی سونے کا اور کبھی یاقوت وموتی کا شرع نے بتایا ہے اور قرآن واحادیث میں ان کو بندوں کے محاورے کے موافق اس عالم کی عمدہ چیزوں کے ساتھ تشبیہ دے کر متعدد جگہ طرح طرح کے عنوانوں سے بیان فرمایا ہے وہ سب انعمائے الٰہی اور بندوں کی خواہش متمثل ہوں گے۔ بلکہ ہر شخص کی خواہش کبھی حور اور کبھی انار اور کبھی یاقوت وزمرد کے مکانات کی صورت میں ظہور کرے گی۔ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ حضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک حور گندم گون سرخ لب دیکھی۔ جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون ہے کہا جعفر بن ابی طالب کی ایسی عورت سے نہایت رغبت خدا نے دیکھی تو اس کو اس شکل میں ظاہر کر دیا۔ اسی طرح ہر روز ہر ایک نعمتِ الٰہی نئی صورت میں ظہور کرے گی۔ اور وہاں کے آفتاب و ماہتاب بھی یہ آفتاب و

[1] یہاں بھی اسی کرسٹان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے جنت ودوزخ کا انکار لازم آتا ہے کیونکہ آدم جس جنت میں رہتے تھے وہ کس کے اعمال تھے الخ حالانکہ یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ مصنف علامہ نے جنت کی بابت کہہ دیا کہ اب بھی رحمتِ الٰہی اور نعمتِ غیر متناہی جنت کی صورت میں متشکل ہے۔ رہے بندوں کے اعمال موجودہ جزئیات مثوبات کی شکل میں ظہور کریں گے نہ کہ جنتِ کلی کیونکہ وہ رحمتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ نہ آج سے بلکہ ازل سے پھر اگر اس میں آدم رہے ہوں تو کیا اشکال لازم آتا ہے۔ اسی طرح جسمانی نعماء کو حقیر جان کر اس جاہل نے اس حدیث حور گندم گوں پر بھی اعتراض کیا کہ جس کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بھی حجۃ البالغہ میں اسی موقع پر ذکر کیا ہے۔ ١٢ ابو الحسن حقانی۔

ماہتاب نہ ہوں گے نہ یہ زمین وہاں کی زمین ہوگی نہ یہ آسمان وہاں کا آسمان ہوگا کما قال تعالیٰ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ○ کہ وہاں آفتاب کی گرمی دیکھیں گے نہ سخت سردی۔ وقال يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتِ کہ آسمان و زمین اس روز بدل جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ عالمِ جسمانی کہ جس کے قویٰ محدود ہیں ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہ سکتا۔ پس ایک روز یہ تمام عالمِ جسمانی، زمین و آسمان، پہاڑ و دریا، چاند و سورج فنا ہو جائیں گے اور یہ سب کے سب اس عالم میں جا کر اپنی موافق صورتوں میں ظہور کریں گے کیونکہ اس عالم سے یہاں یہ چیزیں آتی ہیں اور پھر وہیں چلی جاتی ہیں۔ جس طرح کوئی مچھلی دریا میں ظاہر غوطہ لگا جاوے شاید جو لوگ بروز اور کمون کے قائل ہیں اسی لیے قائل ہوئے ہیں قال تعالیٰ كُلٌّ اِلَيْنَا رَاجِعُوْنَ یعنی ہر چیز ہمارے پاس لوٹ آتی ہے۔ رجوع میں یہ بات ضرور ہے کہ جہاں سے ابتدا ہوا اسی کی طرف انتہاء ہو۔ پس جس طرح یہ عالم حرکتِ تدریجیہ کے ساتھ اس سے ظہور کرتا ہے کہ اول مرتبہ ذاتِ بحت پھر ذرا تفصیل بحالتِ تجرد پھر ظہورِ عالمِ حسی اسی طرح عالمِ حسی سے لوٹ کر ہر چیز پھر عالمِ ملکوت کی طرف رجوع کرتے کرتے اس کے پاس جا پہنچتی ہے۔

قیامت

اس نکتہ کے بیان کی یہاں زیادہ گنجائش نہیں الختصر یہ تمام عالم اس عالم کی طرف رجوع کرے گا کہ جس کو قیامت کہتے ہیں چنانچہ اس فناءِ عالم کی تفصیل قرآن و احادیث میں کثرت سے موجود ہے۔ جنت میں اعلیٰ اور سب سے زیادہ نعمت تجلیِ دیدارِ الٰہی ہوگی کہ جس کی کیفیت سے عقل آگاہ نہیں ہو سکتی بلکہ ہر روز غیر متناہی چیزیں جو جنت میں پیش آئیں گی سوائے خدا کے ان کی کوئی نہ کُنہ حقیقت جانتا ہے نہ پورا ان کا کسی کو علم ہے۔ کما قال تعالیٰ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ بعض لوگ جو اس نکتہ سے ناآشنا ہیں اور جنت و دوزخ اور عالمِ برزخ کے اسرار سے بے خبر ہیں جن کی ان نعماء کا اس آیت کو سند بنا کر انکار کرتے ہیں اور ان نعماء کو عالمِ حسی کی چیزوں پر قیاس کر کے جنت کو دنیا کی خرابات سے تشبیہ دیتے ہیں اور طرح طرح سے زبان طعن وطنز کشادہ کرتے ہیں اور بعض پادریوں نے تو بے سمجھے قرآن و احادیث کے ان پاکیزہ مضامین پر جو اسرارِ الٰہیات ہیں بڑا طعن کیا ہے۔ اور جس طرح ان لوگوں نے ان اسرار کی ناواقفیت سے انکار و اعتراض کیا ہے اسی طرح ہنود کے اکابر اس نافہمی سے ارواح کی نسبت تناسخ کے قائل ہو گئے ہیں کہ دوبارہ پھر اسی جسمِ عنصری میں روح لوٹ آتی ہے اور یہی طریق جزاء و سزا کا ہے۔ اس عقیدے کے ابطال پر ادلہ قائم کرنے کی کچھ ضرورت نہیں جو اس سر سے واقف ہے وہ کبھی تناسخ کا قائل نہ ہوگا۔ جس طرح رضائے الٰہی و نعماءِ نامتناہی جنت کی صورت میں ظہور کرتی ہے اسی طرح وہ اعمال جو خلافِ فطرت عمل میں آئے ہیں عقوباتِ جہنم کی صورت میں پیش آتے ہیں یہی چیزیں نَارٌ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ بن جاتی ہیں اور یہی اعمال اپنی صورتِ طوق و زنجیر و زقوم اور گرم پانی بنا کے ایذاء پہنچاتے ہیں انسان کی شقاوتِ قلبی جہنم کی اندھیری بن جاتی ہے اور قہرِ الٰہی جہنم کی صورت میں متشکل ہو چکا ہے۔ جہنم سے نجات پانے کی مختلف صورتیں ہیں کبھی شفاعت انبیاء کبھی

محض رحمتِ کبریاء کبھی صورِ اعمالیہ کے وجود کی انتہاء۔ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں یہ باتیں اس کثرت سے مذکور ہیں کہ جس کا عشر عشیر بھی نہ کسی کتابِ الہامی میں پایا جاتا ہے نہ اس کا سواں حصہ آج تک کسی اشراقی یا مشائی حکیم پر منکشف ہوا ہے یہ رازِ سربستہ خدا نے اپنی پچھلی کتاب میں اخیر نبی کی زبان سے نہایت وضاحت سے بیان کروا دیا۔ اس علم کے جو دقیق مسائل افلاطونِ الٰہی کو نصیب نہ ہوئے تھے آج وہ اس فیضِ نبوت کے طفیل عام مسلمانوں کو معلوم ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ سید احمد خان صاحب بہادر اس سر کو کیا سمجھے۔

قولہ ص ۳۶ جنت یا بہشت کی ماہیت جو خدا تعالیٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہ ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) چھپا رکھی ہے اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔ پیغمبر علیہ السلام نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند پر بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر الخ

اقول آپ کا حاصل کلام یہ ہے کہ بہشت قرۃ اعین یعنی راحت کا نام ہے اور اس کا بیان کرنا محال ہے۔

قولہ پس بہشت کی کیفیت بالذات کا جس کو قرۃ اعین کے ساتھ تعبیر کیا ہے بیان کرنا گو کہ خدا ہی اس کا بیان کرنا چاہے محال سے بھی بڑھ کر محال ہے اور اس محال ہونے کی دلیل آپ نے یہ بیان فرمائی۔

قولہ انسان مطابق اپنی فطرت کے انہیں چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور انہیں کا خیال اس کے دل میں آ سکتا ہے جو اس نے دیکھی یا چھوئی یا چکھی یا سونگھی یا قوتِ سامعہ سے محسوس کی ہوں اور بہشت کی جو قرۃ اعین یعنی راحت بالذات ہے اس کو نہ انسان نے دیکھا نہ چھوا ہے نہ سونگھا ہے نہ قوتِ سامعہ نے اس کا حس کیا ہے پس فطرتِ انسانی کے مطابق انسان کو اس کا بتلانا ناممکن ہے۔[2] اول تو یہ دلیل آپ کی محض بے بنیاد ہے کیونکہ کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ انسان کو انہیں چیزوں کا علم ہے جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہیں کس لیے کہ ہزارہا ایسی چیزیں ہیں کہ جن کو ہم قطعی طور پر جانتے ہیں لیکن وہ چیزیں حواسِ خمسہ میں سے کسی کے ساتھ بھی محسوس نہیں ہو سکتیں مجردات اور معانی جزئیہ اور کلیات فرمایئے کون سے حس سے محسوس ہیں؟ عداوت، محبت، کسی شے کا قدم یا حدوث اسی طرح انسان حیوان وغیرہما کلیات اور ملائکہ اور خدا تعالیٰ کی ذات۔ اسی طرح اپنی روح کا موجود ہونا بلکہ اپنا درد اور رنج اور خوشی نہ آنکھ سے نہ کان سے نہ قوتِ ذائقہ سے نہ سامعہ سے نہ لامسہ سے محسوس ہوتی ہے باوجود اس کے ہم کو ان چیزوں کا علم ہے۔ شاید اسی بناء پر آپ ملائکہ اور شیاطین اور جن وغیرہ غیر محسوس چیزوں کا انکار کرتے ہیں۔ سید صاحب ان وسواس کے ماننے والوں کا زمانہ گیا اب تو ایسے لا ادریہ اور سوفسطائیہ کو عقلاء حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی اس دلیل کو تسلیم بھی کیا جاوے تو آپ کا اس سے صرف یہ مقصود ہوگا کہ کیفیات (جیسا کہ قند کی شیرینی یا

---

[1] اس عربی فقرہ کو اسی اندھے معترض نے آیت سمجھ لیا پھر اس میں لفظ الموقدۃ نہ ہونے سے مفسر علامہ کے سہو آیات پر محمول کر کے طعن کر دیا۔۱۲۔ ابوالحسن حقانی

[2] سید احمد خان کا بیان کہ خدا کو بہشت کی کیفیت بیان کرنا محال ہے۔

حنظل کی تلخی) یا اور وجدانیاتِ حیزہ بیان سے باہر ہیں۔ انسان ان کو تعبیر نہیں کر سکتا سو یہ مسلم مگر اس سے جنت کی ان نعماء کی کہ جن کا ذکر قرآن میں ہے (حور، قصور، میوجات) نفی یا انکار کسی طرح نہیں لازم آتا۔ غایۃ الامر یہ بات لازم آئے گی کہ جنت کی جس قدر کیفیات ہوں گی ان کی حقیقت کوئی نہیں جانتا۔

سوم غایۃ مافی الباب اس کے بیان سے انسان کا عجز ثابت ہوگا نہ کہ خدا تعالیٰ کا۔ طرفہ یہ کہ آپ خود اقرار کرتے ہیں کہ اس[1] قرۃ اعین کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اولاد پیدا ہونے، مینہ برسانے، رزق کے فراغ ہونے، دشمنوں پر غلبہ پانے اور اس کلفت کو اولاد کے مرنے، قحط پڑنے، وباء پھیلنے، شکست کھانے کی کیفیت کی تشبیہ میں بیان کیا۔ انتہیٰ ص ۳۸ اور آپ اسی صفحہ میں یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسی تشبیہوں میں بیان کیا ہے کہ تمام انسانوں کی طبیعتوں پر حاوی ہیں اور کل انسانوں کی خلقت اور جبلت کی نہایت ہی مناسب ہیں الخ۔ پھر تعجب کی بات ہے کہ اس قرۃ اعین یعنی راحت بالذات کو حضرت موسیٰ اور محمد مصطفیٰ علیہما السلام تو تشبیہاتِ مرغوبہ میں نہایت عمدہ طور پر بیان کر جائیں اور آپ کے خدا صاحب اس سے ایسے عاجز ہو جائیں کہ ان کو اس کا بیان کرنا محال کیا بلکہ محال سے بھی بڑھ کر ہو جاوے۔ تعالی اللہ عن ذلک علوًا کبیرًا۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ اس قرۃ اعین کی کنہ حقیقت کے علم کو ہم محال کہتے ہیں اور باقی ان تشبیہات سے اس کا علم بالوجہ حاصل ہو سکتا ہے سو اس میں ہمارا کلام نہیں تو میں اس کے جواب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو غایۃ ما فی الباب ان چیزوں کا علم بالکنہ مشکل اور متعذر ہوگا نہ محال اور اگر یہ بھی تسلیم کیا جاوے تو یہ تشبیہات جو قرآن میں مذکور ہیں کہ وہاں حوریں اور نہریں اور باغ اور عمدہ عمدہ محل اور سایہ دار درخت اور طرح طرح کے میوے ہیں غلط نہیں ہو سکتیں پھر آپ کا ان چیزوں سے انکار کرنا اور یہ آیت فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۔ اور حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پیش کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ اس تقریر پر آیت اور حدیث کے یہ معنی ہوئے کہ ان چیزوں کی کوئی حقیقت کماھی نہیں جانتا نہ یہ کہ جس چیز کو باغ سے تشبیہ دی ہے اور جس کو حورِ عین کہا ہے اور جس کو سایہ دار درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے علیٰ ہذا القیاس ان کا دراصل اس تشبیہ کے موافق وجود نہیں۔ حاشا وکلا۔ اگر یہ ہو تو پھر یہ تشبیہ لغو ہو جاوے۔ جب ہم زید کو شیر کہیں اور اس کے ساتھ تشبیہ دیویں تو گو زید ہو بہو شیر نہیں مگر یہ تو ضرور ہوگا کہ کسی وصفِ خاص میں شیر کا ہم پلہ نہیں تو مماثل اور مشابہ تو ضرور ہوگا ورنہ یہ تشبیہ لغو اور کذب ہوگی۔ اس تقریر پر یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جنت میں عنصری درخت نہیں نہ وہاں یہ عنصری سونا نہ اس کے مکانات، نہ یہاں کی شراب، نہ یہاں کے اجسامِ عنصریہ سے مرکب خوبصورت عورتیں نہ یہاں کی نہریں نہ یہاں کے میوے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے بلکہ ان کی حقیقت اور یہاں کی چیزوں کی حقیقت غیر ہے۔ محض ہمارے سمجھانے کے لیے یہ الفاظ کسی مناسبت سے بولے گئے ہیں۔ اس آیت اور حدیث سے ان چیزوں کے وجود کی

---

[1] آپ کی اس تقریر سے یہ بات پائی کہ جنت محض راحتِ دنیاوی کا نام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مینہ برسانے، رزق کے فراغ ہونے پر محمول کیا ہے نہ خدا نے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دنیا کے ترغیب دینے کو باغ اور حور وغیرہ چیزوں کو بتایا ہے۔ اس سے اخروی جنت کا بالکل انکار ہو گیا نہ صرف یہ بات کہ آپ وہاں کی نعماء کا ایسا وجود نہیں مانتے جیسا کہ دنیا کی نعماء کا وجود ہے کیونکہ یہ بات تو تمام اہلِ اسلام بھی مانتے ہیں پھر آپ کا نزاع ہی کیا ہے؟ بلکہ بالکل انکار کرتے ہیں۔ ۱۲ حقانی

نفی نہیں سمجھی جاتی بلکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں جو چیزیں ہم نے اپنے بندوں کے لیے مخفی رکھی ہیں ان کو کوئی نہیں جانتا جو کہ اس نے مخفی نہیں رکھیں بلکہ بذریعہ وحی کے بتلا دیں ان کو ہم جان سکتے ہیں اور حدیث تو اسی آیت کی تفسیر میں واقع ہے۔ پس اب ان نعماء کے جاننے اور اس آیت میں منافات باقی نہ رہی۔ اب اس آیت سے یہ سمجھنا کہ جو چیزیں نصوصِ قرآنیہ میں مذکور ہیں وہ محض بے اصل ہیں محض وسوسۂ شیطان ہے۔

قولہ ص ۳۸ یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے اس میں سنگِ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں۔ باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب کی نہریں بہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی وساقنین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہماری ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہماری خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں انتہیٰ۔

آپ کو اس سفید ریش پر یہ بے تہذیب باتیں زیبا نہیں جنت کی نعماء کو کوئی شخص دنیا کی چیزیں بعینہٖ نہیں سمجھتا۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ آپ ایسی باتیں کر کے اپنے بیچارے معتقدوں کا ایمان کیوں خراب کرتے ہیں؟ آپ سے پہلے ہزاروں شاعر بیہودہ گو کلامِ الٰہی پر پھکڑ بازی کر چکے ہیں ان باتوں کا جواب پھکڑ بازی کے ساتھ ہم کو بھی آتا ہے مگر ہم اپنی اوقاتِ عزیز کو ضائع نہیں کرتے ؎

گفتگو آئینِ درویشی نبود
ورنہ باتو ماجرا ہا داشتیم

قولہ ص ۳۹ علماءِ اسلام نے بسبب اپنی رقتِ قلبی الخ کے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اس کو تسلیم کر لیں (بخلاف آپ کے کہ تسلیم نہیں کرتے) اور اس کی حقیقت اور اس کے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں اس واسطے وہ بزرگ تمام ان باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کو کوئی بھی نہیں مان سکتا اور وے باتیں جیسے کہ عقل اور اصلی مقصد بانی مذہب کے برخلاف ہیں ویسی ہی مذاہب کی سچائی اور بزرگی اور تقدس کے مخالف ہیں۔

اقول آپ وہ عقل کے برخلاف باتیں تو پیش کیجئے۔ شاید ملائکہ اور شیطان اور جن اور جبرئیل اور نعماءِ جنت اور معجزات اور خرقِ عادات کو آپ ایسی باتیں قرار دیتے ہیں کہ جن کو اس وقت کے دہریہ خلافِ عقل کہتے ہیں۔ ان بیچاروں کے حصہ میں عقلِ سلیم ہی نہیں ان کو عقل سے کام ہی کیا پڑتا ہے یہ تو صرف محسوسات ہی پر ایمان رکھتے ہیں جو چیز ان کو حواسِ خمسہ سے معلوم نہ ہو ان کے نزدیک تو وہی خلافِ عقل ہے۔ ایسی اندھی عقل کا کیا ٹھکانا ہے؟ جب علماءِ اسلام رحمہم اللہ ہی آپ کے نزدیک خلافِ عقل کے پیرو اور غیر محقق ہیں تو کیا عیسائی اور یہودی علماء کہ جن کا اصولِ مذہب تثلیث والوہیتِ مسیح و کفارہ وتشبیہ وغیرہ لغو باتیں ہیں، محقق ہیں یا ہندوؤں کے پنڈت کہ جن کا اصولِ دین مخلوق پرستی ہے؟

قولہ ص ۳۹ اس امر کے ثبوت کے لیے کہ بانیِ مذہب کا ان چیزوں کے بیان کرنے سے صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا

بقدرِ فہمِ انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا نہ واقعی ان چیزوں کا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا۔ ایک حدیث ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو ترمذی نے بریدہ سے روایت کی ہے ایک شخص نے حضرت ﷺ سے پوچھا کہ بہشت میں گھوڑا ہوگا آپ نے فرمایا کہ تو یاقوت سرخ کے گھوڑے پر سوار ہو کر جہاں چاہے گا اڑتا پھرے گا پھر ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت وہاں اونٹ بھی ہو گا۔ آپ نے فرمایا وہ جو کچھ چاہو گے سب ہوگا۔ پس اس جواب سے مقصود یہ نہیں ہے کہ درحقیقت بہشت میں گھوڑے اور اونٹ ہوں گے بلکہ صرف ان لوگوں کے خیال میں اس اعلیٰ درجہ کی راحت کا خیال پیدا کرنا ہے۔

اقول اس حدیث فہمی کے قربان جایئے کہ جس سے الٹا مطلب سمجھ میں آئے۔ اے حضرت! جب آنحضرت علیہ السلام نے پہلے شخص کے جواب میں گھوڑا یاقوت سرخ کا بیان فرمایا اور دوسرے کو یوں کہا کہ جو چاہو گے سب ہوگا تو صاف اس بات کا بتلا دینا ہے کہ وہاں تمہاری خواہشیں ان ان صورتوں میں ظاہر ہو کر تمہارے روبرو آئیں گی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا نہ یہ کہ وہاں یہ چیزیں نہ ہوں گی۔ چنانچہ یہ آیت بھی اس مدعا پر دلیل ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ کہ تم کو وہاں جو چیز چاہو گے اور جس سے تمہاری آنکھیں خوش ہوں گی' ملے گی۔ مگر آپ چونکہ اس سر سے واقف نہ تھے اس کو الٹا سمجھ گئے۔

قولہ ص ۴۰ حکماءِ الٰہی اور انبیاء دونوں ایک سا کام کرتے ہیں۔ الخ

اقول حکماء بیچارے انبیاء کی برابری کیا کریں گے۔

نو روزہ کجا روئے آفتاب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا

آپ چونکہ ہنوز حقیقتِ نبوت سے واقف نہیں اس لیے دونوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ آپ کا اس کلام سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء کو چونکہ جہلاء کا سمجھانا مقصود تھا اس لیے انہوں نے یہ نعماءِ جنت ذکر کر دیں اور حکماء کو جہلاء سے کام نہ تھا وہ فقط روحانی جنت کے قائل رہے۔ قولہ تربیت یافتہ دماغ ان چیزوں سے محض راحت سمجھتا ہے نہ یہ کہ وہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں اور کوڑ مغز مُلا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں حوریں ملیں گی اور میوے کھادیں گے اور شرابیں پئیں گے الخ

اگر ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ آپ محض نافہمی[1] سے وہ اعتراضات جو پادری فنڈر نے کئے تھے پھکو بازی کے ساتھ اعادہ کرتے ہیں۔ پورا تربیت یافتہ دماغ تو آپ کا جب ہوگا کہ جب غیر محسوس خدا کا بھی انکار کریں گے۔ آپ کی یہ بے دلیل باتیں عقلاء کے نزدیک فضول ہیں مگر اور بہت سے کم علم لوگوں کے دلوں میں شک ڈالنے کے لیے اور ان کو ایمان سے ڈگانے کے واسطے کسی قدر کافی ہیں لیکن جن کے دل فیضِ نبوت سے منور ہیں وہ ایسی باتوں کی طرف کان بھی نہیں لگاتے اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح اکبر کے عہد میں صدہا ملحد پیدا ہو کر زیرِ زمیں ہو گئے اور میر محمد حسین موجد مذہب بیکوک وغیرہ صفحۂ عالم سے مٹ گئے اور دینِ الٰہی اسی طرح قائم رہا اور تا قیامت رہے گا یہ تیرہویں صدی کا الحاد بھی خواب و خیال ہو

[1] اس لیے کہ حقیقتِ جنت کو اور اس کے نعماء کو نہ سمجھے اور اس کا دنیا کی چیزوں پر قیاس کر کے اس کو خرافات کہنے لگے۔ ۱۲ منہ

جائے گا

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

❀❀❀

باب دوم

فصل اول: وحی والہام

لفظ الہام اور وحی باعتبار معنی لغوی کے قریب المعنی ہیں۔ گو بعض مواقع استعمال میں کسی قدر ایک دوسرے سے الگ ہوں مگر اکثر جگہ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی مراد ہوتے ہیں یعنی دل میں القاء کرنا۔ وحی کا اطلاق کتابت اور اشارت اور رسالت اور کلامِ خفی پر بھی ہوتا ہے۔ اور عرفِ شرع میں وحی کے ساتھ انبیاء مخصوص ہیں۔ الہام میں سب شریک۔ پس علاوہ لفظی فرق کے باعتبارِ عرف شرع کے دونوں کے معنی میں بھی کسی قدر تفاوت ہو گیا کیونکہ وحی میں ایک خاص بات ہوتی ہے جو الہام میں نہیں ہوتی۔ اس لیے شرعی معنی کے لحاظ سے غیر انبیاء کو صاحبِ وحی نہیں کہتے ہاں لغوی معنی کے لحاظ سے غیر انبیاء پر بھی اس کا اطلاق ہوا جیسا کہ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ...... وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰى ...... وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ...... وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ ...... وَلَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ۔ یہ تحقیق لفظی تھی اب ہم اس کی حقیقت اور اس کے معنی سے بحث کرتے ہیں۔

وحی یا الہام خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کے درمیان ایک پیغام یا ایسی تار برقی ہے کہ جس کے ذریعہ سے وہ اپنے خالق سے ہمراز و ہم کلام ہوتی ہے۔ گو اس مخلوقات کو اس خالق سے کچھ بھی مماثلت اور مشاکلت نہیں مگر تاہم ایک ایسا رابطہ ہے کہ گویا وہ اس کے پاس ہر دم موجود ہے۔

اتصالِ بے تکیُّف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس
سب سے ربطِ آشنائی ہے تجھے
دل میں ہر ایک کے رسائی ہے تجھے

اس امر میں انسان، حیوان شجر، زمین و آسمان سب شریک ہیں۔ ہر دم وہاں سے ہر ایک چیز کی طرف تار برقی جاری ہے اور ہر نوع کی طرف اس کی وحی ہوتی ہے اور اسی لیے ہر نوع کی ایک شریعت جدا ہے کہ اس پر اس کی مخالفت حرام کر دی گئی ہے۔ معدنیات کی طرف یہ الہام ہو رہا ہے کہ اپنی صلابت اور رخوت اور حرارت یا برودت کو محفوظ رکھے۔ ان کی صورتِ نوعیہ ہمیشہ ان اوامرِ الٰہی کے بجالانے میں کمر بستہ اور دست بستہ کھڑی رہتی ہے کہ کبھی آگ سے حرارت دور نہ ہونے پاوے اور پانی سے رطوبت اور برودت نہ جاوے۔ اور نباتات کی طرف ہر دم یہی پیغام پہنچتے ہیں کہ وہ خاک کو پانی کے ذریعہ سے چوس کر شاخ و برگ و گل بناوے اور اتنی مدت میں پھل آویں اور اتنی میں پھول آویں اور پتوں کی یہ رنگت اور یہ صورت رہے۔

اس میں اس طرح کی لکیریں اور ایسے ریشے ہوویں اور پھول پنکھڑیاں اور اتنی رنگت اور ایسی خوشبو رہے۔ ہر دم ان کی صورتِ نوعیہ ان فرائض کو ادا کیے چلی جاتی ہے۔ بیری[1] کے پتے پر حرام ہے کہ وہ پیپل کے پتے کی صورت میں آئے اور آنب کو حرام ہے کہ وہ بیر بن جائے۔ حیوانات پر وحی آتی ہے اور یہ باتیں فرض ہیں کہ ہر نوع ہمیشہ اپنی صورتِ نوعیہ پر قائم رہے۔ پرندوں کو یہ الہام ہوا کہ نر و مادہ باہم اس طرح سے میل جول کریں، گرمی کے موسم میں اپنا گھونسلا بنائیں۔ انڈوں کو اس طرح سیٔیں، بچے اس طرح نکالیں۔[2] دانہ پانی وہاں سے لائیں، بچوں کو اس طرح سے کھلائیں، بڑے ہو کر اس طرح سے اڑیں، دشمن سے بھاگیں، اپنے مقابل سے کہ جب ان کی ضروریات میں مخل ہو اس طرح جنگ کریں، اپنے بنی نوع کے ساتھ رہا کریں۔ اسی طرح گائے بھینس، انسان، گھوڑے، گدھے ہر ایک نوع کو بذریعہ الہام اور وحی وہ علوم سکھائے جاتے ہیں کہ جو ان کے نوع کو کارآمد اور ضروری ہیں اور ان چیزوں سے ان کی صورتِ نوعیہ کو منع کیا جاتا ہے جو ان کے حق میں ضار اور خلل انداز ہیں۔ گائے، بھینس پر حرام ہے کہ وہ گوشت کھائیں اگر اس حرام کا ارتکاب کریں تو اس کی سزا ان کو وہیں ملے۔ شیر پر گھانس کھانی حرام اور گوشت کھانا فرض ہے اس حکم کو عدول کرے تو سخت مضرت اٹھائے، نقصان کے جہنم میں جائے۔ شہد کی مکھیوں[3] پر یہ فرض کر دیا کہ درختوں کے پتے اور پھول اور پھل دیکھ کر کھائیں پھر اپنے بنی نوع کے لیے ایک گھر بنائیں اور وہاں شہد اس طرح سے بھریں اور اپنے سردار یعسوب کی اطاعت کریں۔ الغرض اور بہت سے حالات ہیں کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ الغرض اس وحی میں ہر ایک چیز شریک ہے اور ہر نوع کی شریعت جداگانہ ہے اور ہر نوع اس شریعت کی مجبوراً پابند ہے چنانچہ ان آیات میں اسی طرف اشارہ ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ[4] مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وقال وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ[5] علاوہ ان کے اور بہت سی آیات ہیں۔ قرآن مجید کی

---

[1] اس پر بھی اس معترض نے اعتراض کیا ہے کہ بہت سی بیری سال بھر کے بعد پیپل بن جاتی ہے الخ شاید ایسی بیری معترض کے گھر میں ہو گی۔ دوم یہ ایک جداگانہ نوع قرار پاوے گی نہ وہ کہ جس میں کلام ہے۔

[2] ان مضامین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ کہ زمین پر ہر جاندار حرکت کرنے والے اور ہر پرند دو بازوں سے اڑنے والے تمہاری مانند گروہ ہیں۔ ہم نے قرآن میں کوئی بات باقی نہیں چھوڑی۔ ۱۲ منہ

[3] چنانچہ اس آیت میں اس کا بیان ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ تیرے خدا نے شہد کی مکھیوں کو حکم کیا کہ پہاڑوں اور درختوں اور چھتوں میں گھر بنائے اور ہر طرح کے پھل کھائے اور سوراخوں سے سمٹ کر نکلے، نکلتا ہے ان کے پیٹ سے شہد مختلف رنگوں کا کہ جس میں لوگوں کی شفاء اور نشانی ہے ان کے لیے جو فکر کرتے ہیں۔ ۱۲ حقانی

[4] اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں (یعنی فرمانبرداری) آسمان والے اور زمین والے۔ ۱۲ منہ

[5] اور آفتاب اپنے ٹھکانے پر چلتا ہے یہ اندازہ ہے زبردست خبردار کا ۱۲ یعنی خدا نے جو اندازہ کر دیا اس کے موافق چلتا ہے اور چاند کے لیے ہمیشہ منزلیں مقرر کر دیں (کہ ہر ایک منزل کو ایک دن رات میں طے کرتا ہے) یہاں تک کہ پھر اسی طرح پرانی شاخ کی مانند ہلال ہو کر نظر آتا ہے آفتاب کو یہ درست نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک ستارہ آسمان میں تیرتا پھرتا ہے۔ ۱۲ منہ

خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہر ایک قسم کی حکمت اور ہر چیز کے سر کی طرف اشارہ ہے۔ کلامِ الٰہی میں یہ خوبی ضرور ہونی چاہیے اور انہیں وجوہ سے اس کا مثل بنانا محالات سے ہے۔ مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں حاصل کلام اس وحی اور الہام میں ہر چیز شریک ہے اور ہر ایک اس کی اطاعت پر سربسجود ہے اور یہی اطاعت ان کا ذکر اور یہی ان کی تسبیح و تقدیس کہ جس سے کوئی جزءِ عالم خالی نہیں۔

بذکرش ہر چہ بینی درخروش است
ولے داند دریں معنی کہ گوش است
نہ بلبل برگلش تسبیح خوانیست
کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانیست

لیکن اس وحی اور اس الہام کی جدا زبان ہے۔ جس زبان سے ہر چیز اس سے بات کرتی اور اپنے دردِ دل کو ظاہر کرتی ہے وہ اور زبان ہے۔ باغ میں سرو دست بستہ کھڑا ہو کے جس زبان سے عرضِ حال کر رہا ہے وہ اور ہے۔ دریا اور پہاڑ اور ہیبت ناک جنگل بلکہ انسان کا ہر ہر عضو بلکہ عالم کا ہر جزء جس زبان سے کلام کر رہا ہے وہ اور زبان ہے یہ زبان کہ جس سے ہم باہم بولتے چالتے ہیں اور زبان ہے اس زبان میں بے آواز اور بے حروف اور بغیر الفاظ کے وحی آتی ہے چنانچہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ[1] وقال وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا[2] وقال فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا اس قسم کے علاوہ ایک دوسری قسم وحی اور الہام کی بھی ہے کہ جس کے ساتھ حضرتِ انسان (یا کوئی اور نوع ذی عقل) مخصوص ہو چونکہ جمادات ترقی کر کے نباتات ہوئے اور نامی کہلائے اور جسمِ نامی ترقی کر کے حیوانیت کے درجہ میں پہنچے پھر اعلیٰ کمال حاصل کرنے والے انسان ہو گئے۔ انسان ان جمادات' نباتات' حیوانات میں چونکہ اعلیٰ اور مخصوص ہے تو اس کے لیے وحی اور الہام بھی بہ نسبت اور چیزوں کے مخصوص ہے۔ اس کا دل گزرگاہِ خداوند تعالیٰ ہے۔ اس کا رابطہ خدا کے ساتھ سب سے نرالا ہے۔

ارض و سماء کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ تو جس میں سما سکے

انسان کے دل پر جو کچھ وارداتِ غیبی ظہور کرتی ہیں سب وہیں سے آتی ہیں اور ہر وقت ملہمِ غیبی اس کو وہاں کی باتیں تلقین کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کا خمیر ایسے متضاد الطبائع سے ہوا ہے کہ جس کی صورتِ نوعیہ کا مقتضی طبعی تاریکی اور اضلال ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کی روح (کہ جس کو حکماء نفسِ ناطقہ کہتے ہیں اور جوہرِ سماوی اور نورِ الٰہی کے لقب سے ملقب کرتے ہیں) گرچہ حادثِ ذاتی بلکہ حادثِ زمانی ہے لیکن اس جسم کے مرکب ہونے سے ہزار ہا سال پہلے پیدا ہو چکی[3]

[1] اور تیرے رب نے مہال (مکھی) کو یہ وحی بھیجی کو تو پہاڑوں میں گھر بنا۔ اور ہر طرح کے میوے کھا کے شہد بنا۔ ۱۲ منہ

[2] اور خدا نے ہر آسمان میں وحی بھیجی۔ ۱۲ منہ

[3] چنانچہ یہ آیت اس دعویٰ پر دلیل میں ہے اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ الآیہ یعنی خدا نے بنی آدم کی ذریات کو ان کی پشت سے روزِ میثاق نکالا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ خدا نے آدم کی پشت کو مسح کیا اس کی تمام ذریت جو کہ قیامت تک ہونہار تھی چیونٹیوں کی طرح نکل پڑی۔ سب سے خدا نے خطاب کر کے پوچھا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہ کیا میں تمہارا رب نہیں قَالُوْا بَلٰی سب نے کہا ہاں۔ کہا میں نے تم سے اقرار لے لیا اور تم کو ←

ہے اور حظیرۂ قدس میں کہ جس کو اس کا اصلی وطن کہتے ہیں رہی ہے۔

توئی آں دست پرور مرغِ گستاخ
کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی
چو دوناں چغدِ ایں ویرانہ گشتی
بیفشاں بال و پرز آمیزشِ خاک
پر تا کنگرۂ ایوانِ افلاک

پھر اس جام کے پتلے[1] سے اس کو پابستہ کر دیا۔ اور اس کا بارِ گراں (کہ اس جسمانی آلے کے ذریعہ سے اپنے لیے اور کمالات زائد حاصل کرے نہ کہ اپنی اصلی استعداد اور ذاتی نورانیت کو اس کی صحبت میں زائل کرے) اس ناعاقبت اندیش کے سر پر دھر دیا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

پس اس جوہرِ نورانی کا مقتضا قوتِ ملکیہ ہے اور اس جسمِ ظلمانی اور صورتِ ہیولانی کا اثر قوتِ بہیمیہ

آدمی زادہ طرفہ معجونیست
از فرشتہ سرشتہ دار خیواں
گرکند میل ایں بود بہ ازیں
گرکند میل آں بود بدراں

اور کبھی یہ دونوں قوتیں باہم مصالحت کر کے رہتی ہیں اور کہیں ہمیشہ کشاکشی اور تخالف کے صدمے سہتی ہیں پھر کبھی یہ غالب اور یہ مغلوب اور کبھی برعکس و مقلوب۔ ان قوائے ملکیہ و بہیمیہ کے اجتماع سے باعتبار کم زیادہ ہونے کے بیشمار مراتب

← تمہارے لیے گواہ بنا لیا۔ اب میں دنیا میں تم کو بھیجتا ہوں اور تمہارے پاس تمہارے لیے ہادی یعنی رسول آئیں گے اس وقت ہر ایک کو اس کی تعلیم قبول کرنی پڑے گی۔ وہ لوگ اس روز کے عہد کو یاد دلائیں گے پس جو کوئی ان کا کہا نہ مانے گا اور نورِ فطرت کو چھوڑ کا اندھیرے میں پڑے گا تو قیامت کو اس کا عذر قبول نہ ہوگا کہ یہ برائیاں شرک و کفر تو ہمارے بڑوں نے کی تھیں اور ہم تو ان کے مقلد تھے۔ ہم سے خدا کیوں مؤاخذہ کرتا ہے کیونکہ یہ عذر بعد اس کے کہ وہ خود عہد کر چکے ہیں مسموع نہ ہوگا۔ (انتہٰی ملخصا)

[1] جس طرح آئینہ کو مٹی ملتے اور اس پر راکھ تھیڑتے ہیں تا کہ اس خاک کے دور ہونے کے بعد یہ خوب چمک جاوے اسی طرح انسان کی روح کو جو آئینۂ ساوی ہے کہ جس میں تمام غیب کی صورتیں بشرط صاف ہونے کے نظر آتی ہیں' جسم خاک سے متعلق کر دیا کہ اس کی مفارقت کے بعد کہ جس کو موت کہتے ہیں اس کے خوب کمالات اور اس کا جوہر چمک آوے اور جمالِ جہاں آرا کے نور منقش ہو جانے کے قابل ہو جاوے۔ پس جس نے اس کو سنوار لیا اس نے فلاح پائی اور جس نے اصلی جوہر کو بگاڑ لیا اس نے خرابی اٹھائی۔ ۱۲ منہ

پیدا ہوتے ہیں مگر زیادہ قابلِ لحاظ یہ آٹھ قسم ہیں۔ چار قسم اس صورت میں پیدا ہوتی ہیں کہ جب ملکیہ اور بہیمیہ دونوں مصالحت پیدا کر کے ایک مزاجِ خاص حاصل کر لیویں: (اول) یہ کہ ملکیہ نہایت علو میں ہو اور بہیمیہ بھی شدید ہو مگر ملکیہ کے تابع ہو یہ وہ لوگ ہیں کہ امورِ ریاستِ دنیا و دین پر حاوی ہیں اور انتظامِ ملت و مذہب و تہذیبِ نفس اور اصلاحِ اخلاق میں ممتاز ہیں۔ دنیا اور دین دونوں کے کمالات ان کو حاصل ہوتے ہیں۔ پس جس طرح کہ عالمِ ملکوت کے اسرار ان کے دلوں

میں منشکف ہوتے ہیں اور وہاں کی چیزیں ان کو عیاناً دکھائی دیتی ہیں ملائکہ اپنی اصلی حالت پر بھی ان سے نظر ملا کر کلام کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیاوی اصلاحات اور انتظامات اور تدابیرِ جزئیہ میں بھی یہ لوگ کامل ہوتے ہیں[1] یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو انبیاءِ اُولوالعزم کہتے ہیں۔

(دوم) وہ کہ قوائے ملکوتیہ ان کے علو پر اور قوائے بہیمیہ ضعف پر ہوں یہ لوگ انتظام و مصالحِ دنیاویہ میں ان سے کم ہیں لیکن وہ بھی انبیاء ہیں۔

(سوم) وہ لوگ ہیں کہ ان کے قوائے بہیمیہ اور ملکیہ دونوں ضعیف ہیں یہ لوگ وہ ہیں کہ جو بھاری کاموں سے خواہ دینی ہوں یا دنیاوی بوجہ سستی کنارہ کش رہتے ہیں یہ لوگ کمالات سے حصہ نہیں پاتے۔

(چہارم) وہ ہیں کہ جن کے قوائے بہیمیہ نہایت غالب اور ملکیہ نہایت پست۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اکثر شہواتِ نفسانی میں سرشار اور تاریکیِ ہیولانی میں گرفتار رہتے ہیں۔

اور یہی اور چار قسم اس دوسری صورت میں پیدا ہوتی ہیں کہ جہاں قوتِ ملکیہ اور بہیمیہ میں باہم مصالحت نہیں بلکہ تجاذب اور تخالف ہے۔ اور ان اقسام میں باقاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کی قوتِ بہیمیہ نہایت تیز ہوگی وہ مجاہدات اور ریاضات کا زیادہ محتاج ہوگا بالخصوص صاحبِ تجاذب۔ پس جب اس کی قوت ملکیہ زور کرے گی تو معارف میں زیادہ مصروف ہوگا اور بسبب غلبۂ بہیمیہ کے اعمال کی چنداں پروانہ کرے گا اور جب اس کی ملکیہ مغلوب ہوگی تو ہمہ تن دنیا ہی میں مصروف ہو جائے گا اس کا یکساں حال کبھی نہ رہے گا۔ اس اصول سے تمام اہل اللہ صدیقین و شہداء کے مراتب اچھی طرح معلوم ہو سکتے

[1] اسی لیے جس طرح ہمارے نبی علیہ السلام نے دینی اور روحانی تعلیم میں کوئی بات نہیں چھوڑی اسی طرح جسمانی اور دنیاوی اصلاح اور انتظام کی باتیں بیع و شراء غسل و طہارت کی بھی اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اجمالاً یا تفصیلاً سب بیان فرما دیں۔ حتیٰ کہ استنجاء کرنا اور پاخانے میں ڈھیلا لینا بھی تعلیم کر دیا۔ رات کو چراغ گل کر کے دروازہ بند کر کے برتنوں کا منہ بند کر کے سونا بھی بتا دیا۔ وقس علیہ۔ اور اسی لیے جیسا کہ آپ اس لطافت کو پہنچے تھے کہ جسمِ اطہر روح کی طرح شبِ معراج آسمانوں پر پہنچا اسی طرح قوائے بہیمیہ کی باتوں، عورتوں سے رغبت رکھنے اور نو بیویوں کے پاس ایک شب میں دورہ کرنے اور شجاعت اور طاقت میں کمال رکھتے تھے ادہر اللہ سے واصل ادھر مخلوق کے شامل۔ خواص اس برزخِ کبریٰ میں تھا حرفِ مشدّد کا۔ ادہر آپ باعتبار قوتِ جسمانی کے دنیاوی کاموں میں بات چیت میں مصروف رہتے مگر اسی حال میں بسبب قوتِ ملکیہ کے ذاتِ پاک میں مستغرق رہتے تھے جو بعض نادان اس نکتہ سے واقف نہیں وہ آنحضرت علیہ السلام کے بکثرت نکاح کرنے وغیرہ باتوں اور جزوی تعلیم پر طعن کرتے ہیں اور اس زمانہ کے متعصب پادریوں اور بعض ہنود نے جیسا کہ پادری فنڈر اور عماد الدین اور لالہ اندرمن وغیرہم ہیں۔ دفتر کے دفتر اسی بارے میں سیاہ کر دے اور بندگانِ خدا کو گمراہی میں ڈالا۔ حقانی

ہیں اور اشرار کے درجات بھی بخوبی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ المختصر اس الہام اور وحی سے ہر فرد بشر فیضیاب ہے لیکن باعتبارِ شدت وضعف قوائے ملکویۃ و بہیمیہ کے علی حسب المراتب حصہ ملتا ہے۔ پس جب کسی قدر قوتِ ملکیہ اس طرف متوجہ ہوتی اور بہیمیہ کے پنجہ سے نجات پاتی ہے تو اس پر وہاں کی باتیں القاء ہوتی ہیں اور اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب قوتِ بہیمیہ کی ہوا چلتی ہے تو اس کے مقتضٰی کے موافق شہوانی باتیں سوجھتی ہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں کہ ''ہر بشر کے دل پر ایک نیکی کا فرشتہ الہام کرتا ہے اور بدی کی طرف شیطان بلاتا ہے'' اسی طرف اشارہ ہے۔ پس انسان کی سعادت اور شقاوت کی باتیں کہ جن کو شریعت کہتے ہیں اور جن کا الہام ہونا رحمتِ الٰہی کے نزدیک نہایت ضروری تھا اس قابل نہ تھیں کہ ہر کس و ناکس کے الہام اور وحی پر چھوڑ دی جاتیں بلکہ ان کے لیے ایسے شخصوں کا الہام ضروری ہے کہ جو قوتِ بہیمیہ کی تشویشات اور شوائبِ بشریہ سے معصوم ہوں اور ان کا الہام بھی نہایت اعلیٰ طور پر ہو کہ جس کو وحی بواسطہ جبرئیل کہتے ہیں۔ پس یہ لوگ انبیاء ہیں۔

اور یہاں سے آپ کو ضرورتِ نبوت بھی خوب معلوم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام افراد نوع میں نفوسِ انبیاء سب سے زیادہ کاملہ ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ انہیں کے وسیلہ سے عالمِ قدس کے فیوضات انسان کو نصیب ہوتے ہیں جس نے ان کے حکم سے سرتابی کی وہ اپنے کمالات سے اس طرح محروم رہا کہ جس طرح نفسِ نباتیہ کی نافرمانی سے شاخ اور پھول و پھل محروم ہو کر سوکھ جاتے اور بگڑ جاتے ہیں اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے[1] اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ مگر یہ تو آپ کو خوب معلوم ہو گیا کہ الہام میں سب شریک ہیں ہر مصنف کو اور ہر شاعر کو اور ہر واعظ کو بلکہ ہر ایک کام کے کاریگر کو بھی الہام ہوتا ہے۔ لوہار بڑھئی کو اپنے کام میں الہام ہوتا ہے کہ جس سے وہ طرح طرح کی صنعتیں اختراع کرتا ہے پھر اس میں بھی متفاوت درجے ہیں جو لوگ کہ ہمہ تن اس میں مستغرق رہتے ہیں ان کی قوتِ متخیلہ یہاں تک غلبہ کرتی ہے کہ وہ خیالات ان کو مجسم دکھائی دیتے اور کبھی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ آوازیں ہاتفِ غیب کی طرف سے نہیں ہوتیں بلکہ درحقیقت وہاں سوائے ان کے خیالات کے اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ مجنون آدمی خیالی صورتوں سے باتیں کرتا اور ان کو دیکھتا ہے یا بیمار آدمی غلبۂ مرض میں کچھ کچھ دیکھتا سنتا ہے بعض کو بخار آتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ سب حالات ان لوگوں کے ہیں کہ جن کے قوائے بہیمیہ اور صفاتِ بشریہ غالب ہیں کہ جن کا عوام الناس لقب ہے اور جن کے قوائے ملکیہ غالب ہوتے ہیں وہ ان خیالات سے بالکل پاک ہیں پھر ان کی دو قسم ہیں کیونکہ یا تو ان کی قوتِ ملکیہ نہایت علو پر ہے یا ذرا کم۔ قسم اول انبیاء علیہم السلام ہیں کہ جن کو باعتبار اختلافِ حالات کے مختلف طور پر الہام ہوتا ہے کبھی تو خواب میں (جب کہ اس جسم سے توجہ کم ہوتی ہے اور اس عالم کا پردہ ان سے اٹھ جاتا ہے) ملائکہ کے ذریعے سے اور کبھی دو بدو خدائے پاک سے ہمکلام ہو کر مستفید ہوتے ہیں اور کبھی مغیبات عالمِ مثالی میں متشکل ہو کر دکھائی دے جاتے ہیں اور کبھی حالتِ بیداری میں کہ جب ملکیہ کا نہایت غلبہ ہوتا ہے تو یہ تینوں صورتیں پیش آتی ہیں۔

صورت اول الہامِ انبیاء: اول یہ کہ وہ فرشتہ کہ جس کو ناموسِ اکبر یا جبرئیل کہتے ہیں پیغامِ الٰہی پہنچاتا ہے اور اس کے بھی کئی طور ہیں۔ اول یہ کہ جبرئیل کسی شکل میں ظاہر ہو کے مطلع کر جاوے۔ چنانچہ جنگِ احزاب کے بعد جبرئیل آدمی کی

[1] حکم مانو اللہ اور رسول کا جب کہ تم کو وہ ان باتوں کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشتی ہیں۔ ۱۲

شکل میں غبار آلودہ ظاہر ہوئے اور یہ کہہ گئے کہ آپ اے نبی اللہ! جنگ سے فارغ ہو گئے لیکن ہم نہیں ہوئے۔ چلیے بنی قریظہ کا محاصرہ کیجئے۔ چنانچہ اس حدیث کو صحاح ستہ میں روایت کیا ہے اور اکثر تو دحیہ کلبی کی صورت میں دکھائی دیتے تھے اور کبھی اجنبی شکل میں اس طرح ظاہر ہوتے تھے کہ جس کو حضارِ مجلس بھی دیکھ لیتے تھے۔ چنانچہ بخاری مسلم وغیرہما محدثین نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت جبرئیل مسافرانہ صورت میں نہایت سفید لباس میں ظاہر ہو کر آنحضرت علیہ السلام کے زانو سے زانو ملا کر ایمان اور اسلام کے معنی پوچھنے لگے اور آپ کے جواب کے بعد خود ہی تصدیق کرتے جاتے تھے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس کے اس سوال و تصدیق سے نہایت تعجب ہوا۔ پس جب وہ چلے گئے تو آنحضرت علیہ السلام نے بتلایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے تم کو ایمان و اسلام کے معنی سکھانے آئے تھے اور اسی طرح دو روز جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا کہ ایک روز اول وقت اور دوسرے روز اخیر وقت امام مالک وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے۔ اس امامت کو بھی غالباً حضارِ جماعت نے مشاہدہ کیا ہوگا اور صحیح بخاری میں بھی ہے کہ احیانًا یتمثل الی الملك رجلًا فیکلمنی فاعی مایقول کہ کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں آ کے مجھ سے کلام کرتا ہے تو میں اس کی بات یاد کر لیتا ہوں۔

دوم یہ کہ جبرئیل ملکوتی صورت میں خاص آپ کو ہی دکھائی دیویں اور کلامِ الٰہی یا احکامِ الٰہی کبھی مع الفاظ اور کبھی محض مطلب دل میں القاء کر جاویں اور کلام کر جاویں اور کسی کو نہ ان کی صورت دکھائی دیوے نہ ان کی آواز سنائی دیوے۔

چنانچہ اکثر وحیِ قرآن میں یہی بات پیش آتی تھی اور کبھی جبرئیل کے وحی لاتے وقت آنحضرت علیہ السلام کو ایک آواز جرس کی مانند سنائی دیتی تھی جیسا کہ صحیح بخاری اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ حالت آپ پر نہایت شاق گزرتی تھی۔ اس آوازِ جرس کی اصل حقیقت نبی علیہ السلام سے منقول نہیں۔ لیکن علماء نے اپنی رائے سے اس کی چند وجوہ بیان کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ملائکہ کے پروں کی آواز تھی بعض کہتے ہیں کہ تنبیہ کرنے کے لیے پیشتر آواز آتی تھی والعلم[1] عند اللہ۔

صورت دوم: دوسری بیداری کی یہ حالت ہے کہ تجلی ذاتی ہو کر خود بخود خدائے تعالیٰ سے ہمکلام ہو جیسا کہ کوہِ طور پر موسیٰ علیہ السلام کو یہ معاملہ پیش آیا و کلم اللہ موسیٰ تکلیما اور شب معراج میں یہ بات آنحضرت علیہ السلام کو پیش آئی۔

صورت سوم: تیسری یہ صورت کہ حالتِ بیداری میں عالم ملکوت کا مشاہدہ و تجلی ہو کر اسرارِ غیب پر مطلع ہو جاویں۔ چنانچہ نمازِ کسوف میں یہ بات آپ کو پیش آئی۔

چوتھی ایک اور صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ فرشتہ غائبانہ آواز سنا کر بتا دے کہ جس کو ہاتفِ غیب کہتے ہیں۔

---

[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وحی کے وقت ملکیہ کا زور اور بہیمیہ کا تنزل ہوتا ہے۔ جس میں باہم ایک منازعت سی پیدا ہونے سے جسم میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوتا ہے۔ جس سے یہ جھنجھناہٹ کی سی آواز بھی کان میں آتی ہے اور پسینہ بھی آجاتا ہے۔ یا بظاہر بیہوشی کی سی حالت بھی ہو جاتی اور کبھی خراٹا بھی لگ جاتا ہے بلاتشبیہ جب آمدِ بخار کا وقت اور دورہ شروع ہوتا ہے تو حالتِ صحت و مرض میں اختلاف عظیم پیدا ہونے سے اصوات تنبیہیہ وغیر ہا باتیں محسوس ہونے لگتی ہیں حالانکہ ان دونوں حالتوں میں جو مرض اور وحی کے وقت پیدا ہوتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس وہ جو روایات میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بوقتِ وحی پسینہ آتا تھا اور بے ہوشی سی ہو جاتی تھی یا کبھی خراٹے کی آواز بھی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محسوس ہوتی تھی۔ غالباً ان کا بھی سبب تھا جس کو سیل وغیرہ لال بجھکڑوں نے کہیں صرع کا دورہ کہیں کچھ تجویز کر کے آنحضرت علیہ السلام کو نادانی سے موردِ طعن بنایا شرِ سوءِ فہمی سے الامان۔ حقانی

اس مقام پر ایک بات قابلِ بحث ہے وہ یہ کہ اور جس قدر وحی یا الہامِ انبیاء کی قسمیں بیان ہوئیں سب ٹھیک ہیں مگر جبرئیل کے ذریعہ سے الہام ہونا یا وحی آنا اور جبرئیل کا مطالب کو کبھی بالفاظ اور کبھی محض معانی دل میں القاء کرنا کیوں ہے؟ کیا اپنی قوتِ ملکیہ سے خود بخود پیغمبر علیہ السلام خدا سے ہمکلام نہیں ہو سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نقل سے تو جبرئیل علیہ السلام کا الہام اور وحی میں واسطہ ہونا بخوبی ثابت ہے۔ چنانچہ وہ احادیثِ صحیحہ جو اس بارے میں وارد ہیں ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ مگر آیاتِ قرآنیہ بھی اس امر میں بیشمار وارد ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کہہ جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہو سو ہوا کرے مگر اس نے تو یہ قرآن تیرے دل پر خدا کے اذن سے اتارا ہے از انجملہ یہ ہے يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ کہ خدا جبرئیل کو جس کے پاس چاہتا ہے بھیجتا ہے۔ از انجملہ یہ ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ''یہ قرآن اس رسول کریم کا سخن ہے کہ جو قوت والا اور خدا کے نزدیک معزز اور امین ہے یعنی جبرئیل اور تمہارا نبی (محمد علیہ السلام) کچھ دیوانہ نہیں (کہ اپنے خیالات کو مجنون کی طرح جبرئیل اور وحی سمجھ جاوے) اور اس نے جبرئیل کو (اس کی صورتِ اصلیہ پر) کنارۂ آسمان پر دیکھا ہے اور وہ غیب کی باتوں میں بخیل نہیں اور یہ قرآن شیطان کا قول نہیں (کہ کوئی یہ گمان کرے کہ شاید شیطان جبرئیل کی صورت میں آتا ہو) پس تمہارا خیال کدھر جاتا ہے (کہ جو ایسی ایسی بدگمانیاں کرتے ہو'' قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ''تم کہو کہ اس قرآن کو تمہارے رب کی طرف سے سچائی کے ساتھ روح القدس نے اتارا ہے یعنی جبرئیل نے اور سر اس کا یہ ہے کہ جن کو انبیاء کہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے نفوسِ مزکاہ ہر طرح کی لوثِ بشری سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور جن کو ملائے اعلیٰ میں لوگوں کی رہنمائی اور اصلاحِ دارین کے لیے ممتاز بنایا جاتا ہے قال تعالیٰ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ان کی اطاعت کا قرنوں تک لوگوں کے دلوں میں میلان اور شوق ڈالا جاتا ہے ان کے موافق پر رحمت اور مخالف پر لعنت اترتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک ہزار ہا برس سے تخمینًا تمام عالم کہ جس میں طرح طرح کے لوگ ہیں انبیاء علیہم السلام کے تابع چلا آتا ہے آخر کچھ تو بات ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر اور حکماء و عقلاء حضرت مسیح علیہ السلام کو مانتے چلے آئے ہیں۔ اور تخمینًا تہائی دنیا نے تیرہ سو برس سے ایک شخصِ یتیم' خشک پہاڑوں کے رہنے والے یعنی حضرت خاتم الانبیاء ﷺ پر جان فدا کر رکھی ہے ان کا نام دلوں کو مقناطیس[1] کی طرح کھینچتا ہے۔ اگر یہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کی قبولیت نہیں تو پھر کیا ہے؟ تمام یورپ اور امریکہ اور ایشیا اور افریقہ میں چند[2] شخصوں کی مانند کوئی رفارمر یا واعظ یا اپنی قوم کا ترقی خواہ یا کوئی حکیم و فلاسفر یا کوئی ریاضیات کا امام یا کلوں

---

[1] اصل اس کی یہ ہے کہ تمام اشیاء کا مرکزِ اصلی اور مرجع ذاتِ باری ہے اور اس کا یہ اثر عالم کی ہر جزو میں پایا جاتا ہے مقناطیس کے اندر جو جذب ہے' وہ اسی کا پرتوا ہے پھول جو بلبل کا دل کھینچتا ہے اس میں اسی کا پرتوا ہے۔ پس کامل پرتو اس کا انبیاء علیہم السلام پھر اولیاء کرام ہیں اسی لیے ان کی طرف تمام عالم کے دل از خود کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب خدا کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو حکم کرتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تم بھی کرو پھر ملاءِ اعلیٰ کے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں پھر منادی کر دی جاتی ہے پس وہ محبت زمین پر بھی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ اہلِ زمین بھی اس سے محبت کرتے ہیں اور جس سے خدا کو نفرت ہوتی ہے اس کی نفرت اسی طرح پھیلتی ہے۔ ۱۲ منہ

[2] یعنی حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام۔ ۱۲ منہ

کا ایجاد کرنے والا ایسا مقبول اور پیشوائے خاص و عام کیوں نہ ہوگیا؟ کیا کسی کو اس بات کی آرزو نہ ہوئی ہوگی کیوں نہیں بلکہ ہزاروں اس حرص میں ایڑیاں رگڑ کر مر گئے۔ المختصر اس کی معرفت نوع کی اصلاح کے وہ علوم ظاہر ہوتے ہیں کہ جن کے حاصل کرنے سے عقول عاجز ہیں اور اس کا اتباع ہر فردِ نوع پر ایسا لازم اور ضروری ہوتا ہے جیسے کہ درخت یا حیوانات کی صورتِ نوعیہ کا اس کے افراد یا یعسوب کا نحل پر۔ پس جس طرح درخت کے ہر پتے اور پھول اور ہر شاخ کی بہبودگی اور اصلاح نفسِ نباتیہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اگر وہ اس کی مخالفت کریں تو اپنے کمالاتِ نوعیہ سے محروم رہ جائیں نہ پتہ بڑھ سکے نہ پھول کھل سکے نہ پھل پک سکے۔ اور جس طرح کہ نفسِ حیوانیہ شیر کو گھانس کھانی حرام اور گائے اور بھینس پر فرض واجب کرتا ہے اسی طرح نبی علیہ السلام کی اطاعت فرض ہے وہ بھی ہر شخص کے لیے اس کی مضر چیزوں کو حرام اور ضروری باتوں کو فرضِ تام کہتا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں اسی طرح اشارہ ہے هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (خدا وہ ہے کہ جس نے ان جان لوگوں میں انہیں میں سے وہ رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک کرتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور بلاشک اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ''کہ اے مومنو کہا مانو اللہ اور رسول کا جب کہ وہ تم کو ایسی بات کی طرف بلائے کہ جو تمہیں حیات (ابدی) بخشے'' وقال یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ''کہ رسول لوگوں کے لیے پاک چیزیں حلال اور گندی چیزیں حرام کرتا ہے'' پس تمام نوعِ انسان میں سے ان علوم کے لیے انبیاء مخصوص ہونے ضرور تھے اور ان ضروری چیزوں کے لیے الہام بھی وہ ہونا چاہیے تھا جو سب صورتوں میں اعلیٰ اور بعید عن الخطاء ہو لیکن الہام کی چھ صورتوں میں سے تین جو خواب میں پیش آتی ہیں اس قابل نہیں کیونکہ اکثر خواب میں قوتِ وہمیہ اور ادراکاتِ عقل صرف کو معارض ہو کر خلط ملط کر دیتی ہے اس لیے مدرکات اپنی مناسب صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا تعبیر دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ باقی رہیں بیداری کی تین[1] صورتیں تو ان میں سے یہ صورت کہ عالمِ ملکوت منکشف ہو جاوے سو اس کا مآل کار اسی بات پر رہتا ہے کہ وہ خدا سے خود ہمکلام ہو جاوے۔ پس یہ ایک دوسری صورت کہ فرشتہ پیغام لاوے قابلِ اطمینان ہیں اور قرآن مجید انہیں دونوں صورتوں میں نازل ہوا ہے لیکن انسان کے حالات گو وہ نبی ہی کیوں نہ ہو ہر دم یکساں نہیں رہتے اس لیے یہ حالتِ ہمکلامی قلیل الوقوع ہے۔ اس لیے اس صورت میں بہت ہی کم قرآن مجید نازل ہوا ہے فقط سورۂ بقرہ کا اخیر شبِ معراج میں اس طرح سے نازل ہوا (کما فی الاتقان) پس زیادہ کار براری کی یہی صورت رہی کہ ناموسِ اکبر یعنی جبرئیل علیہ السلام آنحضرت کو اپنی صورتِ ملکیہ میں نظر آویں اور بالفاظ کلام پہنچاویں کہ جس کو وحیِ متلو اور قرآن بھی کہتے ہیں اور اس کے علاوہ اور جس قدر صورتیں ہیں سب کو وحیِ غیر متلو اور سنت اور کبھی حدیثِ قدسی بھی کہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ جبرئیل وہ کلام کہاں سے لاتے تھے کسی تختے پر لکھا ہوا دیکھ کر یاد کر آتے تھے یا پسِ پردہ خدا سے سن لیتے تھے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے اور جس بناء پر سید احمد خاں صاحب نے اعتراض کیا ہے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ پیشتر فصل ملائکہ میں آپ فرشتے کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں کہ یہ نورانی لوگ ہیں کہ جن کو علیٰ حسبِ مراتب جنابِ

[1] ہاتفِ غیب کی آواز کا اس بارہ میں کچھ شمار نہیں۔ ۱۲ منہ۔

باری سے تقرب ہوتا ہے اور جب کہ جبرئیل نہایت درجہ کے ملائکہ مقربین میں سے ہیں ان کو خدائے پاک سے ہمکلام ہونا ہر وقت آسان ہے۔ لیکن خدا اور فرشتوں کا باہم کلام اس آواز اور ان حروف سے نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو اس عالم میں ہمارے مضامینِ دلی کے ادا کرنے کے واسطے آلات ہیں اور کبھی ہم بھی بغیر ان حروف اور صوت اور تلفظ کے باہم کلام کر لیتے ہیں۔ خیر اعلیٰ لوگ تو قوتِ روحانیہ سے بات چیت صدہا کوس کے فاصلہ سے کر سکتے ہیں مگر تار برقی وغیرہ آلات سے ہم بھی چپ ہو کر لب بند کر کے کلام[1] کر سکتے ہیں۔ پس جبرئیل علیہ السلام علمِ الٰہی سے کہ جس کو قلم[2] اور لوحِ محفوظ کہتے ہیں مطلع ہو کر اور الفاظ بھی وہیں سے تلقین پا کر آنحضرت علیہ السلام کو حسبِ حاجت پہنچا جاتے تھے۔ اور اس قرآن کی عالمِ مثال میں ایک صورت خاص ہے کہ جس کو بیت المعمور میں یکبارگی نازل کرنے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اس کے ساتھ تمام نازل شدہ قرآن کو مطابق کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب یاد کرا دیتے اور آیات کی ترتیب باعتبارِ تقدیم وتاخیر کے بھی اسی کے مطابق مقرر کر دیتے تھے گو نازل ہونے میں اس ترتیب کا لحاظ نہ ہوتا تھا پہلے کا پیچھے اور پیچھے کا پہلے حسبِ حاجت نازل ہو جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ پیغمبر علیہ السلام ان الفاظ اور معانی کو جبرئیل سے حاصل کرتے تھے اور پھر حفاظ کو یاد کرا دیتے اور کاتبینِ وحی سے لکھوا دیتے تھے اور خود بھی بخوبی حفظ رکھتے تھے۔

اب اس مقام پر یہ شبہ کرنا کہ خدا کے کلام میں تو حروف اور آواز نہیں ہے پھر جبرئیل نے وہ کیونکر سنا ہوگا ص ۲۶۔ جیسا کہ سید احمد خان صاحب امام زاری علیہ الرحمۃ سے نقل کرتے ہیں محض لغو ہے۔ پھر اس کا یہ جواب دینا کہ ممکن ہے کہ خدا نے جبرئیل میں ایسی سماعت پیدا کی ہو کہ خدا کا کلام سن لیتا ہو۔ الخ بے فائدہ ہے مگر یہ جواب دینا یا یہ ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز جسم دار میں سے خاص طرح کی آواز ٹھہر ٹھہر کر نکالی ہوں اور جبرئیل نے بھی اسی کے ساتھ آوازیں ملائی ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بتلا دیا ہو کہ یہ وہی عبارت ہے جو ہمارے کلامِ قدیم کو پورا پورا ادا کرتی تھی محض لغو ہے۔ حضرت امام فخر رازی کی شان سے یہ بالکل بعید ہے چونکہ سید صاحب نے کسی مقام کا حوالہ نہیں دیا لہٰذا ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ تقریر کسی کی امام نے علی السبیل قیل نقل کی ہوگی پھر اس پر سید صاحب کا اعتراض دل کھول کر کرنا یہ تقریریں ہمارے علماءِ قدیم کی اسی قسم کی تقریریں ہیں جن پر آج لوگ ہنستے ہیں اور قرآن مجید اور مذہبِ اسلام کو مثل اس تقریر کے لغو سمجھتے ہیں الخ ص ۲۷ بناء الفاسد کا مضمون ہے۔ ایسی بے بنیاد تقریروں پر نظر کر کے سید صاحب جبرئیل اور وحی کے منکر ہو گئے ہیں۔ افسوس آپ کو اس بارے میں تحقیق کا کلام دستیاب نہ ہوا۔

قسم دوم انبیاء سے کمتر درجہ کے لوگوں کا الہام ہے ان لوگوں کا الہام غالباً پہلی تین صورتوں پر مبنی ہوتا ہے اور حالتِ بیداری میں خدا سے کلام کرنا اور بواسطۂ ناموسِ اکبر الہام کا ہونا یہ خاصۂ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اسی جگہ سے یہ بات ٹھہر گئی کہ

[1] خواب میں بے زبان کے بولتے اور بے آنکھ ظاہری کے دیکھتے ہیں کیونکہ خواب میں یہ بند ہوتی ہے الغرض بغیر حواسِ خمسہ کے کاروبار کرتے ہیں اس وقت اور ہی حواس ہوتے ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] یہ خیال کرنا کہ لوحِ محفوظ کوئی تختی ہے کہ جس پر قرآن خطِ نسخ میں لکھا ہوا تھا یا پردے کے پیچھے سے آواز آتی تھی کہ پھر اس کے مطابق آنحضرت علیہ السلام کو پہنچاتے تھے غلط خیال ہے۔ ۱۲ منہ

غیر انبیاء کا الہام ظنی ہے گو ان کو اس پر پورا اعتماد ہو جائے مگر بغیر قرائنِ خارجیہ کے وہ نفسِ الہام ظنیت کے مرتبہ سے نہیں نکلتا اسی لیے اس کا نام الہام اور اس کا وحی' اس فرق کے لیے اصطلاح میں مقرر ہوا۔ اس جگہ سے اگر کوئی شبہ کرے کہ تم نے اول میں خدا سے ہمکلام ہونا ہر چیز کا ثابت کر دیا تھا اور یہاں خاص حصہ انبیاء کا ٹھہرایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کلام سے مراد ہماری ایک ارتباطِ خاص ہے اور یہاں ایک مواجہۃ اور کیفیتِ مخصوصہ۔ اس تحقیق سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صورتِ متخیلہ کا مشکّل ہو کر نظر آنا اور اس کے ساتھ ہمکلام ہونا ان عامی لوگوں کی شان ہے کہ جن کا نمبر پوست دماغ سے مجنون کے قریب قریب ہے۔ چہ جائیکہ صحیح الحواس پھر اولیاء اور مخلص لوگوں کا تو کیا ذکر ہے؟ بالخصوص انبیاء علیہم السلام تو اس مرضِ سوداوی سے بالکل بری اور محفوظ بلکہ معصوم ہیں۔ پھر سید احمد خان صاحب کا ان لوگوں کے حال پر انبیاء علیہم السلام کے حال کو قیاس کرنا بڑی غلطی ہے۔ اس شبہ سے سید صاحب کو اور چند مشکلیں پیش آئیں۔

(۱) یہ کہ جب آپ نے الہام اور وحی اس سوداوی مرض کو فرض کر لیا تو بہت سے لوگوں کو نبی[1] کہنا پڑا اور نبوت کے معنی محض رفارمری اور وعظ گوئی رہ گئی۔

(۲) یہ کہ جب ایسے سوداوی اشکال جبرئیل ٹھہرے تو اصل جبرئیل اور ان کے ساتھ کل ملائکہ اور ان کے ذیل میں شیطان اور جن بلکہ کل غیر محسوس چیزوں کا منکر محض ماننا پڑا اور جن آیات میں کہ ان چیزوں کے ذکر ہیں ان کی توجیہاتِ بعیدہ کرنی پڑیں اور کہیں توجیہ نہ بن آئے تو انکارِ محض۔

(۳) جب یوں نبوت کا دروازہ کھلا اور ہر واعظ اور رفارمر بالخصوص یورپین' جنٹلمین واعظ بھی نبی مانا گیا اور ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ میں قوم کی ترقی کو نبی کہنا پڑا اور وہاں معجزات سے اس کو بالکل خالی دیکھ کر اس کی نبوت باطل ہوتی دیکھی تو سرے سے معجزات بلکہ کل خرقِ عادات ہی کا انکار کر دیا اور جن آیات میں کہ معجزاتِ انبیاء اور خرقِ عادات مذکور ہیں ان کی بے بنیاد تاویلات اور کہیں انکار کیا۔

(۴) یہ کہ جب نبوت ایسی ہلکی چیز ٹھہری تو جملہ عبادات ساقط۔ عبادت کیا مسلمانوں کے لیے دنیا حاصل کرنے کے وسائل کی تعلیم اور یہی ترقیِ اسلام۔

(۵) جب عبادت و ریاضت ندارد تو پھر جنت کی نعماء اور دوزخ کی تکالیف کا بھی انکار محض اور ان آیات کی تاویلاتِ رکیکہ اور ان چیزوں کے انکار سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ جب عقبیٰ کا ڈر اور امید جیسا کہ چاہیے کچھ بھی نہ رہا تو پھر جائز

[1] چنانچہ تہذیب الاخلاق میں بابو کیشب چندر اور دیانند سرتی وغیرہم کو بھی نبی کہا ہے۔ ۱۲۔ بعض لوگ چلہ کشی یا کسی اور ریاضت کی وجہ سے یا تو درحقیقت ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان پر بذریعہ خواب یا بیداری میں کچھ القاء ہوتا ہے یا محض یبوستِ دماغ سے اپنے خیالات میں مستغرق ہو کر ان کی صورتیں دیکھتے اور آوازیں سنتے ہیں پھر ان کو وحی یا الہامِ قطعی کہتے ہیں اور اس پر بڑی بڑی لن ترانیاں کرتے ہیں اور قرآن کی ان آیات کو جو خاص انبیاء کی شان میں وارد ہیں کچھ الفاظ کم زیادہ کر کے اپنے اوپر منطبق کرتے ہیں یہ سب لغو اور بے اصل باتیں ہیں اور یوں اپنے الہام یا مکاشفہ کو قطعی کہنے کے لیے کیا چاہیے ہر شخص مغز چلا نبوت اور جبرئیل کے آنے کا دعویٰ کر کے احکامِ الٰہی اور قرآن میں تغیر و تبدل کرنے کا مدعی ہو سکتا ہے اور صدہا جہلاء بھی اس کے تابع ہو سکتے ہیں۔ ۱۲ منہ

ناجائز حلال و حرام طور سے دنیا حاصل کرنے کا پورا موقع ہاتھ آئے گا۔ شاید اسی اعتماد پر خاں صاحب بہادر اپنے مدرسہ کی تعلیم اور اپنے اقتدار کو دنیا کی بہبودی کے لیے بڑے زور سے وسیلہ بتلاتے اور کافۂ انام کو اس طرف رغبت دلاتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ خیالات سید صاحب کی بیباکانہ طبیعت کا نتیجہ ہیں یا یورپ کے ملحدوں کی صحبت کا اثر۔ ہرچہ باشد مگر انجام برا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو اور ان کے متبعین کو اس تاریکی سے نجات دیوے آمین فائدہ: (۱) جب آنحضرت علیہ السلام پر وحی آتی تھی تو آپ کو ایک کیفیتِ استغراقیہ پیدا ہو جاتی تھی اور ایک عجیب حالت پیش آتی تھی۔ ظاہر اس کا یہ سبب ہے کہ روح القدس کے نازل ہوتے وقت کیفیت فزع یا فرح کی پیدا ہوتی تھی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر روح القدس نازل ہونے کے وقت ایسی کیفیت پیدا ہوئی تھی جیسا کہ جس کو بعض لوگ نشے کی حالت گمان کرتے تھے۔ چنانچہ کتابِ اعمال باب ۲ میں آتشیں زبانیں پیدا ہونا اور ہیبت ناک آواز آنا وغیرہ عجائب باتیں مذکور ہیں۔ فائدہ: (۲) جبرئیل وحی لاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جلد جلد جبرئیل کے ساتھ اس لیے پڑھتے کہ کچھ بھول نہ جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کو دور کر دیا اور فرمایا لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ الآیہ یہ کہ آپ جلدی نہ کیجئے ہم نے ذمہ لے لیا ہے کہ قرآن کو تمام و کمال جمع کرا کے پڑھوا دیں گے۔ شبہ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ الآیہ ''کہ ہر نبی کی آرزو میں شیطان کچھ ملا دیتا ہے پھر خدا آمیزشِ شیطان کو دور کر کے اپنی آیات کو ثابت رکھتا ہے۔'' اور اسی آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس سے شیطان کی آمیزشِ وحی اور کلامِ انبیاء میں اچھی طرح سے ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت علیہ السلام ایک بار سورہ نجم کی یہ آیات مجمعِ عام میں کہ جہاں بت پرست بھی موجود تھے پڑھ رہے تھے وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى الآیہ تو آپ کی زبان سے بے ساختہ شیطان نے بت پرستوں کے خوش کرنے کو یہ کلمہ نکلوا دیا تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى یعنی یہ بڑے بڑے قد آور بت ہیں ان کی شفاعت مقبول ہے اور بقول بعض مفسرین یہ کلمہ شیطان نے آواز میں ملا کر پڑھ دیا بہر طور وحی میں شیطان کی آمیزش ضرور معلوم ہوئی اور اس قصہ کو بیضاوی اور صاحبِ معالم وغیرہما نے نقل کیا ہے اور یہاں سے ایک اور بات بھی پیدا ہوئی کہ ممکن ہے کہ جبرئیل کی شکل میں شیطان آ کر کچھ آیات بنا کے سنا جاتا ہو۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قصہ بالکل جھوٹے اور ملحدوں کی بناوٹ ہے گو بعض سادہ لوح مفسروں نے بے تحقیق اس کو لکھ کر اپنی کتاب کا اعتبار کھویا ہے مگر محققین نے جیسا کہ بیضاوی اور صاحب مدارک اور امام رازی بلکہ جمہور نے دلائلِ عقلیہ و نقلیہ سے اس کو رد کیا ہے دلائلِ نقلیہ میں سے یہ آیات ہیں لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ الآیہ ''کہ قرآن مجید میں کسی طرف سے غلطی نہیں مل سکتی نہ باطل کا اس میں گزر ہو سکتا ہے'' ان کے یہ آیت ہے وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ الآیہ ''کہ قرآن کو حق کے ساتھ ہم نے نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا۔'' منجملہ ان کے یہ آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ''قرآن کو ہمیں نے نازل کیا اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔'' پھر ان آیات کے مقابلہ میں اس[1] بے اصل قصہ کا کہ جس کو کسی محقق محدث نے کسی سند سے بھی روایت نہیں کیا' کیا اعتبار ہے؟ اور اس آیت وَمَا مِنْ نَبِيٍّ الآیہ

[1] کہیں ثابت نہیں ہوا کہ یہ الفاظ حضور علیہ السلام کی زبان سے نکلے یہ روایت سراسر غلط ہے (حقانی)

میں اس بات کا کچھ بھی ذکر نہیں پھر اس سے استدلال کرنا فضول ہے۔ آیت مذکورہ سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ ہر نبی گو کیسا ہی اولوالعزم نبی کیوں نہ ہو مقتضائے بشریت سے خالی نہیں اس کے بعض خیالات میں قوتِ بہیمیہ کی وجہ سے خطراتِ نفسانیہ کی ذرا بو آجاتی ہے لیکن خدا اس نبی کو نورِ نبوت پر ثابت اور قائم رکھتا ہے اور ان خطراتِ شیطانی کو دفع کر دیتا ہے اور اسی لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا ضروری مانا گیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کو لفظ تمنّیٰ کے معنی قرء لے کر اور آیات سے آیاتِ قرآنیہ سمجھ کر اور نسخ سے معنی مصطلح خیال کر کے یہ مغالطہ ہو گیا ہے اس لیے اس کا شانِ نزول وہی جھوٹا قصہ قرار دینا پڑا اور بہت واقعی باتیں جو اس کا محمل ہو سکتی ہیں خیال سے دور کر دیں۔ منجملہ ان کے یہ بات بھی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے (جو اپنی دنیاداری کی وجہ سے نہایت متکبر تھے ان کو غریب اور مفلس مسلمانوں کے ساتھ مل کر آنحضرت علیہ السلام کی مجلسِ وعظ میں بیٹھنا نہایت شاق گزرتا تھا' آپ سے عرض کیا کہ اگر ہمارے لیے کوئی خاص وقت معین فرما دیں تو ہم حاضر ہو سکتے ہیں آپ کو چونکہ ہدایتِ خلق اللہ مقصود تھی اس لیے یہ خیال آیا کہ اگر ان کے لیے جدا وقت مقرر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے لیکن یہ بات خدا کو ناپسند معلوم ہوئی کس لیے کہ خدا کے روبرو اس کے مخلصین کو دنیا مردار کے لیے ذلیل سمجھ کر متکبرانہ حاضر ہونا ان کے لیے مفید نہ ہو گا اور عام مسلمانوں کے دلوں میں دنیا کی وقعت ہو جائے گی۔ سو یہ شیطانی القاء اور یہ آپ کی تمنّیٰ اور یہ خدا کا اس کو منسوخ فرمانا تھا نہ کہ وہ بات۔ اور اگر بطور الزام کلام کیا جائے تو اس آیت سے اگر کچھ بات آمیزشِ شیطانی کی ثابت ہو سکے گی تو پہلے انبیاء میں ثابت ہو گی نہ کہ آپ میں۔ کیونکہ اس میں یہ صریح ہے کہ تجھ سے جس قدر پہلے انبیاء ہیں ان کا یہ حال ہے نہ کہ آپ ختم المرسلین کا۔ یہ بات مشہور ہے کہ المعترض کالاعمیٰ۔ وہ حق و ناحق کچھ نہیں دیکھتا اس کو اعتراض کرنے کے واسطے ذرا سہارا ملنا چاہیے۔ اسلام کے وہ مخالف لوگ (کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہے اور انہوں نے حق و ناحق اسلام کی توہین کا بیڑا اٹھا رکھا ہے بلکہ اسی بات کی تنخواہ بھی پاتے اور خدا ترسی کو عمل میں نہیں لاتے ہیں ایسی ایسی بے سند باتوں سے اسلام پر بڑا اعتراض کرتے ہیں۔ چنانچہ پادری فنڈر صاحب اور پادری عماد الدین صاحب پانی پتی اور پادری صفدر صاحب اکبر آبادی اور ماسٹر رامچند ر صاحب دہلوی نے تو کوئی دقیقہ ہی باقی نہیں رکھا۔ اپنے ہم مذہبوں کے خوش کرنے کو بڑے بڑے ضخیم رسالے بنا کر مشہور کر دیے کہ جن کا جواب ناچار اہلِ اسلام کو دینا پڑا۔ ماسٹر رام چندر صاحب نے تحریف القرآن نام پندرہ سولہ جزء کا رسالہ اسی بیان میں لکھا ہے۔ فقیر نے اس کے جواب میں تعریف القرآن لکھ کر پادری صاحبوں کی ناحق زبان درازی بتلائی ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى دَارِ السَّلَامِ۔

رہا اس بات کا جواب کہ شیطان جبرئیل کی صورت میں ممکن ہے کہ آیا ہو یہ ہے کہ اس وسوسہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نبوت کے اصلی مرتبے کو تسلیم نہ کیا جائے اور جب کوئی نبوت کی ضرورت اور اس کی حقیقت پر مطلع ہو جائے تب اس وسوسہ کا اس کے دل میں کبھی گزر بھی نہ ہو اس لیے کہ جب اس عالمِ حسی کے انتظامات ایسے ہیں کہ یہاں یہ بات ناممکن ہے (کبھی کوئی عیار کسی گورنر کی صورت میں آ کے امورِ سلطنت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا) تو اس عالمِ ملکوت میں یہ بدانتظامی کیونکر ہو سکتی ہے؟ جب ہماری حسِ بصر کہ جو صدہا جگہ غلطی کرتی ہے کھرے کھوٹے کو پرکھتی ہے' پیتل اور سونے' بلور اور ہیرے میں فرق صحیح کرتی ہے تو پھر نبی کی چشمِ حقیقت بین کے آگے کہ جسم پر عالمِ ملکوت کے اسرار اور اشیاء کے حقائق منکشف ہیں)

حقیقتِ جبرئیلیہ (جو آفتابِ جہانتاب ہے) اور حقیقتِ شیطانیہ جو ظلمت آمیز ہے کیونکر مشتبہ ہو سکتی ہے؟ اور اسی حکمت کے لیے جبرئیل قوی امین کو اس امانت کے لیے واسطہ بنایا گیا۔ پس جو یہ کہے (کہ خدا کو جبرئیل کو واسطہ بنانے کی کیا ضرورت تھی کیوں جس طرح جبرئیل کو تلقین کیا نبی کو نہ کر دیا؟) وہ اس سر سے ناواقف یہ بھی کہے کہ خدا کو نبوت کی ضرورت تھی جو احکام و علوم اصلاحِ خلق کے نبی کو تلقین کیے وہ خود خلق کو کیوں نہ تعلیم کر دیے؟

❀❀❀

فصل دوم
جمعِ قرآن

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی حیات میں تمام قرآن کو لکھوا کر ایک جلد میں جمع نہ کیا تھا بلکہ متفرق اجزاء میں اس طور سے تھا کہ کوئی سورت کاغذ پر، کوئی رکوع اونٹ کی ہڈیوں پر، کوئی کھجور کے پٹھوں پر لکھا ہوا تھا اس لیے کہ زیادہ دارومدار حفظ پر تھا اور لکھنے کا رواج بھی کم تھا گو لکھے پڑھے لوگ بالخصوص قرآن کے لکھنے والے صحابہ زید بن ثابت انصاری وعبداللہ بن مسعود وغیرہما ؓ بھی موجود تھے اور آپ ہر آیت کو بترتیبِ اصلی بھی لکھوا دیتے اور حفظ کرا دیتے تھے لیکن نہ تو آپ کی حیات میں قرآن کے کم ہونے کا خوف تھا نہ مشاغلِ دینیہ سے فرصت تھی کہ سب کو ایک جگہ جمع کر کے لکھوائے۔ الغرض ان وجوہ سے من اولہ الی اخرہ قرآن مجید کو ایک جگہ لکھ کر جمع کرنے کا اتفاق آپ کے عہد میں نہ ہوا تھا البتہ متفرق اجزاء میں لکھا ہوا اور صدہا حفاظ کو زبانی اس ترتیب سے جو آج تک چلی آتی ہے خوب یاد تھا اور چونکہ نماز میں پڑھنا اس کا فرض و واجب ہو چکا تھا اور اس کی تلاوت کے فضائل صحابہ میں حد سے زیادہ مشہور و ذہن نشین تھے تو قرآن مجید کے لفظ لفظ پر صحابہ ایسے حاوی تھے کہ جس طرح اس زمانہ کے حفاظ بلکہ اس سے بھی زیادہ دو وجہ سے ایک تو یہ کہ ان کی قوتِ حافظہ حد سے زیادہ تھی۔ دوم یہ کہ علاوہ تبرک سمجھنے کے وہ لوگ اہلِ زبان قرآن کے نہایت فصیح و بلیغ عبارت سے خوب آشنا تھے اور اپنی بول چال کی باتوں پر از بس قادر تھے۔ اور ان نمکین فقرات سے خوب مزہ لیتے تھے پس جس طرح آپ کی حیات میں قرآن مجید مرتب و معین ہو چکا تھا اسی طرح بے کم وکاست آپ کے بعد صحابہ کے نوکِ زبان تھا۔

آپ کے بعد تخمیناً اسی سال میں ملکِ یمامہ میں مسیلمہ کذاب مدعیِ نبوت سے صحابہ کی لڑائی ہوئی اس میں بہت سے لوگ شہید ہوئے ستر کے قریب حافظِ قرآن بھی شہید ہوئے۔ حضرت عمر ؓ کی رائے سے صحابہ اس بات پر متفق ہوئے کہ تنہا حفظ پر مدارِ قرآن نہ رہنا چاہیے بلکہ اس کو ایک جگہ لکھوا کر جمع بھی کر دینا چاہیے کیونکہ اگر اسی طرح دو ایک لڑائیوں میں اور حفاظ بھی شہید ہو گئے تو پھر قرآن کے کم ہو جانے کا خوف ہے۔ زید بن ثابت ؓ جو کاتبِ وحی تھے اس کام کے مہتمم قرار پائے انہوں نے حفاظ کو جمع کیا اور جن جن پاس جس قدر لکھا ہوا تھا وہ منگایا اور سب سے بعد تحقیق و تنقیح ایک جلد میں نقل کر کے جمع کیا پھر وہ نسخہ ابوبکر ؓ کے پاس رہا ان کے بعد حضرت عمر ؓ کے پاس ان کے بعد حضرت حفصہ ؓ ام المومنین کے پاس پھر حضرت عثمان ؓ کی خلافت میں بوجہ اس بات کے (کہ تنہا وہ ایک نسخہ کافی نہ تھا اور ہر شخص حافظ نہ تھا) لوگوں کو بھولے بھٹکے میں دقت پیش آنے لگی اور اختلاف کی نوبت پہنچنے لگی تو حذیفۃ بن الیمان ؓ نے حضرت عثمان ؓ کو اس سے نقل کر کے شہرت دینے کی ترغیب دی۔ حضرت عثمان ؓ نے پھر زید بن ثابت ؓ کو فرمایا اور ان کی مدد کے لیے عبداللہ بن زبیر اور سعید بن عاص اور عبداللہ بن حارث بن ہشام ؓ کو (کہ جو قریش کے محاورات سے بڑے ماہر اور قرآن پر بڑے حاوی تھے) متعین فرمایا اور انہوں نے اس نسخے سے جو حفصہ ؓ کے پاس تھا اسی تحقیق و مقابلۂ حفاظ سے کہ جس طرح

پہلے کی گئی تھی سات یا چھ نسخے نقل کرا کے عراق اور شام اور مصر وغیرہ دیارِ اسلام میں بھجوا دیے اور اصل نسخہ حضرت حفصہ ؓ کو دے دیا۔ اور جن لوگوں نے اپنے نسخوں میں بطورِ تفسیر کے وہ جملے جو آنحضرت ﷺ سے سنے تھے درج کر رکھے تھے اور جن کو بعض لوگ آیت منسوخ التلاوۃ سمجھتے تھے ان کے مصاحف منگا کے رفعِ اختلاف کی نیت سے جلوا دیے کہ مبادا ان جملوں کو پچھلے قرنوں میں کوئی قرآن کی آیات نہ سمجھنے لگے۔ منجملہ ان کے عبداللہ بن مسعود ؓ کا مصحف بھی جلا دیا گیا۔ اب تک بلاکم وکاست انہیں نسخوں کے مطابق اہلِ اسلام میں قرآن ہے والحمد للہ علیٰ ذلک۔ اس مقام پر بعض متعصب دو اعتراض کرتے ہیں:

(۱) یہ کہ حضرت عثمان ؓ نے لوگوں کے مصاحف کو کیوں جلایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رفعِ اختلاف کے لیے نیک نیتی سے جلانا کچھ بے ادبی نہیں۔

(۲) یہ کہ تفسیرِ اتقان وغیرہ کتب میں مذکور ہے کہ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ یہ آیت لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ الآیہ میں نے تمام جگہ تلاش کی کہیں نہ ملی مگر ابی خزیمہ انصاری کے پاس لکھی ہوئی ملی اور اسی طرح حضرت عائشہ ؓ سے منقول ہے کہ ایک آیت لکھی ہوئی ہمارے ہاں پلنگ کے تلے پڑی تھی بکری کھا گئی۔ پس اسی طرح اور روایات بھی ہیں کہ جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ اسی طرح قرآن کی بہت آیات رہ گئی ہوں یا حضرات عثمان اور ابوبکر اور عمر ؓ نے وہ آیات کہ جن میں اہلِ بیت کی مدح تھی درج نہ کی ہوں۔ چنانچہ شیعہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے دس پارہ قرآن مجید کے گم کر دیے اور بعض شیعہ سورۃ حسنین اور سورہ علی اور سورہ فاطمہ پڑھا کرتے ہیں مگر قرآن میں ان کا کہیں پتا نہیں معلوم ہوا کہ یہ سورتیں نکال ڈالیں۔ اس شبۂ بے اصل کو بعض پادریوں نے اتنا پھیلایا کہ اس میں رسالے لکھ ڈالے چنانچہ عبدالمسیح اور ماسٹر رامچندر اور عمادالدین نے اس میں بڑا ہی زور مار کر قرآن مجید میں تحریف ثابت کی ہے لیکن جواب اس کا بہت سہل ہے اور وہ یہ کہ اگر ایسی ایسی دو چار کیا سو دو سو روایات بھی ہماری کتبِ معتبرہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہما سے نقل کی جاویں اور سب کو علی سبیل فرضِ محال تسلیم بھی کیا جاوے بلکہ اس سے بڑھ کر ہماری طرف سے اتنی بات اور ملا دی جاوے کہ ایک آیت کیا بلکہ دس بیس آیتیں زید بن ثابت ؓ کو کسی کے مصحف میں بھی نہ ملیں تھیں اور سو دو سو آیات حضرت عائشہ ؓ کی بکری بلکہ پورا یا نصف قرآن بھی کھا گئی تھی تب بھی قرآن میں باعتبارِ اصل منزل کے ایک حروف کی بھی کمی ممکن نہ تھی۔ ہاں اگر عیسائیوں کی اناجیل اور یہود کی تورات کی طرح قرآن کا دارومدار ایک آدھ نسخے پر ہوتا تو احتمال تھا کہ ایک دو ورق جانے سے کچھ قرآن جاتا رہا ہو مگر یہاں تو حفظ پر دارومدار تھا اور اول ہی قرن میں بیشمار ایسے پکے حافظ موجود تھے کہ جن میں سے ایک ایک قرآن کے لفظ لفظ پر حاوی تھا۔ خیر آپ اس اہلِ زبان کے زمانہ کو تو جانے دیجیے۔ ذرا اس ضعفِ اسلام کے زمانے کو ہی دیکھ لیجئے۔ اگر اس وقت روئے زمین پر ایک نسخہ بھی قرآن کا نہ رہے (خدانکند) تو ایک ادنیٰ گاؤں کے لوگ اپنی یاد سے اس کو حرف بحرف[1] لکھوا سکتے ہیں۔ پس انجیل و تورات پر قیاس کر کے یہ گمان کرنا محض بیہودہ خیال ہے۔ رہا شیعہ کا وہ خیال سو وہ جہلاء

[1] اس مقام پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب ابتداءِ عملداری انگریزی میں یہاں پادری لوگ آئے تو انہوں نے بخیالِ خام اس بات کے کہ یہاں مطابع تو ہیں نہیں قلمی نسخوں پر مدار ہے۔ مسلمانوں سے قرآن مجید گران گران قیمت کو خریدنے شروع کئے اور سالہا یہ ←

کی گپ ہے آج تک سلف سے لے کر خلف تک کوئی محقق شیعہ بلکہ کوئی اہلِ اسلام بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ علماءِ شیعہ اس خیال کی برأت اپنی کتابوں میں بڑی شد و مد سے کرتے ہیں۔ شیخ صدوق ابو جعفر محمد بن علی بابویہ اپنے رسالہ عقائد یہ میں کہتے ہیں کہ جو قرآن کہ اللہ نے حضرت کو دیا تھا وہی ہے کہ جواب لوگوں کے پاس موجود ہے۔ نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے نہ زیادہ۔ ''تفسیر مجمع البیان میں کہ جو شیعہ کے نزدیک معتبر تفسیر ہے سید مرتضیٰ کہتے ہیں'' جو قرآن کہ عہدِ پیغمبر علیہ السلام میں تھا وہی اب بھی ہے بلا تفاوت۔ ''قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب مصائب النواصب میں لکھتے ہیں کہ یہ بات جو شیعہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تغیر و تبدل کے قائل ہیں محض غلط ہے۔ محققینِ شیعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں اور جو کوئی کہے تو اس کا کیا اعتبار ہے۔'' ملا صادق شرح کلینی میں لکھتے ہیں۔ ''یہ قرآن اسی طرح امام مہدی تک سالم رہے گا۔'' محمد بن حسن عاملی کہتے ہیں کہ جو روایات پر ذرا بھی نظر کرے گا یقینی طور پر جان جائے گا کہ قرآن میں بچند وجوہ کمی و زیادتی ناممکن ہے'' اور بالفرض کوئی صاحب یہ عقیدہ بھی رکھے تو ہم اس کو دو وجہ سے قائل کرتے ہیں:

(۱) یہ کہ ائمہ اہلِ بیت اور بنی ہاشم بالخصوص آلِ علی رضی اللہ عنہ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنی فاطمہ نے کیوں اپنے مصاحف کو محفوظ نہ رکھا۔ بلا سے شیعہ ہی میں وہ قرآن مروج اور مستعمل ہوتا۔ اور خیر اگر ظاہر اس کو نہ رکھتے چھپا ہی کے رکھتے' ورنہ حفظ ہی کے طور سے متوارث رکھتے بلکہ اصل حمیتِ اسلام تو یہ تھی کہ اس خیانتِ قرآن کے بارے میں مخالفین کو علی رؤس الاشہاد فضیحت کرتے۔ اول تو جس طرح کچھ نہ کچھ لوگ ہر زمانے میں ان کے ساتھ ہوتے رہے ہیں اس وقت بھی ہوتے۔ ورنہ بنی ہاشم تو ضرور ساتھ دیتے اور اگر کوئی نہ دیتا تو خدا تو ساتھ ضرور ہی دیتا کہ جس نے قریش کے مقابلہ میں ایک یتیم' بیکس' بے زور یعنی سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدد کی اور روئے زمین پر اس کا مذہب پھیلا دیا ورنہ خیر جس طرح امامت اور ریاست کے بارے میں نوبت بشہادت پہنچی اس خاص دینی کام میں پہنچتی تو کیا تھا زہے نصیب اب پادری صاحب فرمائیے وہ کونسا بے حمیت شیعہ ہے جو اپنے اکابر علیہم السلام کی نسبت یہ بدگمانیاں جائز رکھ کر پرائے شگن کے لیے اپنی ناک کٹائے گا اصحابِ ثلٰثہ کی ضد میں اپنے بزرگوں کو برا کہہ کے قرآن کی تحریف کا قائل ہو جائے گا۔

(۲) ان آیات کا کیا جواب ہے کہ جن میں خدا پاک نہایت تاکید کے ساتھ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے قال تعالیٰ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ

تنبیہ: ماسٹر رامچندر نے اپنی کتاب تحریف القرآن اور پادری عماد الدین نے کتاب ہدایت المسلمین میں اور دیگر پوادر نے اپنی اپنی تصانیف میں اس الزام کے دفعہ میں (کہ تورات و انجیل میں متقدمینِ اہل کتاب کی بددیانتی یا غفلت سے بیشمار

← معاملہ رہا چنانچہ میرٹھ اور دہلی کے نواح کے بہت لوگ معمر اس کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک پادری میرے دوست تھے میں نے ان سے پوچھا کہ سچ کہو یہ اس قدر نسخے تم کیوں خریدتے ہو؟ بالآخر بڑے اصرار سے اس نے یہ راز بتلایا کہ یہاں کے مشن کی یہ رائے ہے کہ ان لوگوں سے نسخے خرید لیے جائیں۔ پھر جب نہایت نایاب ہوں تو لندن سے مختلف نسخے قرآن مجید کے طبع کر کے یہاں کے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کئے جائیں پس مسلمانوں میں بڑا اختلاف قرآن میں پڑ جائے گا اور دینِ مسیحی کا خوب ظہور ہوگا وہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ خبط ہے اس سے کچھ بھی نہ ہوگا ناحق روپیہ صرف کرتے ہو چنانچہ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور خریدنا موقوف کیا۔ والعلم عند اللہ ۱۲ منہ

تحریفِ لفظی اور معنوی ہوئیں جس کے محققینِ اہلِ کتاب بھی مقر ہیں چنانچہ ہارن اور ہنری اور اسکاٹ اپنی تفاسیر میں اور پادری فنڈر اختتامِ مباحثہ دینی مطبوعہ اکبر آباد میں صدہا بلکہ ہزار ہا ورس یوس ریڈنگ یعنی غلطیٔ کاتب کے قائل ہیں اور بہت سی آیات اناجیل اور بعض ابوابِ کتب بیبل کو الحاقی مانتے ہیں) چند وہ روایات ہماری کتبِ تفاسیر اتقان وغیرہ سے نقل کی ہیں کہ جن سے بعض آیاتِ قرآنیہ کا منسوخ التلاوۃ ہونا معلوم ہوتا ہے اور ان کو بڑے بسط کے ساتھ لکھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں بھی تحریف ہے۔

ان بے اصل باتوں کا جواب بضمن جواب تحریف القرآن رسالہ تعریف القرآن میں فقیر دے چکا ہے مگر کسی قدر مختصر یہاں بھی بیان کرنا ضرور ہے وھوھذا۔ تحریفِ لفظی یا معنوی خواہ بزیادت خواہ بنقصان کسی کتاب میں جب ثابت ہوتی ہے کہ جب صاحبِ کتاب کے بعد یا اس کی غیبت میں اس کی مرضی بغیر کی جائے اور جب وہ خود کمی زیادتی اپنی کتاب میں کرے تو اس کو کوئی دانشمند تحریف نہ کہے گا۔ پس جب یہ قرار پا چکا تو اس اعتراض کا جواب دو طور پر ہے۔

(۱) یہ کہ یہ روایات اگر صحیح تسلیم کی جائیں تو ان سے غایۃ مافی الباب یہ ثابت ہوگا کہ یہ آیات آنحضرت ﷺ کے روبرو کسی سِرِّ خدائی کی وجہ سے منسوخ التلاوۃ ہو گئیں اور اس کے اکثر اہلِ اسلام قائل ہیں۔ البتہ تحریف جب لازم آئے کہ کسی روایتِ صحیحہ سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ جو قرآن آنحضرت ﷺ بوقتِ اخیر دنیا میں چھوڑ گئے تھے اس میں بعد آنحضرت ﷺ کے کچھ کم زیادہ ہو گیا ہے۔

(۲) یہ کہ قرآن وہ ہے کہ جو آنحضرت علیہ السلام سے بنقلِ متواتر بلاشبہ منقول ہے اور ان روایات میں بعض تو محض بے اصل ہیں اور بعض جو صحیح ہیں تو خبرِ احاد ہیں۔ ان کے ذریعہ سے جو جملے منقول ہیں ان کو ہم قرآن کی آیات نہیں کہہ سکتے۔ پس جب وہ قرآن کے جملہ ہی نہیں تو اب ان کے قرآن میں نہ ہونے سے یہ نہیں لازم آتا کہ قرآن میں کمی ہو گئی یا تحریف واقع ہوئی کیونکہ تحریف جب کہتے ہیں کہ جب ان کا جزءِ قرآن ہونا ثابت ہو جاتا اور پھر یہ قرآن موجود میں نہ پائے جاتے بلکہ بعض محققین تو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ روایات تواتر کو بھی پہنچ جائیں تب بھی ان جملوں کو ہم جزء یا آیتِ قرآن نہ کہیں گے کیونکہ نسخ التلاوۃ بے اصل بات ہے پس وہ جو نصِ صحابہ سے منقول ہے (کہ ہم اس آیت کو حضرت کے عہد میں قرآن میں پڑھتے تھے لو كان لابن آدم واديان من الذهب لاتبغى ثالثا ولا يملا جوف ابن آدم الاالتراب ويتوب الله على من تاب یا اس کو جزء قرآن سمجھتے تھے الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما نكالامن الله والله عزيز حكيم۔ یا یہ جملہ آیت میں شامل تھا حافظوا على الصلوٰت والصلوة الوسطى العصر وغير ذلك تو اس کی یہ وجہ ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بطور تفسیر کے کوئی جملہ جملِ مذکور میں سے آیت کے ساتھ پڑھ دیا۔ لوگوں نے غلطی سے اس کو بھی قرآن کی آیت سمجھا اور جب یہ جملے اصل قرآن میں نہ ملے نہ آنحضرت ﷺ نے ان کے لکھنے کا کاتبوں کو حکم دیا تو ان کو منسوخ التلاوۃ سمجھ گئے۔ پس امرِ حق یہی ہے کہ یہ قرآن بجنسہٖ وہی ہے کہ جس کو جبرئیل آسمان سے لائے تھے اس میں ایک حرف بھی کم زیادہ نہیں ہوا نہ آنحضرت علیہ السلام کے عہد میں نہ بعد میں کما قال اللہ تعالیٰ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ

فصل سوم

آنحضرت ﷺ کے حالات میں

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظاہر ہونے کی تمام انبیاء بشارت دیتے چلے آئے ہیں گرچہ یہود و نصاریٰ نے ضد کے مارے بہت سی بشارتیں نکال ڈالیں اور بہت کو تاویلات اور ترجموں کے ذریعے سے بدل دیا مگر پھر بھی جس طرح ڈھیے پھوٹے مکانات کے نشان باقی رہ جاتے ہیں اس قدر باقی ہیں کہ اتنی بشارات اور کسی کے لیے ثابت نہیں۔ تورات و دیگر صحفِ انبیاء مثل کتاب دانیال وغیرہ۔ زبور و انجیل و مکاشفات یوحنا میں کہیں بطورِ اجمال اور کہیں نام پاکِ محمد یا احمد کے تصریح ہے (کہ جس کا ترجمہ فارقلیط پھر اس کو بدل کر وکیل و معین پھر اس کو چھوڑ کر روح بنایا) بلکہ ہنود کی وید اور پارسیوں کے دساتیر میں بھی حضرت ﷺ کے دینِ پاک کے ظہور کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس بارے میں بعض علماء نے نہایت تفصیل سے کتابیں لکھی ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتا آپ تمام انبیاء علیہم السلام کے سرتاج ہیں ہم عیسائیوں[1] کی طرح اور یہود کی مانند اس قدر مبالغہ نہیں کرتے کہ خدا پاک محمد علیہ السلام کی صورت میں ظاہر ہوا تھا کیونکہ کفر ہے مگر اس میں شک نہیں کہ آپ باعثِ ایجادِ عالم ہیں۔ پس آپ کے انوار و برکات پشت در پشت ظاہر ہوتے چلے آتے تھے کما قال تعالیٰ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ حتیٰ کہ جس روز آپ پیدا ہوئے آتشکدۂ فارس کی آگ بجھ گئی' کسریٰ کے محل کے کنگورے گر پڑے' عرب میں بڑا قحط تھا دفعۃً دور ہو گیا۔ حضرت آمنہ والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں روحانی لوگ آئے اور پھر لڑکپن سے لے کر چالیس برس کی عمر تک جس قدر خوارقِ عادات و معجزات لوگوں نے دیکھے ان کا کچھ شمار نہیں۔ کفارِ قریش آپ کی عزت اور عظمت حد سے زیادہ کرتے تھے۔ آپ کی نیک چلنی اور بزرگی اور مکارمِ اخلاق کا جس قدر عرب میں شہرہ تھا اس کے لیے وہ قصائد جو اس وقت کے لوگوں نے لکھے تھے نمونہ ہیں۔ ان میں سے اس وقت مجھ کو ابو طالب کا ایک شعر یاد آیا وہ یہ ہے :

وابیض یستسقی انعام بوجهه
سمال الیتامی اسوة للارامل

یعنی آپ ایسے متبرک اور گوری شکل کے ہیں کہ خدا آپ کے چہرۂ پرانوار کی برکت سے بارش نازل کرتا ہے جب کہ اس کے ذریعہ سے بارش کی لوگ دعا کرتے ہیں اور آپ یتیم بیکسوں کی پناہ اور بیوہ اور مصیبت زدہ عورتوں کے چارہ ساز ہیں۔ اس عمر میں گو آپ پر وحی نازل نہ ہوئی تھی مگر خلقِ خدا کی بہبودی اور خدا کی عبادت میں شب و روز مصروف رہتے تھے اصولِ فطرت میں سب انبیاء علیہم السلام ایک ہیں ہاں بعض احکامِ شریعت جو ہر زمانے اور ہر قوم کی مصلحت کے موافق دیے جاتے ہیں ان میں اختلاف ہوتا ہے۔ پس جو طریقہ حضرت آدم علیہ السلام کا تھا وہی نوح کا' وہی ابراہیم و عیسیٰ موسیٰ کا تھا علیہم السلام۔ پس جس طریقے پر یہ لوگ قبلِ نبوت عمل کرتے تھے اسی فطرتِ الٰہی پر آپ کا بھی عمل درآمد تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ آپ کے اور موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام سب کے جدِّ امجد بھی ہیں اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ آپ ملتِ ابراہیمیہ کے پابند بلکہ متمم اور مکمل تھے۔ حضرت حمل میں تھے کہ آپ کے والدِ ماجد حضرت عبداللہ کا انتقال ہوا اور تخمیناً چھ برس کے تھے کہ والدہ ماجدہ انتقال کر گئیں۔ آپ

[1] عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں خدا ظاہر ہوا تھا اسی طرح مگر مچھ سور وغیرہ اوتاروں میں ہنود کے اعتقاد میں خدا نے ظہور کیا تھا۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔ ۱۲ منہ

کے جدِّ امجد عبدالمطلب جو سردارِ قریش تھے آپ کی کفالت اور تربیت میں مصروف تھے جب سات برس کے ہوئے تو عبدالمطلب بھی مر گئے اور آپ کے چچا ابو طالب کو آپ کی کفالت سپرد کر گئے۔ بحکمِ الٰہی حضرت اسرافیل آپ کی ملازمت میں رہتے تھے پس گیارہ برس تک یہ ملازمتِ عالی میں رہا کیے۔ بعد اس کے ۲۹ برس تک جبرئیل علیہ السلام آپ کے ساتھ رفاقت میں رہے لیکن دکھائی نہ دیتے تھے اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کئی بار ایک دو بات بھی آپ سے کی تھیں اور وحی سے پندرہ برس پیشتر آپ کو آوازِ غیب سنائی دیتی تھی مگر کوئی شخص دکھائی نہ دیتا تھا اور سات برس پہلے سے ایک عجیب نور دکھائی دیتا تھا کہ جس سے ہر وقت مسرور رہتے تھے۔ پس جب ایامِ وحی نہایت قریب پہنچے تو حضور علیہ السلام کو خلوت[1] کی طرف نہایت رغبت ہوئی تو جبل حراء میں (جو کعبہ سے تخمیناً ڈھائی میل) ایک غار ہے کہ جس کا طول چار گز اور عرض سوا گز اور کہیں سے کم وہاں تنہا ذکرِ الٰہی میں ہمہ وقت مستغرق رہتے تھے۔ حضرت کی بیوی خدیجہ رضی اللہ عنہا دو چار روز کا کھانا پانی آپ کو دے آیا کرتی تھیں اور کبھی کبھی آپ بھی تشریف لاتے تھے۔ پس جب ہمہ تن نور اور ظلماتِ جسمانیہ[2] دور ہو گئے تو عالمِ قدس کا انکشاف آپ کے دل پر ہو گیا اور حجابِ جسمانی اٹھ گئے۔ پس جس حجر و شجر کے پاس سے گزرتے تھے بزبانِ فصیح السلام علیک یا رسول اللہ کہتا تھا اور جب آپ دائیں بائیں دیکھتے تھے تو کوئی نظر نہیں آتا تھا حالانکہ آپ کو اس بات کا سان و گمان بھی نہ تھا تا کہ آواز خیالی کہی جاوے۔ پس ایک روز حراء پہاڑ پر کھڑے تھے کہ ایک شخص ظاہر ہو کر یہ کہنے لگا کہ ابشر[3] **یا محمد انا جبرئیل وانت رسول الله لهذه الامة** اور ایک حریری کپڑا سا جو نہایت خوبصورت تھا آپ کے دستِ مبارک پر رکھ کر فرمایا اس کو پڑھو آپ نے فرمایا کہ میں نہیں پڑھ سکتا۔ پھر آپ کو اپنے سینے سے چمٹایا اور کہا لو اب پڑھو۔ پھر آپ نے یہی عذر کیا پھر چمٹایا۔ الغرض تین بار یہ معاملہ ہوا۔ آپ فرماتے ہیں کہ تیسری بار نہایت زور سے بھینچا اور یہ کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ

[1] خلوت کے چند اقسام ہیں (۱) یہ کہ محض استغراق فی ذات الالہ کے لیے نہ واسطے حاصل کرنے علوم کے بطریقِ نظر و فکر کے (۲) خلوت واسطے صفائی فکر اور خیالات کے تا کہ مجہولات کو اچھی طرح حاصل کریں جیسا کہ حکماءِ الشراقیین کی خلوت (۳) غیر جنس اور بے فائدہ چیزوں سے وحشت دفع کرنے کے لیے ہوتی ہے (۴) طلبِ لذت کے لیے کہ جو خلوت میں حاصل ہوتی ہے۔ لیکن آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلوت اول قسم کی تھی کیونکہ اخیر خلوتین درحقیقت خلوتیں نہیں ان کے خیالات ان کے ہم جلسہ رہتے ہیں البتہ پہلی خلوت خلوت ہے کہ جس میں سوائے ذاتِ بحت حق سبحانہ کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا نہ آپ اپنے خیالات

مکانے مختصر خواہم کہ در وے ہموں جائے من و جائے تو باشد۔

بعض ناواقفوں کا یہ کہنا (کہ اس خلوت میں بسبب یبوست کے حضرت کو خیالات متشکل ہو کر نظر آنے لگے تھے کہ جس کو وہ جبرئیل سمجھتے تھے اور دراصل کچھ نہ تھا) بڑی نادانی ہے کیونکہ وہاں خیالات کا تو گزر ہی نہ تھا خیالات دفع کرنے کے لیے اہلِ حق خلوت اختیار کرتے ہیں البتہ اہلِ دنیا خیالات بڑھانے کے لیے کرتے ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] جس طرح کہ پھول کی صحبت میں مٹی معطر اور آگ کی ملازمت سے لوہا اخگر ہو جاتا ہے اسی طرح نفوسِ قدسیہ کہ جن کے اندر نہایت قابلیت ہوتی ہے يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ جب علائق کو چھوڑ حق سبحانہ کی طرف منہ موڑتے ہیں تو ان کے آئینۂ دل پر اس قدر انوارِ حق فائض ہوتے ہیں کہ ہمہ تن نور اور آفتابِ عالم تاب ہو جاتے ہیں ان کو تو کیا بلکہ ان کے انوار میں آنے والوں کو بھی اس عالمِ ملکوت کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور اسی لیے انبیاء کو آفتاب یا چراغ سے تشبیہ دی جاتی ہے کما قال تعالیٰ سِرَاجًا مُّنِيْرًا کہ ہم نے تمہارے پاس رسول بھیجا جو چمکتا چراغ ہے۔ ۱۲ منہ

[3] مژدہ ہو تم کو اے محمد! میں جبرئیل ہوں اور آپ اس امت کے رسول خدا ہیں۔ ۱۲ منہ

تفسیر حقانی (حصہ اول و دوم) (کاپی نمبر 7)

خَلَقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَلَق اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانُ مَالَمْ يَعْلَمْ پھر آپ اور جبرئیل دونوں پہاڑ سے نیچے اتر آئے اور ایک پتھر کے پاس آپ بیٹھ گئے اور وہاں جبرئیل ؑ نے پاؤں مارا تو ایک پانی کا چشمہ بہنے لگا جبرئیل نے وضو کر کے تھوڑا سا پانی آپ کے منہ پر چھڑکا اور کہا اسی طرح آپ بھی وضو کیجئے اور دو رکعت نماز نفل پڑھیے پس آپ نے اقتداء کی۔ الغرض وضوء اور نماز اس روز سکھائے گئے اور سورہ اقراء نازل ہوئی؟ چونکہ یہ خاص طرزِ طہارت اور عبادت اور جمیع اسرارِ شریعت و طریقت بلکہ انکشافِ عالم لاہوت و ملکوت آپ کو اس وقت نصیب ہوا پہلے آپ نہ جانتے تھے اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کہ آپ کو ان چیزوں کا رستہ معلوم نہ تھا تو ہم نے راہ بتلائی وقال مَاكُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْكِتٰبُ وَالْاِيْمَانُ یعنی آپ کتاب اور شرائعِ اسلام پہلے نہ جانتے تھے۔ بعض متعصبین نے (ان آیات کو اور ان کو کہ جن میں آپ کو مغفرت اور استغفار سے مخاطب کیا ہے اپنے حال پر خیال کر کے گمراہی عرفی اور گناہِ متعارف سمجھ کر) آپ کی جناب میں گستاخی کے کلمات کہہ کر جہنم میں ٹھکانا بنایا ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں پادری عماد الدین اور پادری فنڈر وغیرہما نے اپنی ایمانداری کو خوب ظاہر کیا ہے۔ الغرض آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اس عجیب کیفیت سے مطلع ہو کر گھر میں خدیجہ ؓ کے پاس آئے اور ان کو مطلع کیا۔ وہ آنحضرت ؑ کو ورقاء بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کتبِ سماویہ سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا یہ ناموسِ اکبر ہے۔ آپ نبی ہیں آپ کے پاس آئے ہیں اور انبیاء ہی کے پاس آتے ہیں۔ پس اس کے بعد چھ مہینے تک وحی بند رہی کہ جس سے آپ کو رنج رہتا تھا۔

ذوقِ الطافِ تو اے کاش نمے یافت دلم
یاد ہر لحظہ تو اکنوں سببِ صدالم ست

پھر ایک روز جبرئیل اپنی صورت پر نظر آئے اور سورۂ مدثر نازل ہوئی پھر سورۂ مزمل اور پھر سورۂ نون اور پھر سورۂ فاتحہ اور پھر تبت اور پھر حسبِ حاجت قرآن نازل ہوتا رہا۔ بعد نبوت کے تیرہ برس حضرت ﷺ مکہ میں رہے اور لوگ ایمان لاتے رہے۔ جوانوں میں سب سے اول ابوبکر لڑکوں میں علی، عورتوں میں خدیجہ ایمان لائیں ؓ پس بہت لوگ اسلام میں داخل ہوتے چلے تو مشرکین مکہ کو اور زیادہ کینہ پیدا ہوا۔ طرح طرح کی تکلیفات دینا شروع کیا تب مسلمانوں کی ایک جماعت جعفر طیار ؓ کے ساتھ ہجرت کر کے ملک حبشہ میں چلی گئی وہاں کا بادشاہ نجاشی نام نصرانی تھا تورات وانا جیل سے خوب ماہر' اول کتابوں میں حضرت کی بشارت دیکھ کر ظاہر ہونے کا منتظر تھا۔ جب ان لوگوں سے حال دریافت ہوا اور قرآن سنا تو خود مع اپنے ارکانِ دولت کے ایمان لایا اور ان لوگوں کی بڑی خاطر تواضع کی۔ چند روز کے بعد آنحضرت اور ابوبکر ؓ بھی مدینہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں کے لوگ پہلے سے حضرت پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ خبر سن کر تشریف آوری کے منتظر رہا کرتے تھے۔ جب آپ تشریف لائے تو خوشی کے نعرے مارتے ہوئے آپ کو استقبال کر کے مدینہ میں لے گئے۔ پچیس روز آپ قباء میں ٹھہرے جو مدینے سے تین میل ہے پھر مدینہ میں آئے۔ مدینہ میں بھی حسبِ حاجت قرآن نازل ہوتا رہا۔ اول بار بدر کی لڑائی کفارِ مکہ سے پیش آئی۔ پھر احد کی اور پھر مکہ فتح ہو گیا۔ الغرض یمن و نجد و عراق و بحرین سب مطیعِ اسلام ہو گئے۔ دسویں سال آپ ربیع

الاول کی بارہویں تاریخ پیر کے روز دنیا سے تشریف لے گئے۔[1] مدینہ میں سورۂ بقرہ و آل عمران و مائدہ وغیرہا سورتیں نازل ہوئیں سب سے پچھلی سورت بعض کے نزدیک سورۂ برأت ہے بعض کہتے ہیں سورہ نصر۔ کل قرآن تیئس برس میں تدریجاً لوگوں کی سہولت[2] کے لیے نازل ہوا۔ اپنی حیات میں آپ کل ایک بار قافلہ کے ساتھ نبوت سے پہلے بقصدِ تجارت شام کو تشریف لے گئے تھے سو بعض راہبوں نے آپ کو بسببِ علامات اور کرامات کے پہچان لیا۔ پس مصلحت ہوئی کہ آپ واپس جاویں تب آپ واپس تشریف لائے۔ اب میں پادریوں کی ایمانداری اور انصاف کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس امر میں کیا کہتے ہیں پادری عماد الدین نے اپنی کتاب ہدایت المسلمین کے باب ہفتم فصل اول میں صفحہ ۲۵۱ سے لے کر صفحہ ۲۶۱ تک جو آنحضرت ؑ کا حال خلافِ واقع بیان کیا ہے اس کے رد کرنے کے لیے چند عیسائی محققین کے قول کافی ہیں۔

اب میں پیشتر عماد الدین کی عبارت کو ملخص کر کے لکھتا ہوں تا کہ ان کی ایمانداری اور انصاف کا حال معلوم ہو جاوے قولہ عرب میں ایک شہر مکہ ہے کہ جس میں ایک مندر یعنی بت خانہ تھا جس کا نام کعبہ ہے وہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا۔ محمد صاحب (ﷺ) کے باپ دادا وہاں کے پجاری تھے جب محمد صاحب (ﷺ) پیدا ہوئے اور جوان ہو گئے جب روزگار اور کمائی کی فکر میں کئی جگہ کا سفر اختیار کیا (بالکل جھوٹ) آخر کار خدیجہ کے نوکر ہو کر شام میں گماشتے کے طور تجارت کے لیے

---

[1] آپ کے بعد صحابہ ؓ نے روم' شام' مصر و ایران وغیرہ ملک فتح کر لیے روئے زمین پر اسلام چمکا دیا۔ پھر تابعین کے عہد میں ہندوستان میں سندھ کے ملک میں عملداری قائم ہو گئی۔ آپ کے بعد ابوبکر پھر عمر پھر عثمان پھر علی پھر حسن ؓ تیس برس کے اندر یکے بعد دیگرے حضرت ﷺ کے جانشین ہوئے پھر سلطنت کا طور ہو گیا۔ یہ بادشاہت معاویہ ؓ کے قبضہ میں آئی پھر اس کے بیٹے یزید کے' پھر اس کے بیٹے معاویہؒ کے پھر مروان بن الحکم کے پھر اس کی اولاد میں مدت تک رہی بعد ان کے حضرت عباس ؓ کی اولاد میں آئی تخمیناً چار سو برس انہی کے قبضہ میں رہی ہارون رشید' مامون رشید وغیرہ سلاطین انہیں کے لوگ ہیں۔ پھر قومِ مغل کہ جو اس وقت کفار تھے بغداد پر حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہی پھر اس کے سلاطین نے ان کو نکالا چند روز کے بعد وہ مغل مسلمان ہو گئے۔ ۱۲ منہ

[2] علاوہ سہولت کے تدریجاً نازل ہونے میں یہ چند حکمتیں اور ہیں (۱) یہ کہ یکبارگی نازل ہونے میں مخالفوں کے لیے قرآن کے مثل بنانے میں کچھ عذر ہوتا کہ ہم اتنی بڑی کتاب کی برابر کیونکر بنا دیں جب تیئس برس میں جملے جملے ہو کر نازل ہوا تو اس عرصہ میں بڑی مہلت ان کو دی گئی۔ پس جب بھی ان سے کچھ نہ ہو سکا تو دعوائے تحدی پورا ہوا۔ (۲) قرآن نازل ہوتے وقت خدا سے نہایت قرب اور ہمکلامی حاصل ہوتی تھی پس خدا نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو ابتداءِ نبوت سے لے کر اخیر عمر تک اس خوبی سے سرفراز کیا بخلاف حضرت موسیٰ و عیسیٰ ؑ کے کہ ان کو ساری عمر میں ایک بار یہ دولت ملی مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کے وعدہ کو خوب سچا کیا (۳) آپ کو بار بار جبرئیل ؑ سے ملاقات نصیب ہوتی تھی کہ جس سے قوتِ ملکیہ کی جلا ہوتی رہتی تھی اور صدہا کمالات آناً فاناً حاصل ہوتے تھے (۴) چونکہ آپ کا دین الی یوم القیامہ باقی رکھنا منظور تھا اس لیے ضرور ہوا کہ تیئس برس کے عرصہ میں جس قدر مختلف حالات جو بندوں کو احکامِ الٰہی کی نسبت پیش آتے ہیں ان کی رعایت کر کے شریعتِ ابدی قائم کی جائے۔ چونکہ موسیٰ و عیسیٰ ؑ کو ایک دن یہ بات نصیب ہوئی اور آپ کو تیئس برس۔ پس اس پر آپ کے دین کے قیام کو ان کی شریعت کے قیام پر قیاس کر لینا چاہیے (۵) یکبارگی نازل ہونے میں عرب کے ان پڑھ لوگوں سے نہ تو قرآن اچھی طرح سے یاد ہوتا نہ لکھا جاتا اور اس زمانہ میں چونکہ لکھنے کے سامان کم تھے غایۃً ایک نسخہ بمشکل لکھا جاتا۔ پس تورات و انجیل کی طرح حوادث میں اس نسخے کے تلف ہو جانے یا اوراق کم زیادہ ہو جانے سے کتابِ الٰہی میں فتور آ جاتا (۶) تھوڑا یاد کرنا اور سمجھنا آسان ہے قال تعالیٰ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ اور اسی بات کی طرف خود اشارہ فرماتا ہے قال تعالیٰ وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ ۱۲ منہ

گئے۔ چونکہ محمد صاحب (ﷺ) نے کئی جگہ کے عیسائیوں کی گفتگو سنی تھی اور بت پرستی کے عیوب ان پر ظاہر ہو گئے تھے کیونکہ ذرا غور سے بت پرستی کے عیوب ظاہر ہو سکتے ہیں (افسوس اس وقت کے عیسائی تو بقول آپ کے بت پرست ہی تھے مگر اب کے عیسائیوں پر بھی بت پرستی کے عیوب بڑے غور سے ظاہر نہ ہوئے بندے کو خدا بنا کے پوجنا اس سے زیادہ کیا بت پرستی ہو گی) پس محمد صاحب (ﷺ) نے کارِ تجارت اختیار کیا اور یہودیوں اور رومن کیتھولک عیسائیوں سے اور پارسیوں سے اور شہریوں اور بریوں اور بحریوں سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ معاملہ کیا۔ اس لیے طبیعت کی وہ تاریکی جو بت پرستی کا سبب ہے دور ہو گئی۔ اس لیے محمد صاحب (ﷺ) دینِ حق کے متلاشی[1] ہوئے چنانچہ سورۂ والضحیٰ میں لکھا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اے محمد تو گمراہ تھا پس تجھے ہدایت دی (یہ بالکل جھوٹ اول تو آپ نے یہودیوں اور مصریوں اور پارسیوں سے ملاقات نہیں کی البتہ بقولِ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو مصر میں شعبدہ بازی سیکھنے گئے تھے العیاذ باللہ۔ دوم بقول آپ کے یہ لوگ تو خود شرک میں گرفتار تھے چنانچہ تواریخ بھی اس کی شاہدِ عدل ہیں پھر ان کی صُحبت سے کیونکر بت پرستی سے نفرت ہوئی؟ سوم بمقتضائے نورِ فطرت آپ کو ابتداء سے نفرت تھی اگر ان لوگوں کی صحبت سے ہوتی تو ان کی صحبت سے پیشتر ضرور بت پرستی کرتے حالانکہ اس کا کوئی مخالف بھی قائل نہیں۔ پھر اس پر اس آیت کو اس معنی پر محمول کرنا گمراہی نہیں تو اور کیا؟) پس دینِ حق کی تلاش میں آپ نے سب کی ملاقاتیں کیں مگر کسی کو پسند نہ کیا کیونکہ یہودی تو لائقِ قبولیت کے کسی طرح بھی نہیں ہیں۔ عیسائی بھی وہاں کے رومن کیتھولک تھے وہ طرح طرح کی بت پرستیاں کرتے ہیں۔ (سچ ہے دروغ گورا حافظہ نباشد) علاوہ اس کے عیسائیوں اور یہودیوں میں سخت اختلاف تھا جس کی وجہ سے ان کو اور بھی نفرت ہوئی ان سبھوں سے بیزار ہو کر ایک قسم کی فقیری صوفیہ کے طور پر انہوں نے کی۔ چنانچہ غارِ حرا میں بیٹھنے لگے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ محمد صاحب (ﷺ) نے ایسا کیا (درحقیقت تعجب کی بات نہیں کیونکہ اہل اللہ اور انبیاء کو ہمیشہ جاذبۂ الٰہی خلوت کی طرف کھینچتا ہے مگر جب تمہارے نزدیک نبی اور مؤید اللہ نہ تھے تو جس طرح اور صدہا لوگ بت پرستی کرتے کرتے مر گئے اسی طرح آپ بھی ہوتے۔ پس ایسے تاریک زمانے میں کہ تمام عالم اس وقت بت پرستی یا گناہ میں گرفتار تھا اس طرح انوارِ الٰہی سے منور ہونا اگر داعیۂ نبوت سے نہ تھا تو بڑے تعجب کی بات ہے۔) اب محمد صاحب (ﷺ) جو غارِ حرا میں سادھو اور عابد بن کر بیٹھے وہاں بیٹھے بیٹھے خیالاتِ متنوعہ بھی ضرور ہے ان کے دل میں گزرتے ہوں جیسے اکثر گوشہ نشین خصوصاً جاہل بیکار عابدوں کو گزرا کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض مغز چلے غوثیت اور قطبیت اور ولایت کے دعوے کر اٹھتے ہیں اسی طرح انہوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا (یہ ایسی بیہودہ گوئی اور جہالت ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جناب میں یہود جہالت اور تعصب اور بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ چونکہ ویسے پیدا ہوئے تھے' طبیعت میں شوخی تھی' مصر جا کر کچھ شعبدے سیکھ آئے' مغز چلی باتیں کرنے لگے' خدا کا بیٹا بن بیٹھے' شریعت انبیاء کی اور خود انبیاء کی اہانت کرنے لگے۔ آخر کو اپنے کیے کی سزا کو پہنچے والعیاذ باللہ) اور اس خیال سے کہ یہودی

---

[1] لفظ متلاشی جو تلاش سے اسم فاعل بنایا گیا ہے پادری کی لیاقتِ علمیہ کی کامل دلیل ہے۔ سچ تو یوں ہے ایسے ایسے جاہل کرسٹان ہو کر بیباک ہو جاتے ہیں پھر کوئی امامت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے کوئی اس لیاقت کا مدعی ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی عربیت پر اعتراض کرنا اپنا منصب سمجھتا ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ ۱۲ حقانی

کہ جو کسی مسیح کے منتظر تھے میرے مرید ہو جاویں گے اس لیے یروشلم کی طرف عرب کے برخلاف نماز کرنا شروع کیا (اے متعصب! مکہ میں یہود کہاں تھے اگر آپ کو مرید کرنے کا شوق ہوتا تو مقتضائے وقت تو یہی تھا کہ عرب کو اول مرید کرتے اور ان کے برخلاف نہ کرتے۔ پس جب عرب کی پروا نہ کی اور طرح طرح کی اذیتیں ان کے ہاتھ سے اٹھائیں تو یہ قطعی دلیل آپ کے برحق ہونے کی ہے مگر آپ کی آنکھوں پر کولہو کے بیل کی طرح تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے) چونکہ کوئی بھی نبوت کی نشانی ان میں نہ تھی نہ معجزہ کر سکتے تھے اور نہ پیشین گوئی کر سکتے تھے اور نہ اچھی تعلیم کر سکتے تھے (یہود بھی بعینہٖ یہی تقریر حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت کرتے ہیں) بلکہ مسیح ہونے کا دعویٰ کرنا بالخصوص انہیں پر زیادہ صادق آتا ہے کیونکہ جاہل آدمی تھے اور چال چلن ان کا خراب تھا' عورتوں کا بہت شوق تھا' مال کی طمع پر لوٹ مار کر کے لوگوں کو دکھ دیتے تھے اور بہت سے کام بے رحمی کے ان سے سرزد ہوتے تھے اس لیے یہود نے ہرگز قبول نہ کیا لاچار مندر یعنی کعبہ کی متوجہ ہوئے (یہ بالکل جھوٹ اور صریح کفر ہے اگر خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہی چال وچلن خراب کرنا ہے پھر آپ کے نزدیک حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بڑے بدچلن ہیں جنہوں نے متعدد مقامات میں جہاد کیا (۱) رفیدیم میں قوم عمالقہ سے سفر خروج باب ۱۷ (۲) اموریوں کے بادشاہ سیحون شہر حسبون کے رہنے والے کو تہِ تیغ کر کے اس کا ملک و مال لیا (۳) بسن کے بادشاہ عوج سے بمقام اوراعی جنگ کر کے اس کو معہ اہل و عیال قتل کیا سفر عدد باب ۲۱ و سفر استثناء باب ۲۳ بلکہ یہاں ایسی بیرحمی کی گئی کہ ان کے مرد اور عورت اور لڑکے بالے سب کو بلا دعوتِ دینِ الٰہی قتل کیا اور ان کا مال و اسباب اپنے لیے لوٹ لیا ورس ۵۔۶۔ (۴) سفر استثناء باب ۱۳ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صاف حکم ہے کہ بت پرستوں کو اپنی تلوار کی دھار سے ضرور قتل کرے گا بلکہ وہاں کے خورد و کلاں باشندوں اور بیگناہ مواشی کو بھی قتل کرے بلکہ بقول آپ کے حضرت یشوع بن نون کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے اور بنی اسرائیل کے پیغمبر نہایت خراب چال چلن کے تھے کہ جنہوں نے شہر کے شہر غارت کر دیے اور مال لوٹا اور زن و مرد کسی کو زندہ نہ چھوڑا دیکھو شہر یریحو کی بابت کتاب یشوع باب ۶ میں یہ ہے: ''اور ایسا ہوا کہ جب لوگوں نے نرسنگے کی آواز سنی اور جماعت نے زور سے للکارا تو دیوار سراسر گر پڑی یہاں تک کہ سب آدمی شہر میں گھس آئے اور شہر کو لے لیا (۲۱) اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھا کیا بیل اور گدھا کیا بھیڑ سب کو تہ تیغ کر کے حرم کیا'' انتہٰی ''اور گیا اس سے بھی کوئی اور زیادہ بیرحمی حضرت نے کی تھی جو یشوع علیہ السلام نے عکن سے کی کہ جس نے کسی قدر غنیمت کا مال چھپا لیا تھا جس پر (۲۴) یشوع نے زارج کے بیٹے عکن کو اور روپے اور لبادے اور سونے کی اینٹ اور اس کے بیٹوں اور اس کی بیٹیوں اور اس کے بیلوں اور اس کے گدھوں اور اس کی بھیڑوں اور اس کے خیمے اور اس کے سارے اسباب کو لیا اور وادی عکور میں لائے۔ تب سارے اسرائیل نے اس پر پتھراؤ کیا اور انہیں سنگسار کر کے آگ میں جلا دیا پھر انہوں نے اس پر پتھروں کا بڑا تودہ کیا۔ کتاب یشوع''۔ اور اسی کتاب کے ۸ باب میں عی کی نسبت یہ لکھا ہے: ''کہ سو انہیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا اور نہ کسی کو بھاگنے دیا۔ اور وہ جو اس روز مارے گئے مرد و عورت بارہ ہزار تھے کیونکہ یشوع نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا اٹھایا جب تک کہ عی کے سارے رہنے والوں کو حرم نہ کر دیا نہ اٹھایا ۲۸۔ اسرائیل نے اس شہر کے فقط مواشی اور اسباب کو اپنے

لیے لوٹا خداوند کے حکم[1] کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا''۔ انتہٰی اگر اس پر بھی دل شرمندہ نہ ہو تو کہو اور جہاداتِ انبیائے بنی اسرائیل جو بیبل مقدس میں مذکور ہیں نقل کر دوں۔ بلکہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے جہاد کو اس قتل سے کچھ نسبت ہی نہیں۔ آنحضرت ﷺ کا جہاد محض مفسد اور شریروں کا فساد دفع کرنے کے لیے ہوتا تھا کہ جس کو ہر گورنمنٹ عادل بھی پسند کرتی ہے۔ اسی لیے اول ان کو فہمائش کی جاتی تھی اگر وہ لوگ باز آتے تھے تب ان کو معاف کیا جاتا تھا ورنہ مقابلہ ہوتا تھا مگر یہ بھی جب کہ وہ لوگ امن کے خواہاں نہ ہوتے تھے اور کسی شرط پر اطاعت قبول نہ کرتے تھے اور اس جنگ میں یہ تاکید ہوتی کہ عورتوں اور بچوں کو نہ مارو' درخت نہ جلاؤ' مواشی کو قتل نہ کرو بلکہ بعد غلبہ کے بھی وہ لوگ راہ پر آجانے سے آزاد کئے جاتے اور مال واپس دیا جاتا تھا۔ اور عورتوں کی رغبت پر جس کا اعتراض ہو تو وہ پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام پر اعتراض کر لے کہ جو خدائے[2] بنی اسرائیل کے پہلوٹھے بیٹے تھے جن کے پاس چار بیویاں تھیں جن میں آپس میں دو حقیقی بہن تھیں اور پھر حضرت لوط علیہ السلام پر اعتراض کرے کہ جس نے بقول ان کے شراب پی کر اپنی دونوں بیٹیوں سے زنا کیا جیسا کہ تورات میں موجود ہے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی طعن کرے کہ جن کی دو بیویاں تھیں اور ایک کے کہنے سے ایک کو مع اس کے معصوم بچے کے مکے کے بیابان میں چھوڑا اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام پر اعتراض کرے کہ جو عیسائیوں کے خدا کے جدامجد ہیں کہ جد نے باوجود متعدد بیویوں اور لونڈیوں کے بیچارے اوریا کی بیوی سے زنا کیا اور اس کے خاوند کو فریب سے مروا ڈالا اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی برا کہے کہ جس کے پاس بہت سی عورتیں تھیں۔ عماد الدین اور فنڈر یہ باتیں صرف آپ کے بیبل مقدس میں لکھیں ہیں ہمارا اعتقاد نہیں پھر آپ ان کو نبی جانتے ہیں اور ہمارے حضرت ﷺ پر چند نکاح کرنے سے کیا کیا منہ آتے ہیں اور جھوٹی باتیں نکاحِ زینب اور ماریہ کی بابت بناتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام[3] اور ان کے حواریوں کے ساتھ جوان جوان عورتیں رہا کرتی تھیں جس پر یہود کو بدگمانی ہوئی۔ تعجب ہے کہ یہود سے تو آپ کا دم بند ہوتا ہے اور مسیح علیہ السلام کے دوستوں کو برا کہتے ہو اور آپ کا یہ کہنا کہ یہود نے حضرت کو قبول نہ کیا بالکل لغو ہے۔ عبداللہ بن سلام اور کعب احبار کیسے جلیل القدر علماءِ یہود مشرف باسلام ہوئے۔ علاوہ ان شہاداتِ مسیحین کے جو حضرت ﷺ کے مقدس ہونے کی بابت ہم نقل کریں گے یہ بات اہلِ انصاف کو کیا کم ہے۔ کہ اگر معاذ اللہ بقول پادری صاحب آپ ایسے بدچلن اور طامع اور شہوت

[1] دیکھو یہاں تصریح ہے کہ یہ معاملہ خداوند کے حکم سے کیا تھا اس پر پادری جو کہا کرتے ہیں'' کہ جنگ انبیاء بنی اسرائیل جہاد اور دینی بات نہ تھی بلکہ دنیاوی محض غلط توجیہ ہے کیونکہ جہاد اور عام جنگ میں یہی فرق ہے کہ اول خداوند کے حکم سے ہوتا ہے ثانی از خود۔ پھر جب انبیاءِ بنی اسرائیل نے بھی خدا کے حکم سے جنگ کی تو اب جہاد نہیں تو اور کیا ہے؟ ۱۲ منہ

[2] اس میں تعریض ہے یہود و نصاریٰ پر کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا پہلوٹھا بیٹا کہتے ہیں یعنی وہ خدا تعالیٰ جو حقیقی خدا ہے جس پر مسلمانوں کا ایمان ہے۔ بیٹے جورو سے پاک ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مسلمانوں کا اور خدا اور اہل کتاب کا اور خدا ہے جیسا کہ بعض نادانوں نے خیال کیا ہے۔ ۱۲ حقانی

[3] ایک مخفی کرستان نے جو محمد صالح و محمد صادق فرضی ناموں سے تضحیکِ اسلام کے لیے غلط پیشگوئیاں کیا کرتا ہے مفسر کو بے اعتبار بنانے کے لیے اس عبارت سے یہ الزام قائم کیا ہے کہ مفسر حضرت مسیح علیہ السلام کو زنا کار ٹھہراتا ہے۔ جس کو ذرا بھی اردو عبارت سمجھنے کا سلیقہ ہے وہ فوراً اس مخفی کرستان کی تکذیب کرسکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ جھوٹا الزام ہے۔ ۱۲ حقانی

پرست اور بیرحم تھے تو پھر باوجود اس غریبی کے کہ نہ آپ کے پاس ملک تھا نہ فوج تھی نہ خزانہ بلکہ رہنے کے لیے پورا مکان بھی نہ تھا کس طرح ہزار ہا مقدس لوگوں کے سردار ہو گئے اور عرب نے اپنی جہالت اور سفا کی اور بت پرستی اور شہوت رانی کس معلم کی تعلیم سے چھوڑی؟ اور اگر آپ کی تعلیم اچھی نہ تھی نہ کوئی معجزہ آپ کے پاس تھا تو وہ وحشی لوگ کہ جن سے درندے بھی شرماتے تھے کس طرح سے آپ کے مطیع ہوئے کہ زن و فرزند گھر بار' دینِ آبا چھوڑ کر فدویِ خاص بن گئے اور پھر ان عرب میں کہ اس وقت تمام عالم کی آنکھوں میں حقیر تھے کس کی برکت سے وہ جوش اور وہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ جس کی وجہ سے تیس برس کے عرصہ میں روم و مصر و ایران ایشیائے کوچک وغیرہ بلاد پر شرقاً غرباً قادر و مسلط ہو گئے کہ جس کا نظیر عہدِ آدم سے اب تک کہیں نہیں پایا جاتا اور پھر آج تک ہند اور یورپ اور دیگر بلاد میں باوجود اس ضعف کے جو اس زمانہ میں ہے ہزار ہا جلیل القدر لوگ مشرف باسلام ہوتے چلے جاتے ہیں کہ جن کی فہرست لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ آپ تو چال چلن کے بھی اچھے ہیں اور سچے عیسائی بھی ہیں اور سچے عیسائیوں میں بقول حضرت مسیح علیہ السلام یہ علامتیں ہیں (کہ وہ میرے نام سے دیووں کو نکالیں گے اور نئی زبانیں بولیں گے سانپوں کو اٹھالیں گے زہر ان پر اثر نہ کرے گا۔ بیمار ان کے ہاتھ لگاتے ہی تندرست ہو جائے گا) انجیل لوقاء اور اس پر آپ کی قوم کی حکومت بھی ترقی پر ہے اور اولوالعزمی بھی ہے کہ جس کی وجہ سے کروڑ ہا روپیہ بطور چندہ کے جمع ہو کر پادری لوگوں کے[1] مشنوں میں تقسیم ہوتا ہے کہ جس پر پادری صاحب گھوڑوں اور بگھیوں پر چڑھے پھرتے ہیں اور جس کا روح القدس سن کر عماد الدین کو ایسی ایسی ناپاک اور گندی باتیں انبیاء علیہم السلام کی نسبت کہلاتا ہے۔ اس پر[2] بھی سچا عیسائی کوئی نہیں دکھائی دیتا اور جھوٹے نئے عیسائی بھی باوجود اس کوشش کے دس بیس چمار یا حلال خور یا بعض مسلمان و ہنود میں جو دنیا کی تنگی سے عاجز آ کر منافقانہ عیسائیوں میں جا ملتے ہیں عماد الدین کو دو مہینے تنخواہ نہ ملے تو دیکھئے پھر کیا کرتے ہیں؟ اس مالداری پر دینِ مسیحی کی یہ ترقی ہے کہ اتوار کے دن گرجا خالی پڑے رہتے ہیں اور اس عبادت کے روز بھی بیچارے عماد الدین کے سے دیسی کرسٹین جب تک کہ انگریز لوگ گرجا میں رہتے ہیں جانے نہیں پاتے۔ یہ آنحضرت علیہ السلام کی نبوت ہی کا فیض[3] تو

[1] یہ گفتگو الزامی ہے ورنہ ہم اہلِ اسلام حضرات حواریوں سے سوئے ظن نہیں رکھتے۔

[2] پادری صاحب عرب کی جہالت کی تو بقول آپ کے ایک بدچلن آدمی نے اصلاح کر دی کہ جن کا جزء ناری کابلیوں سے اور ترکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ سچے مسیحی نیک چلن کراماتی سے تو عرب یا کابل میں ایک بدو یا کابلی بھی درست نہ ہو تو ذرا جا کر وہاں منادی تو کیجئے۔ بلکہ عیسائی ملک پادریوں کے ہاتھ سے یوماً فیوماً آزاد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کئی سو برس ہوئے کہ پوپ کو القط کر دیا۔ اور اب لنڈن اور فرانس اور جرمن کے عالی دماغ لوگ تثلیث و کفارہ والوہیتِ مسیح سے جو اصل مذہب عیسوی ہیں صدہا نہیں بلکہ کروڑ ہا نفرت کر گئے اور کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور علاوہ اس کے الحاد اور فلسفہ کو وہ ترقی ہے کہ تخمیناً ثلث لوگ سرے سے ان باتوں ہی کے معتقد نہیں اور اس پر طرہ یہ کہ زنا اور شراب خواری کی وہ کثرت کہ جس کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ آپ لوگوں کی سچی تعلیم نے اس بارے میں کچھ بھی اثر نہ کیا اور حضرت ﷺ کی تعلیم کا اب تک وہ اثر باقی ہے کہ اسلامی سلطنتوں میں یہ باتیں سواں حصہ بھی نہیں۔ یہ تو اس ضعفِ اسلام کا حال ہے اور اس سے پہلے تو وہ پاکدامنی صفحۂ عالم پر جلوہ گر تھی کہ جس کا اثر ہمارے ہمسایہ غیر قوموں پر بھی تھا۔ ۱۲ منہ

[3] باایں ہمہ اس زمانہ میں بھی اسلام کی قدرتی سچائی اور فطرتی نورانیت سے جو کچھ ترقی ہے اس کا کہیں نظیر نہیں پایا جاتا ہے۔ مسٹر ایزک ٹیلر نے جو انگلستان میں ۱۸۸۷ء میں اس بارے میں سینکڑوں ممبروں کے روبرو سپیچ کہی ہے اور جو منشور محمدی وغیرہ اخباروں میں لنڈن کے اخبارات سے ←

ہے کہ صفحۂ دنیا پر توحید و پرہیز گاری' خدا پرستی کی روشنی پھیل گئی' اب بھی ممالکِ اسلامیہ و عیسویہ میں کوئی سیر کر کے دیکھ لے تو رات اور دن کا فرق نمودار ہوگا۔ اس زمانہ میں بھی ممالکِ اسلامیہ میں پرہیز گاری' عبادت' مہمان نوازی' خدا پرستی کی چمک ہے۔ برخلاف ان کے عیسویہ ممالک بالخصوص یورپ میں باوجود ترقیِ علوم کے الحاد' بدکاری' عیاری کے دریا موجزن ہیں۔ پھر آپ کی برکت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو کایا پلٹ گئی اس کو بھی مؤرخین جانتے ہیں ان میں سچا جوش' روحانی زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ اگر یہ نبوت کا اثر نہیں تھا تو پھر کونسی شراب کا نشہ تھا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے حواریوں کو جو آپ کے نزدیک موسیٰ وغیرہ انبیاء علیہم السلام سے ہزار درجہ بڑھ کر ہیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کیا بلکہ تابعین بلکہ بعد کے جان نثاروں سے ہی مقابلہ کر کے دیکھئے۔ یہودا نے تو خود حضرت مسیح کو تیس روپے لے کر یہود کے ہاتھ گرفتار کرایا اور اعظم الحوارین شمعون پطرس نے (کہ جن کو حسبِ مفاد ورس ۱۹ باب ۱۶ متی آسمانی کنجیاں اور اختیارات دیے گئے تھے) ایک عورت کے پوچھتے ہی اپنی رفاقت تو کیا بلکہ شناسائی کا بلفظ لعنت بڑے زور سے انکار کر دیا۔ اور وہ صدہا آدمی جو حضرت مسیح پر ایمان لا چکے تھے سب تر بتر ہو گئے کسی نے چوں بھی نہ کی کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹی۔ حالانکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس بارے میں تاکید بھی فرمائی تھی کہ دنیاوی تکالیف پر جو برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا اور جو میرا انکار کرے گا باپ کے روبرو میں بھی اس کا انکار کروں گا۔ اور اسی لیے حضرت مسیح علیہ السلام نے آسمان پر چڑھتے وقت سب کو بے ایمانی[1] کا لقب عطا کیا۔ چنانچہ انجیل مرقس کے باب ۱۶ میں موجود ہے۔ ولیم میور تاریخ کلیسا کے اول باب میں لکھتے ہیں: ''مسیح علیہ السلام کے حواریوں اور شاگردوں نے اب تک یعنی تا وقتِ عروج اس کی تعلیم کی حقیقت اور مطلب بالکل نہیں سمجھا تھا اور ان کا سست ایمان دنیوی نعمتوں اور فائدوں کی امید میں لگا ہوا تھا اس کے گرفتار ہوتے ہی وے سب بھاگ گئے اور پطرس نے جو عدالت میں گیا وہاں اپنے خداوند کا انکار کیا پھر مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد سب بالکل مایوس اور ناامید ہو گئے'' انتہیٰ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نے تو بنی اسرائیل پر باوجود صدہا معجزات دکھانے کے سواں حصہ بھی آپ کی تعلیم سے اثر نہ کیا' بت پرستی اور گوسالہ پرستی سے باز نہ آئے آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان کی نحوست کی وجہ سے ارضِ مقدسہ میں داخل ہونے سے محروم رہے اور راستے ہی میں کام آئے۔ اب فرمایئے دنیا میں جس قدر انبیاء آئے ہیں ان میں سب سے زیادہ کس کی تعلیم کا اثر ہوا ستمگر دل میں شرمایا تو ہوتا۔

قولہ پس محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کو ترغیب دینی شروع کی اور مدینہ والوں کی مدد سے فوج کشی کر کے مکہ پر حملہ کیا

← نقل کی گئی ہے شاہدِ عدل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں جہاں پادری لوگ خاص کرسٹان بنانے کے لیے کروڑہا روپیہ صرف کرتے ہیں ہر سال تخمیناً چھ لاکھ مسلمان بڑھتے جاتے ہیں جو اور مذہب چھوڑ کر اسلام میں آتے ہیں اور افریقہ کے ملکوں میں باوجود دیکہ پادری مناد بھی وہاں بڑی کوشش کر رہے ہیں لاکھوں غیر مذہب کے لوگ اسلام کو قبول کرتے جاتے ہیں اور یورپ کے ملکوں میں بھی عموماً بمقابلہ مذہب عیسوی یوماً فیوماً اسلام کی طرف رجحان ہوتا جاتا ہے جہاں کہ کوئی مسلمان واعظ بھی نہیں۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ حقانی

[1] دہلی میں ایک مخفی کرسٹان اس لقب بے ایمانی کی یہ تاویل کرتا ہے کہ یہ لفظ حضرت مسیح نے ان کے لیے یوں کہا تھا کہ وہ لوگ آپ کے دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان نہ لائے تھے الخ سبحان اللہ! یہ کیا ہوا بھرپور ایمان نہ لانا اور اس کے معاوضہ میں یہ لقب پانا تو ثابت ہے خواہ کسی وجہ سے ہو۔ پھر جانے پادریوں کو خوش کرنے کو محمد صادق اور محمد صالح فرضی ناموں سے بضمن ردِ تفسیر حقانی اپنے چہرہ پر کیوں خاک افشانی کر رہا ہے۔ ۱۲ منہ

اور بڑی خونریزی کر کے قبضہ کیا اور عرب کو طرح طرح ترغیبیں دینی شروع کیں۔ اول لوٹ کے مال کا لالچ جس میں پانچواں حصہ آپ لیتے اور باقی ان کو بانٹ دیتے۔ الخ

جواب اگر خدا کے حکم سے زمین کو فساد سے پاک کرنا اور شریروں کا دفع کرنا ہی ظلم اور بری بات ہے تو حضرت یوشع بن نون وغیرہ انبیاء بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آپ کے نزدیک برے ٹھہرے۔ اور اگر کہو وہ بھی برے تھے تو آپ عقلِ سلیم کے بھی مخالف ہیں کیونکہ فساد کو دفع کرنا اور گندہ گوشت کاٹ کر زخم کو اچھا کرنا اور بے فائدہ شاخوں کو چھانٹنا ہر ذی عقل کے نزدیک محمود ہے۔ اسی لیے تمام سلاطینِ عادل' باغیوں اور مفسدوں کے قتل اور تخریب میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے اور اگر ان کا مال ضبط کرنا برا ہے تو یہ بھی بیجا ہے کیا یوشع بن نون نے نہ کیا اور کیا سلاطینِ عادل نہیں کرتے؟

قولہ دوسرا عورتوں کا لالچ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاص و عام سب لوگوں کو یہ لالچ دیا اگر میرے ساتھ جاؤ گے عورتیں مفت لوٹ میں ہاتھ آئیں گی۔ تم ان سے صحبت کرنا خدا کا بھی اس میں گناہ نہیں۔ الخ

جواب اول تو آنحضرت علیہ السلام نے کبھی کسی لڑائی میں کسی کو یہ لالچ نہیں دیا اگر سچے ہو تو ثابت کرو۔ دوم یوں کون کسی کے لالچ دینے سے کسی کے ساتھ جان دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب لٹیروں کو کسی کی جورو اور مال لینے سے کون مانع ہے۔ اگر یہی لالچ مؤثر ہے تو گورنمنٹ کا ہے کو کروڑہا روپیہ دے کر فوج مقابلہ میں لے جاتی ہے۔ ایسا لالچ کیوں نہیں دیتی اور آپ کیسے لالچی کہ جس نے ساٹھ روپیہ کی تنخواہ پر اسلام ترک کیا کیوں ایک ٹکڑا ہندوستان کا نہیں دبا بیٹھے۔

سوم ہر لڑائی میں یہ کس کو یقین ہوتا ہے کہ ہم ہی فتح یاب ہوں گے ہاں اگر ان کو مددِ آسمانی کا سہارا ہو تو ان پر حکمِ سماوی میں عیب کیا ہے؟

چہارم اسلام میں لڑائی سے مقصود اس قوم کا ایمان لانا ہوتا ہے اگر وہ قوم ایمان لاوے یا مطیعِ اسلام ہو جاوے تو پھر ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا معاذ اللہ اگر آپ لالچی ہوتے تو خواہ کوئی چیں کرے یا پیں کبھی کسی کو نہ چھوڑتے جیسا کہ بائیبل مقدس کے انبیاء نے کیا۔ حالانکہ یہ کبھی نہیں ہوا۔

قولہ تیسرا لالچ جسمانی بہشت کا جس میں شراب' کباب اور اچھی عورتیں اور فرش لونڈی خوبصورت وغیرہ اور بہت سی غلط اور گندی باتیں جن سے نادان بہلائے جاتے ہیں محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کو سنائیں وے بے علم ناواقف بت پرست شہوت کے بندے خوش ہو کر قبول کر بیٹھے۔ اس بہشت کو علماءِ محمدیہ کلامِ الٰہی سے ثابت کریں ورنہ توبہ کریں۔

جواب یہی اعتراض ہمارے سید صاحب نے بھی قرآن اور اسلام پر کیا ہے اور مدت سے پادری فنڈر وغیرہ اسی کو پیش کیے چلے جاتے ہیں مگر یہ آپ لوگوں کی کم فہمی ہے کیونکہ ان اشیاء سے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں بعینہٖ یہی دنیا کی عنصری چیزیں مراد نہیں بلکہ ان کی طرح کی اور اور لطیف چیزیں اور اس بات کو قرآن نے بھی بتلا دیا[1] ہے۔

دوم جنت کی کسی قدر نعماء مکاشفات[2] یوحنا میں بھی موجود ہیں کہ جس کو تمام کلامِ الٰہی سمجھتے ہو۔ پھر انکار محض جہالت

[1] قولہ تعالیٰ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ الآیہ ۱۲ منہ

[2] چنانچہ مکاشفات یوحنا باب ۴ آیت ۹۔ والیضاً باب ۲۱ و باب ۲۲ میں خوب بیان ہے انجیل متی باب ۲۵ میں بالخصوص انجیل متی باب ۲۶ آیت ۲۹ ←

ہے۔ سوم اگر تمہاری کتابیں جنت اور دوزخ کے بیان سے خالی ہیں تو یہی وجہ حضرت ﷺ کے نبی ہونے کی کافی ہوسکتی ہے کیونکہ جزاء وسزا دارِ آخرت میں انسان کے لیے عقلاً ونقلاً ثابت ہے اور اس کے بیان کی ضرورت ہے پس جس چیز ضروری کے بیان سے تمام کتبِ سابقہ خالی ہیں جن سے اس کو بیان کیا وہ شخص قطعی نبی ہے۔

قولہ چوتھا لالچ مسلمانوں کی طرف داری الخ

جواب غلط کیونکہ سب اہل تاریخ آپ کی عدالت اور انصاف کے مقر ہیں ان باتوں میں اہل اسلام ضرب المثل ہیں۔ یہ عیسائی دین نہیں کہ جس میں کالے گورے کا فرق کیا جائے اور آپ نے یہ آیت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ جو لکھی اس کو طرفداری سے کیا علاقہ کفار پر ان کے دفعِ فساد کے لیے شدت کرنا اور چیز ہے اور اہلِ معاملہ سے انصاف سے پیش آنا اور بات ہے۔

قولہ پانچواں باعث جھوٹی دہشت دینا یعنی محمد صاحب (ﷺ) نے دوزخ اور بہشت اور عذابِ قبر کی بابت ایسے ایسے مضمون صریح البطلان جو ہرگز عقل ونقل قبول نہیں کرتی اس جاہل ملک کو سنا کر ڈرایا۔

جواب ہمارے مشفق سید صاحب بھی آپ لوگوں کی بولی بولتے ہیں مگر افسوس کہ نہ آپ عذابِ قبر کو سمجھے نہ دوزخ کو نہ بہشت کو۔ ہماری اس کتاب کو دیکھتے تو کبھی یہ بات منہ پر نہ لاتے۔ بھلا پادری صاحب یہ فرمایئے کہ جب انسان کے لیے بعد مردن نہ عذابِ قبر ہے نہ دوزخ نہ جنت تو پھر نیک وبدکام کا نتیجہ کیا ہے؟ شاید یہی دنیائے فانی اسی لیے پولوس مقدس نے شریعت پر عمل کرنے والے کو بے ایمان فرمایا اور عیسائیوں کو ہر چیز کا فتویٰ دے کر سانڈ بنایا ہے۔ معاذ اللہ اگر یہی الہام ہے اور یہی نبوت ہے تو سخن فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد۔ پس شیطان صاحب کو تکلیف اٹھانے کی اب کچھ ضرورت نہ رہی۔ عیسائیوں کی کتابیں اور ان کے پادری کافی ہیں علاوہ اس کے مکاشفات[1] یوحنا میں بھی تو ایسی جھوٹی دہشت مذکور ہے اور اکثر انبیاء علیہم السلام کے کلام میں مسطور لیکن آپ کو بیبل پر نظر نہیں جس لیے یہ جھوٹا غرور ہے۔

قولہ غرضکہ ایسی ایسی ترغیبات سے عرب کے عوام ان کے معتقد ہو گئے الخ۔ پس جبکہ ابوبکر وعمر وغیرہ چند رئیس یعنی بستی کے چودہری ایمان لائے تو پھر کیا کہنا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں اقتدار حاصل ہوگیا۔ افسوس محمدی یہ خیال نہیں کرتے کہ عمر نے اپنی بیٹی حفصہ کس طمع پر دی تھی اور ابوبکر نے الخ۔

جواب: جس طمع پر کہ آپ کے جدِّ فاسد نے آپ کے باوا تا جو صاحب کو آپ کی والدہ دی تھی۔ ہمارا کلام بیہودہ گوئی نہیں مگر چونکہ آپ نے سوال کیا ہم کو جواب دینا پڑا۔

قولہ جب محمد صاحب (ﷺ) مر گئے تو یہ سب لوگ ان کا گاڑنا دابنا بھی بھول گئے اور وراثت کی تقسیم میں ایسے مبتلا

← میں تصریح ہے کہ جنت میں انگور کا شیرہ پیا جائے گا۔ پس جب کھانا پینا ثابت ہوا تو یہ پادریوں کو اختیار ہے کہ وہ فقط انگور کا شیرہ ہی پی کر بس کیا کریں اور اہلِ اسلام ہر چیز کھائیں پئیں۔ اب اپنی قسمت پر اعتراض کریں نہ کہ جنت کے نعماء پر۔ ۱۲ منہ

[1] کیا انور کا قصہ عماد الدین نے انجیل میں نہیں پڑھا جہاں حضرت مسیح علیہ السلام عذابِ قبر اور دوزخ کا پورا فوٹو کھینچ رہے ہیں عماد الدین ایسی ضد میں آئے کہ انجیل اور عقائدِ عیسویہ سے بھی ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ ۱۲ منہ

ہوئے کہ مار پٹائی ہونے لگی۔ محمد صاحب کا باغِ فدک جو انہوں نے اپنی بیٹی کو بخش دیا تھا چھین لیا بلکہ محمد صاحب (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ کو بطمع دنیاوی لاتیں ماریں اور کیا کیا واہیات کیا۔ صرف محمد صاحب (ﷺ) کے داماد علی نے ان کو گور گڑھا دیا۔

جواب: یہ ہذیان سرتاپا بے اصل امام باڑوں کی گپیں ہیں اگر آپ سچے ہیں تو بسندِ صحیح ثابت کر دیجیے بلکہ اس کو عقلِ سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی دو وجہ سے:

(اول) آنحضرت علیہ السلام کی نبوت (کہ جس کو مخالف بھی رد نہیں کر سکتے اور وہ تعلیمِ حمیدہ اور وہ جوشِ دینی کہ جس کی وجہ سے صحابہ گھربار چھوڑ چھاڑ حضرت ﷺ کے آستانہ مبارک پر آپڑے تھے' کیا اس زمانہ کی پیری مریدی کا سا بھی اثر نہیں رکھتی تھی؟ حاشا وکلا۔ بلکہ وہ اثر رکھتی تھی کہ جس کا اثر آج تک دلوں میں چلا آتا ہے اور بے دیکھے حضرت ﷺ کے نام پاک پر جان ومال صرف کرنے کو جی آمادہ رہتا ہے اور نام پاک سنتے ہی محبت جوش مارتی ہے۔ پس کسی پیر جی کے مرید یا کسی عالم کے شاگرد یا کسی رفارمر کے معتقد اس کی لاش اور اس کی اولاد کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ ہم نے بعض بزرگوں کی لاشوں کے ساتھ وہ ماتم اور ان کے مریدوں میں وہ جوش دیکھا ہے کہ جس کا بیان نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کے یاروں اور مریدوں نے ایسا کیا ہو۔ توبہ توبہ

(وجہ دوم) بالفرض یہ بھی صحیح لیکن وہ مال اور ملک آنحضرت ﷺ کے بعد کیا برآمد ہوا تھا کہ جس پر یہ نوبت پہنچی بلکہ ایک پیسہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اور اگر وہ لوگ مال کے بھوکے تھے تو مدینہ منورہ میں مال واسباب چھوڑ کر کیوں آئے تھے اور کیوں عمر بھر فاقہ کشیاں کیں درِ دولت سے نہ ہٹے اور خیر یہ بھی سہی مگر آنحضرت علیہ السلام کے بھائی بند بنی ہاشم اور خود علی مرتضیٰ اور ان کے ساتھ وہ انصار جانباز کیا کم تھے کہ جو حضرت عمر یا ابوبکر رضی اللہ عنہما کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لات مارتے دیکھ کر چپ کرتے وہ بے غیرت آئے اُوئی کرنے والے نہ تھے نہ پانی پت کے تیلی جولا ہے جو اس بے حمیتی کو روا رکھتے۔ کسی کی کیا مجال تھی جو خاتونِ جنت کی طرف ٹیڑھی آنکھوں سے بھی دیکھتا مگر ہمارے بھائی بند شیعہ غیر محقق لوگوں نے ایک ذرا سی بات کو پہاڑ بنا دیا۔ اصل نزاع مسئلۂ امامت میں تھا۔ شیعہ کے نزدیک استحقاق اس خدمت کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تھا۔ دوم علی رضی اللہ عنہ سب صحابہ میں افضل ہیں نہ یہ بات کہ اور صحابہ کرام کافر یا مرتد ہو گئے۔ اور باغِ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ملک کر دینا چاہیے تھا۔ اہلِ سنت کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مستحق تھے۔ اور وہی سب صحابہ میں افضل تھے۔ اور باغ آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات میں نذر اللہ کر دیا تھا بلکہ اپنے جان اور مال سب کو وقفِ راہِ مولیٰ کر دیا اور نحن معشر الانبیاء لانرث ولا نورث ماترکناہ صدقۃ فرما دیا تھا پس جس طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی حیات میں جو اس کی آمدنی پاتی تھیں بدستور جاری رکھی اور باغ مالِ خدائی ٹھہرایا گیا۔ کیونکہ جب مال ہی نہیں تو تقسیم کا ہے میں جاری کرتے؟ لیکن بنی امیہ کے ظلم اور زیادتی سے یہ قصہ نہایت طول پکڑ گیا۔ خود شیعہ کے اس مسئلۂ امامت میں بہت سے فریق ہو گئے۔ اور غالی اور متعصب لوگوں نے اپنی رونقِ مجالس اور لوگوں کو مصائبِ اہلِ بیت پر رلانے کے لیے ایسی ایسی باتیں بھی گھڑیں اور کتابوں میں درج کر دیں اور نوبت تبراء اور گالی گلوچِ صحابہ کی پہنچا دی اور پرائے شگن کے لیے اپنی ناک اڑا دی۔ اہانتِ پیغمبر علیہ السلام اور اہلِ بیت کرام کی طرف خیال نہ کیا۔ اس لیے محققین شیعہ ایسی باتوں کو ہیچ و پوچ جانتے ہیں۔ پادری صاحب اصل بات یہ ہے نہ وہ کہ جو تم کہتے ہو۔

قولہ بعد اس کے ہمیشہ روپیہ اور ملک گیری کی خاطر لڑتے رہے یہاں تک کہ محمد صاحب (ﷺ) کے نواسے امام حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) بھی بادشاہت کی فکر میں مارے گئے۔

جواب: بالکل جھوٹ یہ عیسائیوں کی لڑائیاں نہیں کہ محض دنیا کے لیے جھوٹ اور فریب اور بے ایمانی اور دغا بازی کو عمل میں لاتے ہیں اپنے سے غالب کو دب کر سلام کرتے ہیں۔ مغلوبوں کو نہایت بے رحمی سے مارتے ہیں۔ کیا اسپین کا قصہ اور بیت المقدس میں پچاس ہزار مسلمانوں کے زن و فرزند کا باوجود امان کے قتل کرنا وغیرہ صفحۂ عالم سے محو ہو گیا ہے؟ اور حضرت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شہادت محض دین کے لیے تھی کہ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اگر دین کے لیے شہید ہونا عیب ہے تو خود حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے بعض حواری بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔

قولہ غرض یہ سب دنیاوی طمع سے محمد صاحب (ﷺ) پر ایمان لائے تھے اور ان کے بعد بادشاہوں نے طمع اور جان کے خوف سے لوگوں کو مسلمان کیا (جیسا کہ قسطنطین بادشاہ روم نے ہزار ہا بیکس لوگوں کو ظلم سے ہلاک کر کے مذہب عیسائی کو رواج دیا تھا) یہاں تک محمد صاحب کا مختصر احوال سنایا ان شاء اللہ اگر زمانے نے فرصت دی تو خاص محمدی تاریخ جدی لکھ کر مفصل کیفیت سناؤں گا جو پردہ میں ہے۔

جواب: تم نے تاریخ محمدی میں حسب وعدہ اور پادری فنڈر نے اور مصنف نیاز نامہ نے اور ماسٹر رام چندر نے رسالہ مسیح الدجال و تحریف القرآن میں اور تمہارے مقلد لالہ اندرمن مراد آبادی نے وغیر ذلک بہت سے متعصب اور نا انصاف لوگوں نے بہت کچھ کاغذ سیاہ کئے ہیں اور جھوٹے عیب ضعیف اور موضوع روایات و اقوالِ اہلِ سیر سے اور کچھ اپنی طرف سے اس آفتابِ جہاں تاب پر لگائے ہیں اور آسمان کی طرف تھوکا ہے مگر وہ سب اڑ کر کے منہ پر پڑا دیکھئے:

اب ہم آنحضرت ﷺ کے فضائل پر اہلِ انصاف عیسائیوں سے شہادت طلب کرتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟ گاڈفری ہیگنس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ گبن صاحب کہتے ہیں ''چاروں خلفاء کے اطوار یکساں صاف اور ضرب المثل تھے کہ ان کی سرگرمی، دل دہی، اخلاص کے ساتھ تھی۔ اور ثروت اور اختیار پا کر بھی اپنی زندگیاں اداءِ فرائضِ اخلاقی اور مذہبی میں صرف کیں۔ یہی آدمی محمد (ﷺ) کے اول جلسہ میں شامل تھے جو پیشتر اس سے کہ آپ نے اقتدار حاصل کیا آپ کے جانب دار ہو گئے یعنی ایسے وقت میں کہ آپ ہدفِ آزار ہوئے اور جان بچا کے اپنے ملک سے چلے گئے۔ ان کے اول ہی اول تبدیل مذہب کرنے سے ان کے راستی ثابت ہوتی ہے اور دنیا کی سلطنتوں کو فتح کرنے سے ان کی لیاقت کی فوقیت معلوم ہوتی ہے۔'' (۲۱۹) ''اس صورت میں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے ایذائیں سہیں اور اپنے ملک سے جلاوطنی گوارا کی اور اس سرگرمی سے اس کے پابند ہوئے یہ سب امور ایک شخص کی خاطر ہوں جس میں ہر طرح کی برائیاں ہوں اور اس سلسلۂ فریب اور سخت عیاری کے لیے ہوں جو ان کی تربیت کے بھی خلاف ہو اور ان کی ابتدائی زندگی کے تعصبات کے بھی مخالف ہو؟ اس پر یقین نہیں ہو سکتا اور خارج از حیطۂ امکان ہے'' (۱۲۳) عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (ﷺ) کے مسائل نے اس درجہ کا نشۂ دینی آپ کے مریدوں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ (علیہ السلام) کو ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے اور آپ کا مذہب اس تیزی کے ساتھ جس کی نظیر دینِ عیسوی میں نہیں چنانچہ نصف صدی سے کم میں اسلام بہت سی عالیشان اور سرسبز

سلطنتوں پر غالب آ گیا۔ جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے اگر بالفرض آپ کی حفاظت کرنے کی ان کو ممانعت تھی تو آپ کی تشفی کے لیے تو موجود رہتے اور صبر سے آپ کے اور اپنے ایذا رسانوں کو دھمکاتے۔ برعکس اس کے محمد (ﷺ) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا'' انتہٰی۔ پھر خود گبن اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ ''محمد کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک ہے۔ مکہ کے پیغمبر نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا''۔ الخ ''اس نے اپنی سرگرمی سے کائنات کے بانی کا ایک ایسا وجود تسلیم کیا ہے کہ جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا، نہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں، نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں۔'' الخ ''ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا اور اس کے پیروؤں نے ان کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے بہت درستی کے ساتھ ان کی تصریح اور تشریح کی۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے عقائدِ مذکورہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے ادراکِ موجودہ اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے'' الخ ''وہ اصل الاصول جن کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمد (ﷺ) کی شہادت سے استحکام کو پہنچے چنانچہ ان کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے'' انتہٰی

اور ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کہتے ہیں ''محمد (ﷺ) کو نکلتے ہوئے آفتاب، برستے پانی اور اگتی گھانس میں خدا ہی کا یدِ قدرت نظر آتا تھا اور عرش، رعد اور آوازِ آب و طیور کے نغمہ میں حمدِ الٰہی کی آواز سنائی دیتی تھی اور سنسان جنگلوں اور پرانے شہروں کی خرابات میں خدا ہی کے قہر کے آثار دکھائی دیتے تھے انتہٰی۔

اور راوڈویل صاحب دیباچۂ قرآن میں لکھتے ہیں: ''محمد کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ اپنے ملک کے لوگوں کو جہالت اور ذلت بت پرستی سے چھڑا دیں اور یہ کہ نہایت مرتبہ کی خواہش آپ کی یہ تھی کہ سب سے بڑے امرِ حق یعنی توحیدِ الٰہی کا جو ان کی روح پر بدرجۂ غایت مستولی رہتی تھی اشتہار کریں'' الخ ''اور مقتضاءِ حوادث اور بتدریج فوزِ مرام اس امر کا باعث ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا رسولِ امین یقینِ کامل کر لیا۔ تاہم محمد (ﷺ) کی سیرت ایک عجیب نمونہ اس قوت اور حیات کا جو ایسے شخص میں ہوتی ہے کہ جس کو خدا اور قیامت پر اعتقادِ کامل ہوتا ہے اس میں سے جو کچھ نتیجے نکالے جائیں ان کی ذاتِ کریم اور سیرت صداقتِ مشحون سے ہمیشہ ان کو ان لوگوں میں تصور کیا جاوے جن کو ایمان اور اخلاق اور اپنے ابنائے جنس کے تمام حیاتِ دنیوی پر ایسا اختیار حاصل ہے جو حقیقت میں بجز کسی اولالعزم کے اور کسی کو نہیں ہوتا''۔ انتہٰی۔

اور لارڈ ولیم میور اپنی کتاب سیرتِ محمدیہ میں لکھتے ہیں: ''ایک زمانہ نامعلوم سے مکہ اور جزیرہ عرب کی روحانی کیفیت بالکل بے حس ہو گئی تھی گو ایک ضعیف ناپائدار اثر یہودیت و نصرانیت یا فلسفہ کا عرب پر ہوا تھا جیسے کہ ایک دریاچہ غیر رواں کے سطح کا ادھر ادھر لہر کھاتا مگر تہ میں بےحس و حرکت رہنا۔ تمام عرب تو ہمات و ظلم اور بدکاریوں میں غرق ہو رہے تھے۔ یہ عام

رسم تھی کہ بڑا بیٹا اپنے باپ کی بیواؤں کو بیاہ لیتا تھا۔ ان کے غرور اور افلاس سے رسمِ دختر کشی بھی جاری ہوگئی تھی جیسے ہندوؤں میں ہے۔ ان کا مذہب حد کے درجہ کی بت پرستی تھا اور ان کا ایمان ایک مسبب الاسباب مالک علی الاطلاق پر نہ تھا بلکہ غیر مرئی ارواح کے توہم باطل کی سی ہیئت کا ان کا ایمان تھا۔ قیامت اور جزاء وسزاء جو فعل یا ترک کا باعث ہو اس کی انہیں خبر نہ تھی (جیسا کہ پادریانِ حال بالخصوص عماد الدین کو نہیں ہے)۔ ہجرت سے تیرہ برس پیشتر (یعنی قبل نبوت) تو مکہ اس طرح سے ایسی ذلیل حالت میں بے جان پڑا ہوا تھا۔ مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثرِ عظیم پیدا کیا۔ سینکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی۔ (بخلاف پادریوں کے کہ وہ اب بھی تین خدا کی پرستش کرتے ہیں) اور اپنے اعتقاد کے موافق وحیِ الٰہی کی ہدایت کے مطیع ومنقاد ہوگئے۔ اسی قادرِ مطلق سے بکثرت وشدت دعا مانگتے اسی کی رحمت پر مغفرت کی امید رکھتے اور حسنات وخیرات و پرہیز گاری اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اب انہیں شب و روز اسی قادرِ مطلق کی قدرت کا خیال ہے اور یہ کہ وہی رازق ہمارے ادنیٰ ادنیٰ حوائج کا خبر گیراں ہے۔ ہر ایک قدرتی یا طبعی کیفیت میں ہر ایک امورِ متعلقاتِ زندگانی میں اور اپنی خلوت وجلوت کے ہر ایک حادثہ اور تغیرات میں وہ اسی کی یدِ قدرت کو دیکھتے تھے اور اس کے علاوہ لوگ اس روحانی حالت کو جس میں وہ خوشحال اور حمد کناں رہتے تھے خدا کے فضلِ خاص ورحمت بالاختصاص کی علامت سمجھتے تھے اور اپنے کافر اہلِ شہر کے کفر کو خدا کی تقدیر کئے ہوئے خذلان کا نشان جانتے تھے۔ محمد (ﷺ) کو وہ اپنی حیاتِ تازہ بخشنے والا سمجھتے تھے'' الخ ''اس تھوڑے عرصہ میں مکہ اس عجیب تاثیر سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ مسلمانوں نے مصیبتوں کو تحمل اور شکیبائی سے برداشت کیا'' الخ ''ایک سو مرد وعورت نے اپنے ایمانِ عزیز سے انکار نہ کر کے اپنا گھر بار چھوڑ حبش کو ہجرت کر لی تھی پھر اس سے زیادہ آدمی اور ان میں نبی بھی (دیکھو نبوت کا اقرار ہے) اپنے عزیز شہر کو اور مقدس کعبہ کو چھوڑ کر مدینے کو ہجرت کر آئے اور یہاں بھی اس عجیب تاثیر نے دو یا تین برس کے عرصہ میں ان لوگوں کے واسطے ایک برادری جو نبی اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئے تیار کر دی۔ اہلِ مدینہ کے کانوں میں یہودی حقانی باتیں عرصہ سے گوش گزار ہو چکی تھیں مگر وہ بھی اس وقت خوابِ خرگوش سے نہ چونکے جب تک کہ روح کو کپکپا دینے والی باتیں نبیِ عربی کی نہیں سنیں۔ تب البتہ ایک نئی اور سرگرم زندگانی میں دم بھرنے لگے'' انتہٰی۔ ایک جگہ اسی کتاب میں لارڈ صاحب لکھتے ہیں: ''ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے ہمیشہ کے واسطے اکثر توہماتِ باطلہ کو کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی۔ اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور قدرتِ کاملہ کا مسئلہ حضرت محمد (ﷺ) کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے۔ جیسے کہ خاص حضرت محمد (ﷺ) کے دل میں تھا۔ مذہبِ اسلام کی پہلی بات جو خاص اسلام کے معنی میں ہی یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیے۔ بہ لحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں۔ چنانچہ مذہبِ اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں برادرانہ محبت رکھیں، یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کریں، غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے مذہبِ اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیز گاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا'' انتہٰی۔

ہم بنظرِ اختصار انہیں دو چار عیسائی محققوں کے قول پر انحصار کرتے ہیں اور ان محققین بالخصوص لارڈ ولیم میور صاحب بہادر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے بنظرِ انصاف مذہبِ اسلام اور نبی علیہ السلام اور صحابہ کرام کی واقعی واقعی خوبیاں بیان کرنے میں کچھ کمی نہ فرمائی اور منصب تاریخ گوئی کو امانت سے ادا کر دیا۔ اب اگر ہمارے ہندی پادری صاحبان بھی انصاف پر آئیں اور سچے عیسائی ہو جائیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صداقت اور رسالت کی شہادت دینے والے یہودیوں کے جھوٹے الزامات سے بری کرنے والے فارقلیط۔ شیلا حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی عداوت سے باز آئیں اور جس طرح یہود حضرت مسیح علیہ السلام کی گستاخی کر کے حیاتِ ابدی سے محروم رہے، نجات سے محروم نہ رہیں اور جن کتابوں میں آنحضرت علیہ السلام بے گناہ اور معصوم کو گالیاں دی ہیں، برا بھلا کہا ہے، ان کی نسبت عیب لگائے ہیں ان کو جلا دیں تو کیا خوب ہو؟ دیکھو بھائیو ضد بالخصوص اللہ کے پاک اور مقدس اور راہبر لوگوں سے بد ہے اگر تم سچے عیسائی ہو تو برائے خدا ذرا تو تخلیہ میں بیٹھ کر سوچو کہ آنحضرت ﷺ نے دینِ عیسوی کے حق میں کیا برائی کی ہے بلکہ انہوں نے تو ان کی اور حضرت مریم کی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نہایت عظمت کی ہے۔ قرآن میں تمہارے اکابر کی محامد اور تصدیق بکثرت ہے غایۃ مافی الباب تمہارے برخلاف مسئلہٴ تثلیث وکفارہ والوہیتِ مسیح کو (کہ جس کو نہ عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے نہ کسی نبی نے نہ خود مسیح نے فرمایا ہے) نہیں مانتے جیسا کہ خود عیسائیوں کے محقق فرقے (جیسا کہ مارسیونی اریوس، ابیوتی، یونی ٹیرین، ارتمن، نکلاتی، نصاریٰ نجران وغیرہم) اس افراط اور خیالِ باطل کو نہیں مانتے۔ اسلام کا فریق عجیب فرمانبردار فریق ہے کہ جس کو کسی نبی اور کتابِ الٰہی سے انکار نہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو بشرطیکہ اس کی نبوت ثابت ہو جائے اور کتاب کا کلامِ الٰہی ہونا دریافت ہو جائے۔ تم کو البتہ یہود سے مخالفت اور تعصب ہو تو بجا ہے کیونکہ وہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو بری بات پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی کسی کتابِ آسمانی میں نہ کوئی بشارت ہے نہ کوئی خبر۔ ان کے مرید محض بے تک عہدِ عتیق کی آیات کو کھینچ کھانچ کر لاتے ہیں تاہم تک نہیں ملتی۔ نہ ان کے پاس کوئی معجزہ تھا نہ کوئی کرامت۔ گھر سے آوارگی میں بھاگ کر مصر چلے گئے وہاں بعض حکماء سے چند ادویہ مجربہ اور چند نقوش وعمل دیو وجن کے مجرب سیکھ آئے تھے اور یورشلیم میں آکر اپنے کرشمے دکھا کر نبی کیا بلکہ خدا کا بیٹا بن بیٹھے۔ بہت سے احمق ان کے شعبدوں میں آ گئے بہت کو سلطنت کا لالچ دیا اور چال وچلن کے بھی اچھے نہ تھے چند عورتیں ساتھ رہا کرتی تھیں۔ پہلے انبیاء کو چور اور بٹ مار کہتے تھے (یوحنا ۱۰ باب) پس گرفتار کئے گئے اس وقت کوئی معجزہ بھی نہ دکھا سکے اور سب شعبدے بھول گئے۔ آخر الامر چیخ چیخ کر بڑی ذلت سے جان دی۔ چنانچہ اناجیل میں یہ مرقوم ہے کہ ان کے ساتھ جو لالچی لوگ تھے سب تر بتر ہو گئے۔ کچھ شعبدے حواریوں نے سیکھ لیے تھے ان کو دکھا کر لوگوں کو بہکاتے پھرے۔ آخر قسطنطین بادشاہ روم جو بڑا ظالم تھا عیسائی ہوا اس نے بزورِ شمشیر لوگوں کو عیسائی کیا۔ چونکہ اس مذہب میں شریعت پر عمل کرنے والے پر لعنت ہے ان کے ہاں سور وشراب، کتا گدھا وغیرہ ہر چیز مباح ہے نہ عبادت ہے نہ قربانی، نہ ختنہ۔ سوا اس آزادی کی وجہ سے اکثر لوگ عیش پسند اس شہوت پرست مذہب میں داخل ہوتے گئے دنیا کی ترقی و تجارت اور صنعت سے یہ لوگ اور چل نکلے۔ الخ

اقول پادری صاحب کیا یہ کفریات ان کفر کی باتوں سے کم ہیں جو آپ نے سید المرسلین ﷺ کی جناب میں کہے ہیں؟

ہمارے نزدیک جو جواب ان کا ہے وہی ان کا مگر آپ کا یہاں دم بند ہے

فصل چہارم

قرآن کے مضامین کے بیان میں

واضح ہو کہ اصل غرض دنیا میں نبی کے بھیجنے اور اس پر کتاب نازل کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ عالم میں جس قدر فساد واقع ہوئے ہوں اور جو کچھ امور خلافِ فطرتِ سلیمہ لوگوں میں رواج پا گئے ہوں ان کو مٹایا اور ہر امر میں اصلاح و فلاح کا لحاظ فرمایا جائے۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ نبی ہر امر میں خدا کی طرف کا فطرت الیہ کے لیے سچا نمونہ ہے۔ یا آسمانی کسوٹی ہے جو بات اس کے موافق ہے کھری ورنہ کھوٹی ہے۔ اسی لیے ہر زمانہ میں یکے بعد دیگرے انبیاء آتے اور اصلاح[1] فرماتے رہے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس عہد کے موجب طریقے سکھائے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے مناسب احکام جاری کئے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے وقت کے مناسب نماز و روزہ کے احکام سکھائے' توحید کو رواج دیا' بت پرستی کی مذمت کی پھر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام بھی اسی طرح دنیا میں خدائی قانون کو رواج دیتے رہے سب سے اخیر سب کے پیشوا جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملکِ عرب میں تشریف لائے۔ اس وقت تمام عالم میں تاریکیِ جہالت محیط تھی۔ عرب کے لوگ گو اس بات کے مدعی تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمیہ کے کہ جس کو ملتِ حنفیہ کہتے ہیں'' پابند اور حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد اور فرزندِ ارجمند ہیں مگر اس وجہ سے کہ صدہا سال تک ان میں پھر کوئی نبی نہ ہوا تھا نہایت گمراہی آ گئی تھی۔ جس طرح کوئی قدیم عمارت بالخصوص شاہی دیوانِ خاص صدہا سال کی مرمت نہ کرنے سے جا بجا سے ٹوٹ جائے اور کسی قدر در و دیوار کے نشان باقی رہیں اور اس دیوانِ خاص کی کچھ اور ہی شکل ہو جائے اور اس میں اور مکانات بن جائیں یہی حال شریعتِ ابراہیمیہ کا عرب میں تھا۔

اول مرض ان میں یہ پھیلا کہ خدا تعالیٰ و تقدس کو دنیا کے شہنشاہوں پر قیاس کیا کہ جس طرح دنیاوی بادشاہوں سے عرض و معروض و حاجت براری و کارگزاری بغیر وزیروں اور مشیروں اور عملہ کے نہیں ہو سکتی اسی طرح سے خدا تعالیٰ نے اپنے بعض خاص بندوں کو قدرت و کمال عطا کیا اور اپنی خدائی کا ایک حصہ ان کو دیا ان کے بغیر نہ خدا کسی کی عبادت قبول کرتا ہے نہ

[1] اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ الآیۃ اور اسی مضمون کی بہت سی آیات قرآن میں ہیں کہ سب لوگ قوانینِ ملت اور اصولِ فطرت میں ایک تھے اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا۔ خلافِ امور کو اختیار کیا ان کی اصلاح کو انبیاء بھیجے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مامن مولو دالا ویولد علی الفطرة الحدیث اور اسی لیے یہ بھی ثابت ہوا کہ اصولِ دین میں تمام انبیاء یکساں ہیں۔ محض امورِ جزئیہ میں اختلاف ہے کہ کسی نبی کے لیے قوم اور ملک اور زمانہ کی رعایت سے کچھ احکام ملے دوسری کو انہیں وجوہ سے اور احکام دیے گئے جس طرح کہ طبیب ہر مرض اور ہر شہر اور ہر ملک اور ہر موسم اور ہر مریض کے لحاظ سے نسخہ میں کمی زیادتی دیکھ کر کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کل انبیاء علاتی بھائی ہیں ایک باپ اور مائیں مختلف۔ پس اس سے یہی مراد ہے کہ اصولِ شریعت متحد ہیں فروع میں اختلاف ہے۔ ۱۲

حاجت روائی فرماتا ہے۔ بلکہ بعض اقوام نے تو بعض اکابر کی نسبت یہ اعتقاد کیا کہ خدا تعالیٰ دنیا میں اس کی شکل میں ہو کر ظاہر ہوا ہے اور اس میں حلول کیا ہے جیسا کہ ہنود اپنے اوتاروں کی نسبت اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت یہی عقیدہ اب تک رکھتے ہیں۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا پس کسی کو رزق رسانی کا' کسی کو پانی کا' کسی کو تندرستی و بیماری کا' کسی کو قحط وارزانی کا الغرض کسی کو کسی کا اور کسی کو کسی اور چیز کا اپنے دل میں حاجت روا سمجھ لیا اور ان کی عبادت اور قربانی و نذر و نیاز و نام لینے کو اپنے لیے تقربِ الٰہی کا وسیلہ جانا اور ان سے روگردانی کو باعثِ نقصانِ جان و مال مانا اس لیے ان کی پرستش ضرور سمجھی گئی اور وہ لوگ کہ جن کی نسبت ان کا یہ گمان تھا انبیاء و اولیاء و ملائکہ ہیں۔ اور بعض لوگ اپنے آباء و اجداد اور جنون اور ارواحِ خبیثہ کو اور بعض عناصر آگ' پانی' ہوا' خاک کو بھی اور بعض آفتاب و ماہتاب ستاروں اور دیگر عجائب مخلوقات کو بھی اسی مرتبہ میں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان چیزوں کی پرستش کرنے والے ہنود اور مجوس اب تک موجود ہیں۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی ہنود نے نہ چھوڑی۔ عناصر کی پرستش وید[1] اور دساتیر میں اب تک مذکور ہے۔ اور ان کی طرف دھیان دھرنے اور خیال جمانے کے لیے ان کے نام کی تصویریں پیتل اور پتھر وغیرہ چیزوں کی بنا کے آگے رکھ کر عبادت کرنے لگے لیکن ان تصویروں کو معبود نہ سمجھتے تھے بلکہ جہتِ[2] قبلہ خیال کرتے تھے۔ البتہ متاخرین نے خود ان تصاویر ہی کو معبود سمجھ لیا یہ پہلوں سے بھی بڑھ کر خرابی میں پڑے۔ عرب میں یہ بت پرستی عمرو بن لحی کی وجہ سے رواج پائی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تخمیناً تین سو برس پیشتر تھا۔ پس جس طرح اہلِ ہند کے ہاں کرشن وغیرہ اکابر کی تصاویر مندروں میں دھری گئیں اور ان کی پوجا شروع ہوئی اسی طرح سے عرب میں بنی کلب نے ود کا بت بنایا اور ہذیل نے سواع کا اور مذحج نے یغوث کا اور ہمدان نے یعوق اور قوم حمیر نے سباء میں نسر کے نام کا بت بنا کے پوجا۔ اور یہی پانچوں بت قومِ نوح میں بھی تھے جیسا کہ سورہ نوح میں مذکور ہے اور قریش نے خاص مسجدِ ابراہیمی یعنی خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے نام کے اور لوگوں کے نام کے چھوٹے بڑے بہت سے بت رکھ چھوڑے تھے اور گردِ کعبہ کے سب سے بڑا بت ہبل کے نام سے رکھا تھا۔ اور عرب جن بتوں کی پرستش کرتے تھے منجملہ ان کے لات اور منات اور ذوالخلصہ اور ذوالکفین اور ذوالشریٰ اور بہم اور سعیر اور فلس وغیرہا تھے کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ عرب کے لوگ عموماً معطلہ اور کچھ محصلہ تھے۔ معطلہ میں سے ایک صنف تو یہی بت پرست تھے جن کے خیالات کا رد قرآن مجید میں جا بجا ہے کہیں یوں فرمایا اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ الآیہ اور کہیں یوں کہا لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ الآیۃ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ الآیۃ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ الآیۃ وقال لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ الآیۃ اور ایک فریق عرب میں ایسا تھا کہ جو خالق کا اور مر کر دوبارہ حساب و کتاب' جزاء و سزاء کے لیے زندہ ہونے کا انکار کرتا تھا اور طبع

[1] وید ہنود کے نزدیک کتاب آسمانی ہے۔ اور دساتیر مجوس کے نزدیک کتاب آسمانی ہے چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ ۱۲ منہ۔

[2] بعض بت پرست جیسا کہ اندر من وغیرہ اپنی بت پرستی کی یہی توجیہ کیا کرتے ہیں مگر اس سے الزامِ شرک سے بری نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم نے مانا کہ لالہ صاحب وغیرہ دانشمندوں نے مہادیو اور بشن اور کرشن اور کالی بھوانی وغیرہ کی مورتوں کو سجدہ نہ کیا بلکہ ان کو جہتِ قبلہ اور اصل مسجود مہادیو وغیرہ کو جانا [illegible] تصویر [illegible] معبود و مسجود سمجھنا بھی تو بڑی غلطی اور صریح شرک ہے۔ ۱۲ منہ

کو زندہ کرنے والا اور دہر کو فنا کرنے والا جانتا تھا یعنی ترکیبِ اجسام کی طبیعت سے آدمی اور دیگر حیوانات و نباتات خود پیدا ہو جاتے ہیں اور تحلیل ہوتے ہوتے گردشِ دہر سے فنا ہو جاتے ہیں نہ اس پر بعد مرگ کوئی حساب ہے نہ کتاب، نہ دوزخ نہ بہشت، نہ کوئی رسول نہ فرشتہ اور ان لوگوں کو دہریہ کہتے ہیں۔ چنانچہ آج کل بھی انگلستان اور جرمن وغیرہ بلاد میں ان کی ذریت موجود ہے۔ اس فرقہ کا بھی قرآن میں بہت جگہ رد ہے قال اللہ تعالیٰ وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ پس خدا تعالیٰ نے ضروریاتِ فکریہ و آیاتِ فطریہ کے ساتھ چند آیات اور سورتوں میں ان کی اس بیہودہ اور غلط خیال کو رد کیا فقال اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وقال اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ وقال قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ قال مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ الآیۃ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ۵ الآیات۔ اس فریق کا بھی رد قرآن مجید کی اکثر آیات و اکثر سورتوں میں نئے نئے طور سے واقع ہوا ہے۔

اور ایک ایسا فریق تھا کہ جو خالق اور ابداءِ خلق کا تو قائل تھا مگر بعث اور اعادہ کا منکر تھا۔ اس فریق کے عقائد کو بھی قرآن نے اکثر جگہ بڑی شدومد سے رد کیا ہے چنانچہ یہ آیت قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ الآیہ اور یہ آیت اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ انہیں کے رد میں وارد ہے۔ اور ایک فریق ایسا تھا کہ جو خالق اور ابداءِ خلق اور کسی قدر اعادہ کا قائل تھا مگر رسولوں کا منکر تھا اور اصنام کی عبادت کرتا تھا کہ یہ ہمارے لیے آخرت میں خدا کے پاس شفاعت کریں گے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ان کی رد میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ وغیرہا من الآیات۔

اور یہ لوگ بتوں کے نام کی قربانی کرتے تھے اور جس طرح کہ ہنود ہر سال اپنے بتوں کی زیارت کے لیے میلے کے طریق جاتے ہیں اسی طرح یہ مشرکین ان کے لیے حج کرتے اور منتیں مانتے اور بعض چیزیں حلال اور بعض حرام کرتے تھے اور اپنی کھیتی وغیرہ آمدنی میں سے ان کے حصے مقرر کرتے تھے اور اس میں کسی قدر خدا کے نام بھی معین کرتے تھے اور کبھی خدا کے نام کا بتوں کے نام پر چڑھا دیتے تھے ان جانوروں میں سے کسی نر کو مردوں کے لیے حلال اور عورتوں پر حرام کر دیتے تھے چنانچہ سورۂ انعام میں اس کا رد موجود ہے وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا یَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ الآیۃ وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهٖ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ الآیہ ان کے رد میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ الآیہ وقال اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا الآیہ اور عموماً ان لوگوں کے دو شبہ تھے:

اول[1] حشرِ اجساد کا کہ جس کی نسبت کہتے تھے ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ

[1] اس امر میں ایک شاعر جاہلیت نے یہ اشعار کہے ہیں۔

حیات ثم موت ثم نشر حدیث خرافۃ یا ام عمرو

اور بعض نے مرثیہ میں یہ کہا ہے

فماذا بالقلیب قلیب بدر من ایشری فطل بالسنام
یخبرنا الرسول بان نحی وکیف حیات اصداء وہام ۱۲ منہ

وغیرہا من الآیات۔

دوم رسولوں کا آدمیوں کی شکلوں میں آنا اور حوائجِ بشریہ میں شریک ہونا جس کی نسبت خدا تعالیٰ خبر دیتا ہے وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ الی قولہ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا قال وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا پس جو لوگ کہ فرشتوں کے قائل تھے وہ کہتے تھے کہ فرشتے کیوں رسول نہ ہوئے وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ وغیرہا من الآیات۔ اور جو قائل نہ تھے وہ صرف اپنے بتوں کو کافی اور وسیلہ سمجھتے تھے۔

اول شبہ کا جواب قرآن میں کثرت سے دیا گیا اور ثانی شبہ کا جواب بھی اکثر جگہ ذکر فرمایا کہ بشر تمہارے ہم جنس ہے فرشتہ نہیں اور اگر فرشتے کو بھی رسول کر کے تمہارے پاس بھیجتے تو انسان ہی کی شکل میں بھیجتے پھر شبہ کرنے والے اسی طرح اس پر بھی شبہ کرتے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا الآیہ اور جب اس ضرورت کے لیے بشر کو رسول کرنا پڑا تو بشر سے مقتضیاتِ بشریہ ترک ہونی اس طرح ناممکن ہیں کہ جس طرح آگ سے حرارت کا جدا ہونا ناممکن ہے۔ پس اسی لیے جس قدر دنیا میں پیشتر انبیاء آئے کھاتے پیتے تھے بیوی بچے بھی رکھتے تھے قال تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَیَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ اور بعض عرب تناسخ کے قائل تھے کہ انسان جب مر جاتا یا مارا جاتا ہے تو اس کے دماغ کا خون اور اجزاءِ اصلیہ مجتمع ہو کر ایک جانور ہو جاتا اور سو برس تک اس کی قبر پر بولتا اور دشمن سے انتقام چاہتا ہے جیسا کہ آج کل صدہا عوام اور بالخصوص ہنود کے خیالاتِ خام ہیں کہ فلاں شخص کی روح آتی ہے اور فلاں شخص جن بھوت بن کر لوگوں کو ستاتا پھرتا ہے یا فلاں جنگل یا فلاں جگہ میں رات کو فلاں مقتول بولتا اور پانی مانگتا ہے یا بڑے بزرگ گھر پردان پن کے لیے آتے ہیں یا فلاں عورت کی سوکن جو مر گئی ہے اس کو ستاتی ہے چنانچہ شیخ سدو اور زین خان و ماموں الہ بخش اور ہنومان کی چوکی وغیرہ بیہودہ خیالات انہیں لوگوں کی نشانی اور یادگاری ہے اس غلط خیال کو نبی علیہ السلام نے بھی بڑی شدومد سے رد کیا فقال لا ھامۃ ولا عدوی ولا صفر الحدیث بلکہ شگن اور مہورت اور فال وغیرہ خیال کی پرستش کو بھی منع کر دیا اور سنا دیا کہ خدا کی قضاء و قدر کو کوئی چیز روک نہیں سکتی قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا الآیۃ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اسی مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ اور بعض کا یہ اعتقاد تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں ان کی عبادت اور ان کے وسیلے سے حاجت براری ہوتی ہے اس کے رد میں خدا تعالیٰ نے اکثر آیات نازل فرمائی ہیں ازاں جملہ یہ آیت ہے اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَیَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِیْنَ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ اور بعض عرب جنوں کی پرستش کرتے اور ان کے نام کی دہائی دیتے تھے ان کے رد میں خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے وَجَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۔

اور اکثر لوگ ایسے بھی تھے کہ جو کچھ باتیں جنوں سے دریافت کر کے اور اس میں دس جھوٹ ملا کے لوگوں کے آگے بیان کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کو کاہن کہتے تھے جیسا کہ آج کل جہال جمعرات کو جگہ لیپ کر، گانا سن کر، سر بکھیر گردن ہلانے لگتے ہیں کہ ہم پر سید آتا ہے اور عوام ان سے مغیبات کا سوال کرتے اور اس پر ایمان لاتے اور اس کے قول پر عمل

کرتے اور بعض چیزیں کھانی پینی چھوڑ دیتے ہیں وغیر ذلک من الخرافات۔ اس کا رد بھی قرآن میں مذکور ہے کہ خدا کے سوائے کسی کو غیب کا حال معلوم نہیں البتہ جس قدر وہ خود اپنے ملائکہ یا خاص بندوں کو بتلا دیتا ہے بس اسی قدر جانتے ہیں اور جنوں کو تو ملاءِ اعلیٰ تک رسائی بھی نہیں اور جو کوئی وہاں کا قصد کرتا ہے تو اس پر کرۂ نار سے انگارے برستے ہیں سورۂ جن میں اس کا ذکر ہے اور پیغمبر علیہ السلام نے بھی بدلائلِ موثقہ اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اور بعض عرب ستاروں کی تاثیر کے قائل تھے کہ جس قدر حوادث اس عالمِ سفلی میں واقع ہوتے ہیں جیسا کہ مینہ برسنا اور قحط ہونا اور بیمار و تندرست ہونا اور غنی و فقیر ہونا جو کچھ ہوتا ہے سب ستاروں کی گردش سے ہوتا ہے یہاں تک کہ خرید و فروخت و بیاہ شادی سفر وغیرہ ستاروں کے طلوع و غروب کے حساب سے کرتے تھے جس طرح اب تک اس ملک میں ہنود اس کے پابند ہیں۔ برہمنوں کے خیالاتِ خام اور وساوس وغیرہ کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں۔ اس خیالِ فاسد کی غلطی بھی قرآن اور نبی آخر الزماں نے ظاہر کر دی۔ چنانچہ بمقام حدیبیہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ آج شب کو جو بارش ہوئی ہے اس کی نسبت خدا تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ بعض بندوں نے کفر اختیار کیا اور بعض مجھ پر ایمان لائے پس جس نے یوں کہا کہ مطرنا بنوء[1] کذا اس نے کفر اختیار کیا اور جس نے اس بارش کو خدا کی طرف سے سمجھا وہ مومن رہا۔ الحدیث اور قرآن نے بھی یہ کہہ دیا کہ آفتاب و ماہتاب اور جمیع ستارے خدا کی مخلوق اور ممکن اور اس کے حکم کے اپنی چالِ خاص میں مسخر ہیں۔ ہوا، پانی وغیرہ مخلوقات سے ان کو اور کوئی زیادہ بات حاصل نہیں۔ قال تعالیٰ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ وغیرہا من الآیات۔

سوال: یہ خیال غلط نہیں کیونکہ حکماء بھی علویات کی تاثیر کے قائل ہیں۔

جواب: اول تو حکماء بھی بہت سی غلط باتوں کے قائل ہیں۔

(از انجملہ یہ کہ خدا سے سوائے ایک چیز کے اور کوئی دوسری چیز صادر نہیں ہوئی۔ از انجملہ یہ کہ اس کو جزئیاتِ مادیہ کا علی وجہ التفصیل علم نہیں۔

از انجملہ یہ کہ اس کو اپنی ذات کا علم نہیں وغیر ذلک مما لا یخفی۔

دوم: اگر تاثیر ثابت ہے تو اس قدر ثابت ہے کہ جس طرح آگ کی تاثیر حرارت اور پانی کی برودت۔ پس اسی طرح آفتاب و ماہتاب اور دیگر ستاروں کی تاثیر حرارت و برودت ہے کہ جس سے پھل پھول پکتے ہیں نہ یہ کہ انسان کی سعادت و نحوست میں کچھ ان کو دخل ہے اور یہ بات اور ہے کہ اتفاق سے اس ستارے کے طلوع و غروب کے وقت کوئی کام ہو گیا مثلاً کسی کو ایسا اتفاق ہو کہ جب کسی کام کے لیے وہ کتے کے بھونکتے وقت چلا تو وہ کام نہ ہو تو اس سے کوئی ملازمہ عقلیہ یا عادیہ کتے کے بھونکنے کے نہ ہونے میں نہیں ہو سکتا البتہ توہمات کو بڑی گنجائش ہے۔

اور بعض عرب مذہب یہود کی طرف میلان رکھتے تھے اور بعض عیسائی تھے۔ یہود اور عیسائیوں میں جو کچھ خرابیاں اور گمراہیاں اس وقت میں تھیں بلکہ اب تک باقی ہیں بیان سے باہر ہیں۔ کسی قدر ہم ابھی بیان کریں گے۔ اور بعض عرب مجوسیوں کی طرف میلان رکھتے تھے۔ کیونکہ ایک عرصہ سے یمن اور عراق میں ایرانیوں کی سلطنت تھی کہ جو مجوس اور آتش

[1] نوء کہتے ہیں ستاروں کے اجتماع اور طلوع و غروب کو یعنی ہم کو ستاروں کی وجہ سے بارش حاصل ہوئی۔ ۱۲ منہ

پرست تھے اور تبوک وغیرہا اطرافِ عرب میں بالخصوص مدینہ طیبہ سے شمالی اور مغربی حصہ میں اکثر عیسائی لوگ حاکم تھے۔ ہرقل شاہِ روم کے صوبجات شمار ہوتے تھے اور خاص مدینہ منورہ میں اور اس کے اطراف خیبر وغیرہا مواضع میں یہود رہتے تھے باقی حجاز و نجد وغیرہ ملک خود مختار تھے۔

دوسرا فریق عرب کا (کہ جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے طریق پر چلتا تھا) ان کو محصّلہ کہتے ہیں یہ لوگ موحد تھے نبی کے منتظر تھے۔ لیکن یہ فریق بہت ہی کم تھا۔ منجملہ اس فریق کے زید بن عمرو بن نفیل تھے جو کعبہ سے تکیہ لگا کر توحید بیان کیا کرتے تھے اور شرک سے نفرت دلایا کرتے تھے اور حشر و نشر، حساب و کتاب کے قائل تھے منجملہ ان کے قیس بن ساعدہ ایادی ہیں۔ منجملہ ان کے مواعیظ کے یہ اشعار ہیں جو ثبوتِ حشر میں کہے ہیں۔

یاباکی الموت والاموات فی جدث
علیهم من بقایا برهم خرق
دعهم فان لهم یوما یصاح بهم
کما ینبه من یوماته الصعق

الخ منجملہ ان کے عامر عدوانی ہیں یہ شخص عرب کے حکماء اور خطباء میں سے ہے۔ اس کی ایک بڑی وصیت ہے۔ جس کے اخیر میں یہ کلمات ہیں کہ میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ جس نے اپنے تئیں پیدا کیا ہو۔ اور جو آنے والی ہے وہ جانے والی ہے اگر لوگوں کو مرض سے موت ہوتی تو دوا سے زندگی بھی ہو جاتی۔ اس شخص نے زنا اور شراب کو اپنے اوپر حرام کیا تھا اور شراب کی مذمت میں چند اشعار بھی کہے ہیں منجملہ ان کے قیس بن عاصم تمیمی اور صفوان ابن امیہ محرب کنانی اور عفیف بن معید یکرب کندی ہیں۔

قرآن مجید کو اس وقت کے چار فریق کا رد اور دفعِ شبہات کرنا پڑا جو فطرتِ سلیمہ سے برخلاف اور راہِ راست سے دور پڑے ہوئے تھے۔

اول: تو یہی عرب معطلہ کہ جن کے عقائد مذکور ہو چکے ہیں اور ان کے رد میں اہلِ منطق اور اہلِ فلسفہ کے طرز کو اختیار نہیں کیا کہ مقدماتِ یقینیہ سے قیاس بشرائط مرکب کر کے پیش کیا جاتا اور امورِ غامضہ پر مناظرہ کی بنیاد رکھی جاتی اور نہایت باریک باتوں پر الزام دیا جاتا کیونکہ ان عامیوں، انپڑھوں اور اونٹ اور بکری چرانے والوں سے اس طرح سے مناظرہ کرنا خلافِ مقصود تھا۔ وہ ایسی باتیں کب سمجھ سکتے تھے اس لیے مقدماتِ مشہورہ اور مسلمہ پر اکثر الزام دیا اور ان مقدمات کا غلط ہونا ثابت کر دیا جن پر یہ عقائدِ فاسدہ مبنی تھے۔ چنانچہ ہر موقع پر ہم اس کی تشریح کریں گے اور تقدیم و تاخیر کا کچھ لحاظ نہ کیا اور کلام کے مکرر ہونے سے اور اکثر سورتوں میں پھر پھر لانے سے اجتناب نہ کیا کیونکہ مقصود یہ تھا کہ ان کے دل میں شرک کی برائی جم جائے اور ان خیالاتِ فاسدہ کی غلطی پیش نظر ہو جائے کس لیے کہ ذکی تو اشاروں سے سمجھ سکتا ہے اور عامی بغیر مکرر اور تفصیلِ تام کے نہیں سمجھ سکتے۔ جو مفسر اس نکتہ سے واقف نہیں وہ آیاتِ احکام اور آیاتِ مخاصمہ میں باہم ربط دینے میں بڑا

تکلف کرتے ہیں اور ان کے لیے کوئی قصہ شانِ نزول میں تلاش کرتے ہیں اور دراصل لوگوں میں عقائدِ باطلہ کا پایا جانا آیاتِ عقائد کے لیے شانِ نزول ہے اور باہم جھگڑے اور ظلم و ستم کا پایا جانا آیاتِ احکام کے لیے شانِ نزول ہے اور جب ہمارے بعض مفسر ہی اس نکتہ کو نہ سمجھے اور انہیں بے اصل قصوں کو تفسیرِ آیات میں داخل کرنے کی ضرورت پڑی تو بیچارے پادری و ہنود وغیرہم مخالفین (کہ جو علومِ اسلامیہ سے اکثر ناآشنا ہیں) کیا سمجھتے؟ پس پادری فنڈر اور پادری عماد الدین وغیرہم نے جو قرآن پر اس بارے میں بڑی شدومد سے اعتراضات کئے ہیں اور قرآن کی فصاحت و بلاغت میں نقص ثابت کیا ہے اور ناحق کی قابلیت جتلائی ہے درحقیقت اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان اعتراضات میں بیچارے پادریوں کا محققینِ اہلِ اسلام قہقہہ نہ اڑائیں بلکہ ان کو ان کی بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں۔

دوم: فریق کہ جس سے مناظرہ واقع ہوا یہود ہے۔ یہود میں بیشمار خرابیاں شائع ہو گئی تھیں جن کی اصلاح بنی اسرائیل کے نبیوں سے بھی نہ ہو سکی کیونکہ سب سے اخیر انبیاءِ بنی اسرائیل میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔ انہوں نے جس قدر اصلاح چاہی بیان سے باہر ہے مگر اس سخت قوم پر (کہ جس کے ہاتھ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی عاجز آ گئے حالانکہ دن بھر میں بہت سے خوارق و معجزات ان سے دیکھتے تھے) چنداں اثر نہ ہوا۔ آخر علمِ الٰہی کے بموجب ان دونوں حضرات کو یہی فرمانا پڑا کہ جلد راستی اختیار کرو ورنہ آسمانی سلطنت کا زمانہ بہت قریب آتا ہے وہ نبی آنے والا ہے کہ جس کے ہاتھ پر آتشین شریعت[1] ہے۔ سرکشوں کو کامل سزا دے گا۔ اور جو کچھ خدا اور انبیاء بالخصوص حضرت مریم اور عیسیٰ علیہما السلام کی نسبت بہتان باندھ رکھے ہیں اور ان کو دور کرے گا۔ منجملہ خرابیوں کے ایک یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی ذات[2] اور صفات میں تشبیہ کے قائل تھے یعنی اس کو جسمانی جان کر اس کے لیے حقیقۃً جسم اور مکان اور اعضاء ثابت کرتے تھے اور اس کے لیے تناہی قدرت و طاقت مانتے تھے کہ وہ آسمان و زمین پیدا کر کے تھک گیا اور ہفتہ کے روز اس نے آرام لیا اس کا رد بھی قرآن نے کیا فرمایا اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ الآیہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اور فرمایا وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ

ازانجملہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں سے نہایت پیار کے الفاظ سے خطاب کیا تھا اور وہ لفظ پیار کا بیٹا تھا یہود اس سے یہی سمجھ گئے کہ ہم خدا کے پیارے اور بیٹے ہیں ہم کو کسی فعل پر عذاب نہ ہوگا اور جو کچھ ہوا بھی تو بطور تہدید کے چند روز ہوگا اس بات کو خدا نے رد کیا کہ خدا کی جب کوئی جورو ہی نہیں تو بیٹا کہاں؟ باپ بیٹے میں مماثلت اور مجانست ضرور ہے خدا کا نہ کوئی مثل ہے نہ ہم جنس۔ فرمایا لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الآیۃ وَلَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ الآیہ اور فرمایا کہ تم پر کیا منحصر ہے جو کوئی خداوند تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے گا وہ عذاب سے نجات پائے گا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ الآیہ اور

[1] یعنی محمد علیہ السلام۔ ۱۲ منہ

[2] چنانچہ تورات سفر خلیقہ میں ہے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور خداوند سے یعقوب کشتی لڑا۔ اور خدا تعالیٰ تمام بنی آدم کو پیدا کر کے پچھتایا اور آسمان و زمین پیدا کر کے ہفتہ کے دن آرام لیا۔ ۱۲ منہ

فرمایا اگر خاص تمہارے ہی لیے دار آخرت[1] ہے تو ذرا موت کی آرزو تو کرو قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ الآیہ اور یہ کہ گناہ پر ہم کو چند روز عذاب رہے گا پھر نہیں۔ فرمایا یہ تمہارے دلوں کے منصوبے ہیں تِلْکَ اَمَانِیُّهُمْ الآیہ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً الآیہ۔

ازانجملہ یہ کہ شہوت پرستی اور بدمستی سے انبیاء علیہم السلام کی نسبت بھی بڑی بدگمانیاں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت بڑا گناہ خیال تھا اور حضرت لوط علیہ السلام کو یہ کہتے تھے کہ انہوں نے شراب پی کر اپنی دونوں بیٹیوں سے زنا کیا اور وہ دونوں اس سے حاملہ ہوئیں اور ایک نے مواب اور دوسری نے بن عمی جنا۔ چنانچہ سفر خلیقہ کے ۱۹ باب میں اب تک مذکور ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بت پرستی کی اور حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا کی جورو سے زنا کیا چنانچہ کتاب السلاطین میں اب تک موجود ہے۔ اس خیال کو خدا نے رد کیا کہ وہ ہادی اور خدا کے برگزیدہ بندے تھے خدانخواستہ اگر وہ بھی ایسا کریں تو پھر امت کا کیا ٹھکانا۔ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ وغیرہا من الآیات۔

ازانجملہ یہ کہ بابل کی اسیری میں اصل نسخہ تورات ان کے ہاتھ سے مفقود ہو گیا تھا پھر مدت بعد ان کے علماء نے اپنی یاد کے طور پر کچھ مرتب کیا اور عزیر علیہ السلام اس کے مہتمم ہوئے آخر شاہ انٹوکس کے حادثہ میں وہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا پھر اپنے طور پر جو کچھ چاہا لکھا اور اس کا نام تورات رکھا (چنانچہ اس کی تحقیق آتی ہے) چونکہ یہ نسخہ خدائی تو تھا ہی نہیں انہیں کی تصانیف تھا اس لیے اس پر بھی پورا پورا عمل نہ کرتے تھے بلکہ ان کے مشائخ احبار و رہبان رشوت ستانی کے لیے کچھ کا کچھ ادل بدل کر الٹ پلٹ کر دیتے تھے یا اس کی کوئی تاویل کر دیتے تھے کہ جس سے خدا کے حکم پر عمل کرنے سے سدِ راہ ہو جاتے تھے۔ اس کی مذمت قرآن نے بیان کی وقال تعالیٰ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِهٖ الآیہ بلکہ جو ان کی مرضی کے موافق ہوتا تھا اس کو باقی رکھتے تھے اور جو مخالف ہوتا اس کو مٹاتے تھے اس لیے جناب نبیِ آخر الزمان علیہ السلام کی جو صریح خبریں ان کی کتب میں چلی آتی تھیں ان کو اور دیگر احکامِ رجم وغیرہا کو اپنے امراء کی خوشامد میں چھپایا یہ تو ان کے علماء کا طور تھا۔ عامیوں میں یہ خرابی تھی کہ وہ ان لالچی اور بیدین علماء کے اس درجہ معتقد تھے کہ اس کے خلاف[2] میں کوئی کیسی ہی حق بات کیوں نہ کہے اور انبیاء ہی آ کر کیوں نہ سمجھائیں وہ اس کو ہرگز نہ مانتے تھے بلکہ ان حق گو لوگوں کے قتل کے درپے ہوتے تھے۔ چنانچہ بہت سے انبیاء کو اسی بات پر شہید کر ڈالا۔ ازانجملہ یہ کہ تعلیمِ انبیاء علیہم السلام کے برخلاف منہیات میں بالکل مستغرق ہو گئے تھے[3] اور بجائے درس و تدریسِ کتابِ الٰہی کے جادو و منتر وغیرہ بیہودہ خیالات میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم اور ان کے پیرووں کے ساتھ عداوتِ قلبی تھی بیان سے باہر ہے۔ ان ناشائستہ کلمات کا

[1] ہنود کا عموماً یہی خیال ہے کہ مکتی کے لیے چار قوم پرمیشر نے بنائی ہیں برہمن چھتری بیش شودر باقی اور تمام مخلوقِ الٰہی ملچھ یعنی بری اور نجات کے لائق نہیں اور اس پر عجب یہ ہے کہ اور غیر قومیں کسی کرم یعنی عمل سے نہ برہمن ہو سکتے ہیں نہ چھتری نہ بیش نہ شودر۔ پس پرمیشر نے ہندوستان کے ہندوؤں کو ہی مکتی کے قابل بنایا باقی سب ہیچ۔ ۱۲ منہ

[2] جیسا کہ اس وقت جہاں لوگ اپنے بزرگوں اور آباء و اجداد کی تقلید میں نصوصِ قرآنی و سنتِ مصطفویہ کا انکار کرتے اور حیلہ و بہانہ کر کے ٹال دیتے ہیں۔ ۱۲ منہ

[3] جیسا کہ آج کل دینیات کو چھوڑ فضول اور بیہودہ علوم کے سیکھنے میں لوگ مصروف ہیں۔ ۱۲ منہ

ذکر کرنا بھی نامناسب ہے۔ عیسائی لوگ اس کے خود مقر ہیں بلکہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام[1] کو مسیحِ دجال کہتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ بموجب بشارتِ موسیٰ علیہ السلام اگر سچے نبی ہوتے تو قتل نہ کئے جاتے حالانکہ وہ قتل کئے گئے۔ اور جس قدر بشارات کتبِ سابقہ میں ان کے لیے پائی جاتی ہیں سب کی تاویل کرتے تھے۔ اور نبیِ آخر الزماں کے منتظر تھے کہ جو ان کی اعانت کرے۔ پس خدا تعالیٰ نے قرآن میں ان کے اس عقیدہ کو یوں رد کیا کہ تم نے عیسیٰ کو قتل ہی نہیں کیا بلکہ تم کو خود اشتباہ ہوا ہے۔ اور اس کی والدہ پاکدامن اور صدیقہ تھی اور روح القدس کے مس کرنے سے خود بخود ان کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے پیدا کیا اور معجزات عطا کئے۔

از انجملہ یہ کہ حضرت کے معاصرینِ یہود کو آپ سے سخت عداوت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ آپ نے ان کی خرابیوں کی اصلاح فرمانی چاہی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی تصدیق کی اور انجیل کو کتابِ الٰہی کہا پس ان کو وہ جو کچھ ایک مدت سے امید تھی کہ عیسائیوں کو ملزم ٹھہرائیں گے اور عرب کے مقابلہ میں ہماری طرف داری کریں گے یک لخت جاتی رہی اس لیے خود آپ کی نبوت میں کلام کرنے لگے اور جب معجزات وغیرہا دلائل سے انکار کی جگہ باقی نہ رہی اور آپ کو قطعی نبی جان گئے تو یہ حیلہ کیا کہ آپ عرب یعنی امی لوگوں کے رسول ہیں ہمارے نہیں ہو سکتے دو وجہ سے:

(۱) یہ کہ موسیٰ کی شریعت ابدی ہے اگر آپ کو نبی مانا جائے تو اس سے شریعتِ موسویہ کا منسوخ اور غیر ابدی ہونا لازم آئے۔

(۲) یہ کہ یہ استحقاقِ نبوت خاص ہمارے خاندان بنی اسرائیل کا ہے یہ نعمت بنی اسماعیل میں حاصل ہونی ممکن نہیں۔

اول شبہ تو محض لغو ہے کس لیے کہ آپ کے نبی ماننے سے موسیٰ کی شریعت کے ابدی ہونے میں کوئی فرق نہیں لازم آتا کیونکہ آپ کی شریعت اور موسیٰ علیہ السلام کی وہ شریعت کہ جو ابدی ہونے کے لائق ہے ایک ہے۔ البتہ بعض جزئیات قوم اور زمانہ کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں خود تورات میں احکام کا بدلنا ثابت ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

دوم ابدی سے مراد زمانۂ طویل ہے کما لا یخفی۔ دوسرا شبہ تو محض ایک جاہلانہ گفتگو ہے کیونکہ خدا نے کہیں وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں بنی اسمٰعیل میں نبی برپا نہ کروں گا بلکہ نبی برپا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اب تک اس تورات میں بھی موجود ہے جس کی تصریح ہم کسی مقام پر کریں گے اور کسی قدر عقائد الاسلام میں کر چکے ہیں۔ خدا کی رحمت کسی شخصِ خاص کا حصہ نہیں، پس یہ انکار بھی ان کا محض بے دلیل اور احبار و رہبان کی تقلید سے تھا لیکن ان میں سے صدہا منصف مزاج آسمانی شریعت میں داخل ہوئے جیسا کہ عبداللہ بن سلام وکعب احبار وغیرہما رضی اللہ عنہم۔ پس یہ عداوت روز مرہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ جنگِ احزاب کے بعد یہودِ بنی قریظہ و بنی نضیر و خیبر کو آتشِ شریعت نے اپنا کامل اثر دکھایا۔ اور بعض علماءِ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں حاضر ہو کر بہت سے امور کی تصدیق کرتے اور آپ کے لیے بشاراتِ تورات کو ظاہر کرتے تھے مگر وہ بیچارے جب پھر اپنی قوم میں

---

[1] عجب ہے کہ دہلی کے ایک کرسٹین ماسٹر رامچند رنے ایک رسالہ لکھا ہے کہ جس کا نام رسالہ مسیح الدجال رکھا اس میں علاوہ اور لغویات کے ایک طرفہ مضمون یہ تھا کہ ان جملوں کو (کہ جو یہودی حضرت مسیح علیہ السلام پر منطبق کرتے اور ان کو دجال بناتے ہیں) جناب رسالت مآب سید الانبیاء محمد علیہ السلام کی نسبت لگایا اور عاقلوں کو اپنا مخبوط الحواس ہونا ظاہر کر دکھایا۔ ۱۲ حقانی

واپس جاتے تھے تو ان پر بڑی لے دے ہوتی تھی کہ تم کیوں جا کر ایسی باتیں ان کو بتاتے ہو کہ جس سے وہ تم کو الزام دیں۔ الغرض اس طرح سے ہر روز نئی نئی باتیں پیش آتی تھیں کہ جس کا رد خدا کی جانب سے ہوتا تھا۔ کبھی وہ جبرئیل علیہ السلام کی عداوت ظاہر کرتے تھے اور قرآن کے نہ ماننے میں یہ عذر پیش کرتے تھے۔ کبھی مدینے کے منافقین کو ورغلاتے تھے اس لیے سورہ بقرہ وغیرہا میں اکثر ایسے مضامین ہیں۔

(تیسرا فریق) کہ جس سے قرآن میں مناظرہ واقع ہوا ہے نصاریٰ ہے۔ یہود تو تھے ہی یہ ان سے بھی گمراہی میں کئی نمبر بڑھے ہوئے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ ہی سے جو کچھ مصائب مسیحیوں پر پڑنے شروع ہوئے ان کے ذکر کے لیے ایک جداگانہ دفتر چاہیے۔ انہیں حوادث میں انجیل ان کے ہاتھ سے جاتی رہی اور کچھ یادداشت کے طور پر تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رہا۔ کسی معتبر ذریعہ سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ حواریوں کے پاس جب کہ وہ روم وغیرہا بلاد میں منادی کرتے پھرتے تھے کوئی حضرت مسیح علیہ السلام کی تصنیف یا خود ان کی تصنیف کتاب بھی ساتھ تھی؟ لیکن ان حواریوں نے دینِ حق کی اشاعت میں بڑی ہی کوشش فرمائی اور لوگوں کو اپنی کرامات اور نیک چلنی دکھا کر دینداری کی طرف متوجہ کیا۔ پھر تخمیناً دوسری صدی میں صدہا ایسے جھوٹے مسیحی پیدا ہوئے کہ جنہوں نے روح القدس نازل ہونے اور الہام ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے جھوٹے عقائد اور اوہامِ غلط کو حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی طرف منسوب کیا اور لوگوں میں ان کا رواج دینا شروع کیا۔ چنانچہ ورس ۱۳ باب ۱۱ نامہ روم قرنتیوں میں اس کی تشریح ہے۔ اور صدہا جھوٹی انجیلیں اور نامجات معروف و مشہور ہو گئے جیسا کہ باب اول انجیل لوقا اور ابتداء نامہ گلتیوں اور باب دوم نامہ تسلنقیوں میں اس کی تصریح ہے۔ اور اس طوفانِ بے تمیزی کا باعث نہ تنہا طمعِ نفسانی اور تضلیلِ شیطانی تھی بلکہ بہت سے سادہ لوح جھوٹ بول کر دین کو ترقی دینا موجبِ ثواب جانتے تھے۔

چنانچہ ولیم میور اپنی اردو تاریخ کلیسا کے باب سوم حصہ دوم دفعہ ۳ میں لکھتے ہیں کہ دوسری صدی کے عیسائیوں میں یہ گفتگو رہی کہ جب حکیموں سے بحث کا اتفاق ہو تو ان کے طریقے کو اختیار کرنا چاہیے؟ چنانچہ اُرجن کی رائے سے یہی بات قرار پائی۔ اس سے بحث میں تیزی تو پیدا ہوئی مگر راستی اور صفائی میں خلل پڑا اور جعلی تصنیفات پیدا ہونی شروع ہوئیں کیونکہ فیلسوف جس کی پیروی کرتے تھے تو رواج دینے کے لیے اس کے نام سے تصنیف کر کے مشتہر کر دیتے تھے۔ ان کی تقلید سے یہی طریقہ عیسائیوں نے اختیار کیا۔ یہ بات بھی خلافِ حق اور قابلِ الزامِ شدید کے تھی انتہٰی ملخصًا۔ اور یہی بات ان کی پولوس کے اس خط سے جو انہوں نے رومیوں کو لکھا ہے ظاہر ہوتی ہے وہ ورس ۷ باب سوم میں لکھتے ہیں۔ ’’پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اور اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئے تو مجھ پر کیوں گناہگار کی طرح حکم ہوتا ہے اور ہم کیوں نہ برائی کریں تا کہ بھلائی ہو‘‘ انتہٰی۔ الغرض اسی پولوس نے اور بھی دین کو الٹ پلٹ کر دیا اور بجائے صداقت اور ایمانداری کے بیچارے سیدھے سادھے ایمانداروں کے دلوں کو نجس خیالات اور کفر کے عقائد سے بھر دیا۔ چاروں اناجیل کہ جن پر آج کل کے عیسائی ادھار کھائے پھرتے ہیں اسی پر آشوب زمانہ کی تصنیف ہیں۔ یہ تثلیث اور کفارہ اور الوہیتِ مسیح کہ جس کو عیسائی نجات کا مدار جانتے ہیں ایسے ہی جعلسازوں کی گھڑت ہے۔ گرچہ بعض بعض فرقہ عیسائیوں کے اس کفر کے سخت منکر بھی تھے

جیسا کہ فرقہ یونی ٹیرین وغیرہ مگر گمراہی زور پکڑتے پکڑتے آنحضرت ﷺ کے عہد تک حد سے تجاوز کر گئی تھی۔

ازانجملہ سب سے بڑھ کر یہ بدعقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ ہے وہ حضرت مریم کے پیٹ میں رہ کر حسب دستورِ دنیا میں باہر آیا اور انسانی جامہ پہنا اور تمام بنی آدم کے گناہ اپنے اوپر اٹھا کر لے گیا (چنانچہ یہ مضمون عماد الدین کی ہدایت المسلمین کے صفحہ ۲۷ میں ہے) اور گناہ کی معافی کا سوائے اس مشقت کشی کے اس کو اور کوئی طریقہ نہ ملا۔ آخر پھانسی چڑھا اور ملعون ہوا اور تین دن دوزخ میں رہا اور پھر جی اٹھا اور حواریوں کی بے ایمانی اور بے وفائی پر خفا ہوتا ہوا آسمان پر چڑھ گیا اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر گیا۔ چنانچہ اس عقیدہ کو پادری فنڈر نے اپنی کتاب مفتاح الاسرار میں بڑے تفاخر سے بیان کیا بلکہ اسی پر نجات کا مدار ٹھہرایا ہے۔ اس کو یہ لوگ الوہیتِ مسیح کہتے ہیں۔ ان بیہودہ خیالات کو بھی خدا تعالیٰ نے ان دلائل سے قرآن میں رد کیا کہ جس کو ہر ذی عقل اور صاحبِ فطرتِ سلیمہ بہت جلد قبول کرسکتا ہے قال لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اس آیت کی تفسیر میں آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس خیالِ باطل کو کس طرح سے مٹایا ہے؟ جہاں تک کہ ہم کو اس وقت کے پادریوں کی تصنیفات دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں سے مسئلہ کی دلیل سوائے ان دو باتوں کے اور کچھ نہ معلوم ہوئی۔

(۱) یہ کہ بیٹے کا لفظ حضرت مسیح پر بولا گیا۔ اس کو پادری فنڈر نے مفتاح الاسرار میں کئی ایک ورق میں بڑی فصاحت خرچ کر کے بیان کیا۔ اور بغیر سمجھے بوجھے صوفیہ کرام کے الفاظ احدیت اور وحدت کو بڑی تکلیف دی ہے مگر نتیجہ ندارد۔

(۲) یہ کہ خدا کے افعالِ مختصہ کو اناجیل میں مسیح نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت مسیح خدا یا خدا کا بیٹا بلکہ اکلوتا بیٹا ہے۔

اول بات کا جواب بہت سہل ہے کہ یہ لفظ اور لوگوں[1] پر بھی بولا گیا ہے پس جب وہ بیٹے نہیں تو مسیح میں کیا خصوصیت ہے؟ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا تو آدم بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا ہوئے ہیں۔ خدا قادر ہے جس طرح چاہے پیدا کرے[2] اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ الآیہ۔

دوم باپ بیٹے حقیقی میں مجانست تو ضرور ہے پس اگر عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے اور خدائی میں شریک ہیں تو وہ فصل کیا ہے؟ اور فصل ہے تو مرکب ہیں اور ہر مرکب حادث ہے اور اگر فصل نہیں تو اتحادِ محض ہے پھر باپ کون اور بیٹا کون؟ ایک چیز آپ

[1] انجیل متی باب ۵ ورس ۹ ایضاً باب ۵ ورس ۴۵۔ لوقا باب ۶ ورس ۳۵۔ یوحنا باب ۱۱ ورس ۵۲۔ ان مقامات پر مسیح علیہ السلام کے علاوہ اور لوگوں پر بھی خدا کا بیٹا اطلاق ہوا ہے۔ ۱۲ منہ

[2] یہ تو ہمارے نزدیک ہے ورنہ یہود کے نزدیک بلکہ اکثر نو آموز انگریزوں کے نزدیک اور اس وقت کی نئی روشنی والوں کے نزدیک تو ان کے باپ یوسف بڑھئی ہیں اس لیے وہ اپنے تئیں ابن آدم کہتے تھے۔ علاوہ اس کے اگر خدا یا خدا کے بیٹے تھے تو عبادت کس کی کرتے تھے اور کیا ضرورت تھی اور پھر یہود کے ہاتھ سے صلیب پر ایلی ایلی کہہ کر کیوں چلا کے جان دی۔ واہ اچھے گناہ بخشنے دنیا میں آئے تھے اور بھی لوگوں کو گناہگار کر گئے کیا خدا کو اپنی جان دینی آسان تھی اور گناہ بخشنا محال تھا پھر جب ان کے گناہ اپنے سر پر اٹھائے اور جہنم میں گئے تو ان کے لیے کون شفیع ہوا۔ ۱۲ منہ

ہی باپ ہو اور آپ ہی بیٹا ہو محالِ عقلی ہے۔ پس یہ کلمہ مجازاً اطلاق ہوا ہے۔

دوسری بات کا جواب اس سے زیادہ سہل ہے کہ اول تو یہ کتابیں کہ جن میں یہ انتساب ہے الحاق اور تحریف سے مبرا نہیں۔ پھر کیا اعتبار کیا جائے۔ دوم یہ انتساب مجازاً ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ غلام اور خاص نوکر اپنے آقا کے مال کو اپنا مال کہہ دیا کرتا ہے کمالا یخفی۔ پھر کیا اس سے غلام یا نوکر خود آقا ہوسکتا ہے؟ اصل اس بیہودہ خیال کی محض جہالت اور فرطِ محبت ہے ان پر کیا موقوف ہے۔ صدہا جہلاء جب اپنے بزرگوں کے فضائل بیان کرنے پر آتے ہیں ان کو خدا ہی بنا دیتے ہیں کیا ہنود کچھ مچھ سور وغیرہ کو اوتار نہیں کہتے کہ ان میں خدا اترا تھا اور ان کی شکل میں ہو کے ظاہر ہوا تھا۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا

ازانجملہ یہ کہ روح القدس یعنی جبرئیل ایک اقنوم[1] باپ یعنی خدا ایک اقنوم ابن یعنی بیٹا حضرت عیسیٰ ایک اقنوم ہر ایک اقنوم خدا پھر تینوں مل کر ایک خدا نہ تین خدا' یہ پہلے خیال سے بھی زیادہ لغو اور کفرِ صریح اور محالِ عقلی ہے۔

اس کے ابطال میں علماء نے بہت سے دلائلِ عقلیہ قائم کئے ہیں کہ جن کا جواب آج تک پادریوں سے نہ ہوا نہ ہوگا۔ اور میرے نزدیک تو اس بدیہی البطلان بات پر دلیل کی بھی کچھ حاجت نہیں کیونکہ ہر انسان اپنی فطرت کی وجہ سے یہ جان سکتا ہے کہ یہ تینوں چیزیں اپنے وجود اور تشخص اور خدائی میں مستقل ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو تین خدا ہونے میں کیا حجت ہے پھر ایک کہنا چہ معنی دارد؟ اور اگر نہیں پھر ہر ایک کو خدا کہنا اور ازلی سمجھنا محض لغو ہے۔

دوم ان اجزاءِ غیر مستقلہ سے جو مرکب ہے اس کا کیا نام ہے وہ خدا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دو خدا مستقل پھر بھی ماننے پڑے۔ ایک[2] تو یہ کہ جو مجموعہ مرکب ہے۔ دوسرا باپ جو اس مجموعہ کا جز سویمی ہے۔ اور اگر کہو کہ مجموعہ کا نام اب ہے تو پھر تین اقنوم کہاں۔ بلکہ دو رہیں گے ایک ابن دوسرا روح القدس؟ پادری فنڈر و کرسٹن عماد الدین وغیرہم عیسائیوں نے گرچہ اس خراب عقیدہ کے ثبوت میں (کہ جس پر آج کل انگلستان و فرانس و جرمن وغیرہ بلادِ یورپ کے فلاسفر قہقہے مارتے ہیں) بڑا زور مارا اور بہت سے کاغذ سیاہ کئے مگر محض بے سود۔ اس عقیدہ کو بھی قرآن نے بہت جگہ غلط بتایا اور اس سے سخت ممانعت فرمائی ہے قال تعالیٰ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ الآیہ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الآیہ

[1] اقنوم حصہ یا ٹکڑا جز جو چاہو سو کہو۔ ۱۲ منہ

[2] پولجر اپنی کتاب وقائع پولوس کے باب ۲ میں لکھتے ہیں کہ کری ساسٹن اپنی اس تفسیر میں جو کتاب اعمال پر چوتھی صدی میں لکھی ہے یوں ذکر کرتے ہیں کہ فرقہ نزاری جو ابتدائے مذہب عیسوی میں تھا پولوس کی مکاری اور بے دینی کی وجہ سے اس کے نامجات کو (کہ جس کو آج کل عیسائی کلامِ الٰہی کہتے ہیں) نہیں مانتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ شخص بت پرست اور بڑا قزاق تھا اور مکار اور جھوٹا۔ چنانچہ (اول قرنتیوں ۹ باب ۲۰۔۲۲ اور رومیوں کے ۳ باب ۷و۸ اور فلیپون کے ا باب ۱۸ سے ثابت ہوتا ہے) یروشلم میں آ کر اس امید سے ختنہ کرا کے اور یہودی ظاہر ہو کے ٹھہرا کہ ایک بڑے زاہد کی لڑکی سے شادی کرے کہ جس پر وہ عاشق تھا چونکہ رومی الاصل تھا (جیسا کہ اعمال ۲۲ باب سے ظاہر ہے) اپنی مراد پر نہ پہنچا تو یہودیوں سے جھگڑا برپا کیا اور ختنہ اور یوم السبت کی تعظیم اور بہت سے امورِ دینی میں خلل انداز ہوا اور اپنے آپ کو حواری مشہور کر کے عیسائیوں میں مل گیا اور اس نے اپنی عمر بھر حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا مگر چالاک تھا ایک خواب بیان کر دیا کہ مجھ کو مسیح علیہ السلام نے ظاہر ہو کے یوں کہا انتھی ملخصاً۔ اب ہم بھلا اس پولوس کے کلام کا کیونکر اعتبار کرسکیں اور اس کو رسول کس طرح سے سمجھیں۔ اس کے خطوط کس طرح سے کلامِ الٰہی ہو سکتے ہیں۔ ۱۲ منہ

از انجملہ یہ کہ خدا تعالیٰ بشر کے گناہ معاف کرنے پر قادر نہیں اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سب انبیاء گناہگار چلے آتے تھے اور خدا کو اپنے بندوں کی مغفرت منظور تھی تو سوائے اس کے اور کچھ تدبیر نہ سوجھی کہ دنیا میں بشکلِ عیسیٰ ظاہر ہوا اور سب کے گناہ (یا خاص عیسائیوں کے) سمیٹ کر اپنے اوپر رکھے اور سب کے عوض آپ تین روز جہنم میں رہا اور ملعون ہوا (چنانچہ یہ بات نامہ پولوس اور پادریوں کی کتاب سے اب تک پائی جاتی ہے) اسی عقیدہ کے اعتماد پر پولوس[۱] مقدس جو عیسائیوں کے نزدیک بڑا رسول ہے اپنے اس خط میں جو طرطیس کو لکھا تھا حکم دیتا ہے کہ پاک لوگوں کے لیے سب کچھ پاک ہے پر ناپاک اور بے ایمانوں کے لیے کچھ پاک نہیں۔ علاوہ اس کے اپنے خطوط میں بڑی شد و مد سے شریعت پر عمل کرنے کو حرام کہتا ہے۔ اور شراب پینے اور گناہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی کے فتوے پر عمل کر کے عیسائیوں نے باوجود اس اقرار کے کہ تورات کے احکام ہمیشہ رہیں گے سب شریعت کو بالائے طاق رکھ دیا اور ہر ایک طرح کی بدکاری اور گناہ اور الحاد کو دل کھول کر کے عمل میں لائے۔ اسی لیے یورپ میں ملک کے ملک ایسے بے دین اور ملحد ہو گئے کہ جو خدا اور خدا کی باتوں پر قہقہہ اڑاتے ہیں جن کا اثر ہندوستان میں بھی بپولوس ہند آنریبل سید احمد خانصاحب بہادر کے ذریعہ سے نوجوان انگریزی خوانوں میں پہنچا۔ اور شراب خوری اور زنا نے از حد رواج پایا۔ اس مسئلہ تثلیث اور کفارہ کو نہ تورات نے بیان کیا نہ صراحۃً نہ کنایۃً اناجیل اربعہ نے بیان کیا اور کسی لفظ باپ یا بیٹے وغیرہ سے اس مطلب کو سمجھنا محض خیالِ خام ہے تاویل کو بڑی گنجائش ہے۔ نہ پہلے کسی نبی نے اپنی امت کو تعلیم فرمایا اور کس طرح فرماتے حالانکہ یہ بدیہی البطلان اور صریح الفساد ہے بھلا کوئی دانشمند کہہ سکتا ہے کہ خطا کرے کوئی اور اس کی سزائے پائے کوئی؟ اور یہ کیا خدا کا انصاف ہے بہت جگہ رد کیا ہے۔

از انجملہ یہ ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور یہ بھی فرمایا کہ میری جناب عالی ہے جس طرح میں گناہوں پر مؤاخذہ کرتا ہوں۔ بندہ کی عاجزی اور معافی مانگنے اور گریہ وزاری کرنے سے بخش بھی دیتا ہوں اور کچھ پروا نہیں کرتا۔ میں کم ظرف اور تنگ حوصلہ نہیں ہوں میرے غصہ سے میری رحمت کا دامن فراخ ہے۔ قال تعالیٰ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا وَنَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وغیرہا من الایات یہ بدعت بھی عیسائیوں میں تیسری یا دوسری صدی میں مروج ہوئی تھی کہ جس کا رخ کرنا حکمتِ الٰہی میں ضرور تھا۔[۲]

از انجملہ اس پولوس ذاتِ شریف نے عیسائیوں کی ضد میں عیسائیوں کو برباد کرنے کے لیے ایک اور فتویٰ دیا تھا کہ انسان کی نجات عبادتِ روحانی سے ہوتی ہے اور عبادتِ جسمانی محض ابتدائی حالت میں تھی اب فضول ہے۔

[۱] سور اور شراب جو تورات میں حرام ہے عیسائی اس کو حلال جانتے ہیں۔۱۲ منہ

[۲] بعض ناانصاف عیسائی جو کسی غرضِ دنیاوی سے کرسٹین ہو گئے قرآن مجید پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن نے باوجودیکہ ان کتابوں کی از حد تصدیق کی پھر ان نجات کی باتوں کا اعنی الوہیت وغیرہا کو بڑے زور سے رد کیا اس سے قرآن کا کتاب الٰہی ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ پادری صفدر علی نے نیاز نامہ میں اس بات پر بڑا زور دے کر عیسائیوں میں سرخروئی حاصل کی ہے۔ مگر یہ اعتراض بعینہٖ ایسا اعتراض ہے کہ جیسا کوئی چور قزاق کسی عادل گورنمنٹ میں یہ عیب ثابت کرے کہ وہ چوروں اور قزاقوں کو سزا دیتی ہے اس سے اس کی عدالت میں فرق ہے۔ اور قرآن نے ان کتابوں کی کہ جن میں یہ ناپاک مضامین مذکور ہیں کس جگہ مدح فرمائی ہے ذرا وہ آیت تو بیان کیجیے۔ کیا لوگوں کی وہ تالیفات جو صدہا سال بعد موسیٰ و عیسیٰ کے ہوئی ہے تورات وانجیل ہوسکتی ہیں۔ ۱۲ منہ

اس کی پابندی اچھی نہیں۔ عبادتِ روحانی یا تعلیمِ روحانی کیا ہے؟ یہی بیہودہ خیالات الوہیتِ مسیح و تثلیث کو کفارہ اور عبادتِ جسمانی انبیاء کی شریعت نماز و روزہ' اشیاء کی حلت و حرمت' قربانی و ختنہ وغیرہا احکام۔ پس اس خام خیالی کو یہاں تک ترقی دی کہ تورات کے جملہ احکام کو منسوخ کیا۔ بلکہ ملیامیٹ کر دیا اور اس پر لطف یہ کہ عدمِ نسخِ احکامِ تورات کا دعویٰ۔ الغرض سب کو سانڈ بنا دیا جس طرح تکیوں میں بھنگڑ بھنگ گھونٹتے جاتے اور لگے رگڑا مٹے جھگڑا کہتے جاتے ہیں پھر ان کے پیر و مرشد سائیں سونٹے شاہ یا مدار بخش سائیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ داتا عاشقوں کی عبادت اور نماز روزہ تو عبادتِ روحانی ہے یعنی یہ سرور اور اس کی یاد میں مست رہنا باقی سب جھگڑے ہیں اسی طرح عیسائی بھی انہیں دو تین کفر کی باتوں کو تعلیمِ روحانی اور پہلی شریعتوں کی تکمیل اور سب کا عطر کہتے ہیں باقی سب ہیچ۔ غالباً دنیا میں عیسائی مذہب پھیلنے کا سبب یہی آزادی ہے ورنہ مذہب کی خوبی تو معلوم۔ اس بیہودہ خیال کے بطلان پر بھی دلائل لانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ شریعت کے احکام دو قسم کے ہیں نظری یعنی اعتقادیات جیسا کہ خدا کو وحدہ لاشریک جاننا اور اس کو بجمیع صفاتہٖ ازلی و ابدی و رحیم و کریم اعتقاد کرنا' رسولوں کو برحق سمجھنا' فرشتوں کو اور خدا کی بھیجی ہوئی کتابوں کو قیامت کے دن کو اور اس کے حساب و کتاب کو حق سمجھنا۔

دوم عملیات ان کی پھر دو قسم ہیں عبادات اور معاملات' عبادات جانی اور مالی۔ جانی جیسا کہ نماز پڑھنا نجاستِ ظاہری دور کر کے اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر اس کی ثناء و صفت کرنا' اس کے آگے جھکنا اور اس کے آگے سجدہ کرنا اور نہایت درجہ کا اس کے آگے عجز و نیاز کرنا۔ اب یہ جسم کی پاکی اور اس کے آگے جھکنا کھڑا ہونا اس نیازِ روحانی کی صورت ہے کہ جو اس ہیئت اور طریقے پر اچھی طرح سے پایا جاتا ہے نہ کہ مقصودِ اصلی اور مالی جیسا کہ زکوٰۃ دینا' صدقہ دینا۔ اس میں بھی اپنے دل کی محبوب چیز کو دے کر اور بنی آدم کی حاجت براری کر کے تقربِ روحانی پیدا کرنا ہے اور پہلی قسم تو سراسر تعلیمِ روحانی ہے اس میں جسم کو کچھ دخل ہی نہیں۔ اب رہے معاملات کسی پر ظلم نہ کرنا وغیرہ۔ سو یہ بھی سراسر حکمت ہے اور زیادہ تشریح اس کی ہم آگے بیان کریں گے۔ پس اس پر اعتراض کرنا میاں پولوس صاحب کی خوش فہمی اور اس پر ہٹ کرنا عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے۔ اگر یہ تعلیم عیب ہے تو پھر نبی کی کیا ضرورت ہے؟ کیا معجزہ ہی دکھانا مقصود ہے کہ جس کو مخالف نظر بندی اور کیا کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس عقیدہ کو بھی خدا تعالیٰ نے رد کیا کہ رسول کی معرفت جو کچھ احکامِ الٰہی ہوتے ہیں وہ عین حکمت ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کچھ فائدہ ہے تو بندے کا اور ترک سے نقصان ہے تو انہیں کا۔ جس طرح کہ کوئی طبیب سم کھانے سے منع کرے۔ فقط اس قدر فرق ہے کہ سم کا اثر جسم پر ہوتا ہے اور نبی طبیبِ روحانی ہے اس کے اوامر و نواہی کا اثر روح پر پہنچتا ہے جو لوگ اس نکتہ سے واقف نہیں جیسا کہ پادری صفدر علی وغیرہ تو وہ عجب کج بحثی کرتے ہیں کہ جس کو کوئی عاقل پسند نہیں کرتا قال تعالیٰ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ الآیہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ الآیہ۔ علاوہ اس کے جب کوئی امرِ تشریعی ہی باقی نہ رہا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی چیز حلال و حرام رہی نہ فرض واجب تو عیسائیوں سے کوئی پوچھے:

(۱) یہ کہ اب گناہ کس فعل کے کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہے؟ پس گناہ کا وجود ہی نہ رہا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الوہیتِ مسیح و تثلیث و کفارہ پر ایمان انسان جو چاہے سو کرے اس کے لیے کوئی امرِ گناہ نہیں۔

فصل پنجم

علوم قرآن

قرآن مجید میں بیشمار وہ علوم ہیں کہ جن کی طرف بندوں کو سخت حاجت ہے اور جن بغیر نصابِ رسالت تمام ہی نہیں ہو سکتا ان میں سے یہ پانچ علم کثرت سے بیان کئے گئے ہیں:

(۱) علم المخاصمہ یعنی گمراہوں کے عقائدِ باطلہ کا رد جس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے۔ علمِ کلام کی بنیاد انہیں آیات اور اسی علم پر ہے۔

(۲) علم التذکیر بآلاء اللہ یعنی آسمانوں اور زمین اور جملہ مخلوقات کی پیدائش کا بیان اور زمین و آسمان اور رات دن میں جو کچھ عجائبِ مخلوقات ہیں کہ جو اس کی ذات و صفات کے ثبوت کے لیے آیاتِ بینات اور علامات ہیں ان کا ذکر۔ بالخصوص ان چیزوں کا کہ جو انسان کے مادۂ منی سے پیدا ہونے اور پھر ہوش و حواس پا کر مدرک کلیات و جزئیات ہو جانے اور آسمان سے بارش ہونے اور اس کی وجہ سے زمین سے نباتات وغیرہا انسان کے کار آمد چیزیں پیدا ہونے اور ہواؤں کے ایک طرزِ خاص پر چلنے اور آفتاب و ماہتاب کی چالِ معین پر چلنے سے متعلق ہیں کہ جن سے تمام عالم کا انتظام اور تدبیر وابستہ ہے۔ اور اس بات کا بیان کہ خدا نے بندوں کو وہ چیزیں الہام کیں جو ان کو دنیا و آخرت میں کار آمد اور مناسب ہیں۔ اور اپنی صفاتِ کاملہ کا ثبوت اور نقص و عیوب سے تنزیہ اور تدبیر المنزل و سیاستِ مدن و تہذیبِ اخلاق کو بھی نہایت خوبی سے بیان فرمایا یہ علم التذکیر بھی ایک مفہومِ کلی ہے جس کی بیشمار افراد ہیں یا ایک دریائے بیکنار ہے کہ جس کے صدہا نہریں اور نالے ہیں اگر بطور نمونہ کے اس علم کی ہر صنف پر ایک ایک آیت بھی پیش کروں تو یہ تمام مقدمہ اس کو کافی نہ ہو۔ جو ایک بڑا حکیم یا فلاسفر دلائلِ فلسفیہ سے خدا کی ذات و صفات و حدوثِ عالم وغیرہ امور کو نہایت عمدہ طرح سے ثابت کر سکتا ہے اس سے بھی بڑھ کر قرآن مجید نے ان امور کو ثابت کر دیا اور ایسے کھلے کھلے وجوہ اور دلائل بیان کئے جن کو ہر عالم و جاہل بدوی و شہری پڑھا اور ان پڑھا برابر سمجھتا ہے۔[1] یہ بات طاقتِ بشریہ سے باہر ہے۔ منجملہ وجوہ اعجازِ قرآن کے ایک یہ بھی ہے۔ دیکھئے اکثر سورتوں میں مکرر سہ کرر نئے نئے عنوان سے ذاتِ مبدءِ حق سبحانہ کا اس طرح سے اجمالاً ثبوت کیا کہ جس کو اپنی قوتِ فطریہ اور نورِ جبلی کی وجہ سے بغیر علمِ کلام پڑھے اور بدونِ حکمتِ الٰہیہ کے ممارست کئے ہر شخص سلیم الطبع یقین کر سکتا ہے فقال:

وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا الآیۃ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ الآیۃ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ الآیۃ اپنی صفات کے ثبوت میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

[1] اس لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔

وَقَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ آسمان و زمین اور ان کی درمیانی چیزوں کے پیدا کرنے کی بابت فرمایا ہے قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ الآیۃ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ الآیات۔ چونکہ کنہٗ حقیقتِ باری تعالیٰ کا معلوم کرنا اور اس کی صفات سے کماحقہ مطلع ہونا بندوں کی طاقت سے باہر تھا اور بغیر علمِ ذات و صفات نہ تو بندوں کے نفوس مہذب ہو سکتے تھے نہ نبوت بری الذمہ ہو سکتی تھی، نہ کتابِ الٰہی اپنے اصلی مقصد کو پورا کر سکتی تھی اس لیے علم بالوجہ پر بس کیا اور صفات میں ان صفات پر مدار کہا کہ جو بندوں کے نزدیک قابلِ مدح ہیں اور جن کو وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جیسا کہ رحیم و کریم و سمیع و علیم وحی و بصیر و متکلم و مرید ہونا اور عرش پر قائم ہونا اور ہاتھ اور منہ ہونا وغیر ذلک۔ لیکن انسان کی جبلی بات ہے کہ خواہ شے کسی ادنیٰ مناسبت سے کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان کیوں نہ کی جائے اور خاص استعارہ کیوں نہ مقصود ہو مگر یہ حضرت اپنی قوتِ وہمیہ کی وجہ سے اس کو پورا پورا مشبہ بہ ہی سمجھ بیٹھتا ہے اور سب احکام اس کے اوپر جاری کر دیتا ہے۔ اس لیے بعض نے یہ سمجھ لیا کہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی دو آنکھیں اور دو کان اور مضغۂ گوشت زبان اسی طرح ہے کہ جس طرح ہمارے لیے ہے اور اپنے عرش پر بھی اسی طرح بیٹھا ہے کہ جس طرح دنیا میں بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتے ہیں وغیر ذلک من التشبیہات۔ (اور احادیثِ صحیحہ میں بھی چونکہ اسی اصل غرضِ قرآن کو اسی عنوان سے بیان کیا ہے تو اس سے اور بھی خیال میں تشبیہات دلنشین ہو گئیں، لیکن یہ خیالات بالکل خلافِ واقع ہیں کیونکہ یہ وہی تشبیہ تو ہے کہ جس کے یہود قائل تھے۔ علاوہ اس کے خدا کا حادث ہونا اور مجسم ہونا اور دو کان ہونا وغیرہ وعیوب بھی اس میں ثابت ہوتے ہیں کہ جو اس کی ذاتِ مقدس اور الوہیت کے منافی ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں اس مرض کی دوا بھی نازل فرمائی۔ اور ان اوہام کو یہ فرما کے رد کر دیا لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ تا کہ صفات اور ممکنات اور اوصافِ بشریہ سے اس کو بری اعتقاد کیا جائے اور اس کو مجسم ہونے اور بشر یا کسی اور چیز کی صورت میں ظاہر ہونے اور مکان و زمان و مایلزمہما سے صدہا منازل دور اور بالکل نفور سمجھا جائے وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ

(۳) علم التذکیر بایام اللہ یعنی ان واقعات اور حوادثات کا بیان کرنا کہ جن میں خدا تعالیٰ کے فرمانبردار اور نیک بندوں کی خوبیاں اور ان پر انعامِ الٰہی مذکور ہوں اور نافرمان اور سرکشوں کے ساتھ جو کچھ دنیا میں پیش آیا اور جو کچھ آخرت میں آئے گا اس کا بیان ہو۔ اس سے بھی انسان کو ایک عبرت اور نصیحت ہوتی ہے۔ پس جب کہ مقصود یہ تھا تو قرآن میں سابقین کے قصص بیان کرنے میں ان چند امورِ ضروریہ کی رعایت کی گئی۔

(۱) یہ کہ قصہ کو تاریخ کے طور پر من اولہا الی آخرہا بترتیبِ وقوع نہ بیان کیا جیسا کہ پانچوں توریت اور چاروں انجیلوں اور کتاب التاریخ و کتاب السلاطین وغیرہ کتبِ بائبل کے مصنفوں نے کیا ہے یا جس طرح اور تمام اہلِ تاریخ اور روزنامچہ نویس کرتے ہیں کیونکہ اس سے مقصدِ اصلی جو عبرت اور نصیحت ہے فوت ہو جاتا ہے۔ کس لیے کہ ایسے بہت کم قصے ہیں کہ جن میں اول سے لے کر آخر تک عبرت ہو بلکہ بہت اور باتیں خارج مبحث بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ایسا قصہ ہو تو اس کو بتمامہا بیان کرنا کچھ مضائقہ نہیں جیسا[1] کہ یوسف علیہ السلام کا قصہ۔ یہ تاریخ گوئی مؤرخین کی شان ہے نہ کہ رب العالمین کی۔

[1] کہاں ہے وہ خفیہ کرسٹان جو مفسر پر سورہ یوسف کے غیر الہامی ہونے کا اس بیان سے الزام لگا کر اس تفسیر شریف کو عام مسلمانوں کے نزدیک غیر قابل اعتبار بنایا چاہتا ہے۔ ۱۲ منہ حقانی

(۲) مخاطبین کے نزدیک وہ قصے بیان کئے کہ جن سے ان کے کان آشنا تھے۔ جیسا کہ اجمالاً عاد و ثمود اور نوح علیہ السلام کا قصہ کیونکہ ان کو عرب اپنے آباء و اجداد سے سنتے چلے آتے تھے اور جیسا کہ حضرت ابراہیم و انبیاءِ بنی اسرائیل علیہم السلام و ذی القرنین وغیرہ کا قصہ کیونکہ اہلِ کتاب کے میل جول سے عرب ان قصوں کو جانتے تھے بخلاف ایران و ہند وغیرہما بلاد کے قصص کیونکہ ان کے سننے سے بجائے عبرت کے ان لوگوں کو حیرت ہوتی۔

(۳) ان قصوں کو کہ جن سے زیادہ عبرت و نصیحت مقصود ہے ان جہلاء کے مقابلہ میں مختصراً ایک ہی جگہ ذکر نہ کیا بلکہ الگ الگ اسلوب سے مکرر سہ کرر سورتوں میں بیان کیا تا کہ خوب طرح سے ذہن نشین ہو جائیں۔ اور ان واقعات کی تصویر ان کے روبرو ہر وقت کھڑی رہے۔ پس وہ قصص یہ ہیں: قصہ آدم علیہ السلام کے زمین پر پیدا ہونے اور ملائکہ کے سجدہ کرنے اور شیطان کی نافرمانی کا قصہ' مخاصمہ ٔ نوح' و ہود و صالح' و ابراہیم' و لوط' و شعیب علیہم السلام اور ان کی اقوام کا قصہ اس بیان میں کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم کی۔ اور نیکی کی باتیں تعلیم فرمائیں اور وہ لوگ شبہاتِ ضعیفہ سے پیش آئے۔ پھر خدا نے ان کے شبہات کا جواب دیا اور ان سرکشوں کو عذاب دیا اور اپنے انبیاء کی مدد فرمائی۔ اور قصہ ٔ موسیٰ علیہ السلام کا جو فرعون سے اور بنی اسرائیل کے نافرمانوں سے پیش آیا اور جو کچھ معاملہ چالیس برس کے اندر ان منزلوں میں پیش آیا جو مصر کے درمیان ہیں اجمالی طور پر۔ اور قصہ ٔ خلافتِ داؤد و سلیمان علیہما السلام اور ان کی آیات و کرامات اور قصہ مصیبتِ ایوب و یونس اور قبول کرنا دعا زکریا علیہم السلام کا۔ اور قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کہ بوقتِ تولد جو کچھ معجزات و کرامات ان سے ظہور میں آئے۔ اور جو قصہ کہ صرف ایک بار یا دو بار قرآن میں مذکور ہوئے یہ ہیں۔ حضرت ادریس کا آسمان پر جانا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ کرنا۔ جانوروں کو زندہ ہوتے دیکھنا۔ اپنے فرزند اسمعیل کو قربانی کرنا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا۔ اور دریاءِ نیل میں ڈالے جانے کا۔ پھر فرعون کے گھر میں پرورش پانے کا۔ اور قبطی کو مکا مارنے کا اور مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف جانے کا۔ اور وہاں نکاح کرنے اور مصر کی طرف لوٹتے وقت رستہ میں آگ کا شعلہ درخت پر دیکھنے اور اس سے کلام سننے کا بیان اور بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنے اور موسیٰ اور خضر کے باہم ملاقات کرنے کا قصہ اور قصہ طالوت اور جالوت کا اور قصہ ذی القرنین اور اصحابِ کہف کا اور قصہ ان دو شخصوں کا کہ جن کا باہم مناظرہ ہوا تھا۔ اور قصہ باغ والوں کا اور قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تینوں حواریوں کا جو شہر انطاکیہ میں منادی کرنے گئے تھے۔ اور قصہ اس مومن کا (حبیب نجار) جس کو کفار نے شہید کر ڈالا تھا اور قصہ اصحاب الاخدود کا جو سورۂ بروج میں اشارتاً مذکور ہے۔ اور قصہ اصحابِ فیل کا۔ اور قصہ بیت المقدس پر دوبارہ چڑھائی ہونی۔ اور قصہ حضرت عزیر علیہ السلام کا اس کی بربادی پر تعجب کرنے اور پھر سو برس تک مردہ ہو کر زندہ ہو جانے کا۔ ان قصوں سے صرف مقصد یہ ہے کہ ان کو سن کر دل میں شرک اور معاصی کی برائی بیٹھے اور خدا کے عذاب سے خوف پیدا ہو۔ اور مخلصین کو اس کی عنایت اور مدد پر بھروسا ہو جائے جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں۔ اس مقام پر یہ چند امور ملحوظ رکھنے چاہییں:

(۱) یہ کہ ان قصص کے مکرر آنے کا علاوہ اس سبب کے جو پہلے بیان ہوا ایک[۱] اور بھی سبب ہے وہ یہ کہ آپ تو معلوم کر

[۱] بنی اسرائیل کے وہ واقعات کہ جن پر بجز کامل نظر کے اور کوئی واقف نہیں ہو سکتا قرآن نے انہیں کو بار بار بیان فرمایا اور اختلاف نہ ہونے دیا برخلاف کتبِ بائبل کے کہ ان میں باہم بڑا اختلاف ہے توریت اور کتاب تاریخ اور جبرئیل کی کتابوں کو یا خود چاروں انجیلوں کو ایک معاملہ میں مقابلہ کر کے دیکھو پھر جو شخص بظاہر امی ہو اور کتبِ قدیمہ اس کے پاس نہ ہوں پھر بار بار بیان فرمائے اور غلطی سے محفوظ رہے۔ اگر یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ۱۲ منہ

ہی چکے ہیں کہ ان قصص سے مقصود وعظ و پند ہے پس کبھی ایک شخص کا واقعہ چند امور قابلِ عبرت کو متضمن ہوتا ہے اس کو ایک بار پورا بیان کرنے سے غرض متکلم کی جو ان امور پر تنبیہ کرنا ہے' حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے ان اغراض کے لیے بار بار ربط دینے کے لیے وہ قصہ بیان کیا جاتا ہے جس طرح دہلی کے غدر کا قصہ جو صدہا عبرت کو متضمن ہے ہر عبرت کے لیے اس کو ذکر کیا جائے۔ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن میں بہت بار وارد ہوا ہے پھر اس سے کم اور قصے۔

(۲) باوجود اس تکرار اور بار بار آنے کے ہر قصہ اپنے اپنے موقع پر ایک نیا لطف دیتا ہے۔ اس خوبی سے اس قصہ کا دوبارہ اعادہ کیا ہے کہ گویا یہ قصہ پہلے مذکور ہی نہ ہوا تھا۔ اس کے سننے کو ابتدائی قصہ کی طرح کان مشتاق رہتے ہیں۔ یہ بات بھی قرآن کی فصاحت و بلاغت کے لیے بڑی برہانِ قوی ہے ورنہ کیسا ہی کوئی بلیغ کیوں نہ ہو اس کے کلام کو تکرار بے لطف کر ڈالتا ہے (کیوں نہ ہو قرآن معجزہ ہے یہ اسی کا کام ہے)۔

(۳) خدا پاک چونکہ بندوں کے محاورے میں کلام کرتا ہے تو اپنے کلام میں ضرور ان باتوں کی رعایت رکھتا ہے کہ جس کی بندے رکھتے ہیں۔ پس اس لیے کہیں لفظ لَعَلَّ بول جاتا ہے کہ جس کو بلغاء امرِ مظنون میں بولتے ہیں اور کہیں لِیَعْلَمَ اللّٰہُ فرما دیتا ہے کہ جس کو بلغاء اپنے محاورہ میں وہاں بولتے ہیں کہ جہاں ان کو پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ اور کہیں جبکہ بلغاء شک کا کلمہ بولتے ہیں وہاں وہی کلمہ ارشاد فرماتا ہے جیسا یونس علیہ السلام کے قصہ میں مِاَۃَ اَلْفٍ اَوْیَزِیْدُوْنَ کہ وہ لوگ لاکھ کہتے تھے یا زیادہ خدا کو ان کی تعداد میں کوئی شک یا تردد نہ تھا مگر ایسے موقع پر بلغاء یوں ہی بولتے ہیں۔ پس جو مفسر اس نکتہ سے واقف نہیں وہ تکلف کر کے تاویلات کی مشقت میں پڑتے ہیں اور عماد الدین وغیرہ ناواقف لوگ تو اس کو قرآن پر اعتراض جمانے کا اچھا موقع جانتے ہیں۔

(۴) یہ کہ بعض اوقات خدا تعالیٰ جنسِ انسان کی ایک جبلی عادت بیان کرتا ہے کہ انسان کی عادت یوں ہے کہ جب اس کے اوپر سختی ہوتی تو خدا کو یاد کرتا اور اس سے بڑی گریہ وزاری کے ساتھ سوال کرتا ہے اور جب فراغ دستی اور حصولِ مراد کا وقت آتا ہے تو اپنی شیطانی باتوں کی طرف آ جاتا اور علتِ حقیقی کو چھوڑ کر اسبابِ ظاہری کی طرف یا اپنے خیالی معبودوں کی طرف اس نعمت کو منسوب کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرماتا ہے ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا الآیہ ''کہ خدا نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا اور زوجہ بھی اسی سے بنائی۔'' اب آگے خدا تعالیٰ جنس زوج و زوجہ کا جبلی حال بیان فرماتا ہے کہ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے تو دونوں میاں بیوی خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اچھا بچہ عنایت کیا تو ہم تیری شکر گزاری کیا کریں گے۔ پس جب ان کی مراد کے موافق دیا تو غیر کی طرف رجوع ہوئے اور شریک بنانے لگے بعض مفسرین جو اس نکتہ سے واقف نہیں انہوں نے بجائے جنس زوج اور زوجہ کے خاص حضرت آدم اور حواء کی طرف بقرینہ نفسِ واحدۃ ضمیر پھرائی اور پھر ان محدثین نے کہ جن کے اختیار میں اسناد ہے وہ اسناد کے تابع نہیں اس کی تائید میں عبدالحارث[۱] اور شیطان کا ایک قصہ روایت کر دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی شانِ نبوت کی طرف کچھ خیال نہ کیا۔ مخالفین

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ محدثین نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔ اور نیز یُشْرِکُوْنَ میں جو صیغہ جمع ہے اس بات کی صاف تصریح ہے کہ آدم علیہ السلام اور حواء مراد نہیں بلکہ نوع انسانی۔ ۱۲ منہ

اندرمن مراد آبادی وغیرہم کو انبیاء علیہم السلام کی جناب میں گستاخی کرنے اور شرک کی تہمت لگانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ مگر ایسی بے بنیاد باتوں کے اعتماد پر اعتراض کرنا اپنی کم استعدادی اور ناانصافی کو ظاہر کرنا ہے ایسی باتوں سے انبیاء علیہم السلام پر کوئی عیب ثابت نہیں ہوتا (واضح ہو) کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمعصر اہلِ کتاب کو تو ان قصص کی بابت سوائے تسلیم کے اور کچھ بن نہ پڑا اور کسی نے کبھی آ کر یہ نہ کہا کہ یہ قصے جو قرآن میں ہیں یا فلاں شخص کا تذکرہ جو قرآن نے بیان کیا ہے خلافِ واقع ہے یا وہ ہماری کتابوں میں نہیں۔ مگر اس زمانہ میں پادریوں نے دھوکا میں ڈالنے کے لیے عجب غوغا مچایا کہ یہ قصص محض سن کر غیر محققانہ طور پر قرآن میں محمد (ﷺ) نے ذکر کر دیے ہیں چنانچہ پادری فنڈر میزان الحق کے ۳ باب کی ۴ فصل میں لکھتے ہیں:

قولہ اب ان سہو اور بھول چوک سے جو اس امر میں قرآن کے درمیان پائی جاتی ہیں کئی ایک بطریق نمونہ کے ہم یہاں ذکر کریں گے مثلاً وہ جو سورۂ بقر کے اوائل میں ہے کہ فرشتوں نے الخ اس مقام پر پوادر بھی مختلف اللسان ہیں بعض اعتراضات کو بعض پوادر خود ہی رد کرتے ہیں چنانچہ دینِ حق کی تحقیق کا مصنف صفحہ ۱۰۴ میں اور اسی طرح نیاز نامہ کے مصنف نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کی بابت اعتراض کیا ہے کہ یہ بالکل کتابِ مقدس کے خلاف ہے۔ پھر اسی کی بابت ان دونوں کا قبلہ گاہ فنڈر صاحب میزان الحق کے صفحہ ۲۰۹ میں یوں کہتا ہے قولہ اور یوسف کی گزارشات جو سُورۂ یوسف میں ہیں موسیٰ کی پہلی کتاب ۳۷ و ۳۹ سے ۴۷ باب تک صحیح صحیح مندرج ہیں انتہٰی۔ پس معلوم ہوا کہ بعض پوادر تو بے تک ہانکتے ہیں۔

اور اب ہم پادری فنڈر کے اختلاف کا نقشہ لکھ کر جواب دیتے ہیں:

نمبر	مضامین قرآن	مخالفت باکتبِ مقدسہ	جوابِ تفصیلی
۱	فرشتوں کا آدم کو سجدہ بحکمِ الٰہی کرنا اور ابلیس کا انکار کرنا اور فرشتوں کا مباحثہ کرنا	یہ تورات کے خلاف ہے خدا نے ایسا حکم نہیں دیا اور ابلیس اس عالم سے پیشتر نافرمانی کر کے شیطان ہو چکا تھا۔ سید احمد خاں بھی اس امر میں ہمارے مقلد ہیں۔	تورات میں کہیں نہیں کہ خدا نے حکم سجدہ کا نہیں دیا اور عدمِ ذکر عدمِ حکم کو مستلزم نہیں ورنہ صدہا چیز تورات میں مذکور نہیں عبرانیوں کے باب ۳ میں ہے جب پہلوٹھے کو دنیا میں لایا تو کہا کہ خدا کے سب فرشتے اسے سجدہ کریں۔
۲	سورۂ عنکبوت میں ہے کہ بوقتِ طوفانِ نوح نو سو پچاس برس کے تھے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْہِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا فَاَخَذَہُمُ الطُّوْفَانُ وَہُمْ ظَالِمُوْنَ۔	حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کی پہلی کتاب کے ۷ باب آیت ۱۱ میں ہے کہ جب طوفان آیا نوح علیہ السلام چھ سو برس کا تھا اور ۹ باب کے ۲۸ آیت میں ہے کہ بعد طوفانِ نوح تین سو پچاس برس تک زندہ رہا پس نوح کی کل عمر نو سو پچاس برس کی تھی۔	اس آیت میں یہ کہیں نہیں کہ فلاں عمر میں طوفان آیا اور بعد طوفان کے اس قدر عمر تک زندہ رہے بلکہ مجملاً نو سو پچاس برس رہنا ثابت ہے کہ جس کو خصم بھی تسلیم کرتا ہے۔ پس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ نوح علیہ السلام نو سو پچاس برس تک زندہ رہے۔ اور ان کی قوم نے نہ مانا تو طوفان آیا۔
۳	سورۂ ہود کے اوائل میں ہے کہ نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے نے کشتی میں بیٹھنے سے انکار کیا سو وہ طوفان میں ڈوب مرا۔	لیکن موسیٰ علیہ السلام کی پہلی کتاب کے ۸، ۹ باب میں صاف لکھا ہے کہ نوح کے سب بیٹے کشتی میں تھے اور سب نے طوفان سے نجات پائی۔	پادری[1] صاحب نے چونکہ قرآن کو نہیں سمجھا اس لیے اعتراض کیا اس بیٹے کو تو قرآن نے اولاد ہی سے خارج کر دیا لَیْسَ مِنْ اَہْلِکَ فرما دیا۔ پس اب اس کل اولاد کے شمار میں جو کہ ایماندار تھے اس کا ذکر تورات میں نہ ہونا اور قرآن میں ہونا کوئی مخالفت نہیں۔

[1] پادری صفدر علی نیاز نامہ میں لکھتا ہے کہ قرآن و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح کا بیٹا کنعان تھا وہ اور اس کی والدہ کشتی میں داخل نہ ہوئے۔ ←

۴	سورۂ یوسف میں ہے کہ یوسف نے گویا اپنے مالک کی جورو کی خواہش کی تھی جیسا کہ مذکور ہے۔	مگر موسیٰ کی پہلی کتاب کے ۳۹ باب میں کھلا کھلی بیان ہوا ہے کہ یوسف نے بالکل انکار کیا اور بری فکر کو دل میں جگہ بھی نہ دی۔	اس کتاب کی فقط یہ عبارت ہے ۱۰۔ اور ہر چند یوسف کو روز روز کہتی رہی پر اس نے اس کی ایک نہ سنی کہ اس کے ساتھ سوئے یا اس کے ساتھ رہے انتہٰی۔ اس سے یہ کہاں نکلا کہ بری فکر کو دل میں جگہ بھی نہ دی دوم قرآن سے بھی بدارادہ کرنا ثابت نہیں کیونکہ ہَمَّ بِھَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰی بُرْھَانٌ الخ جزا ہے یعنی اگر خدا کی دلیل نہ دیکھتا تو یوسف قصد ہی کر چکا تھا۔
۵	سورۂ قصص کے اوائل میں ہے کہ فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کو بجائے فرزند پرورش کیا۔	مگر موسیٰ کی دوسری کتاب کے دوسرے باب میں ہے کہ فرعون کی بیٹی نے موسیٰ کو پرورش کر کے بجائے فرزند رکھا تھا۔	قرآن سے صرف اس قدر بات ثابت ہے کہ فرعون کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ اس کو قتل نہ کرو شاید ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بیٹا بنا دیں۔ اب عام ہے کہ خاص بیٹی نے موسیٰ کو بیٹا بنا کے رکھا یا اس کی ماں فرعون کی بیوی نے۔ اگر بیٹا ہی بنایا ہو تو اس کی ماں بھی اس کو بیٹا کہہ سکتی ہے اور اسی لیے نَتَّخِذَ کہا اِتَّخَذَ نہ کہا چونکہ پادری قرآن کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے اعتراض کیا۔
۶	سورۂ مریم کے شروع میں مذکور ہے کہ مریم علیہا السلام ایک دور دراز جگہ چلی گئی تھی اور یسوع درختِ خرما کے تلے پیدا ہوا تھا۔	لیکن انجیل لوقا کے دوسرے باب میں مذکور ہے کہ مسیح بیت اللحم میں اصطبل کے اندر پیدا ہوا اور بیت اللحم ملک یہودیہ میں مریم کے باپ کا شہر تھا۔	مکانًا قَصِیًّا کے معنی پادری دور دراز سمجھ گئے جس پر اس قدر چونکے کاش کسی قدر عربی پڑھ لیتے تب کتاب لکھنے بیٹھتے اس کے معنی گوشہ ہے یعنی دردِ زہ کے وقت ایک گوشہ میں چلی گئی عام ہے کہ وہ اصطبل تھا یا کچھ اور۔ اصطبل میں خرمہ کا درخت کچھ محالات سے نہیں۔ اب دونوں میں کچھ مخالفت نہیں رہی۔

ایک اور اعتراض پادریوں نے کیا ہے کہ قرآن میں ایسے بھی بہت سے قصے ہیں کہ جو محض جھوٹ اور بے اصل ہیں منجملہ ان کے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ کہ انہوں نے اپنے باپ کے بت توڑ ڈالے اور اس کی قوم نے اس کو آگ میں ڈالا۔ اور یہ کہ داؤد کے ساتھ پہاڑ اور پرند تسبیح کرتے تھے اور یہ کہ سلیمان علیہ السلام کے جنات تابع تھے اور یہ کہ چیونٹی نے سلیمان علیہ السلام سے گفتگو کی اور یہ کہ سلیمان علیہ السلام کے مرنے کے بعد جنات نے سلیمان علیہ السلام کو زندہ سمجھ کر فریب کھایا اور یہ کہ سبا کی شہزادی بلقیس ان کے پاس آئی اور اس کا تخت طلب کیا گیا اور یہ کہ سلیمان علیہ السلام[1] تمام جہان کا بادشاہ تھا اور حیوانوں کی بولیاں بھی سمجھتا تھا اور یہ کہ سلیمان کے ہوا تابع تھی ہوا پر تخت اڑتا تھا اور یہ کہ سکندر[2] رومی نے سورج کو دلدل کی ندی میں ڈوبتے پایا اور اس نے

← الخ پادری صاحب وہ کونسی آیت قرآن کی ہے کہ جس میں کنعان نام لکھا ہے اور جس میں اس کی والدہ کا غرق ہونا مذکور ہے۔ اس جھوٹ یا جہالت کا کیا ٹھکانا ہے؟

[1] یہ نیاز نامہ کے مصنف کا اعتراض ہے اس کا یہی جواب بس ہے کہ تم نے قرآن نہیں پڑھا اس میں یہ بات کہیں نہیں۔ ۱۲ منہ

[2] یہ اعتراض دینِ حق کی تحقیق میں ہے اس کے مصنف بھی علومِ اسلام سے بے بہرہ ہیں کیونکہ سکندر رومی کا قصہ کسی جگہ بھی قرآن بلکہ احادیث میں بھی نہیں نہ کوئی اس کو نبی کہتا ہے اور دلدل کی ندی میں آفتاب ڈوبنے کو بھی نہیں سمجھتے کیونکہ مراد یہ ہے کہ ایک صاف میدان میں ذوالقرنین پہنچے ←

پیتل اور لوہے کی بڑی بڑی دیواریں یاجوج و ماجوج کے بند کرنے کو بنائیں اور محمد صاحب (ﷺ)[۱] باوجودیکہ وہ بت پرست تھا اس کو نبی کہتے ہیں اور یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ہنڈولے میں باتیں کیں اور لڑکپن میں اس سے معجزات ظاہر ہوئے اور مٹی کے جانور بنا کے اڑائے اور خضر اور موسیٰ علیہما السلام کی ملاقات اور اصحابِ کہف اور رقیم کا قصہ جو سورۂ کہف میں ہے۔ انتہیٰ ملخصًا۔

اقول جواب سے پیشتر دو بات عرض کئے دیتا ہوں تا کہ منصف مزاج عیسائی انہیں پر بس کریں۔

(۱) یہ کہ ان امور کا بے اصل اور جھوٹ کہنا جب وقعت رکھتا کہ اہلِ کتاب کے پاس کل کتابیں سماوی ہوتیں اور پھر تمام جہاں کے واقعات اور سرگزشت ان میں موجود ہونے کا دعویٰ بھی ہوتا۔ پس جب ان میں یہ واقعات نہ ہوتے تو ان کو جھوٹ کہتے لیکن یہ دونوں باتیں اہلِ کتاب کے نزدیک بھی نہیں اول تو یوں نہیں کہ خود بائبل میں بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی تورات وغیرہا کتابوں میں ایسی کتابوں کے حوالے ہیں کہ جن کا مجموعہ پندرہ کتابیں ہیں اور وہ[۲] اب مفقود ہیں اول جنگنامہ جس کا حوالہ سفر عدد کے ۲۱ باب میں ہے۔ دوم کتاب الیاشر کہ جس میں ایسا بڑا محال حوالہ[۳] ہے کہ جس کو کوئی ذی عقل بھی نہیں مانتا۔ کہ آفتاب کھڑا رہا اور مہتاب ٹھہر گیا اور قریب دن بھر کے پچھّم کی طرف مائل نہ ہوا انتہیٰ۔ سوم کتاب یاہو چہارم کتاب سمیعا کی پانچویں کتاب وغیر ذلک کما لا یخفٰی اور دوسری بات کا تو کوئی صاحبِ عقل بھی اقرار نہیں کر سکتا اور کیونکر کر سکتا ہے حالانکہ ہندو چین بلکہ خاص انہیں ملکوں کے ہزار ہا صحیح واقعات کتبِ سماویہ میں درج نہیں ہوئے۔

(۲) یہ کہ بایں ہمہ یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن کو جمہور یہود اور متقدمین نصاریٰ سب تسلیم کرتے تھے۔

قطع نظر اور حوالوں کے ہم خاص پادری فنڈر ہی متعصب اور نا انصاف کے منہ سے اقرار کرا دیتے ہیں۔ پادری صاحب میزان الحق کے ۳ باب کے ۳ فصل میں لکھتے ہیں قولہ ''پھر قرآن میں بہت حکایتیں ایسی مرقوم ہیں کہ جو کتبِ عہدِ عتیق و جدید سے لی گئی ہیں الخ ایسی اور حکایتیں بھی قرآن میں پائی جاتی ہیں کہ جو عہدِ عتیق و جدید سے اخذ کی گئی ہیں لیکن اتنا فرق ہے کہ یا تو قرآن میں کم و بیش بیان ہوئی ہیں یا کچھ تبدیل و تغیر سے لکھی گئی ہیں'' الخ اور پچھلی باتوں کی نسبت لکھتے ہیں قولہ ''یہ سب یہودیوں کی حدیثوں اور تواتر سے لیا گیا ہے چنانچہ اس زمانہ میں بھی اس قسم کی حدیثیں ظالموت و گمرو ضحار و میدراس نامی کتابوں اور یہود کی اور کتابوں میں بھی منضبط ہیں الخ باقی حضرت مسیح کے معجزات طفولیت انجیل طفولیت میں مندرج ہیں۔ اور اصحاب[۴] کہف کا قصہ افرائم کی تصنیف میں اب تک پایا جاتا ہے'' انتہیٰ ملخصًا۔

← کہ اس کے مغرب سمت میں دلدل تھی پس آفتاب غروب ہوتا ہوا دلدل میں معلوم ہوتا تھا جس طرح سمندر میں آفتاب پانی میں ڈوبتا معلوم ہوتا ہے حالانکہ پانی اور دلدل میں نہیں ڈوبتا اس کو ہر ذی عقل جانتا ہے۔ ۱۲ منہ

[۱] حضرت محمد ﷺ نے سکندر رومی کو جو بت پرست تھا کبھی نبی نہیں کہا یہ جھوٹا الزام ہے۔ ۱۲ منہ

[۲] بعض عیسائی یہ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں الہامی نہ تھیں اس کا جواب یہ ہے کہ الہامی کتاب میں تاریخی واقعہ کا غیر الہامی کتاب سے حوالہ دینا دلیل ہے اس بات پر کہ عیسائیوں کا الہام عام مؤرخین کی مانند ہے۔ دوم یہ کہ صاحب الہام کو ایسے واقعات کا علم محض تاریخی کتابوں سے ہے جو رطب و یابس سے خالی نہیں پھر اس الہام کو نبوت کا حصہ ٹھہرانا محض عبث ہے۔ ۱۲ منہ

[۳] پراٹسٹنٹ عیسائی چونکہ نیچریت اور فلسفہ کے بہت پابند ہیں ایسی باتوں کو خصوصًا شق القمر کے معجزہ کو محال کہا کرتے ہیں۔ اس لیے الزامًا اس کو محال کہا گیا اور اس کتاب میں اکثر روئے سخن انہیں لوگوں کی طرف ہے مگر ایک پرانے کرستان نے اس کو تحقیقی جواب سمجھ کر مصنف علامہ پر اعتراض کر کے بڑی قابلیت جتلائی ہے حالانکہ کتب رد نصاریٰ میں اس قسم کی گفتگو کثرت سے ہے۔ ابو الحسن حقانی

[۴] ولیم میور صاحب نے اس قصہ کو بخوبی تسلیم کیا ہے۔ ۱۲ منہ

اب ہم ان اعتراضات اور ان کی دیگر اعتراضات کا دوسری طرح پر جواب دیتے ہیں کہ جس کا رد قیامت تک عیسائیوں سے نہ ہو سکے گا وھو ہذا۔ ان اعتراضات کا دو چیز منشاء ہیں:

(۱) یہ کہ یہ حکایات کتبِ مقدسہ کے برخلاف ہیں جو کلامِ الٰہی ہیں (۲) بعض ایسی حکایات بھی ہیں کہ جو کتبِ مقدسہ میں موجود نہیں گو کسی اور کتاب میں ان کی سند ہو۔ اول بات کی نسبت پادری صاحب کو واجب ہے کہ یہ چند امور براہینِ قاطعہ سے ثابت کریں: (۱) یہ کہ یہ کتبِ مقدسہ جو بالفعل اہلِ کتاب کے ہاتھ میں ہیں اور جن کی مخالفت سے قرآن پر الزام لگایا جاتا ہے کلام الٰہی بھی ہیں کیونکہ محض تورات و انجیل و زبور ان کے نام مقرر کرنے سے یہ کلام الٰہی نہیں ہو سکتیں۔ کیا لوہے کا نام چاندی رکھنے سے چاندی ہو جائے گا؟ پس اول مرتبہ یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جس تورات و انجیل و زبور کا قرآن میں ذکر ہے وہ یہی کتابیں ہیں اور اس امر کے ثبوت میں یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ اگر یہ وہی کتابیں نہیں تو اصلی کتابیں تم لا کر دکھاؤ۔ کیونکہ جب ان اصلی کتابوں کا باقرارِ علماءِ یہود و نصاریٰ صفحۂ عالم پر وجود ہی نہیں تو کوئی کہاں سے لا کر دکھائے؟

(۲) یہ کہ یہ کتابیں بلا تفاوت ویسی ہی ہیں کہ جس طرح ان کو ان کے مؤلفین نے تصنیف کیا لیکن اس کا ثبوت محالات سے ہے کیونکہ باقرارِ علماءِ اہل کتاب باب کے باب اور بہت سی آیات ان میں لوگوں نے داخل کر دیے ہیں۔ چنانچہ پادری فنڈر اختتامِ مباحثۂ دینی مطبوعہ اکبر آباد صفحہ ۵۳ خود مقر ہیں کہ تخمینًا ڈیڑھ لاکھ جگہ ان کتابوں میں غلطیاں واقع ہوئی جن کو ورس یوس ریڈنگ کہتے ہیں اور زیادہ تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔ اگر ان اختلافات کی وجہ سے قرآن غلط ہے تو پھر باہم کی ان کتابوں میں جو فحش اختلاف اور صریح غلطیاں ہیں ان سے اپنی کتابوں کو بھی غیر انصافی کہیں۔ شاہد اول ورس ۲ باب ۲۲ کتاب ۲ اخبار الایام میں عبری ترجمہ کے موافق یہ لکھا ہے کہ اخزیاہ بیالیس برس کی عمر میں بادشاہ ہوا حالانکہ یہ صریح غلط ہے کیونکہ جس سال یہ بادشاہ ہوا اور اس کا باپ یہورام مرا تو اس کی چالیس برس کی عمر تھی۔ چنانچہ اس کتاب کے باب ۲۱ مطبوعہ ۱۸۴۲ میں ہے کہ یہورام بتیس برس کی عمر میں بادشاہ ہوا اور آٹھ برس تک بادشاہت کرتا رہا۔ پس اخزیاہ کی تخت نشینی کے وقت بیالیس برس کی عمر تھی اور اس کے باپ یہورام کی چالیس برس کی اس کا بیٹا دو برس باپ سے بڑا تھا اس سے زیادہ بھی کوئی غلطی ہوگی؟ مگر پھر اس کو کتابِ الٰہی کہتے ہیں۔

(۲) کتاب اول صموئیل ۶ باب آیت ۱۹ میں ہے کہ اس نے پچاس ہزار اور ستر مارے اور عربی اور سریانی نسخہ میں بقول ہارن صاحب مفسر پانچ ہزار ستر لکھتے ہیں اور یوسفیس مؤرخ جو عیسائیوں کے نزدیک بڑا محقق ہے کل ستر آدمی ہی بتلاتا ہے۔ اس اختلاف کا کیا ٹھکانا ہے؟

(۳) کتاب التاریخ ۲ باب ۱۶ میں ہے کہ آسا کی سلطنت کے چھبیسویں برس بعشا یہود پر چڑھا اور اول سلاطین ۱۵ باب میں ہے کہ آسا کی سلطنت کے تیسرے سال بعشا تخت نشین ہوا اور ۲۴ برس سلطنت کی۔ ان میں ایک ضرور غلط ہے اور اس طرح کی صدہا غلطیاں ہیں کہ جن کو مفسرین اہلِ کتاب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پس ایسی غلط کتابوں کے اعتماد پر قرآنی واقعات کو جھوٹ کہنا بڑی سینہ زوری ہے۔ کیا ان کے اغلاط کے لیے قرآن اصلاح[۱] دہندہ نہیں ہو سکتا؟

---

[۱] چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ ھُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۱۲

←

دوسری بات کی نسبت یہ کلام ہے کہ ہر واقعہ کی صحت اس پر موقوف نہیں کہ وہ کتبِ مقدسہ میں بھی موجود ہو کیونکہ اگر یہ ہو تو دو قباحت لازم آئیں گے: (۱) یہ کہ خود بائبل کی حکایتیں غلط ہو جائیں گے کیونکہ جو بائبل کو نہیں مانتا اس کے نزدیک حکایات کے ثبوتِ صدق کے لیے کونسی دلیل ہے؟ پھر پادری صاحب کو لازم ہے کہ ان واقعات کو یا تو کسی اور کتبِ مقدسہ میں جو بائبل کے علاوہ دکھلائیں ورنہ ان کو بھی جھوٹ کہیں۔

(۲) یہ کہ خود عہدِ عتیق و جدید کی کتابوں میں ایسے واقعات ہیں کہ جن کو کسی اور نے نہیں لکھا بلکہ خاص ایک ہی شخص نے لکھا ہے چنانچہ

(۱) باپ بیٹے روح القدس کے نام بپتسمہ دو۔ یہ صرف انجیل متی میں ہے اس کو کسی نے لکھا۔ سو یہ بھی جھوٹ۔

(۲) مجوسیوں کا ایک ستارے کو دیکھ کر مسیح کے لیے آنا سوائے انجیل متی کے اور کسی انجیل میں نہیں سو یہ بھی جھوٹ۔

(۳) یسوع کی پیدائش بیت اللحم میں اور گڈریوں کا فرشتہ کو دیکھنا اور باتیں کرنا مسیح کا ختنہ کرنا سوائے انجیل لوقا کے اور کسی انجیل میں نہیں سو یہ بھی جھوٹ۔ علاوہ اس کے انجیل متی کے ۲ باب میں ہے کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہوا کہ وہ ناصری کہلائے گا الخ۔ بتلائیے کس نبی کی کتاب میں لکھا ہے کہ مسیح ابن مریم ناصری کہلائے گا؟ سو یہ بھی جھوٹ۔ اور اسی طرح وہ جو انجیل متی کے ۲۷ باب میں لکھا ہے کہ جب مسیح کو صلیب پر کھینچا تو (۵۱) ہیکل کا پردا اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے (۵۲) اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی قبروں سے نکل کر شہر میں بہتوں کو نظر آئیں انتہی۔ اور وہ جو انجیل لوقا کے ۲۳ باب میں ہے اور چھٹویں گھنٹے کے قریب تھا کہ ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور نویں گھنٹے تک رہا اور سورج تاریک ہو گیا الخ یہ بھی سب جھوٹ ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کو جو حیرت افزا تھا اور تمام عالم پر گزرا تھا آج تک کسی نے نہیں لکھا نہ کسی یہودی نے نہ مجوسی نے نہ سامری نے نہ ہندو نے نہ ترک نے نہ عرب نے۔

اندکے باتو بگفتیم و بدل ترسیدیم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیارست

واللہ الہادی

(چہارم) **علم التذکیر بالموت و مابعدہ**: یعنی خدا تعالیٰ نے جس طرح سے کہ انسان بلکہ عالم کی ابتداءِ آفرینش کا اجمالاً حال بیان فرمایا اسی طرح سے اس کے فنا ہونے[1] کی کیفیت کو اور فنا ہونے کے بعد جو کچھ اس پر گزرے گا اس کو بھی قرآن میں مختلف سورتوں میں ذکر کیا۔ پس جس طرح سے کہ انسان کا نطفہ سے علقہ اور مضغہ بن کر پیدا ہونا بیان فرمایا تھا اسی طرح اس عالم کی فنا یعنی قیامت کی علامات حضرت مسیح علیہ السلام کا نازل ہونا اور دابۃ الارض کا نکلنا اور قوم یاجوج و ماجوج کا زمین

← فائدہ: اہلِ کتاب کی کتابوں میں جو کچھ باہم واقعاتِ تاریخیہ کے بیان میں اور دیگر باتوں میں اختلافِ شدید ہے اس کا ایک نقشہ تیار کیا جائے کہ جس پر پادری اسکاٹ اور ہارن اور ہنری کو دستخط کرنے میں ذرا بھی انکار نہ ہوگا تو ایک مبسوط کتاب طیار ہو جائے اس لیے چند نمونوں پر قناعت کی گئی اور زیادہ دیکھنا ہو تو مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم کی کتاب اعجازِ عیسوی اور ازالۃ الاوہام وغیرہ کتبِ نصاریٰ کو ملاحظہ کرو۔ ۱۲ منہ

[1] فناء سے مراد عدمِ محض نہیں۔ ۱۲ منہ

پر زور پکڑنا اور نفخ صور اور اس عالم کی بیخ و بنیاد کا گرایا جانا، آسمانوں اور ستاروں کا ٹوٹنا، پہاڑوں کا بادلوں کی طرح زلزلۂ عظیم سے اڑتے پھرنا اور پھر دوبارہ صور پھونکنا اور تمام لوگوں کا زندہ ہونا اور تختِ رب العالمین کے روبرو حساب کے لیے حاضر ہونا اور ملائکہ کا صف بستہ کھڑا ہونا اور نامۂ اعمال کا دائیں اور بائیں ہاتھ سے دیا جانا اور ہاتھ پاؤں کا شہادت دینا اور اعمال کا متمثل ہو کر نظر آنا اور پل صراط پر سے گزرنا پھر اہلِ جنت کا جنت میں داخل ہو کر طرح طرح کی نعمتیں حاصل کرنا یعنی حور و قصور، باغ و انہار، اچھے کھانے اور عمدہ عمدہ لباس پہن کر آپس میں ملاقاتیں کرنا اور خدا کے جلال و تجلی کی کیفیات سے محظوظ ہونا، اس کے دیدار سے مشرف ہونا، ابدالآباد وہاں راحت و آرام سے زندہ رہنا ذکر کیا۔ اور بدلوگوں کا اپنے اعمال کی سزا پانا، جہنم میں جانا اور جہنم کی کیفیات طوق و زنجیر، گرم پانی وغیرہ کو بھی نئے نئے اسلوب سے مختلف سورتوں میں ذکر کیا کہ جس کو سن کر انسان کے دل پر عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے خدا کی محبت ظہور کرتی ہے اور دنیا و مافیہا نظروں میں سرد اور گرد معلوم ہوتی ہے یہ بھی قرآن مجید کا معجزہ اور خاصۂ مختصہ ہے۔ اگلی کتابیں جس طرح سے کہ اور علوم میں ناقص البیان ہیں اسی طرح سے اس علم کو بھی عمدہ طرح سے نہیں بیان کرتیں۔ تورات و اناجیلِ موجودہ میں ذرا سا اشارہ ان چیزوں کی طرف ہے۔ اس مقام پر بھی ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تو محض تعصب سے تجاہلِ عارفانہ کے پیرایہ میں یا محض بے خبری اور لاعلمی سے اس مقام پر پادر صاحب اور ان کے مقلد بعض ہنود عجب غوغا مچاتے ہیں۔ چنانچہ پادری فنڈر صاحب نے میزان الحق میں اور صفدر علی نے نیاز نامہ میں اور عماد الدین نے ہدایت المسلمین میں اور پھر ہر پادری نے اپنی تصانیف میں جنت و دوزخ کی[2] کیفیاتِ عذاب و ثواب پر اعتراض کر کے سخت سخت زبان درازی بے سمجھے بوجھے کلامِ الٰہی پر کی ہے۔ چنانچہ ہدایت المسلمین کے ۲۵۹ صفحہ میں لکھا ہے:

''قولہ محمد صاحب (ﷺ) نے دوزخ اور بہشت اور عذابِ قبر کی بابت ایسے ایسے مضمون صریح البطلان جو ہرگز عقل و نقل قبول نہیں کرتی اس جاہل ملک کو سنا کر ڈرایا'' الخ صفدر علی نیاز نامہ کے ۵۱ صفحہ میں لکھتے ہیں: ''قولہ الغرض بموجبِ تعلیم قرآن و حدیث کے سعادتِ اخروی یہی ہے کہ جسمانی خواہشوں کا پورا ہونا کہ جو آدمی کی خواہش وہاں[3] ہو پوری ہو جاتی

[1] ان کا پرانا مقلد بھی محمد صادق اور محمد صالح کے نام سے تفسیر حقانی پر اس قسم کے نعماء خصوصاً گندم گون حور کے ملنے پر اعتراض کرتا ہے۔ ۱۲ منہ

[2] واضح ہو کہ نیاز نامہ کا مصنف صفحہ ۲۰ میں خود اقرار کرتا ہے کہ وہ قدوس اپنے بندوں کو ان اعمال و افعال کا حکم دیتا ہے جو بذات خود نیک ہیں اور ان سے منع کرتا ہے جو از خود بد اور نفرتی ہیں۔ الخ پھر اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء کی شریعت کو بالکل مٹانے کے لیے یہ کہنا قولہ ''مگر رسمی شریعت وہ ہے جو کتنے ہی کاموں کا حکم دیتا ہے اور کتنے سے منع کرتا ہے مگر وہ کام نہ از خود نیک ہیں نہ بد'' الخ پہلے قول کے لیے صریح نقیض ہے۔ ۱۲ منہ

[3] عذابِ قبر اور دوزخ کی بابت جس کو عماد الدین جھٹلاتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام کا بیان پیش کرتا ہوں جو انجیل لوقاء کے سولھویں باب میں انیسویں جملہ سے شروع ہوتا ہے حضرت لعزر مفلس اور ایک دولت مند کے مرنے کے بعد حال بیان فرماتے ہیں کہ لعزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گود میں فرشتوں نے رکھ دیا اور دولت مند کو لوئیں اور پیاس ستا رہی تھی اور وہ ابراہیم علیہ السلام سے درخواست کرتا تھا کہ لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا بھگو کو میرے لب تر کرے میں لوؤں سے جلا جاتا ہوں۔ الخ یہ عذاب قبر نہیں تو اور کیا ہے کس لیے کہ قیامت سے پہلے کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد پیش آیا اور اسی عالم کو شرع میں قبر کہتے ہیں پھر اس پر اعتراض کرنا اگر سخت مکر نہیں تو اور کیا ہے مگر جس کا دل حبِ دنیا سے سیاہ ہو گیا ہو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر قہقہے نہ اڑاوے تو اور کیا کرے۔ ۱۲ منہ حقانی

ہے۔'' الخ اور انہیں کی تقلید میں آنریبل سید احمد خان صاحب نے ان نصوصِ قرآنیہ کا انکار تاویل کے پیرایہ میں کیا ہے۔ ان سب لغو اور بیہودہ اعتراضات کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں ان معترضوں کو لازم ہے کہ اس مقام کو غور کر کے سمجھیں اور جنت کی حقیقت پر مطلع ہوویں پھر اعتراض کریں ورنہ آخرت میں مخبر صادق ﷺ کے فرمانے کے بموجب جب یہ چیزیں مومنوں کو ملیں گی' اور وہ عذابات پادریوں اور منکروں ماؤلوں کو نصیب ہوں گے اس خبر کی خود تصدیق ہو جائے گی ذرا صبر کریں۔ اور دلیل عقلی و نقلی جو پادری صاحب نے ذکر فرمائی ہم تو آج مشتاق اس کے سننے کے رہے مگر کسی پادری نے ان کیفیات کے محال ہونے پر کوئی دلیل نہ بیان کی اور کیا خاک کریں محض زبانی جمع خرچ ہے اور بس۔

(پنجم) علم الاحکام: یعنی بندوں کے لیے دین و دنیا میں جو جو امورِ ضروریہ اور نافع ہیں ان کو فرض' واجب' مستحب بنایا اور جو چیزیں مضر ہیں ان کو ان کے ضرر کے لحاظ سے حرام و مکروہِ تحریمی و تنزیہی قرار دیا۔ کیونکہ جو چیز اشد ضروری ہے وہ فرض ہے اور جو اس سے کم تو واجب پھر اس سے کم تو وہ مکروہِ تنزیہی ہے اور جو مساوی الطرفین ہے کہ نہ مضر نہ ضروری اس کو مباح کہا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ بے فائدہ اور عبث کسی چیز کا حکم نہیں دیتا بلکہ جس طرح طبیب محض مریض کے نفع و ضرر پر لحاظ کر کے دواء و غذا کا حکم دیتا ہے اسی طرح نبی جو طبیبِ روحانی ہے حکم دیتا ہے۔ قال تعالیٰ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ الآیہ پس ان مجموعۂ احکام کا نام شریعت ہے کہ جس کو پادری لوگ شریعتِ اخلاقی اور احکامِ باطنی اور اصل شریعت کہتے ہیں پھر ان احکام کی دو قسم ہیں ایک نظری کہ جن میں ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء کے فعل کی حاجت نہیں بلکہ دل سے متعلق ہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ کو وحدہ لاشریک جاننا اور جسمانیت اور جمیع عیوب سے اس کو پاک سمجھنا وغیر ذلک کہ جن کی تفصیل علمِ عقائد میں ہے۔ یہ احکام لوگوں اور زمانے کے بدلنے سے نہیں بدلتے اور اسی لیے یہ منسوخ بھی نہیں ہو سکتے۔

دوم عملی کہ جن میں اعضاء کو دخل ہے پھر ان احکام عملیہ کی بھی دو قسم ہیں:

نماز: اول وہ احکام کہ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ بالخصوص متعلق ہیں جیسا کہ اس کی عبادت کرنا اور علاوہ روح کے اپنے تمام اعضاء سے اس کی شکر گزاری کرنا جس کو عرفِ شرع میں نماز کہتے ہیں۔ اس قدر تو سب کے نزدیک اصل ہے باقی اس نماز کے طریقے (کہ کسی وقت محض سجدہ تھا اور کبھی قیام اور کبھی فقط زبان سے اس کی ستائش کا راگ گانا) مختلف ہیں اس اخیر نبی کے عہد میں نماز کے اندر وہ سب باتیں مجتمع کر دی گئیں اور روح اور جسم دونوں کو شامل کر لیا گیا پھر اس نماز کے لیے طہارتِ بدن و جائے و جامہ شرط قرار دی گئی کیونکہ جب عقلاً و نقلاً بغیر طہارت کے روح پر کثافت ہوتی ہے اور آپس میں بھی امراء و شاہوں کے دربار میں ہاتھ پاؤں دھو کر نجاست و میل کچیل سے صاف ہو کر جاتے ہیں۔ پس شاہنشاہِ حقیقی کے روبرو خراب حالت بنا کر جانا اور دل کو مکدر اور بوجھل کر کے اس کی طرف لگانا دشوار اور نازیبا ہے اس کی قرآن میں جا بجا تاکید ہے اور لفظ واقیموا الصلوٰۃ سے اس کو تعبیر کیا ہے مگر اس کی تمام ہیئت پیغمبر علیہ السلام نے ادا کر کے اور زبان سے کہہ کے تعلیم فرما دی ہے اور اس لیے اس کو اسلام کا رکن قرار دیا ہے۔

روزہ: اور جیسا کہ اپنے نفس کو اس کے لیے تمام خواہشوں اور کھانے پینے' جماع کرنے سے روکنا اور قوتِ بہیمیہ کو مغلوب کر

کے روح کو اس کے اذکار سے منور اور تازہ کرنا جس کو روزہ کہتے ہیں یہ بھی تمام شریعتوں میں تھا مگر اس کے آداب اور طریقے اور حدود پیغمبر علیہ السلام نے بوضاحت تعلیم فرمائے اور قرآن میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے لفظ سے تاکید کی گئی اس لیے یہ دوسرا رکن اسلام کا قرار پایا۔

زکوٰۃ: اور جیسا کہ اپنے مال میں سے ایک حصہ معین خدا کے نام پر تصدق کرنا اور اس محبوبِ عالم کی محبت کو دل میں جگہ دینا اور روپیہ اور مال کو کہ جس کی طرف انسان کی اکثر طبیعت مائل رہتی ہے اس کے لیے ہاتھ سے چھوڑنا۔ پھر اس سے اس کے بیکسوں اور یتیموں کی مدد کرنا اس کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یہ بھی پہلے تھی مگر اس کے حدود و آداب و تقررِ حصص و تعینِ مصارف اسلام نے نہایت مناسب طور پر قرار دیے اور قرآن میں مطلقاً بلفظ آتُوا الزَّكٰوةَ سے اس کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے یہ تیسرا رکن قرار پایا۔

حج: اور جیسا کہ کسی موضع متبرک میں (کہ جہاں اس کے بڑے بڑے محبوب و رہنماؤں سے خدا نے کلام کیا اور اپنی تجلی سے ان کو مشرف بنایا ہو اور جس کو ایسے اعتبارات سے تمام زمین پر شرف ہو) جانا اور عاشقانہ ہیئت بنا کے اس پر تصدق ہونا اور دعاء و مناجات کرنا جس کو حج کہتے ہیں یہ بھی پہلے سے چلا آتا ہے مگر نبی اسلام نے اس کے بھی آداب و طریقے الہامی طور پر عمدہ قائم کیے اور جو خرابیاں پیش آ گئی تھیں ان کو دور کر کے خاص ابراہیمی طرز کو برقرار رکھا۔ اس کے فوائد و اسرار بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں آگے بیان کریں گے۔ چونکہ یہ بھی ایک روح کو تازہ کرنے والی عبادت ہے اس لیے اس کو بھی قرآن میں وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے لفظ سے طلب کیا۔ اس لیے یہ بھی چوتھا رکن اسلام کا قرار پایا۔

زبان سے کلمہ کہنا: اور جیسا کہ اس کی توحید اور اس کے رسول کے برحق ہونے کا لوگوں میں زبان سے اقرار کرنا گو دل سے سچ جاننا تو ہر وقت ہی فرض ہے مگر احکامِ ظاہر یہ کے لیے ایک بار منہ سے بھی اقرار کرے جس کو اداءِ شہادت کہتے ہیں اس کو بھی قرآن میں جا بجا بیان فرمایا اس لیے یہ پانچواں رکن اسلام کا قرار پایا۔

جہاد: چونکہ خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کے حال پر بڑی مہربانی ہے وہ خود اور اس کی توحید تمام عالم پر آشکارا ہے اس لیے جب بندے کو مجبوری ہو جیسا اس کی زبان از خود بند ہو یا کوئی ظالم بزور بند کرے تب اس کے ذمہ پر یہ اداءِ شہادت فرض نہیں۔ ہاں اگر اس مصیبت پر بھی ادا کرے گا تو شہید ہو گا اجر پائے گا۔ پادری بالخصوص صفدر علی ظلماتِ تعصب میں بالکل غرق ہیں ان کو یہ سر معلوم نہیں اس لیے نیاز نامہ کے صفحہ ۳۳ میں غل مچاتے ہیں کہ اسلام نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی۔ جھوٹ پر پادریوں کے مذہب کی بناء ہے جیسا کہ پولوس مقدس فرماتے ہیں کما مر اس لیے ان کو ہر جگہ جھوٹ ہی نظر آتا ہے۔ ان سب امور کے انتظام اور قیام کے لیے ایک حکم جہاد کا دیا یعنی جس طرح ہر گورنمنٹ اپنے احکام و قوانین کو اپنی سطوت اور زور سے نافذ کرتی ہے خواہ چور مانے یا نہ مانے مگر سلطنت ضرور اس کو زبردستی سے قید کرتی ہے۔ علی ہذا القیاس اور کیونکر نہ کرے اگر گورنمنٹ ایسا نہ کرے تو اس کا ظلم ہے۔ پس اس تنفیذ کو سوائے جاہل اور کم اندیش کے کوئی شخص گورنمنٹ کا ظلم نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ سب سے پچھلے رسول کو بھیجے اور علاوہ صدہا معجزات و آیات بینات اور پُر اثر وعظ کے اس کو دنیا میں اپنا نائب بنائے اور اپنے احکامِ حیات بخش کی کہ جن سے خاص بندوں ہی کا نفع اور بھلائی ہے اس رسول کی معرفت بزور تعمیل کرائے اور سر اس کا یہ ہے کہ اس نبی آخر الزمان کا وجود تمام عالم پر خدا کی رحمت ہے۔ پس مقتضاءِ رحمت یہ ہوا کہ

اخیر زمانہ میں کہ جب قوتِ بہیمیہ [1] اور شیطان کا غلبہ زیادہ ہو ماں باپ مہربان یا طبیبِ شفیق جس طرح اپنے بچہ کو زبردستی دوا پلاتے اور گھرک کر مضر چیزوں سے روکتے ہیں اسی طرح ان احکام پر ان کو چلائے ایسا نہ ہو کہ گناہ میں پڑ کر ہلاک ہوں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ خدا کے ساتھ جس قدر لوگ گستاخی کرتے ہیں شرک کرتے ہیں پتھروں کو پوجتے ہیں، ان چیزوں کو مٹا کر دنیا کو پاک وصاف کر دے۔ مظلوم کی اعانت کرے، ظالم کے شر کو دفع کرے، اعلانا فحش سے مانع آئے، چوری اور حرامکاری اور رہزنی کو روکے اور دنیا میں عدالت قائم کرے۔ سو اس بات کو خدا نے جس کا ۴۵ زبور میں وعدہ کیا تھا پورا کر دیا کہ جزیرہ عرب میں ایک شخص یتیم وبیکس کو کہ جس کے پاس نہ فوج نہ ملک نہ مال وزر تھا پیدا کیا اور روم وایران [2] وغیرہ اس وقت کی بڑی سلطنتوں کو اس کے پیرووں کے ہاتھ میں دے دیا اور اس نے اور پھر اس کے جانشینوں نے اس حکم کی نہایت عمدہ طور پر تعمیل کی۔ اور اس کا نام جہاد ہے سو اس کا بھی قرآن میں چند سورتوں میں ذکر ہے اور مختلف الفاظ سے اس کو طلب کیا ہے جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ فرمایا کہیں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ کہا وغیرہا من الآیات مگر باوجود اس کے اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا اور لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فرمایا دیا فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ سنا دیا۔

اور یہ جہاد بھی حضرت موسیٰ اور انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام میں جاری تھا۔ چنانچہ کتاب یشوع وغیرہ میں بھی حضرت موسیٰ اور یشوع وغیرہ انبیاء کا جہاد [3] مذکور ہے اور بزور احکام پر چلنے کی بھی تورات میں صراحت ہے۔ چنانچہ سفر خروج ۲۲ باب میں یہ حکم ہے۔ ''تو جادوگرنی کو جینے مت دے، جو کوئی چارپائے سے مباشرت کرے مار ڈالا جائے، جو کوئی فقط خداوند کے سوائے کسی معبود کے لیے قربانی کرے وہ عذاب سے مار ڈالا جائے'' ۲۱ باب میں ہے۔ ''اور وہ جو اپنے باپ یا ماں پر لعنت کرے البتہ مار ڈالا جائے۔'' پھر سفر احبار کے ۲ باب میں زانی کے قتل کا حکم ہے۔ اور لونڈے باز اور چارپائے سے جماع کرنے والے کو قتل کا حکم دیا ہے۔

اب بعض نا انصاف پادریوں نے جو شریعتِ موسوی کے دشمن ہیں آنحضرت علیہ السلام کے جہاد پر طعن کیا ہے ان کو لازم ہے کہ پہلے تورات اور موسیٰ پر طعن کریں ورنہ وہ کیا بات نئی ہے جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافِ عقل ونقل جاری فرمائی۔

---

[1] اور یہ اس لیے کہ آدم میں جس قدر شرف اور علو اور غلبۂ قدرتِ ملکیہ دیا گیا تھا وہ اس کی اولاد میں جس قدر انفصال ہوتا گیا کم ہوتا گیا کیونکہ جس قدر مبدء سے بُعد ہوتا جاتا ہے قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ ۱۲ منہ

[2] اس زبور میں آنحضرت کی نسبت یہ الفاظ ہیں۔ ''اے پہلوان تو جاہ وجلال سے اپنی تلوار حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا امانت اور علم اور عدالت پر اپنی بزرگواری اور اقبالمندی سے سوار ہوتا کہ تیرا داہنا ہاتھ تجھے ہیبت ناک کام دکھائے گا۔'' ۱۲ منہ

نیاز نامہ کے صفحہ ۴۸ میں پادری صفدر علی کہتے ہیں کہ موسیٰ اور یوشع کے قتال کو اپنے جہاد پر قیاس نہ کریں کیونکہ کتاب مقدس میں کسی جگہ موسیٰ ویوشع کو یہ نہ فرمانا کہ تم کفار سے دعوت ایمان کرو اگر نہ مانیں تو قتل کرو الخ یہ عذر بدتر از گناہ ہے اگر موسیٰ اور یوشع کا کنعانیوں وغیرہم کو قتل کرنا خدائی حکم سے نہ تھا اور اس کے لیے نہ تھا تو معاذ اللہ خدا کی عدالت اور موسیٰ کی رسالت کیا تھی ایک ظلم تھا جو بلاوجہ بندگانِ خدا کو بیرحمی کے ساتھ قتل کیا۔ حقانی

[3] روم کے لفظ پر بھی امام پادری بڑے گھبراتے ہیں کہ یہ ملک خلفاء نے بعد میں فتح کیا تھا نہ کہ صحابہ نے۔ اول روم سے مراد ایشیاء کوچک ہے سو وہ بھی صحابہ نے فتح کر لی تھی۔ اور دوم خود صحابہ کا اطراف روم میں قبضہ کرنا واقدی وغیرہ نے لکھا ہے عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں تو قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا گیا ہے۔

قسم دوم وہ احکام جو بندوں کے ساتھ متعلق ہیں پھر ان کی تین قسم ہیں کیونکہ اگر خاص ایک ہی شخص کے حالات اور معاملات کی درستی سے متعلق ہیں تو ان کو تہذیب الاخلاق کہتے ہیں جیسا کہ چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، تکبر نہ کرنا، حسد و بغض وکینہ وحرص نہ کرنا، خوشخوئی سے پیش آنا، لوگوں کے ظلم کی برداشت کرنا، توکل اور قناعت سے دنیا میں رہنا، عدل و انصاف کو اپنا شیوہ بنانا وغیر ذلک۔ ان امور کو بھی قرآن نے کس کس خوبی سے بیان کیا ہے کہ طاقتِ بشریہ سے باہر ہے۔ پھر ان سب باتوں کو ایک آیت میں جمع کر دیا کہ جس کا نظیر ممتنع ہے۔ فقال قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا الآیہ۔

اور اگر ایک گھر کی معاشرت اور انتظام سے علاقہ رکھتے ہیں تو ان کو تدبیر المنزل کہتے ہیں کہ باپ بیٹے سے کس طرح پیش آئے اور جورو خصم باہم مل کر کس طرح سے گزران کریں اور نکاح، بیع وشراء، قرض وامانت میں کس طرح سے برتاؤ کریں؟ ان امور کو بھی قرآن نے بہت سی سورتوں میں مختلف عنوان سے بیان کیا ہے۔ والدین کی نسبت فرمایا:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا اور فرمایا لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وغیرہا من الآیات۔

اور اگر شہر اور ملک کے متعلق ہیں تو ان کو سیاستِ ملک کہتے ہیں یعنی چور اور قزاق اور امنِ عام میں خلل انداز کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ زانی اور غاصب کے ساتھ یوں کرنا چاہیے، اپنے سردار اور بادشاہ کی اس طرح سے اطاعت کرنی چاہیے۔ اس امر میں بھی قرآن میں بہت کچھ مذکور ہے فرماتا ہے وَاُولُوا الْاَمْرِ مِنْكُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ پس حکمت عملی وحکمتِ نظری بتمام وکمال قرآن میں مذکور ہے۔ طہارتِ ظاہر یہ وباطنیہ، حدود و قصاص، میراث وطلاق کی بابت کوئی بات قرآن نے نہیں چھوڑی اور اسی طرح جو چیزیں ناپاک اور نجسِ طبعی تھیں ان کی حرمت اور پاک اور ستھری چیزوں کی حلت بھی بیان کر دی۔

پادریوں نے پولوس کے بہکانے سے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی تمام شریعت کو چھوڑ دیا اور بات یہ بنائی کہ تمام انبیاءِ سابقین ناقص اور ان کی شریعتیں غیر کامل تھیں۔ مسیح علیہ السلام نے آ کر سب کی تکمیل کر دی۔ قربانی کی جگہ خود کفارہ ہو گئے۔ اسی طرح جانوروں کی حلت وحرمت بھی ایک بے فائدہ چیز تھی۔ پھر فنڈر صاحب اور صفدر علی وغیرہما نے ایک اور حیلہ کیا کہ ''شریعت کی دو قسم ہیں ایک اخلاقی دوسری رسمی۔ پس مسیح نے رسمی کا چھڑایا یعنی کامل کیا ہے نہ اخلاقی کو۔ اور قرآن میں سراسر شریعتِ رسمی ہی بھری پڑی ہے۔ اور قرآن میں یہ نقص ہے کہ وہ شریعتِ اخلاقی کو جواب دہی سے منسوخ بتلاتا ہے۔'' الخ

چنانچہ پادری صفدر علی نیاز نامہ کے صفہ ۲۰ سے لے کر ۳۰ تک اس امر میں بڑی قابلیت جتلا رہے اور قرآن پر منہ آ رہے ہیں لیکن پادریوں کا اس بارے میں ایسا ناطقہ بند ہے کہ اگر مگر بہت ہی کچھ کرتے ہیں مگر کوئی بات نہیں بن آتی کیونکہ یہاں چند امر ہیں:

(۱) ''تو بقول حضرت مسیح آسمان وزمین ٹل جائیں گے مگر یہ باتیں نہ ٹلیں گی۔'' (مرقس باب ۱۳) پھر انجیل متی میں

کہتا ہوں کہ جب تک آسمان و زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات کا ہرگز نہ مٹے گا۔'' اخلاقی اور رسمی کی اس میں کوئی تمیز نہیں۔ پس جب رسمی کو بھی نہ مانا تو شوشہ کیا بلکہ ورق کے ورق اور باب کے باب ٹل گئے۔

(۲) نیاز نامہ کے صفحہ ۲۰ میں اول یہ اقرار کرنا کہ وہ قدوس' سبحان اپنی اس ذاتی پاکی' دین کی خوبی کے اقتضاء سے اپنی تمیز دار مخلوق کو ان اعمال و افعال کے کرنے کا حکم دیتا ہے کہ جو بذاتہٖ نیک ہیں اور ان سے منع کرتا ہے جو بذاتہٖ بد ہیں'' الخ پھر رسمی شریعت بنانے کے لیے یہ کہنا اب باقی رہے وہ افعال جو از خود نہ برے ہیں نہ بھلے' اجتماع النقیضین ہے کہ جس کا کوئی عاقل قائل نہیں۔ اس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا قولہ صفحہ ۲۳ ''لہٰذا جو کچھ خدا نے بنایا ہے اور پیدا کیا ہے وہ بذاتہٖ ناپاک نہیں ہو سکتا ہے۔ ہر چہ از غیب ست بے عیب است۔'' عیسائیوں کے لیے گوہ موت اور تمام نجاسات کو پاک قرار دینا ہے۔

دوم تورات سفر احبار ۱۱ باب کے مخالف ہے کیونکہ اس میں بہت سی چیزوں کو ناپاک لکھا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ چیزیں از خود ناپاک نہیں' حکمِ الٰہی سے ہیں۔ مگر باوجودیکہ ان کی ناپاکی حکمِ الٰہی سے بیان ہو چکی پھر ان کو شریعتِ رسمی کہہ کے پاک کرنا تورات کا منسوخ کرنا اور آسمانی بادشاہت میں سب سے جھوٹا کہلانا ہے۔ (متی ۵ باب ۱)

(۳) اس رسمی کے علاوہ اخلاقی شریعت کو بھی تو منسوخ کر ڈالا اور اس کے ابدی ہونے کا کچھ خیال نہ کیا کیونکہ حسبِ بیان مصنف نیاز نامہ صفحہ ۲۴ رسمی شریعت کو ماکولات اور مشروبات میں منحصر کیا ہے'' اور موسیٰ کے احکامِ عشرہ کو خود اخلاقی شریعت قرار دیا ہے حالانکہ ان میں سے کسی کی پابندی بھی نصاریٰ کے نزدیک فرض نہیں۔ پھر اب وہ کون سی بات شریعت کی باقی رہ گئی ہے جس کو اخلاقی اور باطنی کہہ کر پادری صاحب پابندِ شرع کہلائیں گے؟ کیونکہ اناجیلِ مروجہ میں تو پولوس نے صاف یہ کہہ دیا کہ پرانا حکم اس لیے کمزور اور بے فائدہ تھا اٹھ گیا (عبرانیوں کا ۷ باب ۱۸ آیت) اور اس پر طرہ یہ کہ بلا لحاظ اخلاقی و رسمی شریعت پر عمل کرنے سے منع کر دیا اور جوش میں آ کر بڑا لفظ بھی بول دیا پھر اب کس منہ سے صفدر علی قرآن پر معترض ہے کہ اس نے نسخِ احکام کا دعویٰ کیوں کیا؟ مگر شاید پادری صاحب نسخ کی جگہ لفظ تکمیل بول کر خلاصی چاہتے ہیں سو یہ ناممکن ہے لفظ بدلنے سے کام نہیں چلتا۔

(۴) قرآن کے جملہ احکام کو رسمی شریعت کہنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ پادری صاحب کو علم نہیں' کاش! ہماری کتاب ہی دیکھ لیتے یا محض تجاہلِ عارفانہ اور تعصبِ جاہلانہ ہے ورنہ جس قدر احکام کہ ہم نے گنوائے حسبِ قرار دادِ صفدر علی سب اخلاقی ہیں۔ اے عیسائیو! تعصب دور کرو اور راہِ حق پر آ جاؤ' ابدی جہنم سے بچو۔

واضح ہو کہ ان احکام کے جاری کرنے میں خدا تعالیٰ نے فطرت کا لحاظ رکھا ہے۔ پس جو جو باتیں لوگوں میں فطرت اور طریقۂ نبوت کے موافق تھیں ان کو قائم رکھا بلکہ ان کی فضیلت بیان کر دی اور جہاں کہیں کچھ کمی زیادتی تھی اس کو متغیر کر کے اصلی حالت پر کر دیا اور جو احکام بالکل خلافِ فطرت تھے ان کو مٹا دیا۔ اور آپ پیشتر یہ تو جان چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام محض اس لیے دنیا میں بھیجے جایا کرتے ہیں کہ وہ ان امورِ خلافِ فطرت کو کہ جو لوگوں میں رواج پا گئے ہوں' مٹا دیں اور فطرتِ خوابیدہ کو جگائیں اور چونکہ فطرت سب انسانوں کی ایک ہے اس لیے تمام انبیاء کے اصولِ شریعت[1] بھی ایک ہیں۔

---

[1] پادریوں کا یہ اعتراض (کہ آنحضرت ﷺ [illegible]

کما مر۔ ہاں بلحاظ ازمان و اشخاص بعض امورِ جزئیہ کو انبیاء علیہم السلام ضرور بدلتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ عرب کی اصلاح آنحضرت ﷺ سے کرے اور پھر تمام عالم کی اصلاح عرب سے کرے۔ پس اس لیے ضرور ہوا کہ آپ کی بعض شریعت کا مادہ رسوم و عاداتِ عرب پر مشتمل ہو جس قدر غور سے آپ حضرت کی شریعت اور عاداتِ عرب کو دیکھیں گے تو ہر ہر حکم کے لیے ایک علت اور مصلحت ضرور پائیں گے کہ جس پر حکم کا مدار ہے۔ یہ بحث اصولِ فقہ میں خوب کی گئی ہے لیکن ان علل پر احکام کا مبنی کرنا کہ جس کو قیاس کہتے ہیں مجتہد کا حصہ ہے۔ اور ان احکام کے بیان کرنے میں بھی وہی دستورِ عرب مدِ نظر رکھا کہ مختلف سورتوں میں اجمال و تفصیل سے احکام کو بیان کیا چنانچہ صوم کو سورۂ بقر میں اور حج کو بقرہ اور سورۂ حج میں جہاد کو سورۂ بقرہ اور انفال اور دیگر مواضع میں اور حدود کو سورۂ مائدہ اور سورۂ نور میں۔ اور میراث اور نکاح اور طلاق کو سورۂ بقر اور سورۂ نساء میں اور طلاق وغیرہ میں ذکر کیا اور امتوں کے مؤلفین کی طرز کو اختیار نہ کیا کہ باب یا فصل مقرر کر کے علی الترتیب احکام بیان کرتا اور احکام میں حدودِ جامعہ و مانعہ ذکر کرتا بلکہ ان باتوں کو اہلِ زبان کے عرف پر چھوڑ دیا۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں اور زانی پر درے مارے جائیں اور مسافر نماز میں قصر کرے لیکن چور کی تعریف جامع مانع اور زنا کی تعریف اور سفر کی تعریف نہ بیان کی بلکہ ان سے وہی معنی مراد رکھے کہ جن کو اس وقت کے عرب العرباء سمجھتے تھے گو بعد میں فقہاء نے تتبع کر کے ان امور کے حدود بیان کیے ہیں۔

فصاحتِ قرآن: علاوہ ازیں ان علومِ خمسہ کے اور بھی بیشمار علوم قرآن میں ہیں کہ جن کی طرف اجمالاً اشارہ کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن مجید عرب کی نہایت فصیح و بلیغ زبان میں نازل ہوا ہے کہ جس کی مثل بنانا طاقتِ بشریہ سے باہر ہے۔ اس وقت کے تمام عرب العرباء اس کی بلاغت و فصاحت کے آگے عاجز آ گئے تھے مقابلۂ حروف سے مقاتلۂ سیوف ان کے نزدیک آسان تھا حالانکہ وہ لوگ اسبابِ فصاحت و بلاغت میں آنحضرت ﷺ سے کسی طرح کم نہ تھے' کیونکہ جہاں کے آپ رہنے والے تھے وہیں کے وہ بھی' پھر ایک نہیں بلکہ مجتمع ہو کر بھی اس کا مثل نہ بنا سکے اور ایک سورت کا دسواں حصہ بھی نہ لا سکے۔ باوجودیکہ ان کو عار دلا کر کہا جاتا تھا کہ ﴿فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے اور کیونکر اتفاق نہ ہو حالانکہ اعجازِ قرآن بدلائلِ واثقہ و بہ براہینِ قاطعہ ثابت ہے۔ منجملہ دلائل کی:

اول دلیل: دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حکمتِ عملیہ و حکمتِ نظریہ کو بتانا اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ جس کو ایک بڑے سے بڑا حکیم یا فلاسفر اور ایک اونٹ چرانے والا جنگلی کہ جس کو علمِ حکمیہ سے ذرا بھی مس نہ ہو برابر سمجھتے ہیں۔ اول تو اتنے علوم کا ایک کتاب میں جمع کرنا کہ جس کا مثل آج تک کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

← سے لے کر مرتب کیا ہے۔ جو باتیں سمجھ میں آئیں اور عقل نے قبول کیں ان کو لیا اور باقی کو چھوڑ دیا جیسا کہ میزان الحق وغیرہ کتب میں مذکور ہے) پادریوں کی جہالت پر دلیلِ قوی ہے کیونکہ یہی تو وجہ آپ کے من اللہ ہونے کی ہے کہ جو امور موافقِ فطرتِ سلیمہ کے ہیں خواہ ان کا کوئی پابند ہو اور کسی کتاب میں ہوں ان کو آپ نے قائم رکھا۔ اور جب یہود اور مجوس اور عرب کا ایک ہی خدا ہے اور ایک ہی فطرت ہے تو پھر ہر بات میں ان کی مخالفت کرنا تھا۔ معترض کے ہاتھ سے رستگاری مشکل ہے جب فطری باتوں میں آپ تورات وغیرہ کے موافق رہے تو یوں کہا اور اگر مخالف ہوتے تو یہ کہہ دیتے کہ عجیب نبی ہے دنیا سے نرالی وہ باتیں اپنی شریعت میں رکھی ہیں کہ جن کو کسی کی عقلِ سلیم ہی نہیں قبول کرتی۔ ۱۲ منہ

دوم ایسے شخص کا جمع کرنا کہ جو ایسے وحشی ملک کا رہنے والا ہو کہ جہاں سوائے کشت و خون اور چوری و زنا و بت پرستی کے نہ کسی علم کا گزر ہو نہ کسی ہنر کا اور نہ اس نے کسی کی تعلیم پائی ہو نہ اچھی طرح ماں باپ کی تربیت نصیب ہوئی ہو' باجود اس کے وہ شخص نہ علوم و فنون و شعر و شاعری کا مشتاق ہو نہ کبھی کسی نے ان میں مصروف دیکھا ہو بلکہ ہمہ وقت عبادتِ الٰہی میں مستغرق رہتا ہو اور علاوہ اس کے صدہا نہیں بلکہ ہزارہا دنیاوی مصائب اور دلخراش باتیں اس کو ہر دم پیش آتی ہوں۔

سوم پھر اس خوبی اور اس اسلوب سے جمع کرنا کہ جس کو تمام نفوس نہایت عمدہ طور پر قبول کرتے ہوں۔ مضامین درد انگیز اور شیریں' عبارت پر ہر وحشی بھی دیوانہ اور شمع کا پروانہ ہو۔ البتہ مردہ کو زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے بلکہ ہزار درجہ بڑھ کر ہے کیونکہ مردہ کو زندہ کرنے میں تو ڈھڑ بندی اور شعبدہ بازی یا کسی فریب' یا بااثر دوا یا سکتہ وغیرہ امراض کا بھی احتمال ہو سکتا ہے اور یہاں تو ان احتمالات کو دخل بھی نہیں۔ پس معجزہ ہونا بخوبی ثابت ہوا کیونکہ معجزہ اس امرِ خارقِ عادت کو کہتے ہیں کہ جو مدعیِ نبوت سے ظاہر ہو اور جس کا مثل مقابل نہ لا سکے۔ سو یہ سب باتیں قرآن پر بدرجۂ اتم صادق آتی ہیں۔ کما لا یخفی

دوسری دلیل: قرآن باعتبارِ خوبیِ مضامین و عبارت کے یا تو انسانوں کے کلام سے اس قدر زائد ہے کہ عادتاً اس قدر زائد ایک کلام دوسرے سے نہیں ہوتا یا مساوی یا زائد بقدر معتاد یا کم۔ چوتھی شق تو بدیہی البطلان ہے۔ دوسری اور تیسری شق میں بھی مدعا ثابت ہے کیونکہ جب قرآن لوگوں کے کلام کے مساوی یا زائد بقدرِ معتاد تھا اور پھر ایک ایک کیا بلکہ سب سے مل کر بھی باوجود توافرِ دواعی اور کثرتِ تحدی کے قرآن کی ایک سورۃ کی مانند بھی نہیں بن سکے تو یہ خارقِ عادت ہے اور جو امر خارقِ عادت مدعیِ نبوت سے ظاہر ہو وہ معجزہ ہے۔ سو یہ بھی معجزہ ہے اور شق اول پر تو مدعا بالکل ظاہر ہے کیونکہ جب ایک شخص کا کلام تمام لوگوں سے خلافِ عادت زائد ہو تو حدِ اعجاز میں داخل ہے۔

تیسری دلیل: قرآن کا مثل بنانا لوگوں سے بوقتِ معارضہ ممکن تھا یا نہیں اگر ممکن نہ تھا تو مدعا ثابت ہے کیونکہ انسانوں میں سے ایک کا کلام اس قدر بلیغ ہونا کہ اس کا مثل لوگوں سے ممکن نہ ہو خارقِ عادت ہے اور خارقِ عادت مدعیِ نبوت سے سرزد ہو معجزہ ہے۔ پس قرآن معجزہ ہے اور اگر ممکن تھا پس باوجود امکان اور عار دلانے کے اس کا نظیر وقوع میں نہ آتا ہو خواہ یہ فعل ہوا پر اڑنا ہو' خواہ سیر آدھ سیر پانی سے لشکر کو سیراب کر دینا' خواہ درختوں سے کلام کرنا اور ان کو بلانا' خواہ مردے کو زندہ کرنا' خواہ کوئی کلام ہو۔

اگرچہ آنحضرت ﷺ کے بیشمار معجزات ہیں کہ جن کو ان ثقات نے روایت کیا ہے کہ جو تورات و انجیل کی روایت سے ہزار درجہ قوی ہیں اور خود قرآن میں بھی مذکور ہیں۔ پس بعض ناسمجھوں کا یہ کہنا (کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے قرآن میں کل معجزات کیوں مذکور نہیں اور جس طرح ہم عیسائی انجیل میں معجزاتِ مسیح دکھاتے ہیں تم قرآن میں دکھاؤ) محض دھوکا ہے۔ کیونکہ اول تو قرآن مجید آنحضرت ﷺ کے وقائع عمری کی کوئی تاریخ نہیں کہ اس میں بضمنِ احوالِ آنحضرت ﷺ معجزات کا مذکور ہونا بھی ضروری ہوتا۔

دوم بایں ہمہ بطریقِ امتنان پھر بھی قرآن میں معجزات مذکور ہیں۔ کما سیظہر لک۔ اور یہ تورات و اناجیل اربعہ اصل انجیل و تورات منزل علیٰ موسیٰ و عیسیٰ نہیں بلکہ حسبِ اقرارِ علماءِ اہلِ کتاب تاریخ اور روزنامچہ ہیں کہ جن میں بہت عرصہ بعد انبیا

اور حضرت مسیح علیہ السلام کے احوال کو ابتدا سے انتہا تک معتبر اور غیر معتبر رواۃ سے بلاسند متصل مجہول لوگوں نے نقل کیا ہے۔ بخلاف احادیثِ صحیحہ کے کہ ان کو نہایت احتیاط اور سندِ متصل سے جمع کیا ہے پھر ان احادیث کو غیر معتبر اور ان کتبِ تاریخ کو معتبر کہنا اگر اس لیے ہے کہ ان کتب کو مجازاً تورات و انجیل کہتے ہیں۔ کتبِ احادیث کو قرآن نہیں کہتے تو یہ بچوں کی سی باتیں ہیں۔

ترجیح اعجازِ قرآن: لیکن قرآن مجید کا معجزہ جمیع معجزات سے افضل ہے:

(۱) اس لیے کہ اور معجزات ایک طرفۃ العین میں واقع ہو کر پھر محض حکایات ہی حکایات رہ جاتے ہیں۔ پس ان سے جو تصدیق کامل حاصل ہو گی تو خاص ان کو کہ جنہوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے اور باقی سننے والے کی نسبت تو بحکم ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ ویسا اثر نہیں بخشتا بلکہ بعض اوقات روایت پر لحاظ کر کے دل میں کچھ اور ہی خیال آ جاتا ہے۔ بخلاف قرآن مجید کے کہ یہ معجزہ وقتِ نزول سے قیامت تک باقی ہے۔ جو ذوقِ سلیم بھی نہیں رکھتا اور عبارتِ عربیہ کے لفظ سے بھی واقف نہیں وہ بھی مضامین کی خوبی پر عش عش کر جاتا ہے اور جو ایسا ہی کوئی کوڑ مغز اور بھدی سمجھ کا ہو تو اس کا کیا ذکر ہے۔

(۲) اور معجزات سے محض تصدیقِ نبی کا فائدہ ہوتا ہے بخلاف قرآن کے کہ اس میں دونوں باتیں ہیں تصدیقِ نبوت اور قانونِ ہدایت۔

(۳) ہر نبی کو اکثر وہ معجزات عطا ہوتے ہیں جن کا اس زمانے میں چرچا ہوتا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر کا زور تھا۔ ان کو ید بیضا اور عصا ملا کہ جس سے تمام جادوگروں کا ناطقہ بند ہو گیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں جالینوس کی طب کا بڑا چرچا تھا۔ ان کو مردہ کو زندہ کرنے اور بیمار کو تندرست کرنے کا معجزہ ملا کہ جس سے اطباء عاجز آ گئے اور آنحضرت ﷺ کے عہد میں عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت اور شعر گوئی میں عجیب یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اچھے فقروں پر عرب کو وجد[1] آتا تھا۔ پس اس لیے آپ کو وہ کتاب ملی کہ جس سے تمام عرب حیرت میں آ گئے اور سحر مبین کہنے لگے۔ پس جس طرح بلاغت کو عموماً عرب جانتے تھے اسی طرح اعجازِ قرآن بھی عموماً متحقق ہوا۔ بخلاف مریض کو اچھا کرنے اور مردوں کو جلانے کے کیونکہ تحقیقاً اس پر طبیب وغیرہ حذاق ایمان لا سکتے ہیں ورنہ عموماً جہلاء کے پاس کوئی دلیلِ فاروق معجزہ اور نظر بندی میں بجز اپنے اعتقاد کے اور کچھ نہیں۔ فتامل جداً

تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن وجۂ اعجاز ہر ایک محقق کے نزدیک جداگانہ ہے مگر جمہور بلاغت قرار دیتے ہیں کوئی مضامین کی خوبی' کوئی پند و نصائح کا اثر حد سے افزون' کوئی اخبار عن المغیبات' کوئی تزکیۂ روح'

---

[1] مروی ہے کہ جب لبید بن مغیرہ نے یہ آیت سنی اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیہ تو کہا واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ۔ مروی ہے کہ ایام حج میں کفارِ قریش نے ایک مجلس اس لیے منعقد کی کہ آنحضرت ﷺ کے لیے جادوگر یا شاعر ایک بات مقرر کی جائے جب عرب کے قافلے حج کے لیے آئیں تو راستوں پر لوگ بیٹھ جائیں اور یہ کہیں محمد (ﷺ) کی بات نہ سننا۔ پس بعض نے کہا کہ اس کو جادوگر کہو' اس بات کو انجمن نے رد کر دیا اور کہا کوئی بات سحر کی اس میں نہیں۔ بعض نے کہا شاعر کہو شعراءِ انجمن بول اٹھے اس کا کلام شعر بھی نہیں' شعر میں یہ خوبی کہاں۔ پس کسی نے کاہن کہا' اس فن کے لوگ بول اٹھے کہ نہ وہ جھاڑ پھونکی کرتا ہے نہ تعویذ گنڈا۔ الغرض اس کلام کی خوبی سے سب حیران تھے۔ مروی ہے کہ کسی شاعر نے خانہ کعبہ پر کچھ قصائد لکھوا کر لٹکا دیے تھے پس سورۂ کوثر نازل ہوئی تو سن کر حیران ہو گئے اور ان کو اتار پھینکا۔ ایک عرب نے یہ آیت سنی فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ سن کر سجدہ میں گر پڑا اور کہا میں اس کی فصاحت پر سجدہ کرتا ہوں۔ ۱۲ منہ

کوئی حالتِ غضب و رحم و سخاوت و کفایت شعاری وغیرہ صفاتِ متضادہ میں استقامت کہتا ہے مگر یہ نزاعِ لفظی ہے کیونکہ جو ایک چیز کا مقر ہے دوسرا اس کا انکار بھی نہیں کرتا اور جو ایک آدھ کم عقل نے کیا بھی تو وہ کس شمار اور کس قطار میں ہے؟ جیسا کہ نظام معتزلی۔ وہ کہتا ہے اگر نفسِ عبارتِ قرآن پر لحاظ کیا جائے تو ویسی عبارت ممکن ہے مگر جب معانی اور نفیس مطالب بھی اس کے ساتھ لحاظ کیے جائیں تب ممکن نہیں ہے۔ کیا سید احمد خان صاحب کے انکارِ ملائکہ و معجزات سے اس امر پر اجماعِ امت میں کچھ فرق آ سکتا ہے؟ پس حق یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز بجمیع وجوہ مذکور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی کسی وجہ کو کوئی کسی کو ترجیح دیتا ہے۔ ؏ وللناس فیما یعشقون مذاہب اب میں قبل اس کے کہ کسی قدر بلاغتِ قرآن بیان کروں اس کے مضامین کی نسبت عرض کرتا ہوں۔ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس میں ان عمدہ خوبیوں میں سے کوئی نہ ہو:

(۱) صفاتِ الٰہیہ مثلاً اس کا رحیم و کریم و ازلی و ابدی و غفور و قادر و علیم و حکیم و عادل و قدوس و محی و ممیت و معز و مذل ہونا۔

(۲) خدا کا جمیع نقائص اور عیوب سے پاک ہونا جیسا کہ حدوث و عجز و جہل و ظلم وغیرہ۔

(۳) توحیدِ خالص کی طرف بلانا اور شرک اور اس کی شاخ تثلیث کو مٹانا۔

(۴) انبیاء علیہم السلام کا اس طرح ذکر کرنا کہ جو لوگوں کو نیکی کی طرف داعی ہو نہ یہ کہ ان کی برائیاں[1] بیان ہوں کہ جس سے گمراہی پر لوگوں کو جرأت ہو۔

(۵) ملائکہ کا مخلوقِ الٰہی ہونا اور خدا کی فرمانبرداری اور عبادت کرنا۔

(۶) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کی مدح۔

(۷) منکروں کی برائی۔

(۸) اللہ اور ملائکہ اور انبیاء پر اور روزِ حساب پر ایمان لانے کی تاکید۔

(۹) یہ وعدہ کہ انجام کار ایمان والے بے ایمانوں پر غالب رہیں گے۔

(۱۰) قیامت اور جزائے اعمال کا بیان۔

(۱۱) جنت و دوزخ کا ذکر۔

(۱۲) دنیا کی برائی اور اس کی بے ثباتی۔

(۱۳) عقبیٰ اور اس کے ثبات کی مدح۔

(۱۴) اشیاء کی حلت و حرمت۔

(۱۵) احکامِ تدبیر المنزل کا بیان۔

(۱۶) احکامِ سیاستِ مدن کا بیان۔

(۱۷) تہذیب الاخلاق کی تعلیم اور مکارم اخلاق کی خوبی۔

---

[1] بخلاف عہدِ عتیق کے کہ اس میں انبیاء کا زناء کرنا وغیرہ باتیں مذکور ہیں۔ ۱۲ منہ

(۱۸) محبتِ الٰہی اور اس کے پاک لوگوں کے ساتھ محبت کرنے کی ترغیب۔

(۱۹) ان امور کا بیان کہ جو خدا تک رسائی کا ذریعہ اور اس کی خوشنودی کا باعث ہیں۔

(۲۰) فجار اور فساق کی صحبت سے عذر۔

(۲۱) عباداتِ بدنیہ اور مالیہ میں خلوصِ نیت کی تاکید۔

(۲۲) ریاکاری اور دکھلاوے کی عبادت کی مذمت۔

(۲۳) اخلاقِ ذمیمہ پر تہدید۔

(۲۴) بری باتوں کے ترک کرنے کی تاکید جیسا کہ غضب اور تکبر اور بخل اور جبن اور ظلم وغیرہ۔

(۲۵) احکام شرعیہ کا بیان۔

(۲۶) ذکرِ الٰہی کی طرف ترغیب۔

(۲۷) زمین و آسمان میں اپنے آثارِ قدرت و جبروت کا بیان۔

(۲۸) عالمِ کبیر و عالمِ صغیر میں غور اور تامل کرنے کا حکم۔

(۲۹) اگلے لوگوں کے سچے سچے واقعات کہ جن کے سننے سے انسان کے دل پر خدا کے غضب سے ڈر اور رحمت کی امید پیدا ہو۔

(۳۰) یہ بات کہ اس عالم کی جس قدر مخلوقات ہے سب کا وجودِ ظلی اسی کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی طرف لوٹ جائے گا۔

علاوہ ان کے اور بھی بہت سے عمدہ عمدہ مضامین قرآن میں ہیں کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں اور اسی لیے قرآن کو دریائے بے کنار کہا گیا ہے۔ اور اس کے لیے ظہر اور بطن آیا ہے۔ اب منصف غور کرے کہ اس قدر مضامین کو جن کی خوبی اور ضروری[1] ہونے میں کسی اہلِ عقل کو کلام نہیں قرآن نے کس بلاغت و فصاحت سے ادا کیا۔

(۱) تو وہ مفردات الفاظ اپنے کلام میں لایا کہ جو غرابت[2] اور تنافرِ حروف اور مخالفتِ قیاس سے بری ہیں اور پھر مجموعۂ

---

[1] اب میں پادری عماد الدین وغیرہ متعصب لوگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ خدا سے ڈر کر کہو کہ اس تعلیم محمدی میں کونسی بات قابلِ اعتراض ہے۔ پھر آپ صاحبوں نے بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے کے لیے ہدایت المسلمین اور تعلیمِ محمدی و میزان الحق وغیرہ کتابوں میں جزء کے جز کیوں سیاہ کیے ہیں اور لوگوں کو دھوکے کیوں دیے ہیں؟ کیا ان چپڑی چکنی باتوں سے تعلیمِ محمدی میں کچھ دھبہ لگ سکتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں! ہاں مگر آپ کو اس وقت کے مسلمانوں کے خلافِ سنت رسم و رواج پر اعتراض ہے تو بجا ہے مگر اس سے آپ صاحب بھی بری نہیں۔ اور اسی طرح میں عدمِ ضرورت کتاب کے مؤلف سے عرض کرتا ہوں کہ پادری صاحب آپ کو قرآن اور بائبل کا موازنہ کرنا تھا تو ایک کالم میں ان مضامینِ قرآن کو لانا تھا اور دوسرے میں ان کے مقابل بائبل سے مضامین لکھتے تب ضرورتِ قرآن آپ کو معلوم ہوتی۔ آپ نے تورات و انجیل کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ یہود کے نزدیک انجیل کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ تمام بائبل میں صرف مسیح کی سوانح عمری کے سوا اگر کوئی اپنی ماں سے زنا کرے تو اس کی سزا کا بھی حکم نہیں۔ پھر تعجب کہ کس بے شرمی سے قرآن کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ۱۲ منہ حقانی

[2] اگر کوئی کہے [illegible] قرآن مجید میں [illegible] اور غیر زبانوں کے بھی بہت سے الفاظ آئے ہیں۔ پھر غرابت سے ←

کلام کو ضعفِ تالیف اور تنافرِ کلمات اور تعقیدِ لفظی و معنی سے بچایا۔

(۲) کلام کو مقتضا حال کے مطابق کیا اعنی جہاں تقدیم مسند الیہ کا موقع تھا وہاں تقدیم کی' جہاں تاخیر کا مقام تھا تاخیر کی' تاکید جس قدر جہاں مطلوب تھی وہاں اسی قدر تاکید کی' جہاں وصل کا موقع تھا وہاں وصل کیا' جہاں فصل کا مقام تھا فصل

← کیونکر قرآن بری ہو سکتا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ غیر زبانوں کے الفاظ مستعمل ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ الفاظ اس زبان میں مستعمل نہ ہوں۔ دوم یہ کہ مستعمل ہوں۔ اول صورت میں تو بلا شک غرابت ہے اور دوسری غرابت نہیں بلکہ عین فصاحت ہے' مثلاً ہماری اردو زبان میں جو الفاظ انگریزی مثلاً لیمپ و پریس وغیرہ مستعمل ہیں اگر کوئی دہلی کا فصیح ان کو اپنے کلام میں لائے گا تو ہرگز اس کی فصاحت میں کچھ فرق نہ آئے گا بلکہ بڑا فصیح گنا جائے گا' ہاں اگر غیر مستعمل لفظ بولے گا تو اس کے کلام میں نقص ہوگا۔ پس قرآن مجید میں جس قدر الفاظ غیر زبانوں کے وارد ہیں وہ ہیں کہ جو عرب کے نزدیک مروج اور مستعمل تھے کیونکہ ان الفاظ پر کبھی کوئی اہلِ زبان نہ چونکا' نہ کسی کو ان کے معانی دریافت کرنے کی ضرورت پڑی۔ پادری عماد الدین نے تھوڑی سی تنخواہِ مشن کے لیے پادریوں میں بڑی قابلیت جتلائی ہے اور ہدایت المسلمین میں چند فصول رد قرآن میں لکھی ہیں۔ فصل اول جو صفحہ ۳۰۲ سے صفحہ ۳۴۲ تک ہے اس میں کسی قدر بے تک مختصر المعانی کی عبارت فصاحت و بلاغت میں لکھ کر ترجمہ کیا ہے اور چند لغو باتیں بھی کہی ہیں۔

(۱) صفحہ ۳۱۲ میں لکھا ہے کہ قولہ ''بعض محمدی علماء نے بھی مثل مزدار و معمر اور نظام کے اس کے اعلیٰ درجہ کی فصاحت کا انکار کیا ہے۔'' انتہٰی یہ بالکل جھوٹ ہے' اگر سچ ہو تو ثابت کرو۔

(۲) یہ کہ فصاحت و بلاغت کے قواعد از خود مسلمانوں نے گھڑ لیے ہیں۔ قرآن کو اشعارِ عرب سے مقابلہ کر کے دکھاتے تو ہم جانتے۔
اقول: یہ لغو گفتگو ہے اگر آپ کو ان اشعار کا علم نہ ہو تو یہ تمہارا ہی قصور ہے خود اتقان میں ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان محاورات کے ثبوت میں جاہلیت کے اشعار سند میں پڑھ کر سنائے اور یہ قواعد تو ایسے ہیں کہ جن کو ہر ذی عقل تسلیم کرتا ہے اور ہر زبان میں جاری ہو سکتے ہیں اور اکثر جاہلیت کے اشعار سے مستنبط ہیں۔ خود اہلِ معانی نے ان اشعار کو لکھا ہے علاوہ اس کے اگر ان قواعد میں قصور ہو تو بیان کرو۔

(۳) جہاں اتقان میں علاوہ حجازِ عرب کے اور زبانوں کے الفاظ گنوائے ہیں اور ان زبانوں کی تفصیل لکھی ہے وہاں نہ یہ کہا ہے کہ یہ لفظ غیر مانوستہ الاستعمال ہیں نہ ان کو وحشی بتلایا ہے۔ یہ فقط آپ کی چالاکی ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ اور زبانیں جٹا شاہی اور لغو اور بیہودہ ہیں کیونکہ یہ بات کسی زبان کی نسبت نہیں کہی جاتی۔
اب میں پادری صاحب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے جو صفحہ ۳۴۰ تک تفسیر اتقان سے ۱۸۴ لفظ غیر زبانوں کے نقل کیے ہیں اور پھر سخت زبان درازی کی ہے اور قرآن سے مقاماتِ حریری کو بہتر بتلایا ہے۔ یہ تو فرمایئے کہ ان میں سے کونسا لفظ غریب ہے اور غریب کے معنی جو اہلِ معانی نے لکھے ہیں (وھی کون الکلمۃ وحشیۃ غیر ظاہرۃ المعنی ولا مانوستہ الاستعمال) ان میں سے کس پر صادق آتے ہیں؟ جب آپ خود اقرار کر چکے ہیں کہ مکہ میں میلہ ہوتا تھا ہر ملک کے لوگ آتے تھے یہ لفظ محمد (ﷺ) نے ان سے سیکھ لیے تھے تو پھر یہ کہاں سے آپ نے ثابت کیا کہ یہ الفاظ خاص محمد ﷺ نے سیکھے تھے؟ بلکہ آپ کے اقرار کے بموجب تو ان کو عام قریش جانتے کیا بلکہ روزمرہ بولتے تھے پس جب کہ یہ مستعمل تھے تو گو اصل ان کی اور زبانوں سے ہو ان کے استعمال سے کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ کیا آج انگریزوں کے میل جول سے دہلی لکھنؤ کے فصحاء صدہا الفاظ انگریزی جو کہ مستعمل ہیں نہیں بولتے؟ پھر کیا ان کو گنوار اور جٹا شاہی بولی کہہ سکتے ہیں؟ انصاف فرمایئے۔ اب جب تک آپ ان الفاظ پر غرابتِ مصطلحہ کے معنی صادق نہ کر دیں اعتراض نہ کریں گو ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی چند سبق مختصر المعانی کے پڑھے تھے۔ کج طبعی آپ کی جبلی ہے اصل معنی غرابت کے نہ سمجھے غیر زبان کا ہونا غریب ہونا سمجھ بیٹھے اور ایک فصل کی فصل اس بارے میں لکھ دی کہ مشن میں تنخواہ کا اضافہ ہو جائے مگر اہلِ علم میں اپنی قلعی کھلوائی۔ مدارس کے طلبا بھی آپ کی لیاقت پر ہنستے ہیں۔
اب یہ جس طرح آپ کی فصل کا جواب تحقیقی ہو چکا ہے آپ کے ہم عصر ماسٹر رامچند روغیرہ ناواقفوں کا جواب بھی ہو چکا۔ آپ کو علم نہ تھا کاش عقلِ سلیم ہی ہوتی۔ آپ یہ نہ سمجھے کہ اگر یہ الفاظ وحشی اور غیر مانوستہ الاستعمال ہوتے تو حضرت محمد ﷺ کو جن کی عقلِ سلیم کے جمہور عیسائی بھی مقر ہیں باوجود دعوٰی فصاحت کا ہے تو قرآن میں داخل کرتے بھلا کوئی بھی عاقل ایسا کرتا ہے اور اگر یہ تھا تو جب آپ جیسے ہندی نژاد کو یہ نکتہ چینی ممکن ہوئی تو کیا قریش کو نہ ہوتی۔ کوئی تو کہتا کہ حضرت آپ کہاں کے الفاظ بول رہے ہیں اور ذرا دل میں شرماؤ اور عذابِ اخروی سے ڈرو۔ واللہ الہادی۔ ۱۲ منہ

کیا' جہاں نکرہ لانے کا موقع تھا نکرہ لایا اور جہاں معرفہ لانے کی جگہ تھی وہاں معرفہ کا استعمال کیا۔ اسنادِ حقیقی کے موقع پر اسنادِ حقیقی اور مجازی کے موقع پر مجازی قصر جس درجہ کی مطلوب تھی وہاں اسی درجہ کی قصر اِنَّمَا وغیرہ ادوات قصر سے کی۔ جہاں مفعول ظاہر کرنے کا موقع تھا وہاں مفعول ظاہر کیا اور جہاں ترک کا موقع تھا ترک کر کے فعل کو عام یا لازمی کیسا بنا دیا۔ جہاں ایجاز مطلوب تھا ایجاز اور جہاں اطناب مقصود تھا وہاں اطناب اور مساوات کی جگہ مساوات کی رعایت رکھی۔ اب ہم ایجازِ قصر کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ عرب میں قصاص کے بارے میں یہ قول مشہور تھا القتل انفی للقتل اس کی جگہ قرآن میں یہ نازل ہوا ﴿فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ﴾ اب دیکھئے یہ کلام پہلے کلام سے بچند وجوہ بڑھ کر ہے:

(۱) تو باوجود مقصد پورا ادا کرنے کے اس کے حرف کم ہیں کیونکہ اس کے گیارہ حرف ہیں اور اس کے حروف ملفوظ چودہ ہیں۔

(۲) اس میں مقصودِ اصلی (قصاص سے لوگوں کی زندگی) کی تصریح ہے اس میں نہیں۔

(۳) حیوۃ کی تنوین میں تعظیم پائی جاتی ہے یعنی قصاص سے تمہارے لیے بڑی زندگانی حاصل ہوتی ہے کیونکہ جب قصاص جاری ہوگا تو کوئی کسی کو نہ مارے گا ورنہ ایک شخص کو مثلاً کوئی مارتا اور اس کے بدلے میں قاتل اور اس کے مددگار قتل کیے جاتے۔ اب ایک جماعت قتل سے بچ گئی تو قصاص میں بڑی حیات حاصل ہوئی۔

(۴) یا یہ تنوین نوعیت کا فائدہ دیتی ہے اور وہ یہ کہ قاتل کو قصاص میں مارے جانے سے بسبب باز رہنے کے اور مقتول کو قتل ہونے سے حاصل ہوئی۔

(۵) یہ ہر موقع پر صادق آتا ہے کیونکہ کوئی ایسا قصاص نہیں کہ جس میں حیات نہ ہو بخلاف القتل الخ کے کیونکہ ہر قتل قتل کو نہیں مٹاتا بلکہ جو قتل ناحق ہے وہ تو اور بھی قتل کی ترغیب دیتا ہے۔

(۶) اس میں لفظ مقرر نہیں۔

(۷) اس میں مقدار اور محذوف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۸) صنعتِ مطابقت حاصل ہے کیونکہ قصاص اور حیات میں تقابل ہے اور جمع متقابلین سے صنعتِ مذکورہ حاصل ہوتی ہے۔

(۳) باوجود ان رعایتوں کے کلام میں ظہور اور خفا مراد کا لحاظ کیا۔ پس کبھی تشبیہ دے کر بیان فرمایا اور تشبیہ میں جہت مشبہ اور مشبہ بہ کی پوری رعایت رکھی۔ جہاں زیادہ مبالغہ تشبیہ میں مقصود ہوا وہاں کاف وکان وغیرہ ادواتِ تشبیہ کو بالکل حذف کر دیا اور جہاں استعارہ کا موقع دیکھا وہاں استعارہ تخیلیہ یا مکنیہ یا ترشیحیہ کو جیسا جس کا موقع دیکھا مع قرائن حالیہ و مقالیہ کے ذکر فرمایا اور جہاں کنایہ مناسب جانا وہاں کنایہ سے کام لیا اور اسی طرح تمثیل کے موقع پر تمثیل کو مع رعایتِ شرائط ذکر کیا۔

(۴) ان سب کی رعایت کے بعد پھر کلام میں ان وجوہ کی رعایت رکھی کہ جن سے کلام میں اور بھی حسن و خوبی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ دو قسم ہیں ایک معنویہ' دوم لفظیہ۔ وجوہِ معنوہ میں سے مطابقت اور مراعات النظیر اور (تشابہ الاطراف) اور

ارصاد اور مشاکلت اور عکس اور ایہام اور استخدام اور لف ونشر اور جمع اور تفریق اور جمع مع التفریق اور جمع مع التقسیم اور حسن
تعلیل وغیرہ ذلک کو ذکر کیا اور محسناتِ لفظیہ میں سے تجنیس اور رد العجز علی الصدر اور قلب کو کہ جو حروف کو الٹنے سے پھر وہی
جملہ مرکب ہو جائے جیسا کہ کل فی فلک اور ربک فکبر اور لزوم مالا یلزم کو بھی اور وہ یہ ہے کہ حرف ردی اور اس کے قائم مقام
کے پہلے وہ لایا جائے کہ جس کا لانا کچھ ضرور نہ تھا لیکن کلام کو رونق ہو جاتی ہے جیسا کہ ﴿ اَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ
فَلَا تَنْهَرْ ﴾ اور سجع کو ملحوظ رکھا مگر قرآن میں اس کو فواصل کہتے ہیں اور یہ نثر میں ایسی چیز ہے کہ جیسا نظم میں قافیہ ہوتا ہے (۵)
ایک ایسی بات کی رعایت رکھی کہ جس کی رعایت کرنا شعراء کو محال کیا بلکہ محال سے بھی بڑھ کر ہے بلکہ کوئی کیسا ہی بلیغ وفصیح
کیوں نہ ہو وہ بھی اس کو نہیں پورا کر سکتا چہ جائیکہ جناب رسول اللہ ﷺ کہ جنہوں نے ساری عمر کوئی شعر بھی نہیں کہا نہ شعراء
کی مجالس میں بیٹھے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ اسی قادرِ مطلق کا کلام ہے۔ اس بات کے بیان کرنے سے پہلے ہم ایک مقدمہ بیان
کرتے ہیں تا کہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے۔

مقدمہ: کل آباد اور شائستہ ملکوں کے رہنے والوں کی ایک جبلی عادت ہے کہ ان کو کلامِ مسجع اور مقفّٰی میں خواہ وہ نظم ہو
خواہ نثر ایک عجیب لذت اور سرور معلوم ہوتا ہے اور کلامِ موزوں سے ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھئے جب ایک کلام (کہ
جس کے بعض اجزا باہم موافق ہوتے ہیں) مخاطب سنتا ہے کس قدر محظوظ ہوتا ہے اور جب دوسری بیت اسی طرح کی اس کے
کان میں پڑتی ہے تو اور بھی لذت آتی ہے اور جب تیسری بیت سنتا ہے کہ جو دونوں سے قافیہ میں شریک ہے اور بھی دل خوش
ہوتا ہے (شاید پادریوں کو مزہ نہ معلوم ہوتا ہو)۔ پس اس قدر میں تو عرب وعجم و ہندو انگریز سب شریک ہیں مگر بیت کے
توافق اجزا اور قافیہ میں اختلاف ہے۔ پس عرب نے تو وہ قانون اختیار کیا ہے جس کو خلیل نے وضع کیا ہے کہ مستفعلن کی جگہ
مفاعلن و مفتعلن قائم کرتے اور فاعلاتن اور فاعلتن کو ایک ہی قاعدہ پر سمجھتے ہیں اور حشو میں بہت سے زحافات جائز رکھتے
ہیں بخلاف شعرائے ایران کے کہ ان کے نزدیک زحاف مکروہ ہے اور اسی طرح عرب کے نزدیک اگر ایک بیت میں قافیہ قبور
ہے تو دوسری میں منیر درست ہے اور اسی طرح ایک کلمہ کا ایک حرف ایک مصرعے میں اور باقی دوسرے مصرعے میں جائز
رکھتے ہیں۔ وقس علی ہذا۔ اور اہلِ ہند کے نزدیک اشعار میں حروف کا شمار برابر ہونا چاہیے باقی حرکت وسکون کی موافقت کچھ
ضروری نہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں دونوں مصرعوں کے حروف میں برابری بھی کوئی شرط نہیں جس نے انگریزی کے
اشعار اور بدوؤں کی تعزیدات اور ہندوستان میں دیہاتیوں کی نظم اور دھوبی سقوں کے کھنڈ سنے ہوں گے وہ اس بات سے
بخوبی ماہر ہوگا۔ اور کلغی اور طرہ[1] والوں کی مرہٹی اور خیال اسی قسم کے ہیں۔ الغرض ہر ایک قوم اور ہر ایک زمانہ میں ایک قاعدہ

[1] اس کلام میں باوجود یہ کہ صاف طور پر اس بات کا ذکر ہے (کہ ہر قوم کا شعر اور اس کے اوزان جداگانہ ہیں، یہاں تک کہ دھوبی سقوں کے کھنڈ بھی ایک کلام موزوں ہے کہ جس کو وہ شعر سمجھتے اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس لیے حکماء کے نزدیک ہنوز شعر کی حقیقت کی تعیین نہیں ہوئی۔ اور یہ بات بدیہی ہے نہ اس سے یہ مقصود ہے کہ قرآن میں دھوبی سقوں کے کھنڈ ہیں۔ یہ بات تو یہاں سے کسی طرح بھی سمجھی نہیں جاتی) مگر امام پادری کے فہمِ سلیم پر آفرین ہے کہ اس نے یہی سمجھ لیا اور جواب سے عاجز ہو کر عام مسلمانوں کی تفسیر شریف سے بد اعتقاد کرنے کے لیے شور مچا دیا کہ مفسرِ قرآن میں دھوبی سقوں کے کھنڈ موجود ہونا بیان کرتا ہے لیکن اس کے بعد جس نے اصل مقام کو دیکھا تو معترض کی جہالت پر سخت تاسف کیا۔ ۱۲ منہ حقانی

خاص ہے کہ جس کی رعایت رکھنے سے ان لوگوں کو کلام میں لذت حاصل ہوتی ہے جس طرح کہ راگ میں آوازِ موزوں سے
ہر ایک قوم لذت پانے پر متفق ہے۔ باقی راگ اور راگنیوں اور سروں کے قاعدے ہر ایک قوم کے اپنے اپنے مذاق پر الگ
الگ ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ کلام کی موزونیت پر تمام متفق ہیں اور اتفاق ایک تخمینی اور انتزاعی امر میں ہے کہ جو سب سے بحذفِ
مشخصات حاصل ہوتا ہے جس طرح کہ تمام آدمیوں کی صورتیں مختلف ہیں اور نہایت فرق ہے مگر پھر سب ایک امرِ خاص میں
شریک ہیں کہ جس کو انسانیت کہنا چاہیے۔ پس جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تو اب ہم وہ بات بتاتے ہیں کہ جس کی خدا تعالیٰ
نے اپنے کلام میں رعایت رکھی ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کو یہ مقصود تھا کہ اپنے بندوں سے اس طرح کلام کرے کہ جس سے
ان کو لذت آئے اور چونکہ یہ کتاب تمام جہان کے لیے بھیجی گئی ہے اور اولاً بالذات عرب مخاطب بنائے گئے ہیں اس لیے اس
کی زبان تو عربی رکھی مگر اس کی موزونیت میں تمام جہان کی طبائع کی رعایت رکھی یعنی اس امرِ مطلق کی رعایت رکھی کہ جو
سب میں مشترک ہے اور وہ قاعدہ جاری کیا کہ جو ہر زمانے میں ہر قوم کے ذوقِ سلیم سے مناسبت رکھتا ہے۔

وہ قاعدہ یہ ہے کہ یہ تمام بنی آدم کی جبلی عادت ہے کہ چند کلمات کے بعد دم ٹوٹ جاتا ہے گو مشقت سے دم کھینچ سکتا
اور کم بھی کر سکتا ہے کیونکہ جب دم لے کر کوئی بات منہ سے بولتا ہے تو جس قدر دم کم ہو جاتا ہے اسی قدر طبیعت پر اضمحلال
پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب یہ دم تمام ہو جاتا ہے تو بالکل چپ ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا دم لے کر بات کرتا ہے۔ پس
جہاں تک کہ ایک سانس میں کلام کرتا ہے وہ ایک حد مبہم غیر معین ہے لیکن یہ مقدار کم سے کم دو کلمہ کی اور زیادہ سے زیادہ چار
کلمہ کی گنجائش رکھتی ہے۔ پس اس حد کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام میں ایک وزنِ خاص معین فرمایا ہے۔ جس طرح کہ شعرا اپنے
اشعار کے لیے کوئی وزن اور بحرِ خاص معین کرتے ہیں اور جس طرح اس وزن میں اوتاد اور اسباب اور بعض ارکان کے تقدیم
کی بعض پر گنجائش ہوتی ہے اسی طرح اس حدِ مبہم میں ہے اور اس حدِ مبہم کو آیت کہتے ہیں۔ پھر ان آیات کو تین قسم پر تقسیم کیا
گیا ہے طویل جیسا کہ سورۂ نساء میں ہے اور متوسط جیسا کہ سورۂ اعراف میں اور سورۂ انعام میں ہیں اور قصیر جیسا کہ سورۂ شعرا
اور سورۂ دخان میں ہیں اور پھر جس طرح کہ ہر شعر میں قافیہ اور ردی ہوتی ہے اسی طرح آیات میں جس کلمہ پر کہ دم ٹوٹا ہے
اس کو بجائے ردی اور قافیہ کے مقرر کیا اور جس پر دم ٹوٹتا ہے وہ مدہ[1] ہے کہ جس سے پہلے کوئی حرف قافیہ ضرور ہوتا ہے کہ جس
کے بار بار آنے سے صاحبِ ذوقِ سلیم کو لذت اور کیفیت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ رحیم وکریم لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے کلام میں
یہ وسعت رکھی کہ ایک آیت میں مدہ ہو تو اس کے بعد دوسری آیت میں خاص اسی مدہ کی اور اس کے ماقبل کے حرف کی
تخصیص نہیں کی بلکہ دوسری آیت میں کوئی مدہ ہو خواہ ''الف'' ہو خواہ ''یا'' ہو یا ''واؤ'' ہو اور ان کے پیشتر خواہ باء ہو خواہ لام
اور اسی طرح آخر کا کوئی حرف کیوں نہ ہو۔ پس یعلمون اور مؤمنین اور مستقیم موافقی ہیں اور اسی طرح مرتج وتحید وتبارو

[1] مدہ اصطلاح صرف ان حروفِ علت یعنی واؤ، یا، الف کو کہتے ہیں کہ جو ساکن ہوں اور ان سے پیشتر کے حرف پر جو حرکت ہو وہ ان کے موافق بھی ہو، جیسا کہ غفور میں واؤ ساکن مدہ ہے اور اس سے پیشتر جو فا ہے اس پر ضمہ ہے اور ضمہ کو واؤ سے مناسبت ہے جس طرح کہ یا سے زیر کو اور الف سے زبر کو۔ ۱۲ منہ

فواق وعجاب سب ایک ہی قاعدہ پر ہیں۔ اور اسی طرح سب سے آخر میں الف کا آنا بھی ایک لذت دیتا ہے گو حرفِ ردی مختلف ہو جیسا کہ ایک جگہ رحیما ایک جگہ حدیثا اور ایک جگہ نصیرا اور اگر موافقتِ حرفِ ردی کا بھی التزام ہوگا تو اور زیادہ لطف معلوم ہوگا جیسا کہ اوائل سورۂ مریم اور سورۂ فرقان میں واقع ہوا۔ اور اسی طرح سب آیات کا ایک حرف میں شریک ہونا اور بھی لطف دیتا ہے جیسا کہ سورۂ قتال میں سب سے آخر میں میم اور سورۂ رحمٰن میں نون ہے۔ اور اسی طرح ایک جملہ کا اعادہ کرنا بعد ایک کلام کے عجب کیفیت بخشتا ہے جیسا کہ سورۂ قمر اور سورۂ الرحمٰن اور سورۂ مرسلات میں واقع ہے کہ بار بار فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ وغیرہ آیات کا اعادہ کیا گیا ہے جیسا کہ شعراء چار مصرعوں کے بعد ہر جگہ ایک پانچواں مصرعہ لگایا کرتے ہیں اور کبھی ذہنِ سامع کو طرب ونشاط دینے کے لیے یہ بھی کیا ہے کہ فواصلِ کلام کو بدل دیا ہے مثلاً اِدًّا وہدًّا آخری سورۂ مریم میں اور سَلَامًا وَكِرَامًا آخری سورۂ فرقان میں اور طین و ساجدین و ینظرون آخری سورۂ ص میں وارد ہے باجودیکہ ان سب کے اوائل میں اور فواصل ہیں کما لایخفی۔ اور ایک لطف اور کیا کہ آیت کا حرف آخری اگر قافیہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو خیر ورنہ اس کو دوسرے جملے سے ملا دیا کہ جس میں نعمائے الٰہی کا ذکر ہے یا مخاطب کو تنبیہ ہے جیسا کہ فرماتا ہے وهو الحكيم الخبير وكان الله عليما حكيما وكان الله بما تعلمون خبيرا لعلكم تتقون اور کبھی ان مواضع میں کلام کو دراز کر دیا۔ مثلاً فاسئل به خبيرا اور کبھی تقدیم اور کبھی تاخیر اور کبھی قلب اور کبھی زیادت کو تحسینِ کلام کے لیے عمل میں لایا۔ الیاس کی جگہ الیاسین اور طورِ سینا کی جگہ طورِ سینین کہا۔ اور کہیں پہلے فقرے سے دوسرا چھوٹا کر دیا اور کہیں بالعکس کیا جیسا کہ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ اور کبھی ایک آیت میں چند فواصل جمع کیے جس طرح کہ بعض شعراء اپنے اشعار میں متعدد قوافی لاتے ہیں جیسا کہ اس بیت میں

"كالزهر في ترف والبدر في شرف، والبحر في كرم والدهر في همم

الغرض اس طرح کی وہ وہ رعایتیں رکھیں کہ جن کو ہر ایک قوم اور ہر زمانے کے لوگ اپنے اشعار میں مرعی رکھ کر لذت اٹھاتے اور لطف پاتے ہیں۔ جو شخص فواصلِ قرآن اور ہر ملک کے اشعار کو جانتا ہے ہمارے کلام کی تصدیق کرے گا مگر میں اس مختصر میں ان کے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ؎ دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار، گلچیں بہارِ تو زداماں گلہ دارد

(۶) باوجود ان سب خوبیوں کے اپنی عظمت اور جلالِ کبریائی کو مرعی رکھا۔ سورِ قرآن کو شاہی فرمانوں کی صورت میں نازل فرمایا اور ابتدا سے انتہا تک اس کو ملحوظ رکھا۔ پس جس طرح سے کہ بادشاہ بعض فرمانوں کی ابتدا میں حمدِ الٰہی ذکر کرتے ہیں اور بعض میں محض غرض اور مطلب ہی پر بس کرتے ہیں اور بعض کو مرسل اور مرسل الیہ کے نام سے شروع کرتے ہیں اور بعض بغیر عنوان ہی کے رقعہ ہوتے ہیں اور بعض مطول اور بعض مختصر ہوتے ہیں اور بعض کی ابتدا میں چند الفاظ مقررہ سے کسی غرض کی طرف اشارہ ہوتا ہے یا وہ حرف جملوں سے اختصار کے طور پر لیے جاتے ہیں جس طرح عنوان نامہ پر خلاصہ مطلب لکھ دیتے ہیں اسی طرح ان حروف سے اشارہ اسی مطلوب کی طرف کر دیتے ہیں۔

اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنی بعض سورتوں کو حمد سے شروع کیا اور بعض کو تسبیح سے اور بعض کو غرضِ املاء سے جیسا کہ فرمایا ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ وقال سُوْرَةٌ اَنْزَلْنَاهَا وَ فَرَضْنَاهَا اور بعض میں اپنی طرف سے ہونا بتلا دیا ہے

جیسا کہ فرمایا تَنْزِيْلَ الْكِتَابَ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ اور بعض کو بغیر عنوان کے شروع فرمایا جیسا کہ اذا جاءك المنافقون و قد سمع الله الآیہ یاایها النبی لم تحرم اور بعض کی ابتدا میں حروف مقطعات لایا الم حم وغیرہ۔

(۷) وہ بات بھی ملحوظ رکھی کہ جو عرب اپنے قصائد میں رکھتے تھے۔ وہ یہ کہ اپنے قصائد میں جب بلاغت وفصاحت کا زور دکھانا چاہتے تھے تو قصیدہ کے اول میں مواضعِ عجیبہ اور وقائعِ ہائلہ کا ذکر کر کے تشبیب سے شروع کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے بھی بعض سورتوں میں اسی طرز کو اختیار فرمایا جیسا کہ فرمایا ہی وَالصَّافَّاتِ صَفًّا فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا الآیات وَالذّٰرِيَاتِ ذَرْوًا فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ۔

(۸) سب میں بڑھ کر بلاغتِ کلام کے لیے یہ امر ضرور دیکھا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا اور وسط اور آخر کو کیا نسبت ہے؟ اگر تینوں موقعوں پر کلام عالی اور مطلب خیز ہے تو ٹھیک ورنہ وہ کلام درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا ہے۔ آپ نے بعض انجمنوں اور کمیٹیوں میں لوگوں کو لیکچر دیتے اور اسپیچ یا خطبہ پڑھتے سنا ہوگا بعض صاحبوں کے کلام میں ابتدا میں بڑا زور ہوتا ہے، وسط میں کلام بے لطف ہوتا ہے اور آخر تو بالکل پھیکا بے نمک ہوتا ہے گویا کہ اس کو اول کلام سے کچھ ربط ہی نہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ جیسا کہ کسی چیز کو بلند اٹھایا اور پھر دھم سے زمین پر دے مارا اور بعض صاحبوں کے کلام میں آخر پر زور ہوتا ہے اور بعض کسی قدر بیچ میں گرم ہوتے ہیں ورنہ یوں ہی ہچ ہچ کر کے رہ جاتے ہیں اور بعض کلام تو محض خواب کا ہذیان اور تقریرِ پریشان ہوتی ہے مگر قرآن مجید میں ان تینوں موقعوں پر کمال درجہ کی بلاغت ہے اور آخرِ سور میں وہ کلماتِ جامعہ ذکر فرمائے ہیں جو احکامِ سابقہ اور کلامِ گزشتہ کے لیے ایک مہر کہیں تو بجا ہے اور تنبیہ کہیں تو روا ہے، دیکھئے سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے جب مخاصمہ شروع کیا تو یابنی اسرائیل اذکروا الآیہ سے کیا اور جب ان کو الزام دے کر سخن تمام کیا تو اسی کو پھر یاد دلایا اور اسی طرح سورۃ آل عمران میں یہود و نصاریٰ سے جب گفتگو شروع کی تو اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامِ کہہ دیا تا کہ محلِ نزاع قرار پائے، پھر اس کے بعد ادلہ قائم کر کے کس خوبی سے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا۔ وله المثل الاعلیٰ

(۹) سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قرآن مجید میں راست بازی اور سچائی کے ساتھ بلا مبالغہ شاعرانہ کلام ہے مگر بلاغت میں اعلیٰ مقام ہے ورنہ جو اس بات کا التزام کرتا ہے اس کا کلام بے نمک ہو جاتا ہے اس لیے حسان اور لبید کے وہ اشعار جو زمانۂ جاہلیت کے ہیں نہایت بلیغ ہیں اور اسلام کے ذرا پھیکے ہیں۔

(۱۰) شاعری جتلانے اور فصاحت و بلاغت کے گھوڑے دوڑانے کا میدان رزم و بزم، مدحِ حسن و جمال، وصفِ زلف وخال وغیرہ امور سے ہوتے ہیں اور حکیمانہ باتوں میں آ کر قافیہ تنگ ہو جاتا ہے اور ذرا کسی بڑے شاعر سے دو چار جز مسائل میراث وفقہ میں لکھوایئے پھر شاعری ملاحظہ فرمایئے مگر قرآن میں باوجود اس التزام کے پھر اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے۔

(۱۱) جب کوئی فصیح و بلیغ ایک مضمون کو ایک بار کہہ کے پھر کہتا ہے تو وہ لطف نہیں رہتا لیکن قرآن نے مقرر مضامین بیان فرمائے مگر ہر ایک جگہ جدا لطف ہے۔

(۱۲) ہر ایک فصیح و بلیغ ایک خاص امر میں مشہور ہوتا ہے، کوئی رزم میں کوئی بزم میں مگر قرآن ہر بات میں یکساں بلاغت رکھتا ہے۔ اب کوئی شخص ان پڑھ ایسے ملک کا باشندہ اور ایسا ہے جو کہ شعر وسخن سے آشنا ہی نہ ہو ایسے مضامین کو ان

علومِ لسانِ قرآن کی طرف بھی حاجت پڑتی گئی اور یہ مجموعہ ایک سے دوسرے تک نقل ہوتا چلا آیا اور یوماً فیوماً اس میں تحقیقات اور تدقیقات اور زائد ہوتی گئیں۔ پس ایک علم مدون ہو گیا کہ جس کو علماء نے کتابوں میں لکھنا شروع کیا اور جس طرح کہ اور علوم کتب میں مدون کئے گئے یہ بھی کیا گیا۔ پس اب فنِ تفسیر وہ نہ رہا جو کہ خاص صحابہ ؓ کے عہد میں تھا اور جس میں بالرائے کلام کرنا حرام تھا بلکہ اب علمِ تفسیر دو جز سے مرکب ہوا' ایک جز اصلی تو وہی تفسیرِ حقیقی۔ دوسرا جز حلِ لغات و بیانِ محاورات و دفعِ اشکالات وغیرہ۔ علوم جز اول کو نقلی کہتے ہیں۔ یہ آثارِ سلف و اقوالِ قدما کی طرف مستند ہے جس کی شاخیں معرفت ناسخ و منسوخ و اسباب النزول و مقاصدِ آیات و شرح مجمل قرآنی ہے۔ اس فن کے ائمہ طبری و قتادہ و سدی و ابو العالیہ وغیرہ مفسرین ہیں ان میں ابن جریر ابو جعفر طبری ؒ نے کہ جن کا انتقال تین سو دس ہجری میں ہوا ہے اپنی کتاب میں کہ جس کو تفسیر ابن جریر کہتے ہیں۔ ان منقولات کو جمع کر دیا ہے اور اسی طرح حافظ ابو بکر عبد اللہ بن ابی شیبہ وغیرہ محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کو جمع کیا مگر رطب و یابس صحیح و غلط اُن میں سب کچھ ہے کیونکہ اکثر روایات ان میں اہلِ کتاب سے منقول ہیں اس لیے کہ جو اہلِ کتاب اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے وہ صحیح و غلط باتیں کہ جو ان کی کتابوں میں بھری پڑی تھیں نقل کیں۔ لوگوں نے ان کو متبرک سمجھ کر روایت کیا پھر کسی نے ان کو رواج دینے کے لیے جناب نبی ﷺ کی طرف اور کسی نے حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ کی طرف اور کسی نے کعب احبار اور وہب بن منبہ کی طرف منسوب کر دیا۔ جلال الدین سیوطی کی تفسیر درِ منثور بھی اسی قسم کی ہے۔ اور اس وقت مخالفین یہود و نصاریٰ و ہنود جو کچھ اعتراضات قرآن اور اسلام اور پیغمبر علیہ السلام پر کرتے ہیں ان کی بنیاد انہیں لغو روایات پر ہے کہ جن کا اسلام میں کچھ بھی اعتبار نہیں اور قصہ زینب بنت جحش اور تلک الغرانیق العلی اور زمین و آسمان کی کائنات اور زمین کا سات طبقے ہونا اور ہر طبقے میں اسی قسم کی کائنات اور زمین کا بیل کے سینگ پر ہونا اور بیل کا مچھلی پر ہونا اور اس کے ہلنے سے زلزلہ آنا اور یاجوج و ماجوج کا ایک کان ایسا اور ایک ایسا ہونا اور زہرہ کا قصہ وغیرہ ذلک من الاسرائیلیات۔ سادہ لوح محدثوں کی خوش اعتقادی ہے اور بس ان علومِ خمسہ میں اس قسم کی وہ غلطی اور لغو باتیں ان راویوں نے ملائی ہیں کہ جن سے اصل مدعاءِ قرآن کو بھی الٹ پلٹ کر دیا۔ خدا محققین کو جزائے خیر عطا کرے۔ انہوں نے کھرا اور کھوٹا پرکھا اور لغو اور بے اصل باتوں کو کتبِ تفاسیر سے خارج کیا۔ متاخرین میں سے ابو محمد بن عطیہ مغربی اور قرطبی اور ابن الجوزی وغیرہ نے بھی بہت کچھ چھان بین کی ہے۔ اس بارے میں محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شانِ نزول و توجیہ مشکل کے بارے میں جو کچھ بخاری اور ترمذی اور حاکم نے بسندِ صحیح نقل کیا ہے بہت درست ہے اور حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ سے جو کچھ ابن ابی طلحہ اور ضحاک نے روایت کیا ہے اور پھر وہ روایت بسندِ صحیح بخاری وغیرہ محققین تک پہنچی ہے نہایت صحیح ہے۔

دوسرا جز تفسیر کا جس کو اول کے مقابلہ میں عقلی کہنا چاہیے بڑا بھاری ہے۔ اس کی طرف قرآن قرنِ اول کے بعد بالخصوص اس زمانہ میں سخت حاجت ہے۔ یہ جز بھی مفسرین کی افراط و تفریط سے خالی نہیں مثلاً قواعدِ صرف و نحو میں سیبویہ وغیرہ مدونینِ فن کی یہاں تک تقلید کی کہ ان کے قواعدِ مدونہ کو یہاں تک صحیح سمجھا کہ قرآن کے بامحاورہ فقروں میں جہاں کہیں کوئی بات خلافِ قاعدۂ مقررہ دیکھی کھینچ کھانچ کر بتکلف اس کی تاویل کی اور یوں نہ سمجھا کہ اہلِ زبان کا یہی محاورہ صحیح ہے۔ ہمارا

قاعدہ کلیہ نہیں والمقیمین الصلٰوۃ والمؤتون الزکٰوۃ وغیرہ میں عجب تکلفات کرتے ہیں۔ اور اسی طرح متصوفین ایسی توجیہاتِ باطلہ کرتے ہیں کہ جن سے اصل مدعا بالکل متروک ہو جاتا ہے بلکہ بعض جاہلوں نے تو یہی سمجھ لیا کہ ان کے سوا اور کوئی قرآن کو سمجھتا ہی نہیں اور ان سے بڑھ کر بعض دہریے اور لا مذہبوں نے تو اور بھی ستم کیا ہے کہ اپنے فلسفی اور ملحدانہ خیالات کے تابع قرآن کو کر لیا ہے۔ جس جگہ آیتِ قرآنیہ ان کے برخلاف ہیں وہاں نہ محاورۂ اہلِ زبان کی' نہ قواعدِ صرف و نحو کی' نہ اقوالِ سلف کی پابندی کی ہے بلکہ تاویل (جو دراصل انکار ہے) کر کے قرآن کی تفسیر تو کیا بلکہ اس کو محرف کر دیا ہے۔ معتزلہ تفاسیر ہمارے قول کے لیے شاہدِ عدل ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر آنریبل سید احمد خان صاحب کی تفسیر کو ملاحظہ فرما لیجئے کہ جس میں یورپ کے ملحدوں کی تقلید کر کے قرآن مجید کو بالکل محرف کیا ہے۔ خرقِ عادت اور معجزاتِ انبیاء اور ملائکہ اور جن اور شیطان اور نعمائے جنت و عقوباتِ دوزخ کا محض انکار کیا ہے اور پیغمبر علیہ السلام کی وحی اور نزولِ قرآن کو مجنونانہ خیال بتلایا ہے اور وجودِ آسمان اور اثرِ دعا وغیرہ بہت امورِ منصوصہ پر مضحکہ کیا ہے اور جب علماء نے ان کو ان کے بے اصل اقوال پر قائل کیا اور ان کی علومِ قرآن اور علومِ اسلام سے محض ناواقفیت ثابت کر دی تو کیا حیلہ کیا کہ لوگوں کے روبرو مجالسِ عامہ میں کچھ ابلہ فریب باتیں بنا کے اور رقت دلا کے یہ کہہ دیا کہ صاحبو! میرا عقیدہ وہی ہے جو سلف کا ہے مگر اس وقت اسلام پر علومِ جدیدہ سے وہ مصیبت برپا ہے جو بنی العباس کے عہد میں یونانی فلسفہ سے برپا تھی جس طرح اس وقت کے علماء نے ان کے جواب دینے کے لیے علمِ کلام بنایا۔ میں نے بھی ان اعتراضات کے دفع کرنے کے لیے کلامِ جدید کی بنیاد ڈالی اور اس وقت کی مصیبت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ پہلے تو علماء حجروں میں بیٹھ کر خیالی دلائل بنا کر ہی دفع کر دیتے تھے اور اب تو مخالفین دوربینوں وغیرہ آلات کے ذریعے سے مشاہدہ کرا دیتے ہیں انتہیٰ۔ یہ مضمون حضرت نے اخبار الاسلام اور علی گڈھ گزٹ میں چھپوایا ہے اور اس کے ہر فقرہ پر حضارِ مجلس نے بتقلیدِ یورپ بڑی تالیاں بجائی ہیں۔ خان صاحب سے کوئی پوچھے کہ دوربین وغیرہ آلات سے تو محسوسات نظر آیا کرتے ہیں ان سے غایۃ ما فی الباب محسوسات کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے مگر فرمایئے وجودِ ملائکہ اور معجزاتِ انبیاء وغیرہ امور کا (کہ جن کا آپ نے ملحدوں کا مقلد بن کر انکار کیا ہے) کونسی دوربین اور کس آلہ اور کونسے علومِ جدیدہ سے بطلان ہوتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام نے کسی ایسی بات کا دعویٰ ہی نہیں کیا کہ جس کو کوئی کسی آلہ یا کسی علمِ جدید یا کسی کمسٹری کے استحالہ وغیرہ سے باطل کر دے مگر آپ اس بات کو کیا جانیں؟ خیر عامیوں میں آپ کلامِ جدید کے مدون تو کہلائے۔ آپ سے تو پادریوں کے بیہودہ اعتراضات بھی دفع نہ ہو سکے آخر الامر پادری فنڈر کی بولی آپ بھی بولنے لگے ذرا میزان الحق کو ملاحظہ فرما لیجئے۔

الغرض اس قسم کی بے اعتدالیاں مفسروں نے کی ہیں خدا ان کو معاف کرے۔ المختصر فنِ تفسیر جب ان چیزوں سے مرکب ہوا تو اس کی یوں تعریف کرنی چاہیے کہ علمِ تفسیر وہ علم ہے کہ جس میں احوالِ قرآن من حیث القرآن بیان کیے جاتے ہیں اور بقدرِ طاقتِ بشریہ الفاظ سے جو کچھ خدا پاک کی مراد ہے وہ ظاہر کی جاتی ہے۔

موضوعِ تفسیر: موضوع اس فن کا قرآن مجید ہے اور غرض اس علم سے معانی اور مطالبِ قرآن کا جاننا ہے اور مبادی اس کی یعنی اس علم میں کار آمد صرف و نحو و لغت و معانی و بیان و فقہ و اصول' و حدیث و کلام وغیرہ علوم ہیں پس جو شخص اس زمانہ میں ان علومِ اسلامیہ سے محروم ہے خواہ کیسا ہی حکیم کیوں نہ ہو معرفتِ مطالبِ قرآن سے محروم ہے تو قرآن وہ کلام الٰہی

ہے کہ جو بواسطۂ جبرائیل جناب محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اور آنحضرت ﷺ کے بعد مصحفِ ابو بکر میں جمع کیا گیا۔

فصل ہفتم ناسخ ومنسوخ کی بحث

وہ امور کہ جن سے بحث کرنا مفسر کو ضرور ہے اور جن کے نہ جاننے سے مطالب فہمیِ قرآن میں قصور آتا ہے یہ ہیں:

(۱) ناسخ ومنسوخ کا پہچاننا واضح ہو کہ نسخ کے معنی لغتً میں کسی شے کا کسی شے کے ساتھ[1] مٹانا ہے پس صحابہ وتابعین و قدماء تو اس معنی لغوی کے لحاظ سے نسخ کا بہت سے معانی پر اطلاق کرتے تھے۔ اول یہ کہ ایک آیت کا وصف دوسری آیت سے انتہاءِ عمل میں بدل جائے۔ دوم معنی متبادر چھوڑ دوسری آیت سے معنی غیر متبادر مراد لیے جائیں۔

سوم کسی قید کا اتفاقی بیان کر دیا جائے۔ چہارم عام کو خاص بنایا جائے۔

پنجم منصوص میں اور جس کو اس پر ظاہرً اقیاس کیا گیا ہے کوئی فرق بیان کر دیا جائے۔

ششم جاہلیت کی رسم کو مٹایا جائے۔

ہفتم پہلی شریعت کو اٹھا دیا جائے۔

پس ان عام معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق بہت سی آیات پر ہو سکتا ہے اس لیے علماء نے پانچ سو آیات کو منسوخ شمار کیا ہے لیکن متاخرین نے جب نسخ کے معنی میں خوب غور کیا تو خاص اول معنی کو باقی رکھا۔

پس اس اعتبار سے آیاتِ منسوخہ بہت ہی کم ہیں۔ محققین کے نزدیک کل پانچ آیات منسوخ ہیں:

(اول) سورۂ بقرہ میں یہ آیت كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدُكُمُ الآیہ اس آیت میں وصیت فرض تھی جب آیتِ میراث نازل ہوئی تو یہ حکم اٹھ گیا اور آیتِ میراث جو اس کی ناسخ ہے یہ ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ الآیۃ اور حدیث لاوصیۃ لوارث اس کی مبین ہے۔

(دوم) یہ آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ الی قولہ مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ ۔اس آیت میں ایک سال بھر کی عدت فرض تھی۔ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہوگئی اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا اس آیت میں حکم آ گیا کہ جس عورت کا خاوند مر جائے صرف چار مہینے دس دن تک عدت میں رہے۔

(سوم) سورۂ انفال میں یہ آیت وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ الآیہ اس آیت میں اپنے سے دہ چند کفار کے ساتھ مقابلہ فرض تھا یہ حکم اس کے بعد کی آیت سے منسوخ ہو گیا اور دو چند سے مقابلہ کرنا باقی رہ گیا۔

چہارم سورۂ احزاب کی یہ آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ الآیہ (کہ جس میں آنحضرت علیہ السلام کو سوائے موجود بیویوں کے اور نکاح کرنا منع تھا) منسوخ ہوگئی اس سے پہلی آیت اس کی ناسخ ہے اور بعض کہتے ہیں اس آیت سے اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ۔

[1] النسخ فی اللغۃ بمعنی ابطال الشیء وقال القفال انہ للنقل والتحویل لنا انہ یقال نسخت الریح اثار القوم اذا عدمت و نسخت الشمس الظل، اذا عدم۔ ۱۲ تفسیر کبیرہ

(پنجم) سورۂ مجادلہ میں سے یہ آیت اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ الآیہ منسوخ ہوگئی۔ اس کے بعد کی آیت سے اس آیت میں یہ حکم تھا کہ جب کوئی رسول سے سرگوشی کرے تو پہلے کچھ صدقہ دے پھر یہ حکم جاتا رہا۔

ان آیات کے علاوہ اور کوئی آیت منسوخ نہیں بلکہ عام کی تخصیص وغیرہ قیودات کا فرق ہے کہ جس کو نسخ نہیں کہہ سکتے۔ اس نسخ کے کوئی یہ معنی نہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ کو اول میں نہ معلوم ہوا بعد میں پھر سمجھا جیسا کہ پادری الزام لگاتے ہیں۔ یہ احکام جن کو ہم منسوخ کہہ آئے ہیں موقوف تھے یعنی ان کا حکم ایک وقت تک تھا اور جب مصلحت مقتضی ہوئی تو یہ حکم دور کر دیا اور کیوں نہ ہو احکام مصلحت پر مبنی ہیں اور مصالح بدلتے رہتے ہیں اور اگر پادری صاحب اب بھی نہ سمجھیں گے اور پھر وہی سخن پروری کریں گے تو تورات وانجیل میں بہت سے احکام منسوخ ہیں۔ ہم ان کا حوالہ دیں گے۔ اول بضرورت بہن بھائی کا نکاح عہدِ آدم میں درست تھا بلکہ سارا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی علاتی بہن تھی جیسا کہ تورات سفر تکوین کے باب ۲۰ میں مصرح ہے حالانکہ یہ حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں منسوخ ہو گیا جیسا کہ سفر احبار کے باب ۱۸ میں اس نکاح کا حرام اور بمنزلہ زنا کے ہونا مذکور ہے۔

دوم نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے تمام جانور جو زمین پر چلتے ہیں حلال تھے جیسا کہ سفر تکوین کے ۹ باب میں مذکور ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام ہو گئے۔ منجملہ ان کے خنزیر ہے جیسا کہ سفر احبار کے ۱۱ باب میں مذکور ہے۔

سوم حضرت یعقوب علیہ السلام کے عہد میں دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا درست تھا چنانچہ خود حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں دو بہنیں تھیں ایک لیا دوسری راحیل، جو دونوں ان کے ماموں کی بیٹیاں تھیں جیسا کہ سفر تکوین کے ۲۹ باب میں مذکور ہے۔

چہارم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام تھے جیسا کہ سفر احبار میں تصریح ہے ان سب کو پولوس نے یک لخت حلال کر دیا جیسا کہ اس کے اس خط کے پہلے باب میں تصریح ہے کہ جو اس نے طیطوس کو لکھا تھا (کہ پاکوں کو سب چیزیں پاک ہیں۔)

پنجم احکام اعیاد بالخصوص تعظیمِ سبت[1] واجب تھی اور اس کو ابدی کہا ہے اور نہایت تاکید فرمائی ہے کہ جو اس روز کام کرے قتل کیا جائے۔ چنانچہ سفر تکوین کے ۲ باب اور سفر خروج کے ۲۰ باب میں تصریح ہے اور بہت جگہ تورات میں مذکور ہے لیکن اس حکم موکد کو پولوس نے بالکل رد کر دیا چنانچہ اس کے ان خطوط میں جو اس نے اہلِ رومہ اور طیطوس کو لکھے ہیں اس کی تصریح ہے اور سب عیسائی اس کے فتویٰ پر چلتے ہیں۔

ششم ختنہ کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ایک حکمِ ابدی تھا۔ چنانچہ تورات سفر احبار ۱۲ باب میں اس کی تاکید ہے اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا بھی ختنہ کیا گیا تھا جیسا کہ انجیل لوقا کے ۲ باب میں مذکور ہے لیکن پولوس نے اس حکم کو نہایت سختی سے رد کیا چنانچہ اس کے اس خط میں جو اہلِ اغلاطیہ کو لکھا ہے اس کے باب ۵ میں مذکور ہے۔

[1] ہفتہ کے دن کی تعظیم جیسا کہ اب تک یہودیوں میں ہے۔ ۱۲ منہ

ہفتم سب حواریوں نے مشورہ کر کے تورات کے جمیع احکام کو منسوخ کر دیا فقط چار حکموں کو باقی رکھا ذبیحہ صنم، دم مخنوق، زنا، چنانچہ اعمال حواریوں کے ۱۵ باب میں مذکور ہے پھر چند روز کے بعد پولوس نے ان میں سے فقط حرمت زنا کو باقی رکھا اور سب کو منسوخ کر دیا جیسا کہ گزرا پھر جب زنا پر بھی کوئی سزا معین نہ رکھی تو گویا اس کو بھی حلال کر دیا۔ اب اس سے زیادہ کیا نسخ ہوگا؟

ہشتم انجیل متی ۱۰ باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو حکم دیا تھا کہ سامریوں کی بستی میں نہ جانا اور یوحنا کے ۴ باب میں ہے کہ سامریوں کی بستی میں گئے اور دو روز مہمان رہے۔

نہم حضرت مسیح نے فرمایا کہ کچھ اسبابِ سفر ساتھ نہ لو (لوقا ۹ باب) اور پھر حکم دیا کہ اسبابِ سفر ساتھ لو (لوقا ۲۲ باب)۔

دہم تمام عہد نامہ[1] موسوی کو کمزور اور بے فائدہ کہہ کر پولوس نے لغو کر دیا کہ (پرانا حکم اس لیے کمزور اور بے فائدہ تھا اٹھ گیا (عبرانیوں کا ۷ باب)۔

یازدہم شریعت پر عمل کرنے والے کو پولوس ملعون کہتا ہے چنانچہ نامہ اہل اغلاطیہ کے باب ۳ میں مذکور ہے بلکہ اسی مقام پر حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی اپنے بدلہ میں ملعون لکھا ہے۔ العیاذ باللہ۔

دوازدہم ان کے پیرومرشد لوتھر کی یہ تعلیم ہے کہ خوب دلیری سے گناہ کرو اور ایک دن میں ہزار دفعہ حرامکاری اور خون کرو مگر ایمان رکھو تمہارے لیے ایسی نجات یقینی ہے کہ جس طرح مسیح کے لیے (مرآت الصدق مصنفہ پادری بیڈیلی صاحب مطبوعہ ۱۸۵۱ء صفحہ ۳۳)

اب نسخ میں کون سی حجت باقی ہے۔ تم سے زیادہ بھی کوئی نسخ کا قائل ہے؟ اگر یہی تکمیل ہے تو پھر نسخ کیا چیز ہے؟

فائدہ: قال اللہ تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْنُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْمِثْلِهَا الآیہ اس آیت کے ظاہری معنی پر لحاظ کر کے اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ نسخِ قرآن کی تین صورتیں ہیں اول یہ کہ حکم منسوخ اور تلاوت باقی ہو جیسا کہ پانچ آیتیں کہ جن کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں۔

دوم یہ کہ تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہو جیسا کہ یہ آیت الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما نكالًا مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ لو كان لابن آدم واديان الآیہ ان کا حکم باقی ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے ان کو مجموعۂ قرآن سے بحکمِ الٰہی جدا کر دیا تھا۔

سوم یہ کہ حکم اور قرأت دونوں منسوخ ہوں جیسا کہ سورۂ برأت کا اوائل کہ جس کو ننسہا کا مصداق کہنا چاہیے مگر یہ بھی حضرت ہی کے روبرو ہوا۔ اس سے کسی طرح کی قرآن میں تحریف نہیں ثابت ہوتی۔ ہاں اگر بعد میں آپ کے یہ ہوتا تو تحریف و تبدیل کہہ سکتے تھے مگر بعض علماء جیسا کہ ابو مسلم ان سب سورتوں کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کسی طرح کا بھی نسخ نہیں پایا جاتا نہ نسخ محض احکام، کیونکہ جن آیاتِ مذکورہ کے احکام کو تم منسوخ کہتے ہو وہ حقیقتاً منسوخ نہیں

[1] یعنی توریت کو۔ ۱۲ منہ۔

کیونکہ وہ پانچوں حکم مشروع اور جہت سے تھے اور اب اٹھ جو گئے تو اور جہت سے نہ نسخِ تلاوت کیونکہ جن آیات کو آپ منسوخ التلاوۃ کہتے ہیں ان کا جزءِ قرآن ہونا کسی وقت یقینی طور پر ثابت نہیں ہوا بلکہ اصل حال یہ ہے کہ بعض صحابہ نے یہ کلمات اثناءِ تلاوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے تھے جن کو آپ نے بطور تفسیر کے پڑھا تھا پھر جب خود انہیں لوگوں نے ان کلمات کو نہ حفاظ کی لوحِ حافظہ پر پایا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کاتبین سے لکھوایا تو بقرینہ آیت[1] مَا نَنْسَخْ ان کو منسوخ التلاوۃ سمجھ گئے اور بعض روایات تو اس بارے میں بالکل غلط اور بے اصل ہیں۔ جب یہ دونوں احتمال نہیں تو مجموعہ مرکب ان سے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

دوسری بحث اس مقام پر اور ہے وہ یہ کہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں بھی تناسخ واقع ہوتا ہے یا نہیں؟ جمہور کہتے ہیں واقع ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں: اول نسخ الکتاب بالسنۃ جیسا کہ یہ آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ الآیہ حدیث عائشہ سے منسوخ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خبر دی ہے کہ خدا نے ان کو جس قدر عورتیں چاہیں[2] مباح کر دیں۔ رواہ عبد الرزاق والنسائی واحمد والترمذی والحاکم۔

اقول فیہ نظر کس لیے کہ اس آیت کی ناسخ اس سے پہلی آیت ہے کما مر۔ دوم نسخ السنۃ بالکتاب جیسا کہ بیت المقدس کی طرف نماز میں منہ کرنا سنت سے ثابت تھا اس کو قرآن کی اس آیت نے منسوخ کر دیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ اس امر میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ محققین اس کے بھی[3] منکر ہیں اور اس کو باعثِ طعنِ مخالفین سمجھتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک طعن کی کوئی بات نہیں کس لیے کہ نسخ ایک حکم مبہم المدت کی مدت کو بیان کر دینا ہے یعنی خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحیِ متلو یا غیر متلو ایک حکم دیا اور اس کی کوئی مدت بیان نہ کی۔ پس ایک زمانہ تک اس پر عمل ہوتا رہا پھر بذریعہ وحیِ متلو یا غیر متلو بیان کر دیا کہ اس کی یہاں تک مدت تھی اس میں عقلاً و نقلاً کوئی قباحت نہیں لازم آتی۔ پس جس طرح تورات نے بعض احکامِ سابقہ کو بنظرِ مصلحت موقوف (منسوخ) کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام نے اور ان کے حواریوں نے تمام شریعتِ موسویہ ہی کو (بقول عیسائیاں) منسوخ کیا معطل کر دیا۔ اسی طرح قرآن مجید نے تورات و انجیل کے بعض احکام کو موقوف کر دیا خواہ اس موقوف کرنے کو منسوخ کہو خواہ اس کا نام تکمیل رکھو خواہ اس کو تفسیر و تبدیل کہو۔ ہم اہلِ اسلام یہ نہیں کہتے کہ قرآن نے تورات و انجیل کو بالکل رد کر دیا اور ان کے تمام احکام میں تغیر کر دیا بلکہ

[1] اس آیت میں من آیۃ سے آیتِ قرآنی ابو مسلم کے نزدیک مراد نہیں بلکہ آیاتِ قدرت جس سے یہ مراد کہ ہم آیاتِ قدرت میں سے اگر کسی کو مٹا دیں یا بھلا دیں تو اپنی نشانی دوسری اس سے بہتر یا ویسی اور دکھاتے ہیں پھر منکر کہاں تک ہماری قدرت و کمال کا انکار کرے گا اور دہر میں ہر روز ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ ایک آیت یعنی نشان کے بعد دوسری دکھاتے ہیں اور اگر آیتِ قرآنیہ بھی مراد ہو تو یہ جملہ بمنزلہ شرطیہ کے ہے جو تحقیق نہیں چاہتا۔

[2] بعض خفیہ کرسٹان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے محدود نہ ہونے کو عیب سمجھتے ہیں اور اس حدیث کو بہ پیرایہ خیر خواہیِ اسلام بلا قاعدہ محدثین جھوٹی بتاتے ہیں۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس کس قدر عورتیں تھیں؟ حالانکہ وہ نبی اور ان کی کتاب الہامی تسلیم کی جاتی اور مشنوں میں پڑھی جاتی ہے۔ ۱۲ منہ

[3] یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہ کتاب کو سنت نسخ کر سکتی ہے نہ سنت کو کتاب بلکہ کتاب کی ناسخ کتاب اور سنت کی سنت ہو سکتی ہے۔ فنِ اصولِ فقہ میں اس کی تصریح ہے۔

جس قدر تغیر مصلح کے لیے ضروری ہے اسی قدر تغیر کیا اور یوں ان کتابوں کی مدح اور تصدیق کی گو وہ کتابیں نزولِ قرآن کے وقت بجنسہٖ صفحۂ عالم پر نہ تھیں۔ اب پادری فنڈر صاحب وصفدر علی وغیرہم نے جو کچھ زبان درازی کی ہے اہلِ انصاف کے نزدیک محض تعصب اور سخن پروری ہے۔

امرِ دوم شانِ نزول کی بحث: اس میں متقدمین ومتاخرین کا اختلاف ہے صحابہ وتابعین سببِ نزول کو عام معنی پر مستعمل کرتے تھے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جن چند امور پر آیت صادق آتی ہے ان میں سے بعض جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں یا بعد میں واقع ہوتے تھے اسی کو سببِ نزول کہہ دیتے تھے اور اس موقع پر جمیع قیود کا منطبق ہونا کچھ ضروری نہیں بلکہ اصل حکم کا منطبق ہونا کافی ہے اور کبھی ایک حادثہ جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں واقع ہوا اور آپ نے اس کا حکم اس آیت سے مستنبط کر کے وہاں اس آیت کو پڑھ دیا تو صحابہ ؓ اس کو بھی سببِ نزول کہتے تھے۔ گو اس حادثہ سے پیشتر یہ آیت نازل ہو چکی تھی اور کبھی اس صورت میں صحابہ ؓ یہ بھی کہتے تھے کہ اس حادثہ میں خدا نے یہ آیت نازل کی اور یہ اس لیے کہ ایسے امر میں آنحضرت ﷺ کے دل میں اس آیت نازل شدہ کا القاء کرنا بھی ایک قسم کی وحی اور نزول ہے اور ایسے مواقع پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت دو بار نازل ہوئی اور کبھی محدثین اس موقع کو (کہ جس میں صحابہ نے آیت کو مناظرہ میں سند پکڑا تھا یا انہوں نے اس کو آیت کی مثال ذکر کیا تھا یا آنحضرت ﷺ نے وہاں اپنے کلام شریف میں آیت کو بطورِ استشہاد پڑھا تھا) شانِ نزول کہہ دیتے ہیں اور درحقیقت یہ سببِ نزول نہیں۔ پس ان امور کا احاطہ کرنا مفسر کے لیے کچھ ضرور نہیں بلکہ درحقیقت سببِ نزول ہر آیت کا یا سورۃ کا بندوں کی حاجت اور ضرورت ہے کیونکہ مقصودِ اصلی نزولِ قرآن سے نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور عقائدِ باطلہ کا بطلان اور اعمالِ فاسدہ کی نفی ہے۔ پس لوگوں میں عقائدِ باطلہ کا پایا جانا آیاتِ مخاصمہ کے نزول کا سبب ہے اور اعمالِ فاسدہ کا پایا جانا اور باہم معاملات کا پیش آنا آیاتِ احکام کے نزول کا سبب ہے۔ اور لوگوں کا نڈر ہونا یا اس کی رحمت سے ناامید ہونا آیاتِ تذکیر بایام اللہ وآلاء اللہ کے نزول کا سبب ہے۔ وقس علی ہذا۔ پس جو مفسرین آیات کے لیے ہر جگہ ایک قصہ طول طویل نقل کر کے اس کو شانِ نزول بتلاتے ہیں محض تکلف فضول ہے بلکہ یہ طویل وعریض قصصِ انبیاء جو مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں بیشتر علماءِ[1] اہلِ کتاب سے منقول ہیں اور صحابہ وتابعین بعض اوقات مذہبِ مشرکین ویہود اور ان کے عقائد اور عادات کی وضاحت کے لیے قصصِ جزئیہ بھی نقل کر کے یہ کہتے تھے کہ اس امر میں یہ آیت نازل ہوئی، خواہ یہی قصہ ہو یا اس کے مشابہ کوئی اور ہو اور یہ قصہ محض اس امرِ مجمل کی توضیح وتصویر کے لیے ذکر کیا گیا ہے اور یہی سبب ہے کہ شانِ نزول میں صحابہ کے اقوال مختلف ہوتے ہیں کہ کوئی اس امرِ کلی کا مصداق کسی جزئی کا اور کوئی کسی کو توضیح کے لیے بیان کرتا ہے۔ اور اسی طریقہ سے قرآن مجید میں کبھی انسان کی نیکی اور بدی کی حالتوں کو اور اس کے نیک و بد نتیجہ کو ذکر کیا جاتا ہے اور وہاں کوئی شخصِ خاص مراد نہیں ہوتا لیکن جو لوگ اس سر سے واقف نہیں وہ خواہ مخواہ اس کے لیے ایک قصۂ خاص بناتے اور شخصِ خاص کا حال ٹھہراتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ

[1] امام پادری جو در پردہ اہلِ کتاب کی روایات اور ان کی کتبِ محرفہ کو اصلی اور صحیح قرار دینے کا بیڑا اٹھا کر مسلمانوں میں پھر آملا ہے۔ ان قصصِ واہیہ کو حدیث سے نامنقول کہنے پر چڑ گیا اور جانے بے سمجھے بوجھے محمد صالح اور محمد صادق کے نام سے کیا کیا ہذیان بکا ہے۔ ۱۲ منہ حقانی

كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا الآیہ کہ "ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا اس کی ماں نے حمل میں اور جنتے وقت سختی اٹھائی ہے" اور اسی قسم سے یہ آیت ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَّاذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوٓا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ وَإِذَا قِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا الآیہ اور اسی قبیل سے یہ آیت ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً الآیہ اور یہ آیت بھی اسی قسم سے ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا الآیہ بعض ناسمجھوں نے اس آیت کو حضرت آدم ؑ کی بابت قرار دے کر ایک جھوٹی حدیث عبدالحارث کی گھڑ لی ہے۔ اور اسی قسم سے یہ آیت ہے قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ اور یہ آیت بھی وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ الآیہ پس ان آیات میں ان جمیع خصوصیات کا ایک جگہ متفق ہونا کچھ ضروری نہیں جس طرح کہ اس آیت كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ میں یہ ضروری نہیں کہ کوئی پیڑ ایسا دکھایا جائے کہ جس کے سات خوشے ہوں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، بلکہ یہ ثوابِ اعمال کی زیادتی کے لیے ایک تمثیل یا تصویر کھینچی عام ہے کہ خارج میں ایسا کوئی پیڑ ہو یا نہ ہو۔

الحاصل سببِ نزول مجملاً تو درحقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کیا اور تفصیلاً بعض حوادث میں کہ جو آنحضرت ﷺ کے روبرو پیش آتے تھے جیسا کہ منافقین کے اقوال وافعالِ ناشائستہ کا حضرت ﷺ کے حضور میں واقع ہونا پھر قرآن میں ان کا دفع کرنا یا غزواتِ احد اور احزاب وتبوک میں لوگوں سے سستی یا چستی ظہور میں آنا اور اس پر تنبیہ فرمانا یا مدح کرنا وغیر ذلک۔ مفسر کو دو باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

اول یہ کہ جن آیات میں اس قسم کے واقعات کی طرف اشارہ ہے اور جو قصص کہ متفرق جگہ مختلف عنوانات سے مذکور ہیں وہاں ان کے معلوم کیے بغیر پورا مطلب قرآن کا سمجھ میں نہیں آتا تو ان حوادث اور قصص کو مختصر طور پر بروایتِ صحیحہ بیان کر دے۔

دوم جہاں تخصیصِ عام وغیرہ تصرفات قصص میں ہیں وہاں ان کی تشریح کر دے تاکہ مطلب اچھی طرح سمجھ میں آئے اور آیاتِ احکام میں احکام کو باوضاحت بیان کر دے اور آیاتِ تذکیر بآلاء اللہ و وقائعِ حشریہ میں ان کی صورت بیان کر دے۔

فائدہ: بعض مفسرین آیات میں ربط دیتے اور سوال وجواب کے طور پر تقریر کیا کرتے ہیں مگر ہر جگہ اس کا التزام کرنا محض تکلف ہے کیونکہ قرآن حسبِ حاجت ٹکڑے ٹکڑے نازل ہوتا تھا جس طرح بادشاہ کے فرمان حسبِ حاجت وقتاً فوقتاً آویں اور ان کو جمع کر لیا جائے۔ اسی طرح آیاتِ قرآنیہ نازل ہوتی تھیں اور آنحضرت ﷺ ان کو ایک ترتیبِ خاص پر جمع کرا دیتے تھے۔ اب جس طرح سلسلہ وار ان فرمانوں کا ربط دینا لاحاصل ہے اسی طرح اول سے آخر تک تمام آیات میں ربط بھی بے فائدہ ہے ہاں جس قدر آیات کہ ایک بار جس مطلب کے لیے نازل ہوئی ہیں ان میں ضرور ربط ہے اس ربط کی تقریر کرنا کچھ مضائقہ نہیں۔

فائدہ: انبیاء بالخصوص جنابِ رسالت مآب ﷺ کا نفسِ قدسی بمنزلہ آفتاب جہاں تاب کے تھا۔ ان کے متبعین میں بعض [illegible] اور ان میں فیضِ صحبت کی بڑی قابلیت پیدا ہوگئی تھی پس آئینہ کی طرح فیضِ نبوت ان

کے دل پر منعکس ہوتا تھا اس لیے بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ احکام وغیرہ اشیاءِ ضروریہ جو نبی کے دل پر منجانب اللہ فائض ہوتی تھیں ان کے دل پر بھی ان کا انعکاس ہوتا تھا۔ اس لیے حضرت عمر وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم بعض اوقات وہ بات کہہ دیتے تھے کہ جس کا ملاءِ اعلیٰ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر فائض ہونا مقدر تھا اور پھر نبی کی معرفت وہ باتیں نازل ہوتی تھیں۔ دیکھئے استاد کے فیضِ صحبت سے شاگردِ کامل پہلے کبھی وہ بات کہہ دیتا ہے کہ جس کو استاد کہے گا۔ چنانچہ عورتوں کے پردہ اور اساریٰ بدر اور مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق وحی نازل ہوئی۔ بعض متعصب جو اس سر سے محروم تھے انہوں نے طعن کی راہ سے یہ کہہ دیا کہ محمد علیہ السلام لوگوں سے اچھی باتیں سیکھ کر دعویٰ کر بیٹھے تھے کہ مجھے وحی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہدایت المسلمین کے مصنف کرسٹین نے اس باب میں بہت ہی کچھ بیہودہ گوئی کی ہے۔

امر سوم توجیہ مشکل کی بحث: یعنی کبھی کلام میں اپنی ناواقفیت سے بظاہر ایک شبہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ مدلول آیت میں استبعاد معلوم ہوتا ہے یا دو آیتوں میں باہم تناقض سا پایا جاتا ہے یا مصداقِ آیت کے تصور کرنے میں مبتدی کے ذہن پر اشکال ہوتا ہے یا کسی قید کا فائدہ مخفی ہے وغیر ذلک۔ پس جب مفسر اس شبہ کو حل کر دیتا ہے تو اس کو توجیہ مشکل کہتے ہیں یہ بھی ایک بڑا فن ہے۔ اب[1] میں چند مثالیں دیتا ہوں: یَآ اُخْتَ هٰرُوْنَ الآیہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مریم ہارون کی بہن کیونکر ہو سکتی ہے؟ کس لیے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کے زمانہ میں سینکڑوں برس کا فاصلہ ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہارون سے مراد ہارون موسیٰ کے بھائی نہیں یہ اور ہارون ہیں جو مریم کے بھائی تھے۔ بنی اسرائیل میں بزرگوں کے نام رکھا کرتے تھے۔

دوم: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ایک جگہ تو خدا فرماتا ہے لَا یَتَسَآءَلُوْنَ یعنی لوگ باہم سوال نہ کریں گے اور ایک جگہ فرماتا ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ایک دوسرے سے سوال کرے گا۔ فرمایا یہ سوال کرنا حشر میں ہو گا اور سوال جو کریں گے تو جنت میں جا کر آرام پا کر۔

سوم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ جب صفا و مروہ میں سعی کرنا واجب ہے تو خدا نے فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا الآیہ کیوں فرمایا کس لیے کہ لا جناح کے معنی یہ ہیں کہ طواف کرنے میں کچھ گناہ نہیں، جواب دیا کہ ایک قوم گناہ ہی سمجھتی تھی اس لیے لا جناح فرمایا۔ اس باب میں مفسر کو یہ لازم ہے کہ جو محققین سے منقول ہے اسی کو ذکر کرے۔

امرِ چہارم شرحِ غریب کی بحث: یعنی قرآن مجید میں جو الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی میں کسی وجہ سے خفا ہو تو ان کے (لغتِ عرب کا تتبع کر کے یا سیاق و سباق پر نظر کر کے یا اس کلمہ کے اس جملہ سے کہ جس میں یہ واقع ہے مناسبت

---

[1] بعض جاہل پادریوں نے قرآن میں عیب لگانے کو اس قسم کی چند باتیں تفسیرِ اتقان سے نقل کر کے بڑی زبان درازی کی ہے اور جز کے جز سیاہ کر ڈالے ہیں۔ چنانچہ میزان الحق میں پادری فنڈر نے اور ہدایت المسلمین میں ان کے مرید عماد الدین نے اور اعجاز القرآن میں لالہ رام چندر نے بڑی قابلیت جتلائی ہے۔ میں ان لوگوں کی اس عبث حرکت پر نہایت افسوس کرتا ہوں۔ کیا ان صاحبوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسی لغو باتیں اہلِ اسلام کے علماء کیا بلکہ عوام میں بھی کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ ادنیٰ ادنیٰ طلبا بھی ان باتوں سے بخوبی ماہر ہیں مگر کیا کرتے اور کوئی عیب نہ ملا تو یہی سہی چلو کچھ لوگ تو بہکیں گے۔ ۱۲ منہ

دیکھ کر) معانی بیان کر دے۔ اس مقام پر بھی اختلافِ فہم کو بڑی گنجائش ہے کیونکہ زبانِ عرب میں ایک لفظ چند معانی کے لیے آتا ہے اور اس کے سیاق و سباق وغیرہ قرائن سے تتبع کرنے میں عقول متفاوت ہیں اس لیے قدماء کا باہم بعض الفاظ کے معنی میں اختلاف ہے۔ دیکھئے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ قروء کے معنی حیض اور امام شافعی طہر قرار دیتے ہیں۔ ایسے مقام پر دو باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے (اول) استعمالِ عرب کو دیکھئے۔

(دوم) وجوہِ ترجیح میں سے قوی کو اختیار کرے۔ اس شرحِ غریب میں مفسرین کے مختلف حالات میں بعض تو اصل معنی باعتبار وضع لغوی کے بیان کر دیتے ہیں اور بعض لغوی معنی پر بس نہیں کرتے بلکہ صرف مرادی معنی خواہ اصل معنی کو لازم مساوی ہوں یا نہ موقع سے مناسبت دیکھ کر بیان کر دیتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے تفسیر اتقان میں ان الفاظ کی وہ شرح بیان کی ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق ابن ابی طلحہ وضحاک منقول ہے اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب فوز الکبیر میں ان سے بھی بہتر بیان کیا ہے کس لیے کہ صحیح بخاری میں جس قدر شرح غریب وارد ہے اس کو بھی شامل کر دیا ہے۔

امرِ پنجم حذف کی بحث: یعنی کلام میں سے برعایتِ محاورہ بعض اجزاءِ کلام یا ادوات کو حذف کر دینا جس سے کسی قدر معنی میں خفا ہو جائے۔ پس یہ بھی قرآن مجید میں بہت جگہ پایا جاتا ہے۔ مفسر کو ضرور ہے کہ امرِ محذوف کو ذکر کر کے کلام میں وضاحت کر دے۔ اس حذف کے چند اقسام میں حذف موصوف، حذف متعلق وغیرہ اور یہ حذف کچھ زبانِ عرب ہی پر منحصر نہیں ہر زبان[1] میں بلغاء کے کلام میں حذف ہوتا ہے اگر نہ ہو تو گو مطلب کی عامی کے نزدیک کسی قدر وضاحت ہو جائے گی مگر کلام بے لطف ہو جائے گا۔ اب میں اس حذف کی چند مثالیں دیتا ہوں (وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ) یہاں سے ایک لفظ بر محذوف ہے یعنی بر من امن۔ (وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً) یہاں لفظ آیت محذوف ہے کیونکہ ناقہ مبصرہ نہ تھی بلکہ آیت۔ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی من فی الارض لفظ من محذوف ہے کیونکر ایک چیز آسمانوں اور زمین میں نہیں۔ وَاسْئَلِ الْقَرْیَةَ ای اهل القریة لفظ اہل محذوف ہے اسی طرح حروف بھی کلامِ عرب میں بہت محذوف ہوتے ہیں جَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا یہاں لام محذوف ہے۔ عبارت یوں ہے جعل له نسبا وصهرا وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ یہاں من محذوف ہے یعنی اختار موسیٰ من قومہ۔ هُمْ دَرَجَاتٌ ای لَهُمْ دَرَجَاتٌ لَفَتَنُوْا ای لاتفتنوا جس کے معنی ہمیشہ کے ہیں اور اسی طرح جملہ شرطیہ کا جواب اور ان کی خبر اور صدر جملہ اور ان کے کلمہ با و لام جارہ کا محذوف ہونا (بشرطیکہ حذف پر کوئی قرینہ ہو) کلامِ عرب اور قرآن مجید میں بہت ہے۔ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ اس کا جواب لتری قطعا عظیما محذوف ہے۔ واضح ہو کہ اصل اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى وغیرہ میں یہ ہے کہ اذ کسی فعل محذوف کا ظرف ہو لیکن قرآن میں

---

[1] عماد الدین کرسٹین نے عجب غلطی کی ہے کہ اس قسم کے محذوفات کو ذکر کر کے قرآن پر اعتراض کیا ہے کہ یوں چاہیے تھا۔ یہ غلط ہے اور ہدایت المسلمین کی ایک فصل میں ان محذوفات کو مع ترجمہ ذکر کرتے چلے گئے ہیں جس سے عوام کو یہ ثابت ہو کہ قرآن میں غلطیاں ہیں۔ ان بیہودہ اعتراضات پر ہر عربی داں ہنستے ہیں۔ عیسائی عربی دان بھی بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں پھر ان کے ذکر کرنے سے سوائے اس کے پنجاب کے ناواقف پادری خوش ہوں اور تنخواہ کا اضافہ کر دیں اور کوئی نتیجہ نہیں ان کے جواب میں کوئی کتاب ضخیم لکھنا تضیع اوقات ہے۔ حقانی

اس کو مواضع ہولناک پر داخل کر کے ان کو گنوایا ہے تاکہ مخاطب کے دل پر ان کی صورت منقش ہو جائے اور خوف پیدا ہو۔ پس ایسے مواضع میں عوامل محذوفہ کو تفتیش کر کے ذکر کرنا تکلف ہے کیونکہ نہ یہ حیز اعراب میں داخل ہیں نہ جزء جملہ ہیں بلکہ محض غرض مذکور کے لیے ذکر کر دیے گئے ہیں اور بعض مفسر ہر جگہ اذکر محذوف نکالا کرتے ہیں۔

امرِ ششم بحثِ ابدال: ابدال یعنی محاورہ کی رعایت یا کسی اور غرضِ خاص سے کہ جس کو اہلِ زبان جانتے ہیں ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ ذکر کرنا یہ بہت بڑا فن ہے۔ اس کی رعایت کرنا بڑے فصیح و بلیغ کا کام ہے مثلاً جو شخص اردو زبان میں بڑا ماہر ہوگا وہ موقع اور غرض کی رعایت کر کے کبھی کہے گا تناول فرمالو کبھی کہے گا نگل لو' ٹھونس لو اور کبھی مت بولو اور کبھی مت بک' ٹیں ٹیں نہ کرو' مت بھونکو۔ حالانکہ ٹیں ٹیں طوطا وغیرہ طائر کرتے ہیں اور بھوکنا کتے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اسی طرح مخاطب سے جہاں موقعِ تعظیم ہوتا ہے بلفظِ جمع کلام کرتے اور تو کی جگہ تم کہتے ہیں اور جو شخص زبان سے ماہر نہیں وہ ان مقامات میں ٹھوکریں کھائے گا اور سنبھل سنبھل کر دس بیس ضروری باتیں ہی کہہ سکے گا۔ قرآن مجید میں اس بات کی رعایت کر کے کبھی ایک فعل کی جگہ دوسرے فعل کو اور مفرد کی جگہ تثنیہ و جمع کو بالعکس اور ایک حرف کی جگہ دوسرے حرف کو اور اسم کی جگہ دوسرے اسم کو اور مضمر کی جگہ مظہر کو بالعکس ذکر کیا ہے ان کی بہت سی مثالیں ہیں مگر یہاں قدرِ قلیل پر بس کرتا ہوں۔ اَھٰذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اٰلِھَتَکُمْ اصل کلام یوں تھا یسب الھتکم یعنی بولا تو یوں کہ یہ شخص ہے جو تمہارے بتوں کا نام لیتا ہے مگر مقصود یہ تھا کہ جو تمہارے بتوں کو گالیاں دیتا ہے پس تہذیباً گالیوں کی جگہ نام لینا بیان کیا جس طرح ہمارے عرف میں بولتے ہیں خدا دشمنوں کو بیمار نہ کرے یعنی آپ کو بیمار نہ کرے۔ بندگانِ عالی سے عرض کرتا ہوں یعنی آپ سے مِنَّا لَا یُصْحَبُوْنَ ای منا لا ینصرون۔ ینصرون کی جگہ یصحبون کو ذکر کیا کیونکہ نصرت بغیر اجتماع اور صحبت کے نہیں ہوتی۔ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ای خفت۔ ایک اسم کو دوسرے اسم کی جگہ لانے کی یہ مثالیں ہیں فَظَلَّتْ اَعْنَاقُھُمْ لَھَا خٰضِعِیْنَ عناق چونکہ مؤنث تھا اس کو خاضعۃ کہنا تھا مگر ایک غرض سے خاضعین کہا وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ موقع یہ تھا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کانت من القانتات کہتے مگر جب ان کو ان کے محاسن سے مردوں میں شمار کیا گیا تو یہ لفظ بولا گیا کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِیْنَ اصل یوں تھا نوحاً لیکن جب کہ نوح کی تکذیب کی توجیہ اصولِ متفقہ میں تمام انبیاء کی تکذیب کی اس لیے مفرد کی جگہ جمع کا صیغہ آیا فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ اصل یوں تھا کہ اذا قھا اللہ طعم الجوع کہ خدا نے انہیں بھوک کا مزہ چکھایا مگر چونکہ یہ بات بتلانی تھی کہ بھوک کا لباس کی مانند دبلا ہونے اور مضمحل ہونے میں تمام بدن پر اثر ہے اس لیے طعم الجوع کی جگہ لباس الجوع کہہ دیا (صبغۃ اللہ) اے دین اللہ مگر چونکہ نصاریٰ اپنی بپتسمہ (غوطہ لگانے) کو باعثِ پاکی اور سببِ رنگینی سمجھتے تھے اس لیے فرمایا کہ خدا کے دین سے دل رنگین ہوتا ہے اور اس غوطہ لگانے کا اثر تو بدن ہی پر ہوتا ہے اس لیے دین کی جگہ صبغۃ آیا ایک حرف کی جگہ دوسرے حرف لانے کی یہ مثالیں ہیں فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ ای علی الجبل 'علی کی جگہ لام کو ذکر کر دیا وَھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ ای الیھا۔ الی کی جگہ لام کو ذکر کیا وَلَاُصَلِّبَنَّکُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ای علی جذوع النخل علی کی جگہ فی آیا وَفِی الْاَرْضِ ای علی الارض اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِہٖ ای منفطر فیہ مُسْتَکْبِرِیْنَ بِہٖ ای عنہ اور کبھی ایک جملہ کی جگہ

دوسرا جملہ بھی لاتے ہیں جب کہ اس سے پہلے کا مطلب بخوبی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ اصل یہ تھا لاباس بذلك لانھم اخوانکم اور جس طرح کہ بلغا کے کلام میں ابدال واقع ہوتا ہے اسی طرح تغیر بھی واقع ہوتا ہے کہ کلام کو ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف متغیر کر دیتے ہیں پس کبھی غائب کی ضمیر کی جگہ متکلم کی و بالعکس اور مخاطب کی جگہ متکلم کی و بالعکس ضمیر لاتے ہیں اور اس کو صنعتِ التفات کہتے ہیں۔ اس تفسیرِ کلام کی بھی بہت سی صورتیں ہیں کہ جن کو فصیح و بلیغ ہر زبان میں ہمیشہ عمل میں لاتے ہیں۔ واضح ہو کہ جس طرح حذف و ابدال و تغیر حسبِ موقع بلاغت کا جز ہے اسی طرح بعض الفاظِ زائد کا لانا بھی کہ جس سے کلام میں حسن اور مطلب عمدہ طرح سے ثابت ہوتا ہے' بلاغت کا ایک جزا عظم ہے۔ پس زبانِ عرب میں لفظ مثل اور کاف وغیرہ اس مراد کے لیے آتے ہیں۔ بولتے ہیں مثلک لا یبخل یعنی آپ جیسا شخص بخل نہیں کرتا۔ مراد یہ کہ آپ بخل نہیں کرتے لیکن اس میں زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ جب ایک شخص کا مثل نہیں بخل کرتا تو یہ بدرجۂ اولیٰ نہیں کرتا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ یہاں کاف محض اس بلاغت کے لیے آیا ہے کہ جس کا بیان ہوا ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ﴾ یہاں اگر ما کو مصدر یہ نہ پڑھا جائے تو لفظ مثل اسی مراد کے لیے آیا ہے۔ بعض کوڑ[1] مغز پادریوں کو اردو کے بھی محاورات معلوم نہیں جو ان کی زبان ہے۔ قرآن کے محاورات جاننا تو کجا انہوں نے اپنے قصورِ فہم سے ایسے مواضع میں قرآن مجید پر اعتراضات کر کے اپنی لیاقت پر دھبہ لگایا ہے۔

ہفتم علمِ محاورات: ہے یہ سب سے مشکل فن ہے اپنی زبان کے محاورات پر بخوبی مطلع ہونا مشکل ہے چہ جائیکہ غیر زبان کے محاورات۔ دیکھئے اس ملک میں پادری لوگ اردو دانی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں اور سالہا سال لوگوں سے پڑھتے اور بازاروں میں جا کر بول چال سنتے ہیں مگر پھر بھی وہ اردو بولتے ہیں کہ جس پر اہلِ زبان ہنس پڑتے ہیں۔ ایک پادری صاحب نے کہا دیکھو تمہاری چارپائی پر قفل بیٹھا ہے' کہنا چاہیے تھا دھرا ہے' ایک نے فرمایا (ہماری گائے کا بیٹا پیدا ہوا ہے) حالانکہ بیٹا انسان کی اولاد میں مستعمل ہوتا ہے اور یہ جاننا (حیوانات کے بچوں کے الگ الگ نام ہیں اور ہر حیوان کی آواز کو الگ الگ لفظ سے تعبیر کرتے ہیں مثلاً گھوڑے کے بچے کو بچھیرا اور گائے کے بچے کو بچھڑا کہتے ہیں اور گھوڑا ہنہناتا اور ہاتھی چنگھاڑتا اور بکری ممیاتی ہے اور پھر ہر ایک کو اسی لفظ سے ادا کرنا اور محاورات میں جو مثالیں اور کہاوتیں کہی جاتی ہیں ان کو ان کے موقع پر کہنا) مشکل بات ہے۔ عرب میں حجاز کی زبان اور اس پر قریش کے زبان زد محاورات کہ جن کو قرآن نے ادا کیا ہے عرب کے نزدیک عجب لطف رکھتے تھے۔ حتی المقدور مفسر کو ان محاورات کا جاننا از بس ضرور ہے جو محاوراتِ قرآن نہیں جانتے وہ مطلب فہمی میں بڑی دقت اٹھاتے ہیں۔ اب میں چند وہ مثالیں بیان کرتا ہوں کہ جو سمجھنے کے لیے کافی ہیں مَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا کہ زمین پر کوئی ایسا چلنے والا جاندار نہیں کہ جس کی پیشانی خدا نے نہ پکڑ رکھی ہو۔ بظاہر ناصیہ پکڑنا ہر دابہ کا سمجھ میں نہیں آتا مگر جو یہ جانے گا کہ ناصیہ پکڑنا محاورۂ عرب میں قبضہ[2] کرنا ہے تو اس کے نزدیک

---

1. بالخصوص عماد الدین نے ہدایت المسلمین میں تو بہت زہر اگلا ہے اور جوش میں آ کر اندھا دھند بکواس کی ہے۔
2. گھوڑے کی پیشانی کے بال جب سوار پکڑتا ہے تو اس کے قبضہ میں آ جاتا ہے یہاں سے ہر جاندار کے قبضہ کے لیے یہ لفظ مستعمل ہو گیا۔

کچھ دقت نہیں کیونکہ ہر دابہ خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ﴾ جو محاورہ نہیں جانتا وہ یوں ترجمہ کرے گا مارا گیا آدمی کسی چیز نے اس کو کافر کر دیا مگر جو محاورہ دان قتل کو جملہ دعائیہ اور ما اکفرہ کو فعلِ تعجب جانتا ہوگا تو یوں کہے گا: ''مارا جائے آدمی کیا ہی ناشکر ہے'' تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ کے بھی یہی معنی سمجھنے چاہییں یعنی ابی لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں جیسا کہ اردو میں کہتے ہیں فلاں کو خدا غارت کرے بڑا ہی قرآن کا دشمن ہے ﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ﴾ اس سے یہ مراد نہیں کہ درحقیقت کسی کے مرنے پر آسمان و زمین روتے ہیں بلکہ آسمان و زمین کا رونا عرب میں محاورہ ہے افسوس و حسرت کے لیے یعنی کسی نے ان کی بداطواری کی وجہ سے ان کے مر جانے پر کچھ افسوس و رنج ظاہر نہ کیا' فتامل۔ اور یہ بھی محاورہ ہے کہ خطاب کے صیغے لائے جائیں اور ان سے کوئی شخصِ خاص مقصود نہ ہو بلکہ عوام مراد ہوں۔ اور یہ بھی کہ کبھی ایسے امر کو کہ جس کے دلائل متفکر کے نزدیک ظاہر ہوتے ہیں بمنزلہ محسوس کے قرار دے کر لوگوں کو مخاطب بنایا جاتا ہے ﴿اَوَلَمْ يَرَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا﴾ اور اسی طرح کسی چیز آیندہ آنے والے کو جو قطعی ہونے والی ہے ماضی کے صیغہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جنت و دوزخ کی جزا و سزا بیان کرنے میں یہی رعایت رکھی اور کبھی کنایہ کے طور پر معنی مراد کو صورت محسوس میں لاتے ہیں ﴿وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ﴾ شیطان کو چوروں کے سردار کے ساتھ تشبیہ دے کر سوار و پیدل کا دوڑانا بیان کیا ﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا وَجَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا﴾ خدا نے سچ مچ کی دیوار کافر کے آگے پیچھے کھڑی نہ کر دی تھی نہ کوئی لوہے کا طوق ان کی گردن میں ڈالا تھا بلکہ ان کی ظلمتِ کفر و اعراض کو دیوار و طوق سے تشبیہ دی ہے۔ ﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ یہ مراد نہیں کہ ان کے دل گلوں میں آ گئے تھے بلکہ شدتِ خوف میں عرب کا محاورہ یہ ہے جس طرح ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ ناک میں دم آ گیا ﴿وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ یہاں یہ مراد نہیں کہ بازو یا ہاتھ سمیٹ کر بیٹھ بلکہ یہ محاورہ ہے اس معنی میں کہ خاطر جمع رکھ۔

کبھی مخاطب کے ادعا کو چھوڑ کر اصل مقصود میں کلام کیا کرتے ہیں جس کو الکلام علی مجارات الخصم کہتے ہیں جیسا کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا جن غلطی معبودوں کو وہ الٰہ کہتے تھے ان کو ان کے ادعا پر اسی لفظ سے تعبیر کر کے ان کو الوہیتِ باطل کی ہماری زبان میں جیسا کوئی سیادت کا ادعا کرے اور مخاطب اس کو بہ تلفظِ سید خطاب کرے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس نے اس کی سیادت تسلیم کر لی۔ اور کبھی کسی جملۂ خبریہ کو نہ اخبار کی غرض سے بلکہ تمسخر کی راہ سے تکذیب کے لیے بیان کیا کرتے ہیں اِنَّكَ لَاَنْتَ الْعَلِيْمُ الرَّشِيْدُ و ذُقْ اِنَّكَ عَزِيْزٌ كَرِيْمٌ جیسا ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ آپ بڑے اچھے آدمی ہیں یا آپ مرشد ہیں یعنی بڑے اور چالاک ہیں یا کہتے ہیں بہت خوب یعنی ہرگز نہیں جو لوگ ان محاورات سے واقف نہیں وہ اپنی نادانی سے قرآن کے ان مزیدار فقروں پر اعتراض[1] کرتے ہیں۔

فائدہ: قرآن مجید میں گرچہ مخاطب بالذات وہی لوگ ہیں جو اس وقت موجود تھے مگر علمِ الٰہی میں جو چیز آیندہ آنے والی ہے وہ بھی موجود ہے اس لیے اور آیندہ آنے والی نسلیں قیامت تک مخاطب ہیں۔ اور گو اکثر مقام پر مذکر کے صیغے بولے

[1] چنانچہ عماد الدین وغیرہ نا سمجھ لوگوں نے اپنا وقت اس میں ضائع کیا ہے۔ ۱۲ منہ

گئے ہیں مگر عورتیں بھی مراد ہیں۔ اور اسی طرح گو کسی آیت کا شانِ نزول کوئی خاص حادثہ ہی کیوں نہ ہو اور خواہ کسی خاص شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہو لیکن جب تک قرائن تخصیص کے نہ پائے جائیں گے اعتبار عموم الفاظ کا ہوگا۔ خصوصیتِ مورد کو نہ دیکھا جائے گا۔ پس احکامِ الٰہی میں عرب و عجم' امیر و فقیر' غلام و آقا سب برابر ہیں۔

امرِ ہشتم محکم و متشابہ کی بحث: محکم و متشابہ کا جاننا قال اللہ تعالیٰ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ واضح ہو کہ محکم اور متشابہ کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں محکم وہ کلام ہے کہ جس کی مراد معلوم ہو خواہ بالظہور خواہ بالتاویل۔ اور متشابہ وہ ہے کہ جس کو خاص خدا ہی جانتا ہے جیسا کہ خروجِ دجال و قیامت۔ بعض نے کہا کہ محکم وہ ہے کہ جس کے معنی واضح ہوں اور متشابہ اس کے برعکس ہے کیونکہ جو کلام بامعنی ہے یا تو دوسرے معنی کا احتمال رکھتا ہے یا نہیں۔ جو دوسرے معنی کا احتمال نہیں رکھتا وہ نص ہے اور جو رکھتا ہے تو اس کے دوسرے معنی پر دلالت زیادہ ہوگی یا نہیں۔ اول وہ ظاہر ہے ان دونوں کو محکم کہتے ہیں دوسرا دو حال سے خالی نہیں یا تو دونوں معنی برابر سمجھے جاتے ہیں یا نہیں۔ اول مجمل اور ثانی ماول ہے ان دونوں کو متشابہ کہتے ہیں۔ پس نص اور ظاہر تو دونوں محکم کی قسم ہیں اور مجمل اور ماوّل متشابہ کی۔ یہ تقسیم ان علماء کے نزدیک ہے جو مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ پر وقف لازم نہیں سمجھتے اور اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کو بھی اس میں شریک جانتے ہیں جیسا کہ اکثر شافعیہ کی یہی رائے ہیں اور جن کے نزدیک اِلَّا اللّٰهُ پر وقف لازم ہے تو ان کے نزدیک خدا کے سوائے متشابہ کے معنی کوئی نہیں جانتا اور پھر اس کے قرآن میں نازل کرنے سے صرف علماء کا امتحان مقصود ہے کہ ان امور پر محض خدا کے فرمانے سے ایمان بھی لاتے ہیں یا نہیں؟ پس ان کے نزدیک کل کلامِ الٰہی کی بلکہ ہر ایک کلام کی یوں تقسیم ہوگی جو کلام کہ ظاہر المراد ہے اس کے معنی میں تاویل کی گنجائش ہے یا نہیں۔ پس اگر ہے۔ اب ظہورِ مراد اگر محض الفاظ سے ہے تو اس کو ظاہر کہتے ہیں اور جو اس کے ساتھ اس کا سیاق بھی اسی مراد کے لیے ہے اور اس میں اس وجہ سے اور بھی ظہور ہو گیا ہے تو اس کو نص کہتے ہیں۔ اور کبھی عموماً ہر آیت و حدیث کو بھی نص کہا کرتے ہیں۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یہ آیت اباحتِ نکاح کے لیے تو ظاہر ہے اور عدد بیان کرنے میں نص ہے کیونکہ اسی لیے یہ کلام چلایا گیا ہے اور جس میں تاویل کی گنجائش نہیں وہ بھی دو حال سے خالی نہیں یا تو نسخ کا احتمال ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کو مفسّر کہتے ہیں اور نہیں تو محکم۔ پیغمبر علیہ السلام کے بعد جمیع آیاتِ احکام اور کل قصص اور آیات متعلقہ توحید وغیرہ سب محکم ہیں۔ ان چاروں اقسام کے مقابلہ میں چار اور قسم ہیں جس طرح ان میں درجہ بدرجہ ظہورِ مراد کو ترقی تھی۔ ان میں درجہ بدرجہ مراد میں خفا اور پوشیدگی کو ترقی ہے کیونکہ جس کلام کے معنی میں پوشیدگی ہے یا تو وہ کسی ایسے عارض سے ہے کہ جو لفظ کے علاوہ ہے یا محض الفاظ ہی میں خفاء ہے اول کو خفی کہتے ہیں اور دوسرا کہ جس کے الفاظ میں اشکال ہے یا تو ایسا اشکال ہے کہ تامل کرنے اور قرائن میں غور کرنے سے دور ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اول کو مشکل کہتے ہیں اور دوسرا کہ جس کا اشکال قرائن میں غور کرنے سے دور نہیں ہوتا دو حال سے خالی نہیں یا اس کے اشکال دور کرنے میں متکلم کی جانب سے انکشاف کی امید ہے یا نہیں اگر ہے تو اس کو مجمل کہتے ہیں اور نہیں تو اس کو متشابہ کہتے ہیں جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى وجہ اللہ و یدہ وغیر ذلک من الصفات المتشابہات اور جیسا کہ اوائل سور میں الم حم وغیرہ حروف مقطعات ہیں۔ یہاں

آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ظاہر کے مقابلہ میں خفی اور نص کے مقابلہ میں مشکل اور مفسر کے مجمل اور محکم کے متشابہ ہے۔ پس جس طرح محکم میں نہایت درجہ کا ظہور ہے متشابہ میں نہایت درجہ کا خفا ہے اور یہ بھی کہ اول فریق کی تقسیم کے موافق مجمل اور ماؤل ہی کو متشابہ کہتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک اور بھی آیاتِ متشابہ کہلائیں گی۔ آپ یہ بات بھی خیال میں رکھیں کہ یہ جو محکم اور متشابہ باہم مخالف ہیں یہاں تک کہ جو آیت محکم ہے اس کو متشابہ نہیں کہہ سکتے اور جو متشابہ ہے اس پر محکم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہ سب اس تقدیر پر ہے کہ محکم اور متشابہ سے ظہور و خفا مراد لیا جائے ورنہ جب حکم محکم ہونے سے مراد مضبوطی اور نقصان و اختلاف قبول نہ کرنا مراد لیا جائے گا تو تمام آیاتِ قرآنیہ کو محکم کہا جائے گا کما قال تعالیٰ کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیَاتُہٗ اور اسی طرح جب متشابہ کے معنی صدق اور اعجاز میں ایک دوسرے کا شبیہ ہونا قرار دیا جائے گا تو تمام آیات کو متشابہ کہیں گے لقولہ تعالیٰ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا

فائدہ: اسی طرح ان طرق کا (کہ جن سے مطلب پر استدلال کیا جاتا ہے) جاننا ضروری ہے ان کے جانے بغیر مطالبِ قرآن پر مطلع ہونا دشوار ہے اور وہ طریقے چار ہیں کیونکہ یا استدلال الفاظ سے ہے یا معنی سے۔ پہلی صورت میں وہ کلام اگر خاص اسی مطلب کے لیے بولا گیا ہے تو اس کو عبارۃ النص کہتے ہیں۔ ورنہ اشارۃ النص۔ دوسری صورت میں اگر وہ مطلب اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ شرعاً یا عرفاً یا عقلاً لفظی معنی ان پر موقوف ہیں تو اس کو اقتضاء النص کہتے ہیں اور اگر اس طرح سے نہیں بلکہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے تو اس کو دلالۃ النص کہتے ہیں۔ یہ چاروں طریق تو سب کے نزدیک مقبول ہیں۔

ان کے علاوہ بعض محققین کے نزدیک اور طریقوں سے بھی مطلب سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں مفہوم الشرط۔ مفہوم الصفۃ وغیرہا کہ جن کو مفہوم مخالف کہتے ہیں اور اسی طرح عام و خاص و مشترک و ماؤل اور حقیقت و مجاز صریح و کنایہ کا جاننا بھی بالخصوص اس شخص کے لیے کہ جو احکامِ قرآن پر مطلع ہونا اور ان سے اور احکام کا استنباط کرنا چاہے ضرور ہے۔

امرِ نہم اختلافِ قرأت کے بیان میں: واضح ہو کہ نبی ﷺ سے صحابہ کرام ؓ کی ایک جماعت کثیر نے یہ نقل کیا ہے ان القرآن انزل علی سبعة احرف کلها شافٍ کافٍ یعنی قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے ہر ایک کافی شافی ہے۔ اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں مگر حروف کے معنی میں علماء کا بہت کچھ اختلاف ہے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ چنانچہ تفسیر اتقان میں چالیس قول نقل کیے ہیں مگر ان اقوال میں ایسے بھی اکثر قول ہیں جن کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں اس لیے ان کو چالیس کہنا میرے نزدیک صحیح نہیں۔ خیر اس کو جانے دو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ جو باہم مخالف اقوال ہیں وہ سب کے سب صحیح نہیں، میں نے جہاں تک علماءِ محققین کے اقوال اور احادیثِ صحیحہ میں نظر کی اور مختلف عنوانوں میں اس حدیث کے مطلب پر غور کیا تو یہ معلوم ہوا کہ سات حرف سے قبائلِ عرب یا خاص قبائلِ قریش کے وہ مختلف محاورات مراد ہیں

۱ خواہ ان احرف سے تقدیم و تاخیر کلمات میں کرنا یا ایک کلمہ کا دوسری جگہ ہم معنی ہونے کی وجہ سے پڑھنا' یا قریش و ہوازن وغیرہ قبائل کے لغات الغرض جو کچھ ہو وہ آسانی کے لیے آپ کے روبرو تھا مگر جو کچھ اصل تھا لکھانے اور یاد کرانے میں اسی کا اعتبار تھا۔ پس ان عارضی وجوہات کو اب پیش کر کے قرآن میں تحریف کا مدعی ہونا ایک خیال محال ہے۔

کہ جن سے مطلب میں کچھ تغیر نہ آئے اور ہر ایک کو ادا کرنے میں آسانی ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی استدعا کے موافق اس امر کی خدا نے اجازت دی (جس طرح ہندوستان میں کیا اور کا اور کے اور کی' پورب اور پنجاب اور وسط ہند میں بولا جاتا ہے۔ اور کوئی مصنف سہولت کے لیے اپنی کتاب میں اس لفظ کو ہر طرح سے ادا کرنے کی اجازت دے) مگر آنحضرت ﷺ لوگوں کو قرآن اسی طرز پر یاد کراتے اور کاتبوں سے اس طریق پر لکھواتے تھے جو خاص آپ کی زبان تھی۔ پس جب حضرت ابوبکر ؓ کے عہد میں قرآن جمع کیا گیا تو خاص اسی طرز پر جمع کیا گیا اور باقی وجوہ کہ جن کی ایک عارضی طور سے اجازت تھی رفعِ اختلاف کے لیے کتابت میں نہ آئیں۔ اس وقت وہ سبعہ احرف باقی نہ رہے' گو اپنے طور پر کوئی پڑھا کرے مگر اس مصحف میں درج نہ کیے گئے۔ پھر جب حضرت عثمان ؓ کے عہد میں اس نسخہ سے پانچ یا سات نسخے انہیں پکے حافظوں اور زبان دانوں سے نقل کرا کے اطراف و جوانب بھیجے ان میں بھی وہ حروف چھوڑ دیے گئے کیونکہ یہ نسخے تو خاص اسی نسخے سے نقل ہوئے تھے جو خاص آنحضرت ﷺ کی زبان کے موافق لکھا گیا تھا مگر وہ سب نسخے خط کوفی میں تھے کہ جس کی رسمِ خط میں حروف میں تشابہ واقع ہوتا ہے جس میں یعلمون کی جگہ تعلمون اور تعلمہ کی جگہ نعلمہ پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ اختلاف حفاظ کو ہرگز پیش نہ آتے تھے کیونکہ وہ لوگ حرف بحرف اسی طرح یاد رکھتے تھے جو آنحضرت ﷺ نے بتایا تھا بلکہ ان لوگوں کو جو صرف لکھے ہوئے پر دار و مدار رکھتے تھے۔

قراءِ سبعہ صحابہ:

صحابہ میں بڑے معتبر حافظ اور قاری کہ جو عامیوں کے اختلاف کو درست کرتے تھے اور جن کی طرف ہر مشکل میں لوگ رجوع کر کے حل کرتے تھے یہ لوگ تھے عثمان' علی' ابی' زید بن ثابت' ابو مسعود' ابو دردا' ابو موسیٰ اشعری ؓ کذا قال الذہبی فی طبقات القراء۔ پھر مکہ اور مدینہ اور بصرہ اور کوفہ اور شام میں ان کے تلامذہ پھیل گئے اور قرآن کی تعلیم میں مصروف ہوئے اور لوگوں کے شکوکِ رسم الخط کو حل کرتے رہے۔ چنانچہ مدینہ میں ابن المسیب اور عروہ اور سالم و عمر بن عبد العزیز اور سلیمان اور عطا اور معاذ بن حارث کہ جو معاذ قاری کے لقب سے مشہور تھے اور عبد الرحمٰن بن ہرمز اور ابن شہاب زہری اور مسلم بن جندب اور زید بن اسلم تھے اور مکہ میں عبید اور عطاء بن ابی رباح اور طاؤس اور مجاہد اور عکرمہ اور ابن ابی ملیکہ اور کوفہ میں علقمہ اور اسود اور مسروق اور عبیدہ اور عمرو بن شرحبیل اور حارث بن قیس اور ربیع اور عمرو بن میمون اور ابو عبد الرحمٰن سلمی و زر بن حبیش و عبید بن فضیلہ و سعید بن جبیر' نخعی و شعبی اور بصرہ میں ابو عالیہ اور ابو رجاء اور نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر اور حسن بصری اور ابن سیرین اور قتادہ اور شام میں مغیرہ ابن ابی شہاب مخزومی حضرت عثمان ؓ کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اس فن کے ماہر تھے بلکہ بعض تو خاص اسی فن کے امام مشہور ہو گئے۔ چنانچہ مدینہ میں ابو جعفر پھر ابن نصاح پھر نافع قاری مشہور ہوئے اور مکہ میں عبد اللہ بن کثیر و حمید بن قیس و محمد بن محیض اور کوفہ میں یحییٰ بن وثاب و عاصم بن ابی النجود و سلیمان اعمش پھر حمزہ پھر کسائی اور بصرہ میں عبد اللہ بن ابی اسحاق و عیسیٰ بن عمر اور ابو عمرو بن العلاء و عاصم پھر یعقوب حضرمی اور شام میں عبد اللہ بن عامر و عطیہ بن قیس کلابی و اسماعیل۔ پھر یحییٰ بن حارث و ماری پھر شریح بن یزید حضرمی امام القراء کہلائے۔

قراءِ سبعہ:

اور پھر ان میں سے سات شخص تو ایسے ہوئے کہ دور دراز سے لوگ ان کے پاس آ کر قرآن کی حرکات و سکنات، مدو شد بلکہ لب و لہجہ کو بھی سیکھتے تھے اور اس فن کے مقتداء مانے گئے اور وہ یہ ہیں (۱) نافع۔ اس شخص نے ستر تابعین کی شاگردی کر کے یہ علم حاصل کیا تھا اور یہ مدینہ میں رہتے تھے۔ (۲) ابن کثیر مکی یہ عبداللہ بن سائب صحابی کے شاگرد تھے۔ (۳) ابو عمرو علماءِ تابعین کے شاگرد تھے اور بصرہ میں رہتے تھے، (۴) عبداللہ ابن عامر شامی یہ ابوالدرداء اور عثمان کے شاگردوں کے شاگرد تھے، (۵) عاصم کوفی یہ بھی تابعین کے شاگرد تھے پھر ان کے شاگرد (۶) حمزہ اور پھر ان کے شاگرد (۷) کسائی۔ وہ سات قاری کہ جن کی سات قرأت مشہور ہیں یہی لوگ ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی قرأت کے دو دو راوی ہیں کہ جن کے لب و لہجہ میں کسی قدر باہم اختلاف ہے۔ چنانچہ نافع سے ان کے شاگرد قالون اور ورش اور ابن کثیر سے قنبل اور بزی ایک واسطہ سے اور ابوعمرو سے دوری اور سوسی ایک واسطہ سے اور ابن عامر سے ہشام اور ذکوان ایک واسطہ سے، اور عاصم سے ابوبکر بن عیاش اور حفص (حفص کی قرأت ہندوستان میں مشہور ہے) اور حمزہ سے خلف اور خلاد بواسطہ سلیم اور کسائی سے دوری اور ابوالحارث روایت کرتے ہیں ان سات قاریوں کی قرأت میں جو کچھ اختلاف ہے یا پھر ان کے راویوں کی قرأت میں جو قدرے مخالفت[1] ہے سو وہ سب محض اخفاء و اظہار، مدو قصر، تفخیم و امالہ، و اشمام، رفع و خفض، یعنی کھڑا اور پڑا پڑھنے وغیرہ امور میں ہے کہ جو لب و لہجہ سے علاقہ رکھتے ہیں یعنی ان حضرات نے اپنے اساتذہ سے آنحضرت ﷺ کے قرآن کی ادائیگی اور تلفظ کی کیفیت کو محفوظ رکھا۔[2] (اور جس طرح علمِ موسیقی سننے سے تعلق رکھتا ہے یہ فنِ تجوید[3] بھی سماعتِ استاد سے علاقہ رکھتا ہے) پس ان سات قرأتوں سے وہ سبعہ احرف (کہ جو حدیث میں وارد ہیں اور جن کے معنی میں اختلاف ہے) مراد لینا نہایت جہالت ہے۔ وقد ظن کثیر من العوام ان المراد بہا القرأت السبعۃ وھو جھل قبیح۔ اتقان

الغرض قرآن جب لکھا گیا تو خط کوفی میں خاص اسی طرز پر لکھا گیا تھا کہ جو آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات میں حفاظ کو یاد کرا دیا اور کاتبوں سے لکھوا دیا تھا، باقی جو کچھ بطریقِ تفسیر تھا اور بعض لوگوں نے اس کو اپنے مصاحف میں متبرک سمجھ

[1] جہاں تک میں نے غور کیا ہے قراء کے اختلاف کا مدار وہی رسم الخط ہے یعنی جہاں تک خطِ کوفی میں وسعت تھی وہیں تک وقف اور اعراب اور لب و لہجہ وغیرہ امور میں اختلاف ہے۔ جو ہر ایک روایت کو خطِ کوفی گنجایش دیتا تھا۔ ۱۲ منہ

[2] پس وہ جو بعض مفسرین اختلافِ قرأت بیان کرتے وقت کسی قدر زائد باتیں بیان کرتے ہیں سو وہ محض خبرِ احاد سے ثابت ہیں وہ کسی طرح جزءِ قرآن نہیں ہو سکتیں کیونکہ قرآن میں تواتر شرط ہے۔ ہاں ان سے حدیث سمجھ کر کوئی حکم ثابت کیا جائے تو ممکن ہے۔

[3] تجوید فنِ قرأت کو کہتے ہیں۔ علماء نے طرزِ تلفظ وغیرہ امور بالخصوص مفردات و مرکبات الفاظ کے مخارج کو کتابوں میں بیان کیا ہے۔ اس فن میں سب سے اول ابوعبیدہ قاسم بن سلام نے پھر احمد بن جبیر کوفی نے پھر اسماعیل مالکی نے پھر ابوجعفر ابن جریر عبری نے پھر ابوبکر محمد داجوانی نے پھر ابوبکر بن مجاہد نے تالیف و تصنیف کی، پھر بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھیں ہیں جزری اور شاطبی بھی اس فن میں عمدہ کتابیں ہیں۔ ۱۲ منہ

کر لکھ لیا تھا (کہ جس کو منسوخ التلاوۃ کہتے ہیں) اور ان عام محاورات کو (کہ جن کی بضرورت اجازت تھی) چھوڑ دیا کیونکہ وہ دراصل قرآن نہ تھی۔ پھر جن کو اس رسم الخط میں تردد ہوتا تھا تو ان کے تردد کو صحابہ پھر تابعین وغیرہ علماء اپنی یاد سے دور کر دیتے تھے لیکن جب یہ دیکھا کہ مصاحف کثرت سے پھیل گئے اور اسلام صدہا بلکہ ہزارہا کوس اور مختلف قوموں میں پہنچ گیا کہ جن کی عربی زبان نہیں ہے تو عام سہولت کے لیے قرآن پر تابعین ہی کے زمانہ میں اعراب[1] زیر و زبر و مد و جزم لگائے گئے اور آیات اور اوقاف کے نشان دیے گئے کہ جس سے ہر شخص بلاکم و کاست و بلاتغیر بخوبی قرآن مجید پڑھ سکتا ہے اور ہر طرح کی غلطی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ متقدمین کو جزاءِ خیر عطا فرمائے کہ ان کی کوشش اور سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ زمانہ نزول سے آج تک ہر ملک اور ہر قوم میں ایک ہی قرآن ہے کسی جگہ بھی حروف یا شوشہ یا نقطہ کا فرق نہیں۔ واللہ الحمد۔

اب بعض عیسائیوں کا تورات و انجیل کی تحریف کی نظیر میں قرآنِ مجید میں تحریف ثابت کرنے کے لیے ان الفاظ کو نقل کرنا کہ جو بطورِ تفسیر کے پڑھے گئے تھے اور ان کو پھر آنحضرت ﷺ نے قرآن میں داخل نہ فرمایا اور ان خبرِ احاد کو نقل کرنا جن میں سبعہ احرف کے بیان میں تقدیم و تاخیر وغیرہ تصرفات مذکور ہیں، محض بے فائدہ ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اگر صحیح روایت اور پھر متواتر یا مشہور سے بھی ثابت ہو جائیں تو آنحضرت ﷺ کے روبرو ہی قرآن میں مندرج نہ ہوئی تھیں نہ پھر جمہور صحابہ نے قرآن کو جمع کرتے وقت ان کو نقل کیا بلکہ سب نے بالاتفاق ان کو قرآن کا جز نہ سمجھا۔ پس جب یہ جزءِ قرآن نہیں تو ان کے قرآن نہ ہونے سے کوئی نقصان لازم نہیں آتا مگر جو لوگ اس بات سے ناواقف میں وہ بغیر سمجھے بوجھے تفسیر اتقان وغیرہ کتب سے اس قسم کی روایات نقل کر کے قرآن میں تحریف ثابت کرنے کے مدعی ہو جاتے ہیں مگر جب تحریف اور قرآن کی تعریف مقرر کر کے امورِ تنقیح طلب قرار پاتے ہیں تو اہلِ اسلام کے روبرو خجالت اٹھاتے ہیں۔

امرِ دہم ترتیب یعنی تقدیم و تاخیرِ آیات کی بحث: واضح ہو کہ قرآن مجید جس ترتیب سے کہ جمع کیا گیا ہے یعنی اول الحمد پھر سورۃ بقرہ، سورۂ آل عمران اس ترتیب سے نازل نہیں ہوئیں ہیں بلکہ اصل حال یہ ہے کہ اس ترتیبِ موجودہ کے ساتھ قرآن مجید لوحِ محفوظ سے رمضان کے مہینے میں شب قدر کو یکبارگی آسمانِ دنیا میں بیت المعمور[2] کی طرف نازل ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ الآیہ وقال ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ پھر وہاں سے حسبِ حاجتِ عباد تھوڑا تھوڑا جبرائیل علیہ السلام[3] حضرت ﷺ کے پاس لاتے تھے اور آپ ان آیات کو ان کے اصلی موقع پر کاتبوں سے لکھوا دیتے اور حافظوں کو یاد کرا دیتے تھے جس طرح کسی دیوانِ مرتب میں مندرج ہیں جو اول ہے اس کو اول اور جو آخر ہے اس کو اخیر لکھے۔ گو آخر کی غزل اول بار بھیجی جائے مگر لکھی آخر ہی میں جائے۔ یہی حال قرآن مجید کا ہے۔ چنانچہ شوال کے اول عشرہ میں اول سورۃ اقراء مالم یعلم تک نازل ہوئی پھر سورۂ مدثر، پھر سورۂ مزمل۔ بعض کہتے ہیں اول

[1] عبدالملک بن مروان کے زمانے میں خلیل وغیرہ لوگوں کے اہتمام سے یہ کام انجام پایا۔ ۱۲ منہ

[2] بیت المعمور ہمارے مکانوں کی مانند کوئی دفتر خانہ یا منشی خانہ نہیں ہے بلکہ یہ تعینات عالم مثالی ہیں جن کی شرح کی یہاں گنجائش نہیں۔

[3] بعض نافہموں نے جبرائیل علیہ السلام کا انکار کیا اور نزولِ قرآن اور وحی کو حضرت ﷺ کی حالتِ جذبہ کا ثمرہ بتایا اور اس کو مجنونوں کی خیالی باتوں کے ساتھ تشبیہ دیا، نعوذ باللہ منہ۔ دراصل یہ اکسہو میو اور بولنجر وغیرہم یورپ کے ملحدوں کی تقلید ہے کہ جس پر سید صاحب اور ان کی امت فخر کرتی ہے۔

سورۂ اقراء پھر سورۂ مدثر پھر سورۂ فاتحہ پھر تبت پھر اذا الشمس کورت پھر سبح اسم ربک الاعلیٰ پھر واللیل پھر فجر پھر والضحیٰ پھر الم نشرح پھر والعصر پھر والعادیات پھر کوثر پھر الہاکم التکاثر پھر ارایت الذی پھر قل یا ایہا الکافرون پھر الم تر پھر قل اعوذ برب الفلق پھر قل اعوذ برب الناس نازل ہوئی۔ اکثر تو ایک سورۃ کئی کئی ٹکڑے ہو کر نازل ہوتی تھی اور کبھی تمام سورۃ یکبارگی نازل ہوئی ہے جیسا کہ سورۂ انعام وتبت واذا جاء نصر اللہ وغیرہ من السور۔[1] تمام محققین کے نزدیک آیات کی ترتیب توفیقی ہے یعنی جس طرح جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا آپ ﷺ نے اسی کے موافق آیاتِ قرآن کو مرتب کیا اور ہر سورۃ کی آیات کو ان کے موقع پر لکھوا دیا۔ اسی طرح سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت ﷺ کے عہد میں ہو چکی تھی اسی ترتیب سے جواب موجود ہے۔ صد ہا حفاظ کو قرآن مجید یاد تھا اور آپ ﷺ ہی کے ارشاد کے مطابق فاصلہ کے لیے ہر سورت کے اول میں بسم اللہ بھی لکھی جاتی تھی چونکہ سورۂ برأت کے اول میں آپ نے حکم نہ دیا تو وہاں یہ نہ لکھی گئی۔ پس جس قدر آیات اور سورتیں کہ مکہ میں نازل ہوئیں ان کو مکیہ کہتے ہیں اور جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں ان کو مدنیہ کہتے ہیں اور بعض نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو کچھ ہجرت سے پہلے نازل ہوا خواہ خاص مکہ میں یا طائف میں یا کہیں اور سب کو مکیہ کہتے ہیں اور جو کچھ بعد ہجرت کے نازل ہوا خواہ خاص مدینہ میں یا قباء میں یا راستہ میں یا خیبر یا تبوک کے سفر میں سب کو مدنیہ کہتے ہیں۔ متاخرین نے قرآن کی ہر سورت کے شروع میں اس کا بیان لکھ دیا ہے کہ یہ مکیہ ہے یا مدنیہ اور اس کی اس قدر آیات ہیں البتہ احکام کے نسخ و منسوخ پہچاننے کے لیے اس قدر جاننا تو ضرور ہے۔ باقی یہ معلوم کرنا کہ یہ آیات سردی کے موسم میں نازل ہوئی تھیں یا گرمی کے موسم میں صبح کے وقت یا شام کے وقت، دن میں یا رات میں، سفر میں یا حضر میں کچھ ضرور نہیں اور جو کوئی ان باتوں پر بھی حاوی ہو جیسا کہ بعض محدثین نے آیات صیفی وشتوی، لیلی ونہاری سفری وحضری کو جداگانہ بیان کیا ہے تو یہ اس کے وفورِ علم کی دلیل کامل ہے۔ الغرض آیات و سور کی ترتیب اصلی قرار دینے کے لیے ہر رمضان میں جبرائیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ سے دور کرتے تھے اور آ کر رمضان میں دوبار دور کیا تا کہ نزول کی تقدیم وتاخیر کو درست کر کے ہر چیز کو اس کے اصلی موقع پر قائم کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا کیا اور لوحِ محفوظ کے مطابق قرآن کو کر دیا۔ اس لیے تمام اہلِ اسلام میں اسی ترتیب سے قرآن اب تک موجود ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ہاں اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ تلاوت یا کسی اور غرض سے کوئی شخص بعض سورتوں کو مقدم مؤخر کر دے جیسا کہ پنج سورۃ میں ہوتی ہیں یا ایک قسم کی آیات کو جداگانہ ترتیب دے اور دوسری قسم کو جدی جگہ لکھے جیسا کہ اہل درود و وظائف کرتے ہیں چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ترتیبِ نزول کے لحاظ سے رکھی تھی یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے کتبِ احادیث میں موجود ہے۔ اتقان میں اس کے حوالے مندرج ہیں۔ واللہ اعلم

فصل ہشتم

اسمائے سورِ قرآن

قرآن مجید کی سورتوں کے نام آنحضرت ﷺ کے روبرو ہی مقرر ہو چکے تھے نام رکھنے میں اکثر جزءِ غالب یا مقصود بالنظر کا اعتبار ہوتا ہے اس لیے سورۂ بقرہ کو کہ اس میں ذبحِ بقر کا عجیب وغریب قصہ ہے۔ سورۂ بقرہ کہنے لگے اور سورۂ یوسف

میں چونکہ یوسف علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے اس لیے اس کو سورۂ یوسف کہنے لگے اور کبھی کسی وصفِ خاص کا بھی لحاظ ہوتا ہے مثلاً سورۂ الحمد میں ایک وصف شفاء ہے اس لیے اس کس سورۂ شفا رکھا گیا، اسی لحاظ سے ایک سورت کے متعدد نام مقرر ہوئے ہیں اور کبھی اول کلمہ کا لحاظ کر کے وہی نام رکھ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سورۂ نون کو ''ن'' اور صاد کو ''ص'' اور حم کو ''حم'' اور تبت کو ''تبت'' کہنے لگے وقس علی ہذا۔

فائدہ[1]: احادیث میں اکثر سورتوں کے نام آئے ہیں۔ گو ان میں بعض احادیث ضعیف اور بعض صحیح ہیں۔ پس سب کو غیر ثابت کہہ دینا قاعدۂ محدثین کے برخلاف ہے اور ان امورِ مذکورہ کا تسمیہ میں مرعی رکھنا عرب میں قدیم سے مروج تھا۔ چنانچہ انہی وجوہ سے وہ اپنے قصائد کو موسوم کیا کرتے تھے۔ پس اس تسمیہ کو یہود کی تقلید کہنا جیسا کہ سید احمد خان صفحہ ۴ میں کہتے ہیں بڑی غلطی بلکہ ناواقفی ہے۔

تنبیہ: حروفِ مقطعات انتیس (۲۹) سورتوں کے اول میں آئے ہیں۔ علماء کا ان کے معانی میں اختلاف ہے۔ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔ مگر ایک جماعت نے ان کو ان سورتوں کا نام بھی مانا ہے اور ان کے یہی معنی قرار دیے ہیں لیکن آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کوئی روایت صحیح نہیں آئی۔ پس ان حروف کو سورتوں کا نام بامرِ وحی یا بامرِ الٰہی سمجھنا اور یوں کہنا ان میں بجز انتیس کے کہ جن کی ابتدا میں حروفِ مقطعات ہیں اور کسی کو خدا تعالیٰ نے موسوم نہیں کیا۔ سید احمد صاحب بڑی غلطی کی بات ہے۔

فائدہ[2]: قرآن مجید میں کل ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں اور قرآن کی آیات کی تعداد میں اہلِ کوفہ اور اہلِ شام اور اہلِ بصرہ اور اہلِ مکہ واہلِ مدینہ کا اختلاف ہے۔ اختلاف کی یہ وجہ نہیں کہ ایک گروہ بعض کو آیاتِ قرآنی کہتا ہے اور دوسرا ان کو قرآن میں داخل نہیں کرتا بلکہ اس وجہ سے کہ جس گروہ کے نزدیک نبی ﷺ کا جس جگہ وقف کرنا پایا گیا انہوں نے اس کو ایک آیت شمار کیا اور جن کے نزدیک دونوں جگہوں میں وقف کرنا ثابت نہ ہوا بلکہ وصل ثابت ہوا تو انہوں نے دونوں کو ایک آیت سمجھا۔ پس اکثر کے نزدیک چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) ہیں اور اہلِ کوفہ کے نزدیک چھ ہزار دو سو چھتیس (۶۲۳۶) ہیں اور اہلِ مدینہ کے نزدیک چھ ہزار دو سو چودہ (۶۲۱۴) ہیں۔ متاخرین نے آیات پر کہیں لفظ شامی کہیں کوفی لکھ دیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ آیت کوفہ یا شام میں نازل ہوئی بلکہ یہ مراد ہے کہ علماءِ کوفہ کے نزدیک یا علماءِ شام کے نزدیک یہ آیت ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اسی طرح حروفِ قرآن کا بھی علماء نے شمار کر لیا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تین لاکھ بائیس ہزار چھ سو ستر حروف بتائے ہیں اور یہاں بھی اختلاف کا یہ سبب ہے کہ بعض نے حروفِ مشدّدہ میں سے ایک کو دو گنا بعض نے ایک ہی شمار کیا۔

فائدہ[3]: لوگوں کی آسانی کے لیے جب علماء نے قرآن مجید پر اعراب لگائے اور علمِ رسم الخط تدوین کیا تو سہولت کے لیے متاخرین نے قرآن کو تیس دنوں کے موافق تیس کیا اور ہر پارہ کے چار ٹکڑے کیے۔ ربع، نصف، ثلث کا لفظ ہر مقام پر لکھا اور پھر ہر ٹکڑے کو تقسیم رکوعات پر کیا اور رکوع کا اشارہ ''ع'' کے ساتھ کیا۔ پھر رکوع کی پانچ پانچ یا دس دس آیات پر چند نشان لگائے جن کی تفصیل یہ ہے:

ھ یہ پانچ آیتوں کی علامت ہے جو کوفیوں اور بصریوں کے نزدیک یا خاص کوفیوں کے نزدیک ہیں۔

ع اسی طرح سے دس آیتوں کی علامت ہے جو لفظ عشرہ ابتدائی حرف لیا گیا جیسا کہ ''ھ'' خمسہ کا اخیر ہے۔

عب سے اشارہ ہے اس طرف کے یہاں بصریوں کے نزدیک دس آیتیں تمام ہو چکیں ہیں ''ع'' سے عشرہ اور ''ب'' سے بصریین مراد ہیں۔

خب سے مراد ہے کہ بصریین کے نزدیک پانچ آیتیں یہاں تک ہو چکی ہیں ''خ'' سے خُمسہ اور ''ب'' سے بصریین مراد ہیں۔

تب سے یہ مراد ہے کہ بصریین کے نزدیک آیت ہے ''ت'' سے آیت اور ''ب'' سے بصریین مراد ہے۔

لب سے یہ اشارہ ہے کہ اہلِ بصرہ کے نزدیک یہاں آیت نہیں ''ل'' لیس اور ''ب'' سے بصریین مراد ہیں۔

عرب کی زبان میں یہ دستور ہے کہ جب جملہ تمام ہوتا ہے وہاں ذرا ٹھہر جاتے ہیں کہ جس کو وقف کہتے ہیں اگرچہ ہر ایک آیت ایک کلامِ تمام ہے۔ اس پر وقف ہے مگر آیت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں دو یا کئی جملے ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر وقف کرنا چاہیے۔ پس قدیم عرب کو آیات اور ان کے درمیانی جملوں پر جس طرح اعراب کی حاجت نہ تھی اسی طرح وقوف کے لیے رموز و اشارات مقرر کرنے کی بھی حاجت نہ تھی۔ جس طرح وہ بغیر تعلیم وہ تعلمِ صرف ونحو و دیگر قواعدِ بلاغت اپنے سلیقۂ زبان دانی سے صحیح تلفظ کرتے تھے اسی طرح جملوں کے معانی پر لحاظ کر کے وقف کرتے تھے۔ لیکن جب قرآن ہر ملک میں پہنچا اور عجم سے عرب کا اختلاط ہوا تو ضرور ہوا کہ غلطی سے محفوظ رکھنے کے لیے وقف کے لیے کوئی علامت مقرر کی جائے کیونکہ اگر وقف کے موقع پر وقف نہ کیا جائے اور دونوں جملوں کو ملا دیا جائے تو کلام کے معنی میں فرق آ جائے۔ دیکھئے اس آیت وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا میں اگر قولہم پر وقف نہ کیا جائے تو ان العزۃ کفار کا مقولہ ہو جاتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ کفار جو یہ کہتے ہیں کہ عزت سب خدا کے لیے ہے اس سے غم نہ کر۔ حالانکہ یہ مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ کفار کی بات سے رنج نہ کرو عزت ہر طرح کی خدا کے لیے ہے۔ یہ جدا جملہ ہے اور اسی طرح وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا ان رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ میں هَمَّتْ پر وقف نہ کیا جائے اور دونوں کو ملا دیا جائے تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ زلیخا نے یوسف سے اور یوسف نے زلیخا سے قصدِ بد کر لیا تھا۔ اور یہ مقصود نہیں بلکہ هَمَّ بِهَا جدا جملہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا کی طرف کی رہنمائی یوسف کو نہ ہوتی تو برا ارادہ کر چکے تھے۔ اور اسی قسم کے بیشمار مواضع میں قراء کے نزدیک وقف اور ابتدا میں کبھی صرف معنی کا لحاظ ہوتا ہے۔ چنانچہ نافع اس کے قائل ہیں اور کبھی دم ٹوٹنے کا لحاظ ہوتا ہے کہ جہاں دم ٹوٹے سوائے چند مواضع کے وقف کر دیا جائے۔ چنانچہ ابن کثیر اور حمزہ کا یہی مذہب ہے اور کبھی کلام کے پورا ہونے کا لحاظ ہوتا ہے کہ جہاں کلام تمام ہو جائے وقف کر دیا جائے۔ چنانچہ عاصم اور کسائی کا بھی یہی مذہب ہے اور ابوعمر کے نزدیک آیات کی انتہا ہی پر وقف ہوتا ہے اور اسی کو وقفِ نبی ﷺ کہتے ہیں کیونکہ ہر آیت پر آپ قصداً وقف کرتے تھے۔ کیفیت وقف میں بھی عرب کے مختلف حالات ہیں چنانچہ قراء نے ان میں سے نہایت معتبر نو صورتیں شمار کی ہیں۔ (۱) سکون (۲) روم (۳) اشمام (۴) ابدال (۵) نقل (۶) ادغام (۷) حذف (۸) اثبات (۹) الحاق لیکن کلمۂ متحرک پر وقف کرنے میں اصل اصول سکون ہے اور باقی ہر

ایک کی تفصیل مطولات میں ہے۔ متقدمین کے نزدیک وقف اور قطع اور سکتہ کے ایک ہی معنی ہیں مگر متاخرین نے فرق کیا ہے پس لفظ قطع اس صورت میں اطلاق کرتے ہیں کہ جب قاری بالکل ٹھہر جائے اور آگے پڑھنے کا قصد نہ رکھے۔ یہاں تک کہ اگر پھر پڑھے تو دوبارہ اعوذ پڑھنے کی ضرورت ہو اور سکتہ یہ ہے کہ ذرا ٹھہر جائے مگر دم نہ توڑے اور وقف میں ٹھہر جاتے اور دم لیتے ہیں مگر نیت اعراض نہیں ہوتی۔ قراء نے ہر موقع پر لحاظ کر کے وقف کے بہت سے اقسام بیان کیے ہیں۔ ابن انباری کے نزدیک تو وقف کی صرف تین قسم ہیں (۱) وقفِ تامؔ (۲) وقفِ حسنؔ (۳) وقفِ قبیحؔ وقفِ تام وہ ہے کہ جہاں دوسرے جملہ کو پہلے سے کچھ تعلق نہ ہو پس اول جملہ پر وقف کر کے ابتدائے کلام دوسرے سے کی جائے جیسا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اور حسن وہ ہے کہ پہلے کلام پر وقف تو ٹھیک ہو مگر دوسرے سے تنہا ابتداءِ کلام نہ ہو سکے جیسا کہ الحمد للہ پر وقف کرنا کیونکہ رب العالمین جو اس کی صفت ہے تنہا اس سے بغیر موصوف کے ابتدائے کلام نہیں ہو سکتی اور قبیح وہ کہ جو نہ حسن ہو نہ تام جیسا کہ بسم اللہ میں بسم پر وقف کرے۔ اور بعض نے اور بھی اقسام وقف کے بیان کیے ہیں کہ جن کے ذکر کی اس مختصر میں گنجائش نہیں مگر ہم اب ان تمام وقوف کے اشاروں کو جو قرآن میں لکھے جاتے ہیں بیان کرتے ہیں اس سے وقوف کے اقسام بھی سمجھ لو۔

ہ یہ گول دائرہ آیت کی علامت ہے اور بعض اس میں نقطہ بھی لکھتے ہیں اور بعض فقط لفظ ہی پر بس کرتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنا چاہیے۔

م یہ اشارہ ہے وقفِ لازم کی طرف یہاں ٹھہرنا ضرور ہے ورنہ کلام کے معنی بدل جائیں گے۔

ط یہ اشارہ ہے وقفِ مطلق کے لیے یہاں ٹھہرنا بہتر ہے یہ اس صورت میں ہے کہ جب دوسرے جملہ سے ابتدا کرنا حسن ہو۔

ج یہ علامت وقف جائز کی ہے کہ یہاں وقف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں چاہے کرے چاہے نہ کرے۔

ز یہ علامت ہے اس کی کہ یہاں نہ ٹھہرے اور اگر ٹھہرے گا تو جائز ہے۔

صلے یہ علامت اس بات کی ہے کہ یہاں وقف کی رخصت ہے یعنی طولِ کلام کی وجہ سے یہاں دم لینا کچھ مضائقہ نہیں ہاں وقف نہ کرنا بہتر ہے بخلاف ز کے۔

یہ علامات تو وہ ہیں کہ جو متقدمین کے نزدیک مروج تھیں مگر متاخرین نے چند اور علامات مقرر کی ہیں اور وہ یہ ہیں:

علامت ہے الوصل اولیٰ کی یعنی اس مقام پر وقف نہ کرنا اولیٰ ہے ملا کر پڑھنا چاہیے۔

ق علامت ہے قیل کی یعنی کہا گیا ہے کہ یہاں وقف ہے مگر یہاں بھی نہ ٹھہرنا بہتر ہے کیونکہ قیل ضعفِ وقف پر دال ہے۔

صل علامت ہے قد یوصل کی یہاں وقف اولیٰ ہے۔

ک علامت کذلک کی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ یہاں وہی وقف ہے جو اوپر گزر رہا ہے۔

قف صیغہ امر ہے یہاں وقف کرنا چاہیے۔

مین علامت سکتہ کی ہے اور کبھی لفظ سکتہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہاں ذرا ٹھہر جاؤ اور دم نہ توڑو۔

قلا قیل لا کی علامت ہے یعنی بعض نے یہاں نہ ٹھہرنا کہا ہے۔

لا اگر کسی آیت پر نہیں تو بالاتفاق نہ ٹھہرنا چاہیے یہ وقف لازم کے مقابلہ میں ہے جس طرح وہاں ملا کے پڑھنے سے معنی خراب ہوتے ہیں یہاں وقف کرنے سے۔ یہ وقفِ قبیح کی صورت ہے اور اگر آیت کے اوپر لا ہے تو اس میں محدثین کا بڑا اختلاف ہے اکثر قراء اور محدثین کہتے ہیں ٹھہریئے اور اکثر قراء کہتے ہیں نہ ٹھہریئے اور یہی مشہور ہے۔

مع علامت معانقہ کی ہے کہ یہاں دو جگہ قریب قریب ہیں جن پر تین نقطے لکھے ہوتے ہیں اس سے یہ مراد ہے کہ ان دونوں لفظوں میں سے دوسرے کو پہلے کے ساتھ وہ ارتباط ہے جو اگلے لفظ کے ساتھ خواہ پہلے لفظ پر وقف کرو دوسرے کو تیسرے کے ساتھ ملا کر پڑھ دو خواہ وقف نہ کرو جیسا لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ میں لا ریب اور فیہ میں معانقہ ہے خواہ لا ریب پر وقف کرو کیونکہ اس فیہ کو دونوں سے ربط ہے۔ مراقبہ میں دو جگہ قریب قابل وقف ہوتے ہیں اگر ایک پر وقف کرو تو دوسرے پر ہرگز نہ کرو۔

❀❀❀

باب سوم

فصل اول

واضح ہو کہ قرآن مجید میں اکثر جگہ تورات و انجیل و زبور و صحف ابراہیم علیہ السلام وغیرہ کا ذکر آیا ہے اور ان کی مدح اور تصدیق اور کتاب الٰہی ہونا بیان کیا ہے اور بعض مضامین کا حوالہ ان کی طرف دیا ہے اس لیے جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جمیع انبیاء اور تمام کتبِ الٰہیہ کو بلا تفریق حق سمجھنا خاص اہلِ اسلام کا ہی حصہ ہے۔ اس لیے مجھ کو ضرور ہوا کہ ان کتابوں کا کسی قدر مختصر حال بیان کروں تا کہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو کتابیں اس نام کی اہلِ کتاب کے پاس ہیں وہ اصل نہیں ہیں۔ اس زمانہ میں عیسائیوں کا بڑا زور ہے۔ پادری گلی کوچوں میں لوگوں کو بہکاتے پھرتے ہیں۔ کہیں کالج مقرر کر کے لوگوں کو لالچ دے کر انجیل کی تعلیم دیتے اور کرسٹین بناتے ہیں بلکہ سینا پرونا سکھانے کے بہانے سے شرفائے اہلِ اسلام کے گھروں میں مستورات کے بہکانے کے لیے جوان جوان شاطر میموں کو بھیجتے ہیں اور وہ گھر کے نوجوانوں سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آ کر رجھاتی ہیں اور دین سے برگشتہ کراتی ہیں اور کہتی ہیں دل تمہارے قرآن میں بھی تورات و انجیل و زبور پر ایمان لانے کی تاکید ہے یہ کتابیں ہمارے پاس ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ ان میں جو کچھ لکھا ہے اس کو مانو۔ مسیح خدا کا بیٹا اور دنیا کا کفارہ ہے۔ جب سادہ لوح اس دام میں آئے تب ان کو اور کچھ سنایا کہ تمہارے نبی کے پاس کوئی معجزہ نہ تھا اگر ہوتا تو قرآن میں مندرج ہوتا جس کو تم نبی سمجھتے ہو وہ نبی نہ تھے۔ اس نے قرآن میں بہت سی غلط باتیں لکھ دیں اور جب کسی نے پوچھا اچھا میم صاحب ان باتوں کے غلط ہونے کی کیا دلیل تو انہوں نے کہا جس کو تم چند روز ہوئے تورات و انجیل مان چکے ہو یہ باتیں ان کے برخلاف ہیں اس لیے غلط ہیں۔

اول تو یہ فریب آمیز تقریر پھر میم صاحبہ کی نرم و مہین آواز اور یورپ کے ناز و انداز اور بھی غضب تزویر ہے۔ اس لیے اس پر آشوب زمانہ میں ان کتابوں کی تحقیقات کی ہم کو زیادہ ضرورت ہوئی۔ اہلِ کتاب اپنی تمام کتبِ سماویہ کے مجموعہ کو بائبل[۱] کہتے ہیں۔ پھر اس کے دو حصے ہیں ایک عہدِ عتیق یعنی پرانی کتابیں اور دوسرا عہدِ جدید اور جس طرح ہم قرآن کے جملوں کو آیت کہتے ہیں۔ یہ لوگ ورس کہتے ہیں پہلے حصہ میں یہ کتابیں:

(۱) سِفر خلیقہ[۲] کہ جس کو کتاب پیدائش بھی کہتے ہیں ابتدائے پیدائش آسمان و زمین کے حال سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک سلسلہ وار تاریخ کے طور پر بیان ہے۔

(۲) سِفر خروج جس میں بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنے وغیرہ امور کا ذکر ہے۔

---

۱ لفظ یونانی بمعنی کتاب ہے۔۱۲ منہ

۲ سفر بالکسر بمعنی کتاب اردو اور اسی طرح زبور بمعنی مکتوب جس کی جمع زبر آتی ہے جس سے مراد کتاب ہوتی ہے۔ اب اہلِ کتاب کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب کو زبور کہتے ہیں۔

(۳) کتاب احبار جس میں قربانی اور قصاص اور جانوروں کی حلت وحرمت وغیرہ احکام ہیں۔

(۴) سفر عدد جس کو گنتی کی کتاب کہتے ہیں' اس میں بنی اسرائیل کے فرقوں کا شمار ہونے کا اور دیگر بیان ہیں۔

(۵) سفر استثناء اس میں ملک فلسطین کی تقسیم وغیرہ امور ہیں۔ ان پانچوں کو تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف کہتے ہیں۔ یہ تورات ضخامت میں تخمیناً سعدی کی بوستان کے برابر ہے۔

(۶) کتاب یشوع

(۷) قاضیوں کی کتاب

(۸) راعوث یا روت کی کتاب یہ تین ورق میں الیملک اور اس کی جورو نعومی کا قصہ ہے۔

(۹) صموئیل کی اول کتاب

(۱۰) صموئیل کی دوسری کتاب

(۱۱) سلاطین کی پہلی کتاب

(۱۲) سلاطین کی دوسری کتاب

(۱۳) اول کتاب تواریخ

(۱۴) دوسری کتاب تواریخ کہ جس کو اخبار الایام بھی کہتے ہیں۔

(۱۵) عزرا[۱] کی کتاب اول

(۱۶) عزرا کی دوسری کتاب کہ جس کو کتاب نحمیا بھی کہتے ہیں۔

(۱۷) کتاب ایوب[۲]

(۱۸) زبور داؤد علیہ السلام اس میں محض مناجات اور خدا کی مدح وثنا ہے۔

(۱۹) امثال سلیمان علیہ السلام اس میں پند ونصائح ہیں۔

(۲۰) کتاب واعظ جس کو جامع بھی کہتے ہیں۔

(۲۱) غزل الغزلات کہ جس کو نشید انشاء بھی کہتے ہیں یہ پانچ چھ ورق کا رسالہ ہے جس میں عاشقانہ مضامین ہیں بلکہ بعض فحش آمیز کلمات بھی ہیں۔

(۲۲) یسعیاہ[۳] نبی کی کتاب

(۲۳) یرمیاہ نبی کی کتاب

(۲۴) یرمیاہ نبی کا نوحہ یا مرثیہ جو تین چار ورق میں ہے۔

---

۱ یعنی عزیر علیہ السلام۔ ۱۲ منہ

۲ اس میں کسی نے حضرت ایوب علیہ السلام کی مصیبت اور ان کے صبر کا قصہ لکھا ہے۔ چھوٹا سا رسالہ ہے۔ ۱۲ منہ

۳ ان کو اشعیاہ بھی کہتے ہیں۔ ۱۲ منہ

(۲۵) حزقیل کی کتاب

(۲۶) دانیال علیہ السلام کی کتاب۔

(۲۷) ہوسیع نبی کی کتاب۔

(۲۸) یوئیل نبی کی کتاب یہ صرف دو ورق ہیں۔

(۲۹) عاموس نبی کی کتاب یہ کل چار ورق کی ہے جس میں کچھ پیشین گوئیاں ہیں۔

(۳۰) عبدیاہ نبی کا خواب جو ایک صفحہ پر ہے۔

(۳۱) کتاب یونہ یعنی یونس علیہ السلام کا ڈیڑھ ورق پر مختصر سا حال۔

(۳۲) میخایا میکہ علیہ السلام کا چار ورق پر الہام بیان ہے۔

(۳۳) ناحوم علیہ السلام کا الہام جو نینوہ شہر کی نسبت ہے دو ورق میں۔

(۳۴) حبقوق نبی کا الہام جو دو ورق پر ہے۔

(۳۵) صفنیاہ یا صفونیا نبی کا الہام جو دو ورق پر ہے۔

(۳۶) حُجی نبی کا الہام جو دارا شاہ ایران کے عہد میں ہوا' ایک ورق پر۔

(۳۷) زکریا علیہ السلام کا الہام جو دارا کے عہد میں ہوا تھا' آٹھ ورق پر۔

(۳۸) ملاخیا یا ملاکی نبی کا الہام' دو ورق پر جس میں الیاس کے آنے کی بھی خبر ہے یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے چار سو برس پہلے تھے اور کبھی ان صحیفوں کے مجموعہ کو بھی مجازاً تورات کہتے ہیں۔ یہ ۳۸ کتابیں وہ ہیں کہ جن کو یہود اور عیسائی سب مانتے ہیں مگر فرقہ سامریہ ان میں سے صرف تورات[۱] اور کتاب یوشع اور کتاب القضات کو مانتے ہیں اور سب کے منکر ہیں (اور یہ سب کتابیں عبرانی زبان میں ہیں جو ملک یہودیہ کی قدیم زبان ہے اور یہود کے نزدیک عبرانی میں ان کے کچھ اور نام ہوں تو تعجب نہیں۔ پھر ان کے تراجم یونانی اور لاطینی اور عربی وغیرہ زبانوں میں ہو گئے۔ میرے پاس بالفعل اردو بائیبل مطبوعہ مرزا پور ۱۸۶۷ء موجود ہے لیکن عیسائیوں نے نو اور کتابیں اس مجموعہ میں داخل کی ہیں کہ جن کی تسلیم وعدمِ تسلیم میں ان کے متقدمین ومتاخرین میں سخت اختلاف ہے چنانچہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا اور وہ نو (۹) کتابیں یہ ہیں:

(۱) کتاب استریہ: پانچ ورق کا ایک دلچسپ قصہ آستر یہودیہ کا ہے کہ اس کو اخسویرس بادشاہ نے وشتی ملکہ پر خفا ہو کے اپنی ملکہ بنایا اور اس کے چچا زاد بھائی مردکی کو کہ جو اس کا مربی تھا ایک خیر خواہی پر اپنا وزیر اعظم کیا اور ہامان وزیر سابق کو جو یہودیوں کا سخت دشمن تھا مع زن وفرزند قتل کیا (یہ قصہ اب تک عیسائیوں کے نزدیک کتب ساویہ میں شمار ہے)۔

(۲) کتاب باروق۔

(۳) ایک حصہ کتاب دانیال کا

(۴) کتاب توبیاس

---

۱ موسیٰ کی پانچویں کتاب۔ ۱۲ منہ

(۵) کتاب یہودیت

(۶) کتاب وزدم

(۷) کتاب ایکلیز یاسٹیکس۔

(۸) مقابیس کی اول کتاب

(۹) مقابیس کی دوسری کتاب۔

یہود ان کتابوں کو لغو قصے سمجھتے ہیں مگر عیسائیوں نے الہامی مانا ہے عہدِ جدید میں یہ کتابیں ہیں۔

(۱) انجیل متی کہ جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد متی حواری نے مسیح کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات میں تاریخ کے طور پر جمع کیا۔

(۲) انجیل مرقس یہ مرقس کی تصنیف ہے اس میں بھی ابتدا سے لے کر آخر تک حضرت مسیح کی سرگزشت سنی سنائی بیان کی ہے کیونکہ مرقس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا کس لیے کہ یہ پطرس حواری کا شاگرد ہے۔ چنانچہ پطرس اپنے پہلے خط کے پانچویں باب میں اس کو بیٹا کہتا ہے۔ یہ شخص رومی ہے اور اس کی یہ کتاب لاٹن یعنی رومی زبان میں تھی پھر اس کا یونانی اور سریانی میں ترجمہ ہوا۔

(۳) انجیل لوقا یہ بھی حضرت مسیح کی تاریخ ہے جس کو لوقا نے لوگوں سے سن کر تالیف کیا ہے کیونکہ اس نے کیا بلکہ اس کے استاد پولس نے بھی حضرت مسیح کو نہ دیکھا تھا چنانچہ اپنی کتاب کے اول میں وہ خود اقرار کرتا ہے قولہ ''چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کا جو فی الواقع ہمارے درمیان ہوئے بیان کریں جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے محو و دیکھنے والے اور کلام کی خدمت کرنے والے تھے ہم سے روایت کی۔ میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لیے اے بزرگ تھیوفلس بہ ترتیب لکھوں۔'' انتہٰی

(۴) انجیل یوحنا اس میں یوحنا حواری نے حضرت مسیح کا تمام حال ابتدا سے انتہا تک لکھا ہے۔

جس کا آخری فقرہ یہ ہے قولہ ''اور بھی بہت سے کام میں جو یسوع[1] نے کیے اور اگر وہ جدے لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں نہ سما سکتیں''۔ انتہٰی ان چاروں تاریخوں کو کہ جن کے زمانۂ تالیف میں بڑا اختلاف[2] ہے عیسائی اناجیلِ اربعہ[3] کہتے ہیں۔

(۵) اعمال حوارئین[4] یہ ایک چھوٹی سی حواریوں کی تاریخ ہے کہ حواری فلاں شہر میں گئے اور وہاں یوں لوگوں کو خوارق

---

[1] یسوع اور مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے ہیں۔

[2] چنانچہ ہارن صاحب اپنی تفسیر کی چوتھی جلد کے دوسرے حصہ کے دوسرے باب میں بعد اس کے کہ زمانہ تالیف اناجیل کو غیر معین مانا ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ پہلی انجیل ۳۸ یا ۴۲ یا ۴۸ یا ۶۱ یا ۶۲ یا ۶۳ یا ۶۴ عیسوی میں اور دوسری انجیل ۵۶ سے ۶۵ عیسوی تک اور غالباً ۶۰ یا ۶۳ عیسوی میں اور تیسری انجیل ۵۳ یا ۶۳ یا ۶۴ عیسوی میں اور چوتھی انجیل ۶۸ یا ۶۹ یا ۷۰ یا ۹۷ یا ۹۸ عیسوی میں تالیف ہوئی۔ ۱۲ منہ

[3] انجیل معرب ہے انگلیوں کا جس کے معنی یونانی زبان میں بشارت اور تعلیم کے ہیں۔ ۱۲ منہ

[4] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کے نام ہیں: (۱) شمعون جس کو پطرس بھی کہتے ہیں۔ (۲) اندریا پطرس کا بھائی (۳) زیدی کا بیٹا یعقوب (۴) اس کا بھائی یوحنا (۵) فیلبوس (۶) برتھولما (۷) تھوما (۸) متی (۹) یعقوب بلفاء کا بیٹا (۱۰) لبی جس کو تھدی بھی کہتے تھے (۱۱) شمعون کنعانی ←

دکھائے اور مخالفوں نے ان کو ایسی ایسی تکلیفیں دیں۔ اس کے مؤلف کا نام بھی معلوم نہیں۔ غالباً یہ اس شخص کی تالیف ہے کہ جس نے تیسری انجیل لکھی ہے یعنی لوقا کی کیونکہ اس کی ابتدا میں وہ یوں کہتا ہے: قولہ ''اے تھیوفلس وہ پہلی کیفیت میں نے تصنیف کی ان سب باتوں کی جو کہ یسوع شروع سے کرتا اور سکھاتا رہا' اس دن تک کہ الخ وہ اوپر اٹھالیا گیا۔ انتہٰی

(۶) حواریوں اور غیر حواریوں کے خطوط کہ جن کی تفصیل یہ ہے پولوس کے (کہ جس نے دین عیسائی برباد کیا) ۱۳ خط اور پطرس حواری کا اول خط اور یوحنا کا پہلا خط سوائے چند فقرات کے یہ کل بیس (۲۰) کتابیں ہیں جن کو سب عیسائی بالاتفاق مانتے ہیں اور سات کتابیں اور ہیں جن کو قدماءِ مسیحین نے رد کر دیا اور متاخرین نے ان کو اپنی کتبِ مقدسہ میں شمار کیا ہے۔

(۱) پولس کا اول خط جو عبرانیوں کو لکھا ہے۔

(۲) پطرس کا دوسرا خط

(۳) یوحنا کا دوسرا خط

(۴) یوحنا کا تیسرا خط

(۵) یعقوب کا خط

(۶) یہودا کا خط

(۷) مکاشفات یوحنا (واضح ہو کہ) شاہِ قسطنطین کے حکم سے شہر نائس میں عیسائی علماء کی ۳۲۵ عیسوی میں ایک مجلس (کمیٹی) تثلیث والوہیتِ مسیح کے مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے قائم ہوئی اور ان کتبِ مشکوکہ کی بابت بھی بحث آئی۔ پس علماء نے بڑی بحث اور تحقیق سے یہ حکم دیا کہ ان مشکوک کتابوں میں سے صرف کتاب یہودیت واجب التسلیم ہے چنانچہ یہ بات جیروم کے اس مقدمہ سے معلوم ہوتی ہے کہ جو اس نے اس کتاب پر لکھا ہے پھر ۳۶۴ء میں ایک اور کمیٹی ہوئی کہ جس کا نام کمیٹی لوڈیسا ہے اس انجمن نے بھی کتابِ یہودیت کو واجب التسلیم مانا اور سات کتابیں اور واجب التسلیم بتائیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) کتاب آستر

(۲) یعقوب کا خط

(۳) پطرس کا دوسرا خط

(۴) اور

(۵) یوحنا کے دونوں خط

(۶) یہودا کا خط

(۷) پولس کا وہ خط جو عبرانیوں کو لکھا ہے۔

← (۱۲) یہودہ اسکریوتی کہ جس نے ان کو گرفتار بھی کرا دیا تھا علاوہ ان کے اور مرد اور چند عورتیں جیسا کہ مریم گدلینی سلومی اور یعقوب کی ماں مریم بھی حضرت کے مخلصین میں سے تھیں۔ ۱۲ منہ

اور کتاب مکاشفات یوحنا کو ویسا ہی مشکوک چھوڑا اور اس حکم کو بذریعہ اشتہار جا بجا مشتہر کرا دیا۔ پھر ۳۹۷ء میں ایک اور کمیٹی قائم ہوئی جس کو انجمن کارتھیج کہتے ہیں۔ اس میں علاوہ اگسٹائن کے جو ان کے نزدیک بڑا عالم تھا ایک سو چھبیس اور بڑے بڑے عالم تھے اس مجلس میں پہلی مجلسوں کے حکم کو بحال رکھ کر یہ سات کتابیں اور واجب التسلیم قرار دی گئیں۔

(۱) کتاب وزدم

(۲) کتاب توبیاس

(۳) کتاب باردخ

(۴) کتاب ایکلزیاستیکس

(۵) (۶) مقابیس کی دونوں کتابیں

(۷) مکاشفات یوحنا۔

لیکن اس مجلس نے کتاب باردخ کو کتاب ارمیاء کا جز بنایا کیونکہ ہارون علیہ السلام ارمیاء علیہ السلام کے خلیفہ اور نائب تھے۔ اس کے بعد اور تین مجلسیں مقرر ہوئیں کہ جن کو مجلس ترلو اور مجلس فلورنس اور مجلس ترنٹ کہتے ہیں۔ ان مجلسوں نے مجلس کارتھیج کے حکم کو باقی رکھا مگر کتاب باردخ کو فہرستِ کتب میں سے علیحدہ لکھا۔ پس یہ کتابیں بارہ سو برس تک عیسائیوں میں واجب التسلیم رہیں۔ یہاں تک کہ فرقہ پروٹسٹنٹ ظاہر ہوا' اس نے کتاب باردخ اور کتاب توبیاس اور کتاب یہودیت اور کتاب وزدم اور کتاب ایکلزیاستیکس اور مقابیس کی دونوں کتابوں کو رد کر دیا اور لغو سمجھا اور کتاب آستر کے چند بابوں کو بھی الحاقی بتا دیا کیونکہ اس کے سولہ باب تھے جس میں سے اب نو باب اور دسویں کی بعض آیات کو مانتے ہیں اور باقی سب کو جعلی بتاتے ہیں۔ اب آپ کو اسلاف کی تحقیق اور ان کتابوں میں اختلاف کی وجہ بخوبی معلوم ہوگئی۔

فصل دوم

پیشتر اس کے کہ میں آپ کو ان کتابوں کی اصلیت بتاؤں ایک اور بات سناتا ہوں کہ جس سے آپ کو ان اصلی کتابوں کے گم ہو جانے میں کچھ تعجب نہ رہے اور وہ یہ ہے کہ قسیس نورتن کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں لکھنے کا دستور نہ تھا۔ اس قول کی صداقت ان دو باتوں سے اور بھی ہوتی ہے :

(اول) یہ کہ اس زمانہ میں کاغذ نہ تھا یہاں تک کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کئی سو برس بعد کاغذ ایجاد ہوا اور لکھنے کا دستور جاری ہوا۔ چنانچہ اس ہسٹری میں کہ جو ۱۸۵۰ء میں لندن مطبع چارلس ڈالیس میں چھپی ہے لکھا ہے کہ اول زمانہ میں سلائیوں سے تختوں پر حروف نقش کیا کرتے تھے پھر سب سے اول مصر والے درخت پیپرس کے پتوں پر لکھنے لگے پھر بلدہ برگس میں خس کی وصلی ایجاد ہوئی اور آٹھویں صدی میں روئی اور ریشم کا کاغذ تیار ہوا۔

(دوم) یہ کہ تورات مطبوعہ ۱۸۳۵ء میں یہ ہے کہ مذبح کے پتھروں پر وضاحت سے تمام تورات کو لکھا تھا۔ چنانچہ نسخہ فارسیہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء کی یہ عبارت ہے (درانجا بر سنگ ہا نسخہ تورات موسیٰ علیہ السلام را کہ در حضور بنی اسرائیل نوشتہ بود نوشت۔ انتہیٰ

بلفظہ اگرچہ بالفعل کے نسخوں میں اپنی جبلی عادت کے موافق اہلِ کتاب نے تورات کو چھوڑ کر احکام بنایا ہے لیکن ہمارا مدعا تو بخوبی ثابت ہے کہ اس وقت میں کاغذ نہ تھا اور اگر تھا تو بہت ہی کم اور کاغذ[1] کی لکھی ہوئی بالخصوص ایسی ضخیم کتابیں کہ جیسے تورات ہے شاید تمام قوم میں ایک آدھ ہی نسخہ ہو اور حفظ کا رواج نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ نسخہ تورات (کہ جو کتابِ الٰہی تھی خواہ بواسطہ جبرائیل علیہ السلام معہ الفاظ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی یا بطورِ الہام کے انہوں نے لکھی تھی ہرچہ باشد) احبار کو دے دیا تھا اور انہوں نے صندوقِ شہادت میں رکھ دیا تھا اور سات برس کے بعد صندوق کھلتا اور یہودی عید کے روز اس کو سنتے تھے۔ چنانچہ حضرت یشوع تک یہی حال رکھا۔ پھر جب یہودیوں میں انقلاب ہوا کہ کبھی مرتد ہو کر سالہا سال بت پرستی کرتے تھے اور کبھی اسلام لاتے تھے تو ان حوادث میں تورات جاتی رہی۔ جزماً نہیں کہہ سکتے کہ کب گئی مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے عہد سے پیشتر تلف ہوئی کیونکہ جب سلیمان علیہ السلام نے وہ صندوق کھولا تو اس میں فقط وہ دو لوح برآمد ہوئیں کہ جن میں دس احکام لکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ بات اول کتاب السلاطین کے ۸ باب درس ۹ سے ثابت ہے پھر سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے اور دونوں سلطنتوں میں کفر اور بت پرستی نے تخمیناً اڑھائی سو برس تک وہ زور پکڑا کہ آخذ کے عہد میں بعل بت کے لیے ہر جگہ مذبح بنائے گئے اور بیت المقدس کے دروازے بند ہو گئے اور اس عرصہ میں دو بار حملے بھی ہوئے چنانچہ ایک بار سلطانِ مصر نے چڑھائی کر کے بیت المقدس کو لوٹ کر تباہ کر دیا اور تمام چیزیں لے گیا اور ایک بار اسرائیل کا ایک مرتد بادشاہ چڑھ آیا اور اس نے بھیٔ ایسا ہی کیا۔ الختصر سلیمان علیہ السلام کے بعد سے تخمیناً چار سو برس تک یہ حال رہا کہ ایک مدت تک چند بادشاہ مشرک اور مرتد ہو کر دینِ موسوی کو برباد کرتے رہے اور بیچ میں ایک دو دین دار بھی ہو گئے۔ آخر کار منسا کے عہد میں تو از حد کفر اور بت پرستی ہوئی چنانچہ خاص بیت المقدس میں بت رکھے گئے یہاں تک کہ جب یوسیاہ بن آمون تخت پر بیٹھا اور صدقِ دل سے بت پرستی سے توبہ کر کے دینِ موسوی کی طرف متوجہ ہوا تو رات کو بہت ڈھونڈا لیکن اس کو تورات کا پتا نہ ملا مگر اٹھارھویں سال خلقیاہ کاہن نے دعویٰ کیا کہ مجھ کو نسخہ تورات بیت المقدس میں سے دبا ہوا ملا اور اس نے بذریعہ ساطافن کاتب کے وہ نسخہ یوسیاہ کو دیا کہ جس کو سن کر یوسیاہ کو بنی اسرائیل کے گناہ پر بڑا رنج ہوا (بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود اس تجسس کے نہ بادشاہ کو نہ کسی اور کو بیت المقدس میں نسخہ تورات ملا خلقیا کو مل گیا۔ پس قطعی یہ ہے کہ اتنی مدت تک خلقیاہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و دیگر حکایات کو اپنے طور پر جمع کرتا رہا جب مرتب ہو گیا تو دعویٰ کیا) پس جب یہ بادشاہ مر گیا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا یہوآ خر تخت

---

[1] اور یہ کہنا کہ لوہے یا لکڑی یا سیسہ کے تختہ پر کھودنا بہت ہی بہتر اور پائیدار اور معقول صورت تھی جائز ہے کہ تورات لوہے یا پتھر یا لکڑی کے تختوں پر لکھی ہو۔ بالکل لغو ہے کیونکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو بدرجۂ اولی تورات کا یک ہی نسخہ ہوگا کیونکہ عادتاً اتنی بڑی کتاب کا لوہے وغیرہ چیزوں کے تختوں پر کھودنا نہایت مشکل کیا بلکہ اس زمانے کے لحاظ سے محال معلوم ہوتا ہے پس جب تورات کا بہزار مشکل لکڑی کی تختیوں پر کھود کر ایک غایت دو بالفرض تین نسخے مہیا کیے گئے تو اس قدر لکڑیوں کا انبار بخت نصر وغیرہ کے حوادث میں محفوظ رہنا اور اس کو کہیں چھپا دینا عادتاً محال ہے۔ بس اس انبار میں سے دس بیس نسخے ہی گم ہو گئے تو تورات میں قطعی کمی ہوگئی پھر سخت مصائب اور سفروں میں اس کے محفوظ رہنے کی کیا صورت۔ ۱۲ حقانی کتاب استثناء کے اکتیس باب نویں ورس میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس شریعت کو لکھا اور بنی لاوی کے جو صندوق شہادت اٹھاتے تھے اور

پر بیٹھے ہی مرتد ہو گیا اور کفر پھیلا دیا مگر اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد شاہِ مصر نے گرفتار کر لیا پھر اس کے بعد اس کا بھائی یہویقیم تخت پر بیٹھا' وہ بھی مرتد ہوا' اس کے بعد اس کا بیٹا یہوکین مرتد تخت پر بیٹھا تو بابل کا بادشاہ بخت نصر[1] اس کو گرفتار کر کے لے گیا اور بیت المقدس کو خراب کر گیا اور اس کے چچا صدقیاہ کو اس کی جگہ قائم کر گیا۔ پس جب اس نے بھی بخت نصر سے بغاوت کی تو دوبارہ بخت نصر نے چڑھائی کی پھر تو بیت المقدس کو بالکل منہدم کر دیا اور ہزار ہا بنی اسرائیل کو تہ تیغ کیا اور بیشمار کو غلام بنا کے لے گیا اور جلیل اور یرشلیم کو بھی مسمار کر گیا۔ اس حادثہ میں تورات (اگر فرض کیا جائے کہ وہ باقی تھی ورنہ وہی تصنیفِ خلقیاہ) اور تمام کتابیں روئے زمین سے بالکل معدوم ہو گئیں چنانچہ اس بات کا اہلِ کتاب کو اقرار ہے۔ پھر اس کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چار سو چھپن برس پیشتر پھر جو کچھ اپنی یاد پر لکھا تھا (کہ جس کو اہلِ کتاب تورات کہتے ہیں گو وہ بھی غلطی سے خالی نہ تھا کیونکہ سفر اول اور دوم کتاب تاریخ کو حضرت عزیر علیہ السلام نے بقول اہلِ کتاب حجی اور زکریا علیہ السلام کی مدد سے لکھا ہے اس میں اولادِ بنیامین کے بیان میں تورات کا خلاف کیا ہے۔ تورات میں جو غلطی سے دس لکھ گئے ہیں ان کو کبھی تین اور کبھی پانچ بتلایا ہے) وہ بھی شاہ انٹیوکس کی چڑھائی میں برباد ہو گیا۔ یہ حادثہ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک سو اکسٹھ برس پیشتر یہود پر گزرا ہے اور ساڑھے تین برس تک رہا ہے جیسا کہ کتبِ تواریخ سے ظاہر ہے۔ باب اول کتاب اول مقابیس میں یہ ہے کہ انٹیوکس شاہ فرنگ نے یرشلیم پر چڑھائی کی اور عہدِ عتیق کی[2] تمام کتابوں کو جلا دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس یہ کتابیں نکلیں گی یا کوئی رسمِ شریعت بجالائے گا قتل کیا جائے گا اور ہر مہینہ میں تین بار خانہ تلاشی کرتا تھا۔ ملخصًا اور ملز کا تلک بھی اپنی اس کتاب میں جو ۱۸۸۴ء میں بلدہ ڈربی میں چھپی ہے اس کے ۱۱۵ صفحہ میں لکھتا ہے کہ "علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل نسخہ تورات اور اسی طرح اصل نسخے اور عہدِ عتیق کے بخت نصر کے ہاتھ سے شہر اور یرشلیم اور ہیکل کی بربادی کے وقت جاتے رہے اور صحیح نقلیں ان کی پھر عزرا کے طفیل سے بہم پہنچیں تو اینٹوکس کے حادثہ میں تلف ہو گئیں۔ پھر مسیح اور حواریوں کی شہادت بغیر ان کی تسلیم کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس زمانہ پر قیاس کر کے یہ کہنا (کہ عزیر اور اینٹوکس میں کئی سو برس کا فاصلہ ہے اس عرصہ میں بہت سی کتابیں پھیل گئی ہوں گی۔ یہود بالخصوص ملک یہودیہ کے قتل سے وہ سب کیونکر تلف ہو سکتیں؟ کیا اب کوئی بادشاہ روم اور عرب کے قرآن جلائے تو فارس اور کابل اور ہندوستان کے کیونکر جلا سکتا ہے' ہدایت المسلمین) قیاس مع الفارق ہے کیونکہ اول تو اس زمانہ میں عہد عتیق کا اگر کچھ وجود ہوگا تو غایۃً ایک یا بفرض محال دو نسخے ہوں گے کچھ مطابع تو تھے ہی نہیں کہ ہزاروں کی نوبت پہنچی ہوگی یا کاغذ پر صدہا قلمی لکھی گئی ہوں گی کیونکہ کاغذ نہ تھا نہ کتابت کا اس

---

[1] جس کو بنوکد نضر بھی کہتے ہیں چنانچہ کتاب السلاطین کی جلد دوم ۲۴ باب میں اس واقعہ کی تصریح ہے۔ ۱۲ منہ

[2] اس کی تصدیق اس بات سے بخوبی ہوتی ہے کہ جب بخت نصر نے عہد عتیق کو کہ جو صدہا سال سے یہود میں چلا آتا تھا نیست و نابود کر دیا حتیٰ کہ اگر عزیر علیہ السلام نہ ہوتے تو بقول اہلِ کتاب پھر تورات کا صفحۂ عالم پر کوئی نشان بھی نہ رہتا۔ پس اینٹوکس کا فاصلہ تو بقول عماد الدین چار سو برس کا تھا اور یہود کو اگلے زمانہ کا سا عروج بھی اس عرصہ میں نہ ہوا تھا اس میں کسی طرح سے احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ یہود کے ہاں تورات کے صدہا اور ہزار ہا نسخے پھیل گئے ہوں گے اور شرقاً غرباً پہنچ گئے ہوں گے تاکہ یہ کہا جائے کہ اینٹوکس کے فساد سے تمام نسخے کیونکر معدوم ہو سکتے ہیں۔ پس جس طرح بخت نصر نے کچھ کم ہزار برس کا نسخہ تورات اپنے دوسرے حملے میں معدوم کر دیا تو اینٹوکس نے چار سو برس کے نسخہ عزیر کو تو ساڑھے تین برس کے ہر روزہ حملوں میں بدرجۂ اولیٰ معدوم کر دیا ہوگا۔

قدر رواج تھا۔ کما مر۔ دوم یہودیوں کا تو ہمیشہ سے ایک ملک مخصوص چلا آتا ہے اس زمانہ تک وہ تمام جہاں میں کہاں پھیلے تھے جو اہلِ اسلام اور قرآن پر قیاس کیا جائے۔ اس امر کی تصدیق اس سے بھی بخوبی ہو سکتی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ انبیاء علیہم السلام کے صحیفے عالم سے مفقود ہو گئے اسی طرح انبیاءِ بنی اسرائیل کی بہت وہ کتابیں کہ جن کا ذکر عہدِ عتیق میں اب تک پایا جاتا ہے ان حوادث میں روئے زمین سے معدوم ہو گئیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) سوسے کا جنگ نامہ جس کا ذکر سفر عدد کے ۱۱ باب ۱۴ آیت میں ہے۔

(۲) کتب الیسر جس کا ذکر کتاب یوشع کے ۱۰ باب ۱۳ آیت میں ہے۔

(۳) اور (۴) اور (۵) سلیمان علیہ السلام کی تین کتابیں تھیں ایک کے پندرہ سو زبورات تھے' دوسری مخلوقات کی تاریخ تھی' تیسری میں تین ہزار امثال تھیں کہ جن میں سے کسی قدر امثال اب تک باقی ہیں ان تینوں کا ذکر کتاب اول سلاطین کے ۴ باب کے ۳۲ اور ۳۳ آیت میں ہے۔

(۶) کتاب قوانین سلطنت صموئیل کی تصنیف جس کا ذکر اول کتاب صموئیل کے ۱۰ باب ۲۵ آیت میں ہے۔

(۷) تاریخ صموئیل۔

(۸) تاریخ ناتھن نبی کی۔

(۹) تاریخ غیب میں نبی کے واوا کی۔ ان تینوں کا ذکر اول کتاب التواریخ کے ۲۹ باب ۳۰ آیت میں موجود ہے۔

(۱۰) کتاب سمعیا کی

(۱۱) کتاب عیدو غیب بین کی۔

(۱۲) کتاب اخیاہ نبی کی۔

(۱۳) مشاہدات عیدو غیب بین کے۔ ان دونوں کا ذکر دوم کتاب تواریخ کے ۹ باب ۲۹ آیت میں ہے۔

(۱۴) یاگھو نبی کی کتاب اس کا ذکر دوم کتاب تواریخ کے ۲۰ باب ۳۴ آیت میں موجود ہے۔

(۱۵) اشعیا نبی کی کتاب کہ جس میں شاہ غریاہ کا اول سے آخر تک حال مندرج تھا اس کا ذکر دوسری کتاب التواریخ کے ۲۶ باب ۲۲ آیت میں ہے۔

(۱۶) خرقیاہ نبی کے مشاہدات اس کا ذکر دوسری کتاب التواریخ کے ۳۲ باب ۳۲ آیت میں ہے۔

(۱۷) مرثیہ ارمیا کا یوشیا پر علیہما السلام اس کا دوم کتاب التواریخ کے ۳۵ باب کی ۲۵ آیت میں ہے۔

(۱۸) کتاب تواریخ الایام اس کا ذکر کتاب نحمیا کے باب ۱۲ کی ۲۳ آیت میں ہے۔

اور دو کتابیں یوسیفس مؤرخ خرقیال علیہ السلام کی اور بتلاتا ہے اب یہ کل بیس کتابیں ہیں کہ جن کے مفقود ہونے کا تمام علماءِ اہلِ کتاب اقرار کرتے ہیں اور افسوس ظاہر کرتے ہیں مگر آج کل کے کرسچن بقول شخصے مدعی سست گواہ چست' یہ بات بناتے ہیں کہ یہ کتابیں الہامی نہ تھیں اس لیے متقدمین نے ان کو محفوظ نہ رکھا اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آٹھ کتابیں اور تھیں کہ بعض سے عیسائیوں کے بزرگوں نے سند پکڑی ہیں ان میں سے بھی اکثر مفقود ہیں ان کے یہ نام ہیں:

(۱) گیارہ زبور (۲) ایوب کی دوسری کتاب (۳) کتاب مشاہدات (۴) پیدائش کی خورد کتاب (۵) کتاب معراج (۶) کتاب الاسرار (۷) کتاب ٹسٹمنٹ (۸) کتاب الاقرار۔[1]

چنانچہ ارجن لکھتا ہے کہ ورس ۶ باب ۵ اور ورس ۱۵ باب ۱۶ گلابتوں میں پولوس کتاب پیدائش سے نقل کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ورس ۹ نامہ یہودا کا کتاب المعراج سے منقول ہے اور لارڈنر نے اپنی تفسیر کی جلد دوم صفحہ ۵۱۲ میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اوروں سے بھی سند پکڑی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ پادریانِ حال کا یہ جواب کہ یہ الہامی نہ تھیں عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے کیونکہ الہامی نہ ہونے کی صرف یہ وجہ کہتے ہیں کہ یہ تاریخی کتابیں انبیاء نے لکھی تھیں ان میں الہام کو دخل نہ تھا۔

اقول یہ کتابیں کہ جن کو اہلِ کتاب اب مانتے ہیں انہیں انبیاء کی تصنیف ہیں ان میں کہیں نہیں کہا ہے کہ ہم الہام سے لکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے تاریخ نویسی میں الہام کے کیا معنی؟ اگر یہ مراد ہے کہ سچے واقعات تو پھر ان کتب کی کیا خصوصیت ہے؟ جس قدر دنیا میں سچی تاریخیں ہیں سب الہامی ہیں اور اگر یہ مراد کہ ان میں اور مؤرخوں کی طرح سے راویوں اور کتابوں کے حوالہ سے درج نہ کیا جائے بلکہ ایک انکشافِ الٰہی سے لکھا جائے تو اس صورت میں بھی یہ کتابیں جواب الہامی مانی گئی ہیں' الہامی نہیں کیونکہ لوقا اور مرقس سب راویوں کے ذریعے سے حالات لکھتے ہیں اور ان کتبِ مسلمہ میں تاریخی کتابوں کے حوالے ہیں اور کوئی الہام کی صورت تاریخ نویسی میں سمجھ میں نہیں آتی کہ جو ان کتابوں میں ہے اوروں میں نہ تھی۔ باوجود اس کے ان کے بھی یہی لوگ مصنف ہیں۔ پس فرق بتانا پادریوں کے ذمہ ہے ورنہ رجماً بالغیب باتوں کی طرف ہم کان بھی نہیں رکھیں گے۔

جبکہ آپ کو یہ حال معلوم ہو چکا تو اب میں چند دلائلِ منصفانہ بیان کرتا ہوں کہ جن سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف نہیں۔

(۱) ان کتابوں میں بہت سے ایسے مضامین پائے جاتے ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد یہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔

شاہد اول کتاب استثناء کا ۳۴ باب تو یہی کہہ رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے صدہا سال بعد کوئی شخص اس کا مصنف ہے چنانچہ اس میں یہ ہے۔ ''سو موسیٰ علیہ السلام خداوند کا بندہ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اس نے اسی موآب کی ایک وادی میں بیت ففور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔''

شاہد دوم ورس ۳۱ باب ۳۵ کتاب پیدائش کا یوں ہے ''پھر بنی اسرائیل نے کوچ کیا اور اپنا خیمہ عیذر کے ٹیلے کے اس پار استادہ کیا انتہٰی۔ حالانکہ عیذر نام اس منارہ کا ہے جو شہر یروشلم کے دروازے پر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ صدہا برس بعد بنایا گیا۔

شاہد سوم: ورس ۳ باب ۲۱ کتاب گنتی کا یہ ہے ''چنانچہ یہواہ نے بنی اسرائیل کی آواز سنی اور کنعانیوں کو گرفتار کروا دیا اور انہوں نے انہیں اور ان کی بستیوں کو حرم کر دیا اور اس نے اس مکان کا نام حرمہ رکھا'' انتہٰی۔ حالانکہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ

[1] اظہار الحق صفحہ ۲۱۴ جلد اول مطبوع مطبع سلطانیہ ۱۸۸۲ ہجری

السلام کیا بلکہ حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد واقع ہوا ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تو اپنی زندگی میں کنعان تک پہنچے بھی نہ تھے۔ بستیوں کا حرمہ کرنا تو کجا؟ ان مقامات پر مفسرینِ اہلِ کتاب عاجز ہو کر یہ کہتے ہیں کہ یہ جملے الحاقی ہیں اور ان کو حضرت عزیر نے ملا دیا ہے مگر یہ جب قبول ہوتا کہ اس کا کوئی ثبوت کافی ہوتا ورنہ بے تک عزیر کا نام لے دینا فضول ہے۔ کسی جگہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ فلاں فقرہ میرا ہے اور نہ کوئی فرق کے لیے نشان لکھا بلکہ تمام کلام متصل یکساں ہے۔

(۲) زبور اور کتاب نحمیا اور یرمیا اور حزقیل کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں بھی تصنیف کا طرز اور مصنفوں کے محاورات ایسے ہی تھے کہ جواب ہیں کہ جہاں مصنف اپنا حال لکھتا ہے تو متکلم کے صیغے بولتا ہے گو کسی جگہ بلفظ غائب بھی تعبیر کرتا ہے مگر اس تورات میں تو ابتدا سے لے کر انتہا تک کسی مقام پر بھی متکلم کا صیغہ نہیں بولا بلکہ جو کوئی تورات کو اور کسی تاریخ کے ساتھ (کہ جس میں کسی مؤرخ نے کسی کے حال کو سالہا سال بعد لکھا ہے) مقابلہ کرے گا تو سرِ مو تفاوت نہ پائے گا' اور یہی حال باقی نبیوں کی کتابوں کا ہے۔ اگرچہ سب الفاظ کا نقل کرنا مشکل ہے مگر نظیر کے طور پر کسی قدر نقل کرتا ہوں۔ اباب ۲ ورس خروج کا یہ ہے ''اُن روزوں یوں ہوا کہ جب موسیٰ بڑا ہوا' الخ ۱۵ جب فرعون نے یہ سنا تو چاہا کہ موسیٰ کو قتل کرے پر موسیٰ فرعون کے حضور سے بھاگا الخ۔ تب موسیٰ اس شخص کے گھر رہنے پر راضی ہوا''۔ اول سے آخر تک تمام کتاب میں یہی طور ہے علاوہ اس کے اور تمام کتابوں کا (کہ جن کو وہ انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں) یہی حال ہے۔ چنانچہ کتاب یشوع کی یہ عبارت ہے ''جب خداوند کا بندہ موسیٰ مر گیا تو یوں ہوا کہ خداوند نے نون کے بیٹے یشوع کو جو موسیٰ کا خادم تھا خطاب کر کے فرمایا'' الخ ''تب نون کے بیٹے یشوع نے سطم سے دو مرد بھیجے''۔ الخ کتاب ردت میں بھی کوئی شخص نامعلوم لغومی یہودیہ کی بہو مسماۃ ردت کا قصہ بیان کر رہا ہے چنانچہ اس کی یہ عبارت ہے ''اور لغومی کا شوہر الیملک مر گیا وہ اور اس کے دونوں بیٹے باقی رہ گئے تھے ان دونوں نے موآب کی عورتوں میں سے جورواں کیں ایک کا نام عرفہ اور دوسری کا نام ردت تھا'' الخ۔ اسی طرح کتاب صموئیل کا بھی عنوان صاف صاف بآوازِ بلند یہ کہہ رہا ہے کہ کوئی اور شخص صموئیل کے قصہ کو لکھ رہا ہے چنانچہ صموئیل کی والدہ حنہ کا تمام قصہ لکھ کر یہ مؤرخ کہتا ہے۔ (۲۰) ''اور ایسا ہوا کہ حنہ کے حاملہ ہونے کے بعد جب دن پورے ہوئے تو ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس نے صموئیل رکھا۔ الخ

(۳) ان کتابوں میں بہت سے ایسے مضامین پائے جاتے ہیں کہ جن سے خدا پاک کی ذاتِ مقدس میں اور اس کے ملائکہ کرام اور انبیاء علیہم السلام میں سخت عیب لگتا ہے اور کتبِ الٰہیہ کی شان سے یہ ناممکن ہے کہ کیونکہ ان سے ہدایت مقصود ہوتی ہے نہ ضلالت۔ پس ثابت ہوا کہ یہ الہامی نہیں ہیں۔

شاہد اول: کتاب پیدائش کے اباب ورس ۲۶ سے ثابت ہے کہ ''خدا نے آدم کو اپنے ہمشکل بنایا'' اور کئی مقام سے بھی یہی ثابت ہے جس سے لازم آیا کہ خدا تعالیٰ مجسم اور حادث ہے تعالی اللہ عن ذلک۔

سوال: قرآن میں بھی تو خدا کے لیے منہ اور ہاتھ ثابت کیا ہے۔

جواب: اس میں اور جسمانیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کی تفصیل پہلے ہم کر چکے ہیں۔[1]

[1] [illegible] تسلیم کرتا ہے اور ان آیات واحادیث کو (کہ جن

شاہد دوم: کتاب پیدائش کے باب ۳ ورس ۲۲ میں یہ ہے اور خداوند نے کہا: ''دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا اور اب ایسا نہ ہو کہ ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے کچھ لے لے اور کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے''۔ انتہی۔ یہاں سے کئی برائیاں ثابت ہوئیں۔ (۱) کہ کئی خدا ہیں (۲) کہ علم و ادراک میں آدم خدا کی مانند ہو گیا (۳) یہ کہ خدا کو آدم کے ہمیشہ جینے سے اندیشہ اور خوف پیدا ہوا۔

شاہد سوم: اسی کتاب کے باب ۶ ورس ۵ و ۶ میں ہے۔ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔ یہاں سے اس کی جہالت اور عاجزی ثابت ہے۔

شاہد چہارم: کتاب خروج کے باب ۱۶ اور باب ۲۹ اور کتاب احبار کے باب ۲۶ اور کتاب دوصموئیل کے باب ۷ اور ۲۲ اور کتاب خروج کے باب ۲۴ اور کتاب اول سلاطین کے باب ۲۲ وغیرہ مقامات میں تصریح ہے کہ خدا تعالیٰ بدلی میں اترا اور خیمہ کے دروازہ پر کھڑا رہا اور اس کے منہ سے آگ اور نتھنوں سے دھواں نکلا اور وہ ایک کروبی پر سوار ہو کر اڑا اور اسرائیل کے ستر لوگوں نے موسیٰ اور ہارون کے ساتھ خدا کو'' (کرسی پر بیٹھے) ''دیکھا اور کھایا اور پیا اور اس کا لباس برف سا سفید اور اس کے سر کے بال صاف ستھرے اون کی مانند تھے۔ اس خرافات کا کچھ ٹھکانا ہے۔

شاہد پنجم: کتاب پیدائش کے باب ۳۲ ورس ۲۴ میں ہے کہ ''یعقوب سے صبح صادق تک تمام رات خدا کشتی لڑتا رہا اور صبح کو جب جانا چاہا تو یعقوب نے بغیر برکت لیے جانے نہ دیا۔'' اور باب اول فصل سوم مفتاح الاسرار میں پادری فنڈر صاحب اس کشتی لڑانے والے کو خدا کہتے ہیں۔

شاہد ششم: کتاب خروج کے باب ۲۰ ورس ۵ اور باب ۳۴ ورس ۷ اور کتاب یرمیاہ باب ۳۲ ورس ۱۸ میں تصریح ہے کہ ''خدا تعالیٰ باپ دادائوں کے گناہ کی سزا ان کی تیسری چوتھی پشت کو دیتا ہے''۔ واہ کیا انصاف ہے! کرے کوئی بھرے کوئی سبحان الله عما یصفون۔

ملائکہ کی نسبت کتاب پیدائش کے ۱۸ باب ۸ ورس میں یہ ہے: ''پھر اس نے گھر اور دودھ اور بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انہوں نے کھایا''۔ انتہی ''پس جب فرشتوں نے کھایا پیا تو تمام شہوانی باتیں جو تغذیہ کو لازم ہیں پائی گئیں پھر قدوسیتِ ملائکہ کہاں رہی؟

اب انبیاء کی نسبت سنیے:

شاہد اول: کتاب پیدائش کے ۹ باب میں ہے کہ ''حضرت نوح علیہ السلام شراب پی کر بدمست اور بدحواس ہوئے کہ تمام ستر برہنہ ہو گیا اور ان کے بیٹوں نے ڈھانکا''۔

شاہد دوم: کتاب پیدائش کے ۱۹ باب میں ہے کہ حضرت لوط نے شراب پی کر اپنی دونوں بیٹیوں[1] سے زنا کیا اور یہ

← کے معنی علماءِ متکلمین نے بالاتفاق اسی طرح بیان کیے ہیں جیسا کہ مفسر نے بیان فرمایا اور تمام اہلِ اسلام اس پر متفق ہیں کہ وہ جسمانیت اور مکانیت اور شکل و صورت و مثل سے پاک ہے۔ یہ جاہل نہیں مانتا جیسا کہ اس کے پنج گنج سے واضح ہے۔

[1] ان سب باتوں کو وہ خفیہ کرستان تسلیم کرتا ہے جیسا کہ جواب تفسیر حقانی اور پنج گنج وغیرہ رسائل سے ثابت ہے۔ مسلمانوں کو اس منافق کے فریب سے کہ جو بلباس اسلام دھوکا دیتا ہے بچنا فرض ہے۔

معاملہ دوبار وقوع میں آیا''۔

شاہد سوم: ''حضرت یعقوب علیہ السلام نے بکری کے بچوں کی کھال ہاتھوں میں لپیٹ کر جھوٹ بولا اور اپنے باپ اسحاق کو دھوکا دینے کو اپنا نام عیص بتلایا۔ یہ کتاب پیدائش کے ۲۷ باب میں مذکور ہے۔

شاہد چہارم: کتاب پیدائش کے ۳۴ باب میں مذکور ہے کہ ''جمور کے بیٹے سکم نے حضرت یعقوب کی بیٹی دینہ سے زنا کیا اور یعقوب کے بیٹوں نے اس سے یہ مکر کیا کہ تو اور تیری تمام قوم اگر ختنہ کرے تو دینہ کی شادی تجھ سے کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ان نبی زادوں نے ایسا موقع پا کر اس کو اور اس کی تمام قومِ بے گناہ کو نہایت بے رحمی سے تہِ تیغ کیا اور مال و اسباب لوٹ لیا اور ان کی بیویوں اور بچوں کو غلام بنایا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے منع کرنا تو درکنار اس نالائق حرکت پر اپنی ناراضی بھی ظاہر نہ کی۔

شاہد پنجم: کتاب خروج کے ۳۲ باب میں ہے کہ ''بنی اسرائیل کے کہنے سے موسیٰ کی غیبت میں ہارون علیہ السلام نے زیور کا ایک بت بنایا اور تمام بنی اسرائیل سے اس کو پجوایا اور اس کے لیے قربانیاں گزارنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے کہ جو تمہیں مصر کی زمین سے نکال لایا''۔ انتہی یہ وہ ہارون ہیں کہ جنہوں نے بالمشافہ خدا تعالیٰ کو دیکھا اور اس سے کلام کیا تھا اور ان کے لیے خدا کے گھر کی کہانت مقرر ہوئی تھی۔ اس پر یہ بت پرستی توبہ توبہ!

شاہد ششم: صموئیل کی دوسری کتاب کے ۱۱ باب میں ہے کہ ''حضرت داؤد اپنے بام پر چڑھے اتفاقاً اوریاہ کی جورو بنت سبع کو نہاتے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گئے اور آدمی بھیج کر اس کو بلوایا اور اس سے زنا کیا کہ جس سے وہ عورت حاملہ ہو گئی پھر اس کے خاوند کو ایک مکر و تدبیر کر کے مروا ڈالا جس پر ناتن نبی کی معرفت داؤد پر بڑی زجر و توبیخ ہوئی''۔ انتہی۔ یہ وہ داؤد ہیں کہ جن کی تصنیف زبور کتبِ مقدسہ میں شامل ہے اور جو عیسائیوں کے خدا کے جدِّ امجد ہیں اور جو خدا کی پیروی کرنے والے ہیں اس پر یہ حرامکاری اور یہ مکاری العیاذ باللہ العیاذ باللہ!

شاہد ہفتم: کتاب اول سلاطین کے ۱۱ باب میں ہے کہ حضرت سلیمان نے باوجود سخت ممانعت کے موابی اور عمونی وغیرہ بت پرستوں عورتوں کو بیوی بنایا اور خواہشِ نفسانی کو یہ طغیانی ہوئی کہ سات سو بیگمات اور تین سو حرموں تک نوبت پہنچی اور پھر ان پر یہاں تک عاشق اور مرید زن ہوئے کہ بتوں کی طرف مائل اور تعمیرِ بت خانوں میں مصروف اور شامل ہو گئے اور آخر عمر میں ایمان کو بھی سلام کر گئے''۔ انتہی ملخصاً یہ وہ سلیمان ہیں کہ جن کی تصنیفات امثال و غزل الغزلات اہلِ کتاب میں الہامی مانی جاتی ہیں اور جن کے لیے خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ دیکھ میں نے عاقل اور سمجھ دار دل تجھ کو بخشا ایسا کہ تیری مانند تجھ سے آگے نہ ہوا اور تیرے بعد تجھ سا برپا نہ ہوگا'' (کتاب اول سلاطین باب ۹ ورس ۲) اسی قسم کے اور بہت سے شواہد ہیں۔

فائدہ: قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے ان مقامات میں ناپاک باتوں کے انتساب سے بھی اپنی ذاتِ مقدسہ اور ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو بچایا ہے۔

وجہ چہارم: ان باتوں میں باہم ایسے مضامین متعارض پائے جاتے ہیں کہ جو الہامی کتابوں کی شان سے ازبس بعید ہیں اور مواضع متعارض میں سے ایک کا غلط ہونا بدیہی ہے۔ ان مواقع میں مفسرین اہلِ کتاب لاچار ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ

یہ سہوِ کاتب ہے چنانچہ ایسے سہوِ کاتب کہ جن کو وریسیوس ریڈنگ'' کہتے ہیں خود پادری فنڈر نے مباحثِ دینی مطبوعہ اکبرآباد میں لاکھ سے بھی زیادہ تسلیم کیے ہیں چنانچہ صفحہ ۵۳ میں لکھتے ہیں کہ گریسباخ نے ایسے غلط مقامات ایک لاکھ پچاس ہزار گنے ہیں'' اور انسائیکلو پیڈیا برٹنیکا کی جلد ۱۹ بیان اسکریچر میں لکھا ہے کہ فاضل وٹسیلٹین نے ایسے مقامات دس لاکھ سے زیادہ گنے ہیں۔ اب جبکہ ایسے بڑے محققین اقرار کرتے ہیں تو آجکل کے کرسٹین یا نئے پادری کا انکار کیا وقعت رکھتا ہے؟ اثباتِ تحریف کے لیے ہم کو نہ اب ان مقامات کے نقل کرنے کی ضرورت ہے نہ عماد الدین کے ان جوابوں کی خاک اڑانے کی حاجت ہے کہ یہ کاتب کی بھول ہے غلطی عملاً ظہور میں نہیں آئی۔

(۲) دس بیس باتیں کسی سچی کتاب میں جعلی نکل آنے سے وہ کل کتاب کیونکر جعلی ہو سکتی ہے (مقاماتِ تعارض میں یہ جوابات ہیں) ایک جگہ یوں ہوا تو پھر کیا اور دوسری جگہ برخلاف آ گیا تو کیا ہوا' مطلب واحد ہے۔

(۳) ان باتوں سے تحریف کیونکر ثابت ہوگئی۔

(۴) مولوی رحمت اللہ مطلب نہیں سمجھے۔

(۵) اچھا اگر تعارض ہوا تو پھر کیا اس سے کہیں کتبِ مقدسہ میں عیب لگ سکتا ہے کیونکہ یہ ایسے بساندے جواب ہیں کہ جن سے ہر دانشمند کو یقینِ کامل ہو جاتا ہے کہ درحقیقت یہ کتابیں جعلی ہیں۔

(وجہ پنجم) ان کتابوں کا طرزِ طریق فحش آمیز اور نہایت غیر مہذب ہے جو روح کے تقاضے پورا کرنے سے بالکل عاری ہے بلکہ قوائے شہوانیہ اور خیالاتِ شیطانیہ کے جلا دینے کے لیے ایک عمدہ نسخہ ہے۔ میں بطور نمونہ کے کسی قدر عبارتیں نقل کر کے دکھاتا ہوں: کتاب یسعیاہ کے ۴۲ باب میں خدا کا کلام یہ ہے۔ ''میں بہت مدت چپ رہا میں خاموش ہو رہا آپ کو روکتا گیا پر اب میں اس عورت کی طرح جسے دردِ زہ ہو چلاؤں گا اور ہانپوں گا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا''۔

اور نوحہ یرمیاہ کے باب ۳ میں خدا کو ریچھ اور شیر بتایا ہے۔ کتاب خرقیل کے ۲۳ باب میں یہ ہے ''خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا اے آدم زاد! دو عورتیں تھیں جو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں انہوں نے مصر میں زنا کاری کی' وہ اپنی جوانی میں یار باز ہوئیں وہاں ان کی چھاتیاں ملی گئیں اور وہاں ان کے بکر کی پستان چھوئی گئی ان میں کی بڑی کا نام اہولہ اور اس کی بہن اہولیہ' وے میری بیویاں ہوئیں اور بیٹے بیٹیاں جنیں'' الخ۔ معاذ اللہ مرد الہامی کو کیا بنی تھی کہ اس نے ایسی فاحش باتیں لکھ کر اپنی کتاب کو بے اعتبار کیا۔ کتاب یرمیاہ کے ۳ باب میں ہے کہاوت ہے کہ ''کوئی مرد اگر اپنی بیوی کو نکالے اور وہ وہاں سے جا کے دوسرے مرد کی ہو جائے' کیا وہ پہلا اس کے پاس پھر جائے گا' کیا وہ زمین ناپاک نہ ہوگی لیکن تو نے بہت یاروں کے ساتھ زنا کیا تب بھی میری طرف پھرا''۔ انتہٰی۔ مانا کہ یہاں کچھ اور مراد ہے مگر کلام میں بڑا فساد ہے۔ کتاب یسعیاہ کے ۲۳ باب میں ہے ''اور وہ پھر خرچی کے لیے جائے گی اور ساری زمین کی مملکتوں سے زنا کرائے گی لیکن اس کی تجارت اور خرچی خداوند کے لیے مقدس ہوگی'' الخ۔ ''بلکہ اس کی تجارت کا حاصل ان کے لیے ہوگا جو خداوند کے حضور رہتے ہیں کہ کھا کے سیر ہوویں' نفیس پوشاک پہنیں' مقدس لوگوں کو کیا پاک مال کھلوایا اور کیسی پوشاک پہنوائی ہے''۔ الہامی بیان اسی کو کہتے ہیں۔ کتاب حزقیل کے ۲۳ باب میں یہ ہے'' (۱۹) ''تس پر بھی اس نے اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے (جبکہ وہ

مصر کی زمین میں چھنالا کرتی تھی) زنا کاری پر زنا کاری کی'' (۲۰) سو وہ پھر اپنے یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا۔ غزل الغزلات کے ۴ باب ۱۰ درس میں یہ ہے ''میری بہن میری زوجہ تیرا عشق کیا خوب ہے'' انتہٰی اور اسی قسم کی اور بہت تشبیہات فحش آمیز ہیں کہ جن کے پڑھتے وقت گرجا میں پادری لوگ بلاشک آنکھ بھی کر لیتے ہوں گے۔

وجہ ششم: محققینِ اہلِ کتاب کا ان کتابوں کے مصنفوں کی بابت اور ان کے زمانۂ تالیف کی بابت سخت اختلاف ہے جس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ محض تخمینی طور پر ان کتابوں کو اپنے انبیاء کی تصنیف بتلاتے ہیں نہ کوئی ان کے پاس مؤلفین تک بسلسلہ[1] متصل ہے نہ کوئی اور دلیل قابلِ تسکین ہے بلکہ صرف قیاس اور تخمین ہے۔ تورات کی نسبت سکندر گیدس[2] کا قول انسائیکلو پیڈیا پینی کی دسویں جلد میں یوں منقول ہے کہ مجھ کو یقینی طور سے تین باتیں معلوم ہوئیں (۱) یہ کہ توراتِ موجودہ ہرگز موسیٰ کی تصنیف نہیں (۲) یہ کہ کسی شخص نے اس کو کنعان یا اورسلیم میں موسیٰ کے بہت مدت بعد لکھا ہے (۳) یہ کہ اس کی تالیف داؤد کے زمانے سے پہلے کی نہیں ہے اور کتاب یوشع کی نسبت بھی بڑا اختلاف ہے۔ بعض لوگ تو اس کو تصنیف یوشع کی کہتے ہیں اور ڈاکٹر لائٹ فٹ اس کو فینحاس کی تصنیف بتاتے ہیں اور کالون عزرا کی تصنیف کہتے ہیں اور دانئل صموئیل کی ہنری ارمیا کی تصنیف کہتے ہیں۔

اسی طرح قاضیوں کی کتاب میں بھی سخت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں حزقیل کی اور بعض عزرا کی اور بعض فینحاس کی کہتے ہیں حالانکہ عزرا اور فینحاس میں تخمیناً نو سو برس کا فاصلہ ہے اس لیے یہود لاچار ہو کر بے تک اس کو صموئیل کی تصنیف بتاتے ہیں۔ کتاب راعوث میں بھی سخت اختلاف ہے بعض کہتے ہیں خرقیا کی تصنیف ہے۔ اس تقدیر پر یہ الہامی نہیں اور بعض کہتے ہیں عزرا کی تصنیف ہے یہود اور اکثر عیسائی صموئیل کی تصنیف کہتے ہیں اور کا تلک ہرلڈ کی ساتویں جلد کے صفحہ ۲۰۵ میں ہے کہ راعوث کی کتاب ایک گھر کا دکھڑا سا ہے اور یونس کی کتاب محض کہانی ہے یعنی دونوں غیر معتبر ہیں۔ کتاب نحمیا میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں نحمیا کی تصنیف ہے اور کریزاسٹم وغیرہ عزرا کی کہتے ہیں لیکن اس میں دارا شاہ ایران کا بھی ذکر ہے جو نحمیا کے سو برس بعد ہوا ہے اس لیے لاچار ہو کر اس باب کو الحاقی کہتے ہیں۔ کتاب ایوب میں بھی نہایت اختلاف ہے۔ میکالکس اور سملر اور بشپ اسٹاک وغیرہ کہتے ہیں کہ ایوب ایک فرضی نام ہے اور یہ کتاب جھوٹی کہانی ہے اور جو ایوب کا وجود

[1] آج کل کے پادری مسلمانوں سے سندِ متصل کا لفظ تو سیکھ گئے ہیں مگر معنی سے ہنوز بے خبر ہیں۔ باوجود بڑی لن ترانیوں کے کسی پادری صاحب نے آج تک اپنے سے لے کر کسی کتاب کے مؤلف تک سلسلہ وار متصل سند نہ لکھی۔ کاش دس بیس جھوٹے ہی نام فرض کر کے پادری عماد الدین یہ لکھ دیتے کہ یہ تورات مجھ کو کھپریل صاحب سے اور ان کو بڑھل سے اور ان کو ڈاکٹر کٹھل سے پہنچی کیونکہ جھوٹ تو پولوسی مذہب کا مدار ہے۔ اور یوں تو بقول شخصے میں مرد نہیں میرے بھائی مرد نے بڑی شیخیاں بگھاری ہیں کہ فلاں صاحب نے کتاب الاسناد میں سند لکھی ہے۔ خیر سند کو چھوڑ و کوئی ہزار برس کا پرانا نسخہ ہی بتاؤ اور جو پرانے نسخے عبری کے گنوائے ہیں تو محض دام بازی کی ہے۔ جن کو یہ پرانا نسخہ کہتے ہیں غایۃ آٹھ سو برس کا ہے اور یہ آٹھ سو برس بھی پرانے اور پھٹے ورق دیکھ کر کہے جاتے ہیں ورنہ اس کی بھی کیا دلیل ہے؟ گو ضد کے مارے پادری لوگ منہ سے نہ کہیں مگر دل میں تو ہمارے قول کی خوب تصدیق کرتے ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] یہ شخص عیسائیوں میں بڑا محقق ہے۔ ۱۲ منہ

مانتے ہیں تو وہ اس کے زمانہ میں اختلاف کرتے ہیں۔ بعض ابراہیم علیہ السلام سے پہلے زمانہ کا بعض موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا بعض قضات کے عہد کا اور بعض یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا اور بعض سلیمان علیہ السلام کے، بعض بخت نصر کے، بعض اردشیر شاہِ ایران کے عہد کا بتاتے ہیں۔ اور اس کتاب کے مصنف میں بھی سخت اختلاف ہے کوئی الیہود کوئی ایوب کوئی موسیٰ کوئی سلیمان کوئی اشعیا کو کوئی کسی نامعلوم شخص کو کہتا ہے کہ جو منسی بادشاہ کے عہد میں ہوا ہے اور بعض حزقیل اور بعض عزرا کا نام لیتے ہیں۔

زبور میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے ارجن وغیرہ اور اگسٹائن وغیرھم کل کو داؤد علیہ السلام کی تصنیف کہتے ہیں اور جیردم اور یوسی بیس وغیرہ علماء اس قول کو رد کرتے ہیں اور تیس زبور سے زیادہ کے مصنف کو نامعلوم شخص کہتے ہیں اور باقی نوے سے ننانویں تک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف اور اکہتر زبور کو داؤد کی اور بارہ کو اساف کی اور گیارہ زبور کو قورح کے تین بیٹوں کی کہتے ہیں اور اٹھاسیواں (۸۸) زبور ہمان کی اور نواسیواں تھان اور تین زبور جدوچھن کی تصنیف کہتے ہیں اور ایک سوستائیسواں سلیمان کی تصنیف کہتے ہیں۔ امثالِ سلیمان میں بھی نہایت اختلاف ہے۔ الغرض یہ اختلاف سلف سے خلف تک چلا آیا ہے کہ جس کو لاچار ہو کر پادری فنڈر صاحب وکیل مذہب پولوسی نے بھی میزان الحق میں قبول کرلیا ہے (قولہ) ''اگرچہ پرانے عہد کی بعض کتاب لکھنے والے کا نام معلوم نہیں ہے لیکن مسیح کی گواہی سے اور ان دلائل سے بھی جو کتبِ اسناد میں ہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ سب الہام کی راہ سے لکھی گئی ہیں''۔ (صفحہ ۵۴ فصل ۳ باب اول) اور اسی طرح اختتام مباحثہ دینی مطبوعہ اکبر آباد ۱۸۵۵ء کے صفحہ ۳۶ میں کہتے ہیں (قولہ) ''بعض صحیفوں کی بابت معلوم نہیں کہ کس نبی کے ہاتھ سے لکھے گئے''۔ انتٰہی۔ صفدر علی و عماد الدین وغیرہ عیسائی اس کے جواب میں مسیح کی گواہی اور سلف کا تسلیم کرنا جو بیان کرتے ہیں ہم اس جواب کی طرف اگلی فصل میں غور کریں گے آیا یہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ؟

اب ہم کو اس دلیل کے لیے اور صحیفوں کی بابت اختلاف نقل کرنے کی کچھ حاجت نہیں رہی جب کہ مخالف کا وکیل خود تسلیم کرتا ہے۔ ان وجوہات سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدہا سال بعد مشائخِ یہود نے تصنیف کی ہے اس میں کچھ غلط اور صحیح حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اور کچھ احکام اصل تورات کے ہیں کہ جو ان کو زبانی یا اپنی اور کتابوں کے ذریعے سے یاد تھے اور کچھ آسمان و زمین وغیرہ چیزوں کی تاریخ ہے۔ واللہ اعلم

(عہدِ جدید) خیر تورات میں یہ بات تو ہے کہ اس میں کسی قدر مطالب اصل تورات کے ہیں اور کچھ مشائخ کے لکھے ہوئے تاریخی واقعات کہ جس کے مجموعہ کو اہلِ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف وہ کتاب تورات بتلاتے ہیں کہ جو انہوں نے بالہامِ الٰہی تصنیف کر کے لاویوں کو دی تھی۔ چنانچہ کتاب استثناء کے ۳۱ باب ۲۴ ورس میں یہ ہے (اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے لاویوں کو فرمایا کہ اس کتاب کو لے کر خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو۔ انتٰہی)

لیکن جس کو عیسائی انجیل کہتے ہیں وہ تو نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ وحی نازل ہوئی نہ خود ان کی تصنیف نہ ان کے زمانہ میں تصنیف ہوئی بلکہ ایک عرصہ بعد لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات اور ان کے معجزات اور پند و نصائح

کو جمع کرلیا ہے جن میں سے دو مصنف تو وہ ہیں کہ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا بھی نہیں' ایک مرقس دوسرا لوقا بلکہ لوقا کے استاد پولوس نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت نہیں پائی۔ پس یہ دونوں تو محض سنی سنائی باتیں لکھتے ہیں کہ جس میں الہام کو کچھ بھی دخل نہیں۔ چنانچہ خود ان کے دیباچہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اور دو شخص اگر وہی متی اور یوحنا ہیں کہ جو حضرت کے حواری ہیں تو اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات اور کچھ سنی سنائی بات لکھتے ہیں اور اکثر جگہ تورات و صحفِ انبیاء کے غلط حوالے دیتے ہیں کہ یہ مضمون فلاں جگہ لکھا ہے کہ وہاں اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔

پس ان کتابوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وہ نسبت ہے جو سکندر نامہ کو سکندر سے اور ہنود کی کتاب راماین کو راجہ رام چندر سے ہے۔ پس جو اس انجیل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب بتائے وہ سکندر نامہ کو بھی سکندر کی تصنیف بتلاوے۔

اب یہ بات باقی رہی کہ آیا خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی کوئی انجیل تھی جو حوادثِ مفصلہ ذیل میں تلف ہوگئی یا انجیل کے معنی تعلیم کے ہیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و وعظ ہی انجیل تھا؟ جہاں تک تجسس کیا گیا یہی بات معلوم ہوئی کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ایک کتاب تھی کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے اور جس کا ثبوت کتاب مرقس کے ۱۶ باب ورس ۱۵ میں ہے۔ ''اور اس نے انہیں کہا کہ تم تمام دنیا میں جا کے ہر ایک مخلوق کے سامنے انجیل کی منادی کرو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں انجیل تھی اور پولوس مقدس کے نامہ گلاتیوں کے اول باب ورس ۱ سے بھی اس انجیل کا پتا لگتا ہے۔ ''پر اے بھائیو! میں تمہیں جتاتا ہوں کہ انجیل جس کی میں نے خبر دی انسان کے طور پر نہیں ہے (۱۲) اس لیے کہ میں نے اس کو کسی آدمی سے نہیں پایا نہ کسی نے مجھے سکھایا' پر وہ یسوع مسیح کے الہام سے مجھے ملی''۔ انتٰہی اور اسی باب میں پہلے لوگوں کو تہدید کرتا ہے کہ بعض لوگ مسیح کی انجیل الٹ دینی چاہتے ہیں ''لیکن اگر ہم یا آسمان سے کوئی فرشتہ سوائے اس انجیل کی جو میں نے تمہیں سنائی دوسری انجیل تمہیں سنائے وہ ملعون ہوئے'' انتٰہی۔ اور دوسرے باب میں پطرس اور برناباس حواریوں کی شکایت میں لکھتا ہے (۱۴) ''جب میں نے دیکھا کہ وے انجیل کی سچائی پر سیدھی چال نہیں چلتے''۔

یہاں سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) یہ کہ پولوس کے پاس خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل تھی اور وہ ان چاروں انجیلوں موجودہ کے غیر تھی کس لیے کہ لوقا اور مرقس اور یوحنا کی انجیل تو اب تک تصنیف بھی نہیں ہوئی تھی اور متی کی انجیل پر یہ صادق نہیں آسکتا کہ میں نے اس کو کسی آدمی سے نہ پایا۔ کس لیے کہ اگر یہ انجیل مراد ہوتی تو یہ تو ان کو آدمیوں ہی کے ذریعے سے ملتی کما لا یخفیٰ۔

(۲) یہ کہ اس وقت میں بھی عیسائیوں میں انجیل کے الٹ دینے والے پیدا ہوگئے تھے۔ اب عیسائی کس منہ سے کہتے ہیں کہ انجیل میں تحریف کرنے سے کیا غرض تھی۔

وجوہِ فقدانِ انجیل شریف: اب ہم وہ وجوہ بیان کرتے ہیں کہ جن کے دیکھنے سے تعجب نہ رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل کیوں مفقود ہوگئی؟

(۱) تو وہی سبب کہ اس زمانہ میں بھی لکھنے کا دستور نہایت کم تھا اور کاغذ کم موجود تھا شاید درختوں کے پتوں یا کسی اور چیز پر لکھتے ہوں گے جیسا کہ مؤرخین کے قول سے پہلے واضح ہوا۔

(۲) یہ کہ اول اور دوسری صدی میں عیسائی غریب اور مفلس لوگ تھے اور بہت کم جہاں کہیں کوئی حواری جاتا تھا وہیں اس پر مصیبت آ جاتی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اس وقت کے بادشاہ ان کے سخت دشمن ہو گئے اور قتلِ عام شروع ہو گیا۔ چنانچہ دس بار عیسائیوں پر یہ قتل شروع ہوا اور متصل تین سو برس تک جاری رہا اور ۶۴ ء نیرو شاہِ فرنگستان کے حکم سے ہوا جس میں پطرس حواری اور پولوس وغیرہ مارے گئے۔ دوسرا جود دشیان کے عہد میں ہوا' اس ظالم نے بھی از حد خونریزی کی اور یوحنا حواری جلا وطن ہوئے۔ تیسرا قتل ترجان کے عہد میں اٹھارہ برس تک رہا۔ الغرض ایسے ایسے قتل دس بار ہوئے کہ جن میں گرجا گرائے گئے اور زمین خون سے رنگین کی گئی اور تلاش کر کے کتابیں جلائی گئیں۔

اس کے جواب میں پادری کہتے ہیں کہ تین سو برس تک گو یہ حوادثِ عظیمہ رہے لیکن بہت سے ملکوں میں عیسائی مذہب اور انجیل پھیل گئی تھی پھر کیونکر صفحۂ عالم سے مفقود ہو گئی۔ الخ

ہم کہتے ہیں کہ جس قدر یہودیوں کی موسیٰ علیہ السلام کے لے کر بخت نصر تک ترقی اور ثروت اور شیوع اور حکومتیں اور زمانہ گزرا ہے اس کی نصف بھی تین سو برس میں عیسائیوں کی ترقی اور حکومت نہیں ہوئی۔ پھر جب اس ایک حادثہ میں تورات صفحۂ عالم سے مفقود ہو گئی حتیٰ کہ اگر عزیر نہ ہوتے تو نام و نشان بھی باقی نہ رہتا تو اس قدر حوادثِ عظیمہ میں اس مفلس اور غریب قوم سے انجیل کا مفقود ہونا کیا تعجب کی بات ہے کیونکہ جس قدر قلت کاغذ کتابت کی اس عہد میں تھی ویسی ہی عیسائیوں کے ہاں اس زمانہ تک تھی نہ حفظ کا ان کے ہاں رواج تھا۔ پس اس زمانہ پر قیاس کرنا بڑی غلطی ہے اور شاہد اس امر پر یہ ہے کہ بہت سی کتابیں اس زمانہ کی اب بالکل مفقود ہیں چنانچہ انجیل یوحنا کے ۲۱ باب ورس ۲۴ میں ہے یہ وہ شاگرد ہے جس نے ان کاموں کی گواہی دی اور ان باتوں کو لکھا۔ اب اُس شاگردِ مسیح کی لکھی ہوئی کتاب کا نام و نشان بھی نہیں' اسی طرح انجیل لوقا کے دیباچہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اور لوگوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احوال میں انجیلیں لکھی تھیں چنانچہ تفسیر ہنری و اسکاٹ اور ڈوالی اور رچرڈ مینٹ میں اس کی تصریح ہے۔ مؤرخ موشیم اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۳۲ء کی جلد اول میں فرقہ ناصریوں اور آبیونی کے بیان میں لکھتا ہے کہ ان دونوں فرقوں کے پاس ہماری انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل تھی کہ جس کے بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے۔ انتہٰی ملخصًا (۳) اول ہی صدی میں عیسائیوں میں اناجیل تصنیف کرنے کا شوق ہو گیا تھا پس وہ انجیلی حضرت مسیح کی اناجیل کو الٹ پلٹ کر اپنی تصانیف کو زیادہ رواج دینا چاہتے تھے جیسا کہ پولوس کے بیان سے ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس قرن ہی میں صدہا انجیلیں تصنیف ہو گئی تھیں پس ان حوادث میں جب اصلی انجیل مٹ گئی تو ان میں سے جس کی انجیل مشہور ہو گئی اسی پر سادہ لوح عیسائیوں نے قناعت کر لی۔ اب ہم ان چاروں کتابوں کی بابت گفتگو کرتے ہیں اور ان تاریخوں سے ان میں سے کونسی بات زائد ہے کہ جس کی وجہ سے ان کو آسمانی کتابیں اور الہامی صحیفے مانا جائے اور انبیاء کی فہرستِ کتب میں درج کیا جائے سو واضح ہو کہ ان کا الہامی ہونا دو باتوں پر موقوف ہے: (۱) یہ کہ ان کے مصنفین انبیاء ہوں (۲) ان کی یہ تالیف محض عام مؤرخوں کی مانند نہ ہو کہ جو کسی واقعہ کو دیکھ کر یا سن کر لکھتے ہیں بلکہ محض انکشافِ الٰہی اور تائیدِ روح القدس سے ہو کہ جو خاصۂ انبیاء ہے اور جس میں غلطی کو دخل نہیں ہوتا ورنہ یوں تو ہر شاعر اور ہر مؤرخ بلکہ ہر شخص بشرطیکہ وہ امرِ شر نہ ہو الہام ہی سے کرتا ہے میں بھی یہ کتاب الہام کے ذریعہ سے لکھ رہا ہوں اول امر دو

شخصوں کی نسبت تو بالکل نہیں پایا جاتا یعنی ان چاروں میں سے لوقا اور مرقس کی نبوت اب تک کسی قوی دلیل تو کیا اقناعی سے بھی ثابت نہیں ہوئی نہ تو کسی کتابِ عہدِ عتیق میں ان کی نبوت کی پیشین گوئی ہے نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو نبی کہا ہے نہ ان کے بارہ حواریوں میں سے کسی نے فرمایا ہے۔ اول تو معجزات و خرق عادات کا (عیسائیوں کے نزدیک) کچھ اعتبار ہی نہیں کیونکہ انجیل متی کے باب ۲۴ ورس ۲۴ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول یہ ہے کہ بہت سے جھوٹے نبی ظاہر ہوں گے اور ایسے بڑے معجزے اور کرامتیں دکھائیں گے اگر ممکن ہوتا تو وہ برگزیدوں کو بھی گمراہ کرتے۔ انتہٰی۔ دوم ان سے کوئی معجزہ یا کرامت سرزد بھی نہیں ہوئی نہ کسی جگہ ان کا اور کوئی کمال مذکور ہے بلکہ اس سبب سے کہ ان کو پولوس نے تعلیم کیا ہے ان کے جھوٹے ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ پولوس کا دینی امور میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ سے اپنے خیالات کو پھیلانا پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ پولوس کسی طرح سے نبی نہیں بلکہ دینِ عیسویٰ کا مخرب اور محرف ہے اور نامہ حواریوں میں جو کچھ اس کی کرامات لکھی ہیں وہ ہمارے لیے سند نہیں کیونکہ وہ اس کے شاگرد کی تصنیف ہے اگر سچ ہے تو انہیں معجزات میں شمار ہیں کہ جن کی مسیح علیہ السلام نے خبر دی ہے کیونکہ اس نے شریعت پر چلنے والے کو ملعون[1] کہا اور تثلیث کی تعلیم کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات کو لغو اور کمزور بتایا چنانچہ نامہ عبرانیوں کے ۷ باب ۱۸ ورس میں کہتا ہے پس اگلا حکم (یعنی تورات) اس لیے کہ کمزور اور بے فائدہ تھا اٹھ گیا' انتہٰی۔ بلکہ یہ شخص جناب مسیح علیہ السلام کی جناب میں بھی نہایت بے ادبی کر کے اُن کو ملعون کہتا ہے العیاذ باللہ پس جب تک عیسائی پولوس کے اور ان کے شاگرد لوقا اور مرقس کی نبوت نہ ثابت کر دیں انجیل لوقا اور مرقس اور پولوس کے خطوط سے ہمارے روبرو کوئی سند نہ پیش کریں کیونکہ جب کہ ان کی نبوت تو کیا بلکہ دینداری ہی کلام ہے تو ان کی تصانیف کا کیا اعتبار ہے؟ اب رہے متی اور یوحنا سو اول تو اس کا بھی کوئی کافی ثبوت نہیں کہ یہ وہ متی اور یوحنا ہیں کہ جو حواری ہیں۔ دوم ان کی نبوت کی بابت بھی کوئی پیشین گوئی کہیں سے منقول نہیں' نہ کوئی مسیح علیہ السلام کا قول پایا جاتا ہے اور نہ کوئی معجزہ و کرامت منقول ہے۔[2] اور اگر ہو تو اس کا کیا اعتبار ہے کیونکہ مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں اس دن بہت سے کہیں گے اے خداوندا! کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے دیووں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سی کرامتیں ظاہر نہیں کیں اس وقت میں ان سے صاف کہوں گا میں کبھی تم سے واقف نہ تھا اے بدکارو! میرے پاس سے دور ہو انتہٰی (متی باب ۷)

کیونکہ سب حواری ان کتابوں کے بموجب پاکباز اور دیندار نہ تھے' دیکھئے یہود نے آنحضرت کو گرفتار کروا دیا آخر خودکشی کر کے مر گیا اور پطرس وغیرہ کو پولوس نے انجیل پر نہ چلنے کا الزام لگایا اور کیا کیا ان کی نسبت کہا اور دنیا سے آسمان پر چلتے وقت مسیح سب حواریوں کو بے ایمانی کا لقب دے گئے جیسا کہ مرقس کے ۱۶ باب ورس ۱۴ میں ہے اب جب تک یہ نہ ثابت کر دیا

---

[1] نہ وہ پولوس کی انجیل اب کسی کے پاس ہے کہ جس کو وہ ان سب انجیلوں کے غیر بتلا کر اس پر چلنے کا حکم دیتے تھے اور اس کے علاوہ اور انجیلوں کے سننے والے پر لعنت کرتے تھے سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ حواریوں میں پطرس وغیرہ کسی بڑے حواری کی تو کوئی بھی انجیل نہ ہو اور مرقس اور لوقا تابعین کی انجیلیں تسلیم کی جائیں۔

[2] اور کتاب اعمال حواریوں سے جو کوئی ثابت کرتا ہے تو بے فائدہ محنت اٹھاتا ہے کیونکہ یہ کتاب لوقا صاحب کی تصنیف ہے کہ جو پولوس کے شاگردِ رشید ہیں۔ ۱۲ منہ

جائے کہ متی اور یوحنا ان باتوں اور ان القابوں سے مستثنیٰ اور صاحب نبوت ہیں کیونکر نبوت کا اقرار کیا جائے' ہاں! ہم اہل اسلام اپنی تحقیق سے ان کو دیندار اور راستباز کہتے ہیں اور ان کا نہایت ادب کرتے ہیں اور پس دوسری بات تو بہت ظاہر ہے کہ یہ کتابیں انہوں نے الہام سے نہیں لکھیں کیونکہ لوقا اور مرقس تو سن کر لکھتے ہیں جیسا کہ خود دیباچۂ لوقا سے معلوم ہوتا ہے اور متی اور یوحنا اپنے روبرو گزرا ہوا معاملہ لکھتے ہیں اس میں بھی الہام کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ باسو برادر لیافان کہتے ہیں کہ جب حواری بچشمِ خود دیدہ یا معتبر گواہوں سے سن کر لکھتے تھے تو ان کو الہام کی حاجت نہ تھی۔ انتہیٰ۔ پولوس کے قول کے بموجب تو یہ چاروں کتابیں قابلِ رد ہیں کیونکہ اس نے اس انجیل کے سوا (کہ جو اس کو مسیح سے بلا توسطِ غیر ملی تھی جیسا کہ پہلے ذکر ہوا) اور کسی انجیل کے ماننے والے پر لعنت کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چاروں وہ انجیل نہیں اور بالفرض ہوئی بھی تو ایک ہوگی پھر تین غیر معتبر ہیں یہاں تک کہ ان کے سنانے والے پر لعنت پڑے گی اس کے سوا اور چند ادلہ ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ الہامی نہیں۔

وجۂ اول: یہ کہ ان کے مؤلفین نے بڑی سخت غلطیاں کی ہیں چنانچہ متی نے جو مسیح کا نسب نامہ لکھا ہے اس میں کئی نام بھول گیا جس کی تاویل میں مفسرین نہایت تکلفات کرتے ہیں اور اسی طرح اور چند غلطیاں کی ہیں جن کی تفصیل اعجاز عیسوی وغیرہ کتابوں میں ہے اسی طرح لوقا نے دوسرے باب میں غلطی کی ہے کہ اوگوسطوس قیصر نے اسم نویسی کا حکم دیا تھا اور قورنیوس حاکمِ یہودیہ کے وقت میں یوسف نجار اپنی بیوی مریم علیہا السلام کو جو کہ حاملہ تھیں ہمراہ لے کر شہر بیت اللحم میں نام لکھوانے آیا تھا اور وہاں حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہو پڑے' انتہیٰ ملخصاً حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ اول یوں کہ قورنیوس حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے پندرہ برس بعد وہاں کا حاکم ہوا تھا' دوم یہ کہ حسبِ بیانِ متی حضرت مسیح ہیرود کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور اس کی زندگی تک یہ ملک قورنیوس وغیرہ حکامِ روم کے قبضہ میں نہ آیا تھا۔

وجۂ دوم: دوم یہ کہ ان کتابوں میں بہت سے ایسے جھوٹے مضامین مندرج ہیں کہ جن کی شہادت آج تک کسی تاریخ سے نہیں پائی جاتی نہ عقل ان کو تسلیم کر سکتی ہے مثلاً متی نے ۲۷ باب میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب صلیب پر چلا کر جان دی تو ہیکل کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی قبروں سے نکل کر مقدس شہر میں بہتوں کو نظر آئیں (انتہیٰ ملخصاً) اور اسی طرح لوقا نے ۲۳ باب میں لکھا ہے کہ چھٹویں گھنٹہ کے قریب تھا کہ تمام زمین پر اندھیرا چھا گیا اور نویں گھنٹہ تک رہا اور سورج تاریک ہو گیا اور ہیکل کا پردہ بیچ سے پھٹ گیا (انتہیٰ) اور اسی طرح متی نے ۴ باب میں لکھا ہے کہ مجوسیوں کو ایک ستارہ دکھائی دیا اور وہ ان کے آگے چلتا تھا اور جہاں مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تھے وہاں آ کر ٹھہر گیا۔ انتہیٰ ملخصاً

وجۂ سوم: حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت وہ قول بھی نقل کیے ہیں جو ان کی شان سے نہایت بعید ہیں چنانچہ یوحنا اپنی کتاب کے ۱۰ باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے پیشتر جس قدر انبیاء آئے ہیں سب چور اور رہزن تھے (انتہیٰ ملخصاً) پھر اسی قول کی تقلید کر کے پولوس مقدس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جناب میں کیا کیا گستاخی کرتے ہیں کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی

(انتہیٰ ملخصاً)۔ (نامہ دوم قرنیتوں کا باب ۳) اور نامہ تک پرانے عہد نامہ کے پڑھنے میں وہی پردہ رہتا ہے اٹھ نہیں جاتا۔ عبرانیوں میں تورات کو کمزور اور بے فائدہ کہتا ہے اور اس سے بڑھ کر فرقہ پروٹسٹنٹ کے پیر و مرشد لوتھر صاحب اور بھی کلماتِ تعظیم منہ سے نکالتے ہیں چنانچہ وارڈ صاحب اپنی کتاب اغلاط نامہ مطبوعہ ۱۸۴۱ء کے صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں کہ لوتھر صاحب اپنی ایک کتاب کی تیسری جلد کے صفحہ ۴۰ میں لکھتے ہیں ہم نہ سنیں گے اور دیکھیں گے موسیٰ کو اس لیے کہ وہ صرف یہودیوں کے لیے تھا اور ہم کو اس سے کچھ علاقہ نہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ ہم نہ موسیٰ کو نہ اس کی تورات کو قبول کریں گے اس لیے کہ وہ دشمن عیسیٰ کا ہے اور جلادوں کا استاد ہے' پھر لکھتے ہیں کہ ان کے دس حکموں کو خارج کرنا چاہیے کیونکہ تمام بدعت انہی پر موقوف ہے حالانکہ ان دس حکموں میں یہ بھی ہے کہ: (۱) شرک نہ کرو (۲) ماں باپ کی تعظیم کرو (۳) ہمسایہ کو ایذا نہ دو (۴) خون نہ کرو (۵) زنا نہ کرو (۶) جھوٹی گواہی نہ دو وغیرہ ذلک پس اس تعلیم کے بموجب تو عیسائی شرک کرنے اور ماں باپ کی گستاخی کرنے اور ہمسایہ کو ستانے اور چوری اور زنا اور خون کرنے' جھوٹ بولنے کو راہِ نجات سمجھتے ہوں گے؟ معاذ اللہ اگر یہی الہام ہے تو الہام کو سلام۔

وجۂ چہارم: ایسی غلط پیشین گوئیاں ان کتابوں میں مندرج ہیں کہ جن کے جھوٹ ہونے میں کسی عیسائی کو ذرا بھی شک نہیں۔ چنانچہ انجیل متی کے ۲۴ باب میں اور مرقس کے ۱۳ باب میں اور لوقا کے ۲۱ باب میں مذکور ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے مخاطب ہو کر اپنے دوبارہ آنے کی بابت یہ فرمایا تھا کہ ان دنوں میں سخت مصیبت پڑے گی کہ جو نہ کبھی پہلے پڑی ہے اور نہ آگے پھر پڑے گی اور سورج اندھیرا ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گر جائیں گے اور آسمان کی قوتیں ہل جائیں گی تب ابن آدم کو (یعنی مجھ کو) بادل پر بڑی قدرت اور جلال سے آتے دیکھیں گے'' انتہیٰ اس کے بعد پھر فرماتے ہیں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ [1] سب کچھ نہ ہو لے اس وقت کے لوگ گزر نہ جاویں گے'' اور بعض کتب مطبوعہ ۱۸۴۱ء میں ہے کہ جب تک یہ سب کچھ پورا نہ ہو لے یہ پشت گزر نہ جائے گی اور انجیل مرقس میں یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ جب تک یہ سب کچھ واقع نہ ہو لے گزر نہ جاویں گے۔ حالانکہ اس زمانے کے تمام لوگ گزر گئے اور بہت ساروں کی تو انتظار میں آنکھیں بھی پتھرا گئیں تھیں مگر ان سب چیزوں میں سے کوئی بھی انہوں نے نہ دیکھی۔ اس مقام پر یہ خیال میں آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ باتیں قیامت کی علامات میں فرمائی ہوں گی سو انشاء اللہ وہ ہوں گی مگر یہ مؤرخ اپنی غلط فہمی سے کچھ اور سمجھ گئے۔

اب اس پر بحکم اندکے از بسیارے و مشتے از خروارے ان انجیلوں کی جملہ تحقیقات اور الہام کو قیاس کر لینا چاہیے۔ اسی لیے ان کتابوں میں اول اور دوم صدی کے عیسائیوں کو نہایت تردد اور شک تھا چنانچہ محقق برشینڈر اور اسٹاڈلن اور فرقہ الوجین جو دوسری صدی میں تھا اس انجیل کو یوحنا حواری کی تصنیف نہیں کہتا تھا اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ جب اس انجیل کا انکار

---

[1] بعض پادری کہتے ہیں کہ اس سب کچھ سے مراد صرف بیت المقدس پر مصیبت آنا تھا سو وہ اس وقت کے لوگوں نے دیکھا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ تمام باتیں ذکر کر کے پھر سب کچھ کہنا تو برہانِ قوی ہے اس بات پر کہ یہ سب چیزیں مراد ہیں نہ کہ بعض۔ سب کچھ سے بعض مراد لینا تمام اہلِ عقل کے نزدیک نامقبول ہے یوں تو بلا قرینہ ہر چیز کی تاویل ہو سکتی ہے پولوس بول کر عماد الدین مراد لے سکتے ہیں اسی مراد لینے نے تو انجیلِ اصلی کو غارت کر دیا۔ ۱۲ منہ

ہوا تو ارینوس نے جو پولی کارپ کا شاگرد ہے کبھی نہیں کہا کہ پولی کارپ نے کہ جو خاص یوحنا کا شاگرد ہے اس کو یوحنا کی تصنیف بتلایا ہے اور اسٹاڈلن کہتا ہے کہ یہ انجیل قطعی کسی طالب علم مدرسہ اسکندریہ نے لکھی ہے۔ بعض پادری کہتے ہیں کہ اسکندریہ کا مدرسہ تو اس انجیل کے بعد قائم ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ کیونکر ثابت ہوا کہ اس مدرسہ سے پیشتر یہ کتاب تھی۔ اس پادری کی بات کو مانیں یا اسٹاڈلن جیسے محقق کی بات مانیں کہ جس کے قول کو ہارن صاحب مفسر نے بڑے ادب سے اپنی کتاب کی جلد چہارم صفحہ ۳۱۶ میں لکھا ہے۔ اسی طرح اور تینوں کتابوں کی نسبت بھی بہت کچھ قیل و قال[1] تھی۔ اور یہ قیل و قال ضرور ہونی چاہیے تھے کیونکہ اس زمانہ میں صدہا انجیلیں تصنیف ہوگئی تھیں اور جو غیر معتبر شخص تھے وہ بتقلیدِ فلاسفۂ یونان اپنی کتاب کو کسی اور مشہور آدمی کے نام سے شہرت دیتے تھے چنانچہ تخمیناً اسی (۸۰) نوے (۹۰) اور کتابیں اب تک عیسائیوں میں مشہور ہیں کہ جن کو ان کے مرید الہامی کہتے تھے مگر جب ان کی نہ چلی اور مخالفوں نے اپنی کتابوں کو رد کر دیا تو وہ غریب بے الہامی ہوگئیں۔ اس جعلسازی کی وجہ سے بیچارہ پولوس بھی بڑا غل مچاتا تھا تین سو برس تک عیسائیوں میں یہی جوتی پیزار رہی کہ کسی نے کسی کتاب کو الہامی سمجھا اور انجیلوں کے سننے سنانے والے کو ملعون کہا، کسی نے کسی کتاب کو عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل قرار دے کر اپنا دل خوش کیا۔ آخر جب قسطنطین شاہِ روم کہ جو بڑا ظالم اور نہایت سفاک تھا اپنے گناہ معاف کرانے اور اپنے ظلموں کے مٹانے کے لیے پولوس کی جماعت کا مرید ہوا تو اس نے شہر نائس میں عیسائیوں کو جمع کر کے ان کتابوں کی بابت ایک کمیٹی قائم کی اور اپنے زور و شوکت سے تمام عیسائیوں کو ان کتابوں کے ماننے پر مجبور کیا اور مسئلۂ تثلیث اور کفارہ کو کہ جس کے اعتماد پر وہ عیسائی ہوا تھا بتحکم رواج دیا۔ اس وقت سے ان کے ہاں اس زبردستی کا نام اجماعِ سلف قرار پایا کہ جس کو آج کل کے عیسائی ان کتابوں کے مقبول ہونے کے لیے سند قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ پادری صفدر علی کہ جس نے ان کتابوں کے الہامی ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے نیاز نامہ کے صفحہ ۲۰۰ میں بڑی مجبوری سے اقرار کرتے ہیں کہ ''وجوہات مذکورہ بالا کے باعث تخمیناً ۳۰۰ء تک نہ تو تمام جماعتوں کو تمام نوشتوں کی اصلیت کا حال معلوم ہوگیا تھا الخ۔ پس جو کچھ ان کے پاس برائے نام سند ہے وہ ۳۰۰ء تک بمشکل پہنچتی ہے۔ آگے تو بس یہی سند ہے کہ اگناشش پاولی کارپ وغیرہ کی تحریرات میں بعض ایسے جملے پائے جاتے ہیں کہ جن کا مضمون ان کتابوں سے مطابق ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا کوئی دانشمند پچھلی کتاب کو مقدم کہہ سکتا ہے؟ گلستان یا بوستان میں بعض کیا بہت سے مضامین وعظ و پند میں اناجیل کے وعظ و پند سے ملتے ہیں اب کوئی بیوقوف ہوگا جو یہ کہے گا کہ اناجیل سعدی کی کتابوں سے لکھی گئیں یا اناجیل کے وقت میں سعدی کی کتابیں تھیں۔ پس اسی طرح اگناشش وغیرہ کی تصانیف اگر مقدم ہوں تو کیا بعض مضامین کی مطابقت سے مؤخر ہو جاویں گی بلکہ بعض اوقات بعض کتابوں کے مضامین میں توافق ہوتا ہے اور ایک کو دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوتی اس سے لینا یا اس کی شہادت دینا چہ معنی دارد؟ ولوسلمنا اگر شہادت ہے تو بعض مضامین کی ہے کل کتاب کا تسلیم کر لینا کہاں سے پایا جاتا ہے؟ واضح ہو کہ یہ

[1] انجیل متی اصل میں عبرانی میں تھی اس کا ترجمہ یونانی میں خدا جانے کس نے کیا اور کیسا کیا ہے۔ اصل اس کی کسی کے پاس نہیں کہ جو اس سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ یہاں سے آپ کو اور کتابوں کے گم ہو جانے میں کچھ تعجب نہ معلوم ہوگا کیونکہ جس طرح اور جس سبب سے متی کی عبرانی کتب مفقود ہوگئی وہی سبب کتابوں کے لیے پیش آیا۔

بات ہمارے عیسائیوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ چاروں انجیلیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصنیف ہیں نہ ان کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔

پس ہم کو تو بحث کو اسی جگہ تمام کر دینا چاہیے تھا کیونکہ جس انجیل کے اہلِ اسلام قائل ہیں اور جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ انجیل ہے کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ روح القدس نازل ہوئی ہے جس طرح کہ تورات و زبور و دیگر صحفِ انبیاء کا حال ہے مگر چونکہ عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ گو یہ مسیح کی اناجیل نہیں مگر یہ بھی الہامی اور رسولوں کی تصنیف ہیں اس لیے ان سے بھی بحث کرنی پڑی۔ ہر چند اس بات کو بھی ہم نے تجسس کر کے دیکھا مگر بہت سے وجوہ سے غلط پایا اور عیسائیوں کے پاس سوائے خوش اعتقادی کے اور کوئی دلیل نہ دیکھی۔ ہاں اس قدر ہم بھی مانتے ہیں کہ ان میں کچھ مضامین الہامی بھی ماخوذ ہیں اور یہ بھی متفق علیہ کہ ان کے مصنفین کے بعد ان میں خواہ سہواً خواہ عمداً بیشمار جگہ غلطیاں اور کمی زیادتیاں بھی ہوئی ہیں کہ جن کا شمار بقول علماءِ اہلِ کتاب ہزار ہا تک پہنچتا ہے جن کی تفصیل اظہار الحق وغیرہ کتب میں ہے اور جن کا اقرار پادری فنڈر صاحب کو بھی ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ پادری صاحب ان تحریفات کو اپنی خوش اعتقادی سے ویریوس* ریڈنگ یعنی سہوِ کاتب کہتے ہیں ہم نہیں کہتے لیکن مدعا واحد ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ جب اہلِ اسلام ان کتابوں میں تحریف ثابت کرتے ہیں تو ان کا اول صدیوں میں غیر مقبول ہونا یا ان کی نسبت علمائے اہل کتاب کا یہ کلام ہونا کہ یہ دراصل ان شخصوں کی تصنیف ہی نہیں و دیگر مضامین اور بھی اسی قسم کے ذکر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اعجازِ عیسوی وغیرہ کتب میں یہ کیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ جملہ بھی[1] بتلایا کرتے ہیں کہ جن کو محققینِ مسیحین نے الحاقی بتلایا ہے۔

اس پر پہلی بات کا جواب پادری یوں دیا کرتے ہیں کہ اس سے تحریف کو کیا علاقہ؟ اس سے تحریف کیونکر ثابت ہوئی؟ چنانچہ فنڈر صاحب نے بھی کہا ہے اور عماد الدین اور صفدر علی بھی انہی کی تقلید کر کے یہی فرماتے ہیں مگر ہم کو کیا بلکہ سب اہلِ عقل کو اس جواب پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی کسی گھوڑے میں عیوب ثابت کرنے والا یہ کہے کہ دیکھو یہ تو مرگیا یہ اب بالکل کسی کام کا نہیں۔ اس کے جواب میں مالک کہے اس سے کیا ہوتا ہے اس کے پاؤں اور دم وغیرہ اعضا میں کوئی عیب بتاؤ۔ اب وہ بیوقوف یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا مدعا تو بخوبی ثابت ہوگیا کیونکہ جب اصل ہی نہیں رہی تب اب اس کی فروعات کہاں؟ اور دوسری بات کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ اچھا کچھ فقرے الحاقی ہوئے تو کیا ہوا ان سے ہمارے اصولِ

[1] قرآن مجید میں بعض جگہ یہود کے مذاہب میں یہ واقع ہوا ہے یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کہ بعض کلمات کو ان کی جگہ سے محرف کرتے ہیں اور اسی طرح کی اور آیات ہیں ان کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ یہود کتاب میں تبدیل نہ کرتے تھے بلکہ کسی کے سناتے وقت شرارت سے یہ کام کرتے تھے۔ بعض کہتے ہیں بلکہ نفسِ کتاب میں اغراضِ دنیاویہ سے تبدیل کرتے تھے خیر جو کچھ ہو مگر یہ بات یہودِ مدینہ کی بابت ہے لیکن قطع نظر اس آیت کے یہود کیا بلکہ کل اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں تحریف کرتے تھے۔ اگر یہ آیت نازل نہ ہوتی تب بھی یہ نفس الامری حسب اقرار اہل کتاب پر باقی رہتا۔ ہمارے دعوائے تحریف کی بنیاد اس قسم کی آیات پر نہیں بلکہ ایک نفس الامری واقع پر ہے۔ اب اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہونا ہمارے دعوے کو کچھ مضر نہیں۔ وہ خفیہ کرسٹان بتقلیدِ ولیم میور صاحب ان آیات کے ذیل میں جو کچھ علماء نے فرمایا ہے اور وہ جو بعض نفسِ قرأت میں تغیر کے قائل ہوئے ہیں ان سے تورات و اناجیل کو اصلی اور غیر محرف ثابت کر کے مسلمانوں کو بہ پردۂ اسلام دھوکا دے رہا ہے۔ ۱۲ منہ

مذہب میں کیا فرق آیا کل کتاب کیونکر غیر معتبر ہوگئی؟ ان میں محمد صاحب (ﷺ) کی بشارت سے کیا علاقہ۔ چنانچہ فنڈر صاحب اور ان کے دو مقلدوں نے اپنی تصانیف میں یہی ذکر کیا ہے اور لفظ لفظ پر طعن وطنز کرتے گئے ہیں، مگر یہ جواب اول سے زیادہ لغو ہے۔

پادری صاحبو! ذرا اتنا تو سوچو کہ جب دو چار فقرے الحاقی ثابت ہو گئے گو بقول آپ کے ان سے آپ کے اصول دین میں کوئی فتور نہیں آتا مگر یہ کتاب تو غیر معتبر ہوگئی۔ اب کیا اعتبار کہ آپ کے اصولِ دین بھی ایسے ہی الحاقی فقروں سے ثابت ہوں۔ الغرض کتاب کی بے اعتباری یا کسی دستاویز کی بے اعتباری کے لیے ادنیٰ شبہ بھی کافی ہوتا ہے چہ جائیکہ صدہا الحاقات۔

فائدہ: جب چاروں انجیلوں کا یہ حال ہے تو پولوس کے خطوں کا کیا اعتبار ہے۔ اس میں تثلیث اور خدا کا مجسم ہونا اور شریعت کو ترک کرنا وغیرہ وہ ملحدانہ مضامین ہیں کہ جو تمام اہلِ نقل وعقل کے نزدیک بدتر اور خراب ہیں اور پطرس اور دیگر شخصوں کے خطوط بھی ان شرائط سے خالی ہیں کہ جو کتابِ الٰہی کے لیے ضروری ہیں۔

فصل سوم

فائدہ: خدا تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ تورات اور زبور اور انجیل کی مدح فرمائی ہے اور صحفِ ابراہیم وموسیٰ کا بھی تبعاً ذکر کیا ہے اور قرآن کو ان کتبِ مقدسہ کا مُصَدِّق یعنی سچا کرنے والا کہا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور تورات کو کتابِ منیر اور امام اور فرقان اور رحمۃ وغیرہ القاب سے یاد کیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ فرمایا ہے وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ الآیہ کہ ہم نے اس کو انجیل دی اسی طرح واتینا داؤد زبورا فرمایا ہے کہ داؤد کو ہم نے زبور دی اور سورۂ بقرہ میں ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی یعنی تورات، اور کئی جگہ ان کتابوں پر ایمان لانے کی تاکید فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ......الآیہ کہ "اے مسلمانو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل ہوئی اور جو اس سے پہلے نازل ہوئی"۔ اور سورۂ بقرہ کے اول ہی میں مومنین کی شان میں فرمایا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ کہ مسلمان وہ ہیں کہ جو چیز تم پر نازل ہوئی اس پر اور جو تم سے پہلے نازل ہوئی اس پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی[1] آیات ہیں۔ یہاں سے دو باتیں ثابت ہوئیں: اول یہ کہ تورات وہ کتاب ہے جو کہ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور زبور وہ کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی اور انجیل وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور کچھ

[1] اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔

صحفے حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ انبیاء پر نازل ہوئے تھے اور اس امرِ منصوص میں سنی، شیعہ کل فرقے اسلام کے سلف سے خلف تک متفق ہیں۔ پس یہ کتاب جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد تصنیف ہوئی اور کچھ مضامین توراتِ اصلی کی یادداشت کے طور پر اس میں درج کر کے تورات نام رکھا گیا قطعی وہ تورات نہیں کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے اسی طرح وہ کتابیں جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لوگوں نے تصنیف کی ہیں اور ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات واقوال کو صحیح وغلط طور پر جمع کر دیا ہے کہ جس کو اب عیسائی انجیل متی ومرقس ولوقا ویوحنا کہتے ہیں وہ انجیل نہیں کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے چنانچہ امام قرطبی نے اپنی کتاب اعلام میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور امام رازی وغیرہ جمیع علماءِ اسلام اسی کے قائل بلکہ تمام امتِ محمدیہ میں یہ مسئلہ متفق علیہا ہے بخوفِ تطویل[1] اقوال نقل کرنا مناسب نہیں جانتا۔ پس اب جو اہلِ کتاب اس تورات وانجیل کو لیے پھرتے ہیں اور اس کو اصل تورات وانجیل بتا کر مسلمانوں کو ایمان لانے کے لیے مجبور کرتے ہیں محض فریب ہے اس سے ہر ایماندار کو بچنا فرض ہے۔

دوم یہ کہ وہ تورات وانجیل وزبور ودیگر صحفِ انبیاء کہ جن کا قرآن میں ذکر ہے کلامِ الٰہی اور واجب التعظیم تھے جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی معرفت ان میں ذکر فرمایا تھا سب حق تھا اسلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے یہ ہدایت کی ہے کہ اپنا اور بیگانہ[2] کچھ نہ دیکھو بلکہ جس قدر خدا کے فرستادہ لوگ ہیں کہ جن کو انبیاء کہتے ہیں خواہ کسی ملک کے ہوں اور جس قدر مقدس کتابیں خدا نے بھیجی ہیں سب پر ایمان لاؤ اگرچہ بحکم وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کہ "ہر گروہ میں خدا کی طرف کا ہادی آیا ہے" وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (کہ بعض انبیاء کا آنحضرت سے ذکر آیا اور بعض کا نہیں۔) ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کے ہادی نبی یا ان کے نائب ضرور آئے (کہ جن کا علمِ تفصیلی خدا ہی کو ہے اور اجمالاً ہم سب کو حق جانتے ہیں اور تفصیلاً ان کی تعیین کرتے ہیں کہ جن کا ذکر قرآن واحادیث میں آیا ہے) مگر چونکہ ان انبیاء کے طرق اور کتب میں حوادثِ زمانہ سے وہ تغیرات پیش آئے اور وہ تحریفات اور خلط ہوا کہ جس سے اصل مذہب اور اصل کتاب میں کچھ امتیاز نہ رہا بلکہ اکثر وہ کتابیں صفحۂ عالم سے ناپید ہو گئیں اور ان مذاہب کے مشائخ نے اپنے خیالاتِ فاسدہ کو مضامینِ الہامیہ میں ملا کر ایک ایسی معجون مرکب بنائی کہ جس کے اجزاءِ اصلیہ اور غیر اصلیہ میں تمیز کرنا کسی استحالۂ کیمیائی سے ممکن نہ رہا اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت سے سب نبیوں کے آخر میں ایک ایسا نبی بھیجا کہ جس کی تعلیم کامل کی وجہ سے آئندہ کسی نبی کی ضرورت نہ رہی اور اس پر وہ کتابِ جامع نازل فرمائی کہ جس میں پہلے انبیاء کی ضروری ہدایتیں اور ان کتبِ مقدسہ کے سب اصول زمانۂ اخیر کی رعایت ملحوظ رکھ کر جمع کر دیے اور ہم کو اس تکلیف مالا یطاق سے نجات بخشی کہ کتابوں کی تحقیق کرتے پھریں اور ان کے وجوہِ اصلی کے اثبات میں سرگردانی اٹھائیں اور جو کوئی نسخہ بہم پہنچے تو پھر اس میں اصل اور ملونی میں تمیز کریں۔ للہ الحمد۔ پس قرآن کا ماننا خدا کی تمام کتابوں کا ماننا ہے اور محمد ﷺ پر ایمان لانا جمیع

[1] وہ کرستان اپنی پہلی تحریرات کو غلط ٹھہرا کے اب پھر پادریوں کے خوش کرنے کو ان تورات وانا جیل کو اصلی بتاتا اور اس بات کے منکر کو کافر کہہ کر ضمناً مسلمانوں کو کافر کہتا ہے۔ ۱۲ منہ

[2] یعنی اپنی قوم اور اپنے ملک کا خیال نہ کر کے سب انبیاء کو حق مانو اس سے اس کرستان نے ہنود کے دیوی دیوتا کس لفظ سے سمجھ کر مفسر پر الزام لگا دیا کہ

انبیاء پر ایمان لانا ہے اور ان سے سرتابی اور انکار جمیع انبیاء اور ان کی سب الہامی کتابوں سے انکار کرنا ہے کہ جس کی سزا ابدی جہنم اور خدا کے جلال اور بادشاہی میں سب سے خوار اور ذلیل ہونا ہے۔ عیسائی برائے نام توریت کا بوجھ لادے تو پھرتے ہیں مگر پولوس کے کہنے سے اُس پر بالکل عمل نہیں کرتے بلکہ اس کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

فائدہ ۲: نزولِ قرآن مجید کے وقت گو تورات وانجیلِ اصلی دنیا پر نہ تھیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوا مگر اصلی تورات وانجیل کے صدہا احکام اور بیشمار باتیں اہلِ کتاب میں زبانی یا ان فرضی کتابوں کے وسیلے سے مشہور ومعروف تھیں لیکن وہ لوگ اپنی شرارت سے ان پر بھی عمل نہیں کرتے تھے اس لیے خدا تعالیٰ نے جابجا قرآن کی صداقت ثابت کرنے میں اس بات کو ذکر کیا کہ یہ قرآن کتبِ سابقہ اور انبیاءِ سابقین کے برخلاف نہیں بلکہ اصولِ مذاہب اور امورِ فطرت میں ان کے مطابق اور ان کا اور اگلے انبیاء کا مصدق ہے کہ جن کو تم مانتے ہو پھر اب قرآن کو نہ ماننا ان کا نہ ماننا ہے اور یہ کہ جن کو تم تورات وانجیل سمجھتے ہو اس پر کیوں نہیں عمل کرتے اور جن انبیاء کی پیروی اور محبت کا تم کو دعویٰ ہے ان کی پیروی کس لیے نہیں کرتے اور کبھی مشرکینِ عرب کو بعض قصص واحکام میں الزام دینے کے لیے یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کو اہلِ کتاب سے پوچھ دیکھو وہ بھی یہی کہتے ہیں پھر محمد علیہ السلام نے کونسی نئی بات فرمائی ہے کہ جس پر تم چونکتے ہو۔ ان باتوں سے بعض ناواقف پادری یہی سمجھ گئے کہ نزولِ قرآن کے وقت تورات وانجیل بجنسہٖ موجود تھی کہ جس کی طرف خدا نے حوالہ دیا ہے اور جس پر عمل کرنے کی ترغیب دی ہے اور وہ یہی تورات وانجیل ہے کہ جو ہمارے پاس موجود ہے حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے۔ فائدہ ۳: اہلِ کتاب بالخصوص پادریوں نے اس تورات وانجیلِ موجودہ کے اصلی تورات وانجیل ہونے پر چند ادلہ بیان کیے ہیں جو محض وہم پر مبنی ہیں میں ان کے دلائل اور پھر ان کے جواب ذکر کرتا ہوں۔

دلیل اول: قرآن میں متعدد جگہ تورات وانجیل پر اہلِ کتاب کو عمل کرنے کی ترغیب دی اور ان کے محامد بیان فرمائے ہیں اور ان پر ایمان لانے اور ادب کرنے کی ترغیب دی اگر اس وقت یہ کتابیں موجود نہ ہوتیں تو عمل کس پر اور ایمان کس پر لاتے؟ اور وہ آیات یہ ہیں: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ...... الآیه...... قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ...... الآیه...... قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ لِيَحْكُمَ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ...... الآیه﴾ وغیرها من الآیات۔ پس صاف معلوم ہوا کہ اس وقت تورات وانجیلِ اصلی موجود تھیں اور وہ یہی ہیں۔ جواب ہمارے پاس ہیں۔ نیاز نامہ کے مصنف نے اس دلیل پر بڑا زور دیا ہے اور بہت سے ورق سیاہ کیے ہیں۔[1] جواب اول اور دوسری اور پانچویں آیت کا اور جس قدر آیات اس مطلب پر دلالت

[1] پادریوں کے قدیم نمک خوار نے بہ پردہ اسلام پنج گنج اور جواب تفسیر حقانی میں کسی انعام کی امید میں کتاب نوید جاوید اور رقیمۃ الوداد کے خلاف پھر ان کتابوں کو ان آیات اور بعض اقوال سے بتقلیدِ ولیم میور صاحب اصلی اور غیر محرف ہونا ثابت کرنا چاہا ہے اور ایسا زور لگایا ہے کہ ایمان کو خیر باد کہہ کر جو کچھ نہ کہنا تھا کہہ دیا۔ مسلمانوں کو ان سے پرحذر رہنا چاہیے کہ کل کو کوئی عیسائی ان کی اس اخیر تصنیف سے جو بنام محمد صادق ومحمد صالح لکھی ہے اہلِ اسلام پر حجت نہ پکڑے اطلاعاً یہ اعلان کر دیا گیا اور کافہ علماء نے ان کی تکفیر پر مہر بھی کر دی ہے۔ ۱۲ منہ۔ ولیم میور صاحب نے اپنی شہادت قرآنی میں انہی آیات سے استدلال کیا ہے۔

کرتی ہیں ان سب کا یہ جواب ہے کہ تورات وانجیل کے اوپر چلنے اور ان کے قائم رکھنے سے تورات وانجیلِ اصلی کے احکام مراد ہیں جیسا کہ بیضاوی وغیرہ جمہور مفسرین نے بیان کیا اور خود مستدل نے نقل کیا اور قرینہ بھی دال ہے اور احکامِ تورات وانجیل کے بیشتر ان تورات وانجیل میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت تورات وانجیل کے احکام ان کے پاس موجود تھے اور احکام کے موجود ہونے سے مجموعۂ تورات وانجیل کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھئے ہدایہ وغیرہ کتبِ فقہ میں قرآن کے احکام موجود ہوتے ہیں مگر ہدایہ کو قرآن نہیں کہہ سکتے۔ تیسری اور چوتھی آیت کہ جس میں یہ ہے کہ یہود کے پاس تورات ہے اور اس قسم کی اور جملہ آیات کا یہ جواب ہے کہ یہاں بھی تورات سے مراد احکامِ تورات ہیں سو وہ بے شک یہود کے پاس خواہ بلا تغیر خواہ بالتغیر اس توراتِ فرضی میں اب تک موجود ہیں۔ پس احکام کے موجود ہونے سے مجموعۂ توراتِ اصلی کا موجود ہونا لازم نہیں آتا اور دلیل اس بات پر کہ تورات سے مراد احکام ہیں بطریقِ اطلاق الکل علی الجزیہ ہے کہ اصل تورات وہ ہے کہ جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی جیسا کہ آیاتِ مذکورہ سے ثابت ہے اور یہ مجموعہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد مرتب ہوا جیسا کہ اس کے دلائل گزرے۔ پس جس نے ہم کو یہ بتایا کہ ان کے پاس تورات ہے اسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ پس مستدل جب تک اس احتمال کو کہ جو ناشی عن الدلیل ہے بند نہ کر دے گا تو اس کی دلیل سے نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ دوم یہود اس مجموعہ کو تورات کہا کرتے تھے اور اب تک کہتے ہیں اور اس میں اصلی تورات کے احکام بھی موجود ہیں پس قرآن میں ان کو ان احکام پر عمل نہ کرنے میں الزام دینا مقصود تھا اس لیے اس مجموعہ کو اسی لفظ سے تعبیر کرنا پڑا کہ جو ان کے نزدیک مشہور تھا اور اگر کچھ اور کہتے تو وہ ہرگز نہ سمجھتے مثلاً کوئی شخص ایک کتاب تصنیف کرے کہ اس میں قرآن مجید کے اکثر احکام اور غلط طور سے جمع کر کے اس کا نام قرآن رکھ دے اور ہمیں اس کو اس وجہ سے کہ وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔ الزام دینا منظور ہو اور اس مجموعہ کے نام لینے کی ضرورت پڑے تو بلاشک ہم اس کو قرآن کے لفظ سے تعبیر کریں گے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ ہم نے اس کو اصل قرآن تسلیم کر لیا۔

دلیل دوم: اہلِ کتاب کو اپنی کتابوں کے گم کر دینے یا بدل دینے میں کوئی غرض نہ تھی بلکہ ہر ایک میں اہلِ کتاب اور کتاب تھے اور باہم بڑے غیور تھے پھر ممکن نہیں کہ کوئی کتاب میں تصرف کرنے پاتا جس طرح کہ اہلِ اسلام میں کوئی قرآن میں کسی طرح تصرف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی بادشاہ اس کو مٹا سکتا ہے۔ (نیاز نامہ وغیرہ ملخصًا)

جواب: یہ ایک گمان یا وہمِ فاسد ہے کیونکہ جب پولوس مقدس اور حواری اول ہی صدی میں شور مچاتے ہیں کہ لوگ انجیل کو الٹ دینا چاہتے ہیں تو اب یہ غرض ان سے پوچھنی چاہیے اور قرآن کا مدار اول ہی سے حفظ پر ہے اگر تمام نسخے دنیا سے معدوم کر دیے جاتے تو بھی ایک حرف میں فرق نہ آتا۔ بخلاف کتبِ مقدسہ کے کہ اس کا مدار صرف لکھنے پر تھا اور لکھنے کی اور کاغذ کی قلت اور صدہا سال تک مصائب کی بڑی کثرت تھی۔ پس ان کا گم ہو جانا یا ان میں تغیر ہونا کچھ بھی بعید نہیں۔ چنانچہ باقرارِ علماءِ اہلِ کتاب اب نہ وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے لکھ کر لاویوں کو دی تھی نہ عیسیٰ علیہ السلام کی وہ انجیل ہے کہ جس کی منادی کرنے کی وہ تاکید فرما گئے تھے اور جو پولوس مقدس کو بلاتوسط کسی آدمی کے پہنچی تھی وغیر ذلک۔

دلیل سوم: ان کتابوں میں بہت سے ایسے مضامین ہیں کہ جو خدا کی ذات وصفات وتقدس اور انسان کو خدا سے

تقرب اور محبت اور روح کی پاکیزگی کا طور بتلاتے ہیں اور نیک چلنی اور اخلاقِ حمیدہ سکھاتے ہیں اور عالم کے پیدا ہونے اور انسان کی نجاست کا وسیلہ بیان کرتے ہیں۔ وغیر ذلک اور ان میں بہت سی پیشین گوئیاں بھی مندرج ہیں جو اپنے وقت پر ظاہر ہوئیں اور یہ سب مضامین بغیر الہام اور تائیدِ روح القدس کے اور کسی کو حاصل نہیں ہوتے۔ اس دلیل کو پادری فنڈر صاحب نے میزان الحق میں ہر ہر بات کا حوالہ دے کر بڑے بسط سے بیان کیا ہے اور ہر ایک بات کو دلیل بنا کر ایک کی چو دلیلیں بتائی ہیں اور بڑے زور سے نتیجہ نکالا ہے۔

جواب: اولاً غایۃ مافی الباب یہ مضامین الہامی اور انبیاء علیہم السلام کے فرمائے ہوئے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کتاب میں یہ مضامین بطور نقل کے جمع کر دیے جائیں وہ انبیاء کی تصنیف اور الہامی کتاب بھی ہو جائے۔ کیا اگر کوئی شخص قرآن کے مضامین کو ملخص کر کے اس پر کچھ اور ملا کے کتاب بنا دے وہ قرآن ہو سکتا ہے؟ ان مضامین کا الہامی ہونا اور بات ہے کتاب کا الہامی ہونا اور بات۔ بہت سی غیر الہامی کتابوں میں الہامی مضامین ہوتے ہیں۔

ثانیاً ان کتابوں میں اگر یہ عمدہ مضامین ہیں تو اس کے ساتھ خراب مضامین بھی تو ہیں کہ جن کو الہام کی طرف منسوب کرنا بھی نازیبا ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔ پس یہ مجموعہ کیونکر الہامی ہو سکتا ہے؟

ثالثاً جن کتابوں کے تم منکر ہو ان میں بھی یہ مضامین نہایت عمدگی سے پائے جاتے ہیں پھر ان کو الہامی کیوں نہیں کہتے؟

دلیل چہارم: یہ کتابیں ان کے مصنفین سے لے کر آج تک ہم میں متواتر چلی آتی ہیں اور تمام امت کا ان کے قبول کرنے پر اجماع ہو چکا ہے اور یہ اجماع ہر قرن میں پایا گیا ہے۔

جواب: اول تو یہ دعویٰ غلط ہے کہ ان کے مصنفین تک ہر قرن میں ان کتابوں پر اتفاق رہا ہے کیونکہ تیسری صدی کے بعد قسطنطین کی وجہ سے یہ اتفاق یا نفاق جو کچھ کہو پایا گیا مگر اس سے پیشتر یعنی حضرت مسیح علیہ السلام سے تخمیناً تین سو برس تک تو سب کتابیں عیسائیوں میں عموماً مشہور بھی نہ تھیں جیسا کہ اوپر گزرا اتفاق اور اجماع ہونا تو کجا؟

دوم اگر یہ سب تسلیم بھی کر لیا جائے تو غایۃ الامر یہ کتابیں ان کے مصنفین کی تصنیف قرار دی جائیں گی لیکن اس سے الہامی ہونا ہرگز ثابت نہ ہوگا جب تک کہ وہ پہلی شرطیں ثابت نہ کی جائیں گی۔

دلیل پنجم: چونکہ خدا سب کا خدا ہے تو اس کا دین بھی سب کے لیے ہونا چاہیے اور دین کی تعمیم بغیر اس بات کے ممکن نہیں کہ وہ کتاب تمام عالم میں پھیلے اور یہ صفت خاص بائیبل بالخصوص عہدِ جدید میں پائی جاتی ہے کیونکہ اب کوئی ملک باقی نہیں کہ جہاں انجیل کی منادی نہ ہوتی ہو اور ہر زبان میں اس کے ترجمے ہو گئے ہیں تو یہ نشان الہامی ہونے کا ہے۔

جواب: یہ دلیل بھی محض پادریانہ خیال ہے کیونکہ اول تو سب کتابوں سے زیادہ بائیبل کی شہرت نہیں بلکہ ابتدا سے لے کر اب تک جس قدر قرآن کی دنیا میں شہرت ہوئی اس قدر کسی کتاب کی نہیں ہوئی کونسا ملک اور کونسی زبان ہے کہ جہاں قرآن کے روح افزا مضامین لوگوں کی زبان پر جاری نہیں؟ اور انجیل کی شہرت جو کچھ ہے سو تخمیناً ہزار برس سے ہے پس لازم آیا کہ اس سے پیشتر یہ کتاب الہامی نہ تھی پھر ہو گئی۔

دوم زیادہ شہرت ہونے سے الہامی ہونا لازم نہیں آتا۔ گلستاں اور کلیلہ دمنہ کی شہرت بھی کچھ کم نہیں۔ ان کو بھی الہامی کہو۔

دلیل ششم: اس کتاب کے پڑھنے سے نیک چلنی اور محبتِ الٰہی اور روح کی صفائی پیدا ہوتی ہے اور یہ خاصہ الہامی کتابوں کا ہے۔

جواب: بالفرض اگر بعض مضامین کی وجہ سے جو کہ الہامی ہیں یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مجموعۂ کتاب الہامی نہیں بلکہ ان کتابوں کے پڑھنے سے دل پر (تثلیث پرستی اور خدا کی ذاتِ مقدس میں عیوب ثابت کرنے سے اور عیسیٰ علیہ السلام کو کفارہ سمجھ کر دن میں ہزار بار حرام کاری کی اجازت اور شراب اور سور اور جھوٹ بولنے کی رخصت سے) وہ تاریکی اور الحاد پیدا ہوتا ہے کہ جو کسی کتاب سے نہیں ہوتا۔ یورپ میں اس قدر الحاد اور زنا اور جھوٹ اور شہوت پرستی کا شیوع انہیں کتابوں کی برکت سے ہوا ہے برعکس اس کے کہ قرآن مجید کی ہدایت کا اثر اب تک تمام عالم پر جلوہ گر ہے۔

فصل چہارم

ہنود بھی اپنی کتابوں کو الہامی کہتے ہیں گو ان کا قرآن میں کہیں تفصیلاً ذکر نہیں مگر ہر الہامی کتاب پر ایمان لانا ہم اہلِ اسلام پر فرض ہے اس لیے ان کی تحقیق کرنا بھی ضرور ہوا۔ واضح ہو کہ ہنود کے نزدیک یہ چار وید رگھ وید۔ یجر وید۔ شام وید۔ اتھربن وید۔ برہما کے منہ سے نکلے ہیں اور ان کو ست جگ[1] زمانہ کی تصنیف کہتے ہیں اور چھ شاستر (کہ جن میں نیائی شاستر ویدانت شاستر میمانسا شاستر سانکھ شاستر وغیرہ داخل ہیں) اور[2] اٹھارہ پران انہی سے نکلے ہیں۔ چونکہ یہ شاستر اور پوران اور دیگر کتب مہا بھارت اور گیتا اور جوگ بسشٹ اور رامائن وغیرہ ہنود کے نزدیک بھی ان کے علماء کی تصانیف ہیں اور کچھ مضامین وید سے لے کر یا تاریخی واقعات کو سن سنا کر پنڈتوں نے تصنیف کی ہیں پس یہ تو کسی طرح کتبِ آسمانی ہو نہیں سکتیں۔ لہٰذا ہم ان کی تحقیق سے دست بردار ہوتے ہیں مگر اس قدر یاد رہے کہ یہ سب کتابیں اہلِ ہند کے نزدیک معتبر اور دینی ہیں اس لیے ہم الزاماً علیہم کچھ مضامین ان سے نقل کریں گے۔

اب وید کی نسبت کلام کرتے ہیں کہ جو ان کے نزدیک برہما کے منہ سے نکلا ہے سب سے قدیم ان کے نزدیک رگھ وید ہے اس میں قدیم لوگوں کے چھند یعنی اشعار (دیوتاؤں کی مدح میں جب کہ ان کے گھر پر جاتے تھے) مجمع الاشعار کے طور پر جمع ہیں مگر ہر جگہ ان اشعار کے مؤلفین کا نام نہیں ہے تاہم بہت جگہ سے یہ ثابت ہے کہ یہ اشعار فلاں رشی یعنی عابد کے

---

1. ہنود کے نزدیک زمانہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ اول ست جگ۔ دوم ترتیا۔ سوم داد پر۔ چہارم کل جگ کہ جس کو برا زمانہ کہتے ہیں اور ہر زمانہ کی کئی لاکھ اٹھاسی ہزار یا کچھ کم مدت قرار دیتے ہیں۔ ۱۲ منہ
2. تفصیل ان کی یہ ہے (۱) بشن پوران (۲) بھاگوت پوران (۳) میتسہ پوران (۴) سکند پوران (۵) مارکنڈی پوران (۶) بھوست پوران (۷) برہم پتی ورنگ پوران (۸) گوڑم پوران (۹) پدم پوران (۱۰) برہم پوران (۱۱) بالو پوران (۱۲) باون پوران (۱۳) گڑر پوران (۱۴) ارگن پوران (۱۵) بارہ پوران (۱۶) لنگ پوران یعنی شیو پوران (۱۷) نارد پوران (۱۸) برہمانڈ پوران۔ ۱۲ منہ

ہیں اور یہ فلاں کے۔ چنانچہ اب تک ان کے نام لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں سو اس وید میں شاعرانہ (بالخصوص ایشیا کے قدیم شاعروں کے حد سے زیادہ) مبالغہ مذکور ہیں۔ ان میں کہیں کچھ فائدہ مند باتیں بھی ہیں اور کہیں محض بیہودہ گپ ہے۔

اس کے بعد یجروید ہے۔ یہ اس سے بہت عرصہ کے بعد تصنیف ہوا ہے' اس میں اربعہ عناصر اور آفتاب و ماہتاب کی پرستش کے طریقے اور جگ کرنے کی ترکیب و منتر کسی نے جمع کر دیے ہیں اور جابجا مدح کے موقع میں رگ وید کے اشعار کو حسبِ موقع لکھ دیا ہے گویا یہ ہنود کے رواج اور دھرم کا دفتر ہے۔ بعد مدت کے پنڈتوں نے یجروید کو نئے طور پر مرتب کیا اور اس کی شرح کر کے ایک اور گرنتھ بنایا اور اس کا نام شام وید رکھا۔ اب رہا اتھربن وید سو اس کا قدما میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ چنانچہ منوسنگتا میں دوسری ادھیائی کے دوسوتیں اور چھہترا شلوک سے ظاہر ہے۔ منوجی وغیرہ اس کو وید نہیں مانتے ہیں بلکہ کسی نے بعد مدت مدید کے تینوں ویدوں سے کچھ مضامین جمع کر دیے ہیں اور اس کا نام اتھربن وید رکھا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اور بیان کریں محققینِ مذہبِ ہنود کے اس قول کو نقل کرتے ہیں کہ جو تت بودھنی سبھا[1] بریلی کے نام سے مشہور ہے۔

قولہم پُران کی مت میں یہ چاروں وید برہما کی زبان سے یعنی چار منہ سے نکلنا لکھا ہے۔ الخ۔

یہ بات قابل اعتماد کے نہیں اس بات کو پنڈت لوگ جاننے والے وید کے خوب جانتے ہیں کہ کوئی وید ایک وقت میں ایک آدمی کی زبان سے نہیں بنا ہے' سب ویدوں کے جدے جدے بھاگ جدے جدے رشیوں نے بنائے ہیں اور بلکہ وید بنانے والے رشیوں کے نام بھی جگہ جگہ پائے جاتے ہیں'' الخ۔

جب اس قوم کے پنڈتوں ہی نے اس بات کو رد کر دیا کہ یہ برہما کے منہ سے نکلے ہیں اور یہ اقرار کر لیا کہ ان کے مصنف ایک دو شخص نہیں ہیں بلکہ متعدد لوگ مجہول الحال ہیں تب ان کو کس طرح سے الہامی اور کلامِ الٰہی مانا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ اہلِ ہند اس پر نہایت اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کو پیار کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اب ہم عام ہنود کے پرانے خیال کو تسلیم کر کے یعنی یہ بات مان لیں کہ یہ سری برہما کے منہ سے نکلے ہیں کلام کرتے اور ان میں الہامی کتاب کی شرط کو تلاش کرتے ہیں۔

اول ہم کو یہ بات دریافت کرنا چاہیے کہ برہما جی کون شخص ھیں آیا خدا ہیں یا اس کا کوئی پیغمبر ہے یا کوئی فرشتہ ہے یا کوئی عام آدمی جو کسی خاص وجہ سے مشہور ہو گیا ہے؟ پھر یہ دریافت کرنا چاہیے کہ اس کتاب کے کیسے مضامین ہیں؟ اور پھر یہ مجموعہ اس کے مصنف سے بسندِ متصل بلا تفاوت اب تک پایا جاتا ہے یا نہیں؟ بیدانت شاستر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برہما ایشر یعنی خدا تعالیٰ کی ایک صفت (یا جز) ہے کیونکہ اس میں خدا کی تین صفت قرار دی ہیں ایک رج گن یعنی قوتِ ایجاد یا بہمیہ کو جس کو برہما کہتے ہیں۔ اس صفت سے اس نے تمام عالم کو پیدا کیا۔ دوسری تربیت یعنی عالم کو پرورش کرنا جس کا نام ست گن ہے اس کو بشن (وشنو) کہتے ہیں۔ تیسری صفت تُم گن یعنی فنا کرنا اور غضب وغصہ کو کہ جس کو مہادیب (مہادیو) کہتے ہیں۔ پس اس قول کے موافق برہما' بشن' مہادیو اس کی تین صفات یا جز ہیں نہ خدا ہیں نہ کوئی پیغمبر نہ فرشتہ (یہ بیہودہ خیال

پادریوں کی تثلیث کا نمونہ ہے۔

اس کے برخلاف شیو پران سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سری برہما ایک شخص نہایت بے عقل اور مشرک تھا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ بشن کی ناف سے کنول کا پھول نکلا اس میں سے برہما پیدا ہوا دونوں جھگڑنے لگے برہما کہنے لگا میں نے تجھ کو پیدا کیا ہے اتنے میں آسمان سے دھواں پیدا ہو کر اس نے فیصلہ کیا کہ تو برہما اور یہ بشن ہے اے برہما! تو اس سے پیدا ہوا ہے اب تو خلقت کو پیدا کر' جب اس دھوئیں کو غور سے دیکھا تو اس میں لنگ یعنی آلۂ تناسل کی صورت دکھائی دی۔ اس کی تحقیق کے لیے بشن سؤر بن کر زمین میں گھسا اور برہما ہنس بن کر اوپر کو اڑا لیکن جب دس ہزار برس تک دونوں کو اس کی انتہا نہ پائی تو برہما نے یہ جانا کہ میرا یہی خدا ہے تب سے لنگ پوجا شروع ہوئی۔ انتٰہی۔

یہاں سے چند باتیں معلوم ہوئی: (۱) یہ کہ برہما اور بشن دونوں جاہل تھے کہ لنگ کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور انجام اس کو خدا سمجھ لیا۔ (۲) برہما اور بھی زیادہ جاہل تھا کہ جس نے اپنے خالق بشن سے مقابلہ کیا۔ (۳) یہ کہ برہما اور بشن نہ خدا ہیں نہ خدا کی کوئی صفت نہ پیغمبر نہ فرشتہ بلکہ لنگ پرست۔ پدم پوران میں ہے کہ برہما اہنکاری یعنی شہوت پرست ہے اس نے اپنی بیٹی سرستی کی طرف بری نگاہ کی تب اس کی بددعا سے اس کے منہ سے فحش جاری ہوا۔ انتٰہی۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ برہما کوئی نیک آدمی بھی نہ تھا بلکہ نہایت شہوت پرست اور یہ اس کا کلامِ الہامی ہونا تو درکنار بلکہ فحش کا مخزن ہے پھر اس کی تصنیف کے کیا کہنے ہیں؟ مضامین بھی اس کتاب کے اس قابل نہیں کہ ان کو الہامی کہا جائے کیونکہ بت پرستی اور عناصر پرستی اور ستاروں کی پرستش وغیرہ وہ لغو تعلیم اس میں اور اس کے ملخص پرانوں میں ہے کہ جن کو کوئی اہلِ عقل تسلیم نہیں کر سکتا اور اس کے سوائے بے حیائی اور فحش کے قصہ اور خدائے قادر کی ذات و صفات میں جہالت اور عجز اور حدوث اور شہوت پرستی اور خواب و غفلت کے نہایت ناپاک مضامین مندرج ہیں۔ علاوہ اس کے انہیں پرانوں اور ویدوں سے بھی ثابت ہے کہ ایشر یعنی خدا تعالیٰ پر چوبیس بار وہ سخت مصیبت پڑی کہ اس کو بغیر سور اور شیر وغیرہ جانوروں کے قالب میں آنے کے چارہ نہ ہوا چنانچہ تمام ہنود کے نزدیک یہ مسئلہ متفق علیہا ہے اور ان چیزوں کو ہنود اوتار کہتے ہیں ان چوبیس میں سے یہ اوتار نہایت بزرگ ہیں۔ (۲) مچھ اوتار کہ خدا مچھلی کی صورت میں آیا (۲) کچھ اوتار کے کچھوے کی صورت میں آیا (۳) بارہ اوتار کہ سور کی صورت میں آیا (۴) نرسنگ اوتار یعنی شیر کی صورت میں دشمن کے ہلاک کرنے کو آیا (یہ ست جگ میں ہوئے ہیں)۔ (۵) باون اوتار (۶) پرس رام اوتار (۷) رام چندر اوتار کہ جو راون سے ہنومان کی مدد سے لڑا اور سالہا جنگلوں میں سیتا کے فراق میں حیران و سرگرداں رہا (یہ ترتیا جگ میں ہوئے ہیں)۔ (۸) کرشن اوتار (۹) بودھا اوتار (یہ دواپر جگ میں گزرے ہیں) معاذ اللہ اس لغو اعتقاد سے زیادہ اور کیا لغو اعتقاد ہو گا۔ عیسائیوں نے بھی خدا تعالیٰ پر گناہ معاف کرنے کی مشقت ڈال کر اس کو گناہ اٹھانے اور پھانسی پانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ظاہر ہونے پر مجبور مانا ہے۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیراً۔ اِس مجموعہ کی سند متصل بھی کسی ہندو کے پاس نہیں کہ سلسلہ وار اس کے مصنف تک پہنچا دے۔ ایک اور وجہ بھی ہے کہ جس سے وید کا الہامی ہونا رد ہوتا ہے وہ یہ کہ ان ہنود کے نزدیک برہما نہ اوتار ہیں نہ خدا اور نبوت کے یہ لوگ سرے سے قائل ہی نہیں' پس جب برہما ان کے نزدیک بھی نبی نہیں ہیں تو اس کی کتاب کس طرح الہامی ہو

سکتی ہے۔ بعض ہنود جیسا کہ منشی الکھ دھاری مترجم اپنکھدھا یہ کہتے ہیں کہ چاروں وید برہما کے قول کی شرح ہیں بیاس نے ان کو جمع کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ رگھ وید برہما کے اس قول کی شرح ہے (پرگیا نند برہم) اور یجر وید کو برہما کے اس قول کی شرح میں تصنیف کیا (اہنگ برہما اسمی) کہ میں پرمشیر ہوں اور شام وید کو سری پیاس جی نے برہما کے اس قول سے ملا (تتوسسی) یعنی ایشر ہوں اور اتھربن وید کہ جو تینوں کا خلاصہ ہے۔ اس قول کی شرح میں بیاس جی نے ترتیب دیا ہے۔ (آہنگ آتما برہم) یعنی آیا پرمشیر انتہٰی ملخصًا یہ قول اگرچہ پنڈتان سبھا بریلی کے نزدیک غلط ہے مگر کسی قدر اس کی اصل ہو تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ یہ بیاس جی چند روز زرتشت کے پاس[1]شہر بلخ میں تعلیم پانے گئے تھے اور ہنود میں مشہور ہے کہ سری بیاس

[1] فرقہ آریہ کا موجد دیانند کاٹھیاواڑی ہے جو چند برس ہوئے اجمیر میں انتقال کر گیا جونئی روشنی کے سبب بہت ہندو اپنی خرافات سے نادم ہو کر اپنے قدیم مذہب کی ترمیم کرنا چاہتے ہیں وہ اس گروہ میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ فرقہ ہنود کے اٹھارہ پرانوں اور بہت سے کتابوں کو غیر معتبر بتاتا ہے ان کے نزدیک یہ چار وید ان چار شخصوں سے بذریعہ الہام ظاہر ہوئے ہیں۔ (۱) اگن سے رگوید (۲) وایو سے یجر وید (۳) آدت سے شام وید (۴) آنگرہ سے اتھرون وید۔ ان چاروں ویدوں کو قدیم بھی کہتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ ان چاروں مصنفوں کو قدیم نہیں کہتے اور مہا بھاش میں ہے کہ اندر نے برہسپتی سے ست دویا پڑھی اور اس نے انگرہ سے اور اس نے منو سے اور منو نے وراٹ سے اور اس نے برہما سے اور برہما نے اگنی اور اوک سے اور انہوں نے بذریعہ الہام پرماتما سے حاصل کی' الخ۔

اس تقریر سے کہ جس کو آریہ پسند کرتے ہیں کئی باتیں معلوم ہوئیں (۱) یہ کہ انگرہ کا استاد منو ہے جو وارٹ کا شاگرد اور برہما کا شاگردان شاگرد ہے اور برہما اگنی کا شاگرد ہے جو رگ وید کا مصنف ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ انگرہ اور اگنی کا ایک زمانہ نہیں پھر اس کی تصنیف بھی رگوید کے بعد کی ہے پھر وہ قدیم اور اناد کیونکر ہو سکتی ہے؟

اسی طرح اب ان چاروں شخصوں کی تاریخ میں غور کرنے سے عجب الٹ پھیر معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ یہ شخص ہنود میں معمولی مرتبے کے شخص تھے کوئی خصوصیت الہام اور کرامات کی نہ تھی۔ آریہ کو لازم ہے کہ ان کے تاریخی حالات اپنی معتبر کتابوں سے بیان کریں تب کچھ دعویٰ کریں۔

(۲) رگوید کے منڈل ۱۰' انوواک ۷' سکت ۹' منتر ۹ میں چاروں ویدوں کا بیان ہے (تکذیب براہین صفحہ ۱۱۸ مصنف پنڈت لیکھرام آریہ) اب بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ رگوید تو اگنی کا تصنیف ہے جو انگرہ کا کئی سلسلہ سے استاد الاستاد ہے جیسا کہ اوپر گزرا جس کا زمانہ ہنود کے زمانہ عمرہائے گزشتگان ہزاروں برس سے کیا کم ہوگا پھر اس کی کتاب میں اس شخص کی کتاب کا جو اس کے صدہا ہزار ہا برس بعد پیدا ہوا کیونکر ذکر آ گیا؟ غالباً یہ رگوید کا فقرہ الحاقی ہوگا اگر یہ ہے اور غالبًا یہی ہے تو ویدوں میں الحاق بخوبی ثابت ہے

(۳) ان کے بیان کے بموجب بیاس اور بشسٹ وغیرہ لوگ وید کے شارح ہیں نہ کہ مصنف۔ اب چاروں مصنفوں سے پہلے اہل ہند میں کوئی کتاب الہامی تھی۔ اس کا بھی پتا نہیں ملتا؟ اور ان چاروں سے پہلے ہنود کے اکابر کا ایمان اور شریعت اور دستور العمل کیا تھا اس کا بھی پتا نہیں ملتا۔

(۴) اگر ان چاروں ویدوں کے مضامین کو دیکھا جائے اور ان نئے معانی سے قطع نظر کی جائے جو ہزاروں برسوں کے بعد تمام پنڈتوں کے برخلاف دیانند نے پیدا کیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان ویدوں کے مضامین الہامی نہیں' کس لیے کہ عناصر کی پرستش اور غیر مرئی چیزوں سے استمداد اور مہاراجوں کے قصے اور مذہبی دستورات مذکور ہیں۔

(۵) اور لطف یہ ہے کہ یہی اندر اور برہسپتی اور برہما جو اگنی کے شاگردان شاگرد بتلائے گئے ہیں انہیں کے محامد رگوید میں مذکور ہیں الغرض کوئی بات نہیں بنتی۔ ۱۲ منہ

فائدہ: ملل والنحل میں لکھا ہے کہ حکیم فیساغورث کا ایک شاگرد قلانوس نامی علوم علویہ اور فنِ الٰہیات کا نہایت ماہر تھا اس نے ہندوستان میں جا کر اقامت اختیار کی اور مذہب فیساغورث کو عمدہ دلائل اور ریاضات سے ثابت کیا اور ایک شخص برہمن کو اپنا شاگرد بنایا چونکہ یہ برہمن بھی ان علوم میں ←

ایک مدت تک غائب ہو کر نارائن جی کے پاس گئے تھے۔ چنانچہ یہ بات دساتیر نامہ زرتشت میں اب تک موجود ہے جو چاہے دیکھ فرما لے۔ پس کچھ تعجب نہیں کہ یہ عناصر اور کوکب پرستی کے مضامین بیاس جی نے تعلیمِ زرتشتی کے موافق لکھے ہوں اور پھر کچھ اور پنڈتوں نے بھی اس میں ملایا ہو اور ہر کسی نے اپنے خیالات کو دخل دیا ہو بلکہ یہی یقینی بات ہے کیونکہ وید میں مختلف مضامین پائے جاتے ہیں کہیں کہیں ذاتِ باری کی تقدیس اور توحید بھی موجود ہے۔ اگر بیاس جی بھی اس کے مصنف ہوں تو وہ بھی باقرار ہنود کوئی الہامی نہیں بلکہ افعال و اقوال میں برہما جیو کے لگ بھگ ہیں۔ ستونتی سے جس طرح ان کا پیدا ہونا لکھا ہے پھر بھائیوں کی بیبیوں پر دستِ شفقت پھیرنا جو مہا بھارت میں مذکور ہے اس کے ذکر کرنے سے تو شرم ہی آتی ہے۔ واللہ الہادی

فصل پنجم

پارسی بھی (یعنی آتش پرست کہ جن کو مجوس کہتے ہیں) اس امر کے مدعی ہیں کہ ہمارے دخشوروں یعنی پیغمبروں پر آسمان سے خدا کا کلام نازل ہوا ہے کہ جس کو وہ الہامی اور کلامِ خدا سمجھتے ہیں ژند و وستا[1] وغیرہ گو ان کے پاس اور کتابیں بھی ہیں مگر زیادہ مشہور اور معتبر دساتیر ہے۔ اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے (پندرہ شخصوں کے) پندرہ نامے ہیں (اول) نامہ[2] آباد دخشور کا اس کو ایرانی اول پیغمبر کہتے ہیں۔ (۲) نامہ جی افرام کا (۳) نامہ شائی کلیو کا (۴) نامہ یاسبان کا (۵) نامہ گلشاہ کا کہ جس کو کیومرث بھی کہتے ہیں (۶) نامہ سیامک دخشور کا (۷) نامہ ہوشنگ کا (۸) نامہ تہمورس دخشور کا (۹) جمشید دخشور کا (۱۰) نامہ فریدوں کا (۱۱) نامہ منوچہر کا (۱۲) نامہ کیخسرو کا (۱۳) نامہ زرتشت کا (۱۴) پند نامہ سکندر کا (۱۵) نامہ ساسان اول کا (۱۶) نامہ ساسان پنجم کا۔ ان میں سے اگر پند نامہ سکندر کو جدا نہ شمار کیا جائے تو یہ پندرہ نامے ہیں ورنہ سولہ ہیں۔ ان میں سے نامہ اول اور نامہ زرتشت اور نامہ ساسان اول تو تخمینًا ایک ایک جز کے ہوں گے ورنہ اور تو ایک صفحہ یا دو صفحہ کے نامہ ہیں۔ ان ناموں کو ساسان پنجم نے خسرو پرویز بن ہرمز بن نوشیروان کے عہد میں پاژندی[3] زبان سے دری زبان میں ترجمہ

← نہایت لائق اور فائق ہوا' اس نے تمام ہند کو مجاہدات و ریاضات کی طرف رغبت دلا کر اپنا مرید بنایا اور اس کے بعد پھر یہ مذہب فلاسفی اہلِ ہند کے دل پر نقش کالحجر ہو گیا انتہٰی۔ یہ بات نہایت قرینِ قیاس ہے کیونکہ ہند میں صدہا فرقے ہیں اور ان کی عبادت اور ریاضت کے طریقے بھی الگ ہیں بلکہ معبود بھی الگ الگ ہیں مگر ان کے بعض فرقوں میں فلسفی خیالات بھی پائے جاتے ہیں کہ جن پر ہنود کو بڑا ناز ہے جیسا کہ فرقہ بیدانتی اور کچھ عجب نہیں کہ ان فلسفیوں کے اقوال بھی اس کشکولِ قدیم یعنی وید میں جمع ہوں جیسا کہ بعض شاستر اور پورانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

[1] یہ کتاب زرتشت کی تصنیف ہے کہ جو ایران میں گشتاسپ بن لہراسپ شاہِ ایران کے عہد میں ظاہر ہوا تھا اور اس کو اپنے مذہب کی طرف بلایا اور خوارق دکھائے تھے اور اسفندیار نے اس کے مذہب کی ترویج میں بڑی کوشش کی تھی اور ہندوستان سے بیاس جا کر اس کا مرید ہوا تھا۔ ۱۲ منہ

[2] نامہ ساسان پنجم کے ۵۷ جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہ آباد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں ہے کہ خانہ کعبہ کو مہ آباد نے بنایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا ہے۔

[3] پاژندی ایران کی قدیم زبان ہے سنسکرت سے بہت مشابہ ہے اگر لب و لہجہ اور دیگر تفاوتِ قلیلہ کو دور کر دیا جائے تو دونوں ایک ہی زبان ہیں۔ ایران کے قدماء کے رسوم اور اہلِ ہند کے رسوم و عادات و عبادات بہت قریب ہیں وہاں کے لوگ ہند میں آ کر بادشاہ بن بیٹھتے ہوں تو کچھ تعجب نہیں جانیں۔

کیا اور اصل کے فقروں پر ہندسوں کے نشان لگائے گئے ہیں اور ہر نامہ کے اول بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اعوذ کا ترجمہ کو کہ ہے اس طرح سے (پناہیم بہ یزدان از منش وخوئے بدوزشت گمراہ کنندہ و براہِ ناخوب برندہ رنج دہندہ آزار رسانندہ

(۲) بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان دادگر۔ ان نامجات میں کچھ صفاتِ باری تعالیٰ اور یہ بات کہ عقلِ اول کے ذریعہ سے خدا نے تمام عالم پیدا کیا جس طرح کہ حکمائے یونان کا مذہب ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے یونان کے فلسفۂ الٰہیات اور فلکیات اور عنصریات کو کسی نے نقل کر دیا ہے اور کواکب پرستی و آتش پرستی کے طریقے بھی مذکور ہیں اور کسی قدر پیشین گوئیاں ہیں۔ اب یہاں چند امور قابلِ بحث ہیں:

(۱) یہ کہ ان کے مؤلفین نے ان کو الہام سے لکھا ہے یا نہیں؟ (۲) ان کے مؤلفین کون لوگ ہیں؟ (۳) ان کے مضامین کیسے ہیں؟

اول امر کی نسبت یہ تحقیق ہے کہ یہ تمام نامے ایک شخص اعنی ساسان پنجم کے جمع کیے ہوئے ہیں کہ جو خسرو پرویز کے عہد میں تھا اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو کیا بلکہ اپنی اولاد میں ہمیشہ پیغمبری کا مدعی ہے۔ چنانچہ اس کے نامہ کا ۳۹ فقرہ یہ ہے ''درتخمۂ تو پیغمبری ہمیشہ ماند'' اگرچہ اس کے حالات مفصلاً ہم کو معلوم نہیں مگر اس کے نامہ میں دو چار پیشین گوئیاں ایسی ہیں کہ جن کے جھوٹ ہونے میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ ۳۵ اور ۳۶ جملہ میں کہتا ہے ''و پاداش گران گروہے باشند آرے ۲۶۰ درہم افتادہ و بدکار وانچہ بزرگ ایشان گفتہ ہم نکند''۔ انتہٰی یعنی جو گروہ عرب نبی عربی کا پابند کہ ایرانیوں کو ان کے گناہوں کی سزا دے گا' بدکار اور اپنے پیغمبر کا نافرمان ہوگا۔ سو یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ایران کو فتح کیا ہے اور اس میں سب صحابہ شریک تھے اور انہیں کے ہاتھ سے ایرانیوں کی سلطنت برباد ہوئی۔ سو وہ پیغمبر علیہ السلام کے ایسے فرمانبردار تھے کہ آج تک ایسی کوئی قوم اپنے نبی یا بزرگ کی فرمانبردار نہیں ہوئی۔ جناب رسولِ خدا اس گروہِ پاکباز کی جان و مال کے مالک تھے اور ان کے نیک ہونے میں بھی کسی اہلِ تاریخ کو مجالِ گفتگو نہیں۔ مؤرخین یورپ کے اقوال آپ پہلے سن چکے ہیں۔

(۲) اس نے کہا کہ میری اولاد میں ہمیشہ پیغمبری رہے گی سو یہ بھی بالکل جھوٹ۔ آج تک اس کی اولاد میں سے کسی نے کوئی پیغمبر دیکھا تو کیا سنا بھی نہیں' ہاں یہ بات اور ہے کہ کوئی پارسی بمبئی میں بیٹھ کر پیغمبری کا دعویٰ کیا کرے۔

(۳) وہ کہتے ہیں کہ دینِ محمدی ہزار برس کے بعد ایسا خراب ہوگا کہ اختلافِ باہمی کی وجہ سے پہچانا نہ جائے گا چنانچہ ۳۰ جملہ میں اس کی تصریح ہے لیکن یہ بھی صاف جھوٹ کیونکہ گو امورِ جزئیہ میں باہم اہلِ اسلام میں اختلاف ہوا اس وقت دہ ہزار برس سے کہیں پیشتر بلکہ دوسری تیسری صدی میں شروع ہوا مگر بحمد اللہ اب تک قرآن اور احکامِ منصوصہ اسلام و دیگر فرائض وغیرہ امورِ ضروریہ میں ایک بال کے برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ان امور میں آج تک تمام اہلِ اسلام یک زبان ہیں اور یہ امور ہو بہو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔

بلکہ ان کے بزرگ ساسان اول کی پیشین گوئی بھی صریح غلط نکلی کیونکہ وہ اپنے نامہ کے ۳۷ جملہ سے ۸۰ جملہ تک یہ

خبر دیتے ہیں کہ عرب کے غلبہ ہونے کے بعد پھر ساسان اول کی اولاد میں ایک پیدا ہوگا اور ایرانیوں کی وہ حکومت وشوکت برباد شدہ پھر عود کر آئے گی اور اہلِ اسلام ایرانیوں سے ایسے بھاگیں گے جیسے بلی سے چوہے بھاگتے ہیں۔ انتہٰی۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے کیونکہ جب سے اسلام کا پھریرا ایران میں اڑا اس وقت سے لے کر اب تک اہلِ اسلام ہی غالب رہے ہیں۔ مجوسیوں کی عزت اور سلطنت نے عود نہیں کیا۔ علاوہ اس کے یہ ساسان خسرو پرویز کی بڑی مدح کرتا ہے اور اس کو فرشتہ منش کہتا ہے حالانکہ یہ خسرو وہ بدنصیب ہے کہ جس نے پیغمبرِ آخر الزمان کا نامہ مبارک پھاڑا تھا اور آتش پرستی اور بدمستی اس کا شیوہ تھا۔ پس ان دلائل سے معلوم ہوا کہ ساسان پنجم نے الہام سے نہیں لکھا بلکہ دوسری بات بھی معلوم ہوگئی کہ مجوس کے اکابر کہ جن کی طرف یہ نامجات منسوب ہیں (بلکہ ہنود کے اکابر سری رام چندر و سر کرشن وغیرہ بھی) اگر یہ کتابیں ٹھیک ٹھیک ان ہی کی تصنیف اور ان میں بلاکم وکاست انہیں کے عقائد مذکور ہیں تو وہ ہرگز پیغمبر نہ تھے۔ غایۃ مافی الباب بادشاہ تھے اور حکمت وفلسفہ میں خوب دخل رکھتے تھے جس کی وجہ سے مشہور ہوگئے اور پیشوا مانے گئے۔ ان کتابوں کے تمام مضامین بھی ایسے نہیں کہ ان کو الہام کی طرف منسوب کیا جائے بلکہ بعض جھوٹے مضامین اور بعض میں شرک اور نازیبا باتوں کی تعلیم ہے۔

شاہدِ اول: ساسان اول کے نامہ میں ۱۹ جملہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ مر کر انسان کی روح دوسرے جسم میں تناسخ[1] کے طور پر جاتی ہے (قولہ) ''رواں از تنے بہ تنے روندہ است''۔ پھر اس کی شرح میں ساسان پنجم بڑے دلائل قائم کرتے ہیں حالانکہ یہ عقیدہ بالکل لغو اور باطل ہے نہ عقل اس کے مقتضی ہے نہ نقل۔

شاہدِ دوم: نامہ شت[2] جی افرام کے ۲۰ جملہ میں کہتا ہے کہ مہ آباد کی اولاد میں چودہ وخشور ہوئے ہیں کہ ان کو آباد کہتے ہیں ان آبادوں کی اولاد میں سوزاد تک سلطنت قائم رہی اور زاد حسبِ تفسیر ساسان پنجم کروڑ تو کیا بلکہ ارب بلکہ کھرب بلکہ نیل سے بھی زیادہ ہے۔ پس جب اس کو سوبار لیا جائے تو کہاں تک پہنچتا ہے؟ حالانکہ اس کے جھوٹ ہونے میں کسی عقلمند کو بھی شک نہیں کیونکہ مہ آباد ابراہیم علیہ السلام ہیں اور بالفرض آدم بھی مراد لیے جائیں تو ان کا زمانہ اب تک سات آٹھ، ہزار برس سے زیادہ نہیں گزرا۔ چہ جائیکہ جی افرام کے عہد تک مہ آباد کی نسل میں صدہا کروڑ برس کا زمانہ گزر جائے ایسی گپیں زمانہ کی بابت ہنود کے ہاں بھی ہیں۔ سری بیاس جی یہیں سے سیکھ کر گئے ہیں۔

شاہدِ سوم: نامہ وخشور یاسان کے ۸۵ جملہ میں تصریح ہے کہ آگ اور ستاروں کے آگے سجدہ کرو اور ان کی تعظیم اور عبادت بجالاؤ پھر نامہ سیامک بن گلشاہ کے ۳ جملہ میں تصریح ہے کہ اے سیامک ہمیشہ تو مشتری کی اس طرح ستائش کر آگے پھر اس کی بڑی ثناء وصفت[3] ہے اور اس سے یوں دعا مانگ کہ ''میخواہم از تو نیک بختی ہر دو سرائے'' پھر نامہ تہمورس میں آفتاب پرستی

[1] اسی طرح نامہ اول کے ۷۰، ۷۱ اور ۷۲ جملوں میں اس کی تصریح ہے کہ اس عالم میں انسان اپنے پہلے بدن کے اعمال کا نتیجہ شادی وغمی' رنج وخوشی دیکھتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے کس لیے کہ جب اول جسم میں آ کر رنج وراحت پائی تھی وہ کونسے جسم کے اعمال کا نتیجہ تھا؟ ۱۲ منہ

[2] شت سو بمعنی حضرت۔ ۱۲ منہ

[3] چنانچہ اس کے محامد میں سے یہ بھی ہے۔ بزرگ بخشندہ۔ ۲ فریادرس۔ الخ ۱۲ منہ

کی نہایت تاکید ہے اور اس کی بڑی ثناء وصفت بتلائی ہے کہ وہ عبادت کے وقت پڑھی جائے اور اس سے یوں دعا مانگی جائے اور سجدہ کیا جائے۔ پھر نامۂ جمشید میں ناہید یعنی زہرہ کی بڑی ستائش ہے اور وہ الفاظ دعا میں مذکور ہیں کہ جو خاص اللہ تعالیٰ سے ہونے چاہییں۔

الغرض آگ اور آفتاب اور ماہتاب اور ستاروں کی پرستش کے طریقے دساتیر میں اکثر موجود میں پھر ایسی کتاب معدنِ شرک وفکر کو کیونکر الہامی اور من جانب اللہ تصور کیا جائے اور یہی آتش پرستی اور آفتاب پرستی سری بیاس جی نے ہندوستان میں پھیلائی ہے۔ ان کے وید کو دساتیر سے نہایت مناسبت ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ بیاس جی نے پاژندی زبان سے اپنے استاد زرتشت کی کتاب کو سنسکرت میں ترجمہ کیا ہو اور وید نام رکھا ہو بلکہ یہی صحیح ہے۔ بعض ہنود اور مجوس اس آتش پرستی اور آفتاب پرستی کی یہ توجیہ کیا کرتے ہیں کہ یہ جوہر نورانی ہیں ہم ان کو نہیں پوجتے بلکہ ان کی طرف منہ کر کے ان کا دھیان دھر کر اور ان کو جہتِ قبلہ سمجھ کر خدا کو پوجتے ہیں مگر یہ توجیہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ عبادت یا پرستش یا پوجا جو چاہو سو کہو۔ تذلیل اور عاجزی اور استعانت اور اس کی ثناء وصفت کرنا اور اس کو نافع وضار سمجھنا ہے۔ سو یہ تمام باتیں ان کے ساتھ برتتے ہیں پھر عبادت میں کیا باقی رہ گیا۔ دیکھئے ہم خانہ کعبہ کو جہتِ عبادت سمجھتے ہیں مگر نہ اس سے استعانت کرتے نہ اس کو نافع وضار سمجھتے ہیں' نہ بوقتِ نماز یا طواف کچھ اس کی حمد وثنا کرتے ہیں پھر اس پر قیاس کرنا دور از عقل ہے۔ اس مختصر میں مجوس کے فرقوں کیومرثیہ وثنویہ وزرتشتیہ وغیرہ کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

خاتمہ

واضح ہو کہ توجیہ وتاویل کو بڑی وسعت ہے جس کلام کو چاہو تاویل کے ذریعے سے اس کی اصلی مراد کے برخلاف کر سکتے ہو۔ چونکہ قرآن مجید کی موافقت اور مخالفت کو لوگوں کی دلی خواہشوں کی کامیابی اور ناکامی میں بڑا اثر ہے اس لیے بہت سے اہلِ اسلام میں سے کجرو لوگوں نے اور بہت سے شریر اور بدعتیوں نے اور بہت سے ایسے لوگوں نے کہ جو پہلے وہ اسلام کے مخالف تھے اور پھر وہ اسلام میں بخلوص آئے مگر وہ پچھلا زہر بالکل نہ گیا یا منافقانہ اسلام قبول کر کے اپنے ملحدانہ خیالات کو پھیلانا چاہا اور بہت سے جاہل صوفیوں نے قرآن مجید کو اس کے اس اصلی مرکز سے جو اس کے نازل کرنے والے نے قائم کیا تھا ہٹا کر تاویل کے ذریعے سے اور طرف کر دیا اور کلامِ الٰہی کو بالکل بدل دیا اور اس کا نام تفسیر رکھا چونکہ تفسیر سمجھ کر بہت سے سیدھے سادھے مسلمان ان کے اس زہر کو جو انہوں نے اگلا ہے آبِ حیات جان کر پی جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا روحانی مزاج بالکل فاسد ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اسی مرض سے مر جاتے اور حیاتِ ابدی سے محروم اور اس عالم میں ہمیشہ معذوب ومغموم رہتے ہیں۔ ان بے کسوں کی بے کسی پر افسوس صد افسوس يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ اس لیے مجھ کو ضروری ہوا کہ معتبر تفاسیر اجمالاً بیان کردوں اور اعتبار کے لیے کلیہ قاعدہ بتلا دوں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فنِ تفسیر دو جز سے مرکب ہے۔ ایک جز منقولات دوسرا معقولات۔ اب جس کے دونوں جز اچھے ہوں گے وہ تفسیر بھی اچھی ہوگی ورنہ نہیں۔ منقولات شانِ نزول وغیرہ وہ امور جو نقل سے متعلق ہیں اگر وہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام بالخصوص ان دس[1] صحابہ سے کہ جو اس فن میں امام تھے اور پھر تابعین[2] وغیرہ سے کہ جو اس فن کے ماہر تھے

---

[1] خلفاءِ اربعہ وابن مسعود وابن عباس وابی بن کعب وزید بن ثابت وابو موسیٰ الاشعری وعبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔ یہ اول طبقہ ہے۔

[2] تابعین میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد مکہ میں مجاہد وعطا بن ابی رباح وعکرمہ مولی ابن عباس وسعید بن جبیر وطاؤس وغیرھم اور کوفہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد بڑے مفسر تھے۔ اور اسی طبقہ میں ہیں حسن بصری اور عطاء بن ابی سلمہ خراسانی' محمد بن کعب قرظی' ابوالعالیہ' ضحاک بن مزاحم' عطیہ وقتادہ وزید بن اسلم' مرہ ہمدانی وابو مالک وربیع بن انس وغیرہم' یہ لوگ بیشتر صحابہ سے نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے تیس بار ابن عباس رضی اللہ عنہما کو قرآن مجید سنایا ہے یہ دوسرا طبقہ ہے اور تیسرے طبقہ میں تبع تابعین ہیں' ان میں سے سفیان بن عیینہ ووکیع بن الجراح وشعبۃ بن حجاج ویزید بن ہارون وعبدالرزاق وآدم بن ابی ایاس واسحاق بن راہویہ وروح بن عبادہ وعبد بن حمید وابی بکر بن ابی شیبہ وسنید ہیں۔ چوتھے طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو ان سے بعد ہیں ان میں سے ابو جعفر محمد بن جریر طبری ہیں کہ جن کی تفسیر عمدہ اور مشہور ہے۔ ۳۱۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ایک ابن جریر شیعہ اور کرامیہ بھی ہیں۔ اس سے ناواقفوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی طبقہ میں ابن ماجہ' ابن مردویہ وابوالشیخ وابن المنذر ہیں۔ پانچویں طبقہ میں وہ ہیں جو بحذفِ اسناد روایات بیان کرتے ہیں اس طبقہ میں آ کر بہت خلط ملط ہو گیا' اس طبقہ میں ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین نیشا پوری صاحبِ تفسیرِ حقائق ہیں وفات ۴۱۲ھ میں ہوئی ہے اور ابو اسحاق احمد ثعلبی نیشا پوری اس کی تفسیر میں بھی محمد بن حسین نیشا پوری کی طرح رطب ویابس ہے۔ ابو محمد عبداللہ جوینی والد امام الحرمین ان کی تفسیر کا نام بھی کبیر ہے اور ابو القاسم عبدالکریم قشیری متوفی ۴۶۵ھ اور ابو الحسن بن احمد نیشا پوری بھی ہیں۔ چھٹے طبقہ میں وہ لوگ ہیں کہ جن کا روایت میں کم اعتبار ہے جیسا کہ قرطبی اور ثعلبی اور امام فخر الدین رازی۔ ساتویں طبقہ میں ابو القاسم حسین راغب اصفہانی مصنف احتجاج القرآن فی قراۃ مفردات القرآن ان کی وفات ۵۰۳ ہجری میں ہوئی ہے اور ابو حامد محمد بن محمد غزالی ملقب بزین ←

منقول ہے تو قابل اعتبار ہے۔ بشرطیکہ نقل بھی بقاعدہ اہلِ حدیث معتبر ہو ورنہ رطب و یابس منقولات جو بعض تفاسیر میں علماء اہلِ کتاب وغیرہم سے منقول ہیں اعتماد کے قابل نہیں اور معقولات یعنی نکاتِ قرآنیہ اور فصاحت و بلاغت و زباندانی کے متعلق باتیں وغیرہ ذلک اس فن کے علماء اور کملاء مدققین کی طرف مستند اور ان کے منظورِ نظر ہوں تو خیر ورنہ بے تک باتیں قابلِ التفات نہیں۔ متقدمین منقولات کو بسلسلۂ روایات صحیح لکھا کرتے تھے مگر متاخرین نے یا صرف حوالہ ہی پر اعتماد کیا یا بغیر حوالہ اپنی خوش اعتقادی سے جو کچھ پایا لکھ دیا اور کتاب کو بے اعتبار بنایا۔ اور بعض نے متاخرین محدثین کی یہاں تک تقلید کی کہ جو کچھ ان لوگوں نے آنحضرت علیہ السلام یا صحابہ و تابعین کی طرف منسوب کر دیا اس کو ایسا یقینی سمجھا کہ پھر اس میں تحقیقات کرنے کو برا جاننا خواہ وہ کیسی ہی روایت کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے اسلام اور قرآن کے نورانی چہرہ پر دھبہ ہی کیوں نہ لگے اور مخالفین اسلام اس کو تمسک بنا کر اسلام کی کیسی ہی بیخ کنی کیوں نہ کریں مگر یہ سادہ لوح جو بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہیں اور باہر کا کچھ حال معلوم نہیں ان پر ایسا اڑتے ہیں کہ ٹلتے ہی نہیں بلکہ اس کھوٹی پونجی کو ہی تفسیر سمجھتے ہیں اور جن محققین نے ایسے امور میں چھان بین کی ہے ان کی تفاسیر پر نام دھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ فنِ تفسیر سے مس نہیں رکھتے اور ان کے برخلاف ایک اور گروہ ہے جو روایت کو چھوڑ کر درایت کا پابند ہے۔ انہوں نے یہ غضب کیا ہے کہ اوہام و شکوکِ فلاسفۂ بے دین اور بیہودہ گوئی ملحدین کی وجہ سے روایت کو معتد بہ نہ سمجھا نہ صحیح احادیث و اجماعِ سلف صحابہ و تابعین سے روگردانی کی حالانکہ قرآن انہیں کی زبان میں اور انہی کے زمانہ میں نازل ہوا ہے اس کے مطالب کی شرح میں انہی کا قول زیادہ معتبر ہے اور بس الغرض افراط و تفریط دونوں بری ہیں۔ پس جس تفسیر میں روایت اور درایت دونوں عمدہ اور صحیح ہیں وہ تفسیر بھی عمدہ اور صحیح ہے اور جس میں ان دونوں میں قصور ہے اسی قدر اس کی کتاب میں فتور ہے۔ تفاسیر صدہا ہیں۔ اگر ان کے نام لکھوں تو ایک دفتر بھی بس نہ کرے چنانچہ کتاب کشف الظنون میں بیشمار نام مندرجہ ہیں مگر میں یہاں چند تفاسیر کو بیان کرتا ہوں۔

تفسیر ابن جریر طبری: یہ تفسیر منقولات میں بہت عمدہ ہے پیشتر اس کی روایاتِ صحیحہ میں راقم الحروف نے اس کو مدینہ منورہ میں دیکھا ہے۔ امام نووی تہذیب میں اس کی بڑی مدح کرتے ہیں۔

مجمع البحرین و مطلع البدرین: جلال الدین سیوطی کی تصنیف اس میں اقوالِ منقولہ و دیگر فوائد کو نہایت احتیاط سے جمع کیا ہے اور اتقان کو اس کا مقدمہ بنایا ہے۔

تفسیر ابی اللیث: نصر بن محمد فقیہ سمرقندی حنفی متوفی ۳۸۳ ہجری کی تصنیف نہایت عمدہ کتاب ہے روایت اور درایت میں خوب اہتمام کیا ہے شیخ زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی نے اس کی احادیث کی تخریج کی ہے۔

تفسیر ابن کثیر: امام ابو الفداء اسماعیل ابن عمر قرشی دمشقی متوفی ۴۷۷ ہجری کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دس جلد میں ہے احادیث و آثار کو نقل کر کے جرح و تعدیل بھی کرتا ہے اچھی کتاب ہے۔

← الدین مصنف جواہر القرآن و یاقوت التاویل ان کی وفات ۵۰۵ ہجری میں ہوئی۔ غزالہ طوس کے قریب ایک گاؤں ہے ایک شخص محمود غزالی بھی ہیں وہ معتزلی ہیں بلکہ شیعہ اکثر لوگ لفظ غزالی سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسی طبقہ میں ہیں ابو محمد حسین بن محمود بغوی مصنف معالم التنزیل' ان کی وفات ۵۱۶ ہجری میں ہوئی ہے یہ بغشور کے رہنے والے ہیں جو توابع خراسان سے ہے اس کے علاوہ اور بہت مفسرین اس طبقہ میں ہیں۔ ۱۲ منہ

تفسیر اسحاق بن راہویہ: امام ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن مخلد حنظلی مروزی نخعی نیشا پوری متوفی ۲۳۸ ہجری کی عمدہ تفسیر ہے منقولات کو احتیاط سے ذکر کیا ہے۔

تفسیر الخوارزمی: ابو الحسن علی بن عراق بن محمد بن علی عمرانی حنفی متوفی ۵۳۹ ہجری کی تصنیف بطرز اہلِ حدیث۔

تفسیر الجوینی: امام ابو عبد اللہ یوسف نیسا پوری متوفی ۲۳۸ ہجری کی تصنیف مشہور تفسیر ہے ہر آیت کی دس وجہ پر تفسیر کی ہے۔

تفسیر کواشی: موفق الدین احمد یوسف موصلی شیبانی شافعی متوفی ۲۸۰ ہجری کی تصنیف اس کی دو کتاب ہیں بڑی کا نام تبصرہ اور چھوٹی کا نام تلخیص ہے۔

تفسیر قشیری: امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن شافعی کی تصنیف ان کے علاوہ اور بھی قدماء کی بہت سی تفاسیر ہیں کہ جن میں مسلسل روایات کو بیان کیا ہے اب میں چند وہ تفاسیر بیان کرتا ہوں کہ جو ہمارے ملک میں مشہور ہیں۔

تفسیر کشاف: امام علامہ ابو القاسم جار اللہ محمود بن محمد عمر زمخشری خوارزمی متوفی ۵۲۸ ہجری کی تصنیف اس کتاب میں علومِ عربیت کو نہایت عمدہ طور پر جمع کیا ہے بلکہ علومِ ادبیہ میں یہ کتاب سند ہے البتہ منقولات میں اس شخص کا پایہ بلند نہیں اور کہیں کہیں مذہبِ معتزلی کی تائید بھی کرتا ہے اس لیے امام ناصر الدین احمد بن محمد بن منسیر اسکندری نے ایک حاشیہ اس پر لکھا ہے کہ جس کا نام انصاف ہے اس میں اس کے مذہبِ اعتزال کی باتوں پر گرفت کر کے کتاب کو درست کر دیا ہے۔ اسی طرح اس کتاب پر علماءِ محققین کے بیشمار حواشی ہیں منجملہ ان کے قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی اور فخر الدین احمد بن حسن جار بردی و شرف الدین حسن بن محمد طیبی و سعد الدین علامہ تفتازانی و سید شریف علی بن محمد جرجانی وغیرہم کے حواشی ہیں۔ یہ کتاب علماء میں نہایت مشہور ہے اگر اس میں اعتزال کی باتیں اور روایت میں زیادہ احتیاط ہوتی تو بے نظیر کتاب تھی تاہم بساغنیمت ہے۔

انوار التنزیل و اسرار التاویل: قاضی ناصر الدین ابی سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی کی تصنیف ہے کہ جس کو تفسیر بیضاوی کہتے ہیں اس کے مصنف کی وفات تبریز میں ۶۸۵ ہجری میں ہوئی ہے اس کتاب میں اعراب و معانی و بیان کے جو کچھ متعلق ہے وہ کشاف سے ماخوذ ہے اور جو کچھ حکمت و کلام سے متعلق ہے وہ تفسیر کبیر سے اور جو کچھ اشتقاق و غوامض حقائق و لطائف و اشارات سے متعلق ہے وہ تفسیر راغب اصفہانی سے ملخص ہے اور باقی اپنا طبع زاد ہے خیر جو کچھ ہو مگر یہ کتاب نہایت عمدہ اور بڑی مشہور ہے اس نے ان لغو روایات کو جن سے اسلام پر دھبہ لگتا ہے یک لخت رد کر دیا۔ اس تفسیر پر بھی علماء کے بہت سے حواشی ہیں منجملہ ان کے محی الدین محمد بن شیخ مصلح الدین اور شیخ جلال الدین بن عبد الرحمٰن سیوطی اور ابو الفضل قرشی خطیب اور محمد بن جمال الدین شردانی و صبغۃ اللہ و شیخ محمود بن حسین حاذقی و شیخ شہاب خفاجی و ملا عصام و عبد الحکیم سیالکوٹی وغیرہم کے حواشی ہیں۔ اس کتاب میں فضائلِ سور میں احادیثِ ضعیفہ بلکہ موضوعہ بھی مصنف نے داخل کر کے اس کی عمدگی پر دھبہ لگا دیا تاہم بہت خوب تفسیر ہے۔

مدارک التنزیل: حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود نسفی کی تصنیف یہ مختصر تفسیر نہایت عمدہ ہے اس کے

مصنف حنفی ہیں وفات ۷۱۰ ہجری میں ہوئی۔

معالم التنزیل : ابومحمد حسین بن محمود بغوی ؒ کی تصنیف اس کو فراء بھی کہتے ہیں فروپوستین کو کہتے ہیں یہ پوستین بنایا کرتے تھے ان کی وفات ۵۱۶ ہجری میں ہوئی ہے یہ صاحب محدث ہیں بطرزِ اہلِ حدیث تفسیر بیان کرتے ہیں مگر اس میں کسی قدر غیر معتبر قصے مذکور ہیں۔

تفسیر جلالین : سورۂ اسراء سے لے کر آخر تک جلال الدین محلی شافعی متوفی ۸۶۴ ہجری کی تصنیف ہے جب وہ ناتمام چھوڑ کر مر گئے تو اسی طور پر امام جلال الدین سیوطی نے چھ سال بعد اس کو تمام کیا اور الحمد کی تفسیر بھی آپ ہی نے لکھی۔ یہ تفسیر مختصر ہے نہایت خوب اس کے حواشی بھی بہت ہیں کمالین اور ہلالین اور جمالین اور جمل وغیرہ اس میں مختصر طور پر شانِ نزول وشرح مفردات ہے۔

مفاتیح الغیب : مفاتیح الغیب کہ جس کو تفسیرِ کبیر کہتے ہیں امام فخر الدین محمد بن عمر رازی کی تصنیف ہے ان کی وفات ۶۰۶ ہجری میں ہوئی ہے اس میں سب کچھ ہے مگر روایت میں کم پایہ ہے۔

تفسیر بحر مواج : علامہ شمس الدین دولت آبادی ثمہ دہلوی کی تصنیف ہے تمام وکمال قرآن مجید کی تفسیر فارسی زبان میں سلطان ابراہیم شرقی جونپوری کے زمانہ میں لکھی گئی اس مصنف کی علمی قابلیت کو دنیا نے تسلیم کیا ہے اور جس قدر اوصاف مفسر میں ہونا چاہیے وہ سب ان میں پائے جاتے ہیں یہ شاگرد قاضی عبد المقتدر کندی شریحی کے آوردہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی ؒ کے ہیں۔ یہ تفسیر معروف ومشہور ہے لیکن تمام وکمال کمیاب ہے۔

تفسیر ابی السعود : علامہ ابو السعود بن محمد عمادی کی تصنیف ہے۔

تفسیر مظہری : قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ کی تصنیف ہے یہ حضرت بڑے عالم اور صاحبِ نسبت حضرت مرزا مظہر جانجاناں ؒ کے مرید اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد ہیں نہایت عمدہ تفسیر ہے اکثر منقولات کو تحقیق سے لاتے ہیں۔

در منثور : جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے اس میں کثرت سے منقولات ہیں لیکن رطب ویابس۔

تفسیر رحمانی : شیخ علی بن احمد مہائمی کی تصنیف ہے۔ مہائم گجرات میں ایک بندرگاہ ہے۔ ان کی وفات ۸۳۵ ہجری میں ہوئی ہے آیات میں ربط خوب دیتے ہیں۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کے وحدت وجود میں پیرو ہیں۔

سواطع الالہام : جس کو بے نقط تفسیر کہتے ہیں ابوالفیض فیضی کی تصنیف یہ جلال الدین اکبر بادشاہِ ہند کے امراء میں سے تھا تمام تفسیر میں بے نقط حروف لایا اور بڑا تکلف کیا ہے ایک طرح کی عبادت آرائی ہے مگر فنِ تفسیر اور دیگر تحقیقات سے بالکل بے بہرہ ہے۔

سراج المنیر : شیخ خطیب شربینی کی تصنیف چار جلد میں ہے رازی وغیرہم سے اخذ کرتا ہے۔

فتح الرحمٰن : ترجمہ قرآن فارسی زبان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف ہے۔

فتح العزیز : جس کو تفسیر عزیزی کہتے ہیں حضرت مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی کی تصنیف دو جلد۔ اول میں الحمد سے لے کر وَاَنْ تصوموا خیر لکم الخ تک کی تفسیر ہے۔ دوسری میں سورہ تبارک الذی سے اخیر تک نہایت عمدہ کتاب ہے۔

فتح الخبیر : شاہ ولی اللہ ؒ کی مختصری تفسیر جس میں آثارِ ابن عباس ؓ کو بطریقِ صحیح اور اسبابِ نزول کو کہ جو تفسیر بخاری وترمذی و حاکم میں وارد ہے مختصر طور پر جمع کر دیا ہے اصل میں فوز الکبیر کا یہ پانچواں باب ہے۔

موضح القرآن : شاہ عبد القادر بن شاہ ولی اللہ کا ترجمہ قرآن اس میں محاورہ کو خوب مرعی رکھا ہے نہایت عمدہ اور مقبول ترجمہ ہے اور ایک ترجمہ تحت لفظی مولانا رفیع الدین صاحب کا بھی عمدہ ہے اور ایک ترجمہ فارسی میں سید شریف علی جرجانی کا بھی نہایت عمدہ ہے۔

تفسیر عباسی : کسی حضرت نے عبد اللہ بن عباس ؓ کی روایت کو جمع کر دیا ہے لیکن تصحیح طلب ہے۔

عرائس البیان : ابومحمد روز بہان بقلی شیرازی کی تفسیر بطریقِ اہلِ تصوف۔

فتح البیان : نواب امیر الملک والا جاہ مولوی سید صدیق حسن خاں بہادر زوج رئیسۂ بھوپال کی تفسیر چار جلد میں ہے سید موصوف نے فتح القدیر محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۵ھ کی تفسیر کو ملخص کر کے لکھا ہے البتہ منقولات کو احتیاط سے درج کیا ہے۔

تفسیر القرآن : آنریبل سید احمد خاں بہادر دہلوی کی تصنیف ہنوز ناتمام ہے۔ اس شخص نے ترجمہ شاہ عبد القادر کو ذرا بدل کر ترجمہ لکھا ہے اور باقی اپنے ان خیالاتِ باطلہ کو جو ملحدینِ یورپ سے حاصل کیے ہیں اور جن کے اتباع کا ان کے نزدیک ترقیِ قومی اور فلاحِ اسلام ہے، درج کیا ہے اور بے مناسبت آیات واحادیث واقوالِ علماء کو اپنی تائید میں لا کر الہامِ الٰہی کو تحریف کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب تحریفِ قرآن ہے نہ تفسیر آگے ہم اس لقب سے اس کو یاد کریں گے انشاء اللہ خانصاحب بہادر کی بے باکی اور الحاد کی وجہ سے تمام ہندوستان کے علماء نے تکفیر کا فتویٰ دیا ہے مگر چونکہ وہ اور ان کی ذریت جنت ودوزخ کے منکر اور الہامی باتوں کو لغو سمجھتے ہیں اس لیے اس تکفیر کی بھی کچھ پروانہیں کرتے بلکہ مضحکہ اڑاتے ہیں العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔

فتح المنان : تفسیر القرآن مشہور بہ تفسیر حقانی اس بیوقوف کم استعداد ابومحمد عبد الحق بن محمد امیر بن شمس الدین بن نور الدین ابن خواجہ جعفر بن خواجہ سلیم بن مظفر الدین احمد بن شاہ محمد تبریزی کی تصنیف۔ اس کتاب میں روایت کو کتبِ حدیث سے اور درایت کو اس فن کے علماءِ محققین سے نہایت احتیاط کے طور پر لے کر جمع کیا ہے اور چونکہ مقصود کلامِ ربانی کا لوگوں کو سمجھانا تھا اس لیے اس میں ان چند امور کی رعایت کی (۱) اردو میں اصل مطلب قرآن کو واضح کیا۔ (۲) شانِ نزول بروایاتِ صحیحہ لکھا۔ (۳) آیاتِ احکام میں اول مسئلہ منصوصہ کو ذکر کر کے پھر اختلافِ مجتہدین اور ان کے دلائل کو بیان کیا (۴) غیر ضروری سمجھ کر فقط ایک ہی قراءت کے موافق وجہ اعراب کو بیان کیا (۵) وجوہِ مختلفہ میں سے ایک کو سب سے قوی سمجھ کر ذکر کیا (۶) معانی اور بلاغت کے متعلق نکاتِ قرآنیہ کو ظاہر کیا (۷) کوئی حدیث بغیر سند کتبِ صحاح ستہ وغیرہا کے نہ لایا (۸) قصص میں جو کچھ بروایتِ صحیحہ کتبِ سابقہ سے ثابت ہے یا خود قرآن میں کئی جگہ بیان وارد ہے وہاں سے ملخص کر کے بیان کر دیا (۹) آیات میں ربط دیا (۱۰) مخالفین کے شکوک وشبہات جس قدر تاریخی واقعات یا مبدء ومعاد کے بابت وارد تھے سب کا جواب الزامی اور تحقیقی دیا۔ اور نفسِ ترجمہ میں تفسیر کو دو قوسوں کے بیچ میں لیا اور مکرر تفاسیر کی عبارت کے ترجمہ کرنے اور رطب و یابس قصے بھرنے اور کسی خاص مذہب کی تائید کرنے سے کہ حق وناحق اس کی تائید کی جاوے اجتناب کیا۔ یہ تفسیر علاوہ زمانہ

حال کی متعلق باتوں کے سلف کی عمدہ تفاسیر کا لبِ لباب اور عجیب و غریب کتاب ہے خدا مقبول کر کے اس سے اپنے بندوں کو اور مجھ کو اور میرے متعلقین کو دنیا و آخرت میں بہرہ مند و خورسند فرماوے امین۔ اے میرے خالق و قدوس گو تیری نذر کرنے کے قابل میرا یہ کام اور یہ کلام نہیں مگر تیری رحمت جو کہ واسع ہے اور اوراقِ لیل و نہار پر بقلمِ جلی لکھی ہوئی ہے اس کا یہی مقتضیٰ ہے کہ اس کو بھی مقبول کر لے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

❀❀❀❀❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ

تفسیر فتح المنان

المشہور بہ

تفسیر حقانی

مقدس

عمدۃ المحدثین فخر المفسرین الشیخ ابو محمد عبد الحق الحقانی الدہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ

حصہ دوم

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذى اسبغ نعمه على العباد، فارسل الانبياء والهداة الى سبيل الرشاد بالحجج البينات والبرهان، واتاهم الايات الباهرات وانزل عليهم الصحف والقران حتى محقت دجية الضلال، واشرقت الارض بنور ربها ونارت الجبال، فيا واجب الوجود وياغاية كل مقصود صل وسلم على جميع انبياء ك وعلى جملة اصفيائك خصوصا على سيد المرسلين تاج النبين الذى نبع من لسانه ماء الحيات، وسألت من بيانه انهار النجات، فنور الارض بعد ما ملأت من الظلمات وافتا التوحيد بعد ما عبدالمخلوقات سيدنا ومولانا محمد خاتم الرسالة وفص خاتم العدالة، الحم مصاقع الخطباء من العرب العرباء باقصر سورة القران واعجز بكلمة من الكلم الحكمية حكماء الزمان الذى فتح الله به اعينا عميًا وقلوبا غلفا واذانا صمّا وعلى اله الابرار واصحابه الاخيار الذين اقتدوا بهديته وتمسكوا بسيرته فاوضح الطريقه ونصحوا الخليقة شهروا لاسلام كسروا لاصنام الذين هاجروا لنصرته ونصروه فى هجرته فنعم المهاجرون ونعم الانصار صلوة نامية دائمة ما سجعت فى ايكها الاطيار وهمعت بوبلها الديمة المددار۔

امابعد فقیر حقیر ابو محمد عبدالحق بن محمد امیر کہتا ہے کہ اسلام کی خیر خواہی ہر زمانہ اور ہر ملک میں جداگانہ ہے کبھی زبان تلوار کا کام دیتی ہے اور جب کہ کجرو و کج فہم تقریر سے نہیں سمجھتے تو (جس طرح شفقتِ پدری بچے کو امورِ مصلحت پر مجبور کرتی ہے اسی طرح) رحمتِ الٰہی بوسیلۂ خاصانِ درگاہِ سیاست سے کام لیتی ہے۔ جب بنی العباس کے عہد میں حکمتِ یونانیہ و فلسفۂ روم و رومانیہ نے اسلام پر حملہ کیا تو علمائے کلام کے اقلام نے نیزوں کا کام دیا کیونکہ جب صحابہ اور عرب العرباء کو جو رموزِ قرآن سے واقف تھے اٹھ گئے تو علماء نے مطالبِ قرآنیہ کی حفاظت پر کمر ہمت باندھی پھر علوم و فنون میں بے حد ترقی کی یہاں تک کہ جس طرح مدارسِ اندلس و بغداد میں صدہا علوم[۱] دنیویہ کا اپنے اور بیگانوں کو درس دیا۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق بے شمار علوم کو مدون کیا۔ جس کا دسواں حصہ بھی عہدِ آدم سے لے کر کسی قوم نے اپنی کتاب الٰہی کے لیے تدوین نہیں کیا۔ اسی لیے زمانۂ نزول سے اب تک جس طرح قرآن محفوظ ہے ایسی کوئی کتاب محفوظ نہیں۔ پھر جس طرح اسلام کا شجرِ طوبیٰ اثر زمین پر ابرِ رحمت کی طرح پھیلتا گیا۔ ہر ملک اور ہر شہر کو اس نے اپنے حیات بخش

---

۱ چنانچہ علم ریاضی کے متعلق زیج اور اکر اور اصطرلاب اور مرایا و مناظر کہ جس کا اثر آج کل فوٹو گرافی اور نقشہ نویسی ہے اور جبر و مقالہ وغیرہ علوم کو زندہ کیا اور رصد بنائی اور ستاروں کی چال وغیرہ وغیرہ فنونِ ہیئت کی تحقیقات کی۔ حساب و ہندسہ۔ کے اصول کو از سرِ نو قائم کیا فنِ عمارت و فلاحت میں یہ لوگ استادِ زمانہ مانے لگے مساحت کے اصول سب سے پیشتر عرب نے قائم کیے جہاز رانی اور ستاروں کے حساب سے سمندر میں سفر کرنا زیادہ تر اسلامیوں ہی نے رواج دیا۔ پھر طبیعات علم العناصر کہ جس سے ہوا اور پانی اور زمین اور کرۂ نار کے عجائب حالات معلوم ہوتے ہیں اور علمِ جمادات کہ جس سے ہر زمین کے معدنیات کی کیفیت اور جواہرات اور زمین سے سونا چاندی نکالنے کی کیفیت اور پہاڑوں اور دریاؤں اور چشموں کے پیدا ہونے کے حالات منکشف ہوئے ہیں اور علم النباتات کہ جس سے درختوں کے سرخ و سبز پھول آئے اور ان کے ثمرات کے مختلف مزہ ہونے اور زمین کی جڑی بوٹیوں کے خواص سے بحث ہوتی ہے۔ اور علم الحیوان کہ جس میں حیوان کے انواع و اوصاف کے عجائب حالات سے گفتگو کی جاتی ہے اور علم الکیمیا کہ جس کو کیمسٹری کہتے ہیں جس میں استحالاتِ عناصر سے بحث ہوتی ہے وغیرہ علوم کے اہلِ اسلام ہی استاد مانے گئے ہیں۔ پھر جس قدر منطق اور فلسفہ کو علمائے اسلام نے ترقی دی وہ ←

پھلوں اور پھولوں سے بہرہ ور کیا اور اپنے ظلِ عاطفت سے بہرہ یاب فرمایا تو اسی قدر خدائے تعالیٰ نے اہلِ سیف و قلم کو اس کا حامی بھی بنایا جنہوں نے بوم منش اور موش طبع لوگوں سے اس کو ہر طرح سے بچایا۔ چنانچہ جب ہندوستان کو اس آفتابِ جہاں تاب نے تاریکی، جہالت و

بھی ظاہر ہے۔ قدمائے یونان کی کتابوں میں ایسا غوجی۔ اعنی کلیات خمس وغیرہا چند بے نمک مسائل مذکور ہیں۔ لیکن اسلامیوں نے تو اس کو اس درجہ تک پہنچا[یا] کہ جس کے بعد پھر ترقی کا کوئی درجہ ہی باقی نہ رہا اور اسی طرح علمِ حکمتِ نظریہ کو از سرِ نو زندہ کیا اور حکمائے یونان کے اغلاط پر بحث کر کے ایک نیا فلسفہ قا[ئم] کر دیا۔ جس کو علمِ کلام میں بطور مبادی کے ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حکمتِ علمیہ میں تہذیبِ اخلاق اور سیاستِ مدن اور تدبیرِ منزل کے وہ اصول قائم کیے کہ جن کو اس وقت کے فلاسفر بھی مانتے ہیں۔ پھر جغرافیہ اور تاریخ میں بھی حکمائے اسلام استاد مانے گئے ہیں اور ان عجائب صنعتوں کے ذکر کی تو یہاں گنجائش ہی نہیں کہ جن کو اسلامیوں نے اپنے زمانہ میں ایجاد کیا تھا چنانچہ ہارون رشید کے حکم سے بغداد کے دو عالموں نے کوفہ اور سنجار کے صحرا کا ایک درجہ محیط ناپ کر زمین کا محیط تخمیناً ساڑھے چوبیس ہزار میل ثابت کیا۔ اقلیدس اور مجسطی کی شرح کی۔ بطلیموس کے زیج کو درست کیا منطقۃ البروج کی تعدیل کا حساب لگایا۔ سمرقند میں رصد بنائی ہیئت اللہ بن حنین نے نور کی رفتار کا اندازہ نکالا اور اسی طرح توپ و بندوق کا ایجاد بھی ان ہی کے زمانہ میں ہوا ہے اور جرِّثقیل کا بھی فن اور فنِ طب میں بھی جو کچھ ترقی ان کے عہد میں ہوئی وہ بیان سے باہر ہے اور فنِ عروض و قوافی تو خاص ان ہی کا حصہ ہے چونکہ اس بیان کی تفصیل کو بڑی کتاب درکار ہے لہٰذا اس بیان کو میں صرف دو باتوں پر تمام کرتا ہوں: (١) یہ کہ اس وقت میں جن چیزوں میں ترقی اہلِ یورپ نے کی ہے۔ جیسا کہ تار برقی، ریل گاڑی، دخانی جہاز تارپیڈو، ڈائنامیٹ وغیرہ صنعتیں اور کپڑا بنانے کے کارخانے اور دیگر کارخانجات یہ سب تخمیناً پچاس ساٹھ برس میں مختلف ملکوں میں مختلف لوگوں کے ہاتھ سے مروج ہوئے ہیں۔ روم اور مصر کے اہلِ اسلام بھی ان میں شریک ہیں اور لندن کی کچھ خصوصیت نہیں۔ فرانس جرمن، روس وغیرہ کل ممالک میں ہیں۔ ان کے اصول پہلے بھی اہلِ اسلام میں تھے اور یوں ہمیشہ ہر زمانے میں ایسے امور میں ترقی اور تنزل ہوتا آیا ہے۔ (٢) یہ کہ یورپ کے بڑے بڑے محقق بھی اس شاگردیِ اہلِ اسلام کے مقر ہیں۔ چنانچہ سدلیو کہ جو علمِ تاریخ میں فرانس کے ملک میں بڑا مدرس تھا وہ اپنی ہسٹری آف اسلام میں کہتا ہے کہ قومِ عرب لاشک ہمارے یعنی یورپ کے استاد ہیں جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور انہوں نے وہ سامان مہیا کیے کہ جن سے ہماری یہ تاریخیں بنیں اور انہوں نے ہی حالاتِ سفر کو قلمبند کرنا شروع کیا الخ وہی صنائع اور دست کاری میں اس مرتبۂ کمال کو پہنچے جس کی انتہا نہیں الخ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے گویا وہ شمہ عرب کی اس فضیلت کا ہے کہ جو آج تک ہم کو بھی نصیب نہیں ہوئی مگر بہر کیف عرب کی قوم ہمارے جملہ فضل و کمال کا اب بھی سر چشمہ ہے اور جن کمالات کو ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ اور لوگوں کی ایجاد ہوں گے وہ اب ہم کو ان کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا چلا ہے کہ اصل میں ان سب کے موجد عرب ہی ہیں۔ پھر یہ مؤرخ اپنی تائید میں سکندر ہمبلٹ جرمنی کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ عرب کی قوموں کو خدائے تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ علوم و فنون اور اسبابِ تمدن کو ان مختلف قوموں تک پہنچا دیں جو فرات کے کنارے سے اسپانیہ کے وادی کبیر تک پھیل رہی ہیں۔ چنانچہ ان تمام قوموں نے جملہ کمالات اسی قومِ عرب سے حاصل کیے تھے الخ اور مانیا کی قوم نے بابِ تمدن میں جو کچھ حاصل کیا یا جو کچھ اس کو آیا وہ عرب ہی کے فتوحات کے زمانۂ طویل کے بعد آیا۔ اور عرب ہی سے اس نے سیکھا۔ عرب جہاں جاتے تھے اپنے طریقِ تمدن کو گویا ساتھ لے جاتے تھے اور جہاں وہ قیام کرتے تھے وہاں ان کا طریقِ تمدن پھیل جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی عادت تھی کہ جس ملک میں وہ گئے وہاں انہوں نے اپنی زبان اور اپنے علوم اور اپنا دین اور اپنے اخلاقِ مذہب کو شائع کرنا شروع کیا۔ الخ انتہٰی ملخصاً اور تاریخ ڈروی میں جس کا مصنف فرانس کا وزیرِ اعظم ہے۔ یہ لکھتا ہے کہ ایک زمانہ میں اہلِ یورپ جہالت کی تاریکی میں ٹکریں مارتے پھرتے تھے کہ دفعۃً ان پر امتِ اسلامیہ کی جانب سے ایک نورِ علومِ ادبیہ اور فلسفیہ اور فنونِ صنائعی اور دستکاری وغیرہ کا پرتو افگن ہوا۔ کیونکہ اس زمانہ میں شہر بغداد اور بصرہ اور سمرقند اور دمشق اور قیروان اور مصر اور فارس اور غرناطہ اور قرطبہ وغیرہ علوم و فنون اور صنائع کے مرکز تھے۔ اور جہاں کہیں کمالاتِ علمی اور عملی پھیلے ان ہی شہروں میں سے پھیلے اور قرونِ متوسط میں اہالیانِ یورپ انہیں شہروں میں سے علوم و فنون کو اڑا لے گئے انتہٰی۔ اور گارڈ فری ہیگنس کہتے ہیں کہ (١١٠) میں بخوبی جانتا ہوں کہ عیسائی لوگ مسلمانوں اور ان کے مذہب اور ان کی ہر ایک شے پر نظرِ حقارت ڈالتے ہیں مگر وہ تحقیق کریں تو معلوم ہو جائے کہ اہلِ اسلام اپنے مذہب پر قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد تمام روئے زمین پر سب سے زیادہ فیاض اور سب سے زیادہ باعلم قوم ہو گئی۔ اور متقدمین کے علومِ مفید بھی ہم کو بیشتر انہی کے ذریعہ سے پہنچے۔ مسلمانوں کے مذہب ... سے فیاضی

بت پرستی سے چھڑایا اور اپنے قدرتی نور سے منور فرمایا تو یہاں بھی اس کے حامی و مددگار پیدا کر دیے جس قدر فتنہ گر آتشِ فساد سلگاتے رہے اتنا ہی خاصانِ خدا اس کو نسیمِ لطف اور ابرِ رحمت سے بجھاتے رہے (لیکن جس طرح آمدِ بہار سے پہلے درختوں پر خزاں آتی اور باغ میں ہوائے صرصر چل جاتی ہے اسی طرح بہارِ آیندہ کے لیے) چند عرصہ سے اس شجرِ اسلام پر بھی جھونکے چل رہے ہیں۔ جس سے دشمن خوش اور دردمند کفِ افسوس مل رہے ہیں یہاں تک کہ اخلاف انصار و مددگار شرابِ غفلت و نفاق ہو کر بیہوش اور مست و بخوابِ خرگوش ہو گئے تو مخالفوں نے میدان خالی پا کر اپنا کام کیا۔ اس کی دولت اس کی شوکت اور اس کی سلطنت حکومت اور اس کے علوم و فنون کا کام تمام کیا۔[1] جب تخمیناً سو برس سے بڑے دور دراز سے ایک قوم عیسائی دانشمند، آزادی پسند ہندوستان میں آئی تو اپنے ساتھ ہی صدہا جہاز الحاد اور شراب خوری وغیرہ کے بھی بھر کر لائی۔ اول تو یوں ہی مسلمانوں کی حالت خراب تھی اس پر آزادی اور الحاد کی برانڈی نے وہ آفت ڈھائی کہ ؎

ازاں افیوں کہ ساقی در مے افگند
حریفاں را نہ سر ماندو نہ دستار

اور تہذیبِ اخلاق کے اکثر مسائل اور جاہل متعصبوں سے ان کے مذہب پر الزام لگانا جیسا کہ وہ اس زمانے میں رسوا ہے محض بے جا ہے۔ جیسا کہ دینِ عیسوی کو اس کے پادریوں اور اس کے محققوں سے ہے (١١١) فرنگی اس فوقیت پر (کہ جو ان کو مسلمانوں پر علوم و فنون اور فوج میں ہے) بڑے نازاں ہیں اور جو کوئی ان کی گفتگو سنے تو یہی جانے کہ زمانہ سابق میں کوئی قوم اس سے عمدہ اور مفیدِ تحصیل میں کبھی فائق نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ دھوکا ہے بجز چند فروعات اس حکمتِ عملی کے جو تجربہ سے متعلق ہے اور سوائے کارخانوں کے کوئی بات ایسی نہیں کہ جو خلفاء کی رعایا میں نہ تھی اور اب گریٹ برٹن میں حاصل ہے۔ انتہٰی ملخصاً اور جان دیون پورٹ اپنی کتاب میں موشیم مورخ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: یہ بات یقینی ہے کہ اس زمانہ میں اہلِ عرب نے ملکِ ہسپانیہ اور اٹلی میں بہت سے مدرسے جاری کیے تھے اور ان مدرسوں میں ہزاروں طلباء عربی فلسفہ اور حکمت کی تعلیم پاتے تھے اور پھر ان علوم کو آن کر عیسائی مدرسوں میں جاری کرتے تھے۔ ہمیں اس بات کا یقین کرنا چاہیے کہ تمام قسم کے علم، طب اور طبیعات اور فلسفہ اور ریاضی جو دسویں صدی سے یورپ میں جاری ہوئے یہ سب عرب کے مدارسِ فلسفہ سے سیکھے گئے تھے۔ بالخصوص اندلس کے اہلِ اسلام تو فلسفۂ یورپ کے بانی خیال کیے جاتے ہیں الخ اہلِ روما اور گوتھ لوگوں نے ہسپانیہ کو دو سو برس میں فتح کیا تھا۔ مگر اہلِ عرب نے صرف کل بیس برس میں اس کو فتح کیا اور کوہ پری نیز سے اتر کر اس طرف فرانس میں پہنچ گئے ان کو علمی ترقی بھی ایسی جلد حاصل ہوئی جیسی انہیں فتحیں حاصل ہوئی تھیں۔ انتہٰی ملخصاً۔ اور ہنری لوئیس کی تاریخ فلسفہ میں یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے یورپ میں علم اور فلسفہ پہنچا اس امرِ خاص میں یورپ ان کا ممنونِ احسان ہے اور اس سے بڑا احسان عرب کا یورپ پر ہے کہ انہوں نے علمِ ہندسہ اور طب اور کیمیا میں بڑی کوشش کی اور ان ہی کی بدولت اسپین سے فرانس ہو کر فرنگستان میں علم پھیلا۔ انتہٰی۔ اور ڈاکٹر ٹیلر زسکندر فریز اپنی کتاب کے دوسرے حصہ میں کہتا ہے کہ فرنگستان میں جو علم کا چرچا ہوا سو وہ عربوں سے ماخوذ ہوا ہے الخ عربوں نے خاص ان کتابوں پر التفات کیا جن میں علمِ ریاضی اور طبعی اور الٰہی مندرج تھی ار فرنگستان کے ممالکِ مغربی بھی عرب کے ترجموں کے وسیلہ سے ان علوم سے آگاہ ہوئے۔ شارلیمن شاہِ فرانس نے ان علموں کو زبان عربی سے لاٹینی میں ترجمہ کرایا۔ دستکاری کے صنائعِ بدائع ممالکِ فرنگستان میں بہت کم تھے۔ مسلمانوں نے اس کو ترقی بخشی اور علمِ معماری بھی اہلِ فرنگ نے عربوں سے حاصل کیا۔ جس میں بڑی شان و انداز و پاکیزگی نمایاں ہوئی ہے انتہٰی ملخصاً اس کے سوا اور بہت سے مورخینِ اہلِ یورپ کے اقوال ہیں جن کے ذکر کا یہاں مقام نہیں۔

اس بیان سے میری غرض یہ نہیں کہ اہلِ اسلام کے سوا اور کسی کو دنیاوی امور میں ترقی نصیب نہیں ہوئی نہ اب ہے بلکہ یہ مقصود کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ (پابندیِ اسلام دنیاوی ترقیوں سے مانع ہے) محض غلط ہے۔ اگر پابندیِ اسلام مانعِ ترقی ہوتی تو اہلِ اسلام ترقی میں سب پر سبقت نہ لے جاتے۔

[1] وہ علوم کہ جو قرآن مجید سے متعلق ہیں اور جن کو خاص علمائے اہلِ اسلام نے ایجاد کیا ہے بہت سے ہیں۔ مگر یہاں بطور نمونے کے چند علوم ذکر کرتا ہوں۔

جس سے غفلت اور باہمی نزاع اور بے دینی نے ہر طرف سے محیط ہو کر دینی و دنیوی برکات کا خاتمہ کر دیا یہاں تک کہ ان کا دل خوش

← (۱) علمِ صرف کہ جس میں مصدر سے ماضی مضارع بنانا وغیرہ باتیں مذکور ہوتی ہیں ۔

(۲) علمِ نحو جس میں لفظ عربی سے باعتبارِ اعراب و بناء کے بحث ہوتی ہے۔ اور ان دونوں علموں بغیر زبانِ عرب پر واقفیت مشکل ہے۔

(۳) علمِ معانی کہ جس میں کلامِ عربیہ ان حالات سے بحث ہوتی ہے کہ جن کی وجہ سے کلام مقتضیٰ حال اور مقام کے مطابق ہوتا ہے کہ جس میں اسناد خبر اور مسند الیہ اور مسند اور متعلقاتِ فعل اور قصر اور فصل وصل ایجاز اطناب مساوات کے احوال بیان ہوتے ہیں۔ (۴) علمِ بیان کہ جس سے ایک مطلب کو باعتبار وضاحت و خفی کے چند طور سے ادا کرنا معلوم ہو جاتا ہے اور اس میں تشبیہ اور مجاز اور کنایہ استعارہ وغیرہ ان امور سے بحث ہوتی ہے کہ جن سے انسان کلام میں تاقید معنوی سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ دونوں علم فصاحت اور بلاغتِ کلام سے متعلق ہیں۔ جو اہلِ زبان ہیں وہ تو اپنے ذوقِ سلیم سے جانتے ہیں ورنہ اس علم کی وجہ قرآن کے اسرارِ وضاحت و بلاغت نمایاں ہوتے ہیں اور اعجاز ثابت ہوتا ہے۔ (۵) علمِ بدیع کہ جس سے کلام کی معنوی و لفظی خوبیاں معلوم ہو جاتی ہیں اس میں مستخدام اور ترصیع و تجنیس وغیرہ امور سے بحث ہوتی ہے۔ (۶) علمِ مفردات کہ جس میں باعتبارِ معنی اصلی کے الفاظ سے بحث ہوتی ہے۔ (۷) علمِ رسم الخط کہ جس میں قرآن کے طرزِ کتابت سے بحث ہوتی ہے کہ فلاں لفظ کو یوں اور فلاں لفظ کو یوں لکھنا چاہیے۔ (۸) علمِ تجوید کہ جس میں طرزِ تلفظِ قرآن سے بحث ہوتی ہے۔ اس علم میں آنحضرت ﷺ کے لب و لہجہ کو جو ادائے قرآن سے متعلق ہے محصور کر لیا ہے۔ صفاتِ حروف وغیرہ عمدہ عمدہ باتیں جو اس فن میں مذکور ہوتی ہیں۔ (۹) علمِ عروض و قوافی اس علم کو خلیل وغیرہ نے ایجاد کیا ہے اگرچہ زیادہ تر فائدہ اس فن کا نظم سے ہے۔ مگر فواصلِ آیات کی پوری کیفیت اسی علم سے معلوم ہوتی ہے۔ (۱۰) علم الکلام کہ جس میں ادلۂ عقلیہ و نقلیہ سے مبدء و معاد کی بابت جو کچھ قرآن یا پیغمبر علیہ السلام سے ثابت ہے درج ہے۔ اس فن میں باری تعالیٰ کی ذات و صفات و نبوت و ملائکہ و عالمِ آخرت وغیرہا کے متعلق جو کچھ اہلِ اسلام کے عقائد ہیں ان سے بحث ہوتی ہے۔ (۱۱) علمِ فقہ کہ جس میں قرآن و احادیث و اجماع و قیاس سے جو مسائل کہ قوتِ عملیہ کے متعلق ثابت ہیں مذکور ہوتے ہیں۔ اس فن میں نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، بیع و شرا کے متعلق جو کچھ قرآن و احادیث میں آیا ہے ان کا خلاصہ مذکور ہوتا ہے جس طرح کہ کلام میں خلاصہ عقائد۔ (۱۲) علمِ فرائض بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔ (۱۳) اصولِ فقہ کہ جس سے ادلہ اربعہ قرآن و حدیث، اجماع و قیاس سے مسائلِ فقہ استنباط کرنے کا سلیقہ حاصل ہوتا ہے۔ اس فن میں عام خاص مشترک ماول عبارۃ النص دلالۃ النص ۔ اشارۃ النص ۔ اقتضاء النص، محکم و متشابہ۔ خفی و مشکل ماوّل ظاہر و نص وغیرہ امور سے بحث ہوتی ہے۔ منطق اور علمِ کلام اور لغت کے مسائل بھی اس فن میں بطور مبادی ذکر کیے جاتے ہیں۔ حسن و قبحِ عقلی کی بحث بھی اس فن میں ہوا کرتی ہے۔ یہ علم دریائے بیکنار ہے۔ اس کی شاخ (۱۴) علم الجدال والخلاف بھی ہے کہ جس کو باب قیاس سے از حد ارتباط ہے اور (۱۵) علمِ مناظرہ کہ جس میں بحث کے قواعد مذکور ہیں۔ اسی فن کی ایک شاخ ہے۔ (۱۶) علمِ اصولِ حدیث کہ جس کی وجہ سے نقل اور روایت میں جو کچھ غلطیاں اور جھوٹے لوگوں کی ملونیاں ہیں اس طرح جدا ہو جاتی ہیں کہ جس طرح دودھ سے پانی۔ اس فن میں متواتر اور مشہور عزیز و غریب وغیرہ اقسامِ روایت مذکور ہوتے ہیں۔ (۱۷) علمِ اسماء الرجال بھی اس کی ایک شاخ ہے جس میں راویوں کی تاریخ اور ان کی راست گوئی اور دیانت داری اور حافظہ وغیرہ وہ حالات کہ جو روایت سے متعلق ہے مذکور ہوتے ہیں۔ (۱۸) علمِ حدیث کہ جس میں نبی ﷺ کے اقوال و افعال و سکوت اور اسی طرح صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال و سکوت کو نقل کیا جاتا ہے۔ یہ وہ فنون ہیں کہ جن پر اہلِ اسلام تمام بنی آدم پر فخر کر سکتے ہیں۔ ان ہی فنون کے وسیلہ سے مسلمانوں نے اپنے نبی علیہ السلام کی ہر بات کو نہایت صحت اور تحقیق کے ساتھ اپنی کتابوں میں جمع کر دیا۔ امام بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہم محدثین کو خدائے تعالیٰ نے وہ قوتِ حافظہ عنایت کی تھی کہ جن کو بلا تفاوتِ حروف مع اسناد ہزار ہا احادیث یاد تھیں اور کھرے کھوٹے کے پرکھنے میں ان کی زبان معیار تھی۔ اس لیے جو منصف مزاج اہلِ زبان کے اصولِ روایت اور کتبِ احادیث کو جانتا ہے ۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ اہلِ کتاب کی بیبل کو صحیح بخاری سے صحتِ روایت میں کچھ بھی نسبت نہیں۔ حضرت مسیح کی تاریخ کو گرچہ متی وغیرہ بہت سے عیسائیوں نے بڑی احتیاط سے لکھا ہے کہ جن کو عیسائی الہامی اور حضرت مسیح کی اصلی انجیل سمجھتے ہیں مگر خود ان پانچ چھ جز کی کتابوں میں مصنفوں نے بڑی غلطیاں کی ہیں اور ایک نے دوسرے کے برخلاف بیان کیا ہے اور ان میں سے متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی انجیلیں

کرنے کے لیے ایک قوم نے تو وہ طرز اختیار کیا کہ اہلِ یورپ کا پورا جامہ ہی پہن لیا جس طرح وہ لوگ برائے نام عیسائی اور در حقیقت سخت ملحد ہیں نہ خدا کے قائل، نہ ملائکہ و حشر و نشر، ثواب و عقاب، حلال و حرام، طاہر و نجس کے مقر۔ نبی کو ایک رفارمر (ناصح) الہام اور کلام ملائکہ کیا مجنونوں کی بڑ۔ اسی طرح یہ لوگ بھی نبی اور ملائکہ اور الہام اور جبریل اور خرقِ عادات انبیاء علیہم السلام اور نعمائے جنت اور جہنم کے وہ عقوبات کو جو نصوصِ قرآن سے ثابت ہیں ان سب باتوں کے منکر اور حلال و حرام اور طہارت و نجاست وغیرہ جملہ احکامِ اسلام سے نافرمان۔ اس پر نام کے مسلمان ہیں۔ پھر ان کفریات اور پادریوں اور ملحدانِ یورپ کے معتقدات کا نام تحقیق اور ترقیِ اسلام رکھ کر صد ہا دولت مندوں اور آزادی پسندوں کو تفسیر کے پیرایہ میں ملحد و گمراہ بلکہ حقیقی اسلام کا بدخواہ بنا دیا۔ حیف صد ہا کو روحانی زہر کا پیالہ پلا دیا۔ لہٰذا حمیتِ ایمانی اور اہلِ اسلام کی نفع رسانی نے مجھ جیسے بے لیاقت کو مجبوراً اردو میں ایسی تفسیر لکھنے پر مامور کیا۔ یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ تالیف اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی بادشاہِ دیں پناہ نظام الملک آصف جاہ میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ (جمیع اللہ) کے عہدِ مبارک میں ظہور پذیر ہوئی۔ ان شاہِ دکن کا زمانہ حمایتِ علوم و فنون و تربیتِ علماء کے لیے بسا غنیمت ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ نے ان کو حسنِ صورت عطا فرمایا ہے اسی طرح حسنِ سیرت بھی عطا کیا ہے۔ آپ کے اخلاقِ شاہانہ آپ کا جودِ حاتمانہ مشہورِ زمانہ ہے۔ حق سبحانہ آپ کو سلطنتِ آصفیہ پر سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔

اے ہادیِ مطلق مجھ کو وہ بات اس کتاب میں تلقین فرما کر جو تیرے نزدیک حق اور بجا ہو اور لغزش اور خطا سے بچا۔ انک علی کل شیء قدیر و بالا جابت جدیر، انت حسبی و نعم الوکیل۔

سورۂ فاتحہ

یہ سورۃ مکیہ[۱] ہے یعنی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مکہ میں سورۂ اقراء اور نون اور مزمل اور مدثر کے بعد نازل ہوئی تھی۔ نزول میں گو مؤخر ہے مگر قرآن مجید میں سب سے اول یہ سورت ہے اور اسی سے قرآن شروع ہوتا ہے اور اسی لیے اس کو فاتحہ کہتے ہیں۔ اس کا نام بھی آنحضرت ﷺ کے روبرو قرار پا کر صحابہ میں مشہور و معروف تھا گو اس کے اور بھی نام ہیں جیسا کہ سورۂ شفاء کہ اس کی تاثیر سے روحانی اور جسمانی شفا حاصل ہوتی ہے اور ام القرآن کہ یہ تمام قرآن کی اصل ہے اور سب علومِ قرآن اس میں جمع ہیں اور تعلیم المسئلہ کہ اس میں خدائے تعالیٰ نے بندوں کو سوال کرنا سکھایا اور آدابِ دعاء کو بتلایا ہے اور سبع المثانی کہ اس کی سات آیات ہیں اور ہر نماز میں دو بار پڑھی جاتی ہے۔ لیکن

← خیالات کی تائید میں الحاق کیا ہے وہ علاوہ ہے اور نہ کسی کے پاس کوئی سند متصل مؤلفِ کتاب تک ہے پھر کس اعتماد پر عیسائی مسلمانوں کے روبرو تاریخ دانی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ (۱۹) علمِ قصص کہ جس میں قرآن مجید کے تمام قصوں کو علماء نے اپنی کتابوں میں نصیحت اور عبرت کے لیے ترتیب وار جدا لکھا ہے۔ (۲۰) علمِ تصوف کہ جس کو قرآن کی ان آیات سے کہ جو انسان کی کیفیاتِ قلب، حب و توکل و خوف و رجاء وغیرہ ملکاتِ فاضلہ کو جلا دیتے ہیں) اخذ کر کے مدون کیا ہے اس فن میں بھی صد ہا کتابیں ہیں۔ (۲۱) علمِ تفسیر کہ جس کا بیان مقدمۂ کتاب میں ہوا۔ یہ علم بھی ایک بحرِ ذخار ہے۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی علوم ہیں۔ ۱۲ منہ

[۱] یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے بعض علماء مدنی کہتے ہیں دراصل مکی و مدنی کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ یحییٰ بن سلام سے منقول ہے کہ ہجرت کے قبل جتنی سورتیں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں۔ علیٰ ہذا سفرِ ہجرت میں جو قرآن نازل ہوا وہ بھی مکی ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ جن سورتوں میں اہلِ مکہ سے خطاب کیا گیا ہے وہ مکی ہیں اور جن میں اہلِ مدینہ سے خطاب ہے وہ مدنی۔ بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کا کچھ حصہ مکہ میں نازل ہوا اور کچھ مدینہ میں۔ ان میں زیادتی کا لحاظ رکھ کر مکی اور مدنی کی گئی اور جو سرزمین ایسی ہی نواحِ مکہ مثلاً منیٰ عرفات میں نازل ہوئی ... بھی مکیہ کہلاتی ہیں اور جو نواحی مدینہ میں نازل ہوئیں وہ بھی مدنی کہلاتی ہیں۔ فقط حقانی۔ ۱۲

الحمد تو اس کا (اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد ہے) مشہور نام بین العوام ہے اور اسی طرح کافیہ اور کنز اور اساس وغیرہ بلحاظ صفات اور بھی نام ہیں کہ جن سے اس سورت کی فضیلت اور عظمت ثابت ہوتی ہے۔

شانِ نزول

کتابِ دلائل میں بیہقی نے اور واحدی نے (بطریقِ یونس بن بکیر عن یونس بن عمرو عن ابی میسرۃ عن عمرو بن شرجیل) یہ روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب میں تخلیہ میں ہوتا ہوں تو غیب سے آواز سنتا ہوں جس سے مجھ کو ایک دہشت معلوم ہوتی ہے خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سن کر عرض کیا کہ آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر ورقہ[1] بن نوفل کے پاس جائیے اور اس واقعہ کو بیان کیجئے۔ چنانچہ حضرت ان کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا حضرت جب وہ ہاتفِ غیب آپ کو پھر اسی طرح سے یا محمد یا محمد کہہ کے پکارے تو آپ ٹھہر کر اس کی بات سنئے وہ کیا کہتا ہے۔ پس آپ نے ایسا ہی کیا کہ جب آواز آئی تو آپ نے کہا لبیک۔ اس نے کہا کہہ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔ الخ۔ اور اسی کے قریب قریب مولانا یعقوب چرخی نے حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ اگرچہ یہ روایات خبرِ احاد ہیں مگر بر تقدیرِ ثبوت یہاں ایک بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ جب اقراء اور مزمل اور مدثر نازل ہو چکی تھیں تو پھر آپ کو آواز جبریل سے دہشت کیوں معلوم ہوئی اور آپ اس واقعہ کو ورقہ کے پاس کیوں لے گئے کیا خود نہ جان سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو آپ نبی تھے اور تزکیۂ نفس میں تمام نفوسِ قدسیہ کے سرتاج مگر انسانیت کے جامہ میں تھے جس کا ایک جزو بہیمیت ہے اور جب بہیمیت پر ملکیت کا اثر قوی ہوتا ہے تو اس پر اس فعل و انفعال سے ایک تشویش پیدا ہوتی ہے کہ جس کو گھبراہٹ یا خوف کہتے ہیں اور اسی لیے ایک بار یا دو بار یہ بات آپ کو ابتدائے نزولِ وحی میں پیش آئی پھر نہیں۔ اور ایسی حالت میں انسان کا مقتضائے طبعی یہ ہوتا ہے کہ کسی دانشمند ہم جنس سے مل کر انس پیدا کرے۔ سو ورقہ چونکہ اہلِ کتاب اور ذی علم اور صاحبِ شعور تھے اس لیے ان کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ کچھ تعلیم و تعلم کے طور پر نہ گئے تھے اور نہ مرید ہو کر تلقین پانے اور فیض اٹھانے کے لیے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یوحنا کے پاس مرید ہونے اور اصطباغ پانے گئے تھے جیسا کہ انجیل متیٰ کے ۳ باب میں ہے اور اس بیہودہ وسواس کا جواب (کہ جبریل کوئی چیز نہیں ہے اور یہ آواز خیالی مجنون کے تخیلات کے مشابہ تھی) ہم مقدمۂ کتاب میں دے چکے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ[2] شروع اللہ کے نام سے کہ جو نہایت رحم والا بڑا مہربان ہے۔ یہ تو سب علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے

۱ ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی انہوں نے اور زید بن عمرو نفیل نے بت پرستی سے متنفر ہو کر جاہلیت کے زمانہ میں ملکِ شام کو تحقیقِ دین کے حق کے لیے سفر کیا تھا وہاں بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد ورقہ نے مذہب نصاریٰ اختیار کیا ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ ورقہ اول یہودی ہو گئے تھے بعد میں مذہب نصاریٰ اختیار کیا انبیاءِ سابقین کے کتب سے بہت اچھی طرح واقف تھے حضرت ﷺ نے جب ابتدائی وحی کا قصہ ان سے بیان کیا تو ورقہ نے کہا جو فرشتہ تم پر نازل ہوا یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا۔ ورقہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور کہا کاش میں اس زمانہ میں جوان ہوتا جب تمہاری قوم تم کو نکالے گی تب آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھ کو نکالے گی؟ ورقہ نے کہا کہ البتہ ہر نبی ایذا دیا جاتا ہے اگر میں اس دن زندہ رہا تو بے شک میں تمہاری پوری مدد کروں گا ورقہ نے نبوت کے تیسرے سال میں انتقال کیا بعض علما کہتے ہیں کہ ورقہ بن نوفل مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔ فقط۔ ۱۲ حقانی

۲ ابن مردویہ احمد بن موسیٰ بن مردویہ اپنی تفسیر میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب بسم اللہ نازل ہوئی تو بادل مشرق کی طرف دوڑنے لگے ہوا چلنے سے رک گئی، سمندر میں جوش پیدا ہوا، جانور کان لگا کر سننے لگے، شیاطین ہنکائے گئے۔ اللہ نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھائی کہ نہیں پڑھی جائے گی

کہ اس سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں (جملہ) ہیں مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا بسم اللہ بھی ان میں داخل ہے کہ مجموعہ کا نام سورہ فاتحہ رکھا جاوے یا بسم اللہ کو (کہ قرآن مجید کا جزو اور بلاشبہ کلامِ الٰہی ہے) اس سورۃ کے اول بلکہ سب سورتوں کے اول میں اس لیے لکھ دیا ہے کہ اس سے دوسری سورت میں فرق ہو جائے اور اس سے سورۃ کا ابتداء کرنا باعثِ تبرک سمجھا جائے۔ پس مدینہ اور بصرہ اور شام کے قاریوں اور فقہا کا یہی قول ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ بسم اللہ جزوِ سورہ نہیں۔ محض فضل اور تبرک کے لیے لکھی ہے اور یہی بات قوی ہے۔ کیونکہ بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے اور اسی طرح طبرانی اور ابن خزیمہ اور ابوداؤد وغیرہم محدثین کی روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں بسم اللہ کو آہستہ پڑھتے تھے اور الحمد للہ رب العالمین کو پکار کر پس جب یہ ہے تو بسم اللہ الحمد کا جزو نہیں ہے کیونکہ سورت میں سے ایک جزو کا خفیہ پڑھنا کوئی وجہ نہیں رکھتا۔ اگر یہ جزو ہوتی تو اس کو بھی پکار کر پڑھتے اور مکہ کے اور کوفے کے قاری اس کو جزوِ الحمد سمجھتے ہیں۔ اور امام شافعی اور عبداللہ بن مبارک کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی لیے یہ لوگ اس کو نماز میں پکار کر پڑھتے ہیں اور ان کے پاس بھی دلائل ہیں۔ مگر نبی ﷺ اور خلفائے اربعہ نے اس بارہ میں کسی بات کی صراحت نہیں کی دونوں فریق اپنی اپنی رائے سے اپنے مذاہب کو احادیث سے ثابت کرتے ہیں۔ پھر جو اس کو جزوِ الحمد کہتے ہیں ان کے دو قول ہیں۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ یہ آیت پوری ہے اور بعض کہتے ہیں آیت کا ٹکڑا ہے بلکہ اگلا جملہ مل کر ایک آیت ہوتی ہے پس جن کے نزدیک بسم اللہ بھی ایک آیت پوری ہے تو ان کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ ایک آیت ہے اور جن کے نزدیک نہیں تو وہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو ایک آیت اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کو دوسری آیت کہتے ہیں۔ واللہ اعلم

ترکیب : لفظ با جار اور اسم مجرور مضاف اللہ مضاف الیہ موصوف اور لفظ الرحمن الرحیم دونوں یکے بعد دیگرے اس کی صفت۔ موصوف و صفت جو مضاف الیہ ہے اپنے مضاف سے مل کر جار کا مجرور ہوا اور یہ جار متعلق ہے ایک فعل محذوف کے کہ جو یہاں اقراء ہے کیونکہ جس چیز پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے وہاں اسی قسم کا فعل محذوف مانا کرتے ہیں جو کھاتے وقت پڑھیں گے تو اٰکُلُ اور پیتے وقت اَشْرَبُ علیٰ ہٰذا القیاس۔ پس یہ سب اپنے فعلِ محذوف کے ساتھ مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔

تفسیر : خدائے تعالیٰ اپنے بندوں کو اس سورت میں یہ بتلاتا ہے کہ یوں کہا کرو نہ یہ کہ وہ خود اپنی طرف سے یہ کہتا ہے کہ میں خدا رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں تا کہ آگے چل کر یہ کہنا پڑے کہ وہ کسی مخاطب سے یہ کہتا ہے کہ میں تیری ہی عبادت کرتا اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ حاصل مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم کرتا ہے کہ یوں کہو کہ ہم خدا کے نام سے شروع کرتے ہیں کہ جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ان مسائل کا ذکر اس تفسیر میں مفید عام نہیں اس لیے ان سے قلم کو روکتا ہوں کہ بسم اللہ جو اسم ہے وہ سموء سے مشتق ہے کہ جس کے معنی بلندی کے ہیں جیسا کہ اہلِ بصرۂ اہلِ کوفہ سمۃ سے مشتق کہتے ہیں جس کے معنی علامت ہے اور یہ تحقیق کہ لفظ اللہ کون سے لفظ سے مشتق ہے۔ اور رحمٰن منصرف ہے یا غیر منصرف۔ لیکن یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بسم اللہ اصل میں باسم اللہ تھا۔ الف کو کثرتِ استعمال سے حذف کر کے اس کی جگہ کتابت میں ب کو طویل کر دیا۔ اس لیے عربی میں بسم اللہ اسی طرح لکھتے ہیں۔ نہ بنسم اللہ

نکات متعلقہ بمعنی

دفعہ ۱ : چونکہ دنیا میں انبیاء علیہم السلام اس لیے آئے ہیں کہ لوگوں کو خدا کا راستہ دکھائیں اور اس معبودِ حقیقی تک پہنچا دیں کہ جو عالمِ حس میں دکھائی نہیں دیتا نہ کسی قوتِ سامعہ و لامسہ و ذائقہ و شامہ سے معلوم ہو سکتا ہے اور جس کے وجود میں وہ لوگ شک کرتے ہیں کہ جن کو حواسِ

خمسہ کے سوا کوئی کامل قوتِ ادراک عطا نہیں اور جو عطا ہے تو اس پر شکوک و شبہات کی ہزاروں من خاک پڑی ہوئی ہے اور وہ تمام کائنات کو صرف عالمِ محسوس میں منحصر جانتے ہیں اور جو وجود کے قائل ہیں تو ہر امر میں اسبابِ ظاہریہ اور اپنے تصرفات ہی کو مؤثرِ حقیقی جانتے ہیں اور اسی لیے جو چیز اسبابِ ظاہرہ پر مبنی نہیں (جیسا کہ معجزات و کرامات) ان کا وجود نہیں مانتے۔ اور اسی لیے توکل کو لغو جان کر حصولِ دنیا میں سرگردانی اور ناکامیابی پر سخت پشیمانی اٹھاتے ہیں۔ غرض ہر کاروبار میں اس حقیقی فاعل کی طرف (کہ جو اس پردہ میں آپ سب کچھ کر رہا ہے) توجہ نہیں کرتے۔ پس ان کے لیے خداوند تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی معرفت اول یہی سبق دیا کہ ہر کاروبار میں میرا نام لیا کریں اور ہر چیز کا فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ تام جان کر برکت اور استعانت کے لیے مجھ ہی کو یاد کریں۔ سو اس لیے نبی ﷺ نے کھانے پینے ہر کارِ خیر میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا اور یہ سنا دیا کہ جو کام اس سے خالی ہوگا وہ گو عادت اللہ کے موافق اپنے اسباب پر مرتب ہو جائے گا۔ مگر اس میں وہ روحانی برکت جو منعمِ حقیقی اور فاعلِ اصلی کی یاد اور اس کی استعانت سے ہوتی ہیں نہ ہوگی (اجذم اور ابتر جو احادیث میں وارد ہے اس کے یہی معنی ہیں) اور اسی لیے آپ نے کلامِ مقدس میں سب سے اول بسم اللہ کو سرنامہ بنا کر لکھوا دیا۔ جو شخص بن دیکھے خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور تعلیمِ عبادت کے لیے سلسلۂ نبوت کو برحق مانتا ہے اور آسمانی دستور العمل کو بھی تسلیم کرتا ہے تو اس کے نزدیک مکتبِ نبوت میں بسم اللہ الرحمن الرحیم سے بہتر کوئی سبق عقل میں نہیں آ سکتا۔ یہ بات تعلیمِ کتابِ آسمانی کے لیے ضرور ہے اور جس الہامی کتاب میں اول یہ نہیں تو اس کتاب میں قصور ہے۔ (۱) ہر کاروبار میں مؤثرِ حقیقی اور خالقِ اسباب بلکہ جملہ کائنات سمجھ کر اس کا نام لینا اور اس سے برکت اور استعانت چاہنا گرچہ ایسا بدیہی حکم ہے کہ جس کو فطرتِ سلیمہ بہت جلد تسلیم کرتی ہے اور جس میں کسی خدا پرست کو انکار نہیں۔ مگر قرآن نے جو خدا کا نام لینا بتلایا ہے تو ان خوبیوں کے ساتھ بتلایا ہے کہ جن کا کچھ بیان نہیں۔ از ان جملہ یہ کہ باللہ الرحمن نہ فرمایا بلکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے برکت و استعانت طلب کی جاتی ہے اسی طرح اس کے نام میں بھی وہی اثر ہے۔ دوم یہ کہ بندہ کی رسائی اور اس کا ارتباط بحالتِ ابتدائی اس کے نام ہی تک ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دامن تلک تو تیرے ہے کہاں دسترس مجھے
تیری گلی کی خاک ہوں تو یہی ہے بس مجھے

سوم چونکہ مشرکین باسم اللات والعزیٰ کہتے تھے ان کے مقابلے میں ردِ شرک کے لیے بسم اللہ کہنا مناسب ہوا۔ از ان جملہ یہ کہ تین نام ذکر کئے اللہ رحمٰن، رحیم اور انسان کیا بلکہ ہر ممکن کے تین حال ہیں۔ اول عدم کہ جب اس کی ہستی کا نام و نشان بھی نہ تھا جیسا کہ خود ہی فرماتا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا کہ بلا شک انسان پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے کہ جس میں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔'' دوم یہ ہستیِ دنیا جس کو عرفِ عام میں زندگانی کہتے ہیں۔ سوم اس عالم سے کوچ کر جانا جس کو موت کہتے ہیں یا یوں کہو کہ اول وہ زمانہ کہ جس میں اس کی روح اس قیدِ جسمانی سے آزاد اور عالمِ قدس میں شاد تھی۔ یعنی دنیا میں پیدا ہونے سے پیشتر۔ دوم یہ زندگی مجازی کہ جس میں ہزار ہا حاجات اور بے شمار بلیات ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ سوم یہاں سے آزادی حاصل کر کے اپنے اصلی وطن میں جانے اور وہاں عالمِ قدس میں اپنے اعمال کی جزا پانے کا زمانہ ہے۔ پس اس لیے ابتدائے کلام میں (کہ جو ہر کام کے ابتداء میں پڑھنا بندہ کو مناسب ہے) اپنے وہ تین نام ذکر فرمائے کہ جو تینوں حالتوں سے مناسب ہیں تاکہ بندہ کو اپنے تینوں حال یاد آ جائیں اور تینوں حالوں میں خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلقِ خاص اور احتیاج بالاختصاص کا تصور آ کر جمیع امورِ دنیا و آخرتؔ میں نیک چلنی اور ہر طرح کی بھلائی پر دل آمادہ ہو جائے اور روحانی معلموں کی سب تعلیم کو برحق جان کر بصدقِ دل ان کو قبول کرے۔ سو اس لیے سب سے پیشتر اللہ کا نام ذکر کیا کہ جو اس کی ذاتِ مقدسہ پر دلالت کرتا ہے کہ جس میں ہر طرح کی صفاتِ کمال و جلال پائے جاتے ہیں کہ جن میں سے قدرتِ

کاملہ بھی ہے کہ وہ معدوم سے موجود اور موجود سے معدوم کر سکتا ہے۔ یہ نام پہلی حالت کو یاد دلاتا ہے اور خالق سے رابطہ بڑھاتا ہے جب اس کے نام کا تصور دل میں جگہ پکڑتا ہے تو پھر دنیا میں کسی چیز کی ہستی آنکھوں میں نہیں جچتی۔ چہ جائیکہ پھر اور کسی کی پرستش کی جائے اور اس سے حاجت برآری کے خیال کو بھی دل میں جگہ دی جائے ؎

چو سلطانِ عزت علم برکشد
جہاں سربجیب عدم برکشد

جب اس اسم کی تجلیات عارف کے دل پر پرتو افگن ہوتی ہیں تو یہاں تک محویت ہو جاتی ہے کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے

بسا میری نظروں میں تو اس قدر ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اس مرتبہ کو توحیدِ بحت کہتے ہیں۔ تثلیث و تربیع کا یہاں کیا ذکر ہے۔ معلمِ روحانی تیری تعلیم کے قربان پہلے ہی سبق میں تکمیل کر کے سعادت کو پہنچا دیا۔ مبداءِ اصلی جل جلالہ سے ملا دیا۔ اسم سے ابتداءِ سلوک تھی۔ اس کے مسمیٰ اللہ پر انتہیٰ ہوگئی۔ اس کے بعد لفظ رحمٰن کو ذکر کیا (کہ جو بروزن فعلان) جس کے معنی زیادہ رحمت کرنے والا ہے۔ کس لیے کہ رحیم سے اس میں حروف زیادہ ہیں اور کلامِ عرب میں زیادتیِ حروف زیادتیِ معنی کے لیے آتی ہے اور اسی لیے رحیم آدمی کو کہہ سکتے ہیں۔ رحمٰن نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حد سے زیادہ رحمت اسی کا کام ہے اور جو کوئی رحمت کرتا ہے کسی نہ کسی غرض سے کرتا ہے خواہ دنیا و دین کی بھلائی ہو یا زوالِ حُبِّ مال یا ہم جنسیت کے عار و ننگ سے رہائی ہو۔ اس سے قطع نظر اور جو کوئی رحمت کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ جوش اسی کی رحمت کا پرتو ہے۔ اور پھر یہ رحمت کر کے جو کسی کو کچھ بھلائی پہنچاوے گا وہ سب چیزیں خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ الغرض یہ لفظ اللہ ہی پر بولا جاتا ہے۔ یہ اسم اس حالت دومی کے لیے آئینۂ جہاں نما ہے یا تریاقِ جاں فزا۔ سو لفظ اللہ کے بعد اس کے ذکر کرنے میں دو نکتہ ہیں: اول یہ کہ عالمِ ہستی میں آ کر انسان جسمانی اور روحانی ہزاروں بلاؤں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس کو سینکڑوں چیزوں کی حاجت پڑتی ہے پس اس عالم کے مناسب کہ جس میں مومن کافر، برے بھلے سب ہیں لفظ رحمٰن ہے کہ جو غیر منتہائے رحمت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جس قدر مرض ہو اسی قدر دوا دینا عین حکمت ہے۔ پس دنیا کے حوائج چونکہ غیر متناہی ہیں ان کے مقابلہ میں ویسا ہی لفظ بولنا کمال ہے۔ دوم یہ کہ لفظ اللہ اسم ذات ہے اور رحمٰن و رحیم اسماءِ صفات اور قانونِ بلاغت یہ چاہتا ہے کہ اس ذات کے بعد اسم صفت وہ بولا جاوے کہ جو بمنزلہ علم کے خاص ہو۔ یہاں اس لفظ رحمٰن میں ایک اور نکتہ بھی ہے کہ تم امورِ معاشرت میں اپنے بیگانے مومن و کافر بلکہ ہر چیز سے مہربانی اور رحمت سے پیش آؤ اور سب سے باہم رحم دلی کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ اس کی شرح میں وہ خود ہی فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ کو احسان کرنے والوں سے محبت ہے اور فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ کہ خدا تم کو انصاف و بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس کی شرح میں نبی ﷺ کی بے شمار احادیثِ صحیحہ وارد ہیں کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں تمام قوانینِ تمدن اور رفاہِ عام کے لیے یہ جملہ اصل الاصول ہے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

اس کے بعد لفظ رحیم کو انسان کے تیسرے حال یاد دلانے کے لیے ذکر کیا۔ کس لیے کہ جس طرح لفظ رحمٰن میں زیادتی باعتبار کمیت کے مراد رکھ کر اس کی رحمت کو عامّہ و تامّہ برے بھلوں سب کے لیے قرار دیا گیا تھا۔ اب مزید لفظ رحیم کو خاص ایک جنس یعنی خدائے تعالیٰ کے فرماں بردار کے لیے خاص کیا گیا۔ پس اخیر میں لفظ رحیم کو لانا اس بات کو بتلانا ہے کہ اس جہان سے سفر کر کے جب وہاں جاویں گے تو

ان کے ایمان واعمال کے لحاظ سے ان پر اس کی رحمتِ خاص ظہور کرے گی کہ جس کی تفسیر نبی علیہ السلام نے اور خود قرآن نے مواضعِ متعددہ میں کی ہے کہ وہاں بمقتضائے رحمت اعمالِ حسنہ وعقائدِ صحیحہ ہر طرح کی اشکال میں متشکل ہو کر نظر آویں گی۔ اس لفظ میں اجمالاً آخرت کے متعلق سب باتوں کی طرف اور ان کاموں اور عقائد کی طرف کہ جو وہاں کار آمد اور نافع ہوں گے اشارہ ہے۔ یہ بسم اللہ الخ لفظ رحمٰن میں دنیاوی معاشرت کے اصول کی طرف اور لفظ اللہ میں اس کی ذات وصفات کے متعلق باتوں کی طرف اشارہ تھا۔ یہ بسم اللہ الخ گویا انسان کے لیے ان تمام الہامی باتوں کا (کہ جو انبیاء علیہم السلام کے وسیلہ سے نازل ہوئی ہیں) خلاصہ یا فہرست ہے گویا سب کو جمع کر کے اور سب کا عطر نکال کر اس جملہ میں بھر دیا گیا ہے کہ پھر اس کی شرح باقی الحمد اور اس کی شرح تمام قرآن اور اس کی شرح تمام کتبِ فقہ ہیں۔ یا یوں کہو تعلیم روحانی اور الہامِ قرآنی ایک شجر طوبیٰ اثر ہے کہ جس کا مبدءِ اولیٰ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے جس طرح کہ درخت کا مبدء تخم ہوتا ہے اور پھر اجمالی طور پر تمام پھل، پھول شاخ وبرگ اس میں ہوتے ہیں اور پھر وہ درجہ بدرجہ حالتِ تفصیلی میں آتے جاتے ہیں۔

دفعہ ۲: اس بسم اللہ کا ابتداء قرآن میں ان تین مخصوص اسموں کے ساتھ آنا اور ہر کار کی ابتداء میں اس سے خدا تعالیٰ کو یاد کرنا ایک اور لطیف بات کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ یہ کہ انسان جواہرات کو پیدا نہیں کرتا ہے بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تصرف کرتا ہے۔ پس لفظ اللہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ چیزیں کہ جن سے ہم نفع لے رہے ہیں اس جامعِ کمال وجلال کی مخلوق ہیں۔ ہم کو شکر ادا کرنا چاہیے اور لفظ رحمٰن میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان اشیاء کا وجود اس کی طرف سے ہے اسی طرح ان کی بقاء بھی محض اس کی رحمتِ کاملہ کا نتیجہ ہے اور لفظ رحیم میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان چیزوں سے انتفاع کہ جو ان کے پیدا کرنے کا نتیجہ اور علتِ غائیہ ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (اس نے زمین کی سب چیزیں تمہارے لیے پیدا کی ہیں) محض اس کی صفتِ رحمت کا اثر ہے۔

قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند ... تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرماں بردار ... شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

اگرچہ اور بھی بہت سے اسرار ہیں مگر اس تھوڑے سے کلام میں ودیعت رکھے گئے ہیں کہ جن کے بیان کو ایک دفتر جداگانہ چاہیے۔ مگر آپ کو یہ تو بخوبی معلوم ہو گیا کہ اس قدر تھوڑے سے کلام میں اس قدر تعلیمِ روحانی اور مقاصدِ الہامی بھرے ہوئے ہیں کہ عہدِ آدم سے لے کر اب تک کسی اور کتابِ الہامی یا غیر الہامی میں نہیں پائے جاتے۔ اب اس سے بڑھ کر اور کون سی ضرورت قرآن اور الہام کے لیے ہو گی۔

سوال: ہم نے انجیلِ عربی کا ایک پرانا نسخہ بچشم خود دیکھا ہے کہ اس میں ہر انجیل کی ابتداء میں اس بسم اللہ سے اچھی بسم اللہ لکھ رکھی ہے اور اسی طرح پارسیوں کی دساتیر میں ہر نامہ کے اول ایک اسی قسم کی بسم اللہ لکھ رکھی ہے غالباً نبی علیہ السلام نے یہ وہاں سے لے کر اپنے قرآن میں داخل کر دی ہو گی اور اسی طرح بہت سے مضامین قرآن مجید کے کتبِ عہدِ عتیق وعہدِ جدید ودساتیر وغیرہ سے ملتے ہیں چنانچہ ایک پادری نے ایک کتاب عدمِ ضرورتِ قرآن لکھ کر یہ بات خوب ثابت کر دی ہے کہ نبی علیہ السلام نے یہ مضامین اور الہامی کتابوں سے لے کر اپنی کتاب بنائی ہے۔ پس جب یہ ہے تو پھر قرآن نازل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

جواب: اس سوال سے تو اور بھی رسالت مآب ﷺ کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ کس لیے کہ جس قدر انجیل کے نسخے صحیح کر کے پادریوں نے لندن اور فرانس اور دیگر بلاد میں چھپوائے ہیں ان میں اس بسم اللہ کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ البتہ اس عربی انجیل میں جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں ہم نے بھی وہ بسم اللہ دیکھی ہے کہ جس کی یہ عبارت ہے۔ ''باسم الاب والابن والروح القدس''۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس انجیلی نے چونکہ عربی داں تھا قرآن خواں تھا تقلیداً یہ بسم اللہ بنا کر لکھی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ غیر لوگوں کے دلوں میں بھی

کلامِ الٰہی کی خوبی بس گئی اور انہوں نے چاہا کہ ہماری کتابوں میں بھی یہ ہو تو بہت خوب ہو چنانچہ بخوفِ ثبوتِ سرقہ بجنسہٖ اصل کلامِ الٰہی تو نہ لکھا اور اسی طرز پر کچھ الٹ پلٹ کر لکھ دیا۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ عمر بھر بھی کبھی ایران میں تشریف نہیں لے گئے نہ کسی مجوسیوں کے مدرسہ میں تعلیم پائی نہ کوئی مجوسی کتب خانہ یا مدرسہ عرب میں تھا۔ بلکہ یہودی اور عیسائی مذہب کا تو کچھ نہ کچھ پتا بھی تھا۔ پارسیوں کے مذہب سے تو وہ لوگ محض نا آشنا تھے۔ پھر آنحضرت علیہ السلام ان کی کتاب میں سے سیکھنے کیونکر گئے۔ اور اس زمانہ میں یہ کتابیں خود ان ہی لوگوں میں پوری شائع نہ تھیں جس طرح کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں کتاب کی قلت تھی ان کے ہاں بھی اور جو کوئی کتاب تھی تو اس کو بڑے متبرک لوگوں کے پاس مقدس جگہ میں رکھتے اور غیر قوموں سے از حد چھپاتے تھے۔ یہ چھاپا نہ تھا کہ جس کی بدولت ہر کتاب گلی کوچوں میں عام لوگوں تک دست گرداں پھرتی ہے۔ اور یہ گمان کہ عجمی غلام سلمان فارسی رضی اللہ عنہ وغیرہ آپ کے پاس رہتے تھے ان سے سیکھ کر لکھی ہو گی محض خیالِ خام ہے۔ کیونکہ اول تو یہ غلام کچھ اپنے مذہب کے عالم نہ تھے کہ انہوں نے تعلیم کر دیا ہو گا۔ دوم یہ تھا تو پھر ان غلاموں پر کیا مصیبت پڑی تھی کہ ایسے شخص کے ہاتھ پر اس صدق سے ایمان لائے کہ ہر چند ان کے مالکوں نے اس بات پر ان پر کوڑے برسائے، دھوپ میں چومکھا کیا، بھوک پیاس کی تکلیف دے کر سخت مشقت میں گرفتار کیا مگر وہ پھر بھی حضرت کے دین سے نہ پھرے۔ سو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایرانیوں نے مسلمانوں سے سن کر اس کلام کو اڑا لیا اور بدل کر اپنی کتاب میں لکھ لیا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اسلام سے پیشتر کے کسی نسخہ میں یہ نہیں۔ ولو فرضاً ہو بھی تو اس میں یہ خوبی کہاں؟ کیونکہ ''بنامِ ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان دادگر'' میں لفظ مکرر ہے اور یہ بھی ظاہر کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جس قدر محرف کتابیں اور اوہام آمیز مذاہب یا لوگوں کی رسم وعادات تھیں سب غلط اور ناحق نہ تھے کیونکہ جھوٹی باتوں میں بعض سچی باتیں اور برے لوگوں میں بعض بھلی عادتیں بھی ہوتی ہیں۔ پس اس نبی کا کہ جو تمام جہان کی اصلاح وفلاح کا بیڑہ اٹھاوے یہ کام نہیں کہ وہ حق وناحق سب کو مٹا کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناوے جیسا کہ خود پسند کیا کرتے ہیں بلکہ ہر مذہب اور ہر کتاب میں اور ہر رسم ورواج میں جو کچھ حق اور فطرت کے موافق ہو اس کو قائم رکھے اور غلط کو مٹاوے نہ یہ کہ سب کا انکار کرے اور نہ یہ کہ سب کو تسلیم کرے۔ پس جب یہ بات ہر دانشمند حق گو کے نزدیک فرض ہے تو اب ضرور ہے کہ اس مجموعۂ تعلیمِ حقانی کے بعض اجزاء ضرور کسی مذہب وملت کے مطابق ہوں گے اور بعض اجزاء بعض دیگر کے مطابق ہوں گے اور اسی طرح بعض عادات واطوار ورسوم کا حال ہے۔ پادری صاحب آپ کے عہد نامہ جدید میں کون سی نئی بات ہے کہ جو اور تاریخوں اور کتبِ اخلاق یا عہدِ عتیق میں نہیں۔ پھر اس فرضی انجیل کو کتابِ الٰہی بنانے کی کیا ضرورت؟ براہِ مہربانی اس کو بھی بیان کر دیجئے۔ یہ آپ کی کتاب کا اجمالی جواب ہے اور تفصیل بشرطِ فرصت پھر گوش گزار کروں گا۔

دفعہ ۳: جو شخص کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے حقوق وعہد کو قائم رکھتا ہے تو یا اس سے خوف اور مضرت کا ڈر ہوتا ہے یا کسی انعام واکرام وبھلائی کی امید ہوتی ہے۔ سو یہ دونوں چیزیں تو وہ ہیں کہ جن پر عموماً طاعت کا مدار ہے (دیکھئے عام لوگ بادشاہ سے ڈر کر اور ملازمین اکرام وانعام کی طمع دل میں دھر کر اس کی اطاعت کرتے ہیں اور جہاں یہ دونوں باتیں ہوتی ہیں تو وہاں طاعت کے ساتھ محبت بھی ہوتی ہے اور جو طاعت کہ محبت سے مرکب ہوتی ہے وہ طاعتِ صرف سے بہتر ہوتی ہے اور اسی لیے ایمان کو امید وبیم دونوں کے اندر رکھا ہے کیونکہ محض خوف سے نفرت اور محض امید سے جرأت ہو جاتی ہے) اور بعض خاص لوگ کہ جن کا عشق محویت کے درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ بلا لحاظِ امید وبیم اس سے محبتِ ذاتی رکھتے اور طاعت کرتے ہیں وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ اور نبی کو (کہ خدا اور بندوں میں واسطہ ہے) ضرور ہے کہ بندوں کو اس کے جلال سے ڈرائے اور اس کی محبت دل میں پیدا کر کے طاعت پر آمادہ کرے کیونکہ تمام دنیا وآخرت کی مصلحتیں اسی پر موقوف ہیں۔ پس اس لیے اپنے ابتداءِ کلام میں وہ رعایت رکھی کہ جس سے یہ مطلب نہایت خوبی وخوش اسلوبی سے ادا ہو گیا۔ کیونکہ لفظ اللہ زبانِ عرب میں

اس شہنشاہِ حقیقی اور پروردگارِ عالم کا نام ہے کہ جس کی ہیبت سے پہاڑ لرزتے ہیں۔ اس نام کے ذکر کرنے سے اس کی ہیبت ظاہر کرنا اور خوف دلانا مقصود ہے اور رحمٰن اور رحیم سے امید دلانا اور محبت پیدا کرنا مطلوب ہے تاکہ لوگ اس سے ڈریں اور رحمت کے امیدوار رہ کر طاعت کریں اور خالص لوگوں کو تو لفظ اللہ ہی سے بلالحاظِ رحمت وغضب محبتِ ذاتی پر تنبہ ہو جاتا ہے جس طرح بسم اللہ میں سیر الی اللہ ہے۔ اسی طرح الرحمن الرحیم میں سیر من اللہ ہے۔ یعنی اسم چونکہ علامات وآثار میں سے ہے۔ پس عارف اس نشان سے معبودِ حقیقی تک جا پہنچا ہے اور پھر وہاں سے نعماء وآلاء کی طرف توجہ کر کے مخلوق کی جانب آ جاتا ہے اور چونکہ امید سے خوف زیادہ تر اس امر میں مؤثر ہے۔ اس لیے لفظ اللہ کو مقدم کیا۔ اور یوں بھی علم اور بالخصوص مقامِ تبرک کا مقتضٰی یہ ہے کہ لفظ اللہ جس طرح ذات میں مقدم ہے ذکر میں بھی مقدم رہے اور بعد لفظ رحمٰن کے رحیم اس لیے ذکر ہوا کہ عالم پر جو رحمت ہوتی ہے اس کی دو شاخ ہیں: اول یہ کہ ہر چیز کے لیے اس کی تمام حاجات وضروریات کو پورا کیا جائے۔ دوم اس کو مخالف اور منافی چیزوں سے بچایا جاوے۔ اول شاخ چونکہ نہایت بڑی اور اہم ہے اس کے لیے لفظ رحمٰن کہ جس میں رحمت زیادہ ہے مناسب ہوا اور دوسری چھوٹی شاخ کے لیے لفظ رحیم بولا گیا اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دنیا کے بادشاہوں سے بڑی چیزوں کا سوال کیا جاتا ہے اگر ان سے کوئی کمتر درجہ کی چیز مانگتا ہے تو خفا ہوتے ہیں بخلاف خدا تعالیٰ کے کہ اس سے چھوٹی بڑی ہر چیز کا سوال کیا جاتا ہے۔ پس اس رمز کے لیے رحمٰن اور رحیم دو لفظ بولے تاکہ دونوں باتوں پر دلالت کریں۔ رحمٰن بڑی باتوں پر۔ رحیم چھوٹی باتوں پر۔ اور ایک پلہ میں لفظ اللہ ہے کہ جس سے ہیبت دل پر طاری ہوتی ہے اور دوسرے پلے میں دو لفظ تسلی بخش یکے بعد دیگرے سنا کر مطمئن بنایا تاکہ جس قدر اس کا خوف دل میں پیدا ہو اتنی ہی محبت بھی جلوہ گر ہو کیونکہ افراط وتفریط مصلحتِ نبوت ومنصبِ رسالت سے بعید ہے۔ عیسائیوں نے الوہیتِ مسیح وکفارہ ثابت کرنے کے لیے اول تو وہ خوف زائد از حد دلایا کہ خدا گناہ کو توبہ سے معاف ہی نہیں کر سکتا اور وہ جو آدم علیہ السلام نے گناہ کیا تھا تمام بنی آدم پر پشت بہ پشت چلا آتا تھا۔ (حالانکہ کسی کا گناہ خدا کی عدالت تو کیا بندوں کی عدالت میں بھی دوسرے شخص پر لازم نہیں ہوتا) اس کی سزا دینی خدا کو از حد ضرور تھی۔ اس لیے خود دنیا میں بشکل حضرت مسیح نو مہینے رحم میں خون کھا کر مقامِ مخصوص سے پیدا ہوا اور تمام دنیا کے گناہوں کی (دھوبی کی لادی کی طرح) گٹھری باندھ کر اپنی پشت پر لاد کر لے گیا اور تین روز جہنم میں رہا اور ملعون ہوا حالانکہ یہ عقیدہ چند وجوہ سے رد ہے (۱) اول تو خدا قادر اور رحیم وغفور ہے۔ توبہ سے گناہ معاف کرنا اس کا قدیم دستور ہے۔

(۲) عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پیشتر جس قدر انبیاء اور ان کے فرماں بردار ہیں سب مسیح کے پیدا ہونے سے پہلے ہی نجات یافتہ ہیں بلکہ مسیح اور حواریوں کے کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے پھر اگر کفارہ ضرور تھا تو ان کی نجات کیوں ہوئی اور ان کے گناہِ موروثی کیوں معاف ہوئے۔

(۳) خود حضرت مسیح اور یوحنا (یحییٰ) علیہما السلام لوگوں کو توبہ اور استغفار[1] کرنے کا حکم دیتے تھے بلکہ خود مسیح نے ایک شخص کے گناہ[2] معاف کر دیے پس اگر کفارۂ مسیح پر نجاتِ کل بنی آدم موقوف تھی تو استغفار اور توبہ اور یہ گناہ معاف کرنا کیونکر ہوا؟ اور پھر امید اور رجاء کا یہاں تک دامن فراخ کیا کہ تثلیث اور کفارہ اور الوہیتِ مسیح پر ایمان لانے والے کے حق میں پولوس نے ہر حرام اور ناپاک[3] چیزوں کو پاک کر دیا

[1] انجیل متی باب سوم ۱۲۔
[2] انجیل لوقا باب ۵ آیت (۲۰) اور (۲۴)۔
[3] پولوس کا وہ نامہ جو طیطس کو لکھا ہے اس کے اول باب ۱۵ ودرس میں ہے۔

اور شریعت پر چلنے والے کو لعنتی[1] قرار دے کر مطلق العنان اور سانڈ بنا دیا حالانکہ حضرت مسیح فرما چکے ہیں کہ تورات[2] کا ایک شوشہ نہیں مٹے گا اور خود تورات میں شریعت کے تارک پر سخت تہدید ہے۔ تورات تو کیا اس کے احکامِ عشرہ کو بھی مٹا دیا۔ اس افراط وتفریط کا کیا ٹھکانا ہے۔ منجملہ اور ضروریاتِ نزولِ قرآن کے ایک یہ بھی ضرورت تھی کہ اس سخت گمراہی کو اٹھاوے۔ فرمائیے پادری صاحب اس سخت ضرورت کو سوائے قرآن کے اور کس کتابِ آسمانی نے پورا کیا۔ منجملہ بیشمار معجزات کے آنحضرت علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ کلامِ حکمت التیام بھی ہے کہ جس میں ہزاروں خوبیاں ہیں اور جس کا مثل بنانا پڑھے اور ان پڑھے سے ممکن نہیں۔

فضائل

جن کلمات کا عالمِ برزخ یا عالمِ مثالی میں کوئی نہ کوئی ایسا اثر خاص ہوتا ہے کہ جس طرح عالمِ عنصری میں دواؤں کا اثر محسوس ہوتا ہے منجملہ ان کے یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی ہے جس سے برکت کا نازل ہونا اور شیطان خبیث کا اثر نہ ہونا وغیرہ فوائد علاوہ اس روحانی فائدے کے ہیں کہ جس کی شرح ہم ابھی کر آئے ہیں۔ اور ان فوائد کا سر تو ہم کسی موقع پر بیان کریں گے مگر اب بعض فوائد جو مشاہدۂ ثقات میں آئے ہیں ذکر کرتا ہوں۔ ازان جملہ یہ ہے جو ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایک شخص نے بغیر بسم اللہ پڑھے کھانا کھایا۔ پس جب ایک لقمہ باقی رہ گیا تو بِسْمِ اللّٰهِ مِنْ اَوَّلِهٖ وَاٰخِرِهٖ کہہ کر اس کو منہ میں رکھ لیا۔ اس بات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسی آ گئی۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ شیطان کھاتا تھا جب اس نے بسم اللہ پڑھی تو شیطان نے جو کچھ کھایا تھا کھڑے ہو کر قے کر دیا اور مسلم نے بھی روایت کیا ہے کہ جس کھانے پر بسم اللہ نہیں پڑھی جاتی اس میں شیطان کا حصہ ہو جاتا ہے۔ ازان جملہ وہ ہے کہ جو ترمذی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے کہ جب بیت الخلاء میں جا کر کوئی شخص بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کے ستر اور جنوں کی آنکھوں کے بیچ میں یہ کلام پردہ ہو جاتا ہے۔ گو یہ احادیث خبرِ احاد ہیں اور بالخصوص اس اخیر حدیث کے سلسلہ میں ترمذی نے کلام بھی کیا ہے اور بعض علماء نے ان کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ دراصل شیطان یا جن یا ہمزاد یا جو کہو ایک ایسی چیز مخلوقِ الٰہی میں سے ہے کہ جو محسوس نہیں ہوتی اور انسان کے اکثر امور میں شریک ہوتی اور اس کی نقل کرتی ہے۔ جس کا صدہا لوگوں کو مشاہدہ ہوا ہے چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک بار میری ملاقات کو ایک دوست آیا میں نے اس کو کھانا دیا وہ کھانے لگا کہ اس کے ہاتھ سے روٹی کا ایک ٹکڑا چھوٹ کر خلافِ عادت دور تک اس طرح لڑھکتا ہوا چلا گیا کہ جس سے سب حاضرینِ جلسہ کو تعجب ہوا۔ پھر اگلے روز محلّہ میں ایک شخص کے سر پر وہ خبیث آ کر یوں بولا کہ فلاں جگہ ہم نے فلاں شخص سے کل ایک روٹی کا ٹکڑا چھینا تھا مگر اس نے ہم سے لے ہی لیا ہم کو نہ دیا اور اسی طرح کی بیشمار حکایاتِ صادقہ ہیں۔ پس اب یہ کیا تعجب ہے کہ اس قوم جن کو ذکر الٰہی سے ایک جبلی نفرت ہو اور اس کی تاثیرِ ملکیت اس کو سخت ایذا پہنچاتی ہو کہ جس سے وہ لوگ ہٹ جاتے ہوں۔

شبہ : حضرت سلامت یہ تو پرانے خیالات اور فاسد توہمات ہیں کہ جن کو آج کل اہلِ یورپ بالخصوص نئی روشنی والے اور ان کے مقلد محض لغو سمجھتے اور ان پر ہنستے ہیں اور اسی طرح عیسائی بھی ان باتوں کو نہیں مانتے۔ الغرض روشن دماغ اور تربیت یافتہ لوگ قائل نہیں۔

[1] پولوس کے نامہ گلتیون کا ۳ باب اور اس میں مسیح علیہ السلام کو ملعون بھی لکھا ہے ۱۲ منہ
[2] یہ خیال مت کرو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے آیا ہوں میں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان وزمین مل نہ جاوے تورات کا ایک نقطہ یا شوشہ ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔ پس جو کوئی ان حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھاوے آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلاوے گا۔ انجیل متی باب ۵ درس ۱۷ تا ۲۱)۔ ۱۲ منہ

جواب : مہربان اس انکارِ بلا دلیل کا تو علاج ہی نہیں۔ اہلِ یورپ کا کیا کہنا ہے وہ تو کل غیر محسوس چیزوں کے منکر ہیں۔ حتیٰ کہ خداتعالیٰ کا وجود بھی نہیں مانتے۔ جرمن اور فرانس کے ملحدوں بولنجر وغیرہ کی کتابیں دیکھئے وہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ و تورات وانجیل سب الہام کے قصہ ہی کو لغو سمجھتے ہیں اور پھر ہزار ہا اہلِ یورپ روحانیات کے بلانے اور ان سے باتیں کرادینے کے بھی قائل ہیں۔ چنانچہ لندن میں ایک کمیٹی بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتی ہے جس کے ممبر ہندوستان میں بھی موجود ہیں اور عیسائیوں کی اناجیل میں جب شیطان اور دیو اور ناپاک روحوں کا نکالنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے تو پھر اس قوم کا انکارِ اجنہ بلا دلیل چہ معنی دارد؟ اور جب دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے یہ قوم ثابت ہو چکی تو پھر اس کے افعالِ ناشائستہ اور کلامِ الٰہی کے اثر کا انکار اور بھی طرفہ ہے اگر اسی کا نام روشن دماغی ہے تو اس روشنیٔ ظلمت مآب کے کیا کہنے ہیں۔

ازاں جملہ وہ قصہ ہے جس کو امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مقابل لوگوں نے کہا کہ تم جو اسلام کے مدعی ہو تو کوئی کرامت تو دکھاؤ تاکہ تمہارے دین کی صداقت معلوم ہو اور اس زہرِ قاتل کی شیشی کو پی جائیے۔ اگر کچھ اثر نہ کیا تو یہ دینِ حق ہے۔ چنانچہ خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ سے وہ زہر لے کر ان ہی کے روبرو بسم اللہ کہہ کر پی لیا اور پھر وہیں کھڑے رہے کچھ بھی اثر نہ ہوا اور اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں۔

سوال : بسا اوقات ہم بسم اللہ پڑھتے ہیں مگر ہم کو اس قسم کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی۔

جواب : خواہ دوا ہو خواہ کلام ہو اس کی تاثیر کے لیے دو بات ضرور ہیں۔ اجتماعِ شروط ارتفاعِ موانع۔ دیکھئے تریاق کے اثر میں کسی دانشمند کو شبہ نہیں مگر جب اس کی ایک شرط بھی فوت ہو جاتی یا کوئی مانع حائل ہو جاتا ہے پھر تاثیر نہیں کرتا۔ اسی طرح خلوصِ نیت وصدقِ اعتقاد و رابطۂ الٰہی وغیرہ ان باتوں کے لیے شروط ہیں اور ریاکاری اور خیالاتِ فاسدہ وتوہماتِ شیطانی ان چیزوں کے لیے موانع ہیں۔ اب کلام کو یہیں تمام کر کے باقی الحمد کی تفسیر لکھتا ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ
الدِّيْنِ ۭ

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو کل جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے جو نہایت رحم کرنے والا جزا کے دن کا مالک ہے

ترکیب : اَلْحَمْدُ مبتدا لِلّٰهِ ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر ہوئی۔ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس کی صفت اول (گو یہ نکرہ ہے مگر معنی کے لحاظ سے معرفہ ہے کیونکہ رب العالمین سوائے خدا کے اور کسی پر صادق نہیں آتا) الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ صفت وموصوف اس کی صفت دوم۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مضاف ومضاف الیہ مل کر اس کی صفت سوم۔ یہ موصوف اپنی تینوں صفات سے مل کر ثابت کے متعلق ہو کر مبتدا کی خبر ہوئی اور خبر و مبتدا مل کر جملہ اسمیہ ہوا۔ گو مقام انشاء حمد جملہ فعلیہ چاہتا ہے مگر چونکہ خبر حمد بھی انشاء حمد ہے۔ دوام وثبات کے لیے جملہ اسمیہ لایا گیا۔

تفسیر : ان تینوں آیتوں میں خدائے تعالیٰ بہت سی حکمتیں رعایت رکھ کر اس تقرب کو بتلاتا ہے کہ جس کی طرف بِسْمِ اللّٰهِ میں اشارہ تھا۔ بسم اللہ میں لفظ اللہ سے ہیبت اور رحمٰن ورحیم سے رغبت دلا کر اپنی ذاتِ پاک کی طرف متوجہ ہونا مجملاً بتلایا تھا لیکن اس وصول اور تقرب کا کوئی طریق صراحۃً مذکور نہ ہوا تھا کہ وہ کیونکر اس کی طرف متوجہ ہو اور کونسی روحانی سڑک پر چل کر شہرِ مقصود تک پہنچے۔ آیا کسی درخت میں الٹا لٹکے یا دنیا کے تمام طیبات چھوڑ کر لنگر لنگوٹا باندھ کر کسی مندر یا دریا یا تالاب کے کنارے بیٹھا کرے یا کسی گرجا میں باجا بجا کر کوئی راگ یا بھجن گایا کرے یا پیالہ لے کر گھر گھر بھیک مانگتا پھرے یا کوئی اور جتن کرے جس سے اس محبوبِ عالم، معبودِ حقیقی کا وصال اور جمالِ باکمال نصیب

ہو تاکہ کمالِ حقیقی اور سعادتِ عظمیٰ ملے۔ سو اس وادیٔ پر خار اور اس بحرِ ذخار میں سیکڑوں بھٹک کر مرگئے اور بڑے بڑے حکیموں اور فلسفیوں کی کشتیاں غرق ہوگئیں

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نشد تختۂ برکنار

اس لیے رحمٰن ورحیم نے اپنی رحمت سے الہام کے ذریعہ سے اس مشکل کو حل کر دیا اور اپنی طرف آنے کا رستہ سہل کر دیا کہ اے طالبانِ راہِ نجات وائے جویندگان آبِ حیات تم اپنی زبان سے یوں کہو ان الفاظ کے رنگِ معانی سے اپنی روح کو رنگین بناؤ کیونکہ جب تم ان الفاظ کے معنی کو خوب دل میں جماؤ اور خیال میں لاؤ گے تو تمہاری روح کی تمام کثافت اور ظلمت و بہیمیت دور ہو جائے گی۔ پس جب آئینہ کا زنگ دور ہوا تو اسی وقت آفتابِ جہانتاب کا عکس پڑ کر پرنور ہوا۔

تفصیل : اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان دراصل روح ہے کہ جس کو نفسِ ناطقہ بھی کہتے ہیں اور جو اس جسم سے پیشتر تھی اور اس کی مفارقت کے بعد بھی رہے گی اور یہ جسمِ خاکی کمالات حاصل کرنے کے لیے اس کا آلہ یا مرکب ہے جس طرح آئینہ میں ذاتی جوہر ظاہر کرنے کے لیے راکھ یا کھریا لگا دیتے ہیں تاکہ اس کے بعد رگڑنے سے اس کا جوہرِ ذاتی نکل آئے اور یہ خوب صاف وشفاف ہو کر چمکنے دمکنے لگے۔ اسی طرح حضرتِ روح کو اس جسم کے ساتھ اسی غرض سے پابستہ کیا ہے۔ پس اصل وبالذات روح کی صفائی مقصود ہے تاکہ یہ اس مبدءِ[1] نور سے تشبہ حاصل کر کے اس سے جا ملے اور اسی کو سعادتِ عظمیٰ اور اسی کو کمالِ اصلی اور اسی کو اتمامِ سلوک کہتے ہیں۔ اس سلوک کو جو لوگ اپنی عقل سے تمام کرتے ہیں تو ان کو وہم اور تخیلاتِ فاسدہ کے راہزن (کہ جو اس جسم اور اس کی بہیمیت سے پیدا ہوتے ہیں) مقصود تک نہیں پہنچنے دیتے بلکہ وہ ان توہمات وتخیلات کی وجہ سے مخلوق پرستی یا بنیادِ جسم کے گرانے اور اس وسیلے سے روح کو چمکانے کے درپے ہوتے ہیں جیسا کہ درخت میں الٹا لٹکنا اور جو انبیاء علیہم السلام اور الہام کی روشنی میں اس سیدھی سڑک پر چلتے ہیں کہ جس کو خداتعالیٰ نے قائم کیا وہ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ۔ کہ بعض رستے سیدھے خدا تک پہنچتے ہیں اور بعض ٹیڑھے ہیں اور خود اسی سورۃ میں آگے چل کر یہ تعلیم کرتا ہے کہ یوں کہو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الخ کہ ہم کو وہ سیدھی راہ دکھلا کہ جو انبیاء کی راہ ہے۔'' الغرض یہ متفق علیہ ہے کہ جب تک روح کو صفائی نہیں اس تک رسائی نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ روح میں کئی طور سے تاریکی پیدا ہوتی ہے۔

(۱) یہ کہ یا تو سرے سے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کے جمیع صفاتِ قدرت وعظمت کا قائل ہی نہ ہو اور تمام مخلوقات یا بعض چیزوں کی ہستی کو از خود جانے۔ جیسا کہ دہریہ[2] اور طبیعیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ چیزیں از خود طبیعتِ[3] عناصر سے پیدا ہو جاتی ہیں اور جب

[1] اس لیے کہ جب تک طرفین میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی اس وقت تک تقرب نہیں ہوتا۔ پس وہ نورِ محض اور لطیف یہ ظلمانی اور کثیف باہم کیونکر ارتباط ہو۔ پس جب انسان اپنی روح کو منور کرتا ہے اور ملکیت غالب ہو جاتی ہے تو ظلمانیت اور تاریکیت ہیولانیت دور ہو جاتی ہے اور انوارِ عالمِ قدس اس پر اس طرح پڑنے لگتے ہیں کہ جس طرح آئینہ میں عکسِ آفتاب۔ پھر یہ شخص بارگاہِ قدس اور انجمنِ انس میں باریاب اور جمالِ باکمال سے فیض یاب ہوتا ہے۔ پس اس طریق کو خدا نے اس سورہ میں نہایت لطف کے ساتھ بیان فرمایا۔ ۱۲ منہ

[2] ہنود کا فرقہ جدید آریہ بھی روحوں اور مادہ وغیرہ کی ہستی کو از خود اور ان کو خدا کا غیر مخلوق کہتا ہے۔

[3] اس کو [illegible] میں نیچر کہتے ہیں پس وہ جو آجکل اہلِ اسلام میں سے ایک فرقہ نیچریہ کہلاتا ہے وہ گو برائے نام مسلمان ہیں مگر درحقیقت طبیعیہ ہیں۔ چنانچہ اس فرقہ [illegible] نے جو ایک تفسیر لکھی ہے اس میں اور تہذیب الاخلاق اخبار میں ان کے عقائد ہمارے اس قول کے شاہدِ عدل ہیں۔ ۱۲ منہ

تک۔ طبیعت اپنے تصرفات پر قادر رہتی ہے یہ زندہ رہتے ہیں اور جب حرارتِ غریزیہ تحلیل ہو جاتی ہے تو فنا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سب کاروبار گردشِ فلک اور طبائعِ اجسام سے ہوتے ہیں نہ زمانے کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ یہ رہٹ ہمیشہ سے یوں ہی پھرتا ہے اور یوں ہی پھرتا رہے گا۔ چنانچہ اس خراب عقیدہ کے لوگ پہلے بھی بہت تھے اور اب بھی ہزاروں ہیں۔

(۲) ؎ : اتعالیٰ کو خالق تو جانے مگر بعد پیدا ہونے کے خلق کو اس کے اسباب و شروط کی وجہ سے خالق سے مستغنی جانے جیسا کہ بعض آریہ سماج کا عقیدہ ہے کہ بعد مخلوق ہونے کے پھر اس کی طرف کچھ حاجت باقی نہیں رہتی۔

(۳) یہ کہ اس مجموعۂ عالم میں سے کسی جزو کو اس کے کمالاتِ ذات و وجود میں مستقل جانے اور پھر اس کو بھی اختیاراتِ الوہیت میں شریک سمجھ کر اس سے بھی واسطۂ عبودیت رکھے جیسا کہ قدمائے یونان و فارس اور زمانۂ جاہلیت کے عرب اور ہندو آگ اور پانی ہوا اور آفتاب و ماہتاب اور تاروں اور غیر مرئی ارواح کی نسبت عقیدہ رکھتے تھے۔ بلکہ رکھتے ہیں (اس تاریکیِ روحانی کو زبانِ الہام میں شرک کہتے ہیں)

(۴) یہ ہے کہ آدمی بعض حاجات اور کاروبار کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے (کہ جن کو رحمتِ الٰہی مصلحتِ ملک یا شہر یا اس شخص سے خلاف جانتی ہے) اس کو سراسر پُر غضب اور بخیل اور ہلا کو جان کر اس سے محبت نہ کی جائے اور دل میں نفرت پیدا ہو جائے جس سے اس کے ابرار اور اس کے ہادی لوگوں سے دشمنی کا برتاؤ کیا جائے جیسا کہ بعض یہود نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور خدا کی دشمنی پر کمر باندھی۔

(۵) یہ کہ گو خدا اور انبیاء کا اقرار ہو مگر قیامت اور وہاں کی جزا و سزا کا انکار ہو جیسا کہ یہود میں فرقہ صدوقیہ کا عقیدہ تھا اور اب بھی صدہا بے دینوں اور دیگر بعض مذاہب کے لوگوں کا عقیدۂ فاسد ہے بلکہ وہ دارومدار جزا و سزا کا اسی عالم پر تناسخ کے وسیلہ سے (جیسا کہ ہنود اور مجوس کا عقیدہ ہے) یا مال و اولاد، تندرستی و بیماری میں محرومی و برخورداری کی نسبت جانتے ہیں جیسا کہ بعض جہلا کا عقیدہ ہے۔

(۶) یہ کہ قیامت اور جزا و سزا کا تو اعتقاد ہو مگر اپنے اوہامِ باطلہ اور خیالاتِ باطلہ سے بعض شخصوں کی نسبت یہ عقیدہ ہو کہ وہ بھی وہاں جس طرح چاہیں گے اپنے معتقدوں اور پرستش کرنے والوں کو فائز المرام کریں گے اور خدائے تعالیٰ کے عذاب و عقاب سے مانع آویں گے۔ اس لیے خدا کے ساتھ نذر و نیاز، استمداد و پرستش میں ان کو بھی شریک کرتے ہیں اور ان کو بھی خدا یا خدا کا جزو یا شریک و سہیم جانتے ہیں جیسا کہ نصاریٰ حضرت مسیح (عیسیٰ) علیہ السلام کو کفارہ سمجھ کر بالکل مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور ان کو خدا اور جزءِ خدا سمجھتے ہیں اور اسی طرح اور بھی صدہا جہلا ہیں جو اپنے بزرگوں کو **مالک و مختار** جانتے ہیں۔

سوال: اہلِ اسلام بھی تو اپنے نبی علیہ السلام کو شفیعِ روزِ محشر جانتے ہیں۔

جواب: شفاعت تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ رحیم ہے اپنے نبی علیہ السلام کی معرفت رحمت ظاہر کرے گا اور اپنے وعدہ کو پورا فرمائے گا۔ نہ یہ کہ آنحضرت علیہ السلام خدا کے شریک و سہیم ہو کر اس کے عذاب کو دفع کریں گے اور خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اس کے معتوب و مغضوب کو جنت میں لے جائیں گے۔ یہ کسی اہلِ اسلام کا عقیدہ نہیں۔ بلکہ جو کچھ آپ سے سرزد ہوگا بمرضیِ الٰہی ہوگا۔

پس یہ چھ طور ان روحانی تاریکیوں کے اصول ہیں کہ جو قربِ خدا سے مانع ہیں اور یہ قرب سے محروم رہنا آخرت میں دوزخ اور طوق و زنجیر وغیرہ چیزوں کی صورت میں ظاہر ہو کر جہنم ہو جائے گا۔ بلکہ ہو چکا اور طرح طرح کی سختیاں دکھائے گا۔ کیونکہ روح کی راحت (کہ جو بشکلِ جنت ظہور کرے گی بلکہ کر چکی) یہ ہے کہ اس کے مرکزِ اصلی کی طرف پہنچنے میں کوئی چیز حائل نہ ہو جائے۔ دیکھئے دنیا میں جب کوئی چیز کسی چیز کے حیّزِ طبعی یا مرکزِ اصلی کے بیچ میں مانع اور عائق ہو جاتی ہے تو وہ چیز اپنے حیّز اور مرکزِ اصلی کی طرف جانے میں کیسی پھڑ پھڑاتی ہے اور یہ پھڑ پھڑانا اور کشاکشی کے صدمات اٹھانا اس کے لیے جہنم ہے (علیٰ قدرِ مراتبہ) باقی ان تاریکیوں کی فروعات۔ سو وہ بے شمار اور ہزار در ہزار ہیں ان کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان چھ طریقوں کی ظلمانیت کو عرفِ شرع میں کفر اور الحاد کہتے ہیں اور ساتواں طور تاریکیِ روحانی کا ایک اور ہے کہ جو اس جسم کے اعمال سے متعلق ہے یعنی جس طرح وہ چھ طور قوتِ نظریہ اعنی اعتقاد سے متعلق ہیں یہ قوتِ عملیہ سے علاقہ رکھتا ہے وہ یہ کہ انسان اپنی زبان سے وہ باتیں بولے اور ہاتھ پاؤں سے وہ کام کرے کہ جو نورِ فطرت کے خلاف ہوں جن کو عرفِ شرع میں حرام اور مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ کلماتِ کفر بکنا، گالی دینا، غیبت کرنا، جھوٹ بولنا، فحش کی باتیں منہ سے نکالنا، قتل کرنا، چوری کرنا، شراب پینا، لوٹ مار کرنا وغیرہ وغیرہ وہ افعال و اقوال کہ جن کی تاریکی روح پر اثر کرتی اور بہیمیت کو زور دیتی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس کی تشریح فرمادی ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ پھیل کر تمام دل کو گھیر لیتا ہے۔ رواہ البغوی۔ یہ سات چیزیں تمام گمراہیوں کی اصول ہیں کہ جن کے مٹانے کے لیے سلسلہ وار انبیاء علیہم السلام دنیا میں آیا کئے اور تمام کتبِ آسمانی بلکہ جمیع کتبِ حکمت و اخلاق انہی سات چیزوں کی شرح ہیں خود قرآن مجید میں بھی مختلف عنوان سے اس کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ایک ہی جملہ میں اس کو ختم کر دیا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ "کہ جس نے اپنی روح کو پاک اور منور کیا اس نے مراد پائی اور جس نے آلودہ کیا تو خسارت اٹھائی اور ایک جگہ اس نجات اور ابدی حیات کو اور لطف کے ساتھ بیان فرمایا فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ کہ جو چاہے اپنے رب کے پاس آنے کا ٹھکانا بنا لے" اور ایک جگہ اور خوبی سے اس کو ادا کر دیا يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ "کہ اے انسان تو اپنے رب کی طرف کھٹ کھٹ کر کے چلا آتا ہے آخر اس کے پاس پہنچے گا" وغیرہا من الآیات۔ پس جب انسان ان ساتوں کو چھوڑ ان کے برخلاف میں جو سات عمدہ اصول ہیں ان کی طرف منہ موڑتا ہے تو مقصودِ اصلی کو پہنچ جاتا ہے اور سعادتِ عظمیٰ پاتا ہے۔ پس ان آیات میں خدا تعالیٰ نے اپنے پاس آنے کا رستہ اس طرح سے بتایا کہ خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء ان صفات کے ساتھ کرو تا کہ روح تازہ ہو جائے اور جنابِ قدس تک گزر ہو جائے اب ہم یہ بات بتلاتے ہیں کہ کون سے جملہ سے کس بات کی طرف اشارہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (کہ تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہیں) میں اول بات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حمد اس ثناء و صفت کو کہتے ہیں کہ جو کسی شخص کے کمالاتِ ذاتیہ و اختیاریہ کی وجہ سے زبان پر آوے۔ جس طرح کہ **مدح** کمالاتِ غیر اختیاریہ پر ہوتی ہے اور حمد اختیاریہ پر۔ موتی کی صفائی اور کسی مکان وغیرہ غیر ذی عقل کی صفائی و زیبائی کو کہ جو بیان کریں گے تو اس کو مدح کہیں گے نہ حمد اور شکر کسی انعام و اکرام کی وجہ سے ہوتا ہے خواہ زبان سے ثناء و صفات کر دی جائے یا کوئی تعظیم کا کام کر دیا جائے یا دل ہی میں خوشنودی پیدا کی جائے۔ شکر اور حمد میں عموم و خصوص من وجہ ہے جو حمد کہ کسی انعام و اکرام کی وجہ سے ہو وہاں اس کو شکر بھی کہہ سکتے ہیں۔ پس جب بندہ نے دل سے یہ کہا اور صحیح اعتقاد کیا کہ تمام خوبیاں خدا کے لیے ہیں تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفاتِ کمالیہ کا اقرار پایا گیا دہریہ پن جاتا رہا اور جب کہا رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہ وہ تمام عالم کا پرورش کرنے والا ہے اس سے دوسری اور تیسری بات جاتی رہی کس لیے کہ **عالم** بروزن **فاعل** بالفتح اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس سے دوسری چیز کا علم حاصل ہو جاوے اور وہ خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے سوا ہر موجود مخلوق کو شامل ہے کیونکہ ان سے ان کے پیدا کرنے والے خدا تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ دیکھئے جب ہم کسی تخت یا مکان کو دیکھتے ہیں تو ہم کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ضرور اس کا بنانے والا کوئی بڑھئی اور معمار تھا کہ جس کے ہاتھ سے یہ بنے ہیں۔ اسی طرح مخلوقات کو غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ضرور کوئی قادرِ بیچون و بیچگون اس کو عدم سے ہستی میں لانے والا ہے۔ پھر اس عالم کے بے شمار انواع و اقسام ہیں: **عالمِ مجردات** یعنی وہ چیزیں کہ جو جسمِ عنصری اور جسمِ سماوی سے بری ہیں اور ہم کو بسببِ لطافت کے دکھائی نہیں دیتیں۔ (جس طرح کہ عالمِ عنصری میں ہوا لطافت سے دکھائی نہیں دیتیں جیسا کہ ملائکہ اور ارواح)۔ **عالمِ جسمانیات** پھر اس کی دو قسمیں ہیں۔ **عالمِ علویات** جیسا کہ آسمان اور آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور **عالمِ سفلیات** پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالمِ لطیفات یعنی وہ چیزیں کہ جو بسببِ لطافت کے دکھائی نہیں دیتیں جیسا کہ ہوا اور کرۂ آتش

ودیگر بسائط کہ جوعلومِ جدیدہ سے ثابت ہوئے ہیں اور وہ چیزیں جن کا مادہ صرف یہ لطیف عناصر ہیں یا یہ غالب ہیں جیسا کہ جن اور شیطان اور دیگر مخلوقاتِ الٰہی کہ جس کو ہم نہیں جانتے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ دوسرا عالمِ **کثیفات** پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عالمِ **مفردات** جیسا کہ پانی اور خاک۔ عالمِ **مرکبات** پھر اس کی چار قسمیں ہیں۔ عالمِ **کائناتِ جوّ** یعنی وہ چیزیں کہ جو زمین سے اوپر ہیں۔ جیسا کہ ابر اور اولے اور قوسِ قزح وغیرہ چیزیں۔ دوم عالمِ **جمادات** یعنی پہاڑ اور دیگر معدنیات چاندی، سونا، ہیرا، بلور وغیرہ سوم عالمِ **نباتات** یعنی درخت اور گھانس اور جڑی بوٹیاں۔ چہارم عالمِ **حیوانات**۔ یعنی انسان، گدھا، گھوڑا، درند، پرند، جاندار چیز خواہ بڑی ہو خواہ بحری۔ ان تینوں اخیر کو موالیدِ ثلاثہ کہتے ہیں۔ ان سب میں عالمِ انسان اشرف ہے بلکہ اپنے روحانی علاقہ سے تو ملائکہ سے بھی دو چار قدم آگے ہے۔ پس جب ان سب کو جمع کر کے خدا نے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہا تو کوئی چیز اس کی تربیت اور پرورش سے خالی نہ رہی اور تربیت یہ ہے کہ درجہ بدرجہ کسی چیز کو پورا کیا جاوے اور اس کے اس کمال تک کہ جو مقدر ہے پہنچایا جاوے اور عالمِ محسوسات میں تو آپ کو بھی صدہا بلکہ ہزارہا چیزوں کا درجہ بدرجہ پورا ہونا اور تربیت پانا مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے۔ سب سے اول اشرف المخلوقات انسان ہی کو دیکھئے کہ اول غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے پھر عورت کے پیٹ میں علقہ اور مضغہ بن کر پورا بچہ بنتا اور باہر آتا ہے اور پھر ایک ہی بار جوان اور قوی نہیں ہو جاتا بلکہ رفتہ رفتہ اس طرح سے کہ پہلے بیٹھنے لگتا ہے پھر گھٹنوں چلتا ہے پھر دیوار پکڑ کر پھر بڑھتے بڑھتے ڈاڑھی مونچھ آ کر قوی جوان ہو جاتا ہے اور پھر اسی طرح منزل بہ منزل بے اختیار گھٹتا جاتا ہے۔ اور یہی حال درخت کا ہے اور یہی حال سب چیزوں کا ہے۔ خواہ وہ ہم کو معلوم ہوں یا نہ ہوں۔

اب میں آپ کے روبرو ایک ایسی دلیل بیان کرتا ہوں کہ جس سے آپ کو تمام عالم کے مجموعہ کا حادث ہونا بخوبی معلوم ہو جائے۔ عالم یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کے سوا جو کچھ ہے یا جوہر ہے یعنی بذاتِ خود قائم جیسا کہ درخت و پتھر یا عرض کہ جو کسی اور میں ہو کر پایا جاتا ہے جیسا کہ رنگ سیاہی سفیدی کہ جو بغیر کسی جسم کے پائی نہیں جاتی اور ان میں سے ہر ایک حادث ہے اعنی پہلے معدوم تھا پھر موجود ہوا ہے اور جب عالم کے دونوں جزو حادث ہوئے تو مجموعہ عالم بھی حادث اور ہر حادث کے لیے ایک محدث یعنی پیدا کرنے والا ضرور ہے کس لیے کہ جب تمام عالم حادث ہوا تو قطعاً ضروری الوجود نہیں ورنہ عدم کو قبول کرنے کے کیا معنی۔ بلکہ وجود وعدم اس کی ترازو کے دونوں پلے مساوی ہیں پس کوئی مرجح یعنی اس وجودی پلہ کا جھکانے والا ضرور ہے اور وہ عالم سے الگ ہے اور عالم کے جمیع اوصاف وخصائص سے بھی اسی طرح مبائن ہے کہ جس طرح اپنی ذات میں مبائن ہے۔ اب رہا یہ ثبوت کہ کل اعراض حادث ہیں سو وہ یوں ہے کہ بعض کا حادث ہونا تو مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی چلی گئی، روشنی ہوگئی سبز پتا سفید ہو گیا اور بعض کا یوں کہ ہر عرض قابلِ عدم ہے قدیم نہیں اور جو قابلِ عدم ہے وہ حادث ہے اور کل جواہر کا حادث ہونا بھی ظاہر ہے۔ کس لیے کہ کوئی جوہر ایسا نہیں کہ جس پر کوئی نہ کوئی عرض سوار نہ ہو اور نہیں تو حرکت وسکون سے کوئی بھی خالی نہیں کیونکہ اگر دو آن تک ایک جگہ میں ہے تو ساکن ورنہ متحرک پس جو حوادث کا محل ہے وہ خود بھی حادث ہے ورنہ قدم حوادث لازم آوے گا۔ اس کے سوا اور صدہا دلائل اور براہین اس امر پر ہیں کہ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ پس جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تمام عالم حادث ہے تو اس میں بھی کوئی شک نہ رہا ہوگا کہ یہ ممکن ہے اور ممکن تو ہر وقت اپنی ذات وصفات میں واجب تعالیٰ کا دستِ نگر رہتا ہے یعنی ہر ساعت وہر لحہ ہر ہر بات میں فقیر کی طرح اس کی طرف جھولی پھیلائے رہتا ہے اور وہ رحمٰن ورحیم اس میں خزانۂ غیب سے وجودات اور صفات کے ٹکڑے ڈالتا رہتا ہے تاکہ ہر وقت اس کو اس سے ارتباط واحتیاج رہے اور ایکبارگی حاصل کر کے دعوائے استقلال نہ کرنے لگے اور خدائی کا دم نہ بھرنے لگے۔ اور اس احتیاجِ ہمہ وقت کے روا کرنے کو تربیت اور اس روا کرنے والے کو رب کہتے ہیں۔ اس عمدہ مطلب کو (کہ جس پر حکماء وعقلا دلائل وبراہین لانے میں بڑی سخت مشقت اٹھاتے ہیں) کس سہل طور سے ایک لفظ

رب العالمین میں بیان کر دیا کہ جس کو عالم وجاہل، حکیم وفلاسفر برابر سمجھتے ہیں اور جس کو اونٹ وبکری چرانے والے عرب کے بدو بھی سمجھ کر حظ اٹھاتے تھے کیونکہ تمام عالم میں اکثر چیزوں کا مربی ہونا تو مشاہدہ سے معلوم ہے اور باقی چیزوں کی نسبت عقل یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ جب وہ بھی ممکن ہیں تو پھر جس طرح ان کو ہر وقت احتیاج ہے ان کو بھی کوئی ترجیح کی وجہ معلوم نہیں پس اس لفظ رب العالمین سے چند امور ثابت ہوئے: (۱) خدا تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ کا اور اس کے تمام کمالیہ کا ثبوت کس لیے کہ اس عالمِ گوناگوں کی تربیت بغیر حیات، قدرت، علم، ارادہ، سمع، بصر، کلام، تکوین اور پھر رازقیت، رحمت، حلم وغیرہ کے نہیں ہو سکتی اور تمام حدوث اور نقصان کی باتوں سے بری ہونا۔ کیونکہ ممکن اور واجب اور رب اور مربوب میں تغائرِ ذاتی ہے۔ پس (۱) جہالت، (۲) عجز، (۳) حدوث، (۴) کھانے، (۵) پینے، (۶) سونے، (۷) چلنے، (۸) پھرنے سے وہ پاک ہے۔ اسی طرح (۹) جورو بنانے، (۱۰) بچہ جنانے اور (۱۱) مجسم ومشکل ہونے اور کسی مکانِ خاص میں اور زمانے میں پائے جانے سب سے پاک ہے کیونکہ یہ باتیں مربوب کا حصہ ہیں نہ رب کا۔

(۲) یہ کہ اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ سہیم نہ ہم جنس نہ ہم کفو نہ باپ نہ بیٹا۔ کس لیے کہ اب جو کوئی دوسرا ہوگا تو عالم میں داخل مخلوق ہوگا اور جبکہ وہ ایک عالم بلکہ کل عالموں کا رب ہے تو پھر اس کا شریک وسہیم کب ہے یہاں سے توحید کا کامل ثبوت ہو گیا۔

(۳) یہ کہ مخلوقات کو جس طرح اپنے خالق کی طرف ابتداءِ وجود میں احتیاج ہے۔ اسی طرح بعد وجود کے بھی ہر وقت ہر بات میں اسی کی دست نگر اور محتاج ہے۔ جیسا کہ لفظِ تربیت بآواز بلند کہہ رہا ہے، پس جو مستقل مانتے اور اسباب وشروط کو مستقل بالتاثیر جانتے ہیں محض تاریکیِ جہالت اور وادیِ ضلالت میں پڑے ہیں۔

(۴) عالم بلکہ جس قدر عالم مقدرۃ الوجود مانے جائیں ان میں سے کوئی فرد اور کوئی جزو ایسا نہیں کہ اپنے کسی کمال یا کسی وصفِ جلال سے اس مرتبہ میں پہنچ جائے کہ وہ اس کی ہر وقت کی دست نگری سے آزاد ہو جائے۔ پس جب خود ہر وقت محتاج ہے تو پھر اور کسی کی کیا حاجت روائی اور کاربراری کر سکتا ہے۔ پھر اس کی پرستش وعبادت اور اس سے سوال واستعانت خامِ خیال اور روح کے لیے وبال ہے۔ سبحان اللہ ایک لفظ رب العٰلمین میں اول اور دوسری اور تیسری اور چوتھی صورت ظلمتِ روح کو کس طرح سے مٹا کر کس طرح منور فرمایا ہے بلکہ اسی لفظ میں پانچویں بات کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ جو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے تو اس کو مہربان اور نہایت رحیم ہونا بھی لازم ہے ورنہ تربیت ممکن نہیں اور جب وہ مہربان ہر وقت تربیت کرنے والا ہے تو یہ بات خیال کر کے دل از حد اس سے محبت کرے گا اور جان سے پیارا سمجھے گا لیکن اس بات کی طرف لفظ الرحمٰن الرحیم میں اور بھی صراحت کر دی پس جو اس کو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ سمجھے گا اور پھر اس کے ساتھ ہی رحمٰن ورحیم کے معنی بھی دل پر نقش ہوں گے تو ایک دریائے محبت جوش میں آئے گا اور شعلۂ عشق بندہ کے دل میں بھڑکے گا اور جہاں عقل کے ذریعہ برسوں میں پہنچتا ہے وہاں عشق کی بدولت ایک لحہ میں وصال ہوتا ہے۔ دیکھئے جب بچہ اپنی ماں سے عاقلانہ طور پر سوال کرتا ہے تو وہ اس سے اسی دانشمندی سے پیش آتی ہے اور جب وہ اچھی میری اماں، اچھی میری اماں کہہ کر گلے سے چمٹ جاتا ہے تو پھر اس کے دل میں بھی محبت کا بے حد جوش ہوتا ہے۔ پس یہی حال بندہ کا خدا سے ہے۔ جب یہ ایک بار جوشِ محبت میں یا ربی کہتا ہے تو وہاں سے پے در پے عبدی عبدی کی آوازیں آتی ہیں چنانچہ خود فرماتا ہے اِنَّ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ کہ "میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے" اور فرماتا ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ "کہ اگر تم ایمان لاؤ اور شکریہ ادا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب کر کے کیا کرے گا"۔ اور جب کہ رحمت پر زیادہ نازاں ہونا باعثِ جرأت تھا تو اس ترازو کو برابر کرنے کے لیے مٰلك يوم الدين بھی فرما دیا اور اس میں پانچویں اور چھٹی اور ساتویں بات کی طرف اشارہ ہے کس لیے کہ انسان جب مٰلك يوم الدين کے معنی پر نظر رکھے گا نہ تو انکارِ قیامت کرے گا اور نہ عدمِ سزاء وجزاء کا قائل ہوگا، نہ تناسخ کو دھیان میں لائے گا اور جب اس دن کا اس کو مالک ومختار سمجھے گا تو مخلوق میں سے کسی چیز کو بھی اس امر میں حصہ دار نہ

جانے گا نہ حضرت مسیح علیہ السلام کو نہ کسی غوث و پیر و ولی و نبی کو نہ فرشتہ کو کیونکہ یہ وہ روز ہے کہ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ ''جس میں خدا کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی نہ کر سکے گا'' اور جب خدا کے روبرو جانے اور اس کی حکومت میں حاضر ہونے کو دل میں جماوے گا تو ادنیٰ گناہ سے بھی اس کے دل میں لرزہ آوے گا۔ پھر شتر بے مہار ہو کر لذائذِ دنیا میں مستغرق ہونا اور فسق و فجور میں عمر کو کھونا تو کجا ایسی باتیں وہی کرتے ہیں جو قیامت سے نہیں ڈرتے اس تھوڑے سے کلام میں تمام مضامینِ ہدایت کو ختم کر دیا اور تین آیتوں میں بے شمار الہامی اور روح کو زندہ کرنے والی باتوں کو بھر دیا۔ اب جو کوئی اس کلام سے واقف ہو کر ان الفاظ سے خدا کی ثناء وصفت کر کے اس کو یاد کرے گا۔ بالخصوص نماز میں کہ جہاں طہارتِ جسمانی بھی اور پھر ہر عضو سے مضمونِ محبت بھی ادا کیا جاتا ہے۔ کبھی دست بستہ کھڑا ہو کر یہ کلام منہ سے بولتا ہے، کبھی شوق میں آ کر پاؤں پڑتا ہے تو اس قدر دل پر انوارِ الٰہی اور فیوضِ نامتناہی فائض ہوں گے کہ بیان سے باہر ہیں۔ اس مطلب کے علاوہ اس کلام میں جو کچھ اسرار ہیں بے شمار ہیں ہم دو ایک اسرار بطور نمونہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) یہ کہ ہر ایک جملہ ایک دوسرے سے زنجیر کے حلقوں کی طرح مربوط ہے گویا کہ ایک دوسرے کی دلیل ہے چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (کہ تمام تعریفیں اور خوبیاں خدا ہی کے لیے ہیں) یہ ایک بڑا بھاری دعویٰ ہے کہ جس کا منکر انکار کر سکتا ہے کہ بعض خوبیاں فلاں کے لیے بھی ہیں یا سرے سے ہم اللہ کو نہیں مانتے یا ان خوبیوں کا خدا کے لیے ثبوت نہیں مانتے۔ پس جب اس کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہا تو ان تمام شکوک کو بڑی دلیلِ قوی سے دفع کر دیا (جیسا کہ آپ جان چکے ہیں) پس جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہا تو گویا تمام عالم کے رب ہونے کے لیے کامل شہادت ادا کر دی کس لیے کہ تمام عالم کی پرورش اسی کا کام ہے کہ جو رحمٰن و رحیم ہے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ تربیت بااختیارِ خود کرتا ہے نہ بجبوری جیسا کہ حکمائے یونان سمجھتے تھے اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ گویا الرحمٰن الرحیم کے لیے تتمہ اور تکملہ ہے۔ کس لیے کہ گو دنیا کی لاکھوں نعمتیں اور بے شمار خوبیاں کسی کو اس کی رحمت سے حاصل ہو جائیں مگر تابہ کے آخر غریبانہ اس ملک سے جانا اور ہر چیز کو چھوڑ جانا ہے کیونکہ یہ ترکیبِ[۱] اجسام ایک روز مضمحل ہونے والی ہے۔ یہ خاک کا گھر مٹی میں ملنے والا ہے۔ ہمارے بدن کے وہ حالات کہ

---

[۱] ترکیبِ اجسام کے لحاظ سے بے بنیاد یہ نرم جسم حیوانات اور نباتات ہے۔ پھر جمادات، اس لیے دنیا میں جس قدر جمادات کی عمر ہے وہ حیوانات نباتات کی نہیں۔ یہ جمادات وہ ہیں کہ جو قدرتی ترکیب سے مرکب ہیں۔ جیسا کہ چاندی' سونا، ہیرا وغیرہ، ورنہ ترکیبِ صناعی کو وہ استحکام کہاں۔ شاہجہانی عمارتیں بھی کئی سو سال بعد ہلنے لگتی ہیں۔ ایک دوست کا مکان دیکھنے کا بعد مدت کے اتفاق ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ ہر جگہ چونا جھڑ گیا دیواروں میں ادھر ادھر درزیں پڑ گئیں نہ کمرے پر وہ رونق ہے نہ کڑی تختہ کا وہ حال ہے۔ یہ دیکھ کر ترکیبِ انسان کی طرف دھیان آیا کہ اسی طرح یہ گل بھی مرجھاتا ہے اور اس خانۂ تن کا نقشہ چند روز میں کیسا بگڑ جاتا ہے۔

صد حیف کہ گلرخاں کفن پوش شدند　　　وز خاطرِ یک دگر فراموش شدند

آنانکہ بصد زباں سخن می گفتند　　　آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

ہر چند احباب و اقارب کی وہ شکلیں جو ہمارے روبرو خاک میں مل گئی تھیں آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور بے اختیار دل آنکھوں سے آنسو ہو کر بہنے لگا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں میں اے لئیم　　　تو نے یہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اس بے بنیاد ہستی میں کچھ غفلت اور خرمستی اور مصائب پر بے قراری اور دکھ پر آہ و زاری ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے　　　تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اس مضمون کو قرآن مجید نے اکثر مقام پر بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک جگہ گھانس کے ساتھ تشبیہ دے کر بے ثباتی بیان کی ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا۔ الآیہ۔ ۱۲ منہ

جو تیس برس یا چالیس برس پیش آتے ہیں زبانِ حال سے یہ خبر سناتے ہیں۔ ادھر بال سفید ہونے لگے ادھر چہرہ کی تازگی میں فرق آنے لگا، آنکھ، کان بھی جواب دینے لگے' سب کیل و پرزے ڈھیلے ہونے لگے' طبیعت اپنے کاروبار سے معطل ہونے لگی' ایک دن بلبلہ سا بیٹھ گیا۔ سب عیش و آرام خواب و خیال ہو گئے۔ سب نعمتیں جاتی رہیں، پس جب تک اس عالم میں سب نعماء اور ہر طرح کی فرحت نصیب نہ ہوئی تو کچھ بھی نہ ہوا۔ پس مٰلک یوم الدین ہونا اس رحمت کو کمال تک پہنچا دینا ہے۔ کیونکہ مالکِ روزِ جزا وہاں یہاں سے بڑھ کر دے گا اور اس غیر متناہی زمانے میں بہت کچھ سلوک اور احسان کرے گا یہ کمالِ رحمت ہے۔

(۲) یہ تو آپ جان ہی چکے کہ نبی بندوں اور خدا میں ایک واسطہ ہے کہ جو بندوں کو خدا سے ملاتا اور باہم میل جول پیدا کرتا ہے۔ پس اس کلام میں کہ جو خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس رابطہ اور میل جول کے متعلق تمام باتیں اجمالاً یا تفصیلاً ہونی ضرور ہیں اور اس باہمی ارتباط اور رشتہ کا مدار چند چیزوں پر ہے: (اول) یہ کہ خدا تعالیٰ کی ذات اور جمیع صفات کا بندوں کو یقین کرا دے اور مشاہدہ سا کر کے دکھا دے۔ نہ یہ کہ صرف بیانِ غیر کافی اور دعوائے غیر شافی پر بس کرے اور یہ بات عالم و جاہل حکیم و فلاسفر سب کے حصہ میں علیٰ قدر استعدادا تہم بارانِ رحمت کی طرح آوے۔ سوائے عنادی اور ازلی کور باطنوں کے ہر شخص اس سے پورا فیض پاوے۔ سو یہ بات اس وقت کہ جب سلسلۂ نبوت کو تمام کرنا منظور ہوا از حد ضرور ہے اور یہ بڑی بھاری بات ہے بلکہ جو شخص رہنمائی کا بیڑا اٹھائے اور سلسلۂ نبوت کا خاتم ہو اس کے لیے معجزہ ہے اور یہ اول امر اس لیے ضروری ہے کہ انسان کی جبلی عادت ہے کہ وہ غیر محسوس چیز کا مشکل سے قائل ہوتا ہے اور ذاتِ باری بھی محسوس نہیں اس لیے سینکڑوں ملحد اس وادیِ شکوک میں سر ٹکرا کر مر گئے اور سینکڑوں کی آنکھوں پر ظلمات کے پردے پڑ گئے اور یہ مقتضائے جسمانی اور اثرِ شیطانی ہے۔ (دوم) وہ نبی اپنے نورِ نبوت سے اس عالم کی ابتداء اور انتہا اس طرح دکھا دیوے کہ عقل کے نزدیک جس طرح اس چیز کی ابتداء و انتہاء میں کہ جس کو اپنے روبرو بنتے بگڑتے دیکھا کوئی شک نہیں رہتا۔ ایسا ہی اس مجموعۂ کائنات کی ابتداء و انتہا میں کوئی شک باقی نہ رہے تا کہ سوائے خدا کے نہ کسی کو قابلِ عبادت سمجھے نہ کسی سے مدد مانگے نہ کسی کو الوہیت کا حصہ دار جانے اور یہاں کی چیزوں کو فانی اور نعماءِ دنیا اور مصائبِ دہر کو آنی جانی جان کر ہر حال میں اسی کا خیال رکھے اور اپنے آپ کو مسافرِ تیز رو جانے کیونکہ تمام اصولِ سعادت اسی پر موقوف ہیں۔ (سوم) یہ کہ خدا تعالیٰ سے وہ محبت پیدا کرا دے کہ جو عقلِ سلیم کے نزدیک اور کسی کے ساتھ جائز نہ ہو۔ یعنی ہزار جان سے دل قربان ہونے کو اس پر آمادہ رہے کہ جس کو عشق یا حقیقی محبت کہتے ہیں نہ یہ کہ صرف زبان سے یہ کہہ کر بس کرے کہ خدا سے محبت کرو اور ایسی اور ایسی محبت کرو کیونکہ سب سے آخیر روحانی حکیم کا یہی کام نہیں کہ وہ یہ کہہ کے چلا جاوے کہ تندرستی حاصل کرو۔ بیماری کو دفع کرو بلکہ اپنی تدبیرِ خجستہ سے علاج کر کے مرض زائل کر دے۔ اس لیے کہ تمام انبیاء کی تعلیم کی یہی علتِ غائی اور مقصودِ اصلی ہے۔ (چہارم) یہ کہ نیک چلنی اور تمام دینی اور دنیاوی کاروبار میں راہِ راست کو اختیار کرنے پر پہلے لوگوں کے اچھے برے حالات اور ان کے نیک و بد نتیجہ کو یاد دلا کر خوب آمادہ کیا جاوے کہ ان کے دل میں بری باتوں کا خوف اور نیک باتوں کا شوق پیدا ہو جائے اور جس طرح دنیاوی کاروبار کو کسی نتیجہ پر یقین کرنے سے ازخود اختیار کرنے اور ان کے بجالانے میں جو کچھ مشقت اٹھاتے ہیں اس نتیجہ کے شوق میں اس کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں اسی طرح ہر عمل کا نتیجہ نیک و بد لوگوں کے روبرو ہر وقت تصویر بن کر کھڑا رہے جس سے وہ ازخود نیک عمل بجا لانے اور برے کاموں سے بچنے میں سعی کریں۔ نہ یہ کہ فقط اسی بات پر بس کرے کہ فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو اور پہلے لوگوں کی کہانیاں کہہ کر قصہ خوانوں کی طرح اپنی محفل کا رنگ جماوے اور وہ نبی بلا سود اپنی کتاب کو روزنامچہ یا تاریخ بنا دے۔

یہ وہ چار اصل الاصول ہیں کہ جن پر عقلمند عین آنکھوں سے صاد کرتے ہیں اور جن کی خوبی کا ہر اہلِ مذہب دم بھرتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ

اِن چاروں کو خداتعالیٰ نے کس خوبی کے ساتھ اپنے ایک تھوڑے سے کلام میں بیان کردیا کہ جس کو ذرا بھی سمجھ ہو تو وہ اس کلامِ مقدس پر سو جان سے ایمان لاوے (اول) امر کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں مشاہدہ کرادیا کیونکہ تمام عالم درجہ بدرجہ کمال کو پہنچتا اور اس کا ہر جزو وقتاً فوقتاً پرورش پاتا ہے جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں اور مشاہدہ بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔ تو اب اس تمام عالم اور مجموعہ کائنات سے علیحدہ ایک شخص کے موجود ہونے میں کہ جو مربی اور قادر اور علیم اور حکیم، مرید و سمیع و بصیر، رحمٰن و رحیم ہے البتہ اس عقل کے اندھے کو شک ہوگا کہ جو کسی تخت و کرسی کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے وجود اور صفات و صنعت و قدرت میں شک کرتا ہے ورنہ عقلمند کو تو مشاہدہ سے بڑھ کر اس بات کا یقین ہوگا۔ دیکھئے جب کوئی کسی پردہ کے پیچھے دیوار بنائے اور رفتہ رفتہ چن کر اس کو تیار کرے پس اس دیوار کی حالت دیکھنے والے کو اس شخص کے وجود کا ایسا ہی یقین ہوگا کہ جس طرح اس کو عیاناً دیکھنے سے ہوتا ہے اور اس کی صفات اور اس دیوار کے حدوث میں بھی کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ اسی طرح جو شخص ہر چیز کو خدا ہی کے یدِ قدرت سے پرورش پاتے اور گھٹتے بڑھتے دیکھتا ہے وہ بھی اس کی ذات اور صفات پر اعلیٰ درجہ کا یقین رکھتا ہے۔ اگرچہ یہاں سے بھی اس کے صفات معلوم ہوتے تھے مگر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں اور بھی کھول دیا اور مشاہدہ کر کے دکھادیا۔ اب غور کیجئے کہ یہ برہان مفید ہے یا یہ کہنا کہ ابتداء میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا الخ جیسا کہ سب سے اول توراۃ میں کہا گیا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کس لیے کہ اس کو تو وہی مانے گا جو خدا کا قائل اور الہام کا بالخصوص اس کلام کا مقر ہوگا ورنہ وہ کہہ سکتا ہے کہ جائز ہے کہ آسمان و زمین قدیم ہوں اور خدا موجود نہ ہو۔ بخلاف اس عبارتِ قرآنیہ کے کہ اس نے منکر وملحد کے تمام شکوک وشبہات کی جڑ اکھاڑ دی اور اس بات کو اس قوی برہان سے ثابت کردیا گویا مشاہدہ کرادیا لہٰذا اس لیے بھی قرآن کا نازل ہونا ضروری تھا اور دیگر کتبِ اناجیل وغیرہ میں تو اتنا بھی نہیں جیسا کہ ہم ہر کتاب کا سرنامہ لکھ کر آپ کو ابھی دکھاتے ہیں۔ امر دوم کو بھی اسی جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے مشاہدہ کرادیا کس لیے کہ جب عقل نے اپنی آنکھوں سے ہر وقت عالم کو ایک غیر شخص کا محتاج دیکھ لیا کہ جو غیب سے اس کو ہستی کا حصہ عطا کرتا ہے اور یہ ہر آن اس کی تربیت سے فیض اٹھاتا ہے تو اب اس کے حادث ہونے اور اس کی ابتداء اور انتہا میں کیا شک باقی رہ گیا۔ یہ بات بھی ایسی فطری الیقین ہے کہ جیسی پہلی بات۔ اس برہانِ تربیت پر جو شخص ذرا بھی غور کرے گا تو اپنی عقل کی دونوں آنکھوں سے جس طرح خداتعالیٰ کو بجمیع صفات مشاہدہ کرے گا اسی طرح اس کے مربوب و مصنوعِ عالم کے احتیاج اور فنا پذیر ہونے کو دیکھ لے گا۔ ایک بڑا حکیم اور فلسفی جو فنِ الٰہیات میں بے شمار دلائل سے ان دونوں باتوں کو ثابت کر کے لطف اٹھاوے یا کوئی صاحبِ قوتِ روحانی اپنے مکاشفہ اور نورِ نبوت سے یہاں تک پہنچ جاوے تو اس کا علم اور یقین اس امر میں اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ جو اس کلام اور اس برہان سے فیض پانے والے کو حاصل ہے۔ توراۃ کا جملہ مذکورہ تو اس امر میں اسی نقصان پر ہے جو پہلے امر میں تھا۔ اور کتابوں میں تو اتنا بھی نہیں یہ بھی نزولِ قرآن کے لیے ایک بڑی ضرورت[۱] تھی۔ (امر سوم) کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے ثابت کیا بلکہ دلوں میں جمادیا۔ کس لیے کہ محبت کی دو قسم ہیں: ایک ذاتی کہ بغیر کسی نفع کے اس کی ذات سے ایک جذبِ مقناطیسی کی سی کیفیت پیدا ہوجائے۔ دوسری صفاتی کہ کسی سے پہلے حقوق اور حال کی نعمتوں اور آیندہ کی امیدوں سے محبت کی جائے۔ پھر صفاتی کی تین قسمیں ہیں: ایک پہلے حقوق کے لحاظ سے۔ دوسرے حال کی بخششوں اور نعمتوں سے۔ تیسرے آیندہ کی بہتری اور ہر قسم کی بھلائی کی امید سے اور تمام دنیا کی محبتوں کو بھی جو آپ غور کریں گے تو وہ انہیں میں سے ایک محبت ہوگی۔ پس کسی دل میں محبت پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ یا اس کو جلوۂ ذات دکھایا جائے یا ان تینوں صورتوں میں سے ایک کو یاد دلایا جائے بلکہ صفحۂ دل پر لکھ دیا جائے۔ اور جہاں کہ جلوۂ ذات اور یہ تینوں حالات بھی سامنے کھڑے کردیے جائیں تو وہاں محبت کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں زبانی محبت کرنے کا

[۱] ضرورتِ قرآن

حکم دینا وہ نسبت رکھتا ہے کہ جو کسی پیاسے کو برف کے شربت پلانے سے زبانی پانی پیو پانی پیو کہنا نسبت رکھتا ہے۔ پس اس اہم امر کو خداتعالیٰ نے ان تینوں جملوں سے دلوں پر نقش کردیا اور ہر قسم کی محبت سے دل کو بھر دیا۔ الحمد للہ میں تو اپنی ذات مجمع الصفات کا جلوہ دکھا کر ذاتی محبت کا پیالہ پلادیا اور رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں حقوقِ سابقہ ولاحقہ تربیت وحاجت روائی کو یاد دلا کر شیدا بنادیا اور الرحمن الرحیم سے اپنی ہمہ وقت رحمت وعنایت کا امیدوار بنا کے مفتون کردیا اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے تو آخرت کی نعماءِ باقیہ اور عنایات غیر متناہیہ کا نقشہ دل پر جما کر اپنا دیوانہ کردیا اور مجنوں بنادیا اور اسی لیے ایک جگہ قرآن مجید میں اس کلام پر ایمان لانے والے کی نسبت یہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کہ "اہل ایمان اللہ سے سب چیزوں سے زیادہ محبت رکھتے ہیں" اور بھی کئی جگہ اسی طرح پر ارشاد ہے۔ اس وقت جو لوگوں نے الہامی کتابیں فرض کر رکھی ہیں ان میں اس اہم مسئلہ کا پتا بھی نہیں۔ چنانچہ ان کے سرناموں سے آپ کو معلوم ہوگا اور جو کہیں بیچ میں ذکر بھی ہے تو صرف محبت کرنا فرمایا ہے۔ نہ محبت کا طریق بتلایا ہے نہ اس کو دلوں میں جمایا ہے۔ اسی لیے جس قدر اس امتِ محمدیہ میں محبانِ خدا گزرے ہیں اور اب بھی ہیں اور آیندہ بھی ہوں گے کسی اور مذہب میں سواں حصہ بھی نہیں۔ کیونکہ محبت کا نتیجہ اول تو پوری پوری اطاعت ہے جیسا کہ فرمایا ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ "کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرا کہا مانو" کیونکہ اطاعتِ رسول عین اطاعتِ الٰہی ہے سو یہ فرمانبرداری اور جان نثاری جس قدر اس امت میں اپنے رسول کے لیے پائی جاتی ہے۔ اس کا بیسواں حصہ بھی کسی میں نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی امت کی سرکشی تو ضرب المثل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری گو مطیع تھے مگر آنحضرت علیہ السلام کے صحابہ سے کیا نسبت جنہوں نے حضرت پر اپنی جان کو تہلکہ میں ڈال کر خدا کے دشمنوں سے بڑے استقلال سے مقابلہ کیا۔ مگر مسیح علیہ السلام کے ایک حواری نے تو چند روپے لے کر ان کو دشمنوں کے پنجہ میں پھنسادیا اور حضرت شمعون پطرس اور دیگر حواری کافور ہوگئے (جس پر عیسیٰ علیہ السلام نے سب کو بے ایمانی اور سخت دلی کا لقب عطا کیا) (انجیل مرقس باب ۱۶) اور اخیر مرتبہ محبت کا یہ ہے کہ اس کے شوق میں اپنی جان اور جسم کو اس پر فدا کر کے اس کے وصال کا طالب ہو ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ‌ ‌ راحتِ جاں طلبم وسوئے جاناں بروم
در ہوائے رخِ تو ذرہ صفت رقص کناں ‌ ‌ تالبِ چشمۂ خورشیدِ درخشاں بروم

اس مرتبہ کو زبانِ شریعت میں شہادت اور عرفِ طریقت میں فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ اس محبتِ الٰہی نے اسلام میں یہاں تک ترقی کی کہ مرنے جینے، کھانے پینے ہر کاروبار میں اسی کا واسطہ اور اسی کا ذکر مقدم سمجھا جاتا ہے ؎

کارِ ما عشق و بارِ ما عشق است
حاصلِ روزگارِ ما عشق است

اور شہداء اور اولیاء اللہ اس امت میں انبیاءِ بنی اسرائیل کے ہم پلہ گزرے ہیں جن کے خرقِ عادات وکرامات کا ایک عالم مقر ہے۔ یہ فیض حواریوں میں رہ کر منقطع ہوگیا۔ اس امت میں قیامت تک رہے گا۔ دوسری صدی عیسوی سے لے کر اب تک عیسائی بھی کسی سچے عیسائی کا پتا نہیں بتلاتے کہ جس پر زہر اثر نہ کرے، سانپوں کو اٹھالے، اس کا ہاتھ لگتے ہی بیمار تندرست ہوجائیں (انجیل مرقس) یہ بھی نزولِ قرآن کے لیے ایک بڑی ضرورت تھی۔ واضح ہو کہ جب انسان کے دل پر یہ تینوں باتیں جلوہ گر ہوجاتی ہیں تو پھر اس کی آنکھوں میں کسی کی ہستی مستقل نہیں معلوم ہوتی چہ جائیکہ اس سے طلبِ حاجات اور ادائے عبادات بلکہ وہ ہر کام میں خدا ہی سے استعانت چاہتا اور اسی کی عبادت کرتا ہے اس لیے ان تینوں آیتوں کے بعد اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ بندے کے منہ سے کہلوادیا۔ (امر چہارم) کو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں واضح کردیا کیونکہ جب بندے کو ہر

امر میں راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دی اور سیدھی راہ چلنے والوں کو جو کچھ نتیجہ ملا وہ بتلا دیا اور اس کے برخلاف افراط و تفریط کرنے والوں راہِ راست کو چھوڑ دینے والوں کا ثمرہ غضبِ الٰہی اور گمراہی پہلوں کا حال بیان کر کے جتلا دیا تو گویا ہر کام کا نیک و بد نتیجہ دنیاوی و اخروی آنکھوں سے دکھا دیا۔ پس جس طرح ان تینوں مضامین کی شرح قرآن مجید میں جا بجا ہے اسی طرح اس امر چہارم کی شرح کے لیے بھی موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور دیگر انبیاء اور ان کے اعداء کا حال بیان کر کے متنبہ کر دیا اور پھر عالمِ آخرت کے نیک و بد نتائج مختلف طور سے بیان کر کے دل کو عالمِ آخرت کے شوق اور اپنے خوف سے بھر دیا۔ چونکہ تورات و انا جیل میں یہ بات نہیں بلکہ صرف امورِ خانہ داری پر ابتداء سے اخیر تک روزنامچہ نویسی کی ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح کے لیے بھی قرآن کا نازل ہونا پُر ضرور تھا۔

(۳) ان تینوں آیات میں رحمت اور غضب کی جیسی رعایت منصبِ الہام کو ضرور تھی ویسی ہی رکھی۔ چنانچہ اس امت مرحومہ کے لیے یہ مناسب تھا کہ آثارِ غضب کی نسبت اطوارِ رحمت کو زیادہ ظاہر کیا جاوے اس لیے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ دو جملے تو وہ بیان کئے کہ جن سے رحمت ٹپکتی ہے اور پھر خوف دلانے کو جیسا آٹے میں نمک مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو بھی ذکر فرما کر چوکنا کر دیا تا کہ رحمت پر مغرور ہو کر جرأت نہ پیدا ہو جاوے۔ الغرض افراط و تفریط سے کامل اجتناب کیا نہ سراسر رحمت نہ بالکل غضب بلکہ مناسب مناسب۔ یہ کمال حکمت ہے۔

(۴) مبدأ و معاد کو بھی برابر یاد دلایا جس طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں آفرینش اور پرورشِ دنیا کا ذکر تھا تو اسی طرح مٰلك يوم الدين میں آخرت کو یاد دلا دیا۔

(۵) ہر ایک موقع پر وہ مناسب لفظ بولا گیا کہ اگر اور لفظ بولا جاتا تو مطلب فوت ہو جاتا چنانچہ الحمد للہ کی جگہ المدح والشکر میں یہ بات حاصل نہ ہوتی کس لیے کہ مدح غیر اختیاری کمالات پر ہوتی ہے اور یہاں خدا تعالیٰ کے کمالات کا اختیاری اور عدمِ اضطراری ہونا ثابت کرنا مقصود تھا کہ فلسفۂ یونان کا یہ غلط خیال رد ہو جائے کہ یہ عالم اس سے بایجاب (بالاضطرار) سرزد ہوا ہے اور وہ بے اختیار ہر چیز کی پرورش کرتا ہے اور اسی طرح شکر کسی نعمت عطا کرنے پر ہوتا ہے نہ کمالاتِ ذاتیہ پر بخلاف حمد کے کہ وہ سب پر ہوتی ہے۔ پس اس لیے لفظ حمد کو اختیار کیا اور اس کے ساتھ الف لام بھی ملا دیا تا کہ فائدہ استغراق کا دیوے اور ہر حمد اس کے لیے ثابت ہو جائے۔ کلامِ عرب میں الف لام اکثر اسم نکرہ پر آتا ہے اور یہ لام چار قسم پر ہے کس لیے کہ اگر اس سے کوئی شخصِ خاص مراد ہے جیسا کہ الرجل یعنی وہ آدمی تو اس کو لامِ عہدِ خارجی کہتے ہیں اور اگر ماہیت مراد ہے تو پھر یا حرفِ ماہیت بلا لحاظ تحقیق افراد ہے تو اس کو لامِ جنس کہتے ہیں جیسا کہ الرجل خير من المراء ة میں لام جنس رجل (مرد) مراد ہے اور اگر وہ ماہیت افراد میں متحقق ہونے کے لحاظ سے ہے تو یا تو کل افراد مراد ہوں گے تو اس کو لامِ استغراق کہتے ہیں جیسا کہ الحمد میں کل افراد حمد مراد ہیں خواہ کوئی حمد کسی کی کرے سب انجام کار خدا ہی کی حمد ہے کیونکہ جس کی کوئی حمد کرے گا تو کسی کمال پر کرے گا سو وہ اسی کے ہاں سے آیا ہے۔ نوکروں کے جود و سخا کی تعریف درحقیقت آقا کے جود و سخا کی تعریف ہے کہ جس کے مال کو اس کی اجازت سے دیتے ہیں اور اگر کل افراد مراد نہیں بلکہ بعض غیر معین تو اس کو لامِ عہدِ ذہنی کہتے ہیں جیسا کہ کوئی شخص اپنے نوکر کو کہے اعط الرجل کہ کسی شخص کو یہ صدقہ دے آ یعنی جو ملے کسی کی خصوصیت نہیں۔ اسی تقسیم کے بیان کرنے میں علماء اصول اور بیان کے مختلف عنوان ہیں۔ تلویح اور مطول میں علامہ سعد الدین علیہ الرحمۃ نے اس کی خوب تحقیق کی ہے اور اسی طرح للہ کی جگہ للغفور یا کوئی اور نام آتا تو یہ مطلب حاصل نہ ہوتا کس لیے کہ دعویٰ یہ ہے کہ کل خوبیاں خدا کو ہیں سو اس کے لیے وہ اسم لانا چاہیے کہ جس میں کل خوبیاں مجتمع ہوں تا کہ اسی دعویٰ میں دلیل پیدا ہو کر ایک عجیب لطف حاصل ہو۔ سو اس کے لیے سوائے لفظ اللہ کے جو اس ذاتِ واجب الوجود کے لیے مقرر کیا گیا ہے کہ جس میں تمام صفاتِ کمالیہ ہوں اور کوئی اسم صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اور اسماءِ صفاتیہ ہیں ان میں خاص ایک صفت کا لحاظ ہے اور اسی

طرح رب العالمین میں رب کی جگہ اگر صانع اور خالق کہتے تو مقصود حاصل نہ ہوتا کس لیے کہ مقصود یہ تھا کہ ہر دہریہ اور منکر کے روبرو ذاتِ باری تعالیٰ کو ثابت کیا جائے۔ سو یہ بات لفظ رب میں حاصل ہے کہ جس سے ہر چیز کا ہر وقت حادث اور محتاج ہونا دیکھ کر جلد یقین ہو جائے کہ آخر اس سلسلۂ ممکنات کا ہر وقت پرورش کرنے والا ضرور کوئی واجب الوجود جامع الصفات ہے ورنہ اگر یہ چیزیں خود بخود ہوتیں تو پھر ان کے وجود کی باگ کون روکنے والا ہے کہ جو ٹھہر ٹھہر کر ہر چیز عطا کرتا اور تدریجاً میدانِ ہستی میں آنے دیتا ہے۔ کیوں یکبارگی نہ ہو گئی بخلاف لفظ خالق و صانع کے کہ ان میں یہ بات حاصل نہیں اور اسی لیے خدا تعالیٰ کے ثبوتِ وجود کے لیے اس برہانِ تربیت سے کوئی دلیل بڑھ کر کیا برابر بھی نہیں اور اسی طرح اگر عالمین میں جمع کی جگہ لفظ مفرد عالم لاتے اور رب العالم کہتے تو وہ مدعا کہ جو ہم نے بیان کیا حاصل نہ ہوتا کیونکہ گو حکمائے یونان اور زردشتیوں اور کیومرثیوں اور قدمائے ہنود اور بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ غلط ہے (کہ ہر نوع کے لیے ایک رب ہے کہ جس کا بت بنا کر اب تک ہندوستان میں ہنود پوجتے ہیں اور جہلاءِ عرب نے بھی ہر کام کا ایک حاجت روا بنا کر سینکڑوں بت کعبے میں اور دیگر مقامات میں رکھ چھوڑے تھے) مگر ان کے مقابلہ میں خدا کو رب العالم کہنا نفیِ شرک اور بت پرستی مٹانے کے لیے چنداں مؤثر نہ ہوتا اور جب رب العالمین کہا تو سب کو خدا کی بے نہایت قدرت و عظمت بتلا کر اور سب معبودوں پر فوقیت مشاہدہ کرا کر خوابِ غفلت سے جگا دیا کہ اے نادانو ذرا یہ تو جانو کہ اول تو جس کو تم جس چیز کے لیے رب قرار دیتے ہو وہ بھی ربِّ حقیقی نہیں۔ نہ باپ بیٹے کے لیے نہ ماں اولاد کے لیے نہ بادشاہ رعیت کے لیے نہ ارواح و ملائکہ نہ ستارے نہ چاند و سورج نہ جو الامکھی آگ کا مالک ہے نہ بھیرون کا کچھ پانی پر اختیار ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور اگر یہ بھی فرض کیا جاوے تو پھر سب کا رب کون ہے اور تمام عناصر و اجسام اور علویات و سفلیاتِ آسمان و زمین کس کے قبضہ میں ہیں سو وہ حقیقی رب ہے عبادت اور استعانت اسی کا حصہ ہے۔ درحقیقت انسان جب تربیت کے مضمون کو خیال کرے اور جو جو چیزیں ایک ادنیٰ چیز کی تربیت میں درکار ہیں ان کو سوچے گا تو یقیناً یہ کہہ اٹھے گا کہ ایک نوع کا رب رب نہیں۔ کس لیے کہ تربیت اور پرورش ایک نوع کی بغیر اس کے کہ اس کو جمیع انواع پر اختیارِ کلی ہو ممکن نہیں۔ ذرا انسان کی پرورش میں صرف روٹی ہی کو خیال کر لیجیے کہ اس کے لیے آفتاب کی حرارت اور ماہتاب کی برودت اور بارش اور ہوا اور زمین کی صلاحیت وغیرہ وغیرہ کتنی چیزیں درکار ہیں سو وہ کل ایک رب النوع کے بس کی نہیں۔ پس وہ رب النوع ایک روٹی حاصل کرنے پر تو قادر ہی نہیں اور جمیع امور میں تو کیا خاک تربیت و پرورش کرے گا۔ اب یہاں سے ہنود وغیرہ ان مذاہب کی حقیقت اور ان کے پیشواؤں کی عقل کی تیزی اور صفائی تو آپ کو بخوبی معلوم ہو گئی ہو گی کہ جنہوں نے عناصر اور کواکب پرستی کو طریقِ نجات ٹھہرا دیا اور دساتیر اور ویدوں اور پرانوں کو انہیں لغویات سے بھر دیا جو اللہ کو رب العالمین جانے گا وہ تو ان سب باتوں کو اور پھر ان سب طریقوں کے پابند ہو کر ریاضت کرنے اور ترکِ گوشت کرنے اور غیر قوموں کے پانی کھانے سے بچنے کو مدارِ نجات یا مکتی کا باعث جاننے والے کو تو کس درجے میں جہلِ مرکب میں گرفتار جان کر اس پر تاسف کرے گا۔ پادری صاحب دیکھئے قرآن کے ایک لفظ نے کس قدر جنمی اندھوں کو بینا اور مرضِ مہلک کے بیماروں کو تندرست کر دیا اور کس قدر مردہ روحوں کو زندہ کر دیا تمہارے تمام انا جیل و تورات اور قرآن کا یہ لفظ ذرا دونوں کو دو پلوں میں رکھ کر تولو اور پھر انصاف سے بولو۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو دو چار بیماروں اور دو ایک مردوں اور دو ایک اندھوں کو معجزہ دکھا کر تندرست اور زندہ کیا اور وہ تندرستی و زندگی بخشی تھی کہ جو جسمِ فانی سے متعلق تھی اور اخیر نبی سید المرسلین علیہ السلام کے تو ایک لفظ نے حیاتِ ابدی اور صحتِ روحانی بخش دی اب دیکھئے کون سا معجزہ بڑھ کر ہے؟

کیا اک لفظ سے عالم کو زندہ — یہ ایک ادنیٰ ہے فیضانِ محمدؐ
لبوں میں آپ کے کیا ہی اثر ہے — مسیحا بھی ہیں قربانِ محمدؐ

اور اسی طرح الرحمن الرحیم کی جگہ اگر کوئی اور لفظ بولا جاتا تو وہ لطف کہ جو ہم نے ان دونوں لفظوں کی تفسیر میں بیان کیا ہے

حاصل نہ ہوتا اور اسی طرح اگر رحیم کو پہلے اور رحمٰن کو پیچھے لاتے تو وہ بات فوت ہو جاتی اور اسی طرح مالك يوم الدين میں اگر لفظ مالک کی جگہ حاکم کہتے تو یہ بات حاصل نہ ہوتی کس لیے کہ کسی چیز کا مالک ہونا اس پر کلیۂ اختیارات کو ہاتھ میں لانا ہے بخلاف حاکم کے کہ اسے اپنے محکوم پر ایک اختیارِ خاص کے سوا اور کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ پس مالک خاص اور حاکم عام ہے اور خاص میں عام بھی آ جاتا ہے اور اسی لیے جو مالک کو ملک پڑھتے ہیں اِن کے قول کو مرجوع ٹھہرایا جاتا ہے اور اگر مالک کے بعد لفظ یوم نہ لاتے بلکہ ملک الدین کہتے تو یہ مقصودِ اعظم کہ جو قیامت کا ثابت کرنا ہے حاصل نہ ہوتا کس لیے کہ دین (دان یدین سے) جزا کو کہتے ہیں۔ عرب بولتے ہیں کما[1] تدين تدان کہ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ پس یہ جزا ہر وقت نہیں ہوتی بلکہ خواہ جزا دنیاوی ہو خواہ اخروی اس کا ایک وقت ہوتا ہے اور یوم سے مراد بھی یہاں مطلق وقت ہے اگر یہاں یوم ذکر نہ کرتے تو جزا کا موقت ہونا سمجھا نہ جاتا تو ہر وقت جزا نہ پانے سے خواہ مخواہ بہت سے کج رو لوگوں کے دلوں میں خدا کی عدالت میں شبہ آتا اور اپنے افعالِ نیک پر اسی وقت نیک نتیجہ مرتب نہ ہونے سے نیکی کرنے والا مایوس اور بدکام کا برا نتیجہ اسی وقت نہ پانے سے شیر اور دلیر ہو جاتا۔ پس جب یوم کہا تو دونوں کو آگاہ کر دیا اور جزاءِ کامل کے وقت (قیامت) کو مبہم کر کے دل کو خوف و امید سے بھر دیا اور یہ بات قانونِ نبوت کے لیے اصل الاصول ہے۔

(۶) یہ کہ اس کلام میں جو خدا نے اپنے بندے کو حمد کرنے سے تقرب کا راستہ[2] بتایا تو اس کلام کے ساتھ حمد کرنی بھی بتلائی کہ جس سے ہر طرح کی تاریکی روحانی (خواہ اعتقاد سے متعلق ہو خواہ عمل سے) زائل ہوتی ہے اور پھر اس حمد کو تین اوصاف پر قائم کیا۔ اول یہ کہ حمد اس ذات کے لیے ہے کہ جو تمام جہان کا پرورش کرنے والا ہے۔ دوم یہ کہ وہ نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سوم یہ کہ وہ یومِ جزاء کا مالک ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس میں یہ تین وصف نہ پائے جائیں وہ ہر قسم کی حمد کا مستحق نہیں اور جب حمد کا مستحق نہیں تو پھر عبادت اور استعانت کا تو کیا استحقاق ہے۔ پس اسی لیے اس کلام کے بعد وہ کلام ذکر کیا جو اس کا نتیجہ ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے (ہر کام میں) مدد مانگتے ہیں

ترکیب: نعبد فعل اور ضمیر نحن فاعل، اياك مفعول ہے کہ جو تخصیص کے لیے مقدم کر دیا گیا ہے۔ فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ واؤ حرفِ عطف نستعين فعل با فاعل اياك مفعول مقدم برائے تخصیص فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ ہو کر معطوف ہوا جملۂ سابقہ پر۔

---

۱ چونکہ دین پر جزا ملتی ہے اس لیے اس کو دین کہتے ہیں اور اس کو اس لحاظ سے کہ وہ ایک راہ خدا کی ہے اس پر خلق کو چلنا چاہیے مذہب اور شریعت کہتے ہیں اور چونکہ وہ لکھنے کے قابل ہوتا ہے اس لحاظ سے اس کو ملت کہتے ہیں۔ بات ایک ہے مگر ہر اعتبار سے ایک جدا نام ہے۔۱۲ منہ

۲ اس نبیِ اخیر کی تعلیم خدا سے ملانے میں اپنا نظیر نہیں رکھتی جو بات پہلی امتوں کو ساری عمر میں نصیب ہوتی تھی اس امت میں اول بار حاصل ہوتی ہے

ﮯ اول، آخر ہر منتہی است
آخر، جیب تمنا تہی است

اور اسی لیے پہلی کتابوں کی طرف حاجت نہ رہی۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ تم کو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی کیا ضرورت ہے واللہ اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے (بخاری) ان ہی روح افزا باتوں سے تخمیناً ۳۳ برس میں شرقاً غرباً روئے زمین پر دینِ محمدی ابرِ رحمت کی طرح پھیل گیا۔ بھلا یہ بات تلوار کے زور سے کہیں نصیب ہوتی ہے؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دینِ محمدی تلوار کے زور سے دنیا میں پھیلا وہ اپنے تعصبِ بے جا سے اسلام کے نورانی چہرہ پر دھبہ لگانا چاہتے ہیں۔

تفسیر: بندہ جبکہ اس کی حمد ان اوصاف کے ساتھ کر چکا کہ جن کی تجلی نے خدا تعالیٰ کی ہستی اور صفاتِ کمالیہ کا وہ نقشہ اس کے دل پر جمایا کہ سوائے پھر اور کوئی نظروں میں نہ سمایا تو اس شوقِ غائبانہ نے اس کو بارگاہِ حضور تک پہنچایا پس جیسا کہ وہ ابتدا میں خدا تعالیٰ کو بن دیکھے اس کے صفاتِ مخصوصہ سے یاد کر کے دلشاد کرتا تھا اسی طرح اب اس کے روبرو ہو کر یہ کہنے لگا کہ اے میرے معبود میں تجھ پر سے قربان تیرے سوا کون ہے میں تیری ہی عبادت اور تجھ ہی سے ہر کام میں مدد مانگتا ہوں۔ آپ کو اس آیت کا پہلی آیتوں سے ربط معلوم ہو گیا کہ یہ ان دلائل کا نتیجہ اور اس تعلیم کا ثمرہ ہے اور غائبانہ سے حاضر ہو کر کلام کرنے کا سر بھی منکشف ہو گیا ہوگا۔ مگر اس کلام کے اسرار و معانی بیان کرنے باقی ہیں سو پیشتر ہم معانی بیان کرتے ہیں۔

عبادت: نہایت درجہ کی عاجزی و انکساری ہے کہ جو کسی کی تعظیم کے لیے عمل میں آوے اور یہ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے۔ طریق معبد ای مدلل اس رستہ کو عرب معبد کہتے تھے کہ جس پر کثرت سے لوگ چلتے ہوں اور وہ پاؤں میں روندا جائے۔ پس اسی سے عبادت ہے کہ عابد اپنے معبود کے آگے بچھا جاتا ہے۔ عبادت دو قسم پر ہے: اول وہ کہ جو ظاہر اعضائے بدن سے متعلق ہو۔ دوم وہ کہ جو قوائے باطنیہ سے علاقہ رکھتی ہو۔ پھر اول کی دو قسم ہیں۔ بدنی اور مالی پھر بدنی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی فعل تعظیماً عمل میں آوے جیسا کہ سجدہ کرنا' رکوع کرنا جس کو نماز کہتے ہیں اور اس کا نام زبان سے تبرکاً لینا' اس کی تسبیح و تقدیس کرنا' اس کے کلام کو تبرکاً پڑھنا' اس کے مقدس مقامات پر تبرکاً جانا کہ جہاں اس کے ابرار کے نشانات و ظہورِ برکات ہوں جیسا کہ حج و طواف و سعی وغیرہ' مصائب و حاجات میں اس کو پکارنا' اس کے نام کی دہائی دینا دعا مانگنا۔ دوم اس کے خوف اور ادب سے کسی کام کو عمل میں نہ لانا جیسا کہ جماع و اکل و شرب کہ جو نفس کے نزدیک نہایت مرغوب ہیں اس کے لیے ترک کرنا جس کو شرع میں صوم یعنی روزہ کہتے ہیں اور جیسا کہ مقاماتِ متبرکہ میں شکار نہ کھیلنا' وہاں کے درخت نہ کاٹنا۔ جیسا کہ حرم اور احرام میں اور مالی عبادت اس کے نام پر کچھ دینا جیسا کہ زکوٰۃ اور صدقہ اور جو قوائے باطنیہ سے متعلق ہیں وہ بھی چند قسم ہیں۔ اس کے آیات اور عجائبِ قدرت میں غور و فکر کرنا' اس سے دلی اور حقیقی محبت رکھنا' اس کی دل سے تعظیم کرنا' اذکارِ روح اور نفس اور قلب اور خفی اور سر بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ جن کو اربابِ طریقت عمل میں لا کر قدسی ہو جاتے ہیں۔ یہ اصول ہیں باقی ان کے فروع اور اسباب و شروط بے شمار ہیں۔ پس جب اس کے روبرو حاضر ہو کر بندے نے یہ کہا کہ اياك نعبد کہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے اور آیندہ کریں گے تو اقرار کر لیا کہ یہ امورِ خاص تیرے ہی لیے عمل میں لاویں گے اور کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اب غور کرو کہ ایک تو بندے کو یہ حکم دینا کہ تو بت کو سجدہ نہ کیجیو کسی تصویر کو نہ پوجیو جیسا کہ تورات میں مذکور ہے اور ایک یہ کہ ان دلائل کا پرتو ڈال کر کہ جو پہلے تین آیتوں میں مذکور ہوئیں بندے کے منہ سے یہ اقرار کرا دینا دونوں میں کون زیادہ اثر رکھتا ہے۔ چونکہ پہلی کتابیں اس امر میں قاصر تھیں اس لیے نزولِ قرآن کی ضرورت ہوئی اور جس طرح ردِ شرک میں یہ کلام بینظیر ہے اسی طرح ہر قسم کی بندگی اور عبادتِ الٰہی کی ترغیب میں اپنا مثل نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایک تو یہ کہنا کہ تو اپنے سارے دل اور سارے جی سے اس کی بندگی کر (تورات سفر استثناء) اور ایک ان دلائل سے کہ جو پہلے مذکور ہوئے بندہ کی آنکھوں میں اور کسی کو قابلِ عبادت نہ رکھ کر اور اپنی رحمت اور پرورش یاد دلا کر خود اس کے منہ سے یہ اقرار کروانا۔ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اسی طرح یہ آیت محبتِ الٰہی پیدا کرنے میں بھی بے مثل ہے۔ تورات میں صرف یہی ہے کہ تو اپنے سارے زور سے اپنے خداوند کو دوست رکھ (استثناء) وہاں نہ محبت کا طریق بتلایا نہ وجوہاتِ محبت ذکر کیے اور اس جگہ دونوں باتیں ہیں کس لیے کہ وجوہاتِ محبت تو (پرورش کرنا' ہر طرح کی حاجات کا روا کرنا' بعد مرنے کے آرام و راحت پہنچانا) اول کی تینوں آیتوں میں ذکر ہو چکے اور یہاں طریقِ محبت بتلا دیا کہ اس کی عبادت کرو ورنہ اس کے سوا محبت کا اور کیا طور ہے؟ کیا کسی لکڑی اور بت کو گلے سے لگا کر پیار کیا کرے۔

واضح ہو کہ دنیا میں جو لوگ وہم اور خیالاتِ فاسدہ کی پابندی سے جن خیالی معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کی چند قسمیں ہیں کیونکہ بعض

تو جسمانی چیزوں کو شریکِ عبادت کرتے ہیں اور بعض غیر جسمانی چیزوں کو۔ اوّل اعنی جسمانی چیزوں کی دو قسم ہیں ایک جسمِ سفلی اور دوسرا جسمِ علوی پھر وہ معبود کہ جو جسمِ سفلی ہیں ان کی بھی دو قسم ہیں بسیط اور مرکب۔ بسائط جیسا کہ آگ اور پانی اور ہوا۔ چنانچہ ان چیزوں کی اب تک ہنود اور مجوس پرستش کرتے ہیں اور دساتیر اور وید اور پرانوں میں مذکور ہے اور پھر وہ معبود کو جو اجسامِ مرکبہ ہیں ان کی بھی چند اقسام ہیں معدنیات، پتھر، چاندی، سونا، تانبا، پیتل، چنانچہ ان چیزوں کو بھی اب تک اہلِ ہند پرستش کرتے ہیں اور درخت وغیرہ نباتات چنانچہ پیپل کو اب تک ہندو پوجتے ہیں اور اس کے کاٹنے کو بڑا گناہ جانتے ہیں اور حیوانات چنانچہ گائے اور بیل اور سانپ وغیرہ جانوروں کو ہندو اب تک پوجتے ہیں اور ان کے ذبح کو بڑا گناہ جانتے ہیں اور انسان چنانچہ راجہ رام چندر اور کرشن اور مہادیب اور بشن وغیرہم بہت سے انسانوں کو اب تک معبود جانتے اور ان کے نام کی خیالی صورتیں پتھر وغیرہ کی بنا کے مندروں میں رکھتے ہیں اور ان کے آگے گا بجا کر اور بھوگ لگا کر پوجا کرتے اور سجدہ کرتے ہیں اور ان سے حاجات طلب کرتے ہیں اور اسی طرح عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود جانتے ہیں اور بعض بیوقوف یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی خدا کا بیٹا کہتے تھے اور وہ معبودِ باطل کہ جو اجسامِ علویہ ہیں ان کی بھی کئی قسم ہیں۔ آفتاب، ماہتاب، ستارے۔ چنانچہ ان کو بھی ہنود اور مجوس اب تک پوجتے ہیں۔ دساتیر میں ہر ایک ستارے اور آفتاب و ماہتاب کی تسبیح اور پرستش کا طریق مندرج ہے اور وید اور پرانوں میں بھی بہت سے دیوتاؤں اور سورج دیوتا کی پوجا کے طریق مندرج ہیں اور گاتری منتر بھی۔ ہندو اس کی پوجا کرنے میں بڑے اعتقاد سے پڑھتے ہیں جس میں آفتاب کی بڑی مدح ہے اور بعض تو ایسے دھرماتما ہیں کہ جب تک سورج دیوتا کے درشن نہیں کرتے اَن جل کے پاس نہیں جاتے اور آسمان چنانچہ بہت سے جہلاءِ عرب اور مجوس آسمان کو ہر بات کا خالق سمجھتے تھے اور جب ایران میں آ کر اہلِ اسلام آباد ہوئے تو ان کی اولاد میں بعض پر مجوس کا خیال قدرے مؤثر ہوا اور اپنے اشعار میں آسمان کو مخاطب کرنے لگے اور پھر جب اردو میں شعر نے جنم لیا تو انہیں ایرانیوں کی تقلید سے یہاں کے شعراء بھی بیچارے آسمان کے پیچھے پڑ گئے اور سارے گلے شکوے ناکامیابی کے اسی کے سر لگا کر دس پانچ گالیاں دینا ضرور سمجھنے لگے اور جو اجسام نہیں تو ان کی بھی چند قسم ہیں ایک قسم نور و ظلمت اعنی چاندنی اور اندھیرا۔ چنانچہ فرقہ مانویہ اور شنویہ کہ جو مجوس ہیں اندھیرے اور چاندنی کو مدبرِ عالم جان کر پوجتے اور خدا سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم ارواح چنانچہ ایک قومِ عرب میں یہی عقیدہ تھا کہ ملائکہ ارواح فلکیہ ہیں اور ہر ملک کے لیے ایک ارواحِ فلکیہ میں سے ایک روح مدبر اور کارکن ہے اور اسی طرح اس عالم میں سے ہر نوع کے لیے ایک روح مدبر اور رب ہے۔ سو یہ لوگ ہر روح کی ایک خیالی صورت پتھر یا پیتل کی بنا کر پوجتے تھے۔ چنانچہ ہنود بھی اب تک یہی کرتے ہیں اور ایک قسمِ خیر و شر، چنانچہ مجوس میں سے ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس عالم کے دو خدا ہیں اور وہ دونوں بھائی ہیں ایک یزداں جو خیر ہے اور تمام اچھی باتیں وہی کرتا ہے اور ایک اہرمن کہ جو شر ہے اور تمام بری باتیں وہی کرتا ہے۔ اگرچہ پادری موحد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر باہمی مناظرات سے بھی اور ان کی بعض کتابوں سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ شر کا خالق خدا تعالیٰ نہیں گو اہرمن کے قائل نہ ہوں مگر اس کی جگہ دوسرا مستقل خدا انسان کو مانتے ہیں[1]۔ حالانکہ ہم نے ان کو سمجھایا بھی کہ خالق ہونا اور چیز ہے اور کاسب ہونا اور چیز۔ خدا خالق ہے اور بندہ کاسب اور اس فعل کے ساتھ کاسب متصف ہوتا ہے نہ خالق۔ دیکھو سیاہی بنانے والے کو سیاہ نہیں کہتے بلکہ اس کو کہ جس کے بدن پر لگی ہو لیکن ان کی سمجھ میں یہ باریک بات نہیں آئی اور اسی لیے اہلِ اسلام میں سے بھی بعض لوگ کہ جن کو قدریہ یا معتزلہ کہتے ہیں بہک کر شر کا خالق بندے کو قرار دیتے ہیں جس سے عالم کے لیے دو مستقل خالق ماننے پڑتے ہیں۔ وفسادہ مما لا یخفی۔ پس یہ تمام گروہ ان چیزوں کو نفع کی امید اور برائی کے ڈر سے پوجتے تھے اور اب بھی پوجتے ہیں اور جو کسی کی عبادت یا طاعت کرتا ہے تو انہیں دونوں باتوں سے کرتا ہے اور جو ذاتی عبادت کرتے ہیں تو وہ بہت ہی کم ہیں اور محکمہ نبوت کے لیے پر ضرور ہے کہ وہ

[1] آریہ کا بھی یہی اعتقاد ہے۔ ۱۲ منہ

اس خراب عقیدہ کو مٹاوے بالخصوص اس نبی کے لیے کہ جو تمام عالم کا نبی ہو اور اس وقت تمام عالم میں انہیں خیالاتِ فاسدہ کی اندھیریاں ہر طرف سے محیط ہوں اور اس گمراہی نے تمام عالم کو تاریک کر رکھا ہو۔ اور اس خیالِ فاسد کے مٹانے کے لیے تنہا معجزات کافی نہیں۔ کس لیے کہ کچھ عجب نہیں کہ اس نبی کو بھی ان معجزات و کرامات سے منجملہ اور معبودوں کے ایک معبود سمجھ بیٹھیں۔ مطلب برعکس ہو جاوے جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھ لیا اور اس کا بیٹا بنا دیا بلکہ برہانِ قوی سے ان تمام چیزوں کا بلکہ مجموعہ عالم کا اور جس قدر عالم فرض کیے جاویں ان سب کا محتاج اور حادث ہونا اور ان کے سب کمالات بلکہ ان کی حیات کا مستعار ہونا دکھا دیا جاوے اور کسی مالک و مختار قادرِ علیم و رحیم کا ہر وقت دست نگر ہونا مشاہدہ کرا دیا جاوے تا کہ پھر اور کسی چیز کو استحقاقِ عبادت عقلِ سلیم کے نزدیک نہ رہے اور نہ کسی سے مدد مانگنے کی حاجت پڑے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنے کلام میں ایسا ہی کر دیا کہ اول تینوں آیتوں میں تمام عالم کا محتاج ہونا اور اپنا ہر طرح قادر و رحیم و کریم ثابت کر کے بندے کے دل پر وہ تجلیِ ذاتی کی کہ ہر چیز اس کی نظروں میں گر گئی اور خدا ہی کی عبادت و استعانت کا اقرار کرنا پڑا۔ پس ان تینوں کے بعد ایاک نعبد نے تمام جہان کے جھوٹے معبودوں کی خدائی چھین کر کلمۂ حق لا الہ الا اللہ کو برہانِ قطعی سے ثابت کر دیا۔

استعانت : معونت (مدد) کا طلب کرنا۔ استعانت کے اصول چار ہیں:

(۱) دل میں کسی کام کا ارادہ پیدا کرنا اور اس کی خوبی اور نتیجہ کا حسنِ دل پر نقش کر دینا کہ جس کی وجہ سے انسان اس کی طلب میں سرگرم ہوتا ہے۔

(۲) اس کام کے آلات و اسباب اور سب ساز و سامان بہم پہنچا دینا۔ پھر اس ساز و سامان کی دو قسم ہیں۔ ایک ضروری کہ جس کے بغیر کام تمام نہ ہو۔ بلا لحاظ سہولت۔ دوسرے زائد از ضروری کہ جس سے بآسانی وہ کام تمام ہو جائے۔ مثلاً ایک تو صرف پیٹ بھر دینا خواہ عمدہ غذا ہو یا بری۔ دوسرے یہ کہ عمدہ غذا سے پیٹ بھرنا۔ پس اس قسم اول کے ساز و سامان کو قدرتِ ممکنہ اور دوسری کو قدرتِ میسرہ کہتے ہیں اور استطاعت بھی اسی کو کہتے ہیں۔ پھر یہ ساز و سامان بے شمار ہیں۔ سلامتِ حواسِ ظاہرہ و باطنہ اور خارجی اسباب کا بہم پہنچانا۔ وغیر ذلک۔

(۳) ارتفاعِ موانع۔ اعنی اس کار میں جو چیزیں خلل انداز ہیں (خواہ اس کام میں یا اس کی حسن و خوبی میں) ان کو دفع کرنے کے لیے کہ گو کسی کام کا ارادہ دل میں مصمم ہو اور اس کے سب سامان بھی بہم پہنچیں مگر تاوقتیکہ اس کی حارج اور خلل انداز اور مانع آنے والی چیزوں کو دور نہ کیا جائے وہ کبھی کام انجام کو نہیں پہنچے گا۔

(۴) اس کام پر غرض کا مرتب ہونا کیونکہ گو ایک گروہ کی یہ رائے ہے (کہ جب دونوں چیزیں ہوں گی یعنی ساز و سامان اور ارتفاعِ موانع ہو گا تو خواہ مخواہ اس فعل کا نتیجہ یا غرض پیدا ہو گی) مگر ہم خدائے تعالیٰ کو قادرِ مطلق مان چکے ہیں۔ ہر چند اس کی عادت یوں ہی جاری ہے کہ وہ ان دونوں باتوں کے بعد اثر کو فعل پر مرتب کرتا ہے لیکن وہ قادر ہے چاہے تو نہ ہونے دے چنانچہ جس طرح کبھی کبھی اپنا یدِ قدرت دکھانے کو بغیر سامان و اسباب کے اثر مرتب کر دیتا ہے اسی طرح گاہے اسباب پائے جانے اور موانع نہ ہونے پر بھی اثر کو مرتب نہیں ہونے دیتا۔ کبھی آگ نہیں جلاتی، پانی سے سیرابی نہیں حاصل ہوتی، بے لشکر کے فوجوں کو ہزیمت دے دیتا ہے، بے ساز و سامان غیب سے کام کر دیتا ہے اس کو ہم خرقِ عادات کہتے ہیں جو اپنے خدا کو عاجز کہے اور اس کا انکار کرے ہمیں اس سے کیا؟ مگر ہمارا خدا تعالیٰ قادر ہے۔ اس چوتھی قسم کو برکت بھی کہتے ہیں پس جن کاموں پر اثر مرتب نہیں ہوتا یا حسبِ دلخواہ نہیں ہوتا تو وہاں کہتے ہیں کہ اس میں برکت نہ ہوئی اور اسی لیے ہر کاروبار میں خدا کا نام لینا اس برکت کے لیے طریقۂ اسلام قرار پا گیا۔ پس جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سامان کا بہم پہنچنا کافی ہے وہ اپنے زعمِ فاسد میں اپنی احتیاج کا سلسلہ خدا سے منقطع جانتے ہیں اس لیے نہ وہ برکت کے قائل ہیں نہ ہر کام میں اس کا نام لینا سودمند سمجھتے ہیں جیسا کہ اکثر اہلِ یورپ اور ان کے مقلد نیچری۔ خدا تعالیٰ ان کو اس گمراہی سے نجات دے۔ پس یہ جس قدر معونت ہیں سب خدا ہی کے خزانہ

غیب سے عطا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کے دامنِ تربیت تلے محتاجانہ پرورش پاتا ہے۔ وہ خود محتاج ہیں ان کی ہستی بھی گھر کی نہیں چہ جائیکہ اور کمالات ان سے اور کوئی کیا خاک مدد مانگے

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

وہ لوگ کہ جو مخلوق پرستی کرتے ہیں۔ جیسا کہ معنیٔ عبادت میں بیان ہوا وہ ان معبودوں سے حاجات بھی طلب کرتے ہیں پس خدا تعالیٰ نے لفظ اِیَّاکَ مقدم کر کے جب بندہ کے منہ سے حالتِ مشاہدہ میں یہ اقرار کرایا کہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں تو ان تمام غلط مذاہب کو مٹا دیا اور راہِ توحید دکھا دیا۔ اس مسئلہ کو بھی حضرت خاتم الانبیاء علیہ السلام نے لوگوں کے دلوں پر ایسا مدلل کر کے بٹھا دیا کہ جس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اس لیے اس نبی علیہ السلام کا پیرو ہر جگہ موحد کے لقب سے ممتاز ہے۔

سوال : بلاشک جو قومیں کہ مخلوق پرستی کرتی ہیں خواہ اس مخلوق کو اس کا مظہر بنا کر پوجیں یا جہتِ قبلہ کی توجیہ کریں جو کچھ ہو بہر حال صریح گمراہی میں ہیں مگر ہندوستان کے بعض مسلمان بھی تو اس سے بری نہیں۔ دیکھئے کوئی تعزیہ پوجتا ہے' کوئی کسی قبر کو سجدہ کرتا ہے' کوئی طاق بھرتا ہے۔ الغرض جس طرح ہندو کرتے ہیں اسی طرح یہ بھی کرتے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کو پوجتے ہیں اور یہ اپنے بزرگوں کو۔

جواب : اس سے اسلام پر کوئی عیب نہیں لگتا کیونکہ اسلام نے ان باتوں کی ممانعت کر دی ہے جو کرے گا وہ عدالتِ اسلام کا مجرم ہوگا۔ پس خالص مسلمان تو ان باتوں کے پاس بھی نہیں جاتے۔ ہاں صحبتِ ہنود سے اگر بعض جہلا ایسا کرتے ہیں تو برا کرتے ہیں۔ دیکھو زنا کو شرع نے حرام کر دیا اب جو کوئی مسلمان اس کا مرتکب ہو تو اس سے اسلام پر کچھ عیب نہیں لگتا۔ یہ اس شخص کی برائی ہے۔

اسرار : (۱) یہ کہ لفظ اِیَّاکَ کو جو ضمیر منصوب منفصل ہے لفظ نَعْبُدُ سے مقدم کیا چند حکمتوں کے لئے۔

(اول) یہ کہ عبادت بندہ کی طرف سے اس شاہنشاہِ حقیقی کے لیے ایک ہدیہ یا نذرانہ ہے۔ پس اس کا مقتضاء یہ ہے کہ اس نذرانے سے پیشتر جس کے لیے نذرانہ ہے اس کا وجود اور اس کا جلال آنکھوں میں سما جائے۔ کیونکہ جب تک بادشاہ قائم اور اس کا وجود مسلم نہیں تو نذرانہ اور ہدیہ بھی قائم نہیں ہو سکتا۔

(دوم) یہ کہ خدا تعالیٰ کی ذات قدیم اور بندہ اور اس کی بندگی حادث ہے تو جو چیز مقدم الوجود ہے جب تک کوئی اور وجہ عارض نہیں تو اس کو ذکر میں بھی مقدم کرتے ہیں۔

(سوم) یہ کہ عبادت ہر چند غذائے روحانی ہے مگر یہ جسم اور اس کے مقتضیات جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں ان پر عبادت شاق گزرتی ہے اور لہو ولعب میں آرام آتا ہے۔ دیکھئے ناچ میں رات بھر نیند نہیں آتی' مسجد میں تھوڑی سی دیر میں اونگھنے لگتے ہیں اور درحقیقت یہ عبادت خدا تعالیٰ کی وہ امانت ہے کہ جس کا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ الآیہ میں اشارہ ہے۔ سو یہ بوجھ بھاری بغیر کسی سہارے کے نہیں اٹھ سکتا۔ پس اس تکان اور ماندگی کو دفع کرنے کے لیے بیشتر شربتِ حضوری کا جام پلا دیا کہ اس کے نشہ اور سرور میں چور ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر ہمہ تن عبادت میں مستغرق ہو جائے اور اس پر تکان و ماندگی نہ آئے۔

ہر چند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم

دیکھئے جب کوئی کسی پر عاشق زار ہوتا ہے تو جب اس ... کہ محبوب کا نام ... لے کر کوئی اس ... سے کیسا ہی بھاری کام کو کہتا ہے تو اس ... کے نشہ میں آ کر

کس خوشی سے کرتا ہے اور جب وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر یوں کہے کہ تیرے قربان (کیونکہ عبادت دراصل قربان ہونا ہے) محبوب کا تو نام سننے سے دل بے قرار ہو جاتا ہے چہ جائیکہ وصال اور مشاہدۂ جمال ہو۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

پس اس لیے ایاک کو مقدم کیا۔

(چہارم) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عابد کو لازم ہے کہ اولاً بالذات معبود کی طرف دھیان رہے اور عبادت کو صرف اپنے اور اس کے بیچ میں ایک عمدہ واسطہ اور رابطہ جانے نہ یہ کہ عبادت یا اس کے ثواب و جزا پر نظر کرے۔ کس لیے کہ کامل عبادت یہ ہے کہ اور تو کیا اپنی ہستی کو بھی بھول جائے اور سوائے معبود کے اور کچھ نظر نہ آئے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت عالمِ غرور سے عالمِ سرور کی طرف اور اشغالِ خلق سے حضرتِ حق کی طرف جانا ہے اور یہ محویت کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عشقِ مجازی میں محبوب کو دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر مصر کی عورتوں نے بیخود ہو کر ترنج کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پس اس مجازی محبت اور جمال کا یہ حال ہے تو اس حقیقی محبوب اور حقیقی جمال میں کیا مقال ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عبادت کے تین مرتبہ ہیں پہلا مرتبہ یہ کہ عبادت ثواب کی امید اور عذاب کے خوف سے کی جائے۔ دوسرا مرتبہ یہ کہ اپنی عبادت کے قبول ہونے سے بزرگی اور کمال پیدا کرنے کے لیے عبادت کرے۔ تیسرا درجہ یہ کہ خدا کی خاص خدا ہی کے لیے عبادت کرے (یعنی وہی مقصود ہو)۔ تینوں میں یہ اخیر مرتبہ بلند ہے پس اس لیے ایاک کو جو ذاتِ الٰہی پر دلالت کرتا ہے مقدم کیا۔

(پنجم) اگر لفظ ایاک کو مقدم نہ کرتے تو حصر اور خصوصیت نہ سمجھی جاتی۔ پس ان مذاہبِ باطلہ کا اس لطف و خوبی کے ساتھ رد نہ ہوتا۔ کیونکہ یہاں اور معبودوں کی عبادت کنایۃً مٹائی گئی ہے اور اور کنایہ صراحۃ سے ابلغ ہوتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(۲) یہ کہ لفظ نعبد جمع متکلم کا صیغہ بولا اعبد نہ کہا اس میں بھی کئی حکمتیں ہیں: (اول) یہ کہ عبادت ایک نہایت عمدہ فعل ہے۔ اس کے لیے خلوصِ نیت اور حضورِ قلب شرط ہے اور یہ ہر شخص کو میسر آنا مشکل ہے اس لیے اپنی عبادت کو اور اچھے لوگوں کی عبادت میں شامل کر دیا تا کہ وہ کریم ان کے طفیل میں اس کو بھی قبول کر لے۔ مثل مشہور ہے لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرتا ہے۔

(دوسرے) یہ کہ عبادت کا استحقاق تربیت اور رحمت اور بندوں کی حاجت روائی کی وجہ سے ہے (کہتے ہیں جس کا کھائیے اس کا گائیے) اور اس کی پرورش ایک دو کے لیے نہیں بلکہ تمام جہان کے لیے ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔ پس اس کی عبادت بھی تمام جہان پر فرض ہوئی۔ پس اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے (کہ نہ تنہا میں بلکہ اے خداوندِ عالم ہم سب تیری عبادت کرتے ہیں) جمع کا صیغہ بولا۔

(تیسرے) یہ کہ یہ سورہ نماز میں پڑھی جاتی ہے اور نماز میں جماعت مقصود ہے (تا کہ شوکتِ اسلام معلوم ہو اور ایک کا دوسرے کو حال معلوم ہوا کرے اور باہم محبت پیدا ہو اور ایک پر دوسرے کے انوار منعکس ہوں اور بہتوں میں ایک نہ ایک خالص بندہ بھی ہوتا ہے اس کے ساتھ عبادت کرنا قبولیت کا باعث ہے) پس اس مقصود کی طرف اشارہ کرنے کو لفظ جمع لایا گیا۔

(چوتھے) یہ کہ اگر اعبد کہتے تو اس میں عابد کو یہ خیال آتا کہ میں عبادت کرتا ہوں اور کوئی نہیں۔ سو اس وسوسہ کے مٹانے کے لیے جمع متکلم کا صیغہ نعبد کہا تا کہ معلوم ہو کہ اور ہزاروں ہیں میں کیا ہوں۔

(۳) کہ نعبد مضارع کا صیغہ بولا کہ جو حال اور استقبال دونوں کو شامل ہے ماضی عبدنا نہ کہا۔ کس لیے کہ حضوری کا مقام یہ چاہتا ہے کہ اس وقت بھی عبادت کی جائے اور آئندہ کے لیے اس کا عہد کرے۔ سو یہ بات مضارع میں حاصل ہے نہ ماضی میں۔ اور اسی قدر اسرار ایاك نستعین میں ہیں ان سب کو وہاں خیال کر لیجئے۔ طولِ کلام سے ڈر کر بس کرتا ہوں۔

(۴) عبادت کو مقدم کیا اور استعانت کو مؤخر اس میں چند اسرار ہیں۔

(اول) یہ کہ اول بادشاہوں کے حضور میں پیشتر کوئی تعظیم اور کورنش بجالا کر اور کچھ ہدیہ یا نذرانہ پیش کر کے عرضِ حال اور سوال کیا کرتے ہیں گو خدا تعالیٰ کو دنیاوی بادشاہوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں مگر فطرتِ سلیمہ کا یہی مقتضا ہے۔ اس لیے اول عبادت کو اس کے حضور عالی میں پیش کر کے اپنی عبودیت کا اظہار کر دیا۔ اور اس کی خوشنودی کو حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ایاك نستعین کہہ کر سوال کیا۔ خلاصہ یہ کہ عبادت وسیلہ ہے استعانت' سوال' مطلب اور ہمیشہ وسیلہ مقدم ہوتا ہے۔

(دوم) یہ کہ ایاك نعبد یہ چاہتا ہے کہ نفس کو عبادتِ الٰہی سے ایک بڑا رتبہ حاصل ہو اور اس میں ایک قسم کی خود پسندی پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ تو اسی لیے اس کے بعد ایاك نستعین کہہ دیا کہ یہ عبادت بھی تیری ہی مدد اور اعانت سے ہوتی ہے تا کہ اس مرض کا علاج ہو جاوے۔

(سوم) اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ استعانت اسی سے چاہتے ہیں کہ جس کی عبادت کرتے ہیں کیونکہ عبادت کا وہی مستحق ہے کہ جو خالق اور مربی اور ہر طرح کی قدرت و اختیار رکھتا ہو اور وہ مستحق طلبِ اعانت بھی ہے۔ گویا کہ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ پھر ان دونوں لفظوں کے جمع کرنے میں بھی حکمت ہے (الف) یہ کہ مرتبہ عبودیت دو باتوں سے کامل ہوتا۔ اول یہ کہ عبادت کرے۔ دوم یہ کہ اپنے آپ کو محتاجِ محض سمجھ کر ہر کام میں اسی سے مدد مانگے کس لیے کہ جو نوکر ہمیشہ خدمت گزاری کرتے ہیں اور اپنی حاجات کا اظہار مولیٰ سے نہیں کرتے نہ اس سے طالب امداد ہوتے ہیں تو ان سے کسی قدر بوئے نخوت آیا کرتی ہے اور ان کا فدوی مخلص ہونا ثابت نہیں ہوتا بالخصوص اس آقا کے روبرو جو دے کر خوش ہوتا ہے اور جو مانگنے کا حکم دیتا ہے۔ پس اس لیے ایاك نعبد کے بعد ایاك نستعین کہہ دیا۔ (ب) یہ کہ تکملہ عبادت کا ہے۔ اعنی پوری اور اصل عبادت جب ہی پائی جاتی ہے کہ جب ہمہ تن عجز و انکسار ہو کر اس کے آگے ہاتھ پھیلایا جاوے۔ کس لیے کہ اس وقت وہ روحانی نیاز اور ارتباط پیدا ہوتا ہے کہ جو بہت سی عبادت سے نہیں ہوتا۔ اور اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے (مشکوٰۃ) اور اسی لیے ہر عبادت کے ساتھ دعا کا مانگنا اسلام میں لازم قرار دیا گیا۔ نمازِ پنجگانہ کے بعد ہمیشہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام دعا مانگا کرتے تھے اور سب انبیاء اکثر اوقات دعا کرتے تھے اور اسی لیے حکیموں کا قول ہے کہ جب بندہ دعا کرتا ہے تو عرشِ الٰہی کو جنبش ہوتی ہے یعنی بندے اور خدا میں جو واسطہ اور رابطہ ہے وہ زندہ ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے بعد اکثر بندہ کا مقصود خدائے تعالیٰ عطا بھی کرتا ہے۔

(ج) یہ کہ دنیا کے جس قدر فریق مشرک ہیں وہ اپنے خیالی معبودوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور پھر ان سے ہر حاجت کا سوال بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ اب بھی ہنود بتوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر مانگتے ہیں اور بعض آدمیوں سے بھی اولاد و مال و تندرستی و عزت مانگا کرتے ہیں۔ پس شرک کی یہ دو شاخ ہیں ایک عبادت دوسرے استعانت اس لیے خدا تعالیٰ نے پہلے تین آیتوں میں دو دلائل قائم کر کے (کہ جن سے اس کے ماسوا ہر چیز کا محتاج اور حادث ہونا ثابت ہو) ان دونوں شاخوں کو جڑ سے کاٹ دیا کہ بندہ کے منہ سے دربارِ خاص میں بہت سی جماعت کے روبرو اپنا جلوہ دکھا کر یہ اقرار کرا دیا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں نہ اور کسی کی اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں نہ اور کسی سے (د) یہ کہ دنیا میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ اول جبری جو کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ اختیار نہیں جو کچھ کرتا ہے وہی کرتا ہے۔ ہم تو لکڑی پتھر کی طرح بے اختیار ہیں۔ دوم قدری کہ جو ہر چیز میں اپنے آپ کو فاعل مختار اور موجد اور قادر سمجھتے ہیں۔ سوم اہلِ حق کہ جو نہ بندہ کو مختارِ محض کہتے ہیں نہ بے اختیارِ محض۔ چونکہ وہ دونوں فریق غلطی پر ہیں کس لیے کہ اول گروہ تو شریعت بلکہ کل معاملاتِ دنیاوی کا ابطال کرتا

اور خدا کی ذاتِ مقدس میں عیب ثابت کرتا ہے۔ پس ان کی رد میں تو اِيَّاكَ نَعْبُدُ فرمایا کہ جس سے بندہ کو عبادت کا اختیار ثابت ہوتا ہے اور دوسرا فریق کارخانہ خالقیت میں حصہ پیدا کرتا ہے۔ ان کی اصلاح کے لیے لفظ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فرمایا کہ جس سے بندہ کا محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مسائل فقہیہ: اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خدائے تعالیٰ کے سوا اور کسی کی پرستش حرام ہے خواہ وہ اور کوئی ہو نہ اور کسی کو سجدہ درست ہے نہ رکوع۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا حضرت! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا کریں آپ نے منع فرمایا (مشکوٰۃ) اور نہ کسی کے نام کا روزہ رکھنا جائز ہے اور نہ غیر اللہ کے نام سے صدقہ و خیرات کرنا درست ہے نہ اور کسی گھر کا خانہ کعبہ کی طرح طواف درست ہے نہ احرام باندھ کر جانا یہاں تک کہ ذبیحہ پر بھی غیر اللہ کا نام لے کر ذبح درست نہیں اور اسی طرح غیر اللہ سے مدد مانگنا بھی درست نہیں۔ نہ اور کسی کو قاضی الحاجات و دافع البلیات خیال کرنا روا ہے۔

سوال: جب یہ بات ہے تو پھر مسلمان ایک دوسرے سے کیوں مدد مانگتے ہیں۔ کوئی کسی سے پانی مانگتا ہے' طبیب کے پاس علاج کے لیے جاتے' بادشاہوں اور امراء سے سوال کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس حالانکہ ان باتوں کو کوئی بھی منع نہیں کرتا نہ ان کے مرتکب کو کوئی مشرک کہتا ہے۔

جواب: استمداد کی دو قسم ہیں۔ ایک یہ کہ جس سے امداد چاہتا ہے اس کو عالمِ اسباب میں ایک حیلہ اور مددِ الٰہی کا مظہر جانتا ہے اور دراصل مدد کرنے والا خدا ہی کو سمجھتا ہے چونکہ وہ اور کے دل میں القا کرتا ہے تو وہ کام کر دیتا ہے اور یہ کہ اسی غیر کو مستقل جانتا ہے۔ قسم اول کی استمداد درحقیقت خدا تعالیٰ سے استمداد ہے نہ اس غیر سے اور دوسری قسم غیر سے ہے۔ اس لیے قسم اول مباح اور قسم دوم حرام ہے اور سوال مذکور میں جو استمداد ہے وہ قسم اول سے ہے۔ اسی لیے علماءِ اسلام نے یہ فرمایا ہے کہ جو طبیب کو صحت بخشنے والا جانے گا اور دوا کو مستقل مؤثر سمجھے گا مشرک ہوگا۔ ہاں دوا کو اور حکیم کو ایک سبب جانے اور خاص فاعل اسی کو سمجھے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اور اسی طرح انبیاء اور اولیاء اور صلحاء سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم کرنا عبادتِ غیر اللہ نہیں۔ کس لیے کہ یہ بھی صرف خدا تعالیٰ کے واسطے سے کیا جاتا ہے نہ ایسے افعال میں عبادت پائی جاتی ہے مگر افراط و تفریط نہ چاہیے۔

فروعات: (۱) اس حکم کو قرآن مجید میں اور جگہ بھی بکثرت فرمایا' وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ''میں نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے''۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (ترجمہ) ''تیرے رب نے یہی حکم دیا ہے کہ اسی کو پوجو'' اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ خدا سے مدد مانگو۔ اور بہت سی آیات ہیں۔ اس حکم کا اسلامیوں پر وہ اثر ہوا کہ کبھی کسی نبی کی امت پر نہیں ہوا۔ پنجگانہ نماز (کہ جس میں روحانی اور جسمانی عبادت اور استعانت اور استغفار اور اپنی عاجزی اور خدا کی شکرگزاری اور اس کی ثناء و صفت اور دعا ہے) پھر اس کے ساتھ سنن اور نوافل اور پھر شب بیداری کہ جس کی نسبت فرمایا ہے يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (ترجمہ) ''خدا کے خالص بندے اس کے لیے سجدہ اور قیام میں شب گزاری کرتے ہیں اور پھر صبح اور شام اور زوال وغیرہ اوقات سفر و حضر سونے جاگنے' کھانے پینے کے اذکار بیشمار اسلام کے شرف کی دلیلِ واضح ہے۔ یہ بات کسی مذہب و ملت میں نہیں۔ پھر مالی عبادات اور ریاضتِ صوم و حج بھی اس ملت میں فرض ہے۔ یہ نہیں کہ جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے۔ پھر اس عبادت اور توحید کا نور اور سرور جو کچھ اہلِ اسلام کے دلوں پر جلوہ گر ہوا اور اب تک ہے اس کا نظیر بھی کہیں اور کسی امت میں پایا نہیں جاتا۔ محبت اور خوفِ الٰہی سے شب بھر رونا اور اس مزہ میں بے خود و مست ہونا کہ نہ تن کی خبر نہ بدن کی۔ سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین بلکہ اولیائے متاخرین حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی قدس سرہ اور حضرت بایزید بسطامی اور حضرت جنید بغدادی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی وغیرہم کے احوال بیان کرنے کی یہاں

گنجائش نہیں۔ خود آنحضرت ﷺ کے سینۂ فیض گنجینہ سے ایک ہانڈی کے جوش کی طرح شوقِ الٰہی میں آواز آیا کرتی تھی۔ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو شام سے صبح ہو جاتی مگر اس ذوق میں ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اسی لیے ان لوگوں کی روحانی قوت اس درجہ کو غالب آ گئی تھی کہ جو انبیاءِ بنی اسرائیل سے معجزات سرزد ہوئے ہیں وہ ان سے کرامات صادر ہوئی ہیں کہ جن کو لوقا اور مرقس سے زیادہ ترثقہ لوگوں نے مشاہدہ کیا اور اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ حواریوں کے حالات اور ان کی تاریخ و ملفوظات کو عیسائی انجیل اور کتاب الٰہی کہتے ہیں ہم ان بزرگواروں کے حالات کی کتابوں کو قرآن اور کلامِ الٰہی نہیں کہتے مگر دونوں برابر ہیں کوئی کچھ کہا کرے۔ چونکہ ان کے ہاں کتابِ الٰہی نہ تھی اگر یہ لوگ ان تاریخوں کو انجیل کہہ کر دل خوش نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید کلامِ الٰہی موجود ہے ہم کو اس تکلیف کی کیا ضرورت۔ اس بات سے ان کی تاریخیں (کہ جن کو انجیل کہتے ہیں) معتبر اور ہماری تاریخیں غیر معتبر نہیں ہو سکتیں نہ وہ ہم سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان باتوں کو قرآن مجید میں دکھلاؤ۔

(۲) چونکہ اس مذہب میں یہ نورِ عبادت و توحید ہمیشہ ہے اس لیے ان کے ہاں وہ لوگ کہ جن پر فیضِ روح القدس نازل ہوتا ہے ہمیشہ چلے آئے ہیں اور عیسائیوں کے ہاں یہ بات چونکہ حواریوں میں تھی کہ ان پر روح نازل ہوتی تھی جس سے وہ صدہا کرامات دکھاتے تھے۔ زہر ان پر اثر نہ کرتا تھا' بیمار ان کے ہاتھ لگانے سے تندرست ہو جاتے تھے' سانپوں کو اٹھا لیتے تھے۔ (مرقس) مگر ان کے بعد دینِ مسیحی میں تحریف و تبدیل ہو کر فرق آ گیا وہ بات جاتی رہی پھر کوئی ایسا نہیں ہوا نہ کوئی عیسائی ایسا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اب کیا حواریوں کے بعد سے کوئی سچا عیسائی نہ رہا۔ ورنہ اس فیضِ روحانی کے بند ہونے کی کیا وجہ؟

(۳) آپ جان چکے ہیں کہ بندے سے کرامات جب صادر ہوتی ہیں کہ وہ قربِ خدا حاصل کرتا ہے کیونکہ دراصل ہر چیز پر وہی قادر ہے لیکن جب بندہ اس کی صحبت میں رہتا ہے تو جس طرح آگ کا لوہے پر اثر آ کر اس کو بھی جلا دینے والا بنا دیتی ہے یا جس طرح پھول اپنی صحبت میں مٹی کو معطر بنا دیتا ہے یہی حال عابد و عارف کو خدائے تعالیٰ کی قربت سے نصیب ہوتا ہے تو پھر اس کی زبان اس کا بیان ہو جاتی ہے

جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

کس لیے کہ جب ممکنات میں اثر و تاثیر کا یہ حال ہے پھر وہ تو قادر و ذوالجلال ہے اور یہاں سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت کا فائدہ بندہ کے لیے ہے خدا کو کچھ ضرورت نہیں وہ بندے کے نفع کے لیے حکم دیتا ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

ہم کو سیدھے راستے پر چلا

ترکیب: اِهْدِ امر حاضر معروف اَنْتَ اس کا فاعل اور نَا مفعول اول۔ اور الصِّرَاطَ موصوف الْمُسْتَقِيْمَ صفت دونوں مل کے مفعول ثانی۔ فعل اپنے فاعل اور دونوں مفعولوں سے مل کر جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا اور معنًا یہ نستعین میں جو اعانت مطلوب تھی اس کا بیان ہے کہ ہم آپ سے یہ استعانت چاہتے ہیں کہ آپ ہم کو ہر امر میں خواہ دینی ہو یا دنیوی سیدھے راستے پر چلائیں۔ افراط و تفریط یعنی کمی زیادتی سے بچائیں۔ پس پہلے جملے سے ربط اس طور سے ہوا۔

معانی الفاظ: ہدایت: زبانِ عرب میں مقصود کا رستہ دکھانا یا مطلوب تک پہنچانا ہے اور ہدیہ (تحفہ) سے چونکہ تحفہ دینے والوں کی محبت معلوم ہوتی ہے اس لیے اس کو ہدیہ کہتے ہیں اور ہوادی الوحش ان وحشی اور صحرائی جانوروں کو کہتے ہیں کہ جو سب کے آگے آگے چلا کرتے

ہیں کیونکہ وہ ان سب کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن عرف میں اس کا استعمال نیک چیزوں کی رہنمائی میں ہوتا ہے۔ اور وہاں کہ جہاں فائدہ اور بھلائی حاصل ہو۔ پس اس لیے چوری' بدکاری وغیرہ کا رستہ بتانے کو ہدایت نہ کہیں گے نہ قید خانہ کی راہ بتانے کو ہدایت بولا جائے گا۔ اور قرآن میں جو (کہ ان دوزخیوں کو جہنم کا رستہ بتلاؤ) آیا ہے تو علیٰ سبیلِ استہزا آیا ہے۔ چونکہ علماء میں سے بعض کہتے تھے کہ ہدایت کے معنی راہ دکھانا اور بعض کہتے تھے کہ مطلوب تک پہنچانا تو اس کا فیصلہ بعض محققین نے یوں کیا ہے کہ جہاں اس کا استعمال مفعول ثانی کی طرف لام اور الیٰ کے ذریعہ سے ہوگا تو وہاں اراءۃ الطریق یعنی راہ دکھانا مراد لیا جاوے گا۔ جیسا کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ اور هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور جہاں کہ بغیر ان دونوں کے ہوگا تو وہاں ایصال الی المطلوب ہوگا یعنی مقصود تک پہنچانا جیسا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ فقیر کہتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بعض پر اس کا خلاف بھی ہے پس اس امر میں قرائن اور مواقع سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

تفسیر: خدا تعالیٰ کی ہدایت کے بے شمار اقسام ہیں کہ جن کا شمار کرنا مشکل ہے لیکن ان کی اجناسِ عالیہ یہ ہیں:

اول مرتبہ: ہدایتِ الہامی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مطلب کا القا ہوتا ہے جیسا کہ بچہ کو پیدا ہوتے ہی دودھ پینا اور رو کر اپنی حالتِ درد کو بیان کرنے کا الہام ہوتا ہے۔ درختوں کو زمین سے پانی چوس کر بڑھنا' پھل پھول لانا' شاخوں کا فضا کی طرف پھیلنا۔ علیٰ ہذا القیاس عالم میں سے کوئی چیز بھی اس کے فیض سے محروم نہیں اور خدا تعالیٰ کے وجود کا علم ہے اور اس پر ہم ایمان لائے ہوئے ہیں اور وہ بھی اسی قسم کی ہدایت کا ثمرہ ہے اس کی طرف اس آیت کا اشارہ ہے اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى کہ "ہر شے کو اس کے مناسب طور پر پیدا کر کے رہنمائی کی"۔

دوسرا مرتبہ: ہدایتِ احساسی کا ہے کہ حواسِ ظاہری کان' آنکھ' ناک' چکھنا' چھونا (۲) حواسِ باطنی' حسِ مشترک' خیال' وہم' حافظہ' قوتِ متصرفہ عطا فرما کر گرم و سرد' نافع و مضر چیزوں کا تمیز کرنا بتلایا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو انسان کیا بلکہ حیوان کی زندگی نہ ہوتی۔ یہ فیض تمام حیوانات پر ہے۔ اس کی طرف بھی آیتِ مذکورہ میں اشارہ ہے۔

تیسرا مرتبہ: ہدایتِ عقلی ہے کہ جو چیز حواس سے غائب ہے اور جہاں کہ حواس کی رسائی نہیں وہاں انسان کی عقل مدرکاتِ حواسِ ظاہری اور باطنی سے کلیات انتزاع کر کے فی الفور کام لیتی ہے۔ دیکھئے جب کان میں بہت سے لوگوں سے کسی واقعہ کی خبر پہنچتی ہے تو عقل اسی وقت اس خبر کی صداقت کا حکم لگا دیتی ہے۔ وہاں استدلال اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس فیضِ الٰہی سے حکماء' حمقاء تمام انسان بلکہ جن اور فرشتہ بھی فیضیاب ہیں اس کی طرف بھی آیتِ سابقہ میں اشارہ ہے۔

چوتھا مرتبہ: ہدایتِ استدلالِ عقلی ہے۔ یعنی جہاں بداہتِ عقل کی رسائی نہیں وہاں مقدمات ترتیب دے کر نتیجہ نکالنا اور اس ذریعہ سے کسی نامعلوم چیز کو حاصل کرنا اور یقین پیدا کرنا۔ اس امر میں عقلاء و حکماء مخصوص ہیں۔ اس لیے ان کے اقوال کی عام لوگ پیروی کرتے ہیں۔ مگر عقل سے بسا اوقات قوتِ وہمیہ مقابلہ کر بیٹھتی ہے اور اس کو راہِ راست یعنی صراطِ مستقیم سے پھرا کر ادھر ادھر وادیِ اغلاط میں لے جاتی ہے۔ اسی لیے حکماء کے اقوال اور رائیں کبھی باہم متعارض اور مخالف بھی ہوتی ہیں۔ ایک حکیم کچھ کہتا ہے تو دوسرا اس کے برخلاف فرماتا ہے اور کبھی خود ایک ہی شخص ایک وقت ایک بات دریافت کر کے اس پر دل کو جما لیتا ہے۔ پھر دوسرے وقت آپ ہی اس کو غلط بتلاتا ہے۔ ہر چند اس غلطی سے بچانے کے لیے حکماء نے فنِ منطق بنایا مگر اس نے تو اور بھی پریشانی میں ڈال دیا۔ پس اس لیے خدا تعالیٰ نے اس کے واسطے

پانچواں مرتبہ: ہدایت کا الہامِ انبیاء علیہم السلام قائم کیا کہ جہاں عقول عاجز آ جاویں وہاں خدا تعالیٰ الہامِ انبیاء کے ذریعہ سے رہنمائی کرتا ہے۔ پس اس لیے جس طرح عامیوں کو عقلا و حکما کے اقوال پر اعتماد تھا اسی طرح حکماء و عقلا کو انبیاء علیہم السلام کا اتباع ضرور ہوا کیونکہ

ان کی رہنمائی کا یہی لوگ سبب ہیں۔ یہاں سے آپ کو ضرورتِ نبوت بھی بخوبی معلوم ہوگئی پس جو لوگ کہ منصبِ نبوت کے منکر ہیں جیسا کہ براہمہ وہم کی دلدل میں دھسے ہوئے ہیں۔ چوتھے مرتبہ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ کہ انسان کو ہم نے نیک و بد دونوں رستے بتلائے اور اس پانچویں مرتبہ کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا کہ ہم نے انبیاء کو پیشوا بنایا کہ وہ ہمارے حکم کی رہنمائی کرتے ہیں۔

چھٹا مرتبہ : ہدایتِ انکشافی ہے کہ خدائے تعالیٰ بندہ کے دل سے حجابِ ظلمانی اٹھا کر اس کو عالمِ غیب کا مشاہدہ کرادے اور ہر چیز کی اصل حقیقت دکھادے یہ ہدایت کا انتہائی مرتبہ ہے۔ یہ خواص انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے کہ جن کی اطاعت تمام خلق پر فرض ہے اور ان کے مریدوں اور پیروں میں سے بھی ان لوگوں کو (کہ جن کے قلوب میں آئینہ کی طرح ان کے انوار قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے) اس ہدایت میں سے کچھ حصہ مل جاتا ہے اور ان پیروں کو حواری یا اولیاء اور کبھی محدث کہتے ہیں۔ اس ہدایت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ جنہوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہے ہم ان کو اپنا رستہ بتلا دیں گے۔ آپ کو یہاں سے نبی اور ولی کے معنی بھی بخوبی معلوم ہوگئے اور جو لوگ کہ نبوت کو بڑھئی لوہار کے کام کا ملکہ قرار دیتے ہیں ان کی غلط فہمی بھی معلوم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دنیا کے تمام کاروبار اور عمدہ صنعتیں اور تدابیر ملک اور آخرت کے احکام اور قواعدِ شریعت سب خدا کی ہدایت کا نتیجہ ہیں۔

مگر آپ کو یہ بھی یاد رہے کہ یہ جتنے امور ہیں سب میں سیدھا رستہ ضرور ہے اور جہاں افراط و تفریط ہوئی' سیدھے رستے سے الگ ہوا مقصد میں خرابی آئی۔ پس اسی لیے خدا تعالیٰ نے اِھْدِنَا کے بعد الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ذکر فرمایا یعنی یہ تعلیم کی یوں دعا مانگو کہ اے خدا ہم کو ہر امر میں سیدھا رستہ دکھا۔

واضح ہو : کہ جب تک ہر امر میں افراط (زیادتی) و تفریط (کمی) معلوم نہ ہوگی صراط مستقیم یعنی درمیانہ پن معلوم نہ ہوگا۔ پس سب سے پیشتر ہم عبادت اور استعانت میں جو افراط و تفریط ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔ عبادت میں افراط یہ ہے کہ جہاں خدا کی کسی صفت کا ظہور دیکھے اسی کو پوجنے لگے جیسا مجوس اور ہنود کرتے ہیں انہوں نے کوئی چیز بھی نہ چھوڑی یہاں تک کہ جب ہندوستان میں ریل جاری ہوئی اور انجن کو جو بغیر بیل اور گھوڑوں کے خود بخود دوڑتا دیکھا تو بہت سے ہندوؤں نے ہر ہر کر کے اس کے آگے ڈنڈوت کی اور ریلشر مہاراج بنایا اور تفریط یہ کہ معاشِ دنیا اور کاروبار میں ایسا مشغول ہو کہ ذرا بھی خدا کی طرف توجہ نہ رہے عبادت تو کجا جیسا کہ اہلِ یورپ کا دستور ہے۔[1] شاید پیرس اور لندن اور برلن وغیرہ شہروں میں کبھی کوئی خدا کا نام لیتا ہوگا۔ اور اسی طرح استعانت میں افراط یہ ہے کہ ہر چیز کو سبب سمجھ کر اور وسیلہ حاجات جان کر اس سے سوال کرے اور ستاروں کی تاثیر سے اپنی سعادت و نحوست سمجھے۔ اور گھر اور بیوی اور ہتھیاروں اور دیگر اسباب معیشت میں نحوس و سعادت کا خیال کر کے سودائی بن جائے اور عناصر اور آفتاب و ماہتاب اور ارواحِ انسانیہ اور دیگر غیر مرئی چیزوں کو خدا تعالیٰ کے خزانۂ غیب کا داروغہ یا مالک یا مختار جان کر ان سے مدد مانگے اور ان کے نام سے نذر و نیاز اور ہول و جگ کرے جیسا کہ ہنود کرتے ہیں اور ویدوں میں اب تک یہی مضامین بھرے پڑے ہیں کہ جس سبب سے یہ لوگ ہر چیز سے ڈرتے اور ہر چیز سے امیدِ نفع رسائی کی رکھتے ہیں اور تفریط یہ کہ دوا و غذا وغیرہ اسباب معتبرہ کو بے اعتبار جانے اور خدا سے دعا کرنا اور نیکی اور خدا کی راہ میں دینے کو خیر و برکت کا سبب نہ سمجھ کر ان سے اعراض کرے اور جو چیزیں کہ عالمِ اسباب میں مؤثر ہیں ان کو فضول اور بے اعتبار جانے۔ اگرچہ صراط مستقیم کی تفصیل علم

---

۱ بخلاف اس کے اہلِ اسلام کا کوئی شہر ایسا نہیں کہ جس میں پانچوں وقت بآوازِ بلند خدا کی توحید و تقدیس نہ پکاری جاتی ہو اور پھر سیکڑوں خدا کے بندے مل کر اس کی ثناء و صفت اور اس کی شکر گزاری اور اپنے گناہوں سے استغفار اور اس سے دعا نہ کرتے ہوں اور اس کے آگے اپنے جسم و روح سے نہایت پاکیزہ حالت بنا کر نہ جھکتے ہوں۔ یہ سچے دین کی علامت ہے بالخصوص مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں تو ہمہ وقت یہی حالت رہتی ہے۔ فقیر مکہ معظمہ میں جبل صفا کے نزدیک مقیم تھا شب کو تمام شب تکبیر و تحلیل کی آواز کانوں میں آتی تھی۔ ۱۲ منہ

اخلاق کی کتابوں میں خوب کی ہے مگر کسی قدر مختصر طور پر یہاں بھی بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لان مالا یدرک کله ولا یترک کله

واضح ہو : کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو تین قوتیں عطا فرمائی ہیں:

(اول) قوتِ درّاکہ کہ جس سے ہر چیز کو جانتا ہے جس کو قوتِ عقلیہ اور نطقیہ بھی کہتے ہیں پس اس سے جس چیز کو جانتا ہے وہ یا خدا کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے دنیا و آخرت میں آثار ہیں اور ان کے جاننے کو علمِ الٰہی کہتے ہیں اور اس میں افراط یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی کنہ حقیقت دریافت کرنے لگے اور اس کی صفات میں گھوڑے دوڑانے لگے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگ باہم قیل و قال اور سوال کریں گے کہ یہ چیزیں تو خدا نے بنائی ہیں خدا کو کس نے بنایا۔ پس جب یہ نوبت پہنچے تو یہ کہو کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔ (متفق علیہ) اور اس کے لیے جسم اور مکان اور شکل اور حدوث اور صورت وغیرہ وہ صفات ثابت کرے جو اس کے تقدس کے منافی ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ ہنود نے ایسا ہی کیا ہے کہ خدا کو مجسم اور حضرت آدم علیہ السلام کا ہمشکل اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں مانا اور کچھ لوگوں نے[1] سور شیر وغیرہ حیوانات کی شکل میں ہو کر اس کا دنیا پر آنا اور کھانا پینا وغیرہ وہ باتیں ثابت کی ہیں کہ جن سے وہ بری ہے اور خالق کو مخلوق کے ساتھ مشابہ بنا دیا ہے تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ یا بندہ کو عاجزِ محض جان کر تمام قبائح زنا و چوری کو اسی کی طرف نسبت کرے جیسا کہ جبریہ کرتے ہیں۔ یا یہ اعتقاد کرے کہ ایمان لانے کے بعد پھر بندے کو کسی گناہ پر عذاب دینا اس کا دستور نہیں بندہ جو چاہے سو کرے جیسا کہ پولوس اور اس کے مریدوں نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ ان کے مقلد اہلِ اسلام میں سے بھی بعض لوگ ہیں جن کو مرجیہ کہتے ہیں اور تفریط یہ کہ اس کی صفات کا انکار کیا جاوے اور اس کو اپنے خیال میں جزئیاتِ مادیہ کے علم سے بے بہرہ جانے اور ایسا عاجز جانے کہ سوائے عقل اول کے اور کوئی چیز اس نے پیدا ہی نہیں کی جیسا کہ حکماءِ یونان اور مجوس کا عقیدہ ہے اور یہ کہ اس کی صفاتِ سمع و بصر وغیرہ جو نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہیں ان سے بلا کسی وجہ وجیہہ کے انکار کیا جاوے اور یہ کہ اس کو گناہ بخشنے سے عاجز قرار دیا جاوے کہ بغیر اس بات کے کہ وہ سب کے عوض میں آدمی کی شکل میں خود آ کر کفارہ ہو۔ یہود کے ہاتھ سے صلیب پر کھینچا جاوے گناہ معاف نہیں کر سکتا جیسا کہ پادریانِ حال کا عقیدہ ہے اور یہ کہ جمیع افرادِ عالم میں اسباب ہی کو مؤثر جان کر خدائے تعالیٰ کو نکما اور بیکار جانے جیسا کہ آریہ[2] کا عقیدہ ہے اور یہ کہ بندہ کو خالقِ مستقل جان کر افعالِ عباد کو اس کے قبضۂ قدرت سے علیحدہ سمجھے جیسا کہ حال کے عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور اہلِ اسلام میں سے معتزلہ ان کے مقلد ہیں اس کے علاوہ اور بہت سی افراط و تفریط ہیں اور یا وہ چیزیں کہ جن کو بندہ جانتا ہے ارواح و ملائکہ و انبیاء و اولیاء و ائمہ دین ہیں ان کے علم کو نبوات کہتے ہیں اور اس میں افراط یہ ہے کہ ان لوگوں کو ایسا بڑھائے کہ درجہ خدائی تک پہنچائے جیسا کہ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا اور اس کا بیٹا کہتے ہیں یا بعض جہلا ان چیزوں کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غیب داں ہیں ان کو بندوں کی حاجت براری اور فریاد رسی کی مستقل قدرت ہے[3] یہ خیال کر کے ان کی تصویروں کو اور ان کی قبروں کو اور تعزیہ کو پوجتے ہیں اور ان سے اولاد اور مال اور تندرستی اور عزت و آبرو مانگتے ہیں۔ جیسا کہ ہنود عناصر اور دیوتاؤں اور بہت سے انسانوں کو اس لیے پوجتے ہیں چنانچہ رگوید اور یجروید میں ان کی پرستش کے طریقے اور ان کی مدح میں منتر اور سکت ان ویدوں کی سنہتا میں مندرج ہیں اور اسی طرح پارسیوں کے دساتیر ان ہی باتوں سے بھرے پڑے ہیں جو چاہے دیکھ لے یا ان کو یوں سمجھے کہ خدا چاہے نہ چاہے یہ ہماری حاجت کو پورا کریں گے۔ اور حشر میں خواہ مخواہ اپنے پرستش کرنے والوں کو

---

۱ ہندو کہتے ہیں کہ ایشر یعنی خدا کئی بار جب کہ اس کو ضرورت پڑی۔ سور' شیر' کچھوے' انسان کے جسم میں ظاہر ہوا اور ان چیزوں کو اوتار کہتے ہیں جن میں سے راجہ رام چندر جی اور کرشن جی بھی اوتار مانے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ بھی قریب اسی کے ہی ہے کہ خدا تعالیٰ بشکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوا۔

۲ ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے جس کے اس زمانے میں پیشرو دیانند سرستی تھے۔

۳ بخلاف وسیلہ گردانے یا ان کے مزاروں کو محل رحمت و استجابت خیال کرنے کے اس میں کسی کو کلام نہیں۔ ابوالحسن حقانی

رنج وغم سے رہائی دیں گے جیسا کہ ہنود اپنے دیوتاؤں کی نسبت اور مسیح علیہ السلام کی طرف عیسائی اب تک یہی اعتقاد رکھتے ہیں اور بعض جاہل اپنی جہالت اور سفاہت سے حضرات اولیاء اور انبیاء اور ان کے مزاراتِ مقدسہ سے ایسی لغو باتیں عمل میں لاتے ہیں یا کسی ولی کو نبی کے رتبہ میں خیال کیا جاوے اور نبی کو شریکِ خدائی کر دیا جاوے جیسا کہ عیسائی کرتے ہیں اور تفریط یہ کہ سرے سے غیر محسوس چیزوں کا منکر ہو جاوے۔ پس نہ وجودِ ملائکہ کا قائل ہو۔ نہ جن و شیطان کے وجود اور انبیاء علیہم السلام کو صرف رفارمر یعنی ناصح اور واعظ جانے' نہ ان کے انکشاف کا معتقد ہو' نہ ان کے خرقِ عادات معجزات و کرامات کا قائل جیسا کہ آج کل یورپ کے ملحدوں کا عقیدہ ہے اور ہندوستان میں ان کے مرید نیچریوں کا اعتقاد ہے یا انبیاء علیہم السلام کو معصوم و محفوظ نہ جانے' نہ ملائکہ کی عصمت کا قائل ہو بلکہ اپنے نفسِ خبیث پر قیاس کر کے ان کو بھی ہر طرح کے گناہ میں ملوث سمجھے جیسا کہ اہلِ کتاب کا عقیدہ ہے کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کو اپنی[1] دونوں بیٹیوں سے زنا کرنے والا اور حضرت ہارون[2] علیہ السلام کو بچھڑا پوجنے والا اور حضرت داؤد[3] علیہ السلام کو اوریا کی بیوی بنت سبع سے حرام کرنے والا اور حضرت سلیمان علیہ السلام[4] کو بت پرستی کرنے والا سمجھتے ہیں اور یہ باتیں ان کی تورات اور دیگر کتبِ الہامیہ میں مذکور ہیں اور جیسا کہ ہنود دیوتاؤں کو کہ جن کو وہ فرشتہ کہتے ہیں زنا کار اور سخت مکار جانتے ہیں۔ چنانچہ اندر کا گوتم کی جورو سے زنا کرنا کتبِ مسلمہ ہنود میں مندرج ہے اور یہود میں بھی ہاروت ماروت کا قصہ مشہور تھا کہ انہوں نے شراب پی کر زہرہ سے زنا کیا کہ جن کی تقلید سے بعض ناسمجھ مفسروں نے اس بے اصل قصہ کو قرآن مجید کی تفاسیر میں لکھ دیا۔[5] یا انبیاء علیہم السلام کے رتبہ کا لحاظ نہ کر کے ان کو بڑے بھائی کے برابر قرار دے دیا جاوے وغیر ذلک من العقائد الفاسدہ۔ یا وہ چیزیں کہ جن کو جانتا ہے قبر اور دوزخ اور جنت اور حساب اور میزان وغیرہ امورِ آخرت کے معاملات ہیں اور ان کے علم کو علمِ معاد اور علمِ سمعیات بھی کہتے ہیں اس میں افراط یہ ہے کہ ایمان کو ایسا مؤثر جانے کہ پھر اس کے لیے کوئی گناہ مضر نہ سمجھے اور جزائے اعمال میں خدا تعالیٰ کو محض مجبور جان کر گناہ بخشنے یا کسی عمل کے قبول نہ کرنے پر قادر نہ جانے جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے اور تفریط یہ کہ یا تو سرے سے بعد مرنے کے جزا و سزا' عذاب و ثواب' قبر و حشر کا قائل نہ ہو جیسا کہ دہریوں کا عقیدہ ہے اور جو قائل ہو تو پھر ادنیٰ سے گناہ کو بھی ایمان کا زائل کر دینے والا جانے جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے یا وہاں کے عذاب و ثواب کو خیالی عذاب و ثواب جانے جیسا کہ عیسائیوں اور حکماءِ یونان اور ان کے مقلد نیچریوں کا عقیدہ ہے یا وہاں کے لذات اور عقوبات کو فانی جانے اور دنیا کے انقلابات پر محمول کرے وغیر ذلک یا وہ چیزیں کہ جن کو انسان جانتا ہے علاوہ ان کے اور جواہر و اعراض ہیں کہ جن کے علوم کو علیٰ حسب اختلاف الموضوع علمِ طبعی اور ریاضی کہتے ہیں۔ پھر ہندسہ اور ہیئت اور نجوم زیچ اور اکر اور علم الحیوان وغیرہ بہت سے علوم انہیں علوم کے موضوعات کی شاخیں ہیں۔ پس ان میں افراط یہ ہے کہ ان میں ایسا مشغول ہو کہ دنیا و مافیہا سے خبر نہ رہے یا نجوم اور طلسم نیرنجات اور کیمیا وغیرہ ان فنون میں مشغول ہو کہ جو کارآمد نہیں۔ یا ان کی تاثیراتِ سعادت و نحوست ہی کا قائل ہو اور تفریط یہ کہ بالکل ان علوم سے بے بہرہ رہے یا ان چیزوں کی تاثیراتِ جسمانیہ کا بھی مطلق قائل نہ ہو۔ المختصر اس قوتِ ادراکیہ یا عقلیہ میں افراط و تفریط بری ہے' درمیانی حالت عمدہ ہے اور اس کو حکمت کہتے ہیں کہ جو انسان کا بڑا کمال ہے اور

---

[1] کتاب پیدائش ۱۹ باب

[2] کتاب خروج ۳۲ باب

[3] کتاب دوم سموئیل ۱۱ باب

[4] کتاب اول سلاطین ۱۱ باب

[5] چنانچہ پادری فانڈر کی کتاب میزان الحق اور سید احمد خان صاحب نیچری کی تفسیر الفرقان میں مذکور ہے جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں اس کی خوب تشریح ہو چکی ہے۔

صراطِ مستقیم کا مصداق اور اس کی افراط کو جربزہ کہتے ہیں یعنی عیاری و طراری اور تفریط کو عباوت اور بلادت (دوسری قوتِ شہویہ) ہے کہ جس پر منافع حاصل کرنے کا مدار ہے اور اسی کی وجہ سے مرغوب چیزوں کی خواہش ہوتی ہے۔ پس اس کی افراط یہ ہے کہ کھانے پینے اور جماع کرنے وغیرہ لذائذ میں ہمہ تن مصروف اور سراسر گرفتار ہو جائے اور اس مرتبہ کو فجور اور خلاعت بھی کہتے ہیں جس کا ثمرہ فحش اور بے حیائی ہے اور اس کی تفریط یہ ہے کہ جس قدر لذائذ اس کے لیے حلال اور مباح ہیں اور جن پر معیشتِ دنیا کی بنیاد قائم ہے ان کو بھی ترک کر بیٹھے جیسا کہ رہبان اور ہندوؤں کے فقیر جوگی اور گسائیں وغیرہم کرتے ہیں۔ قرآن اور نبی علیہ السلام نے جس طرح افراط سے منع فرمایا اسی طرح اس تفریط سے بھی کہ جس کو خمود کہتے ہیں بڑی تاکید سے روکا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ ''کہہ کس نے خدا کی ان ستھری اور زینت کی چیزوں کو حرام کیا ہے کہ جو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں'' اور نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ ''کہ اسلام میں رہبانیت کا کچھ کام نہیں'' اور ان دونوں حالتوں کی درمیانی حالت کہ جس پر صراطِ مستقیم صادق آتا ہے عفت ہے یعنی اپنی خواہشِ نفسانی کو عقل اور شرح کے تابع بنانا اور اس عفت سے بہت سے اخلاقِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ صبر' قناعت' جود' سخاوت اور پھر سخاوت سے کرم اور ایثار کہ اور لوگوں کو بھلائی میں اپنے نفس پر مقدم رکھنا اور معاملات میں مساہلت یعنی فروگذاشت کرنا۔ اور تیسری قوت غضبیہ ہے کہ جس کے طفیل انسان خطرناک کاموں میں گر پڑتا ہے اور اپنے نفس اور اس کے متعلقوں سے مضرت کو دفع کرتا ہے اس افراط کو تہور کہتے ہیں کہ بغیر مصلحت جرأت اور دلیری کر بیٹھنا کہ جس طرح شیر وغیرہ درندے کرتے ہیں اس سے ظلم اور بے رحمی وغیرہ قبائح پیدا ہوتے ہیں۔ اس تہور کو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں منع فرمایا ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کہ اپنی جانوں کو ہلاکی میں نہ ڈالو اور اس صفت کی تفریط کو جبن یعنی نامردی کہتے ہیں۔ بے غیرتی اور بزدلی کہ جو انسان کو اس کے ہم چشموں میں ذلیل و خوار اور غیر لوگوں کا غلام اور رعیت اور تابعدار بنا دیتی ہے اسی کا ثمرہ ہے۔ اس کی برائی بھی قرآن اور احادیث میں بکثرت آئی ہے اور صراطِ مستقیم یعنی درمیانی حالت کو شجاعت کہتے ہیں کہ جس سے بہت سے اخلاقِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ علوِ ہمتی اور استقلال اور حلم اور تحمل اور حمیت وغیر ذلک۔

قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں ہر ایک جانب کا اور توسط کا اور پھر جو ان سے اخلاقِ پسندیدہ پیدا ہوتے ہیں ان کا بکثرت بیان ہے۔ بخوفِ تطویل ہر مقام پر آیت لانا مناسب نہ جانا جو چاہے کتبِ اخلاقِ محمدیہ دیکھ لے۔ پس جب یہ تینوں قوتیں کامل ہو جاتی ہیں اعنی توسط کے مرتبہ میں آتی ہیں کہ جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں تو اس کو عدالت کہتے ہیں کہ جس کی نسبت خدائے تعالیٰ قرآن مجید میں اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ فرماتا ہے پھر اس عدالت سے بے شمار اخلاقِ حمیدہ پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ محبت اور وفا اور شفقت کہ جس کو خدا ترسی کہتے ہیں اور کسی کے احسان کا بدلہ دینا اور حسنِ صحبت اور توکل اور ہر حقدار کا حق ادا کرنا کہ جس کا ثمرہ توحید و ایمان و طاعتِ خدا اور سول اور رعیت و ملک و شہر کی خیر خواہی اور ماں باپ بیوی اولاد یا عزیزوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا' عمدہ تربیت کرنا' غلاموں اور نوکروں اور بے زبان چارپایوں پر رحم کرنا' ان کی وسعت سے زیادہ کام نہ لینا' ان کی خوراک وغیرہ ضروریات کو بخوبی ادا کرنا وغیرہ وغیرہ اخلاقِ حمیدہ کہ جن کو فطرتِ انسانیہ اچھا جانتی ہے۔ ان سب باتوں کو خدا تعالیٰ نے ایک آیت میں کس خوبی سے ادا کر دیا ہے کہ مثل نہیں اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ پس جب آپ کو لفظ ہدایت اور صراطِ مستقیم کے معنی بخوبی معلوم ہو گئے تو اب اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ بندہ کو خدائے تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ تو مجھ سے یہ دعا کر کہ اے خدائے تعالیٰ تو مجھ کو صراطِ مستقیم (کہ جو ہر امر کی درمیانی حالت ہے) نصیب کر کیونکہ جب انسان کو صراطِ مستقیم پر چلنا نصیب ہوا تو سعادت مل گئی کہ جس کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں آئے ہیں اب اس دعا کو دیکھئے کہ جس کو پادری گرجا میں عبادت کے وقت پڑھتے ہیں۔ وہ یہ کہ اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو تیری بادشاہت آدے۔ تیری مرضی جس طرح آسمان پر ہے ویسی زمین پر بھی

ہووے ہماری روز کی[1] روزی آج ہمیں دے الخ۔ بلاشک ان دونوں میں زمین وآسمان کا تفاوت ہے۔ پس جس کی معرفت یہ دعا الہام ہو اس کو نبی نہ کہا جائے اور دعائے نان کے معلم کو نبی کہا جاوے اگر سخت ناانصافی اور تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟

نکات : (۱) یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان بیشمار علمِ اخلاق کی باتوں کو کہ جن کی تصریح آگے چل کر قرآن میں کی ہے اور پھر اپنے نبی ﷺ کی زبان سے احادیث میں بیان کرا دیا ہے سب کو سمیٹ کر ایک مختصر سے لفظ میں رکھ دیا کہ جو ہر وقت بندہ کو ہر طرح کی نیک چلنی کی طرف بلاتا ہے اور حالتِ ابتدائی میں تفصیل کرنا قانونِ تعلیم کے منافی ہے۔

(۲) یہ کہ لفظ صراط آیا تا کہ عارف کی نظر میں پل صراط کا خیال پیدا ہو اور یہ جان لے کہ یہ تمام شریعت اس روز پل صراط کی صورت میں ظہور کرے گی۔ جو یہاں اس پر بآسانی چلتے ہیں وہاں اس پر وہ بآسانی چلیں گے۔ اگر لفظ طریق بولا جاتا تو یہ مطلب حاصل نہ ہوتا۔

(۳) یہ کہ صراط کے بعد لفظ مستقیم آیا اس کی جگہ سویٰ وغیرہ دیگر الفاظ جو سیدھے ہونے کے معنی پر دلالت کرتے ہیں نہیں آئے۔ اس نکتہ کے لیے مستقیم میں استقامت پائی جاتی ہے کہ جس سے یہ ارشاد ہوا کہ صرف ایک بار ان اخلاقِ حمیدہ سے موصوف ہونا کافی نہیں بلکہ ان پر مداومت ہونی چاہیے اور ایک ملکہ پیدا ہونا چاہیے کہ جس کو استقامت کہتے ہیں چنانچہ ایک جگہ خود فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (ترجمہ) جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر قائم بھی رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غم کھاویں گے اور اسی لیے جس بات پر استقامت نہیں اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ چنانچہ یہ قول مشہور ہے کہ الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔ پس لفظ مستقیم میں ہمیشہ ان باتوں پر قائم رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) یہ کہ اھد ناذکر کیا اھدنی بصیغۂ واحد نہ آیا اس میں چند مصلحتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ یہ دعا ہے اور دعا جب سب لوگ مجتمع ہو کر کرتے ہیں وہ زیادہ قبول ہوتی ہے کیونکہ جب بہت سے قلوب عالمِ بالا کی طرف ہمت کرتے ہیں تو ان کے اثرِ ہمت کو عالمِ بالا سے مقصود کے وجود میں بڑا علاقہ ہے پس کبھی وہ دعا مصائب کے دفع کرنے میں صرف ہوتی ہے اور کبھی عالمِ حس میں متشکل ہو کر مقصود اور مطلوب بن جاتی ہے اور یہ ایک سِرِّ الٰہی ہے کہ جس کو ہر شخص نہیں جانتا۔

(۲) یہ کہ جب تک سب کو ہدایت نہ ہو تو اس دعا کرنے والے کا بھی پورا مقصد نہ پایا جاوے۔ کس لیے کہ تمام کاروبارِ عالم کے ایک دوسرے سے متعلق ہیں پس جب ایک راہِ راست پر ہو اور نہ ہوں تو اس کو بڑی دقت پیش آئے اور دینی ودنیاوی معاملات میں بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور جب کہ گھر یا شہر کے سب یا اکثر لوگ راہِ راست پر ہوتے ہیں تو کامل فائدہ ہوتا ہے۔

(۳) یہ کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم خلق کی خیر خواہی اور دوسروں کی بھلائی کے بھی درپے رہو۔ نفسا نفسی نہ کرو۔ پس دعا میں جس طرح ان کو شریک کرتے ہو تو اس پر عمل بھی کرو کہ اور کاروبار میں ان کو شریک کرو اور رفاہِ عام کا لحاظ رکھو۔ (۴) یہ کہ دعا عاجزی اور احتیاج کا ثبوت ہے پس جس طرح وہ رب العالمین ہے اسی طرح اس سے سب کو اظہارِ احتیاج اور عاجزی کرنی چاہیے۔

واضح ہو کہ صراطِ مستقیم کو عقلِ سلیم پہچان سکتی ہے مگر اکثر اوقات وہم دخیل ہو کر غلطی میں ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے آپ دنیا میں سینکڑوں اختلافات اور ہزاروں تناقضات دیکھتے ہیں۔ دیکھئے جن چیزوں کو اہلِ عقلِ سلیم برا کہتے ہیں ان کو کج فہم بھلا بتلاتے ہیں۔ تمام بنی آدم گوشت کھانے کو مباح مانتے ہیں مگر تھوڑے سے ہندو برا جانتے ہیں۔ علی ہذا القیاس بحکم "کس نگوید کہ دوغِ من ترش است" ہر شخص اپنے

[1] کیا اسی تعلیم کو الہام اور نبوت درکار ہے؟ اے حضرت پیٹ بھرنے کی دعا تو گدھا بھی ہر روز مانگتا ہے۔ چنانچہ اس دین میں جنت اور دوزخ یہی دنیا کی عیش ونا کامی ہے اسی لیے عیسائی نماز میں یہی دعا مانگتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست حقانی

مذہب وملت' اخلاق وعادات' معاشرت ومعاملات کو راہِ راست بتلاتا اور صراطِ مستقیم کا مصداق ٹھہراتا ہے۔ حلال خوروں سے پوچھئے تو وہ لال گرو کی اطاعت ہی کو باعثِ نجات بتلاتے ہیں۔ ہندو بت اور عناصر پرستی ہی کو مکتی کہتے ہیں۔ عیسائی تثلیث وکفارہ والوہیتِ مسیح کو ماننا حیاتِ ابدی کہتے ہیں۔ پارسی آتش پرستی ہی میں سرگرم ہیں۔ الغرض کسی کے کچھ اقوال وافعال ہیں کسی کے کچھ اور بچن[1] اور کرم[2] ہیں مگر یہ تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ نہ سب حق ہیں نہ سب باطل کیونکہ نہ اجتماع النقیضین ممکن ہے نہ ارتفاع النقیضین۔ پس اس لیے ان میں ایک فریق صراطِ مستقیم پر ہے اور سب ضلال مبین میں گرفتار اور خوار ہیں۔ کس لیے کہ بری چیز کو بھلا جان کر اس پر نقدِ عمرِ عزیز کو صرف کرنا بڑے خسارہ کی بات ہے اور اسی لیے اس جہلِ مرکب کو حکمانے مرضِ لا دوا مانا ہے اور خدائے تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں اس کو سب سے بڑا مرض گردانا ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا "تم کہو کہ آؤ ہم تم کو بتلا دیں کہ سب سے زیادہ کون خسارہ میں پڑے ہوئے ہیں وہ کہ دنیا میں جن کی کمائی اکارت گئی اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔"

ے

بروزِ حشر شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختہ عشق در شبِ دیجور

کیا خوب کہا ہے کسی نے ے

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
خواجہ را حاصل بجز پندار نیست

لیکن جہاں عقل غلطیوں کی سخت دلدل میں پھنس جاتی ہے تو رحمتِ الٰہی اس کو الہامِ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ سے نجات دیتی ہے یعنی ایسے اختلافات میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کسوٹی ہیں کہ جو ان سے مطابق ہیں تو ٹھیک ورنہ صراطِ مستقیم سے الگ ہیں۔ پس اس لیے اس کے بعد یہ فرمایا کہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۠○ ع ۱

ان کے رستہ پر کہ جن پر تو نے فضل کیا نہ ان کے رستہ پر کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا نہ گمراہوں کے راستہ پر (آمین)

ترکیب : صِرَاطَ مضاف اَلَّذِيْنَ مضاف الیہ موصول اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فعل بافاعل وضمیر عاید اس کا صلہ۔ موصول وصلہ مل کر مضاف الیہ ہوا مضاف کا وہ مضاف اپنے مضاف الیہ سے مل کر بدلِ کل ہوا الصراط المستقیم سے۔ یعنی صراط مستقیم سے مراد وہ رستہ ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کا ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ معطوف علیہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ معطوف۔ معطوف اور معطوف علیہ دونوں مل کر الذین سے بدل ہوا۔ یعنی جن پر تو نے انعام کیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن پر تیری خفگی نہیں ہوئی ہے اور نہ وہ گمراہ ہیں تا کہ کوئی انعامِ دنیاوی سمجھ کر گمراہ دولت مندوں اور بادشاہوں کا طریقہ نہ سمجھ لے۔ یہاں یہ سورۃ تمام ہوگئی۔

[1] بچن۔ قول
[2] کرم۔ فعل

تفسیر : نعمت[۱] لغت میں نرمی کو کہتے ہیں۔ثوب ناعم اور جلد ناعم بولتے ہیں۔یعنی نرم کپڑا یا نرم جلد۔پھر اس حالتِ سرور ولذت پر اس مناسبت سے لفظ نعمت[۲] بولنے لگے لیکن مراد اس سے وہ چیزیں لینے لگے کہ جن سے انسان کو راحت اور سرور پیدا ہوتا ہے اور انعام نعمت کسی کو اس طرح پر دینا کہ اس سے صرف احسان مقصود ہو اپنی کوئی غرض نہ ہو اور اسی لیے خدائے تعالیٰ کے سوا کسی کو منعمِ حقیقی نہیں کہہ سکتے ہاں مجازاً اطلاق کر سکتے ہیں۔

ہر چند خدائے تعالیٰ کی نعمتیں بیشمار ہیں جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ترجمہ) ''کہ اگر تم خدا کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے''، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی دوسری اخروی۔پھر دنیوی کی دو قسم ہیں ایک وہبی کہ جس میں بندہ کو کچھ دخل نہیں۔دوسرے کسبی کہ جو بندے کے کسب اور کام سے علاقہ رکھتے ہیں۔پھر وہبی کی دو قسم ہیں ایک روحانی جیسا کہ اس کی روح کو پیدا کرنا اور پھر اس کے بدن سے متعلق کرنا کہ جس کو زندگیِ دنیاوی کہتے ہیں اور پھر اس کو عقل سے منور کرنا اور اس کے متعلق قوی فہم وفکر ونطق وغیرہ عطا کرنا۔دوسرے جسمانی جیسا کہ اس کا بدن پیدا کرنا اور اس میں قوائے غادیہ ونامیہ وغیرہا کہ جن سے اس کا قوامِ بدن ہے، عطا کرنا اور اس کے اعضا ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کو کامل بنانا اور پھر اس کے متعلق کھانا اور کپڑا اور دیگر حوائج وزینت' روپیہ پیسہ' زن وفرزند' مکان و سواری وغیرہ وغیرہ بے شمار چیزیں ہیں یہ نعمتیں خدائے تعالیٰ کی کافر ومومن نیک وبد سب کو عطا ہیں، چونکہ بندہ کو مفت ملی ہیں اس لیے قدر نہیں کرتا اگر ان میں سے ایک تندرستی اور فراخ دستی ہی کو دیکھا جائے تو کیسی نعمت ہے اور پھر ایک آنکھ یا ناک وغیرہ اعضاء کے لیے اگر لاکھوں روپیہ صرف کرے تو کہیں دستیاب نہ ہوں۔ادنیٰ سی بات جوانی میں بالوں کا سیاہ ہونا ہے پھر اس کے لیے بڑھاپے میں لوگ خضاب لگا کر جو کچھ مشقت اٹھاتے ہیں بیان سے باہر ہے۔پھر پانی اور ہوا اور طرح طرح کی خوشبوئیں اور میوے اور قسم قسم کے اناج اور نفیس کپڑے سب خدا کی مخلوق ہیں جو بندہ کے کام میں آتے ہیں بندہ کا اس میں خانہ زاد کچھ بھی نہیں اور کسبی بھی بہت سی نعمتیں ہیں جیسا کہ اخلاقِ حمیدہ سے نفس کو مزین بنانا اور علم وفضل' صنعت اور طرح طرح کی آرائشیں ظاہری وباطنی پیدا کرنا۔یہ بھی سب ادھر سے ہیں لیکن قدرے بندے کے کام کو دخل ہے مگر مراد کو وہی پہنچاتا ہے۔ورنہ اپنی سعی وکوشش سلطنت اور دیگر کمالات حاصل کرنے میں کون کمی کرتا ہے۔اخروی نعمتوں کے بھی بیشمار اقسام ہیں جیسا کہ بندہ کو اپنی معرفت اور ہدایت اور تقرب وغیرہ آخرت کے وسائل عطا کرنا اور اس کے گناہ معاف کرنا اور مرنے کے بعد اس کو عالمِ برزخ (قبر) اور عالمِ حشر میں جنت دینا اور اس میں صدہا وہ نعمتیں کہ جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا ہے نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے اور سب سے بڑھ کر وہاں کا دوام اور اس کا دیدار ہے اللهم ارزقنا رؤيتك في جنت الفردوس۔آمین

---

۱ نُعمت بالفتح۔۱۲منہ

۲ نعمت بالکسر یہ دنیا کی تمام عیش وعشرت' دولت وجوانی' حسن وخوبی' اقبال وشہرت سب خواب وخیال ہیں جس طرح کوئی رات کو خواب میں شادی کرے اور نہایت خرمی اٹھاوے یا تختِ سلطنت پاوے صبح کو جب آنکھ کھلے تو کچھ نہ دیکھنا۔یہی حال اس چندروزہ زندگی اور اس کی بہار کا ہے۔اگر کسی کو اس بات کا معائنہ کرنا ہو تو پرانے کھنڈرات بالخصوص پرانی دہلی میں بادشاہوں کی شکستہ عمارات اور کوشک ہزار ستون کی بنیاد کو دیکھے اور توزک سلاطین تیموریہ کا آئینۂ عبرت لال قلعہ ہے۔دہلی کے کسی بڑے بادشاہ نے اخیر عمر میں جب برسفر تھے کیا حسرت کے یہ اشعار کہے

چوں گل دریں جہاں چمیدیم سیار نعیم وناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشتیم ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

عالم گیر کے اشعار

پس آپ کو جب نعماءِ الٰہی کا کسی قدر حال معلوم ہوا تو اب یہ جان لیجئے کہ اس آیت میں (کہ جن پر اے خدا تو نے نعمت کی ہے ان کی راہ پر چلا) نعمتِ اخرویہ مراد ہے۔کس لیے کہ دراصل جس قدر دنیا کی نعمتیں ہیں سب فانی ہیں باقی نعمتیں اخرویہ ہیں۔سو ان کے مقابلہ میں کالعدم ہیں۔دوم دنیاوی نعمتوں میں تو گمراہ بھی شریک ہیں پھر ان کی راہ کیونکر مطلوب ہو سکتی ہے ان کی راہ تو سیدھی غمکدۂ جہنم میں جاتی ہے اعاذنا الله منها اور یہ بھی واضح ہو کہ جن کو خدائے تعالیٰ نے اخروی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ چار گروہ ہیں جیسا کہ خود ایک جگہ فرماتا ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ''کہ جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا کہ جن پر خدا نے انعام کیا اور وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں اور یہ اچھے رفیق ہیں۔''

آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ عالمِ غیب سے یہ صراطِ مستقیم اول انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتا ہے اور پھر ان کا پرتو صدیقین پر پڑتا ہے اور ان کا شہیدوں پر اور ان کا صالحین پر۔کس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ایک قوتِ نظریہ کہ جس کی وجہ سے اشیاء کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس قوت کی تکمیل کی دو صورتیں ہیں ایک انکشاف کہ روح کو نورِ قدس سے وہ صفائی حاصل ہو کہ پھر حجابات اور ظلمات ادراکِ حقائقِ اشیاء سے مانع نہ آویں۔اس کا قلب عالمِ غیب کا خزانہ ہو جائے اگر بغیر اکتساب وتعلیم یہ بات اس کو حاصل ہے تو وہ نبی ہے۔پھر انبیاء کے بھی مراتب متفاوت ہیں۔اعلیٰ درجہ میں رسولِ اولوالعزم ہیں اور ان سب کا سلسلہ ایک شخص کی طرف منتہی ہے کہ جو عالم روحانی میں خداوند تعالیٰ کے ظہور کا اول پرتو ہے کہ پھر جو اور مخلوقات ہے سب اس کی تفصیلات[۱] ہیں اور عالمِ حسی میں وہ سب سے اخیر ہے۔جس کو حقیقتِ محمدیہ کہتے ہیں علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا خوب کہا ہے کسی نے

تو اصل وجود آمدی ازنخست
دگر ہرچہ موجود شد فرعِ تست

پس چونکہ کل کائنات اسی کے وجود کے انبساطات ہیں اس لیے جس طرح اپنے وجود کا علم ضروری ہے ان کا بھی ضروری ہے۔اس لیے تمام علوم کا سرچشمہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں چنانچہ خود بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ کو تمام اولین وآخرین کے علم دیئے گئے ہیں اور چونکہ بنی آدم از علم یا بدکمال کمال کا اعلیٰ مرتبہ قوتِ علمیہ کی تکمیل ہے اور آپ اس میں سب سے بڑھ کر ہیں۔اس لیے آنحضرت سید المرسلین قرار پائے۔الحاصل نبی وہ ہے جس کی قوتِ علمیہ انکشافِ الٰہی سے نہایت کمال کو پہنچ جائے کہ پھر اس میں غلطی کا احتمال نہ رہے اور اس کی قوتِ عملیہ بھی مکمل ہو جاتی ہے کہ جس سے ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ ومعصوم رہتا ہے اور اس کی روحانی قوت سے خرقِ[۲] عادات ومعجزات اس کی

---

۱ اس کی ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ جس سے ایک چیز کا سب سے اول ہونا اور آخر ہونا سمجھ میں آ جائے۔کسی درخت کے تخم کو دیکھئے کہ وہ اُس درخت کی اصل ہے پھر اُس سے دو پتے نکلتے ہیں یہ ایک مرتبہ تفصیل کا ہوا پھر کس قدر شاخیں نکالتا ہے یہ دوسرا مرتبہ اُس تخم کی تفصیل کا ہوا۔پھر تمام شاخیں اور پتے اور پھل پھول نمودار ہوتے ہیں۔یہ تیسرا مرتبہ تفصیل کا ہوا کہ اُس تخم میں جس قدر یہ چیزیں مجملاً ودیعت تھیں سب باہر آ گئیں اور تفصیل ہو گئیں پھر تخم سب سے اخیر پھل میں آ گیا۔یہ تخم جو پھل میں نمودار ہوا ہوا گر کسی قدر تعینات کا لحاظ کیا جائے تو وہی پھل ہے کہ جس سے یہ تمام درخت پیدا ہوا۔اب دیکھئے یہ تخم سارے درخت سے مقدم ہے مگر موخر بھی ہے۔یہی حال حقیقت محمدیہ اور تمام سلسلۂ انبیاء کا ہے فتامل۔۱۲منہ

۲ معجزات کبھی اقوال ہوتے ہیں جیسا کہ غیب کی خبر دینا اور بے مثل کلام کہ جس میں کہ ہر طرح کی ہدایت مع غایت فصاحت ہو جیسا کہ قرآن مجید یا افعال ہیں جیسا کہ انگلیوں سے پانی جاری کرنا اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا اور درختوں کا حاضر کر دینا۔ایک مشتِ خاک سے لشکر کو اندھا کر دینا وغیرہ وغیرہ اور جس طرح انبیاء کو تصدیق کے لیے معجزات دیے جاتے ہیں اسی طرح اُن کو آیاتِ عقلیہ بھی ملتی ہیں۔پھر ان آیاتِ عقلیہ کی یہی چند قسم ہیں۔ازاں ←

تصدیق کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور جو لوگ ان کے فیضِ صحبت اور اثرِ تربیت سے اس درجۂ علیا کو پہنچتے ہیں ان کو صدیق کہتے ہیں جیسا کہ صحابہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے اور پھر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد اور ہزارہا صدیقین گزرے ہیں کہ جن کے فیوض اور انوار نے ایک عالم کو منور کر رکھا ہے اگرچہ حکمائے اشراقیہ اور دیگر اہلِ ریاضت جیسا کہ ہنود کے جوگی وغیرہم بھی اس انکشاف سے کسی قدر بہرہ یاب ہوتے ہیں مگر بسبب اختلاطِ قوتِ وہمیہ کے غلطیوں سے محفوظ نہیں اور نہ یہ قوت ان کے حدِ کمال تک پہنچتی ہے بلکہ وہ ایسے ہیں کہ جس طرح کسی طائر کے تھوڑے سے پر ہوں اور وہ اچھی طرح نہیں اڑ سکتا کسی قدر تڑپتا ہے اور گر پڑتا ہے اور وہ لوگ عقاب کی طرح اڑتے ہیں اس لیے ان کا اعتبار نہیں ان کا اعتبار ہے اور وہی قابلِ اقتداء ہیں مگر عام لوگ ان کی ان ادنیٰ باتوں پر بھی گرویدہ ہو جاتے ہیں اور ان کو خدا بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک شخص ابن صیاد تھا کہ حضرت نے اس سے دخان دل میں رکھ کر پوچھا تو دُخ کہہ کر رہ گیا اور اب بھی ہزاروں ایسے شعبدہ باز ہیں۔ دوسری صورتِ استدلال اور تجربہ وغیرہ امور ہیں گو ان چیزوں سے عقل کو ترقی ہوتی ہے مگر کمال کو نہیں پہنچتی۔ کس لیے کہ استدلال میں جو کچھ خرابیاں پیش آتی ہیں اس کے تو حکماءِ مشائین بھی قائل ہیں کہ جن کی اصلاح کے لیے فنِ منطق تدوین کیا تھا اور اس کے بعد بھی ارسطاطالیس وغیرہ بہت سے حکیم اغلاط سے نجات نہ پا سکے جیسا کہ ان کے فلسفہ سے ظاہر ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اور تجربہ کا یہ حال ہے کہ انسان کی جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے تجربہ اور مشاہدہ سے عقل بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یونانیوں ا حواس میں بھی فرق آنے لگتا ہے پس جس طرح بوڑھے لوگ دانائی کے لقب سے ممتاز ہیں اسی طرح کم عقلی کا بھی خطاب ان کو ملتا ہے۔ اس کے سوائے تجربہ کو امورِ آخرت وغیرہ یعنی فن نبوات سے کیا علاقہ؟ اس لیے یہ فریق بھی معتبر نہ رہا اور ان کو خود حضرات انبیاء علیہم السلام کا تبع ہونا پڑا۔ دوسری قوتِ علمیہ ہے کہ جس سے کسی قول کے نتیجہ پر یقین کر کے اس کو عمل میں لاتے ہیں۔ پس جن لوگوں پر انبیاء علیہم السلام اور ان کے صدیقوں کا اثر پڑتا ہے اور ان کو ثواب اور وعدۂ الٰہی کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے (گویا یہ اس کے پاس پہنچ گئے ہیں اور اس وجہ سے اس پر یہاں تک عمل کرنے کو آمادہ ہیں کہ اپنی جان تک دریغ نہیں کرتے) ان کو شہید[1] کہتے ہیں گو وہ زندہ ہوں مگر جب اس مرتبہ پر پہنچ

← جملہ اخلاقِ حمیدہ ہیں و بیان شافی و حجۃ واضحہ ہے۔ انوارِ صحبت تکمیلِ نفس ہے کہ اُس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نفس کو کمال حاصل ہو جائے۔ ازاں جملہ خیر و برکات و نیک وقتی ہے کہ اُس کے یمن و برکت سے انسان کو ہر قسم کی نیک چلنی اور خیر و برکت حاصل ہو جائے۔ پس جس طرح کہ ناقص لوگوں کو معجزات سے نبی کی تصدیق ہوتی ہے کاملوں کو اس سے بڑھ کر آیاتِ عقلیہ سے تصدیق ہو جایا کرتی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر معجزات عطا ہوئے تھے کہ آج تک کسی نبی کو نہیں ملے مگر اُن سے دو چند حضرت کو آیاتِ عقلیہ عنایت ہوئی تھیں جس سے اُمت محمدیہ علی صاحبہا السلام کا کمال معلوم ہوتا ہے یعنی جناب محمد علیہ السلام کی اُمت ایسی کوڑ مغزی نہیں کہ ان کو سوائے موٹی موٹی باتوں کے اور لطیف باتوں سے نبوت کے دریافت کرنے کا حصہ ہی نہیں ملا۔ دیکھئے اہلِ سنت اور حکماءِ اشراقیہ آیتِ عقلیہ سے دوسرے شخص کے کمالات کیسے جلد دریافت کر لیتے ہیں اور دیکھئے وائسرائے کا حاکمِ ہندوستان ہونا حامیوں کو ظاہری تجمل فوج و شوکت سے معلوم ہوتا ہے اور جو پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اُن کو اس کی کچھ حاجت نہیں وہ بغیر اس ظاہری تجمل کے یقین کامل کرتے ہیں۔ پس زیادہ ظاہری تجمل کے ساتھ رہنا وائسرائے کی خوبی اور کمال نہیں۔ بلکہ عامیوں کے نقصانِ عقل کی دلیل ہے۔ ۱۲ منہ

[1] پس جس طرح نبی کو اس لیے نبی کہتے ہیں کہ لفظ نبوت کے معنی علم و خبر کے ہیں اور وہ لوگوں کو اپنے علم سے خبر دیتا ہے اسی طرح صدیق چونکہ صداقت والا ہوتا ہے اور نبی کی تصدیق کرتا ہے اس کو صدیق کہتے ہیں اور شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں اور چونکہ گواہ موقع پر حاضر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو شاہد ←

جاتے ہیں تو شہید ہی کہلاتے ہیں اور چوں کہ انہوں نے اپنی حیاتِ مستعار کو دریغ نہ کیا تو اس کے بدلہ میں خدا ان کو حیاتِ ابدی نصیب کرتا ہے کہ جس کی نسبت فرماتا ہے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ''کہ جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔'' کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں ازغیب جانے دیگر است

اور اسی لیے بعد مردن بھی ان کی روح سے امورِ عجیبہ اور اسرارِ غریبہ سرزد ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی یہ کارروائی ملاءِ اعلیٰ کے موافق اور حسبِ خواہش ہوتی ہے تو ان کی یہ خواہش باغ اور خوشبو اور طرح طرح کی راحتوں میں ظہور کرتی ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا میں پھر آنے کی کوئی آرزو نہ کرے گا مگر شہید کہ وہ اس ذائقہ کے لیے پھر آنے کی آرزو کرے گا اور اسی لیے اس شہادت کی آرزو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ واللہ میری یہ آرزو ہے کہ خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور پھر زندہ ہوؤں اور پھر مارا جاؤں (مشکوٰۃ) یہ بات کہ اول قطرۂ خون سے شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں منجملہ اور فضائل کے ایک ادنیٰ بات ہے۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِىْ شَهَادَةً فِىْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِىْ بِبَلَدِ رَسُوْلِكَ ''الٰہی مجھ کو اپنی راہ میں شہادت نصیب کر اور اپنے رسول کے شہر میں موت دیجیو'' چنانچہ خدا نے ان کی دعا قبول کی۔ الٰہی میں بھی دعا کرتا ہوں ؎

آرزو یہ ہے کہ تیری راہ میں
ٹھوکریں کھاتا ہمارا سر چلے

جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے مریدوں میں استیقان رحمہ اللہ یروشلم میں شہید ہوئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہر جگہ صدہا شہید ہوئے ہیں اور اگر یہ دونوں قوتیں کمال پر نہیں پہنچیں مگر اس کو حضراتِ انبیاء سے کمال درجہ کا اتباع ہے تو اس کو صالح کہتے ہیں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر خدائے تعالیٰ نے رحمت کی اور نعمت دی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں قیامت تک صدیق اور شہید اور صالح پیدا ہوتے رہیں گے۔

متعلقات : غضب: انسان کی ایک کیفیت ہے کہ جس میں خونِ دل جوش مارتا ہے اور روحِ حیوانی مکروہ کے دفع کرنے کو اور دشمن کے مقہور کرنے کو باہر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پس یہ بات ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت محال ہے کیونکہ خونِ دل کا جوش مارنا جسمانی چیزوں اور ممکنات کا خاصہ ہے۔ پس اس صفت سے مراد اس کی غایت اور اثر ہے یعنی دشمن اور مخالف کا مقہور کرنا اور تمام صفاتِ رحمت اور استہزاء اور خدع اور مکر وغیرہ جو قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ کی نسبت واقع ہیں سب کے مجازی معنی اثر اور غایت مراد ہے۔ کس لیے کہ خدا تعالیٰ کو ممکنات سے کسی بات میں اشتراک نہیں مگر جب کہ اس کی صفات تعبیر کرنی پڑیں تو لامحالہ وہی الفاظ استعمال کرنے پڑے کہ جو بندوں کی صفات کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ خدا تعالیٰ کا غصہ اس کی برخلافی اور سرکشی پر ہوتا ہے کہ جس کا نتیجہ دین و دنیا کی خرابی و بربادی ہے۔ خدا اپنے غضب سے محفوظ رکھے۔ آمین

ضلال : ہدایت کا ضد ہے۔ یعنی اس رستہ پر چلنا کہ جس سے مقصود کو نہ پہنچے۔ پس جس طرح ہدایت کے مراتب ہیں اسی طرح

← کہتے ہیں اور شہید چونکہ اپنے دل سے ایسی تعمیل کرتا ہے گویا اُس کے نتیجہ کے پاس پہنچ گیا اور حاضر ہو گیا۔ اس لیے اُس کو شہید کہتے ہیں۔ اور چونکہ صالح نیک ہوتا ہے اُس کو صالح کہتے ہیں۔ یہ لغوی معنی ہیں ورنہ حقیقت ہر ایک کی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ ۱۲ منہ

ضلالت کے مراتب مرتبہ ہیں اور جس طرح ہدایت کے مراتب غیر متناہی ہیں اسی طرح ضلالت کے مراتب بھی لاانتہا ہیں۔ الغرض ہر ہدایت کے مقابلہ میں ایک ضلالت ہے۔ پس جس کو دس مرتبے ہدایت کے حاصل ہوئے اس سے اوپر گیارہویں مرتبہ میں ہنوز ضلالت ہے۔ ایک بڑے سے بڑے کامل کو کہ ہنوز اخیر مرتبۂ کمال کی اس کو ہدایت نہیں ہوئی اس مرتبہ کے لحاظ سے ضال کہہ سکتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کو یہ فرمایا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کہ آپ جب تک مرتبۂ نبوت اور وحیِ جلی کی ہدایت کو نہ پہنچے تھے اس مرتبہ میں ضال تھے۔ پھر اس کی آپ کو ہدایت کردی۔ بعض بے علم عیسائیوں نے اس لفظ کو عرفی ضلالت پر محمول کر کے آنحضرت ﷺ کی نسبت قبلِ نبوت گمراہی کا الزام لگایا ہے اور پولوس مقدس پر قیاس کیا ہے کہ ابتداء میں سخت بے دین تھا۔ چنانچہ حضرت استیقان کے شہید کرنے والوں میں شامل تھا اور پھر ہر روز دینداروں کو قتل کرتا اور ستاتا تھا۔ اور دمشق کو کاہنوں کا خط لے کر ایمانداروں کو قتل کرنے چلا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے روحانی تصرف سے اس کو اندھا کر دیا اور پھر یہ شخص عیسائیوں کا وہ پیشوا ہوا کہ جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی ملعون کہا اور تمام شریعتِ موسیٰ علیہ السلام اور تورات کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ یہ سب باتیں کتاب اعمال اور نامجات سے ظاہر ہوتی ہیں۔

یہ ضلالت یعنی گمراہی کبھی اختیاری ہوتی ہے کہ اسبابِ گمراہی کو از خود اختیار کر لیا جاوے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ''کہ ہم نے ثمود کو اسبابِ ہدایت تو میسر کر دیے تھے مگر انہوں نے از خود اسبابِ گمراہی کو اختیار کیا۔'' وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور یہ بات کبھی لذاتِ جسمانیہ کو لذاتِ روحانیہ پر مقدم کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی حبِّ جاہ و مال سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی پابندیِ رسم و عادات سے بھی حاصل ہوتی ہے اور کبھی صحبتِ بد سے اور کبھی نفس کو لذات اور خواہشوں میں شترِ بے مہار کرنے سے اور جب نفس موٹا ہو جاتا ہے تو اسے نیکی سے نفرت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ آج کل ہم اوباشوں کو دیکھتے ہیں کہ دن رات چانڈو اور بھنگ اور افیون اور شراب اور ناچ و رنگ گنجفہ و شطرنج میں غرق رہتے ہیں اور رنڈی بھڑووں کو ہر وقت اپنی صحبت میں رکھنا اور ہاہا ہو اور فحش بکنے میں شب کے دو بجے تک جاگنا اور صبح کو دس بجے اٹھنا اور پھر کنگھی چوٹی میں باقی وقت ضائع کر دینا اور پھر بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی میں مصروف ہونا ان کے خمیر میں داخل ہو گیا۔ الغرض رات دن میں، نہ خدا کا نام بھی ان کے منہ سے نکلتا ہے نہ موت کا دھیان آتا ہے اور نہ دنیا کے کاروبار کا دل و دماغ، نہ سلطنت و ملک کی کچھ خبر۔ عدل و انتظامِ مالی و ملکی تو کجا اور بیدار مغزی سے کیا علاقہ۔ ان لوگوں کا جس طرح حصۂ دینی برباد ہو گیا دنیاوی حصہ بھی برباد ہوتا جاتا ہے۔ اگر باور نہ آئے تو ہندوستان کے رئیسوں اور امیروں کو دیکھ لیجئے اور ان کے ملک کی اندرونی حالت کو غور کر لیجئے انہیں خرافات کی بدولت سلطنتِ تیموریہ برباد ہوئی، انہیں کی وجہ سے لکھنؤ اور مرشد آباد وغیرہ بڑی بڑی ریاستوں پر جھاڑو پھر گئی اور جو باقی ہیں ان کو عبرت نہیں۔ لشکر کی یہ حالت کہ پرانی توپوں پر زنگ لگا ہوا ہے۔ توڑے دار بندوقیں اور بیڈول اور نکمے ہتھیاروں کے بوجھ نے سپاہیوں کی پشت کو توڑ دیا ہے۔ ایک پاؤں میں جوتی تو دوسرا ننگا۔ وردی ندارد اور جو پھٹی پرانی کہیں سرکارِ انگریزی سے نیلام میں خرید لی ہے تو اس کی درستگی کی نوبت نہیں پہنچتی۔ نہ قواعد نہ پریڈ۔ نہ افسر قواعدِ جنگ سے واقف۔ افسر کون؟ وہی امیروں کی نالائق اولاد کہ جن کو اپنے تن کا بھی ہوش نہیں۔ رئیس کے دیوان یا وزیر کون وہی عیاش یا ان کی اولاد کہ جنہوں نے رئیس کو لغویات میں بالکل بے ہوش کر رکھا ہے۔ خزانہ کی حالت تباہ، دروازے پر ہزاروں دادخواہ۔ نہ رعایات میں دینی مدارس نہ فنون کی تعلیم نہ علومِ جدیدہ کے لیے کوئی جماعت مستثنیٰ۔ حتیٰ کہ تمام ملک میں کوئی کارخانہ عمدہ بھی کسی چیز کا نہیں اور جو ہے تو غیر لوگوں کے اہتمام سے۔ نہ یہ توفیق کہ اپنی رعایا میں سے دس بیس کو غیر ممالک میں تعلیم پانے کو بھیج کر اپنی رعایا میں وہ ہنر عموماً شائع کئے جاویں۔ نہ کوئی جنگی فوج کا حصہ

اور اسی لیے باوجودیکہ بندہ اس کے روبرو پہنچ گیا پھر اھدنا الصراط المستقیم کے سوال کرنے کا حکم ہوا کیونکہ قربِ الٰہی کی نہایت نہیں

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہرچہ بردی میرسی بروے

کہ جس سے مخالف کے دل پر کوئی اثر ہو نہ رعایا کو عام قواعد سکھانے کی خواہش۔ نہ والنٹیر لشکر رکھنے کی لیاقت۔ قلم کہاں سے کہاں چل نکلا۔ الغرض اس مرتبہ میں دل پر ایک زنگ لگ جاتا ہے کہ جس کو رین کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ پھر جب اس حالت کو توبہ اور تنبیہ کے صابون سے نہیں دھویا جاتا تو غشاوہ کی نوبت آتی ہے یعنی دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ پھر اس پر جب کچھ مدت گزرتی ہے تو ختم کی نوبت آتی یعنی دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس کے بعد نوبت قفل کی آتی ہے اس کے بعد دل مر جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی نصیحت اثر کرتی ہے نہ کوئی معجزہ کارگر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ اور یہ بھی آتا ہے۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ اور کبھی ضلالت بے اختیاری بھی ہوتی ہے کہ مبدءِ غیب سے اس بدنصیب کو اس کی بد استعدادی کی وجہ سے سامانِ ہدایت عطا نہ ہوئے۔ ایسے شخص کو گمراہِ ازلی اور شقیِ بطنی کہتے ہیں کہ ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت تھا۔ ایسے لوگوں کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور کچھ پروا نہیں۔ پس ان لوگوں سے بے خوف و خطر برائیاں اس طرح ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح مقتضیاتِ طبع سونا، کھانا وغیرہ باتیں بلا تکلف سرزد ہوتی ہیں۔

جب آپ کو نعمت اور غضب اور ضلالت کے معنی بہ خوبی معلوم ہو گئے تو اب ہم ان دونوں آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ آپ جان چکے ہیں کہ صراطِ مستقیم کی وضاحت کے لیے یہ دونوں آیتیں وارد ہیں اور صراطِ مستقیم درمیانی راستہ کو کہتے ہیں اور مخاطب کو وہ نشان دیا کرتے ہیں کہ جس کو وہ جانتا ہو اور جس کو مانتا ہو تو اس لیے خدائے تعالیٰ نے اپنے کلامِ مقدس میں تینوں چیزوں کا ایک ایک ایسا مسلّم وصف بیان کیا اور معلوم و مشہور نشان دیا کہ جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر درمیانی راہ کی دو طرف مخالف ہوتی ہیں ایک افراط دوسری تفریط۔ پس یہ دو ہوئے ایک وہ درمیانی حالت۔ یہ تین رستے نکل آئے اس لیے سب سے مقدم درمیانی رستہ کو تو صراط الذین انعمت سے واضح کیا کہ صراطِ مستقیم وہ ہے کہ جس پر چلنے سے نیک نتیجہ پیدا ہوا اور وہ خدا کی نعمت ہے۔ پس جس رستہ پر نیک نتیجہ مرتب نہ ہو وہ صراطِ مستقیم نہیں کیونکہ صراطِ مستقیم ہوتا تو مطلوب (جو رحمت ہے) حاصل ہوتا۔ یہ نشان صراطِ مستقیم کا وہ ہے کہ جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے اور جو لوگ طبعِ سلیم رکھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ درحقیقت خدا کا کامل انعام انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہی پر ہے۔ اس لیے ان کی پیروی اور تقلید واجب ہوئی اور عہدِ آدم سے اس وقت تک آپ جس قدر بنی آدم کو دیکھیں گے اکثر کو ان چاروں فریق کا مقلد و متبع پاویں گے۔ پس مخاطب کے لیے صراطِ مستقیم ثابت کرنے کے لیے اس جملہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الخ سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں (وللہ الحجۃ البالغۃ) اور اس صراط مستقیم کے ایک جانب مخالف اعنی افراط کو غیر المغضوب علیہم سے واضح کر دیا اور دوسری جانب تفریط کو وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے کھول دیا اور یہ بتلا دیا کہ جن پر خدا کا غصہ بھڑکا اور جو گمراہ ہیں صراط مستقیم سے برطرف ہیں خواہ وہ یہودی ہوں خواہ نصاریٰ خواہ بت پرست ہوں خواہ منافق، گنہگار۔

نکات : (۱) انسان کی پوری سعادت یہ ہے کہ اس کی دونوں قوتیں کامل ہو جاویں اور وہ دونوں یہ ہیں۔ قوت نظریہ کہ جس سے علم و معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور مبدا و معاد کے متعلق عقائد کی درستی میسر آتی ہے۔ دوسری قوتِ عملیہ کہ جس سے عمدہ اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ پس یہ جس کی دونوں قوتیں مکمل ہو گئیں اس کو بڑی نعمت نصیب ہوئی اس لیے اس گروہ کو خدا نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے یاد فرمایا اور اس لفظ سے ان دونوں قوتوں کے مکمل کرنے کی رغبت دلائی۔ اور جس کی اول قوت میں نقصان ہے۔ یعنی خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات قیامت اور رسولوں اور فرشتوں کی بابت برا عقیدہ ہے بلکہ خیالاتِ فاسدہ اور توہماتِ کاسدہ ہی کو علم و معرفت تصور کر کے مست و مغرور ہے تو ان پر غضبِ الٰہی پُر ضرور ہے۔ کس لیے کہ سزا بقدر گناہ ہوتی ہے اور قوتِ نظریہ انسان کی سعادت کا اعلیٰ بازو ہے کہ جو بعد مردن بھی باقی رہتی

مل سکتا ہے خراب کیا تو اس پر غضبِ الٰہی نازل ہوا۔ اور اس گروہ میں کافر و مشرک و منافق اور دہریہ وغیرہم داخل ہیں ان لوگوں کو مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یاد کیا تا کہ سزا اور نتیجہ برا خیال میں آوے اور ہر شخص اس شریف قوت کے خراب کرنے سے ڈر جاوے۔ پس وہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یہود ہیں ہمارے قول کا مؤید ہے اور جس کی قوتِ عملیہ میں خرابی ہے تو وہ چوری، زنا، حسد و بغض وغیرہ بدکام کرتا ہے اور نیک کاموں میں کوتاہی کرتا ہے۔ نماز، روزہ، عبادات، سخاوت، محبت، انصاف وغیرہ چیزوں سے بے بہرہ رہتا ہے۔ سو وہ گو اس مرتبہ کا گنہگار نہیں کہ اس پر غضبِ الٰہی بھڑکے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے۔ مگر راہِ راست اور طریقِ ثواب سے ضرور دور ہے اور اسی لیے کافر کو فاسق سے زیادہ قابلِ عقوبت شرع نے بیان کیا ہے اس فریق کو خدا نے ضالین سے تعبیر کیا تا کہ ان کی ناراستی معلوم ہوجائے۔

(۲) یا یوں کہو کہ بندوں کی تین قسم ہیں (اول) وہ لوگ جو خدا کے ظاہراً و باطناً فرماں بردار ہیں اور ان کو مومن کہتے ہیں (دوم) وہ کہ جو ظاہر و باطن نافرمان ہیں ان کو کافر کہتے ہیں (سوم) وہ کہ جو ظاہر میں کسی خوف یا لالچِ دنیاوی سے فرماں بردارِ شریعت ہیں اور در پردہ مخالف۔ ان کو منافق کہتے ہیں۔ پس اول فریق کو بلفظ انعمت علیہم تعبیر فرمایا اور فرماں برداری کا نتیجہ بتلا دیا۔ دوسرے اور تیسرے فریق کو بلفظ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تعبیر کیا تا کہ ان کے اس کام کا بد نتیجہ معلوم ہوجائے لیکن منافق گو کفر میں کافر کے برابر ہے مگر اس کی فریب بازی سے عام اہلِ اسلام کو مضرت پہنچتی ہے۔ اور اسی لیے جس قدر فتنہ و فساد اول دن سے اسلام میں اب تک واقع ہوئے ہیں انہیں بدنصیبوں کی وجہ سے واقع ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے عہد میں جو کچھ ہوا سو معلوم ہے مگر اب بھی جو فتنے ان لوگوں نے برپا کر رکھے ہیں (کہ بظاہر مسلمان کہلاتے ہیں اور در پردہ اسلام کے سخت دشمن جیسا کہ نیچریہ) فتنۂ مسیح الدجال سے کم نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ ''منافق جہنم کے سب سے نیچے کے درجے میں ہوں گے'' اسی لیے پیشتر ان کو بلفظ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ تعبیر کیا اور کفار کو بلفظ ضالین تعبیر کیا۔ خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ۔

(۳) صراطِ مستقیم کے بیان کرنے میں ضرور تھا کہ تین فریق کا ذکر ہوتا۔ ایک وہ کہ جو صراطِ مستقیم پر ہے۔ دوسرے وہ کہ جو افراط و تفریط میں پڑ کر اس کو چھوڑ گئے لیکن کسی شخصِ خاص یا قومِ خاص کا نام لینا منصبِ نصیحت و پایۂ ہدایت کو مناسب نہ تھا دو وجہ سے۔ اول یہ کہ جس کو صراطِ مستقیم پر قائم کہا جاتا اور جس کو برخلاف کہا جاتا تو وہ خود پسندی اور یہ ناراضگی ظاہر کرتے اور یہ سمجھتے کہ اب تو ہم صراطِ مستقیم پر ہیں کچھ پروا نہیں اور ہم گمراہِ ازلی ہیں جستجو بے فائدہ ہے۔ دوم یہ کہ کسی فریق کے نام لینے سے ان تینوں فریق کے نتیجوں کا ذکر رہ جاتا ہے جو مقصودِ اصلی تھا۔ علاوہ اس کے شارع کے احکامِ کلیہ ہونے چاہییں جو زمان و اشخاص کے بدلنے سے نہ بدلیں اور اقوام کا کیا اعتبار۔ کوئی قوم کبھی کیسی اور کبھی کیسی ہوجاتی ہے۔ اچھوں کو برا اور بروں کو اچھا ہوتے دیکھا ہے۔ پس اس نکتہ کے لیے خدائے پاک نے کسی کا نام نہ لیا بلکہ یہ کہہ دیا کہ صراطِ مستقیم ان کا طریق ہے کہ جن پر فضلِ الٰہی ہوا نہ ان کا کہ جن پر غصہ ہوا۔ نہ ان کا کہ جو بے راہ ہیں۔ ایسی عام نصیحت دل پر مؤثر ہوتی ہے یہاں تک کہ جو مختصراً ہم نے بیان کیا وہ ہر ہر جملہ کی بابت بیان کیا ہے۔ اب ہم مجموعۂ کلام کے نکات اور اسرار بیان کرتے ہیں۔

اسرارِ مجموعہ سورہ: (۱) اس سورہ میں پانچ چیزیں خدائے تعالیٰ کے متعلق اور پانچ بندہ کے متعلق مذکور ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے متعلق یہ ہیں۔ اللہ، رب، رحمٰن، رحیم، مالک اور بندہ کے متعلق یہ ہیں۔ عبادت، استعانت، طلبِ ہدایت، طلبِ استقامت، طلبِ نعمت اور غضبِ الٰہی سے پناہ۔ پس عبادت لفظ اللہ سے اور استعانت لفظ رب سے اور ہدایت لفظ رحمٰن سے اور طلبِ استقامت لفظ رحیم سے اور نعمتِ باقیہ کا طلب کرنا اور غضب سے محفوظ ہونا مالک کے متعلق ہے اور اسی طرح انسان پانچ چیز سے مرکب ہے۔ بدن، نفسِ شیطانی، نفسِ سبعی، نفسِ بہیمی، جوہرِ ملکی سے کہ جس کو عقل کہتے ہیں۔ پس یہ پانچوں چیزیں ان پانچوں اسماء سے ایک مناسبت خاص رکھتی ہیں کہ جس [illegible] ان کی

اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ جوہرِ ملکی اسم اللہ سے چمکتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اور کثافتِ بدنی رب العالمین کے ملاحظہ سے دور ہوجاتی ہے۔ اور نفسِ سبعی کی اصلاح لفظ رحمٰن سے ہوتی ہے اور نفسِ شیطانی کی اصلاح لفظ رحیم سے متعلق ہے اور نفسِ بہیمی پر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے دہشت طاری ہوتی ہے۔ جب ان پانچوں ناموں کی تجلّی سے آدمی بالکل مہذب اور شائستہ ہوگیا ہے تو اپنے مقصود کی طرف چلا۔ پس طاعتِ بدن کے لیے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہا اور نفسِ بہیمی کے زیر کرنے کو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ زبان پر لایا اور نفسِ سبعی کے پنجہ اور شیطان کے چنگل سے رہائی پانے کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہا اور جن کا جوہرِ ملکی کامل ہے (یعنی ارواحِ مقدسہ) ان کی رفاقت طلب کرنے کے لیے صراط الذین انعمت کہا اور غضب سے بچنے اور ارواحِ خبیثہ سے دور رہنے کے لیے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا۔

(۲) جب کہ بندے نے مقامِ مناجات میں کھڑے ہوکر کمالات و صفاتِ باری تعالیٰ کا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے لے کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک ملاحظہ کیا تو اس کو بے اختیار شوقِ الی اللہ پیدا ہوا پھر اس کو اس سفر کا کاٹنا ضرور پڑا اور ایسے سفر میں توشہ اور سواری ضرور ہے۔ پس اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا توشہ لیا یعنی عبادت کو اس سفر کا زادِ راہ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اعنی استعانت کو سواری بنایا کیونکہ گو عبادت سے خدائے تعالیٰ کا وصال ہے مگر بغیر اعانتِ الٰہی اور مددِ غیبی محال ہے۔ جب زاد و راحلہ مہیا ہو تو سیدھے رستے کے درپے ہوا اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہا اور جب کہ سیدھی سڑک مل گئی تو رستے کے رفیق بھی درکار ہوئے کہ جن کے سبب سے اس رستہ کی تمام صعوبتیں آسان ہوجاویں اور اس کے مشابہ دوسرے رستہ پر نہ پڑ جائے تو اس لیے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہا اور جب کہ راہزنوں سے خوف پیدا ہوا تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا۔

(۳) اس تھوڑے کلام میں نہایت خوش اسلوبی سے خدا تعالیٰ نے وہ تینوں علم بیان کردیے جن کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے اور ان کے قبول و تصدیق کرنے کے لیے معجزات و آیات دکھائے۔ اس لیے اس سورۃ کو تمام کتبِ سماویہ کا خلاصہ کہیں تو بجا ہے اور سب کا عطر کہیں تو روا ہے اور اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ سورہ ہے کہ اس کے برابر توراۃ و انجیل و قرآن میں کوئی سورہ نہیں (کما سیئاتی) اور وہ تین علم یہ ہیں علمِ شریعت یعنی وہ قانونِ الٰہی کہ جس کے مطابق چلنا بندوں پر ضرور ہے۔ علمِ طریقت کہ جس میں دل کے معاملات پہچانے جاتے ہیں۔ علمِ حقیقت یعنی مکاشفاتِ ارواح اور تجلّیِ علمی۔

علمِ شریعت: کی دو قسم ہیں۔ اول علمِ عقائد کہ جس کو اصول کہتے ہیں دوسرا علمِ احکامِ فقہیہ کہ جس کو فرع کہتے ہیں پھر علمِ عقائد کی تین قسم ہیں:

(۱) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق عقائد کہ وہ موجود ہے واحد لاشریک ہے۔ ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ دیکھتا، سنتا ہے، ازلی ہے ابدی ہے، عادل، رحیم و کریم ہے۔ کھانے، پینے، سونے، مکان و زمان میں ہونے و دیگر عیوب سے پاک ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں نہ کوئی اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی۔ سب کاموں میں بے نیاز اور ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔ نہ اس سے مقابلہ کرسکتا ہے سو یہ سب باتیں خدائے تعالیٰ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ثابت کردیں۔ کیونکہ جب تمام عالم کا وہ مربی ہو تو اب کون چیز ہے جو اس کی شریک و سہیم ہے۔ اور مربی بغیر رحیم و علیم، قادر، سمیع و بصیر اور حیّ قیوم ہونے کے نہیں ہوسکتا اور جب تمام عالم کا مربی ہے تو عالم کی ذات سے اس کی ذات غیر ہے کسی کے مشابہ و مانند نہیں تو جمیع اوصافِ حوادث سے لامحالہ بری ہوا۔ بالخصوص ان سے کہ جن سے اس کی تقدیس میں فرق آتا ہے۔

(۲) آخرت کے متعلق عقائد کہ مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہے وہاں جاکر ہر قسم کے آرام و راحت پاتی یا تکلیف دکھ اٹھاتی ہے اور ہر نیکی و بدی کا بدلہ ضرور ہے اور اعمال کے بموجب اپنے کئے کو ہر شخص پاوے گا۔ اور ایمانداروں پر وہ وہاں مہربانی فرماوے گا۔ سو یہ سب

باتیں اس نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے ثابت کردیں کیونکہ جو شخص جزا کے دن کا مالک ہے تو اس کے لیے یہ باتیں ضرور ہیں کَمَا لَا یَخْفٰی۔ ان دونوں قسموں کے علم کو علمِ مبدء و معاد بھی کہتے ہیں کہ تمام عالم کی ابتداء انتہاء انجام کار سب کچھ بیان کردیا کہ ابتدا میں وہی ایک تھا اور پھر سب کے پیچھے وہی ایک واحد قہار رہ جائے گا۔

(۳) نبوت و امامت و ولایت کے متعلق عقائد اور ان کے مقابلے میں کفر اور بدعت اور شرک کی پہچان۔ سو ان سب باتوں کو مجملاً صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الخ میں مع ان کے نیک و بد نتیجہ کے بیان کردیا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہا تو سیدھے رستے کی خواہش ظاہر کی اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ میں اس رستہ پر چلنے والوں انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین کا منعم علیہ ہونا بیان کردیا اور انبیاء کی عصمت ثابت کردی اور ان کا پیشوا اور رہبر ہونا بتلا دیا اور اسی طرح ان کے مقابلہ میں برے لوگوں کا حال بیان کردیا اور علمِ فقہ کی دو قسم ہیں عبادات کہ عبادت و استعانت ہر قسم کی خدائے تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے نہ کسی کو سجدہ کرنا چاہیے نہ رکوع۔ اور نہ کسی اور کو بوقتِ حاجت پکارنا چاہیے۔ اسی سے ہر کام میں مدد مانگنی چاہیے۔ اور مال و بدن میں ہر قسم کی عبادت اسی کا حق ہے پس ان سب باتوں کو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے ثابت کردیا دوسرے معاملات اعنی بیع و شراء، نکاح و طلاق، قرض و امانت وغیرہ وغیرہ جملہ احکام کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں واضح کردیا اور ہر امر و نہی، فرض و واجب، مندوب و مکروہ حرام کا نتیجہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے مؤکد کردیا۔

علمِ طریقت: کو اجمالاً اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں بیان کردیا اور اس کی دونوں جانب افراط و تفریط کو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے خوب واضح کردیا۔ پھر اہلِ طریقت کے تینوں مرتبوں کو بھی بیان کردیا۔ کس لیے کہ طریقت کا مرتبہ ابتدائی ہے کہ جس بغیر طریقت حاصل نہیں ہوتی اس کو عبادت کہتے ہیں۔ سو اس کو اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے ساتھ تعبیر کردیا اور اس کا درمیانی مرتبہ استعانت اور اس کو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے واضح کیا اور انتہائی مرتبہ استقامت ہے اور اس کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں ذکر کیا اور اس علم میں بڑھ کر دو چیزوں کے حالات سے مطلع رہنا اصل الاصول ہے۔ اول نفس کہ جو ہر دم ہر طرح کی خواہشوں کی طرف رغبت دلاتا اور راہِ راست سے ادھر ادھر لے جاتا ہے کہ جس کے مطیع کرنے کو لوگ سخت ریاضت کرتے ہیں۔ بھوک و پیاس وغیرہ زائد تکلیفیں دے کر اس موذی کو مارتے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ نے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں اس کی لگام کی دونوں باگیں سالک کے ہاتھ میں دے دیں۔ یعنی درصورت زیادتی غضب اور درصورت کمی ضلالت ہے۔ پس جو شخص ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھے گا۔ نفس کو ادھر ادھر جانے نہ دے گا۔ (دوم) قلب کہ جس کی سلامتی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ اس قلب کا کام شوق اور محبت ہے۔ جس کا دل محبتِ الٰہی سے معمور ہوگیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اس لیے اس سورہ میں خدا نے اپنے سے ہر قسم کے محبت کے پیدا کرنے کا طریقہ بتلا دیا۔ محبتِ ذاتیہ لفظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے اور صفاتیہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے تلقین کردی اور پھر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں تو صاف صاف محبت پیدا کرنے کا طریقہ تعلیم کردیا کہ جس سے محبانِ خدا اور خاصانِ کبریا سے ملنے کا بے حد شوق پیدا ہو

نالہ من برسانید بمرغانِ چمن
کہ ہم آوازِ شما در قفسے افتادہ است

اور نہایت اشتیاق میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہا اب مومن کا دل محبتِ الٰہی سے ایسا بھر گیا کہ اور کی جگہ بھی نہ رہی۔ اس قلب کی حفاظت پر تمام انبیاء و صدیقین تاکید کرتے چلے آئے ہیں ؎

پاسبانی کن بسے در کوئے دل
زاں کہ دردانند در پہلوئے دل

واضح ہو کہ جن چیزوں کی اصلاح اہلِ طریقت کے نزدیک زیادہ تر ملحوظ ہے وہ تین قوت ہیں۔ ایک شہوت، دوسری غضب، تیسری ہواء۔ قوتِ شہوت کو نفسِ بہیمی یا بہیمیت کہتے ہیں اور اس کی کمی زیادتی جسم کی کمی زیادتی سے ہوتی ہے اور غضب کو نفسِ سبعی اور سبعیت بھی کہتے ہیں یعنی درندہ پن اور ہوا کو نفسِ شیطانی اور شیطانیت بھی کہتے ہیں۔ لیکن سب میں زیادہ تیز ہوا ہے کہ جو جسم کے پژمردہ ہونے سے بھی کم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد غضب ہے پھر شہوت۔ آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جب یہ تینوں صلاحیت پر آتی ہیں تو عفت اور حلم وغیرہ صفاتِ حمیدہ پیدا ہوتی ہیں کہ جن کو عدالت کہتے ہیں کہ جس کے سبب حضرتِ انسان ملائکہ سے فوقیت لے گئے اور خلیفہ بنائے گئے۔ مگر اسی طرح جب یہ قویٰ خراب ہوتے ہیں تو انسان کو درندہ، گدھا، شیطان بنا دیتے ہیں۔ پس شہوت سے حرص اور بخل پیدا ہوتا ہے اور غضب سے خود پسندی اور تکبر اور ہوا سے کفر اور بدعت اور اسی لیے کہتے ہیں کہ شہوت سے انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور غضب سے غیر پر اور ہوا تو خدائے تعالیٰ و تقدس کی جناب میں بغاوت کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ آیا اور اس کی بخشش نہیں۔ اس کے بعد غضب کا نتیجہ حقوق العباد میں دست اندازی ہے وہ بھی بہ نسبت گناہِ شہوانی کے زیادہ ہے اور جب یہ چند اوصاف رزیلہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان سے حسد پیدا ہوتا ہے کہ جو سخت مرضِ روحانی ہے۔ پس جب ان اوصافِ رزیلہ کا علاج کلامِ الٰہی اور کتابِ آسمانی میں ضرور تھا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام بالخصوص اس سورت میں بھی اس کا علاج نہایت عمدگی سے فرمایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں سب سے بڑھ کر مرضِ حسد کا تدارک کیا۔ کس لیے کہ جب بندہ خدائے تعالیٰ کو رب العالمین خیال کرے گا اور ہر ایک نعمت کا مبدء و فیاض اور مالک اور عطا کنندہ اسی کو سمجھے گا تو پھر کسی کی نعمت دیکھ کر نہ جلے گا اور خدائے تعالیٰ کے فیضِ عام اور خوانِ بیدریغ کو دیکھ کر اس ناپاک خیال کو دل سے نکال دے گا۔ کیونکہ خدا کے دیے کو کون لے سکتا ہے؟ اور پھر کس کس کی نعمت کا زوال چاہیے ایک دو نہیں بلکہ تمام عالم اس انعام سے مالا مال ہے اور بخل کا علاج بھی ملاحظۂ رب العالمین سے بخوبی ہو جاتا ہے کیونکہ ہر نعمت کا پیدا کرنے والا خدا کو تصور کرے گا تو اس کی ملک میں بخل کرنا قبیح جانے گا اور غضب کو اپنی رحمت یاد دلا کر اور اپنا جلالِ اخروی دکھا کر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے فرو کردیا۔ کس لیے کہ جب مضمونِ رحمت دل پر آیا اور اس کے ساتھ خدا کی شانِ کبریائی دل میں سمائی تو غضب کافور ہوا اور خود پسندی کا علاج اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے کردیا۔ کس لیے کہ جب عاجزانہ خدا کے آگے جھکا تمام خود پسندی رخصت ہوئی اور تکبر اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے پست کردیا۔ کس لیے کہ جب عاجزانہ ہر کام میں اس کی طرف ہاتھ پھیلانا بتلایا تو تکبر کو اڑا دیا اور کفر و شرک و بدعت کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے دور کیا۔ کس لیے کہ ہر امر میں میانہ پن کفر و بدعت کے منافی ہے پھر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے کفر کا بد نتیجہ دکھا کر ڈرا دیا اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے اہلِ بدعت کا مآل کار بتلا دیا۔ الغرض بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں تین اسماءِ الٰہی سے ان تینوں بدصفات کو مٹایا کس لیے کہ جس نے اللہ کو جانا شیطان ہوا کو بھگا دیا اور جس نے خدا کو جانا دل میں نرمی آئی۔ غضب و غصہ دور ہوا اور جس نے اس کی رحیمی کا لحاظ کیا اپنی جانِ حزیں کو شہوات کے ظلم سے محفوظ رکھا اور الحمد کی سات آیتوں میں ان سات خصلتوں کی اصلاح کردی کہ جو ان تینوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے پہاڑی وعظ کو مکارمِ اخلاق کی تعلیم میں ہر جگہ قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا کرتے ہیں۔ اگر انصاف فرمادیں تو یقیناً معلوم ہو جاوے کہ اس وعظ کو اس کلام سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

علمِ حقیقت: کو بھی (کہ جو مکاشفۂ روحانی ہی ہے) اس سورۃ میں بخوبی ذکر کردیا۔ چنانچہ تمام اسرارِ ربوبیت کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں بھر دیا گویا کہ عارف کے دل پر اس جملہ میں یہ منکشف کردیا کہ تمام عالم کی ہستی اور ہر چیز کا وجود اس کے وجودِ واجب کا پرتو اور اس آفتابِ حقیقی کی شعاعیں ہیں۔ اس عالم کی جس چیز کو دیکھے گا تو مرتبۂ بذات میں معدوم پائے گا۔ اور خود بھی فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ

كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ کس لیے کہ جب عارف اس مضمون کا (کہ تمام خوبیاں اس ذات جامع الصفاتِ کمالیہ کو جو کہ تمام عالموں کو ہر وقت پرورش اور تربیت کرتا ہے) مراقبہ کرے گا تو پھر اس کی چشمِ حقیقت بیں کے آگے اس کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دے گا اور جب وہ اس مقام سے لے کر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک تجلیاتِ جلالیہ و جمالیہ کی سیر کرتا ہوا آوے گا تو اس کو مرتبۂ علم الیقین حاصل ہو جائے گا۔ اور جب اس نور سے روح مسرور و منور ہو جائے گی تو تمام حجاب مرتفع ہو جائیں گے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے مرتبہ میں عین الیقین حاصل ہو جائے گا اور اس مرتبہ میں لطائفِ خمسہ (نفس، قلب، روح خفی اخفی، ضلال و استعانت و ہدایت و استقامت و انعام کے ملاحظہ سے) نہایت درجہ پر جاری ہو جاویں گی اور پھر ان کے ذریعہ سے ہر چیز کی حقیقت کماہی معلوم ہونے لگے گی اور حق الیقین کا مرتبہ نصیب ہو جائے گا اور جب سیر الی اللہ سے فارغ ہو چکا تو سیر من اللہ شروع کی اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں امورِ آخرت اور اعمال کی حقیقت دریافت کرتا ہوا پھر وہیں لوٹ کر آ گیا تو ھو الاول ھو الآخر کی کیفیت منکشف ہو گئی۔

چونکہ ان باریک باتوں کے بیان کرنے کی میری قلم میں طاقت نہیں لہٰذا اسی پر بس کرتا ہوں۔ یہاں سے آپ کو اس دعوے کی تصدیق ہو گی کہ جس طرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں تمام الحمد کا مضمون ملخص ہے اسی طرح الحمد میں قرآن اور جمیع کتبِ سماویہ کا مضمون جمع ہے۔

(۴) خدائے تعالیٰ نے اجمالی طور پر اس سورۃ میں بے شمار وہ علوم جمع کر دیے کہ جن کو تمام انبیاء اپنی کتابوں میں عہدِ آدم سے لے کر آنحضرت ﷺ تک جمع نہ کر سکے چنانچہ یہ بات آپ کو دفعہ سابق سے بخوبی معلوم ہو گئی ہو گی کہ علمِ شریعت طریقت حقیقت جو دریائے ذخار ہیں اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ مذکور ہیں مگر اس مسئلہ کی اور تشریح کرنی ضروری ہے۔ واضح ہو کہ بِسْمِ اللّٰهِ میں ذات اور بیشمار اسماءِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں خدا تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ کی طرف اشارہ ہے اور اَلْحَمْدُ میں ان نعماءِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا بیان کرنا محال ہے خواہ وہ وجود آسمان و زمین اور عناصر اور کواکب اور انسان کی تندرستی اور اناج اور کپڑے اور چیزیں وغیرہ ہوں کہ جن کے متعلق ہزار ہا مسائل ہیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے بدنِ انسان سے جو کچھ متعلق ہے تخمیناً پانچ ہزار مسئلے ہیں کہ جن کو اطبا بھی جانتے ہیں اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں تربیت کی ہزار ہا اقسام کہ کیونکر تربیت ہوتی ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات کے اصناف و انواع ہی کی تربیت کو لکھا جاوے تو سینکڑوں کتابیں بنیں پھر عالم کے اقسام، ارواح و اجسام، شہودی و مثالی و اعراض و جواہر کا جاننا ہزاروں مسائلِ حکمت سے متعلق ہیں اور اس جملہ کی تفسیر لکھی جاوے تو صدہا کتابیں بنیں اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں دنیا و آخرت کے متعلق وہ صدہا باتیں کہ جو انسان کی حالت سے متعلق ہیں اجمالاً مذکور ہیں۔ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں ابدان سے جدا ہونے کے بعد نفوس کی بقا اور ان کی سعادت و شقاوت کی طرف اور وہاں کے عذاب و ثواب اور مرنے کے بعد زندہ ہونے اور نفخِ صور اور وقوفِ عرصات و حساب و میزان و دوزخ و جنت کے درجات اور انبیاء و صدیقین و دیگر اولیاء کی شفاعت کی طرف اجمالاً اشارہ ہے کہ جن کے لیے دفتر درکار ہیں اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں عبادت کے اقسامِ قلبی و قالبی مالی و بدنی کی طرف اشارہ ہے اور ان کے ارکان و شروط کی طرف کہ جن کا ذکر کتبِ فقہ و سلوک و اوراد و اشغال کے رسائل میں ہے اور یہ بھی سینکڑوں مسائل مہمہ ہیں اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں تمام معونتوں اور دنیا کی جمیع صنعتوں اور کل حرفوں کی طرف مجملاً اشارہ ہے۔ کس لیے کہ تمام پیشوں اور صنعتوں میں خدائے تعالیٰ سے اس کی مخلوقات کے ذریعہ سے استعانت ہے۔ پس ان صنعتوں اور پیشوں کے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ تاکہ پورے طور پر استعانتِ الٰہی کا حال معلوم ہو۔ یہ ہزار ہا مسائل اور بے شمار مباحث ہیں کہ جو اس کلمہ میں مندرج ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں تو اس قدر بے شمار مسائلِ علومِ حکمیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا کچھ شمار ہی نہیں۔ کس لیے کہ

دنیاوی امور بیاہ شادی، مرنے جینے، بیع و شرا، لین دین وغیرہ معاملات میں صراطِ مستقیم بھی ایک دریائے بے کنار ہے اور اسی طرح اخلاقِ انسانیہ سخاوت و شجاعت و صبر و قناعت وغیر ہا صراطِ مستقیم ہزار ہا مسائل متعلق ہیں۔ پھر ہر امر میں صراطِ مستقیم کی ہدایت کے دو طریق ہیں ایک استدلال سے صراطِ مستقیم حاصل کرنا جیسا کہ مشائین کرتے ہیں پھر اور امور تو درکنار خاص ذات باری کے لیے عالمِ علوی و سفلی کا ہر ایک ذرہ شاہدِ عدل ہے کہ جو اس کی کمالِ ذات و تقدسِ صفات و عظمتِ قدرت پر زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

وفی کل شیءٍ له شاهد   یدل علی انه واحد

دوسرا طریق انکشافِ باطنی اور نورِ روحانی ہے کہ جو اشراقین کا ہے پھر یہ ہزار ہا مسائل اور بیشمار علوم ہیں کہ جو اس ایک جملہ میں مجتمع کر دیے گئے ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں مباحثِ نبوات اور ولایت کی طرف اور انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں اور ان کے عقائد اور حالات اور سرگزشت کی طرف اشارہ ہے کہ جو صدہا مسائلِ ملت و تاریخی واقعات سے متعلق ہیں۔ گویا اس جملہ میں تمام انبیاء اور ان کے پیرووں کی تاریخ اور ان کی شریعت مجملاً بیان کر دی۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں تمام کفار اور مشرکین کے حالات اور کل بدعتیوں کی سرگزشت اور ان کے مذاہبِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ اور خراب چال و چلن کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی تفصیل کے لیے ملل و نحل اور دبستانِ مذاہب وغیرہما صدہا کتابیں بھی کافی نہیں اور جن کی تاریخ عبرت انگیز بے شمار کتابوں میں نہیں آ سکتی۔ الحاصل مبدء، معاد، ملت، شریعت، الٰہیات، طبعیات، تاریخِ انبیاء و صلحاء، مخالفین کے حالات وغیر ہا بیشمار علوم خدائے تعالیٰ نے اجمالاً بترتیب اس سورہ میں جمع کر دیے ہیں۔

(۵) دعا خدا اور بندہ میں ایک ایسا عمدہ ارتباط ہے کہ اس سے بڑھ کر پھر کوئی واسطہ نہیں۔ کس لیے کہ دعا میں دو باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک اپنی عاجزی اور فرو ماندگی کا اظہار اور کسی مقصود کا سوال۔ دوسرے خدائے تعالیٰ کی دل سے کامل عظمت اور اس کی جناب میں کامل درجہ کا اعتقاد کہ وہ ہر چیز پر بالخصوص میرے اس مقصد کے عطا کرنے پر قادر ہے۔ گویا دعا پوری عبودیت کا اظہار اور اس کی الوہیت کا اقرار ہے کہ جو دل سے اور زبان سے ادا کر رہا ہے اور اعضاء سے اس کی شہادت دے رہا ہے اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے (رواہ الترمذی) اور یہ بھی آیا ہے کہ دعا سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی چیز بڑی نہیں (رواہ الترمذی و ابن ماجہ) پس دعا جس طرح بندہ کی روح کو جنبش دیتی ہے اسی طرح رحمتِ الٰہی کو تحریک کرتی ہے جس سے خدا تعالیٰ یا تو اس دعا سے کسی مصیبتِ آیندہ کو ٹال دیتا ہے یا اس کام کے اسباب پیدا کر کے اس کو پورا کر دیتا ہے یا کبھی بطورِ خرقِ عادت بلا اسباب مقصد کو جس کے لیے دعا مانگی گئی ہے پورا کر دیتا ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی دعا سے ظہور میں آیا جس کی شہادت کتبِ احادیث و سیر و روایتِ ثقافت دے رہی ہے اور یہی اجابت[1] ہے

---

[1] محرف القرآن اپنی تفسیر میں قواعدِ نیچریہ کے موافق صفحہ ۱۰ میں تحریر فرماتے ہیں:
قولہ۔ مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے دعا کرتے ہیں وہ دعا سے حاصل ہو جائے گا اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہونا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصولِ مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں وہ مطلب تو انہیں اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب جمع کرنے والی ہے بلکہ وہ اس قوت کو تحریک دیتی ہے جس سے اضطراب میں تسکین ہوتی ہے اور ایسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہوتا ہے۔ انتہیٰ۔ ملخصاً
اقول۔ بے شک اصولِ نیچریہ کے مطابق نہ وہ اسے مطلب کے اسباب خدا پیدا کرنے پر قادر ہے نہ اس کو قدرت ہے کہ وہ بندہ کو اس کے عجز و زاری سے اس کا مطلب عطا کرے کس لیے کہ سرے سے نیچر کے نزدیک خدائے قادر کا وجود ہی مسلم نہیں ورنہ اسباب پیدا کرنے سے عجز کے کیا معنی اور بطور ←

اور چونکہ دعا اعلیٰ عبادت ہے تو ضرور ہوا کہ اس کے آداب تعلیم فرمائے جائیں۔ پس اس لیے اس سورۃ میں تعلیم کر دیا کہ اول خدائے تعالیٰ کی ثناو صفت کرنی چاہیے جیسا کہ اَلْحَمْدُ سے لے کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پایا جاتا ہے اور پھر اپنا اخلاص اور نیاز ظاہر کرنا چاہیے جیسا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے ظاہر ہے پھر دعا کرنی چاہیے جیسا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الخ سے ظاہر ہے۔ مگر ایسے بادشاہِ حقیقی سے دعا بھی وہ کرنی چاہیے کہ جو تمام دینی و دنیاوی امور کو حاوی ہو جیسا کہ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الخ سے ظاہر ہے اور اسی حکمتِ بالغہ سے ہر نماز میں دو بار اس سورۃ کا پڑھنا واجب ٹھہرا خدا نے اپنے بندوں کو کیا ہی عمدہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔

(۶) تعلیم کی یہ خوبی ہے کہ ایک بار اجمالاً تمام مراتبِ ہدایت تعلیم کر دے پھر تدریجاً ان کی تفصیل کرے کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل دل پر تہ نشین ہوتی ہے اور اس اجمالی فہرست پر عمل کرنا اور ان مضامین کو اس مختصر متن سے دریافت کرنا بھی زیادہ تر آساں ہوتا ہے پس خدائے تعالیٰ نے اس سورۃ مقدسہ میں یہی کیا کہ تمام الہامی مضامین کو مجملاً مجتمع کر دیا پھر باقی قرآن مجید میں ان کی تفصیل فرمائی چنانچہ (۱) خداوند تقدس و تعالیٰ کی ذات و صفات کی بابت جس قدر آیات ہیں جیسا کہ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ الآیت اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ، لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ وَلَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدًا وغیر ہا من الآیات اور (۲) اسی طرح جو کچھ ابتدائے آفرینشِ آسمان و زمین اور حجر و شجر کے متعلق بیان ہے جیسا کہ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ الآیات وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ، هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اور (۳) اسی طرح جو کچھ اس کی علاماتِ قدرت اور دنیا کی نعمتوں کی بابت مذکور ہے جیسا کہ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ

← خرقِ عادات دعا پر مطلب حاصل کرنے ناچار ہونے کے کی کیا وجہ بلکہ ان کے نزدیک خدا ایک فرضی چیز ہے کہ جس کو باطبع اوہامِ عامہ ہونے کے وجود کی طرح اختراع کرتے ہیں اور جس طرح لڑکوں کو ہوّے سے ڈرانے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دعا کے مستجاب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ بیوقوفوں کو کچھ تسکین سی ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ مگر یہ معنی عقلِ سلیم اور اصولِ ادیانِ سماویہ بالخصوص قواعدِ اسلام کے نزدیک بالکل مردود و مطرود ہے کس لیے کہ جب ادلۂ عقلیہ و نقلیہ سے عالم کے بانی کا ایک ایسا وجود تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا اور وہ ہر ممکن پر قادر ہے۔ اور ممکنات پر تصرف کرنے سے کوئی چیز اس کو نہیں روک سکتی اور دعا کے بعد اسباب کا پیدا کر دینا بلکہ مطلب کا حاصل کر دینا یہ سب کچھ اس قادرِ مطلق کے نزدیک ممکن ہے تو پھر اس تصرف سے کس کا ہاتھ اس کو روک سکتا ہے۔ اور نبی ﷺ کی بے شمار احادیث میں دعا سے مطلب کا حاصل ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہی حضرت ترمذی نے کہ جن کی روایت کو مفسر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں۔ نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضرت فرماتے ہیں ما من احداد عوابدعاء الا ماآتاء الله اسال او كف عنه السوء مثله ما لم يدع بائم وقطيعة رحم (رواہ الترمذی) ''کہ جو شخص خدا سے دعا کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کا مطلب عطا کرتا ہے اس کی مثل اس سے برائی دور کر دیتا ہے جب تک کہ گناہ اور قطعۂ رحم کی دعا نہ مانگے''۔ وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الدعاء ينفع مما نزل ومما ينزل فعليكم عبادالله بالدعاء (رواہ الترمذی ورواہ احمد عن معاذ بن جبل کہ ''دعا ہر حال میں بہتر ہے۔ بلائے نازل شدہ میں صبر و اجر دیتی ہے اور جو ہنوز نازل نہیں ہوئی ہے اس کو دفع کرتی ہے'' وعن سليمان الفارسی قال قال رسول الله ﷺ لا يرد القضاء الا الدعاء رواه الترمذی '' کہ دعا کے سوا قضا کو اور کوئی چیز نہیں رد کرتی''۔

اسی طرح تمام کتبِ سماویہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اکثر لوگ اس فریق کے وہ ہیں کہ جن کو امورِ دنیا میں کامیابی ہے اس لیے وہ دعا کے اثر کو فضول جانتے ہیں اور اکثر اہلِ دنیا ایسا ہی جانا کرتے ہیں۔

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا الآیات اور انہیں اقسام کی جملہ آیات سب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تفصیل اور شرح ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور (۴) جو کچھ انسان کی موت اور موت کے بعد عذاب ثواب اور دنیا کی بے ثباتی اور نفخ صور اور احوالِ قیامت اور دوزخ اور جنت کی کیفیت کے متعلق قرآن میں مذکور ہے جیسا کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ، اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ، يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ الایة۔ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ الایت وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِآيْءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ الآیات۔ یہ آیات اور سورہ رحمٰن وغیر ہا کہ جو جنت اور دوزخ کے حالات سے پر ہیں اور وہ آیات کہ جن میں دیدارِ الٰہی کا ذکر ہے۔ سب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تفسیر اور تفصیل ہے اور (۵) اسی طرح جس قدر آیات میں نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ و صدقہ و خیرات اور خدا کے ساتھ اخلاص و محبت اور دل سے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا ذکر ہے جیسا کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ الآیة يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یہ سب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفصیل ہے اور (۶) اسی طرح جو کچھ باہمی معاملات میں نیک چلنی اور لوگوں سے نیکی سے پیش آنے کی بابت اور گناہوں سے بچنے کی بابت اور اخلاقِ حمیدہ کی بابت اور ہر امر میں میانہ روی کی بابت قرآن میں مختلف سورتوں میں مختلف عنوانوں سے وارد ہوا ہے جیسا کہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ''کہ بدی کے مقابلہ میں نیکی کرو''۔ (حضرت مسیح علیہ السلام نے تو یہی فرمایا تھا کہ جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کی طرف دوسرا گال بھی کر دے) مگر سید المرسلین کی معرفت اس سے بھی بڑھ کر یہ تعلیم دی گئی کہ بدی کے بدلہ میں نیکی کرو) وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ الآیات یہ سب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر ہے اور (۷) اسی طرح جو کچھ انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیرووں کے محامد اور ان پر ملائکہ پر ایمان لانے کی بابت اور ان کے طریقہ کی بابت جو کچھ مختلف سورتوں میں آیا ہے جیسا کہ سورۂ قصص اور سورۂ انبیاء اور سورۂ یوسف اور سورۂ نوح اور سورۂ شعراء اور سورۂ نمل اور سورۂ یونس اور سورۂ مومنون اور سورۂ طٰہٰ اور سورۂ مریم اور سورۂ مائدہ اور سورۂ کہف میں مذکور ہے۔ سب صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفصیل ہے اور (۸) اسی طرح جس قدر سرکشوں کے قصے اور ان پر عذابِ الٰہی نازل ہونا اور قہرِ خدا کا نازل ہونا قرآن کریم میں مذکور ہے۔ جیسا کہ سورۂ مذکور میں فرعون و ہامان اور قارون اور قوم عاد و ثمود کا قصہ کہ جو سورۂ اعراف وغیرہ میں بھی مذکور ہے اور اسی طرح اور گمراہوں اور نافرمانوں اور کافروں کے حالات عبرت انگیز جس قدر قرآن میں مذکور ہیں سب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ مضامین اس خوبی سے کسی کتاب میں نہیں اور جو کوئی دعویٰ کرے تو دکھا دے۔ وید، دساتیر، انجیل، توراۃ، سب اس خوبی سے معرا ہیں۔

(۹) جو کچھ بلاغت اور فصاحت اور سلاستِ الفاظ (کہ جس کا مزہ اہلِ زبان لیتے ہیں) اس سورۃ میں ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ ازان جملہ یہ کہ الحمد للہ کہا۔ نحمد اللہ یا احمد اللہ جملہ فعلیہ نہ کہا دو وجہ سے۔ اول یہ کہ جملہ فعلیہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور وہ اس کے علوِ شان کے مناسب نہیں بخلاف اسمیہ کے کہ جو دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ (دوم) یہ کہ خدا کی حمد کوئی کیا کر سکتا ہے لاکھوں نعمتیں ہیں اور ... اس کی حمد کا دعویٰ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ اس لیے الحمد للہ کہہ دیا کہ حمد خدا کے لیے ہے۔ ازان جملہ صنعت التفات

ہے کہ الحمد للہ سے لے کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک تو غائبانہ گفتگو تھی۔ پھر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں مخاطب بنا کر کلام کیا اور پھر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الخ میں صیغہ متکلم بولا اور یہ صنعتِ زبان عرب میں نہایت محمود ہے تا کہ ایک طرح کے کلام سے دل پر ملال نہ آ جائے جیسا کہ امراءالقیس عرب کا مشہور شاعر اپنے ان اشعار میں اس صنعت کو استعمال کرتا ہے

تطاول ليلك بالاثمد　　ونام الخلى ولم ترقد
وبات و باتت له ليلة　　كليلة ذى العائر الدمد
وذلك من بناء جاءنى　　وخبرته عن ابى الاسود

کلام کے اسلوب کے بدلنے سے نشاطِ خاطر پیدا ہوتا ہے کہ جس کو ہر صاحبِ ذوقِ سلیم جانتا ہے اور یہ کلام میں ایسا ہے کہ جیسا کھانے میں نمک اور انہیں خوبیوں سے عرب قرآن سن کر وجد میں آتے اور آنکھوں سے آنسو بہاتے تھے۔ روایت ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ میں جب چند لوگ ایمان لائے تھے اور مشرکین کے خوف سے بیچارے ایماندار بلکہ سیدِ ابرار پوشیدہ رہتے تھے اور جس طرح شہر یروشلم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں پر ہر طرف سے مار مار اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ تھی یہی حال مکہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جانباز کا تھا مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ بڑے تاجر تھے لوگ ان کا خیال کرتے تھے' اس لیے گھر سے باہر ایک چبوترہ تھا اس پر بیٹھ کر نہایت درد سے قرآن مجید پڑھتے اور اس کے اثرِ جانگداز سے شمع کی طرح روتے تھے ایک تو قرآن مجید کے وہ روح کو کپکپا دینے والے الفاظ' نئی نئی باتیں رستہ چلنے والی عورتوں اور مردوں اور بڈھوں اور بچوں کے کان میں پڑنا اس پر صدیق اکبر کا درد اور اصلی لب ولہجہ سے پڑھنا

وصف اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

پھر تو جو سنتا تھا کھڑا ہو کر سر دھنتا تھا۔ ایک اژدھام اور مجمعِ خاص و عام ہو جاتا تھا۔ جو سخت منکر ننگی تلوار لے کر مارنے آتے تھے آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے جس کا یہ اثر ہوا کہ ہر روز بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد ایمان لاتے اور اس پر مخالفوں کی ہر قسم کی اذیت اٹھاتے تھے۔ کوئی دھوپ میں چومیخا کیا جاتا ہے کسی پر کوڑے پڑ رہے ہیں کسی کو مار پٹ رہی ہے۔ کوئی جلاوطن کیا جاتا ہے کوئی جان سے مارا جاتا ہے۔ میاں سے بی بی اس بارے میں لڑ رہے ہیں میاں بی بی کو سمجھا رہا ہے مگر دل میں قرآن کا اثر روز افزوں اور عشقِ الٰہی میں ہر دم حالت دگرگوں ہے۔ نہ کسی قسم کی تکلیف کا ڈر نہ جلاوطنی کا خوف وخطر۔ یہ حال دیکھ کر لوگوں نے یہ کہا کہ ابوبکر جادوگر ہے جانے یہ کیا پڑھتا ہے کہ جو نہایت پر اثر ہے۔ لہٰذا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی مکہ سے نکال دیا۔ الغرض قرآن مجید کے اس اثرِ بے حد سے تمام عرب میں کھلبلی پڑ گئی۔ جہاں چند صحابہ نے جا کر قرآن کی منادی کی وہیں ہزاروں سرکش اور بت پرست سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور جب چند صحابہ ملکِ حبشہ میں گئے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی نے کہ جو اہلِ کتاب کا بڑا عالم تھا قرآن سنا اس کا اور اس کے ارکانِ دولت کا دل ایمان سے بھر گیا اور سب اربابِ حبشہ بے اختیار رونے لگے۔ اسی طرح جہاں قرآن پہنچا وہیں اس نے اپنا اثر دکھایا۔ اس لیے چند سال میں شرق سے غرب تک اکثر سرسبز سلطنتوں میں اسلام پھیل گیا۔ افسوس متعصب پادری شیوعِ اسلام تلوار کے زور سے بتا کر اسلام پر عیب لگاتے ہیں۔ اب ہم قرآن کا مقابلہ اور کتابوں سے کرتے ہیں اور الحمد کی سات آیتوں کے مقابلہ میں ہر کتاب کے سات جملہ لکھ کر دکھاتے ہیں۔

❀❀❀

مقابلہ

رات محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا
صبح کو خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

تورات	زبور	دساتیر	رگوید	انجیل	قرآن مجید
کہ جس کو بقول اہلِ کتاب حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد علمائے یہود نے جمع کیا اور جس طرح کوئی کسی مردے کی ہڈیاں جمع کر کے نام اُس شخص کا رکھے اسی طرح اس مجموعہ کا نام تورات رکھا۔	بقول اہلِ کتاب اس کے مصنف کا اب تک صحیح پتا نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام یا کوئی اور شخص ہے۔	کہ جن کو ساسان پنجم نے پاژندی زبان سے دری میں ترجمہ کیا	کہ جس کو بیاس جی شاگرد زردشت نے لوگوں کے منتر لے کر جمع کیا ترجمہ لچھمن داس دہلوی	بقول نصاریٰ چار شخصوں متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا نے حضرت مسیح کے بعد تاریخ کے طور پر اُن کے حالات کو جمع کیا۔	عرب میں شہر مکہ مدینہ میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء پر بواسطۂ جبریل علیہ السلام خدا کی طرف سے آیا بلا تغیرِ حرف اہلِ اسلام میں موجود ہے۔
مطبوعہ مرزا پور۔ نارتھ انڈیا۱۸۶۸ء	مطبوعہ مطبع مذکور	مطبوعہ مطبع سراجی دہلی ۱۲۸۰ھ	مطبوعہ دہلی۱۸۸۲ء	مطبوعہ مرزاپور۱۸۷۰ء	
باب اول ابتدا میں خدا نے آسمان کو اور زمین کو پیدا کیا۔	اول زبور مبارک وہ آدمی ہے جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا اور خطا کاروں کی راہ پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کے جلسہ میں نہیں بیٹھتا	پناہم بہ یزداں از منش خوی بد و زشت و گمراہ کنندہ و براہ برندہ و رنج دہندہ وآزار رسانندہ	اگنی میں دیوتا کی فیوم کا بڑا گرو کارکن اور بڑے دیوتاؤں کو نذریں پہنچانے والا اور بڑا اثروت والا ہی مہیا کرتا ہوں یعنی میں آگ کی ستائش کرتا ہوں۔	یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابرہام کا نسب نامہ	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے الحمد للہ رب العالمین سب خوبیاں اللہ کو کہ جو تمام عالم کا پرورش کرنے والا ہے۔
(۲) اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی	(۲) بلکہ خداوند کی شریعت میں مگن رہتا اور دن رات اُس کی شریعت میں سوچا کرتا ہے۔	(۲) بنام ایزد بخشا یندہ بخشایشگر مہربان دادگر۔	(۲) ایسا ہو کہ اگنی جس کی مہما زمانہ قدیم اور زمانہ حال کے رشی کرتے چلے آئے ہیں دیوتاؤں کو اس طرف متوجہ کرے۔	(۲) ابراہیم سے اسحاق اور اسحاق سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یہوداہ اور اُس کے بھائی پیدا ہوئے۔	(۲) الرحمٰن الرحیم۔ جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔
(۳) اور خدا نے کہا کہ اجالا ہوا اور اُجالا ہو گیا۔	(۳) سو وہ اُس درخت کی مانند ہو گا جو پانی کی نہروں	(۳) بنام یزداں	(۳) اگنی کے وسیلہ سے پوجاری کو ایسی آسودگی	(۳) یہودہ سے پھارس اور زارح ثمر کے پیٹ	(۳) مالک یوم الدین اور جزا کے دن کا مالک ہے۔

	کے کنارے لگایا جائے اور اپنے وقت پر میوہ لاوے جس کے پتے مرجھاتے نہیں اور اپنے ہر کام میں پھولتا پھلتا رہے گا۔		حاصل ہوتی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جو شہرت کا سرچشمہ اور انسان کے نسل کی بڑھانے والی ہے۔	سے پیدا ہوئے اور پھارس سے حصروم پیدا ہوا اور حصروم سے آرام پیدا ہوا	
(۴) اور خدا نے اُجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے اُجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔	(۴) شریر ایسے نہیں بلکہ وہ بھوسی کی مانند ہیں جسے ہوا اُڑا لے جاتی ہے۔	(۴) این بود ایزد نتواں دانست چنانکہ ہست او کہ یارو (یعنی حقیقت وجود خدائے تعالیٰ کو سوائے اُس کے اور کوئی نہیں جان سکتا)۔	(۴) اے اگنی یک جس کو کوئی نہیں روک سکتا اور جس کی تو ہر طرف سے رکھشا کرنے والا ہے تحقیقا دیوتاؤں کو پہنچتا ہے۔	(۴) اور آرام سے عمیناداب پیدا ہوا اور عمیناداب سے نحسون پیدا ہوا اور نحسون سے سلمون پیدا ہوا	(۴) ایاك نعبد و ایاك نستعین ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔
(۵) اور خدا نے اُجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات کہا سو شام اور صبح پہلا دن ہوا۔	(۵) سو شریر عدالت میں کھڑے نہ ہوویں گے نہ خطاکار صادقوں کی جماعت میں	(۵) ہستی و یکتائی وکسی سراسر فروزہا آوند گوہر اوست واز وبیرون نیست (یعنی اُس کی ہستی اور تمام صفات اُس کی ذات میں ہیں)	(۵) ایسا ہو کہ اگنی جو نذروں کا پہچاننے والا اور علم کا حاصل کرنے والا اور سچا نامور دیوتا ہے مع دیوتاؤں کے یہاں آوے۔	(۵) اور سلمون سے بوعز راحاب کے پیدا ہوا اور بوعز سے عوبید روت کے پیٹ سے پیدا ہوا اور عوبید سے یسّی پیدا ہوا۔	(۵) اهدنا الصراط المستقیم ہم کو سیدھی راہ پر چلا۔
(۶) اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے بیچ فضا ہووے اور پانیوں کو پانی سے جدا کرے۔	(۶) کیونکہ خداوند صادقوں کی راہ جانتا ہے پر شریروں کی راہ نابود ہوگی۔ (یہاں تک اول زبور تمام ہوا)	(۶) خبر آغاز و انجام و انباز و دشمن و مانند و یار و پدر و مادر و زن و فرزند و جائے وسوے وتن و آساوتانی و رنگ و بوست (یعنی خدائے تعالیٰ ابتداو گا۔ انتہا دشمن اور شریک اور مادر و پدر جسم و رنگ و بو سے پاک ہے)	(۶) اے اگنی جس قدر تیرے سے ہو سکے اپنے نذر دینے والے کو فائدہ پہنچا۔ وہ یقیناً تیرے پاس آئے۔ اینگراو اپس آئے	(۶) اور یسّی سے داؤد بادشاہ پیدا ہوا اور داؤد بادشاہ سے سلیمان اُس سے جو اُریاہ کی جورو تھی پیدا ہوا۔	(۶) صراط الذین انعمت علیهم راہ اُن لوگوں کی کہ جن پر تو نے انعام کیا۔
(۷) تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے پانیوں کو فضا کے اُوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور ایسا ہی ہوگیا		(۷) زندہ و دانا و توانا و بے نیاز و داد گرد بر شنودن و دیدن و بودن آگاہ است (یعنی خدا زندہ و دانا و لا شریک اور سنتا اور خبردار ہے۔	(۷) اے اگنی ہم ہر روز صبح اور شام اطاعت کے ساتھ تیرا وبیان کر کر تیرے پاس آتے ہیں۔	(۷) اور سلیمان سے رجعام پیدا ہوا اور رجعام سے ابیاہ اور ابیاہ سے آسا پیدا ہوا۔	(۷) غیر المغضوب علیهم و لاالضالین نہ ان کی جن پر غضب نازل ہوا نہ گمراہوں کی۔ آمین۔

	ـ	اس کے بعد بطرز حکمائے یونان خدائے تعالیٰ سے عقل اول کا پیدا ہونا اور اُس سے عقل دوم اور نویں آسمان کا پیدا ہونا لکھا ہے اور اسی طرح آسمانوں کے عدم خرق و التیام پر دلائل لایا ہے۔ مگر اس کلام میں بھی چند نظر ہیں (۱) یہ کہ سب ترجمہ ساسان پنجم کا ہے کہ جس نے زمانۂ اسلام کو بھی دیکھا ہے۔ اگر اُس نے اہلِ اسلام کی تقلید سے صفاتِ باری میں کچھ بیان کیا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ چنانچہ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کا ترجمہ شاہدِ عدل ہے۔			اس سورة کو مع اُن تمام اسرار کے ملاحظہ کرنا چاہیے کہ جو اُوپر بیان ہوئے اور اُن کے سوا اور بے شمار اسرار ہیں کہ جن کو میں نہیں جانتا اور جانتا ہوں تو بیان کرنے سے عاجز ہوں کہ جن کو اولیائے امت اور اہلِ باطن جانتے ہیں وہ سب اسرار ان لفظوں سے ذرا تامل کرنے سے بے ساختہ منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فقط

تورات	زبور	دساتیر	وید	انجیل
(۸) اور خدا نے فضا کو آسمان کہا سو شام اور صبح دوسرا دن ہوا۔	یہاں بھی کچھ کلام ہے۔ (۱) یہ کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کلام عمدہ ہے اور اس کو الہامی کہہ سکتے ہیں مگر اس میں جو کچھ ہے صرف شریعت پر عمل کرنے کی تاکید ہے۔	(۲) یہ کہ جن کتابوں کو ہم غیر الہامی کہتے ہیں اُن سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اُن میں کوئی بات بھی حق نہیں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ شاید خدا نے ایران میں بھی انبیا بھیجے ہوں اور اُن پر	(۸) اے اگنی جوتی سروپ یک کی رکشا کرنے والی' دوستی کو فروغ دینے والی اور اپنے مکان میں کثیر ہونے والی ہم تیرے پاس آتے ہیں۔	(۸) اور آسا سے یہوسفط پیدا ہوا اور یہوسفط سے یورام پیدا ہوا اور یورام سے غریاہ پیدا ہوا۔
(۹) اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کے پانی ایک جگہ جمع ہوویں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوگیا۔	مگر جس قدر تاکید اور جو خوبی اهدنا الصراط المستقیم الخ میں ہے کہ شریعت کے نتیجہ کو مشاہدہ کرا دیا ہے) اس میں دسواں حصہ بھی نہیں علاوہ اس کے اور	کتاب نازل کی ہو اور پھر اُن کی کتابوں اور دین میں تحریف ہوگئی ہو (جیسا کہ تورات اور انجیل میں ہوئی) لیکن اس مضمون کو الحمد للہ رب العالمین	(۹) اے اگنی ایسی کرپا کر کہ ہم تجھ تک آسانی سے پہنچ سکیں یہ جیسے فرزند باپ کے پاس جب چاہے جا سکتا ہے ہماری بھلائی کے واسطے ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو۔	(۹) اور غریاہ سے یونام پیدا ہوا اور یونام سے آخز پیدا ہوا اور آخز سے خزقیاہ پیدا ہوا
(۱۰) اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جمع ہوئے پانیوں کو سمندر کہا (یہاں سے ۲۶ آیت تک زمین کی گھاس اور جاندار اور باقی دنوں کا بیان	باقی مضامین سورۂ الحمد کے مقابلے میں تو کچھ بھی اس زبور میں نہیں۔ پھر جو اس کو کلامِ الٰہی کہتے ہیں اُن کو ضرور ہے کہ سورۂ الحمد کو بھی کلامِ الٰہی کہیں	الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین سے کچھ بھی نسبت نہیں کس لیے کہ الحمد میں برہان تربیت ہے خدا تعالیٰ کی ذات اور جملہ صفات کا کامل ثبوت اور ہر نقص	یہ بات تو ظاہر ہے کہ اس کلام کو الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں بلکہ یہ سراسر توحید اور خدا پرستی کے مخالف ہے شرک کی برائی اور	(۱۰) اور خزقیاہ سے منسّی پیدا ہوا اور منسّی سے امون پیدا ہوا اور آمون سے یوسیاہ پیدا ہوا۔

ہے۔
(۲۶) تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنادیں۔ الخ
(۲۷) اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا الخ (باب دوم)
(۲۸) اور خدا نے عدن میں پورب کی طرف سے ایک باغ لگایا اور آدم کو جس نے اُسے بنایا تھا وہاں رکھا۔ الخ
(۱۰) اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کے چار سرے نہروں کے بنے۔
(۱۱) پہلے کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے وہاں سونا ہوتا ہے۔
(۱۲) اور اُس زمین کا سونا اچھا ہے اور وہاں موتی بھی ہیں۔
(۱۳) دوسری نہر کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔
(۱۴) اور تیسری نہر کا نام دجلہ ہے جو آسور کی پورب جاتی ہے۔
(۱۵) اور چوتھی نہر کا نام ذات ہے الخ۔ اگرچہ اس تورات موجودہ میں اصلی تورات کی بہت سی باتیں ہیں کہ جن کا

ورنہ انصاف سے بعید ہے۔
(۲) یہ کہ اس کے مولف اور ملہم کا اب تک تحقیق حال معلوم نہیں کہ کون ہے آیا حضرت داؤد ہیں یا کوئی اور۔ جو حضرت داؤد ہوں تو اُن کی نسبت حموئیل کی دوسری کتاب کی ۱۱ باب میں اوریا کی جورو سے زنا کرنا لکھا ہے۔ پھر جب انہوں نے خود شریعت پر عمل نہ کیا تو اُن کی بات کا کیا اعتبار رہا؟
(۳) عیسائیوں کے نزدیک تو یہ زبور بالکل لغو ہونی چاہیے کس لیے کہ پولوس نے کہ جو اُن کے نزدیک بڑا رسول ہے اپنے اس خط میں کہ جو گلتیون کو لکھا ہے اور جس کو عیسائی کلام الٰہی جانتے ہیں اُس کے تیسرے باب میں شریعت پر چلنے والے کو بلکہ خود عیسیٰ علیہ السلام کو ملعون لکھتا ہے۔
چنانچہ اس کے دس و گیارہویں و بارہویں جملہ میں اس کی تصریح ہے پھر اس کے بموجب تو یہ زبور کچھ بھی نہیں۔
(۴) لیکن بایں ہمہ ہم اہلِ اسلام حضرت داؤد علیہ السلام کو سچا رسول اور پاک اور اس کلام کو حق سمجھتے ہیں۔

سے تنزیہ اور تقدیس ہے کہ جس کو ہر منکر مجبور ہو کر تسلیم کرتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا بخلاف نامہ مہ آباد کے کہ وہاں منکر وجود باری و صفات باری کے مقابلہ میں کچھ بھی بیاں نہیں اور نہ جملہ صفات مذکور ہیں۔ صرف حکیمانہ طور پر صفت کے عین وغیرہ ہونے میں موشگافی کی ہے کہ جو منصب انبیاء علیہم السلام سے بعید ہے۔ پھر عقل اول اور اُس کے وسیلہ سے تمام مخلوقات کا پیدا ہونا اور آسمانوں کا خرق التیام کو قبول کرنا لکھا ہے وہ یا تو حکمائے یونان کی تقلید ہے کہ جو سکندر کی فتح یابی سے ایرانیوں پر غالب آ گئی تھی کہ جس کی اغلاط کو علماء کلام نے شرح مواقف و شرح مقاصد و غیرہما کتب میں طشت از بام کر دیا۔ نہایت سے نہایت اس رسالہ کو ہدایت الحکمۃ کی برابر سمجھا جائے گا اور بس اور باقی اور مضامین حکمت عملیۃ و نظریہ جو الحمد میں ہیں وہ یہاں کہاں نہ اسرارِ آخرت نہ عبادتِ الٰہی نہ اخلاق کی درستی نہ ہر امر میں نیک چلنی۔
(۳) اس دعویٰ پر کہ اس مجموعہ دساتیر کو الہامی نہیں کہہ سکتے یہ دلیل ہے کہ نامۂ دخشور گلشاہ میں زحل ستارہ کی پرستش کا حکم

بت پرستی اور عناصر پرستی کی قباحت اس وقت تہذیب یافتہ ہندوؤں کے دلوں پر بھی نقشِ حجر ہو گئی ہے۔ اب وہ زمانہ گیا کہ جو توہمات اور مخلوق پرستی کی کتابوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ کتاب اور اس کا مؤلف عقل مندوں کے نزدیک نہایت جہالت میں گرفتار ہے۔
(۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ ہندوؤں میں جو مشہور ہے کہ وید برہما کے منہ سے نکلا ہے محض بے اصل بات ہے کہ جو وید سے ناواقفیت پر دلالت کرتی ہے۔ کس لیے کہ وید کے دو حصہ ہیں اول حصہ کو سنتا کہتے ہیں جس میں سکت یعنی منتر اور دعائیں جو مختلف رشیوں یعنی مصنفوں نے عناصر اور اندر وغیرہ کی مہما یعنی ستایش میں بنائے ہیں یہ حصہ اول تصنیف ہوا ہے اس کے بعد دوسرا حصہ برہمنا تصنیف ہوا ہے جس میں منتروں کے قواعد اور یک وغیرہ رسوم کے اصل حالات اور منتروں کے استعمال کے مواضع کہ اس کو فلاں موقع پر آہستہ یا پکار کے پڑھنا چاہیے اور اس کے متعلق کہانیاں۔ اور سرگزشتیں اس رگوید میں اتریا برہمنا نہایت مشہور ہے جس

(۱۱) یوسیاہ سے یکونیا اور اُس کے بھائی بابل کو اُٹھ جانے کے وقت پیدا ہوئے۔
(۱۲) اور بابل کو اُٹھ جانے کے بعد یکونیاہ سے سلتائیل پیدا ہوا اور سلتائیل سے زور بابل پیدا ہوا۔
(۱۳) زور بابل سے ابیود پیدا ہوا اور ابیود سے الیاقیم پیدا ہوا اور الیاقیم سے عازور پیدا ہوا۔
(۱۴) اور عازور سے صدوق پیدا ہوا اور صدوق سے آخیم پیدا ہوا اور آخیم سے الیہود پیدا ہوا۔
(۱۵) الیہود سے الغزر پیدا ہوا اور الغزر سے مہتان پیدا ہوا اور مہتان سے یعقوب پیدا ہوا
(۱۶) یعقوب سے یوسف پیدا ہوا جو شوہر تھا مریم کا جس سے یسوع جو مسیح کہلاتا ہے پیدا ہوا۔
(۱۷) پس سب پشتیں ابرہام سے داؤد تک چودہ ہیں اور داؤد سے بابل اٹھ جانے تک چودہ اور بابل اُٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہوئیں۔
(۱۸) اب یسوع مسیح کی پیدائش یوں ہوئی کہ جب اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تو اُن کے جمع ہونے سے

قرآن صدق ہے مگر اس وقت ہیں اس کلام کی نسبت یہ کہتا ہیں اور یہ کلام غلطی سے خالی نہیں کیونکہ دوسری اور پہلی آیت میں تصریح ہے کہ خدا نے زمین و آسمان پیدا کیا اور زمین پر پانی اور اندھیریاں تھیں اور آیت میں پانیوں کے اندر کی فضا کو آسمان کہا ہے۔

اور اس کی ستایش میں یہ کلمات ہیں۔
(۷) وایں گو نہ ستائی کیوان راتا یا ودِ تو باشد نام و نشان شناخت دشنا سائے چیز و یاد داشت و دریافت افراز شگرف بزرگ

میں اس وقت کے بہت سے افسانے جمع ہیں اور پیشتر گل بکاؤلی اور بدر منیر کے سے وہ افسانے ہیں کہ جو خیالات اور توہمات پر مبنی ہیں۔ دوسرا اتر ما دارنا برہمنا ہے جس میں بعید از قیاس باتیں ہیں اور

پہلے وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی۔
(۱۹) تب اس کے شوہر یوسف نے الخ چاہا کہ اسے چپکے سے چھوڑ دے۔ الخ یہاں چند ابحاث ہیں اور یہ کہ اس تمام نسب نامہ میں نہ خدا کی حمد ہے نہ اس کی ذات و صفات کا ثبوت ہے نہ عالم آخرت کے احوال ہیں نہ عبادت و استعانت اسراء آخرت نہ عبادت الٰہی نہ اخلاق کی درستی نہ ہر امر میں نیک چلنی کا

تورات	دساتیر	وید	انجیل
پہلی بات کے خلاف ہے اور پھر نویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کے پانی کو ایک جگہ جمع کرنے سے خشکی یعنی زمین پیدا ہوئی حالانکہ یہ ہی اول بات کے خلاف ہے اور اس امر کو صحیح طور پر قرآن نے بیان کیا ہے جیسا کہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔ (۲) یہ کہ خدا بے مثل اور بے صورت ہے پھر آدم کا اس کی مثل اور صورت پر بنانا مقدس ذات میں دھبہ لگانا ہے۔ (۳) یہ کہ عدن کی نہر سے دجلہ اور فرات اور جیحون اور فیسوں کا نکلنا بالکل غلط ہے۔ اول تو عدن سے کوئی نہر نہیں نکلتی دوم دجلہ اور فرات اور جیحوں کجا یہ کیا بات ہے کہ جس کی تفسیر میں اب تک تمام علماءِ اہلِ کتاب حیران و سرگردان ہیں۔ پادری لوگ جو مسلمانوں سے سدِ ذوالقرنین پوچھا کرتے اور قرآن پر بے جا عیب لگایا	وسترگ کیایش وشکوہ رخشندہ و بخشائندہ و بخشایشگر و دہشور دادگر۔ الخ۔ دیکھئے جو کلمات خدا تعالیٰ کی نسبت تھے وہی اُس کے حق میں بھی اطلاق کر دیے۔ پھر نامۂ دخشور ہوشنگ میں مریخ کی پرستش اور اس کی بڑی لمبی چوڑی تسبیح مذکور ہے اور پھر نامہ دخشور قہمورس میں آفتاب کی بابت یہ ہے۔ آفتاب یاورتست اوراکہ خورشید باشد فرموم کہ تراہر زید و ہدبس ستائی و ایں گونہ۔ یعنی میں نے خورشید کو تیری اعانت کا حکم دیا ہے تو اس کی ستایش کر آگے بہت کچھ ستایش مذکور ہے۔ اسی طرح ماہتاب اور دیگر ستاروں کی پرستش اور ان سے استمداد اور دعا کرنا مذکور ہے اور نامہ دخشور یاسان میں ہاتھ پاؤں دھو کر دن میں تین یا چار یا دو بار شش کاخ کے آگے نماز پڑھنے کا حکم ہے اور شش کاخ ستاروں اور آگ کو	یجروید کا ستاپاتھا برھما چودہ جلد میں ہے جس میں از حد بے اصل قصے ہیں جیسے کہ سوتے وقت بوڑھیاں کہانیاں کہہ کر بچوں کو بہلایا کرتی ہیں اس قسم کی کہانیاں اس میں ہیں باقی شاید اور اتھربن وید میں بہت کم برہمنا ہیں پھر صدہا سال بعد پنڈتوں نے ان ویدوں کے بعد برہمنا ...... کے رسالے تتمہ یا ضمیمہ کے طور پر لگا دیے ہیں ان کو اوپنشد بھی کہتے ہیں اور اسی طرح علم نجوم اور علم موسیقی اور مذہبی قواعد کے رسالے کہ جن کو ویدانگا کہتے ہیں وید کے ضمیمہ میں اس کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے کہ جب ہندوؤں میں کسی قدر شائستگی نے ظہور کیا تھا سب سے قدیم رگوید ہے اس کے ہزار سے زیادہ سکت ہیں اور دس ہزار جاتیں یعنی فقرے کل سکت آٹھ کھنڈوں یعنی اشکوں (حصہ) پر منقسم ہیں اور ہر کھنڈ یا اشک میں آٹھ	ذکر ہے اور جملہ امور دنیاوی میں استقامت اور صراط مستقیم کا اشارہ ہے اور اگلے برے بھلے لوگوں کے حالات عبرت انگیز نصیحت خیز اس لیے اس کو سورۂ الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ (۲) قطع نظر اس کے کہ اس کو سورۂ الحمد سے کچھ بھی نسبت نہیں فی نفسہٖ یہ کلام اس قابل نہیں کہ اس کو الہامی کہا جائے اور اس کی تصنیف کو امر اہم خیال کر کے الہام کی ضرورت مانی جائے۔ عام تاریخوں میں جس طرح نسب نامہ ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اگر وہ الہامی ہیں تو یہ بھی ہے اور وہ نہیں تو یہ بھی نہیں کوئی خصوصیت اس میں نہیں۔ (۳) یہ نسب نامہ غلط ہے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام میں عیسائی لوگ دو جہت مانتے ہیں ایک الوہیت دوسری انسانیت۔ جہت اول سے تو یہ نسب نامہ قطعی غلط ہے کیونکہ مسیح جہت الوہیت سے یوسف

کرتے ہیں براہ مہربانی اس نہر کا تو پتا بتلادیں۔

(۳) الہامی کتاب اور نبی کا یہ منصب نہیں کہ وہ تاریخ بیان کیا کرے اور نہ یہ اہم کام ہے کہ جس کے لیے الہام اور نبی کی ضرورت بیان کی جائے کیونکہ ایسے امور کو عام مؤرخ بیان کر سکتے ہیں۔ شاید اسی ضرورت کو آریہ سماج فضول سمجھ کر نبوت کے قائل نہیں اور اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے اور اس مضمون کے نقصوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہی اصلی تورات مانا جائے کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے مگر پھر بھی اس کو الحمد سے مضامینِ مذکورہ بالا میں کون سے مضمون میں ہمسری ہے نہ اس میں خدا کی ستایش نہ اس کی ذات وصفات کا ثبوت قطعی نہ عالمِ آخرت اور نہ جزا وسزا کی بابت اشارہ نہ عبادتِ خدا کا ذکر نہ عموماً ہر امر میں نیک چلنی اور میانہ روی کی ترغیب نہ بھلے لوگوں کے رستے کی تحریص نہ برے لوگوں کے طریقے سے حذر پھر جو شخص خداترس اس کو کلامِ الٰہی اور الہامی کہے تو اُس پر فرض ہے کہ قرآن مجید کو بھی کہے اور اس سے زیادہ صدق دل سے اس آسمانی کلام پر ایمان لائے۔

ہم اہل قرآن ہر اچھی بات اور کلام الٰہی کے تسلیم میں انکار نہیں کرتے جو شخص اپنی کتاب کو الہامی ثابت کر دے تو ہماری سرآنکھوں پر۔ فقط

کہتے ہیں چنانچہ خود کہتا ہے' قولہ' پس برابر ششش کاخ آئی ونماز کن وششش کاخ ستارگان اندو آتش کہ فروغندگانند۔ بایں ہر گاہ ششش کاخے بہ بیند نماز برید۔ یعنی جہاں کہیں ستارہ اور آگ کو دیکھو تو اس کے آگے جھکو۔ آگے ششش کاخ کی نماز کا دستور بیان کرتا ہے۔ بار دوم بہر ششش کاخ سر بر زمین گزارد و پیشانی بر زمین رساں الخ۔ و اگر آتش باشد گوید۔ اے پروردگار ونمازِ مرا بہ یزداں رساں۔ الخ۔ اسی طرح آگے چل کر عناصر کی تعظیم اور عبادت کا حکم دیتا ہے۔ الغرض جانوروں کو ذبح نہ کرنا' آگ اور ستاروں کو پوجنا اور آفتاب کی پرستش کرنا اور ہر روز غسل کرنا اور عناصر کی عبادت کرنا وغیرہ دستورات کہ جن کو ہنود بھی عمل میں لاتے ہیں اور آگ جلا کر جگ اور ہوم کرتے اور اس کو پوجتے ہیں جیسا کہ وید بالخصوص رگوید میں موجود ہے یہ سب دساتیر میں موجود ہے۔ سو یہ باتیں ہند میں غالباً سری بیاس جی جامع وید نے مروج کی ہیں۔ چنانچہ نامہ زرتشت میں اول سکندر کے ذریعہ سے علم کا یونان میں پہنچنا اور ایک یونانی کا زرتشت کے پاس آنا اور تعلیم پانا لکھ کر جیکرن گوچہ ہندی کا تعلیم پا کر جانا لکھا ہے۔ انہوں نے برہمنے بیاس نام از ہند آمد پس دانا کہ بر زمین کم است چناں در دل دارد کہ نخست از پرتو پرسد الخ۔ الغرض یہ مخلوق پرستی اور سخت مجاہدات اور جگ اور ہوم کرنا سب کا سرچشمہ دساتیر ہیں۔ یہ دساتیر اور وید تو اس قابل بھی نہیں کہ اُن کو موحدین کی کتابوں کی فہرست میں لکھا جائے کیونکہ محض شرک اور بری تعلیم ہے کہ جس کو عقل نقل [illegible]

ادھیاتی ہیں۔ ہر منتر نظم ہے اس کا جداگانہ وزن اور علیحدہ مصنف ہے اور ہر منتر میں ایک یا دو دیوتا کی مہما ہے۔ چنانچہ اس رگوید کے ایک سو اکیس منتروں میں ۳۷ صرف آگ کی تعریف میں ہیں اور ان کے مصنف مدھوجن داس اور اس کا بیٹا جری اور مدھانی کالوا کا بیٹا وغیرہ ہیں۔ اور کہیں کہیں اگنی کے ساتھ اور دیوتاؤں کی بھی مدح ہے اور ۴۵ میں اندر کی مہما برتن یعنی ستایش ہے اور منجملہ باقی منتروں کے بادہ منتر مروت جنی ہما کے دیوتاؤں کی تعریف میں ہیں کہ جو اندر کی ہمراہی میں ہیں اور گیارہ آسونوں کی تعریف میں کہ جو سورج کے پوتر ہیں چار صبح کے دیوتا کی تعریف میں باقی ادنیٰ دیوتاؤں کی مدح میں ہیں اور دوسرے منڈل کے منتر گریسمدا۔ سناہوزا کے فرزند کی تصنیف جو اینگرا کے خاندان میں تھا۔ تیسرے منڈلا کے منتر دشواسترا اور اُس کے بیٹوں یا رشتہ داروں کی تصنیف ہیں اور یہ شخص راجہ رام چندر کا استاد ہے۔ چوتھے منڈل کے منتر واما دیوا کی تصنیف ہیں۔ پانچواں منڈل اتری اور اُس کے فرزندوں کی طرف منسوب ہے چھٹے کا مصنف بھاردواج ہے اور ساتویں کا استھا اور اس کی اولاد ہے۔ ان سب منتروں یعنی اشعار کو (کہ جن کو عناصر اور غیر مرئی چیزوں اور آفتاب سے مدد مانگنے اور دشمن پر فتح پانے اور اُن کے محامد کے بیان میں مختلف شاعروں نے بنایا تھا کہ جو ہنود کے نزدیک بڑے کامل [illegible]

اور یعقوب یا کسی اور انسان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے بلکہ معاذ اللہ خدا کے بیٹے ہیں تب یوں کہنا تھا کہ مسیح جبرئیل کا بیٹا خدا کا پوتا یا بالعکس اور دوسری جہت سے بھی غلط ہے کس لیے کہ انسانیت کے طور پر نسب حمل سے ثابت ہوتا ہے اور مسیح علیہ السلام تو مریم کے پیٹ میں یوسف کے پاس آنے سے پیشتر کو اپنے میں پائے گئے تھے جیسا کہ خود اسی متی کے (۱۸) جملہ سے صاف ظاہر ہے اور یہ احتمال ہو نہیں سکتا کہ یہ نسب نامہ حضرت مریم کا ہو کیونکہ مریم یوسف کی بیٹی نہیں بلکہ بیوی تھیں۔

(۴) اگر یہ نسب نامہ صحیح فرض کیا جائے تو لازم آوے کہ حضرت عیسیٰ (خدا اور خدا کے بیٹے تو کجا) بلکہ اُس کی جماعت سے بھی باہر کئے جائیں کیونکہ کتاب استثنا ۲۳ باب کے اول ہی میں یہ ہے (حرامی بچہ خداوند کی جماعت میں داخل نہ ہووے اُس کی دسویں پشت تک خدا کی جماعت میں شامل حال نہ ہو۔ الخ (۳) کوئی عمونی یا موابی الخ) ہمیشہ تک خدا کی جماعت میں شامل نہ ہوں۔ الخ اور حضرت داؤد کا باپ یسی اور اُس کا باپ عوبید ہے کہ جو بوغر کے نطفہ سے روت کے شکم سے پیدا ہوا تھا کہ جو موابی ہے جیسا کہ اس کتاب کے چوتھے باب میں ہے اور اس پر لطف یہ کہ بوغر راحاب فاحشہ کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اور راحاب کا فاجر ہونا کتاب یشوع کے ۲ باب سے ظاہر ہے کہ پھارس کہ جس کو حضرت مسیح کے نسب نامہ میں [illegible]

وید	انجیل
کے بیٹے کرشناوہ پیانانے کہ جس کو ویاس یعنی بیاس جی کہتے ہیں کوروں پانڈوں کے زمانہ میں جمع کیا اور مرتب کرکے اُس کا نام وید رکھا اور ویاسا کے معنی ترتیب دینے والے کے ہیں۔ غالباً بعد فتح پانڈوں کے راجہ یدھشتر نے اس کام کے لیے بیاس کو مصروف کیا ہے اور اس کے علاوہ اور بھی پنڈت جو اس زمانے میں واقف منتروں سے واقف تھے۔ سنہتا یعنی منتروں کے مجموعہ کے تیار کرنے میں حسب تفصیل ذیل مصروف تھے۔ پیل رگوید کے اور ویشمپائن یجروید کے اور جیمن شام وید کے اور سمنتو اتھرون وید جمع کرنے پر مصروف تھا اور کچھ عجب نہیں کہ بیاس جی اُن کے مہتمم اور سرپرست ہوں۔ ہرچہ باشد اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص وید ایک شخص خاص کی تصنیف نہیں نہ ایک زمانہ میں تصنیف ہوا چہ جائے کہ برہما کی تصنیف اس کا کوئی لکھا پڑھا ہندو بھی قائل نہیں عوام کا کیا اعتبار ہے پس جب اصل الاصول وید الہامی کیا بلکہ روشنیِ علم کے زمانہ کے بھی تصنیف نہیں نہ کوئی الہامی اور عاقلانہ بات اس میں ہے۔ تو پھر اس کتاب کو نجات کا مدار جان کر پرانی جہالت کے خیالات اور توہمات میں گرفتار ہونا مرنے کے بعد بڑی حسرت اُٹھانے کا سامان ہے۔ العیاذ باللہ اور جب وید کا یہ حال ہے تو اس کے بعد جو پُران اور دیگر پُستک انہیں خیالات کی بنائے فاسد پر بنائے گئے ہیں اور اُس کا نام دھرم رکھا گیا ہے اور جگ کرنا اور آگ جلا کر دیوتاؤں کی نذروں کے لیے کرچھوں میں گھی ڈالنا اور رگوید کے یہ منتر پڑھ کر دنیا وآخرت کی بھلائی تلاش کرنا خیالِ خام اور تقلیدِ عام ہے۔ تمام ہوا وید۔ فقط	پیٹ سے زناکاری سے پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ کتاب پیدائش کے ۳۸ باب میں تصریح ہے کہ یہوداہ نے اپنی بہو تمر سے زنا کیا جس سے پھارس پیدا ہوا۔ پھر اسی طرح حضرت سلیمان اوریا کی جورو سے پیدا ہوئے ہیں کہ جس نے داؤد سے زنا کرایا۔ خیال کیجئے کہ مسیح کے نسب نامہ میں کیسے پاکدامن لوگ ہیں۔ (۵) اس نسب نامہ میں اور بھی اغلاط ہیں (۱) اول یہ کہ خود ابراہیم کو اور ادھر داؤد کو شمار کرلیں تو اول قسمت میں اور دوسرے میں چودہ چودہ نام آجاتے ہیں مگر تیسری قسمت جو سلت ایل سے شروع اور یوسف پر تمام ہوتی ہے اس میں کل ۱۲ شخص ہیں اور جو خود حضرت مسیح کو ملادیں تو تیرہ ہوتے ہیں چودہ نہیں۔ جس کا دل چاہے شمار کرلے۔ پادری عمادالدین نے یکوینا ہ کو دوبار گن کر ٹھگوں کی سی ہیت پھیری کی ہے۔ مگر غلط اس انجیل میں غلطی کا ضرور دھبہ لگتا ہے (۲) دوسری قسمت جو سلیمان سے شروع ہو کر یکویناہ پر ختم ہوتی ہے متی نے اُس کی چودہ گنوائی ہیں حالانکہ یہ صریح غلط ہے بلکہ اول کتاب التاریخ کے ۳ باب میں اٹھارہ شخص لکھے ہیں اگر انجیل متی غلط نہیں تو کتاب التاریخ جس کو تمام عیسائی اور یہودی الہامی مانتے ہیں غلط ہے (۳) متی نے سلت ایل سے زربابل کا پیدا ہونا لکھا ہے حالانکہ کتاب التاریخ میں زوربابل کو لذایاہ کا بیٹا لکھا ہے جو سلت ایل کا بھائی ہے (۴) سلت ایل کو یکویناہ کا بیٹا لکھ کر چودہ پشتیں بابل کے اُٹھ جانے تک گنوائی ہیں سو یہ غلط کیونکہ سلت ایل کو کتاب تاریخ میں ایسر کا بیٹا لکھا ہے کہ جو یکویناہ کا بیٹا ہے۔ اب اس میں ایک شخص اور بڑھ گیا چودہ کہنا غلط ہوا۔ (تمام ہوئی انجیل)

سوال: یہ تسلیم کہ جس قدر مذاہب اور ان کی کتابوں کا قرآن مجید سے مقابلہ کرکے دیکھا گیا سب میں اسلام کو من جانب اللہ اور دینِ الٰہی پایا جس میں خداپرستی اور اس کی صفاتِ کاملہ اور ملائکہ اور انبیاء اور قیامت پر ایمان لانے کی بڑی تاکید ہے اور انسان کی روح کی صفائی کی بابت اور دنیا میں ہر طرح سے نیک چلنی اور مرنے کے بعد جو کچھ وہاں پیش آتا ہے اس کی بابت کامل بیان ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ سب مذاہب باطل یا بالکل باطل ہیں۔ مگر ہنوز اور صدہا مذاہب دنیا میں ہیں جیسا کہ دبستان المذاہب میں لکھا ہے اور ان کے اصولِ حمیدہ بیان کئے ہیں ان سے ہنوز اسلام کا مقابلہ نہیں ہوا، جائز ہے کہ وہ حق ہوں پوری تحقیق جب ہے کہ ان سے بھی مقابلہ کرکے اسلام کا حق ہونا بتلایا جاوے ورنہ پھر تقلیداً اسلام کو حق ماننا پڑے گا۔

جواب: دنیا میں جس قدر مشہور ومعروف مذاہب قدیم سے ہیں وہ یہی مذاہب ہیں کہ جن کی کتاب کو آپ نے آنکھ سے دیکھا، باقی وہ جو صدہا مذاہب دبستان المذاہب میں لکھے ہیں سب یا بیشتر ان ہی کی شاخیں ہیں کیونکہ بہتر فرقے تو اس میں اسلام کے لکھے ہیں اور پھر ہندوؤں کے بہت سے فریق جوگی اور سنیاسی وغیرہ لکھے ہیں کہ جن کی ریاضات اور شعبدوں پر صاحبِ دبستان لٹو ہو کر ہر مذہب پر منہ میں پانی بھرلاتے ہیں اور ناظر کو شک میں ڈالتے ہیں اور پھر آتش پرستوں کے فریق کا بہت کچھ بیان اور اپنا شوق عیاں کیا ہے اور پھر کسی قدر یہود ونصاریٰ کے مذہب کا بیان ہے اور تحقیق کسی مذہب کی بھی حضرت کو میسر نہیں ہوئی۔ سنی سنائی باتیں اور اپنے دیکھے ہوئے حالات

بیان کر دیے ہیں نہ وید انہوں نے دیکھے نہ تورات نہ زبور نہ انجیل۔ اسلام کے اصول و مسائل میں کچھ بے خبری سے بیان کر کے بے علموں کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور ہم نے تو سب کے اصول بیان کر دیے۔ ان کی فروع اور شاخوں سے کیا غرض۔ البتہ حکمائے یونان اور قدیم اہل مصر اور دہریوں اور جینیوں اور دیگر صحرائی قوموں کا مذہب نہیں بیان کیا۔ سو واضح ہو کہ حکمائے مصر اور قدمائے یونان دونوں کواکب اور عناصر پرست ہیں۔ مصریوں کے عقائد ہندوؤں سے بہت ملتے ہیں ان کے ہاں بھی بیل کو پوجتے ہیں کہ جس کو ابیس کہتے ہیں اور اسی تقلید سے بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر پوجا تھا۔ چنانچہ یہ باتیں کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان کے پاس کوئی تاریخ نہیں تھی اور دہریوں کا نہ کوئی اصول ہے نہ مذہب، وہ خدا تعالیٰ اور عالمِ آخرت کے منکر ہیں۔ سو یہ بات ادلّہ عقلیہ و نقلیہ سے باطل ٹھہر چکی ہے خود قرآن نے اس کو رد کر دیا ہے اور ایک مختصر سی بات میں بھی سناتا ہوں کہ بھائی اگر نہ خدا ہے، نہ قیامت ہے، نہ جزا، نہ سزا تو ہم کو بھی کچھ خوف نہیں۔ غایۃ الامر نماز، روزہ طاعت و عبادت کا ثمرہ نہ ملا اور کسی قدر حرام لذتوں سے مزہ نہ اٹھایا تو کچھ پروا نہیں، دنیا کی تکلیف کیا اور مزہ کیا اور جو خدا تعالیٰ اور عالمِ آخرت سب کچھ حق ہوا (اور قطعی ہے) تو کہیے تیرے لیے کیا خرابی ہوگی۔ اب تو محلِ خطر میں ہے یا ہم؟ اور جینیوں کا مذہب بودھ کی شاخ ہے وہ بھی بت پرست ہیں ان کے ہاں بھی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس کو وہ الہامی کہتے ہوں باقی بت پرست اور صحرائی قومیں جیسا کہ افریقہ میں ہیں تو ان کا مذہب تو کیا سرے سے ان کو تو عقل انسانوں کی فہرست میں ہی لکھتے ہوئے ہاتھ کھینچتی ہے۔ اب روئے زمین پر کوئی مذہب عقلاً و نقلاً اسلام کے برابر نہ نکلا۔ الحمد للّٰہ علیٰ دین الاسلام۔

فضائل: اس سورۃ کے بے شمار فضائل ہیں بخاری وغیرہ محدثین نے ابی سعید بن معلیٰ سے روایت کی ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھ کو نبی ﷺ نے پکارا میں بوجہ نماز جواب نہ دے سکا جب فارغ ہو کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تجھ کو بلایا تو نے کیوں جواب نہ دیا؟ عرض کیا کہ حضور میں نماز میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے وقت بھی رسول کا جواب دینا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ الآیہ پھر آپ نے فرمایا کہ دیکھ میں تجھ کو مسجد سے باہر جانے سے پیشتر قرآن میں جو بڑی سورۃ ہے تعلیم کروں گا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چلے۔ جب مسجد سے باہر ہونے لگے میں نے یاد دلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ سورۃ الحمد ہے جس کی سات آیت ہیں اور وہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا۔ صحیح مسلمؒ وغیرہ کتب میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت کے پاس جبریل حاضر تھے کہ ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا، جبریل نے کہا کہ یہ آج سے پہلے کبھی زمین پر نہ آیا تھا، اس فرشتے نے کہا یا نبی اللہ مژدہ ہو کہ آپ کو خدا نے دو نور عطا فرمائے کہ آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا اخیر سورہ بقرہ ہے جو حرف آپ ﷺ ان میں سے پڑھیں گے اس کا ثواب ملے گا۔ دارمی اور بیہقی نے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ سورۃ الحمد ہر مرض کے لیے شفا ہے اور صحیح مسلم و نسائی وغیرہ کتابوں میں ہے کہ صحابہ سانپ اور بچھو کے کاٹے پر اور مجنون اور اہل صرع پر یہ سورت پڑھ کر دم کرتے تھے، اسی وقت مریض تندرست ہو جاتا تھا (جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے بیماران کے ہاتھ لگانے سے تندرست ہو جائے گا) یہ معجزہ آنحضرت ﷺ کا ہر قرن میں متواتر چلا آتا ہے۔ چنانچہ اب بھی سورہ الحمد کا فجر کی سنتوں اور فرض کے بیچ میں اکتالیس بار ہر روز بسم اللہ کا میم الحمد کے لام سے ملا کر چالیس روز تک پڑھنا ہر کام کے لیے عملِ مجرب ہے اور بیمار کو دم کر کے پلانا اور چینی یا شیشہ کے برتن پر

۱ میں اس بات کا نہایت شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اسلام کو تمام روئے زمین کے مذاہب سے ملا کر دیکھا اور کسوٹی پر اس کو لگایا ہر طرح سے کھرا پایا اور محققانہ طور پر مسلمان ہوا اگر میرے ماں باپ مسلمان نہ ہوتے اور قدیم سے اسلام میں میرے آباؤ اجداد حصہ نہ پاتے تو بھی میں از خود اسلام ہی کو اختیار کرتا۔ ان بھائیوں پر ہزار افسوس کہ جو محض تقلید اور رسم اور نفسانیت سے اس نور کے زمانے میں بھی باطل خیالات اور غلط مذاہب پر اڑے ہوئے ہیں۔

مشک و گلاب اور زعفران سے لکھ کر چالیس روز تک بیمار کو پلانا مجرب ہے اور ۱ دردِ گردہ کے لیے ایک سانس سے گیارہ بار پڑھ کر دم کرنا مجرب سریع الاثر ہے۔ مگر اعتقادِ کامل اور ہمتِ جازم شرط ہے۔ ترمذی نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں مجھ کو اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضے میں میری جان ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی) سورۃ الحمد کی مثل کوئی سورۃ نہ تورات میں ہے نہ انجیل میں نہ زبور میں، نہ قرآن میں۔ چنانچہ اس حدیث کی تصدیق ہمارے اس مقابلے سے بہ خوبی ہو سکتی ہے جو ابھی ہم نے تورات و انجیل و زبور کو لکھ کر کیا ہے۔ حقیقت میں یہ سورت ایک دریائے ذخار اور مجمعِ اسرار بیشمار ہے۔ دنیا و دین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں کہ جو کامل طور پر اس سورۃ میں نہ ہو، مگر کسی قدر فہمِ خداداد شرط ہے، ورنہ بہت سے عیسائی اور دیگر متعصب لوگ کہ جن کے انوارِ فطرت عداوت و قساوت سے مٹ گئے ہیں، وہ یہی کہتے ہیں کہ لفظوں سے کوئی بات بھی سورۃ الحمد سے ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ مسلمان اپنی ذکاوت خرچ کر کے یہ باریکیاں پیدا کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ سب باتیں ظاہر الفاظ سے مستفاد ہیں اور اچھا یہی سہی آپ بھی تو روحانی تعلیم سے بہرہ یابی کا دعویٰ کرتے ہیں ہم آپ کو بیس برس کی اجازت دیتے ہیں اور تمام جہان کے لوگوں سے مدد لینے کو بھی جائز رکھ کر یہ کہتے ہیں کہ آپ بھی تو کسی جملۂ تورات و انجیل و زبور و وید و دساتیر سے اس قدر باتیں پیدا کر دیجئے اور جو نہ کر سکو تو یقین کیجئے کہ یہ خاص اعجازِ قرآن ہے۔ اب ہم اس سورۂ مقدسہ کی تفسیر سے فارغ ہو چکے مگر اس کے متعلق تین بحث اور باقی ہیں کہ جن کا ذکر کرنا اس تفسیر میں بعض وجہ سے نہایت مناسب ہے۔

بحث اول: یہ سورہ نماز میں پڑھی جاتی ہے اور ہر نماز میں اس کا پڑھنا (ان خوبیوں کی وجہ سے کہ جن کا اوپر ذکر ہوا) شرع نے ضروری کر دیا، یہاں تک کہ جس نماز میں یہ سورۃ نہ پڑھی جائے وہ فاسد یا باطل ہے، چنانچہ نبی ﷺ فرماتے ہیں: من صلی صلوۃ لم یقرا فیھا بام القرآن فھی خداج ثلثا غیر تمام الحدیث رواہ مسلم کہ ''جس نے نماز میں الحمد نہیں پڑھی وہ نماز ناقص ہے، تین بار یہ فرمایا''۔ وعن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحہ الکتاب متفق علیہ کہ جس نے الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ یہ مسئلہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ نماز میں الحمد کا پڑھنا واجب ہے مگر جبکہ نماز جماعت سے ہو تو مقتدی کو بھی الحمد پڑھنا چاہیے یا جماعت میں صرف امام کا پڑھنا سب مقتدیوں کی طرف سے کافی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اور ان کے شاگرد امام یوسف و امام محمد و امام مالک اور امام احمد اور اسحاق اور سفیان ثوری اور ابن شہاب زہری اور ابراہیم نخعی اور عبداللہ بن مبارک اور قاسم بن محمد اور عروہ بن زبیر رحمہم اللہ بڑے بڑے محدثین تابعین اور صحابہ کبار کا یہ مذہب ہے کہ مقتدی الحمد نہ پڑھے بلکہ چپ ہو کر امام کی قرأت کو سنے اور ختم کرنے کے وقت آمین کہہ کر اپنی مشارکت ثابت کر دے۔ ان چند دلائل کی وجہ سے (۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ کہ جب قرآن پڑھا جائے تو چپ ہو کر سنو تا کہ تم پر رحمت ہو۔ بعض لوگ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ خطبے کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی خطبہ کے وقت چپ کرنا مراد ہے۔ مگر یہ جواب صحیح نہیں اولاً تو یوں کہ یہ آیت مکیہ ہے اور خطبہ مدینہ میں آ کر جب جمعہ شروع ہوا تب مقرر ہوا چنانچہ اکثر مفسرین بالخصوص امام محی السنۃ بغوی شافعی اپنی

۱ عیسائی بالخصوص پراٹسٹنٹ اور وہ جوان میں الحاد کا دم بھرتے ہیں اور وہ ہندوستان کے نیچری جوان کی تقلید کرتے ہیں ان باتوں کے سخت منکر ہیں اور یہ انکار ان کا بجا ہے کس لیے کہ ان کی روح پر اس درجہ تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ کوئی روحانی اثر ان کو محسوس نہیں ہوتا (گویا روح مر گئی) نہ خود ان کو عمر بھر ایسی باتوں کا اتفاق ہوتا ہے نہ اپنے ملک میں کہ جہاں کفر و الحاد کی تاریکی چاروں طرف محیط ہے کسی کو ایسا دیکھتے ہیں اگر صدقِ دل سے توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں اور کسی روشن ضمیر سے (چند روز روح کو منور کرنے والے) اشغال دیکھیں تو پھر عالمِ مثال کے اسرار اور ایسے کلمات کے آثار ان کو دکھائی دیویں اور وہ روحانیت کا اثر اپنے اوپر معائنہ کریں کہ ان کی زبان اور ہاتھ پاؤں سے کس قدر خرقِ عادت سرزد ہوتے ہیں اور جو ہم اہلِ اسلام نے صدہا مخالفوں کو ایسی برکات کا مشاہدہ بھی کرا دیا ہو تو پھر جس قدر اس مشاہدہ سے محروم ہیں وہ کب مانتے ہیں بلکہ خیالی باتیں اور ڈھکوسلے جانتے ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل میں اس کے مقر ہیں۔ ثانیاً یوں کہ گو خطبے کے بارے میں آیت کا نازل ہونا فرض کیا جاوے مگر لحاظ عبارت کا ہوتا ہے نہ موقع نزول کا۔ کس لیے کہ آیت سرقہ اور آیت لعان اور دیگر آیات خاص اشخاص کے معاملوں میں نازل ہوئی ہیں مگر ان کی عبارت پر لحاظ کر کے عام حکم جاری کیا جاتا ہے۔ ثالثاً جب خطبہ میں (کہ جہاں غالباً نصیحت حسبِ وقت ہوتی ہے سراسر قرآن مجید نہیں پڑھا جایا کرتا) چپ رہنا واجب ہوا تو جہاں قرآن پڑھا جاوے اور حالتِ نماز اور توجہ الی اللہ ہو تو وہاں بدرجہ اولیٰ سکوت کرنا چاہیے۔

(۲) عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ انما جعل الامام ليوتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرء فانصتوا رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ۔ یعنی ''نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ امام صرف اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ لوگ نماز میں اس کا اقتدا کریں۔ پس چاہیے کہ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قرآن پڑھے تو چپ ہو کر سنو۔'' (۳) امام مسلم نے ابی ہریرہ اور قتادہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: واذاقرء فانصتوا کہ جب امام پڑھے تو چپ کرو۔'' (۴) امام مالک اور امام احمد اور ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ ایک جہری نماز میں نبی ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ تم میں سے کسی نے میرے ساتھ کچھ پڑھا ہے؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی کہتا تھا کہ مجھ سے قرآن پڑھنے میں کون جھگڑ رہا ہے۔ پس لوگوں نے یہ سنا (تو جن نمازوں میں کہ پکار کر قرآن پڑھا جاتا ہے ان میں) صحابہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے رک گئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیثِ صحیحہ اس بارے میں وارد ہیں کہ جن کے ذکر کرنے کو ایک دفتر چاہیے، لیکن امام شافعی اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ گو امام کے ساتھ پڑھنا ممنوع ہے مگر جب امام دم لیتا ہے بالخصوص تین سکتوں میں مقتدی کو چاہیے کہ الحمد پڑھ لے۔ کس لیے کہ مسلم نے روایت کی ہے کہ جب میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ امام کے پیچھے بھی الحمد پڑھیں تو انہوں نے فرمایا کہ اقرابها فی نفسك الحدیث ''کہ اپنے دل میں پڑھ لے۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد مضمون الحمد کو دل میں تصور کر لینا ہے نہ پڑھنا۔ کس لیے کہ یہی ابو ہریرہ پیشتر روایت کر چکے ہیں کہ جب امام پڑھے تو حضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ چپ ہو کر سنو۔ پس یہاں خلافِ حکم حضرت کے کیونکر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فتویٰ دیتے اور چپ کرنا مطلقاً حضرت نے فرمایا خواہ الحمد ہو یا کوئی اور سورۃ ہو سب سے چپ کرنا چاہیے۔ امام شافعی کے اور بھی دلائل ہیں مگر وہ دلائلِ سابقہ کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے اس لیے ان کا بیان کرنا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ از ان جملہ یہ ہے کہ ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی نے جہاں امام کے پیچھے پڑھنے سے ممانعت کی روایت کی ہے وہاں الحمد کو بھی مستثنیٰ کر لیا ہے۔ لاتقرؤا الا بفاتحة الكتاب فانه لاصلوة لمن لم يقرء بها واضح ہو کہ فریق اول کے (اعنی جو کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنا نماز میں درست نہیں جانتے) دو قول ہیں حضرت امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف تو مطلقاً منع کرتے ہیں خواہ امام پکار کر پڑھے یا آہستہ کیونکہ جو دلائل کہ امام کے پیچھے الحمد پڑھنے سے منع کرتے ہیں وہ عام ہیں سریہ اور جہریہ کی کوئی قید نہیں اور امام محمد وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جب امام چپکے پڑھے (یعنی صلوۃ سریہ میں) تو مقتدی الحمد پڑھ لے۔ کس لیے کہ اب امام سے وہ منازعت نہیں پائی جاتی اور فضیلت الحمد پڑھنے کی ملتی ہے اور ان احادیثِ مخالفین پر بھی عمل ہو جاتا ہے اور یوں خالی کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔

بحث دوم : الحمد کے بعد آمین کہنا مسنون ہے خواہ اکیلا الحمد کو پڑھے خواہ امام کے پیچھے خواہ نماز سے باہر ہو کس لیے کہ مسلم نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے واذقال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمین۔ ''کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہہ چکے تو تم آمین کہو''۔ اور بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کس لیے کہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق پڑتی ہے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کئے جاتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ سورۃ الحمد میں خدا کی ثناء اور صفت کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد آمین مہرِ الٰہی ہے کہ جس سے قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے

چنانچہ ابوداؤد نے ابوزبیر نمیری سے روایت کی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ باہر نکلے تو ایک شخص کو دعا میں نہایت تضرع کرتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس نے تمام کیا تو پالیا۔ ساتھیوں میں سے کسی نے پوچھا کہ یا حضرت کاہے کے ساتھ تمام کرے؟ فرمایا آمین کے ساتھ۔

آمین اسم ہے اس فعل کا کہ جو استجب ہے، یعنی قبول کر۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عطا کا قول یہ ہے کہ آمین دعا ہے۔ الغرض آمین کے معنی (قبول کر) ہیں۔ یہ لفظ مدِ الف اور قصرِ الف دونوں سے جائز ہے اور بالاتفاق یہ لفظ قرآن کا جزو نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد یہ لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا بالاتفاق سنت ہے۔ لیکن صرف اس بات میں اختلاف ہے کہ اس کو آہستہ یا خفیہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے؟ امام ابو حنیفہ اور امام مالک اور سفیان ثوری وغیرہم اکابر علماءِ تابعین اور تبع تابعین خفیہ کہنا اولیٰ سمجھتے ہیں چند دلائل سے:

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کہ ''اپنے رب سے تضرع اور خفیہ دعا مانگو اس کو حد سے بڑھنے والے پسند نہیں آتے۔'' اس آیت سے دعا کا خفیہ کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے کس لیے کہ تضرع وزاری آہستگی میں خوب پائی جاتی ہے اور یہی بات دعا میں اصل الاصول ہے اور آمین دعا ہے جیسا کہ عطاء نے فرمایا اور دیگر مواضع سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۲) بخاری اور مسلم کی احادیث مذکورہ (کہ جب امام غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو) اخفا پر دلالت کرتے ہیں۔ کس لیے کہ اگر امام پکار کر آمین کہتا تو مقتدیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا پتا دینا اور ملائکہ کے ساتھ موافقت بتلانا کچھ مفید نہیں (ابوداؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ نے سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ دو سکتہ کرتے تھے۔ سكتة اذا كبر و سكتة اذا فرغ من قرءة غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ''ایک سکتہ جب کرتے تھے کہ جب تکبیر تحریمہ کرتے تھے (اس سکتہ میں تعوذ وثنا پڑھتے تھے اور ایک سکتہ (یعنی چپ کرنا) اس وقت کہ جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھ کر فارغ ہوتے تھے'' (اس سکتہ میں آمین کہتے تھے) پس اگر آنحضرت ﷺ پکار کر آمین کہتے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کے بعد چپ نہ کرتے بلکہ آمین پکار کر کہتے۔ امام شافعی اور احمد بن حنبل وغیرہما علماء یہ فرماتے ہیں کہ ذرا آواز سے آمین کہے تو بہتر ہے کیونکہ وائل بن حجر سے ترمذی اور ابوداؤد اور دارمی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ کو غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھ کر آمین کہتے سنا اور اپنی آواز کو بلند کیا اور اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آمین سے مسجد گونج جاتی تھی۔ (رواہ ابن ماجہ) لیکن اس قسم کی احادیث کا یہ جواب ہے کہ درصورت معارضہ پہلی حدیث کے معارضہ کے ان میں صلاحیت نہیں کیونکہ ادھر قرآن اور صحیح احادیث ہیں اور ادھر صرف ایسی احادیث ہیں کہ جن میں محدثین کو کلام ہے اور اسی لیے امام بخاری نے باوجودیکہ جہر آمین کا باب باندھا مگر ان احادیث میں سے کسی کو بھی درج نہ کیا، ان کے نزدیک ان کی صحت پر وثوق نہ تھا فقط قولوا آمین کو روایت کر کے بس کر گئے اور قولوا سے کی طرح جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ التحيات لله الخ وقولو اربنالك الحمد (متفق علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا۔ ولم يقل بالجهر من العلماء دوم اگر ان کی صحت بھی تسلیم کی جائے تو ان کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے احیاناً تعلیم کے لیے آمین کو آواز سے کہہ دیا ہوگا تاکہ لوگوں کو آپ ﷺ کا آمین کہنا معلوم ہو جائے چنانچہ بخاری و مسلم نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے نمازِ ظہر کی بابت یہ روایت کی ہے کہ يسمعنا الآية احيانا الحدیث ''کہ کبھی آنحضرت ﷺ کوئی آیت ہم کو سنا کر پڑھ دیتے تھے'' حالانکہ ظہر کی نماز میں خفیہ پڑھنا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ پس صرف تعلیم کے لیے کہ میں ظہر میں فلاں سورت پڑھتا ہوں بعض آیات کو سنا دیتے تھے۔ اسی طرح آمین ہو تو بعید نہیں۔ پس جنہوں نے اس موقع کو دیکھ لیا انہوں نے آمین کا با آواز بلند کہنا اولیٰ سمجھ لیا، وہ اپنے مشاہدہ کے موافق سچے

ہیں۔

سوم: اگر آنحضرت ﷺ ہمیشہ پنجگانہ میں دم اخیر تک آمین پکار کر کہتے تو یہ فعل ایسا نہ تھا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ پر مخفی رہتا حالانکہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ آج کل بعض صاحبوں نے ان خفیف مسائل میں بہت غلو کر کے مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا اور باہمی نفاق اور کینہ کو بجائے مردہ سنت کے جلا دیا۔

بحث سوم : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ الآیۃ ۔یعنی جب تو قرآن پڑھے تو شیطان سے خدا کی پناہ مانگ۔ اس لیے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو بغیر اعوذ کے نہ پڑھنا چاہیے پھر اعوذ مختلف طور پر پڑھتے ہیں زیادہ مشہور تو یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔مصر کے قراء اس میں اور کلمات بھی ملاتے ہیں اور سر اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قویٰ سے مرکب بنایا ہے جس طرح روحانی قوتیں کہ جو امورِ فطرت کی طرف اس کو رہنمائی کرتی ہیں اور جن کو قوائے ملکیہ کہتے ہیں اس کو ملے ہیں اسی طرح جسم کے متعلق ظلمانی قویٰ بھی اس کے پاس موجود ہیں جو کجی اور شہوت اور توہماتِ باطلہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ جن کو قوائے بہیمیہ کہتے ہیں پس قوائے ملکوتیہ تو ملائکہ اور روحانی اور لطیف اور نورانی اشخاص کے آثار کے آنے کا ذریعہ ہیں اور ان قوائے بہیمیہ کے گھوڑے پر شیطان رجیم سوار ہو کر آتا ہے اور گمراہ بناتا ہے۔ اسی لیے کبھی ان قوائے بہیمیہ کو بھی شیطان کہہ دیتے ہیں اور جس میں یہ قویٰ زیادہ پائے جاتے ہیں اس پر بھی اسی علاقہ سے شیطان کا اطلاق ہوتا ہے اور دراصل شیطان وہ ایک شخص خاص ہے کہ جو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے نافرمان ہوا۔ (چونکہ بعض کم فہم اس امر کو نہیں سمجھتے انہوں نے ان قوائے بہیمیہ اور ملکیہ کو کہ جن پر اس علاقہ سے شیطان اور ملک کا اطلاق قرآن اور حدیث میں ہوا ہے اصل شیطان اور فرشتہ سمجھ کر وجودِ شیطان اور فرشتہ کا انکار کر دیا۔) حاصل کلام یہ کہ انسان کے اندر ان قوائے بہیمیہ کے لحاظ سے ہر رگ و ریشہ میں شیطان پھرتا ہے اور قرآن مجید ایک نورانی اور ملکی چیز ہے تو پیشتر جب تک گندی چیزوں سے تصفیہ نہ ہو لے یہ رنگِ ملکوتی نہیں چڑھتا اور ان قوائے بہیمیہ کو فرو کرنے کا بشر کو مقدور نہیں، اس لیے ضرور ہوا کہ خدا سے پناہ مانگے اور جب اس سے کوئی بصدقِ دل پناہ مانگتا ہے تو اس کے قوائے بہیمیہ کو اس خیر میں خلل انداز نہیں ہونے دیتا، نہ شیطان کچھ خلل ڈال سکتا ہے۔ جس طرح عالمِ خواب میں وہم عقل کا معارض ہو کر ادھر ادھر بہکاتا اور کسی ادنیٰ مناسبت سے اصل شے کو دوسری چیزوں کی صورت میں دکھاتا ہے اسی طرح اس عالم میں انسان کے قوائے بہیمیہ اور ان کا سوار شیطان آدمی کی راہ میں ہر طرح سے خلل انداز ہوتا ہے بری چیزوں کو سجا کر آگے لاتا ہے، بھلی باتوں کو برا بنا کر دکھاتا ہے اور یہی تو وجہ ہے کہ اس عالم میں انسان مذاہب کے بارے میں گوناگوں اور ہر ایک غرض میں بنی نوع بوقلموں ہیں۔ کوئی اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بت کے آگے دست بستہ کھڑا ہے۔ کوئی اپنی کسی دھن میں اڑا ہے کل حزب بما لدیھم فرحون ع ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے۔ اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔

❀❀❀

سورۂ بقرہ

یہ سورۃ[۱] مدنی ہے یعنی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اس کی دو سو ستاسی آیتیں ہیں اور چھ ہزار اکیس کلمات اور پانچ سو پچیس ہزار حروف اور چالیس رکوع ہیں۔ قرآن مجید کی سب سورتوں سے یہ سورۃ بڑی ہے اور جس قدر احکامِ شرعیہ اس سے مستفاد ہیں اور کسی سے نہیں۔ اس میں ایک آیت مداہنہ ہے کہ جو سب آیتوں سے بڑی ہے اور بہت سے عمدہ مضامین اور طرح طرح کی ہدایت افزا باتیں ہیں مگر چونکہ گائے کے ذبح[۲] کرنے کا جو بنی اسرائیل میں واقع ہوا ہے ایک عجیب اور بہت سے مقاصد ضروریہ کی طرف اشارہ کرنے والا قصہ مذکور ہے اس لیے اس کا نام سورہ بقرہ[۳] ہوا اور تسمیہ میں کوئی نہ کوئی مخصوص بات ملحوظ ہونی چاہیے۔ یہ نام[۴] اس کا آنحضرت ﷺ کے عہد میں مشہور

---

۱ بعض روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورہ بقرہ آخر کی تین آیتیں معراج کی شب میں اس وقت اتری تھیں جب کہ آنحضرت ﷺ مقام سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے تھے چنانچہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ جس کا ملخص یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ معراج کی رات میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو چھٹے آسمان پر ہے تو اس وقت وہاں پر آپ کو تین چیزیں دی گئیں پانچ نمازیں اور سورہ بقرہ کی آخر کی آیتیں اور یہ حکم کہ اُن کی امت میں جو مشرک نہیں اُس کے گناہ بخشے جائیں گے چونکہ معراج بالاتفاق مکہ میں ہوئی تھی اس لیے یہ آیتیں مکی سمجھی جائیں گی۔

۲ بقر اور بقرہ گائے بیل مذکر مؤنث دونوں پر اطلاق کیے جاتے ہیں یہ بقرہ کی ت تانیث کے لیے بلکہ جنس کے لیے جیسا تمر اور تمرۃ میں ہے۔ ۱۲ منہ

۳ منجملہ مقاصدِ ضروریہ کے خدائے تعالیٰ کے وجود کا اثبات ہے سو وہ بھی اس قصہ سے بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کس لیے کہ اس مقتول کا زندہ ہونا کہ جس پر اس گائے کا گوشت رکھ دیا تھا، خدائے قادر کے وجود پر دلالتِ صحیحہ ہے کہ جس نے اس کو دوبارہ خلافِ عادت جان بخشی از ان جملہ نبوت ہے سو وہ بھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس نبی کے کہنے سے گائے کا گوشت رکھتے ہی مردہ زندہ ہو گیا یہ اُس کا بڑا معجزہ ہے جو اُس کی نبوت پر دلالت کرتا ہے اور جب موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوئی تو ان سے اگلے نبیوں کی نبوت کہ جن کی تصدیق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی اور آئندہ نبیوں کی نبوت کہ جن کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی بخوبی ثابت ہوئی۔ از ان جملہ انبیاء علیہم السلام کے کہنے پر بے چون و چرا عمل کرنا چاہیے ورنہ مصیبت پیش آتی ہے سو وہ بھی اس قصہ سے بخوبی ثابت ہے کہ بنی اسرائیل نے حجتیں کر کے کیسی مصیبت اُٹھائی اور رسوائی پائی از ان جملہ خوف خدا ہے اور وہ یہ کہ کوئی گناہ خدا سے مخفی نہیں رہتا سو وہ بھی اس قصہ سے ظاہر ہے کہ مقتول دوبارہ زندہ ہو کر بولا اور اُس نے رازِ مخفی کھولا۔ ۱۲ منہ

۴ نیچر مفسر اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۲ میں کہتے ہیں قولہ: یہ سورۃ انہی انتیس سورتوں میں ہے جن کو خدا نے ان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے ابتدا میں آئے ہیں۔

اقول : اگر یہ نام خدا کے مقرر کیے ہوئے ہوتے تو ضرور تھا کہ صحابہ میں اور آنحضرت ﷺ کے سامنے شہرت پاتے اور اُن کے اور نام نہ رکھے جاتے حالانکہ کسی حدیث سے کیا بلکہ ضعیف سے بھی ہمیں یہ نہ معلوم ہوا کہ الٓمٓ اس سورۃ کا نام خدا نے مقرر کیا ہے بلکہ سب سلف سے خلف تک اس کو سورۂ بقر کہتے چلے آئے ہیں۔ دوم اگر الٓمٓ اس سورۃ کا نام ہو تو اور سورتوں کا بھی (کہ جن کے اول میں یہ حروف آئے ہیں) یہی نام ہو۔ پس اشتراک لازم آئے جو تعیینِ اسماء کی غرض کو منافی ہے اور جو پیشتر وضع اول کو بھول جانے سے واقع ہوتا ہے اور خدا بھول سے پاک ہے۔ سوم خود مفسر صاحب سورۂ بقر سورۂ عنکبوت۔ سورہ روم سورۂ لقمان سورہ سجدہ نام لیتے ہیں۔ الغرض یہ قول علومِ اسلام سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ ۱۲ منہ

ہو گیا تھا جیسا کہ احادیث صحاح ستہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سورۃ کو سورہ الحمد سے یہ مناسبت ہے کہ سورۃ الحمد میں چونکہ ہدایت کے متعلق جمیع مضامین ایک ایسی خوبی کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں جس کے اثر سے دلِ بیمار اور روحِ مریض کو شفاءِ ابدی حاصل ہوتی ہے اور اسی لیے اس سورۃ کا نام سورہ شافیہ یا شفاء قرنِ اول میں شہرت پا چکا تھا اور شفاءِ قلب کے بعد حیاتِ روحانی اور زندگیِ جاودانی ایک ضروری بات ہے اس لیے ضرور ہوا کہ اس سورۃ کے بعد وہ سورۃ ہو کہ جس میں (بضمنِ تفصیلِ اجمال) وہ باتیں ہوں کہ جو حیات اور ہمیشہ کی زندگانی سے علاقہ رکھتی ہوں۔ یہ بات سورۂ بقرہ میں موجود ہے کیونکہ اس سورت کے کل چالیس رکوع ہیں ان میں سے کوئی رکوع بھی ایسا نہیں کہ جس میں حیات کا مضمون نہ ہو۔ اول و دوم رکوع میں یہ بیان ہے کہ یہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ جو خدا سے ڈرتے اور نیک کام کرتے ہیں (یعنی جن کو صلاحیتِ ازلی اور استعدادِ ایمانی نصیب ہے) نہ ان کے لیے کہ جو کافر و منافق یعنی ازلی کور باطن ہیں۔ سو یہ صاف طور پر اس بات کا بیان ہے کہ جنہوں نے بموجبِ صلاحیتِ ذاتی سعادتِ ایمان پائی' حیات جاودانی پائی اور جو اس سے محروم رہے انہوں نے حیاتِ ابدی نہ پائی۔ تیسرے رکوع میں خدائے تعالیٰ کی (کہ جس نے آسمان اور زمین کو بنایا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو مباح فرمایا) عبادت کا حکم ہے جو حیاتِ ابدی کا باعث ہے۔

چوتھے میں حضرت آدم علیہ السلام کا پیدا کرنا اور اس کو حیات بخش کر ملائکہ پر تفصیل دینا اور اس کے مدعی کو حیاتِ ابدی سے محروم کر دینا مذکور ہے۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ نافرمانی حیاتِ ابدی سے محروم کرتی ہے اور اس میں قیام حیاتِ دنیوی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو حیاتِ اخرویہ کا نمونہ اور وسیلہ ہے۔ اول تو كُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْيَاكُمْ میں زندہ ہونا بتلا دیا پھر تمام نوعِ انسانی کی زندگی اور ابوالنوع حضرت آدم علیہ السلام کا حال بیان کر دیا۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اس کے بعد اس نوع کے ایک بڑے خاندان کی حیات کا ذکر پانچویں رکوع میں یا بنی اسرائیل سے شروع کیا جس میں صدہا انبیا پیدا ہوئے اور تقریباً نصف بنی آدم اب تک اسی خاندان کے بزرگوں کے معتقد ہیں اس کے بعد (۹) رکوع تک اس خاندان کے حالات عبرت خیز بیان کئے اور من و سلویٰ اور قلزم سے پار اتارنا اور فرعون کو کہ جو اس خاندان کی حیات کا دشمن تھا ہلاک کرنا اور تورات کا عطا ہونا اور دیگر امور کہ جو حیات سے متعلق ہیں اور پھر جہلا کا گوسالہ پرستی کر کے حیاتِ ابدی سے محروم ہونا اور پھر ان حیاتِ دنیویہ میں مال و جان خرچ کر کے حیاتِ ابدی خریدنا بتانا اور بنی اسرائیل کے گناہوں پر عذاب بھیج کر حیاتِ ابدی پر متنبہ کرنا اور گائے ذبح کر کے ایک شخصِ مردہ کو اس کے گوشت سے حیات دینا ذکر کیا۔ (۱۰) رکوع میں بنی اسرائیل سے یہ عہد لینا مذکور ہے کہ خاص اللہ کی عبادت کریں گے۔ ماں باپ' یتیموں اور مسکینوں سے نیک سلوک کریں گے، نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی بات کہیں گے، خونریزی نہ کریں گے، کسی کو جلاوطن نہ کریں گے۔ یہ وہ عہد ہے کہ جو اس کو پورا کرے حیاتِ ابدی پاوے، دنیا کی زندگی کا بھی مزہ اٹھاوے۔ (۱۱) رکوع میں موسیٰ کو کتاب دینا اور ان کے بعد نبی پے در پے بھیجنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح القدس سے مدد کرنا وغیرہ وہ امور بیان ہیں کہ جو حیاتِ ابدی کے لیے ضرور اور نافع ہیں۔ (۱۲) رکوع میں اور اس کے بعد قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ الخ اس بات کا بیان ہے کہ جبریل اور جو لوگ حیاتِ ابدی اور وحی کا واسطہ ہیں ان سے بغض رکھنا جیسا کہ بعض یہود رکھتے تھے۔ حیاتِ ابدی سے محروم ہونا ہے اس کے بعد (۱۴) رکوع تک یہود کی اور بہت سی لغو حرکات بیان فرمائیں کہ جو حیاتِ ابدی سے محروم اور بے نصیب کر دیتی ہیں۔ (۱۵) رکوع یا بنی اسرائیل سے لے کر ایک اور اعلیٰ خاندان اعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حالات اور ان کی ذریت میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم برپا کرنے کا ذکر ہے کہ جو تمام عالم کی حیاتِ ابدی کا ذریعہ ہے اور کعبہ جو اس کی تجلیات کا مظہر ہے اس کی بنیاد قائم کرنا مذکور ہے۔ (۱۶) رکوع میں وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ سے لے کر آخر تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کا اسلام لانا اور اسلام کے لیے اپنی اولاد کو وصیت کرنا اور ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر قائم رہنا اور بلاتفریق تمام انبیا علیہم السلام پر ایمان لانا وہ وہ باتیں مذکور ہیں کہ جو حیاتِ جاودانی کے

لیے اصل الاصول ہیں پھر (۱۸) رکوع میں کعبہ کی تحویل پر جو کچھ احمقوں کے بیجا اعتراضات تھے ان کا جواب اور اس بات کا اظہار ہے کہ مقصود ہر طرف خدا ہے اور اس کی یاد اور عبادت اور محبت حیاتِ ابدی کا باعث ہے اور یہ مقامِ متبرک محض امتحانِ طاعت کے لیے مقرر ہوا ہے۔ (۱۹) رکوع میں اور اس کے بعد صبر اور نماز گزاری کا ذکر ہے اور یہ کہ جو لوگ خدا کی راہ میں مر گئے ان کو حیاتِ ابدی نصیب ہو گئی اور حج اور عمرہ وغیرہ وہ ریاضتیں بیان فرمائیں کہ جن سے روح زندہ ہوتی ہے۔ (۲۰) رکوع میں خدائے تعالیٰ کی صفات و آیات اور اس بات کا ذکر ہے کہ خدا سے نہایت درجہ کی محبت رکھنی چاہیے اور دیگر امور مذکور ہیں کہ جو حیاتِ ابدی کے متعلق ہیں۔ (۲۱) میں زمین کی پاک چیزوں کا استعمال کرنا اور ناپاک چیزوں سے پرہیز کرنا اور شیطان کے رستہ پر نہ چلنا اور خدا کا شکر کرنا اور سور اور مردار وغیرہ ان گندہ چیزوں سے دور رہنا مذکور ہے کہ جن کا اثر زہر کی مانند قوائے ملکوتیہ پر دوڑ کر حیاتِ جاودانی میں خلل انداز ہوتا ہے اور دیگر امور متعلق بحیاتِ ابدی ہیں۔ (۲۲) میں یہ بیان ہے کہ رسمی باتوں پر سعادت اور نیکی کا مدار نہیں بلکہ دراصل جو سعادت کہ باعثِ حیاتِ روح ہے وہ اللہ اور انبیاء اور ملائکہ پر ایمان لا کر صدقہ و خیرات و نماز ادا کرنا وغیرہ امور (۲۳) میں روزہ کی فضیلت اور اس کے احکام اور اعتکاف وغیرہ وہ باتیں ہیں کہ جن کا اثر روح پر پہنچتا ہے اور حیاتِ اخرویہ کے لیے کارآمد ہیں۔ (۲۴) میں حج کے احکام اور خدا کی راہ میں مال صرف کرنے کی تاکید اور لوگوں سے نیکی سے پیش آنا مذکور ہے کہ جو حیاتِ دنیا کے لیے ضرور اور دوسرے جہان کے لیے نافع ہے۔ (۲۵) میں احکامِ حج اور دعا اور تکبیر مذکور ہے کہ جن کا پرتو روح کو تازہ کرتا ہے اور تمام لوگوں کو اس بات کی تاکید ہے کہ احکامِ الٰہی کی پابندی کریں تاکہ خرابی نہ پیش آوے اور روح امراض میں گرفتار نہ ہو جاوے۔ (۲۶) میں اس بات کا اظہار ہے کہ خدا کے دشمنوں اور باغیوں سے اس کی فوج بن کر لڑنا اور زمین کو ان کے شر سے پاک کرنا اور دین کو زندہ کرنا کہ جس کو جہاد کہتے ہیں دنیا و آخرت کی زندگانی کا سبب ہے کیونکہ جب دشمنانِ دین غالب ہو جاویں گے تو اپنا غلام اور سواری کا جانور بنا کر کام لیں گے اور دین سے بھی بے بہرہ کر دیں گے اور نہ ترقیِ دینی کبھی نصیب ہو گی نہ دنیاوی اور اس کی شرح اور فوائد دیگر آیات و احادیث میں بکثرت ہیں اور حکمائے امت نے یہ بات بدلائلِ عقلیہ بھی ثابت کر دی ہے اور تجربہ اس کا شاہد ہے۔ (۲۷) میں شراب اور جوئے کی ممانعت ہے کہ جو دنیا و دین کی خرابیوں کا باعث اور تلخیِ زندگی کا وسیلہ ہے اور یتیموں اور بیکسوں کی خبر داری کرنا ہے جو ان کی بھی حیات کا باعث ہے۔ (۲۸) میں خانہ داری اور زندگی کے متعلق احکامِ حیض و ایلاء و عدت و حرمت و اخفائے حمل وغیرہ وہ باتیں مذکور ہیں کہ جو حیاتِ دنیا و اُخروی کے لیے اصل الاصول ہیں۔ (۲۹) میں بھی طلاق و عدت و رجعت وغیرہ باہمی معاملات کے متعلق وہ احکام ہیں کہ جو زندگی کو تازہ کرتے ہیں۔ (۳۰) میں بھی طلاق و حلالہ و رضاعت و نفقہ و مرضعہ و مقدار عدتِ وفات وغیرہا وہ احکام ہیں کہ جن کے بغیر معاشرت کا انتظام اور حیات کا لطف نہیں یہ بیان (۳۲) رکوع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ تک ہے پھر اس رکوع میں جبکہ باہمی معاملات (پرورشِ اولاد وغیرہ امور) سے فراغت ہو چکی تو مبدءِ غیب سے بلا اسبابِ ظاہرہ زندگی عطا ہونا بیان کیا کہ اس کی قیومیت اور قدرت پر کامل یقین ہو جائے۔ اس میں صدہا بنی اسرائیل کا ایک نبی کی دعا سے زندہ ہونا مذکور ہے پھر (۳۳) میں طالوت کا جالوت کو قتل کرنا اور بنی اسرائیل کی برباد شدہ سلطنت و قوۃ کا حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں دوبارہ زندہ ہونا اور تابوتِ سکینہ کا پھر ہاتھ آنا کہ جو خدا کی قبولیت اور قدرت کی بڑی دلیل ہے۔ (۳۴) میں آیت الکرسی ہے کہ جس میں خدائے تعالیٰ کا حی و قیوم ہونا اور بہت سے صفات مذکور ہیں اور یہ کہ حیاتِ ابدی کے لیے یعنی اسلام کے قبول کرنے میں کسی پر زبردستی نہیں کیونکہ اس کے دلائل اور خوبیاں واضح ہیں۔ (۳۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چار جانوروں کو زندہ کر کے دکھانا اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کا کامل وثوق دلانا ہے اور عزیر علیہ السلام کو جو بیت المقدس کے آباد ہونے میں تعجب تھا ایک عرصہ تک مردہ رکھ کر زندہ کرنا اور خدائے تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے پر وثوق دلانا مذکور ہے پھر رکوع (۳۹) تک صدقہ اور خیرات اور پرہیزگاری اور سود کی حرمت اور دیگر احکامِ شہادت وغیرہا مذکور ہیں کہ جو دنیا و دین کی زندگی کے

لیے نہایت کارآمد ہیں اور (٤٠) رکوع میں تو لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے لے کر اخیر سورہ تک وہ باتیں مذکور ہیں کہ جو مردہ دل کو حیاتِ جاودانی بخشتی ہیں ان رکوعات اور پھر ان کی آیات کو جو کچھ باہم ارتباط اور سلسلہ بندی ہے وہ بیان سے باہر ہے کس قدر ہم بھی بیان کریں گے انشاء اللہ۔ اس سورہ کو سورۃ الحمد سے

یہ بھی ربط ہے کہ اس سورہ میں الحمد کے جمیع مضامین کی تشریح ہے چنانچہ (٣) رکوع میں آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور زمین اناج و پھل پھول بیشماران چیزوں کا پیدا کرنا مذکور ہے کہ جن سے خدائے تعالیٰ کی پرورش اور تمام عالم کی تربیت معلوم ہوتی ہے۔ پھر اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت میں رکھنا اور ملائکہ سے سجدہ کروانا اور پھر اس کی اولاد میں سے بنی اسرائیل کو برگزیدہ کرنا اور ان کو ہر طرح کی نعمتیں عطا فرمانا: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ اور پھر بنی اسماعیل میں نبی پیدا کرنا اور کعبہ کو حرمت وعزت بخشنا اور وہاں کے رہنے والوں کے لیے رزق رسانی اور دانہ پانی کا وعدہ کرنا اور بنی اسرائیل کی سلطنتِ باز رفتہ کو داؤد علیہ السلام کے عہد میں پھر واپس دینا اور حضرت عزیر علیہ السلام اور دیگر بنی اسرائیل کو زندہ کرنا اور موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کرنا وغیرہ جو عمدہ مضامین اس سورہ میں مذکور ہیں وہ سب بترتیب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی شرح ہے اور اسی طرح من وسلویٰ بنی اسرائیل کو عطا فرمانا اور دن میں ابر کا سایہ کرنا اور فرعون سے نجات دینا وغیرہ امور جو اس قسم کے اس سورۃ میں مذکور ہیں سب اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی شرح ہیں اور پھر گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت مقتول کی لاش پر رکھنا اور اس کا جی اٹھ کر اپنے قاتل کا نام لینا اور قاتل کا سزا پانا اور اسی طرح بنی اسرائیل کو (گوسالہ پرستی کی سزا میں) خودکشی کا حکم دینا اور ایسی سخت توبہ مقرر کرنا اور بنی اسرائیل کی نافرمانیوں پر طرح طرح کی سزائیں دینا اور کافروں اور مشرکوں اور منافقوں کا گھر جہنم میں بنانا وغیرہ اس قسم کے مضامین جو اس سورۃ میں مذکور ہیں سب مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تفسیر ہے اور روزہ اور نماز اور حج وزکوٰۃ وجہاد اور ذکرِ الٰہی اور تکبیر وتحلیل جو کچھ مختلف رکوعوں میں وارد ہے اور ان کے احکام مذکور ہیں اور جہاں کہیں خاص خدائے تعالیٰ سے محبت اشد کرنے کا حکم ہے اور شرک وبت پرستی کی ممانعت ہے سب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفصیل ہے اور قرآن کا متقیوں کے لیے ہدایت ہونا اور احکام طلاق ونکاح وغیرہ وصلہ رحمی اور والدین اور اقارب اور ہمسایہ سے نیکی کرنا۔ حرم اور اشہر حرم کی حرمت کرنا جو کچھ اس قسم سے اس میں مذکور ہے سب اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی تفسیر ہے اور جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب اور دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیرووں کے اقوال اور ان کے احوال اور ان پر انعامِ الٰہی نازل ہونا اس سورۃ میں مذکور ہے سب صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی تفسیر ہے اور فرعون کا غرق ہونا اور اس کی بداطواری اور اس کا ملک ومال برباد ہونا اور نمرود کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کرنا اور یہود پر ان کی بدکاری سے مصیبت نازل ہونا اور جو کچھ اس قسم کا مضمون ہے سب غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کی پوری شرح ہے چونکہ یہ سورہ بے شمار علوم کا سرچشمہ ہے اس لیے اس کے

فضائل بھی بہت ہیں چنانچہ صحیح مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور آل عمران جانتا تھا اس کی بڑی عزت وعظمت ہوتی تھی اور مسند امام احمد وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورۂ بقرہ بمنزلہ کوہانِ قرآن کے ہے اور بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ رات کو سورۂ بقرہ پڑھ رہے تھے اور ان کا گھوڑا ان کے پاس بندھا ہوا تھا کہ یکایک ان کا گھوڑا چونکا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے پڑھنا بند کیا، گھوڑا پھر ٹھہر گیا، پھر جب میں نے پڑھنا شروع کیا پھر اسی طرح گھوڑا بدکا، تین بار یہ بات پیش آئی اور میرا بیٹا یحییٰ قریب سوتا تھا مجھے ڈر ہوا کہ گھوڑا اسے نہ کچل ڈالے پھر جب میں نے اوپر کو دیکھا تو ایک نورانی سا بادل دکھائی دیا کہ جس میں مشعلیں سی روشن تھیں پھر میں اس کے دیکھنے کے لیے باہر نکلا صبح کو یہ ماجرا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا

ملائکہ تھے جو تیری آواز سن کر آئے تھے اگر تو صبح تک پڑھے جاتا تو وہ بھی صبح تک موجود رہتے اور سب کو نظر آتے۔ اے ابن حضیر! اس کو پڑھا کر اے ابن حضیر! اس کو پڑھا کر۔ مسلم نے ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کو اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔ زہراوین[1] سورۂ بقرہ وآل عمران پڑھا کرو کیونکہ قیامت کو یہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے (بادل کی طرح ہو کر) شفاعت کو آویں گے۔ سورہ بقرہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے پڑھنے میں برکت اور ترک کرنے میں حسرت ہے اور فریبی لوگ اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سورہ کی برکت وآثار جو کچھ بزرگانِ دین کے تجربہ میں بارہا آئے ہیں بے شمار ہیں۔ ازان جملہ یہ کہ جس رات یہ سورہ پڑھی جائے یا جس گھر میں پڑھی جائے وہاں شیطان کا گزر نہیں ہوتا جو لوگ حسِ باطن رکھتے ہیں وہ اس امر کی بخوبی تصدیق کرتے ہیں۔ ازان جملہ یہ کہ بیمار کے روبرو یہ سورہ پڑھی جائے اور ایک مقدار معلوم چاول پکا کر دہی اور کھانڈ ڈال کر کسی مسکین کو کھلایا جائے دفع مرض بالخصوص چیچک کے لیے مفید ہے، فقیر کے تجربہ میں بھی آیا ہے۔

شانِ نزول: جب مکہ اور اس کے گردونواح میں دینِ اسلام کی روشنی پھیلی تو وہاں کے بت پرستوں کے زور وظلم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم حکمتِ الٰہی کے موافق مدینہ میں (کہ جو مکہ سے شمال کی طرف چودہ منزل کے فاصلہ پر ہے) تشریف لائے اس شہر میں اور اس کے اطراف میں عرصہ دراز سے اہلِ کتاب رہتے تھے اور اس وقت عیسائیوں اور یہود کے تعصبات اور گمراہیوں اور توہمات وخیالاتِ مشائخ کی بے جا پابندیوں نے اس ذرا سے نور کو بھی جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا، بجھا دیا تھا۔ ایسی حالت میں جو یکایک ان پر آفتابِ اسلام نے طلوع کیا اور نبی علیہ السلام کی وہ باتیں کہ جو روح کو زندہ کرنے والی ہیں ان کے کان میں پڑیں تو باستثناءِ چند دیندار اکثر کو پابندِ رسوم وتعصبِ بیجا نے باوجود دل میں مقر ہونے کے اسلام اور قرآن کے مقابلہ پر آمادہ کیا، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مقابلہ میں آمادہ کیا تھا۔ یہ فریق علم ودانش میں وہاں کے عربوں کے نزدیک مسلم تھا، اس لیے ان کی نکتہ چینیوں پر وہ زیادہ کان رکھنے لگے اور چراغِ اسلام کو بجھانے میں جہالِ عرب کو ان یہود ونصاریٰ سے ایک مدد مل گئی اور دو فریق مقابلہ میں کھڑے ہو گئے اور مدینہ کے رؤساء میں سے عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ (وہ لوگ کہ جن کو حسدِ ریاست اور حبِ مال وجاہ نے اندھا کر دیا تھا اور کسی مصلحتِ دنیویہ سے وہ اسلام میں نامزد ہوتے تھے اور درپردہ سخت دشمن تھے) ان کے ساتھ مل گئے۔ اس تیسرے فریق منافقین سے اور بھی ان کی ہمت بندھ گئی۔ ان تینوں فریق کی کج بحثیوں کی اصلاح اور ان کے شکوک وشبہات کا ابطال اور ہر طرح کا وعظ وپند حکمتِ الٰہی کے نزدیک ضرور ہوا۔ پس اس لیے مدینہ میں جاتے ہی یہ سورۂ بقرہ نازل ہونی شروع ہوئی کہ جس میں ان سب لوگوں کی اصلاح ودرستی خدا تعالیٰ نے اپنے کلامِ مقدس میں ملحوظ رکھی ہے یہ تمام سورہ کا اجمالی سبب نزول ہے۔ اس اجمال کے سوا خاص خاص باتیں بھی سببِ نزول ہیں کہ جن کو ہم آگے چل کر حسبِ موقع بیان کریں گے، مگر ناظر کو لازم ہے کہ اس اجمالی سببِ نزول کو ملحوظ رکھے تا کہ اس سورۃ کے مطالب اس کے دل پر نقش ہو جائیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الٓمّٓ ① ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْہِ ۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ②

شروع ہے اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا بڑا مہربان ہے۔ الم یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں کوئی بھی شک نہیں پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

ترکیب: اگرچہ الم حروف مقطعات سے ہیں کہ جن کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جیسا کہ آپ کو ابھی معلوم ہوگا مگر اس بات پر محققین

[1] زہراوین زہرا کا تثنیہ ہے اور زہرا ازہر کا مونث ہے جس کے معنی نہایت روشن کے ہیں چونکہ ان دونوں سورتوں اعنی بقرہ وآل عمران میں ایک عجب

متفق ہیں کہ یہ ان حروفِ تہجی کے اسماء ہیں کہ جن سے کلام مرکب ہوتا ہے ان کے ابتداءِ کلام میں لانے سے یہ اشارہ ہے کہ جن حروف سے ہمارا کلام مرکب ہے وہی تمہارے کلام کا بھی مادہ ہے پھر اگر یہ قرآن کلامِ الٰہی اور معجزہ نہیں تو کیا وجہ کہ تم اس کے مثل کلام نہیں بنا سکتے اور اس کی سورہ کا دسواں حصہ بھی نہیں لا سکتے۔ پس اس تقدیر پر الٓمٓ کے معنی المرکب من هذه الحروف مبتداء اور معجز یا متحدی چیز یا برعکس۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کلام کہ ان حروف سے مرکب ہے یعنی قرآن معجز یا متحدی[1] بہ ہے یا یہ کہ یہ کلام متحدی بہ اس قسم کے حروف سے مرکب ہے یا یوں کہو الٓمٓ مبتدا (خواہ اس سے مراد المؤلف منہا لیا جاوے یا قرآن یا سورتوں کا نام مانا[2] جاوے جیسا کہ اکثر علماء کی رائے ہے) اور ذلك اس کی خبر اور کتاب صفۃ یعنی کامل کتاب یہی ہے جیسا کہ بولتے ہیں زید انسان ہے یعنی کامل انسان زید ہے۔ یا یوں کہو کہ الٓمٓ خبر ہے مبتداء محذوف کی جو المتحدی بہ ہے اور ذلك خبر ثانی یا بدل ہے اور کتاب صفت ہے لا نفی جنس ریب اس کا اسم اور فیه خبر یا یوں کہو فیه صفت ریب کی اور للمتقین خبر اور هدیً حال ہے یعنی اس کتاب میں (جو کہ ہدایت دینے والی ہے) پرہیزگاروں کو کوئی شبہ نہیں یا یوں کہو ریب موصوف فیه صفت اور خبر محذوف جیسا کہ لا خیر میں محذوف ہے اس تقدیر پر فیه خبر مقدم ہے هدیً کی۔

یا یوں کہو : ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مبتداء اور لاریب فیه جملہ اس کی خبر اول اور هدی للمتقین دوسرا جملہ اس کی دوسری خبر۔ اس کے سوا اور بھی احتمالات ہیں۔ سبحان اللہ کیا عمدہ کلام ہے کہ ہر پہلو پر ایک عمدہ معنی حاصل ہوتے ہیں اور یہ صحیح تر ہے کہ یہ چار جملے الگ الگ ہیں۔ ہر جملہ پہلے جملہ کے لیے دلیل ہے۔ پس الٓمٓ ایک جملہ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ متحدی بہ انہیں حروف سے مرکب ہیں کہ جن سے عام عرب بلکہ عجم کے کلام مرکب ہوتے ہیں پھر باوجود اس مساوات کے کسی سے بھی اس کے مقابلہ میں کلام نہیں لایا جاتا اس کے اعجاز کی صریح دلیل ہے پھر ذٰلِكَ الْكِتٰبُ دوسرا جملہ ہے جو اعجاز کو خوب ثابت کرتا ہے یعنی دراصل کتاب یہی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے کلام کالعدم ہیں۔ معارض تو کیا پس ثابت ہوا کہ یہ بڑی کامل کتاب ہے کیونکہ لَارَیْبَ فِیْهِ یہ تیسرا جملہ ہے جو اس کے کمال کی دلیل ہے یعنی جس کو ذرا بھی فہمِ سلیم اور سلیقۂ زبانِ عرب ہے وہ اس کی خوبیوں کو دیکھ کر یقین لاوے گا' کوئی شبہ اس کو پیش نہ آوے گا اور درحقیقت جو کتاب ایسے مضامین کو متضمن ہو کہ اس دانشمند اور صاحبِ فطرتِ سلیمہ کو کچھ شک نہ ہو وہ کامل ہے۔ بخلاف ان کتابوں کے کہ جن میں عناصر پرستی یا غلط نسب نامہ یا اور خلافِ عقل مضامین ہوں کہ جن کے قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہو وہ کامل نہیں نہ الہامی ہیں اور اس میں کیوں شک نہیں، اس لیے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یہ چوتھا جملہ ہے یعنی جس کتاب سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے اس میں شک نہیں ہوتا۔ کس لیے کہ اگر شک ہوا تو پھر کتاب ہدایت کیونکر بخشتی بلکہ مشکوک کتابوں کو تو پرہیزگار چھوتے بھی نہیں چہ جائیکہ ان کا دستور العمل اور ہدایت نامہ ہو اور ایک اور لطف بھی اس کلام میں ہے کہ اول جملہ دوسرے کے لیے دلیل بھی ہو جاتا ہے۔

تفسیر : سورۂ الحمد میں جب کہ ہدایت کے متعلق سب ضروری باتیں اجمالاً بیان ہو چکی تھیں تو اس سورہ میں ان مضامین کی تفصیل کی گئی اور سب سے پیشتر قرآن مجید کا کتابِ الٰہی ہونا تین دلیلوں سے ثابت کیا کیونکہ ہر ملت و مذہب کا مدار کتاب پر ہوتا ہے پس جس ملت و مذہب کی کتاب الہامی اور آسمانی ہے وہ حق ہے، ورنہ باطل۔ اور یوں تو ہر شخص اپنے مذہب کو خواہ وہ کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو، حق ہی جانتا ہے۔

دلیل اوّل : الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مستفاد ہوتی ہے تقریر اس کی یہ ہے: عرب میں اس زمانہ میں کہ قرآن نازل ہو رہا تھا فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا ہر شخص اپنے عمدہ اشعار پر ادھار کھائے پھرتا تھا اور معجزہ کی خوبی یہ ہے کہ جس امر میں لوگوں کو ملکہ ہو اور جس کے اسرار کا

[1] تحدی کہتے ہیں کلام مقابلہ میں طلب کرنا متحدی بہ وہ کلام کہ جس کو پیش کر کے اس کے مقابلہ میں کلام طلب کیا جائے۔

[2] اگرچہ سورتوں کا نام بھی علماء نے مانا ہے مگر یہ کہنا کہ یہ نام خدا نے مقرر کئے ہیں اور خدا نے فرمادیا ہے کہ سورہ کا نام ہے محض غلط ہے بلکہ یہ بھی علماء کا قول ہے

ماہر ہوں اسی میں ان کو ایسی بات دکھائی جائے کہ جو ان سب کی قوت سے باہر ہو اور وہ عاجز ہو کر یہ جان لیں کہ یہ اس شخص کا کام نہیں وہ جانتے ہوں اسی میں ان کو ایسی بات دکھائی جائے... ہے جو ہماری جنس اور نوع سے الگ ہے اور اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بیماروں کا تندرست کرنا، مردہ کو زندہ کرنا وغیرہ وہ معجزات دکھائے کہ جنہوں نے طبِ جالینوسی کو پست کر دیا اور اسی لیے فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو اژدہا دیکھ کر جھٹ پٹ ایمان لے آئے، کیونکہ وہ اس فن کے واقف کار تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ جادوگر کا کام نہیں۔ بخلاف فرعون کے کہ وہ اناڑی نہ سمجھا۔ پس اس لیے عرب کے سامنے فصاحت و بلاغت میں معجزہ ظاہر ہونا ضرور تھا تو خدائے تعالیٰ نے اس جملہ میں اعجاز کی طرف اشارہ فرمایا کہ ہمارا کلام بھی انہیں حروف سے مرکب ہے کہ جن سے تمہارا کلام مرکب ہوتا ہے اور جس طرح تمہاری کتابوں پر اطلاقِ کتاب ہوتا ہے ہماری کتاب پر بھی۔ پھر جب تم اسبابِ فصاحت و بلاغت میں بھی کم نہیں بلکہ مشاق ہو اور ایک کیا سب سے مل کر بھی ایسی کتاب نہیں بن سکتی تو جان لو کہ یہ تمہارے ہم جنس کا کلام نہیں۔ اس دلیل کو آگے قرآن میں تفصیل سے خدائے تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ایک جگہ یوں بیان فرمایا ہے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ الخ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا

دلیل دوم : لَا رَيْبَ فِيْهِ سے مستفاد ہے اس کی تقریر یوں ہے جو لوگ لطفِ زبان سے واقف نہیں اور حکیمانہ طور پر مضمون و معانی ہی پر ان کی نظر ہے تو وہ اس کے مطالب اور معانی کو بغور دیکھیں کہ وہ کیسے ہیں کیونکہ جس کتاب کے مطالب بتمامہا میزانِ عقل میں وزنی ہوتے ہیں ان کا اعتبار ہے ورنہ نہیں۔ عقل خدائے تعالیٰ کی طرف سے چشمِ حق بیں عطا ہوئی ہے اگرچہ کبھی عقل وہم کی کشاکشی میں آ کر پست ہو جاتی ہے تو الہام کی تائید سے مرتفع ہوتی ہے مگر ہر نیک و بد اور برے بھلے کا امتیاز اسی کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ پس جن باتوں کو وہ رد کرے وہ مردود اور جن کو قبول کرے وہ مقبول ہیں اور اعلیٰ درجہ قبولیت کا عقل کے نزدیک یہ ہے کہ عقل ان باتوں کا یقین کرلے اس کو ریب اور تردد نہ ہو نہ یہ کہ علی وجہ الظن والتقلید والشک تسلیم کرے۔ سو یہ بات قرآن مجید کے مطالب کو حاصل ہے۔ چنانچہ صدہا عیسائی محقق بھی اس امر کے مقر ہیں کہ محمد ﷺ کے مذہب کی بنیاد ان باتوں پر ہے کہ جن کو عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے نہ توہمات و خیالاتِ فاسدہ پر۔ خلاصۂ دلیل قرآن کے مطالب ایسے عمدہ ہیں کہ عقل کو ان میں ریب و شک نہیں بلکہ یقینی طور پر ان کو تسلیم کرتی ہے اور جس کتاب کے مضامین میں ریب و شک نہ ہو وہ منجانب اللہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ قرآن بھی منجانب اللہ ہے۔ اس دلیل کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ الآیہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ وغیرہا من الآیات۔ جس طرح اول دلیل زباندانوں کے لیے تھی۔ یہ دلیل تمام لوگوں کے لیے ہے۔ یہود و نصاریٰ ہنود و مجوس سب کے لیے مفید ہے۔ صغریٰ کا ثبوت محتاجِ دلیل نہیں جو چاہے قرآن کریم کے مضامین کو ملاحظہ کرلے۔ کوئی بات بھی ایسی نہ پائے گا جس میں عقل کو تردد ہو۔ بخلاف وید اور دساتیر کے کہ ان میں عناصر اور کواکب پرستی کے وہ مضامین ہیں کہ جن سے دل متلاتا ہے اور عقل کو نفرت آتی ہے اور لنگ پوجا اور بھگ (فرج) پوجا اور گائے پرستی پر تو اب دانشمند ہندو بھی ہنستے ہیں اور تورات و انجیل و زبور موجودہ میں گو اصلی کتابوں کے صدہا مضامین الہامی مندرج ہیں مگر تاہم بہت سی وہ باتیں ہیں کہ جن میں عقل کو ریب و تردد بلکہ صریح انکار ہے اناجیل و نامجات میں تو بقول پادری فنڈر صاحب تثلیث و الوہیتِ مسیح و کفارہ مذکور ہے کہ جس کو نہ آج تک کوئی عیسائی ثابت کر سکا نہ کرے گا بلکہ انہی لغو مضامین سے نفرت کر کے صدہا بلکہ لاکھوں عیسائی فرانس اور جرمن اور انگلینڈ میں سخت ملحد ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر دوائٹ کتاب سفر جرمنی کے صفحہ (۴۰۹) میں لکھتا ہے کہ علمِ کلام کے جھگڑے میں عہد[1] عتیق کی سچائی اور اصلیت میں کلام ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ اس کے الہامی ہونے کا یقین جرمنی سے نکل گیا۔ بعد ازاں عہد[2] جدید میں گفتگو شروع ہوئی یہاں تک کہ یکے

بعد دیگرے سب کو غیر الہامی سمجھا بلکہ بہت سے علماءِ جرمن تو ان کو برا سمجھنے لگے یا ان کو محض تاریخ کی کتاب خیال کرنے لگے اور ارسطو اور افلاطون سے زیادہ حضرت مسیح علیہ السلام کو نہ سمجھنے لگے۔ یہ الحاد فرانسیسیوں کے الحاد سے بھی کہ جو اٹھارویں صدی میں پھیلا سبقت لے گیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ پادری لوگ بھی ملحد ہو گئے تو انہوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ انتہیٰ ملخصاً۔ انہی کی تقلید سے ہندوستان میں بھی بعض کوتاہ عقلوں نے اس الحاد کو رواج دیا اور کتاب یشوع میں آفتاب کا ٹھہرا رہنا اور تورات میں لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا اور خدا کا آدم کو پیدا کر کے نادم ہونا وغیرہ ذٰلک بہت سی خلافِ عقل باتیں ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور ملائکہ اور انبیا اور عبادت اور عالمِ آخرت اور نیک چلنی وغیرہ مضامینِ قرآن کے مقابلہ میں جو کوئی عہدِ عتیق و جدید کو دیکھے گا تو ضرور اس بات کا یقین کر لے گا کہ قرآن کتابِ الٰہی ہے اور یہی کتاب ہے لا ریب فیہ۔ گبن کہ جو انگلستان کا بڑا مشہور مؤرخ و مقنن ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک ہے۔ مکہ کے پیغمبر نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے روکا ہے کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابلِ زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے الخ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا الخ ایک حکیم جو خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے عقائد مذکورہ بالا کو کہہ سکتا ہے کہ وہ عقائد ہمارے ادراکِ موجود اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہے۔ الخ وہ اصل کہ جس کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت سے استحکام کو پہنچی الخ انتہیٰ ملخصاً اور سیل اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں باوجود سخت تعصب کے اقرار کرتا ہے کہ تھوڑے سے دنوں میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین شرقاً غرباً روئے زمین پر پھیل گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مذہب کے جملہ امور وہ ہیں کہ جن کو عقل بہت جلد تسلیم کرتی ہے جو لوگ تلوار کے زور سے اس دین کا پھیلنا خیال کرتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ انتہیٰ ملخصاً۔ کبریٰ مسلم الکل ہے۔

سوال: بہت سے لوگوں کو قرآن میں ریب (شک) تھا اور اب بھی ہے اور جو کسی کو نہ ہوتا تو تمام لوگ اہلِ اسلام ہی نہ ہو جاتے پھر مطلقاً یہ کہنا کہ اس میں کوئی شک نہیں کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

جواب: انکار و تکذیب اور چیز ہے شک و تردد اور چیز، بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا یقین کامل ہو سکتا ہے مگر کسی خاص وجہ سے متعصب اور معاند لوگ ضد میں یا رسوم اور قوم کی پابندی میں آ کر انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی سے نہیں مانتے سو یہ اور بات ہے، ہم اس کی نفی نہیں کرتے ہاں کسی صاحبِ عقلِ سلیم کو قرآن کے مطالب میں بعد تامل کے شک نہ ہوگا اور جو کبھی ہوا بھی تو وہ اس کے قصورِ فہم سے ہوگا خلاصہ یہ قرآن بلحاظِ وضاحتِ دلائل محلِ ریب نہیں۔ جس طرح عام محاورہ میں سچی بات کی نسبت کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں گو مخاطب کو شک ہو مگر بلحاظِ وضاحتِ قرائن و دلائل مزیل شک اس شک کو کالعدم قرار دے کر نفی کر دیتے ہیں۔ بعض[1] لوگ اس بات کو نہ سمجھے تو

---

[1] نیچر مفسر اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں۔ قولہ اور وہ (یعنی مناسب) معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کے پرہیزگاروں یعنی ایمان والوں کے ہادی ہونے میں کچھ شک نہیں الخ۔ اگر یہ معنی تسلیم کر لیے جائیں تو ہدیٰ کا لفظ بدل ہے ضمیر مجرور سے جو فیہ میں ہے اور جار مجرور ثابت یا کائن سے متعلق ہو کر لائے نفی جنس کی خبر ہوئی یعنی لا ریب فی کونہ ہادیاً للمتقین۔

خان صاحب بہادر نے کمال کیا ہے۔ تھوڑی سی عبارت میں کس قدر غلطیوں کو سمیٹ کر جمع کر دیا ہے (اول) یہ کہ ہنوز وہ بات باقی رہی کہ کسی کو شک نہیں۔ منکر پھر یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اس کتاب کے پرہیزگاروں کے لیے ہادی ہونے میں شک ہے پھر کیا نئی بات پیدا ہوئی (دوم) اگر فیہ کی ضمیر سے ہدیٰ کو بدل کہیں گے تو ہدیٰ کو مجرور کہنا پڑے گا، حالانکہ آج تک کسی نے اس کو مجرور نہیں کہا (سوم) فی کونہ کے متعلق قرار دیگر اور بدل کو نہ ہادیاً کہنا صحیح نہیں کیونکہ کونہ ہادیاً صفت ہے اور قرآن ذات یا موصوف اور بدل عارض کا معروض ہے درست نہیں (چہارم) جب فیہ سے کونہ ہادی بدل ڈالا تو فی کو ریب سے متعلق کرنا پڑا۔ (پنجم) یہ توجیہ لغو چونکہ عام قدماء کے مقابلے میں ہے اس میں کوئی نکتہ ہونا ضرور تھا ورنہ بغیر وجہ یا نچواں سوار بننا کیا فائدہ۔ ۱۲منہ

تفسیر میں غلطی کے مرتکب ہوئے۔

دلیل سوم: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ[1] سے مستفاد ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے۔ کتابِ آسمانی ہونے کی بڑی علامت اور پکی نشانی یہ ہے کہ وہ ایسا اثر رکھتی ہو کہ مقناطیس کی طرح دلوں کو ہدایت کی طرف کھینچے اور نیک چلنی اور توحید کی طرف رہنمائی کرے۔ یہ کبریٰ مسلم ہے اور یہ صغریٰ کہ قرآن لوگوں کو ان امور کی طرف رہنمائی کرتا ہے بدیہی ہے کیونکہ ۲۳ برس کے عرصہ میں جس قدر قرآن نے خلقِ خدا کے دلوں کو ہدایت کی طرف کھینچا اس قدر ہزار برس میں بھی تورات و انجیل نے وہ اثر نہ بخشا۔ عرب کی جو جہالت نزولِ قرآن سے پہلے تھی بہت خراب حالت تھی بت پرستی اور چوری اور رہزنی اور باہمی بیہودہ تفاخر اور جہالت اور اس کے ساتھ ذلت جس قدر عرب کو حاصل تھی شاید کسی اور قوم کو ہو۔ پھر تھوڑے سے دنوں میں قرآن نے عرب کی کایا پلٹ کرا دی ہر ایک عرب جو پیشتر ہر طرح کی برائی اور اخلاقِ رزیلہ کا مجمع تھا قرآن کی برکت سے اخلاقِ حمیدہ اور تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہو گیا۔ اس بات کے بھی تمام مؤرخین مقر ہیں۔ تورات نے تو بنی اسرائیل پر بھی بہت ہی کم اثر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چند روز غائب ہوتے ہی بقول اہلِ کتاب بنی اسرائیل کے مشائخ تو مشائخ بقولِ یہود خود حضرت ہارون علیہ السلام نے جو خدا کے خیمے کے امام تھے بچھڑا بنا کر پوجا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دمِ اخیر تک کیسی کیسی سرکشیاں بنی اسرائیل کرتے رہے اور بقول ولیم میور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کے ایمان کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے بہت ایمان دنیا کی طمع اور سلطنت کے لالچ سے تھے اور سب سے بڑے حواری شمعون پطرس نے کہ جن کے ہاتھ سے بقول نصاریٰ صدہا معجزات صادر ہوئے تھے، سختی کے وقت حضرت مسیح سے وہ بیوفائی کی کہ آشنائی سے ہی انکار کر دیا اور یہودا اسکریوطی نے تو اپنے آقا حضرت مسیح[2] کو تھوڑے سے روپے لے کر گرفتار کرا دیا اور پھر چند روز بعد صلیب پرستی اور دیگر خرابیاں جو کچھ عیسوی مذہب میں پڑیں ان کی اب تک بھی اصلاح نہیں ہوئی۔ اب انصاف کرنا چاہیے کہ کون سی کتاب سے دنیا میں زیادہ ہدایت پھیلی، پھر جس کتاب نے اپنا آسمانی ہونا عالم کو مشاہدہ کرا دیا ہو اس کو آسمانی کتاب نہ کہا جاوے اور اپنی تقویم کہنہ کو خدائی قانون بنایا جاوے تو بڑی ناانصافی ہے۔ اس دلیل کی طرف قرآن میں بہت جگہ اشارہ ہے جیسا کہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وغیرہا من الآیات۔

واضح ہو کہ ان تینوں دلیلوں میں باہم ایک عجیب مناسبتِ طبعی ہے۔ دلیل اول جو فصاحت و بلاغت سے متعلق ہے یہ چاہتی تھی کہ اس کو مقدم کیا جاوے، کیونکہ سب سے پیشتر عرب کا ایمان لانا مقصود تھا کہ جن کے ذریعے سے تمام عالم میں ہدایت پھیلی اور وہ فصاحت و بلاغت سے جلد تر ایمان لا سکتے تھے چنانچہ لائے۔ اس کے بعد کلام کو بلند کیا اور معانی کی طرف رجوع کر کے اور لوگوں کا بھی اطمینان کر دیا وہ دوسری دلیل سے حاصل ہوا اگر یہاں تک منکر کو کسی قدر چون و چرا کرنے کی مجال باقی تھی وہ کہہ سکتا تھا کہ جہلِ مرکب کی صورت میں بھی ریب نہیں اور اسی لیے ہر فریق اپنی کتاب کو خواہ وہ کیسی ہی غلط کیوں نہ ہو مشکوک نہیں جانتا۔ گو یہ شبہ بالکل بے بنیاد تھا مگر اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے وہ برہان قائم کی کہ

---

[1] علماء نے تقویٰ کی مختلف تعریف کی ہے حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ وہ ہے کہ اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ ماننے اور یقین رکھنا کہ سارے کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں ابراہیم ادھم بن منصور بلخی فرماتے ہیں تقویٰ یہ ہے کہ مخلوق تیری زبان میں کوئی عیب پاوے نہ ملائکہ تیرے افعال میں نہ فرشتے تیرے دل میں۔ بعض کا قول ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ تیرا مالک تجھ کو نافرمانی کی حالت میں نہ دیکھے۔ اس قسم کے بہت سے اقوال علماء نے تعریف میں نقل کیے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ سب حقیقتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جنابِ باری نے ہدایت پانے والوں کی کئی صفتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے ان کو متقی کہا چونکہ ایمان اور اس کی تمام فروعات کی اصل خوفِ الٰہی ہے جس کے دل میں خوف نہیں اس کو کچھ بھی نہیں۔ پہلا اثر جو خوفِ الٰہی پر مرتب ہوتا ہے وہ تقویٰ ہے یعنی خود کو عذاب سے بچانا۔ حقانی

[2] تیس روپیہ لے کر حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کروا دیا گیا۔ حقانی

گویا مشاہدہ کر کے دکھا دیا جیسا کوئی خوشنویس اپنی خوشنویسی کا دعویٰ کرے پھر لکھ کر دکھا دے یا کوئی پہلوان زور کا دعویٰ کر کے کسی درخت کو
دے۔ پھر کوئی دانشمند اس کے خوشنویس اور اس کے پہلوان ہونے میں شک نہ کرے گا، اسی طرح جب قرآن نے اپنا وہ اثر کہ جو کتابِ الٰہی کے
لیے ضرور ہے، دکھا دیا تو اب کونسا شبہ باقی رہ گیا۔ اب اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں شبہ کرنا سکندر کی فوج اور ملک اور جاہ وحشم دیکھ کر بادشاہ ہونے
کا انکار کرنا ہے۔ سو ایسے لوگ ازلی بدبخت ہیں وہ بہرے اور اندھے اور گونگے ہیں، ان کے دلوں پر مہر ہے ان کے لیے قرآن نافع نہیں۔

نکات: (۱) الٓمٓ یہ اور اس قسم کے جس قدر حروف سورتوں کے اول میں آتے ہیں ان کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں۔ علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا
ہے کہ یہ منجملہ متشابہات کے ہیں کہ جن کو خدائے تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا، چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا
کہ ہر کتاب میں ایک سر ہوتا ہے اور قرآن میں اس کا سر اوائلِ سور ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر کتاب میں ایک خاص بات ہوتی
ہے اور قرآن میں خاص بات حروفِ تہجی ہیں۔ (تفسیرِ کبیر) کس لیے کہ جس طرح خفاش نورِ شمس کے آگے خیرہ ہو جاتی ہے اسی طرح اعلیٰ
چیزوں کے انوار کے مقابلہ میں عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ پھر قرآن میں نازل کرنے سے صرف امتحانِ علماء مقصود ہوتا ہے کہ آیا
کہیں عقل کو نقل کے مطیع بھی بناتے ہیں یا نہیں اور ایک جمِ غفیر اہلِ علم کا یہ کہتا ہے کہ اس کے معنی معلوم اور عند الخلق مفہوم ہیں اور اس پر بہت
سے دلائلِ عقلیہ ونقلیہ پیش کرتے ہیں لیکن اس فریق کے تعینِ معانی میں چند قول ہیں۔ (۱) یہ کہ یہ حروف ان سورتوں کے نام ہیں کہ جن
کے ابتداء میں یہ وارد ہیں اور قدیم عرب بھی حروفِ تہجی پر بعض چیزوں کے نام رکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ نقد کو عین اور بادل کو غین اور مچھلی کو
نون اور ایک پہاڑ کو قاف کہتے تھے۔ سورتوں کا ایسے حروف سے مسمّٰی کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہمارا کلام بھی انہیں حروف سے
مرکب ہے کہ جن سے تمہارا۔ پھر تم اس کی مثل کیوں نہیں بناتے۔ (۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں تبرکاً ان کو اوائل سور میں ذکر کر دیا ہے
چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ وہ دعا میں کھیعص یاحمعسق کہتے تھے۔ (۳) یہ کہ اسمائے الٰہی کے اجزاء ہیں سعید بن
جبیر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ الرٰ حٰم ن کا مجموعہ الرحمٰن ہے لیکن اور حروف کے ترکیب دینے پر قادر نہیں۔ (۴) کہ قرآن مجید کے نام مراد ہیں کلبی اور
سدی اور قتادہ کا یہ قول ہے۔ (۵) یہ کہ ان میں سے کوئی صفت یا اسمِ الٰہی یا کوئی اور رمزِ خاص مراد ہے اور اختصار کے طور پر ایک حرف سے اس
رمز کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ بعض عرب کے اشعار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔

لَا تَحْسَبِیْ اِنَّا نَسِیْنَا الْاِیْجَافَ
قُلْتُ لَهَا قِفِیْ فَقَالَتْ لِیْ قَافَ

یعنی ''میں نے اس معشوقہ سے یہ کہا کہ تو یہ خیال نہ کیجیو کہ ہم اونٹ دوڑانا بھول گئے ہیں، اس لیے میں نے اس سے کہا کہ ٹھہر جا،
پس اس نے کہا ٹھہر گئی۔'' دیکھئے قاف وقف کا مختصر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ الف سے مراد آلاء اللہ یعنی خدا کی نعمتیں اور لام
سے لطف اور میم سے ملک مراد ہے۔ یعنی اس کے ملک میں جس قدر نعمتیں پائی جاتی ہیں یہ سب اس کے لطف وکرم کا صدقہ ہے۔ منجملہ ان
نعمتوں کے قرآن ہے وہ بھی اس کے لطف سے بندوں کی بھلائی اور سعادت کے لیے نازل ہوا ہے اور انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ الف
سے مراد اللہ اور لام سے مراد جبریل اور میم سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ یعنی یہ قرآن خدا کی طرف سے بواسطہ جبرئیل محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اور
اسی طرح اور بھی توجیہات علماء کی حروفِ مقطعات میں منقول ہیں۔ چنانچہ بعض نے فرمایا کہ الف اقصیٰ حلق سے جو ابتداءِ مخارج ہے اور لام
کنارۂ زبان سے جو وسط مخارج ہے اور میم ہونٹوں سے جو اخیر مخارج ہے نکلے گا جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوا کہ بندوں کے اول
کلام اور وسط کلام اور اخیر کلام میں ذکرِ الٰہی ہونا چاہیے، یعنی ہر حال میں اس کو یاد رکھنا چاہیے۔ (۶) یہ کہ محض خبردار کرنے کے لیے اور اس
بات کے لیے کہ ایک کلام تمام ہو کر دوسرا شروع ہوتا ہے یہ حروف بولے گئے ہیں اور قدیم عرب بھی اپنے خطبات میں اکثر ایسا کرتے تھے۔
یہ قطرب کا قول ہے۔ (۷) یہ کہ بحساب ابجد ان سے قوموں کے زمانۂ حکومت اور دورِ سلطنت اور بقاءِ عزت کی طرف اشارہ ہے۔ ابوالعالیہ

کا یہی قول ہے۔ کس لیے کہ جب بعض یہود نے آنحضرت علیہ السلام سے الم سنا تو اکہتر برس کا حساب لگا کر یہ کہا کہ جس دین کی یہ تھوڑی مدت ہو
اس میں ہم کس طرح داخل ہوویں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے تبسم کیا۔ یہودی نے پوچھا کہ کیا اس کے سوا اور کچھ بھی ہے؟ آپ ﷺ نے
فرمایا ہاں المص الر، اس نے سن کر کہا اب ہم کو اشتباہ میں ڈال دیا کوئی بات ہم معین نہیں کر سکتے (رواہ البخاری فی تاریخہ) جو لوگ ان کو
سورتوں کے نام کہتے وہ ایک عمدہ بات نکالتے ہیں وہ یہ کہ ہر اسم (نام) کو اپنے مسمّٰی سے ضرور ایک مناسبت ہوتی ہے (چنانچہ شاہ ولی اللہ
صاحب نے اس کو بڑی تفصیل سے ثابت کیا ہے) پس ان حروف کو اپنے معانی سے ایک مناسبتِ خاصہ ہے۔ گویا کہ یہ ان کے مضامین کی
فہرست ہیں مثلاً الف (ہمزہ) اور ہائے دونوں غیب کے لیے مقرر ہوئے ہیں صرف یہ فرق ہے کہ ہا اس عالم کے غائب میں اور ہمزہ عالمِ
مجرد کے غیب میں مستعمل ہوتی ہے، اسی لیے استفہام کے وقت او۔ ام کہتے ہیں اور عطف کے وقت او کیونکہ جس بات کو پوچھتے ہیں وہ بہ
نسبت متعین کے غائب ہیں اور اسی طرح جس میں تردد ہے وہ بھی غیب ہے اور لام کو تعین کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسی لیے تعریف
کے وقت لام زیادہ کر دیتے ہیں اور رجل کو الرجل بولتے ہیں اور میم چونکہ دونوں لبوں کے ملنے سے ادا ہوتی ہے تو اس کو ہیولائی تدلّس پر
استعمال کیا گیا کہ جس میں حقائقِ اشیاء مجتمع ہیں اور عالمِ تجرد سے تقید وتحیز کے قید خانہ میں بند ہیں۔ پس الم سے فیضِ مجرد مراد ہے کہ جو عالمِ
تحیز میں آیا اور بندوں کے علوم اور عادات کے موافق متعین ہوا اور پھر اس نے بندوں کے سخت دلوں کو نصیحت سے نرم کیا اور برے کاموں پر
نادم اور صاحبِ شرم کیا اور وہ کیا ہے؟ یہ سورۂ بقرہ۔ پس اجمالاً تمام سورۂ بقر پر دلالت کرتا اور یہ سورہ گویا ان تین حروف کی تفسیر ہے اور یہی
حال اور حروف کا ہے۔

(۲) ان حروف کے لانے میں ایک عجیب صنعت ملحوظ ہے کہ جو بڑے بڑے فصحاء بلغاء ومشاقِ سخن کی قدرت سے باہر ہے۔ جس سے
یہ ظاہر ہے کہ یہ بشر کا کلام نہیں۔ بالخصوص اس شخص کا کہ جس نے کبھی نہ مشاعرہ کا دروازہ دیکھا ہو نہ کبھی شعر وسخن کی طرف متوجہ ہوا ہو بلکہ علوم
رسمیہ سے بھی محض برطرف ہو اور وہ صنعت یہ ہے کہ یہ حروف جو اوائل سور میں آئے ہیں کل چودہ حرف ہیں کہ جو تمام حروفِ تہجی کے
(بشرطیکہ الف[1] کو حرفِ مستقل نہ شمار کیا جائے) نصف ہیں اور ان کو انتیس سورتوں کی ابتداء میں بہ تعدادِ حرفِ تہجی ذکر کیا پھر ان حروف کے
لانے میں ایک اور عجیب رعایت رکھی ہے کہ جس قدر حروف کی اقسام ہیں ان میں سے بقدر نصف نصف اس حروف میں موجود ہیں۔ دیکھئے
تقسیم اول حروف کی یہ ہے۔ کل حروف مہموسہ[2] ہیں یا مجہورہ مہموسہ دس ہیں۔ س، ت، ش، ح، ث، ک، خ، ص، ف، ہ۔ ان میں سے پانچ ح۔
ہ۔ ص۔ س۔ ک قرآن کے مقطعات میں موجود ہیں اور باقی اٹھارہ حروف مجہورہ ہیں ان میں سے بھی نو حروف ان مقطعات میں موجود ہیں
اور وہ نو یہ ہیں لام، نون، یا، قاف، طاء، عین، ہمزہ، میم، را۔ اور اسی طرح کل حروف دو قسم ہیں یا شدیدہ کہ سخت آواز پیدا کرتے ہیں۔ یا رخوہ پس
شدیدہ آٹھ حروف ہیں ھمزہ، جیم، دال، تا، طا، یا، قاف، کاف۔ ان میں سے نصف چار حروفِ مقطعات میں موجود ہیں۔ اعنی۔ ہمزہ قاف
طا کاف اور باقی رخوہ بیس ہیں ان میں سے نصف دس مقطعات میں موجود ہیں اور وہ دس یہ ہیں۔ ح، م، س، ع، لام، ی، ن، ص، ر، ہ۔ اسی
طرح حروف کی دو قسم ہیں یا منطبقہ کہ ان کے ادا کرنے کے وقت زبان تالو سے لگ جاتی ہے اور زبان اور اس کے محاذات میں آواز رک کر
نکلتی ہے اور یا منفتحہ کہ جن کے ادا کے وقت بات پیدا نہیں ہوتی پس منطبقہ[3] چار ہیں ص، ط، ض، ظا۔ ان میں سے نصف ص اور ط حروفِ

---

[1] یہ ایک بڑی مہارتِ فن کی بات ہے کہ الف کو کبھی حروف میں شمار کیا اور کبھی نہیں کیا تا کہ معلوم ہو کہ الف اور ہمزہ ایک ہی چیز ہے اور یہ کہ ان میں جو فرق ہے تو صرف حرکت وسکون کا ہے۔ ۱۲منہ

[2] مہموسہ جو ذرا نرمی سے ادا ہوتے ہیں اور مجہورہ اس کے برخلاف۔ ۱۲منہ

[3] یہاں سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لوگ قرآن میں ض کو ظ پڑھتے ہیں اور کتبِ قرأت سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ ض کو ظ کے مشابہ لکھا ہے محض غلطی کرتے ہیں۔ مشابہت صرف وصفِ اطباق میں ہے سو وہ ص اور ط کے ساتھ بھی ہے پھر یہی کوئی ض کو ص یا ط پڑھ سکتا ہے۔ عرب میں اب تک کوئی اس طرح نہیں پڑھتا۔ یہ صرف ایران کے شیعہ کی تقلید ہے۔ ۱۲منہ

مقطعات میں موجود ہیں اور اسی طرح باقی منفتحہ چوبیس ہیں ان میں سے نصف بارہ قرآن کے اوائل سور میں موجود ہیں اور حروف قلقلہ کہ جن کے ادا کے وقت زبان میں اضطراب پیدا ہوتا ہے پانچ ہیں ق، و، ط، ب، ج ان میں سے دو کو ذکر کیا ق اور ط کو تا کہ نصف اقل لینے میں اس طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ حروف کمتر استعمال ہوتے ہیں اور حروفِ لینتین دو ہیں و اور یا، ان میں سے ی کو لیا کس لیے کہ اس کا ثقل کم ہے اور حروف مستعلیہ (کہ جن سے زبان حنک اعلیٰ میں چڑھ جاتی ہے) سات ہیں۔ق، ص، ط، خ، غ، ض، ظا۔ان میں سے نصف اقل ق، ص، ط قرآن کے مقطعات میں موجود ہیں اور باقی جو حروف ہیں وہ منخفضہ ہیں سو وہ اکیس حروف ہیں ان میں سے گیارہ نصف اکثر کو لیا اور اسی طرح حروفِ بدل اور حروفِ مدغمہ میں بھی یہی رعایت رکھی ہے پھر اور لطف یہ ہے کہ ان مقطعات کو تین جگہ مفرد لایا گیا ہے اور وہ یہ ہیں ص سورہ صاد کے اول میں اور ق سورہ قاف کے اول میں اور ن سورہ نون کے اول میں تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ حروف مفردہ اسم فعل حرف تینوں جگہ پائے جاتے ہیں اسم جیسا کہ کاف خطاب اور فعل ق اور ل کہ وقی یقی اور ولی یلی کا امر ہے اور حرف جیسا کہ ہائے جر اور کاف تشبیہ اور چار دو دو کر کے آئے ہیں طہ، طس، یس، حم، تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ دو کا مجموعہ حرف میں بغیر حذف ہوتا ہے جیسا کہ بل اور فعل میں بحذف ہوتا ہے جیسا کہ قل اور اسم میں دونوں طرح سے ہوتا ہے۔بغیر حذف جیسا کہ من اور بحذف جیسا کہ دم پھر ان دو دو کے مجموعہ کو نو سورتوں[1] کے اول میں ذکر کیا تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ دو کا مجموعہ اسم فعل حرف میں فتح ضمہ کسرہ سے پایا جاتا ہے اس میں جیسا کہ اذا، ذو، من اور فعل میں جیسا کہ قل، بع، خف اور حروف میں جیسا کہ اَنْ، مِنْ، مِذْ اور تین تین کے مجموعہ کو جیسا کہ الم، الر، طسم ہے۔تیرہ[2] سورتوں کے اول میں ذکر کیا تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ جو اوزان ثلاثی مجرد کے زبان عرب میں مستعمل زیادہ ہیں تیرہ ہیں ان میں سے دس اسمِ ثلاثی کے ہیں جیسا کہ فلس، فرس، کتف، عضد، حبر، عنب، ابل، قفل، صرد، عنق اور تین فعل ماضی کے ہیں۔نصر، علم، شرف اور چار کے مجموعہ کو جو المر و المص ہے اور اسی طرح پانچ کے مجموعہ کو کہ جو کہیعص اور حمعسق ہے دو دو سورتوں کے اول میں ذکر کیا تا کہ یہ بات سمجھی جائے کہ رباعی اور خماسی کے دو وزن ہیں ایک اصلی جیسا کہ جعفر و سفرجل اور ایک ملحق جیسا کہ قردد و جحفل اور اسی نکتہ کے لیے ان حروف کو ایک جگہ جمع نہیں کیا بلکہ انتیس سورتوں کے اول میں لایا۔

(۳) زبانِ عرب میں لفظ ذلك اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو دور ہوتی ہے جس طرح ھذا سے نزدیک کی چیز کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔پس اس مقام پر جو خدائے تعالیٰ نے ھذا الکتاب نہ فرمایا بلکہ ذلك کہا، اس میں اس کتاب یعنی قرآن کی عزت و عظمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب اعلیٰ درجہ میں کوئی شے ہوتی ہے اور کمال کے اخیر درجہ پر جا پہنچتی ہے تو اس اعتبار سے وہ دور اور نہایت بلند مقصود ہو کر ذلك سے اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۴) الکتٰب میں جو الف لام ہے اس سے وہ کتاب مراد ہے کہ جس کا پہلے انبیاء علیہم السلام کی معرفت وعدہ کیا گیا تھا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ تمہارے بھائیوں میں سے خدا مجھ سا نبی برپا کرے گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا (یعنی کتاب اس پر نازل کرے گا) توراۃ سفر استثناء باب ۱۸ یعنی قرآن لفظ کتاب مصدر ہے مبالغۃً مکتوب پر اطلاق ہوتا ہے یا فعال ہے جو مفعول کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ لباس ملبوس کو کہتے ہیں پھر جو عبارت کہ ذہن میں مرتب ہو اس پر بھی لکھے جانے سے پیشتر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اس لحاظ سے کہ لکھی جائے گی صلاحیت رکھتی ہے اس لحاظ سے گو قرآن اس وقت لکھا نہ گیا تھا اس پر کتاب کا اطلاق ہوتا ہے اور لغت میں کتب کے معنی جمع کے ہیں اور اسی لیے فوج کو کتیبہ بولتے ہیں کہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور عرفِ شرع میں کتاب سے مطلقاً قرآن مجید مراد ہوتا ہے۔

---

[1] سورہ طٰہٰ و نمل و یٰس و مومن و حم سجدہ و زخرف و جاثیہ و احقاف و دخان۔۱۲ منہ

(۵) متقین کے لیے خدا نے اس کتاب کو ہدایت فرمایا حالانکہ قرآن کی خوبی یہ تھی کہ سب کے لیے ہدایت ہوتا اور خود ایک جگہ فرمایا ب تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا بلکہ متقین تو ہدایت پا چکے ان کے لیے ہدایت کی کیا ضرورت تھی ب ان کے لیے قرآن کا ہدایت بنانا تحصیلِ حاصل ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک عجیب نکتہ ہے کہ جو اعجازِ قرآن کے لیے شاہد عدل ہے اور وہ یہ کہ متقین سے مراد عام مکلفین ہیں مگر دو وجہ سے بلفظ متقین ان کو تعبیر کیا ایک یہ کہ تفاول مقصود ہے جس طرح کسی مبتدی طالب العلم کو اس لحاظ سے کہ یہ آیندہ عالم ہونے والا ہے، مولوی کہہ دیتے ہیں اسی طرح قرآن کی طرف متوجہ ہونے والے کو باعتبار مآل متقی کہہ دیا کہ جس سے یہ بات جتلا دی کہ آخر کار قرآن کی طرف متوجہ ہونے کا نتیجہ متقی ہونا ہے۔بخلاف اور کتبِ واہیہ کے کہ ان سے یہ نتیجہ حاصل ہونے کی امید ہی نہیں بس گویا اس لفظ سے قرآن کا اثر اور نتیجہ جتلا کر طالب کو خوشخبری اور مژدہ دینا ہے۔سو یہ بات ہدی للناس میں حاصل نہیں ہوتی۔دوسرے یہ کہ گو ہر شخص کا نفع اور سعادت اس کتاب سے متصور ہے مگر دراصل اس میں وہی فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جو ازلی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہیں اور جو بد بختِ ازلی ہیں اور ازل میں ان کی روح پر انوارِ الٰہی کا کوئی ذرہ بھی نہ پڑا تو وہ اس سے محروم ہیں۔پس اس لفظ متقین سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو بد بختِ ازلی ہیں وہ نہیں مانتے اور اس میں نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔سو وہ اس کتاب کا قصور نہیں ہے بلکہ ان کی استعداد میں فتور ہے۔کیا خوب کہا ہے کسی نے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — درباغ لالہ روید و در شور بوم خس
شمشیر نیک زاہنِ بد چوں کند کسے — ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

اب نہ قرآن کی خوبی میں کچھ فرق آیا نہ تحصیلِ حاصل لازم آتی ہے۔

واضح ہو: کہ تقویٰ کہ جس کی اصل وقایہ (یعنی نہایت محفوظ رکھنا) ہے عرفِ شرع میں ان چیزوں سے اپنے تئیں محفوظ رکھنا ہے کہ جو اس کو آخرت میں مضر ہیں اور اس کے تین مرتبہ ہیں: (اول) عذابِ دائمی سے محفوظ رکھنا اور کفر و شرک کو عمل میں نہ لانا۔پس اس لحاظ سے ہر مسلمان کو خواہ وہ کیسا ہی ہو متقی کہہ سکتے ہیں۔چنانچہ اسی آیت میں اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے: وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰی، یعنی کلمۂ توحید۔(دوسرا) ہر گناہ سے بچنا اور اس کے وبال سے محفوظ رکھنا، اکثر کے نزدیک کبائر سے جو پرہیز کرے گا، متقی شمار ہے اور بعض کہتے ہیں کبائر صغائر جب تک سب سے پرہیز نہ کرے گا شرع میں اس پر لفظ متقی نہ بولا جاوے گا اور اس آیت میں اسی مرتبہ کی طرف اشارہ ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا۔(تیسرا مرتبہ) یہ ہے کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی کا خیال بھی دل میں نہ آوے جمیع خطرات اور خیالات سے آئینۂ دل کو صاف کر کے ہمہ تن جمالِ جہاں آراء میں محو اور مشغول ہو جاوے اور یہ تقویٰ حقیقی ہے۔اس مرتبہ کے متقی صرف انبیاء و اولیاء ہوتے ہیں اور یہ تقویٰ قرآن میں اکثر جگہ مذکور ہے۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اور اس آیت میں بھی یہی مراد ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا کہ سب سے ٹوٹ کر اس کی طرف آئے اور هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں بھی تینوں طرح کے تقویٰ مراد ہیں۔

فوائد: امام احمد اور ترمذی وغیرہما محدثین نے عطیہ سعدی سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کو مرتبۂ تقویٰ جب نصیب ہوتا ہے کہ جب ان چیزوں کو بھی کہ جن میں خطرۂ شرعی ہے ترک کرے، اس خوف سے کہ حرام میں گرفتار نہ ہو جاوے۔اور ابن ابی الدنیا نے کتاب التقویٰ میں حضرت خواجہ حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ متقیوں کے ساتھ اس وقت تک تقویٰ رہتا ہے کہ جب تک وہ حرام کے خوف سے بہت سی حلال چیزوں سے بھی دست کش رہتے ہیں۔ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں میمون بن مہران سے روایت کیا ہے کہ کوئی شخص بغیر اس بات کے متقی نہیں ہو سکتا کہ ہر روز اپنے نفس سے ایسا سخت حساب نہ لے کہ جیسا شریک سے لیتے ہیں کہ تیرا یہ کھانا کہاں سے ہے اور یہ پینا کہاں سے ہے اور یہ لباس کہاں سے آیا۔حلال سے ہے یا حرام سے ہے۔قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں تقویٰ کے بہت فضائل اور

بڑی تاکید آئی ہے اور اس میں سر یہ ہے کہ جس طرح امراضِ جسمانی میں پرہیز نہایت نافع ہے اور بد پرہیزی کا اثر جسم پر فوراً ظاہر ہوتا ہے اسی طرح انسان کے اعمال اور اقوال و اعتقادات کا اثر اس کی روح پر پہنچتا ہے اور یہ روحانی امراض ہیں جن کا برا اثر دنیا میں کم اور مرنے کے بعد پورا نمودار ہوتا ہے۔

اسلام کا ایک روشن اصول تقویٰ بھی ہے کہ جس سے اس کو جمیع مذاہب پر شرف ہے اس کے سوا رضا بالقضا اور شکرِ نعماء اور پابندیٔ احکام اور ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہنا کبائر و صغائر تو کیا مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرنا یہی اصولِ اسلام ہیں۔ الغرض زبان اور دل اور ہاتھ پاؤں کو خدائے تعالیٰ کی فرماں برداری میں لانا اصولِ تقویٰ ہیں۔ اسلام نے ان کو طرح طرح سے تعلیم فرمایا ہے جس کا اثر اسلامیوں پر یہ ہوا کہ غیر محرم عورت کو دیکھنا اور بے فائدہ بات منہ سے بولنا بھی دل کو سیاہ کرنے والی چیزوں میں شمار کیا گیا، افسوس کہ آج کل یورپ کے الحاد کا اثر بعض بددینوں کی وجہ سے ہندوستان کے اہلِ اسلام میں بھی نمودار ہونے لگا، اس وقت نوتعلیم یافتہ عبادت، ریاضت، تقویٰ و طہارت کی باتوں پر قہقہے اڑاتے ہیں جس کا اثرِ بے برکتی اور تاریکی نمایاں ہے۔

الٰہی ہم اہلِ اسلام کو اپنے نبیِ عربی سید المتقین کے طفیل سے اس تاریکیِ روحانی اور سواد الوجہ جاودانی سے بچا۔ آمین۔

چونکہ ہر مذہب میں تقویٰ کا دعویٰ ہے اور ہر شخص اپنے خیالاتِ فاسدہ کی پیروی کو تقویٰ سمجھتا ہے اور باعثِ نجات جانتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے اس بات کو کھول دیا اور متقین کے اوصافِ اصلی بتا دیے۔ فقال:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

(اور وہ متقی بھی) جو غیب پر ایمان رکھتے اور نماز قائم کرتے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں

ترکیب: الَّذِيْنَ موصول يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ جملہ معطوف علیہ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ فعل بافاعل و مفعول جملہ ہو کر معطوف اور يُنْفِقُوْنَ فعل بافاعل اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ اس کا مفعول مقدم فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر معطوف ہوا جملہ سابقہ پر۔ پس یہ تینوں جملہ کہ جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں صلہ ہوئے۔ موصول اپنے صلہ سے مل کر صفت ہوئی متقین کی۔

تفسیر: تقویٰ کے دو جزو ہیں۔ ایک اچھی باتوں کا عمل میں لانا، دوسرا بری باتوں سے بچنا۔ پھر اچھی باتوں کی دو قسم ہیں ایک اعلیٰ، دوسری ادنیٰ۔ اعلیٰ قسم امورِ حقہ کی تصدیق ہے جو قلب کا کام ہے اور وہ بدن سے روح جدا ہونے کے بعد بھی روح کے ساتھ رہتی ہے اور جس طرح قلب کو جمیع اعضاءِ بدن پر شرف ہے اسی طرح قلب کے عمل کو بھی اعضاء کے عمل پر شرف ہے۔ اس درجۂ اعلیٰ کو ایمان کہتے ہیں۔ قسم دوم اعمالِ صالحہ ہیں پھر ان کی بھی دو قسم ہیں۔ بدنی اور مالی، بدن کے اعمال میں سب سے بڑھ کر نماز ہے اور مال میں زکوٰۃ، اور اس سے دوسرے مرتبہ کو عملِ صالح کہتے ہیں، اس لیے خدائے تعالیٰ نے ان دونوں قسموں کو اس آیت میں بیان فرمادیا ہے، يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے قوتِ نظریہ یعنی اعتقادیات کی درستی بیان کردی اور جب عقائد اور ادراکاتِ صحیحہ سے روح پاک ہوگئی تو قوتِ عملیہ کے اعلیٰ جزء کو يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ سے بیان کیا اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے مالی عبادت کو ظاہر کردیا، تینوں جملوں سے بترتیب تینوں باتوں کو بیان کردیا۔ اب رہا بری باتوں سے باز رہنا سو وہ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ سے سمجھا گیا کس لیے کہ جب انسان خدائے تعالیٰ پر اور اس کی ذات وصفات اور ملائکہ اور قیامت کے دن پر اور جن چیزوں کی اس نے اپنے رسول ﷺ کی معرفت خبر دی ہے (اور یہ سب باتیں يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے سمجھی جاتی ہیں) ان سب پر صدقِ دل سے ایمان لاتا ہے اور روح اور جسم سے اس کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے کہ جس کو نماز کہتے ہیں تو اس پر وہ انوارِ الٰہی فائز ہوتے ہیں کہ جن سے اس کی بہیمیت بالکل پست ہوجاتی ہے اور معاصی کی طرف نفسِ بہیمی کو نہیں جانے دیتے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کہ نماز ہر قسم کی فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اسی لیے صوفیہ محققین فرماتے ہیں کہ جس قدر قوائے بہیمیہ کو تھوڑی سی دیر کی یادِ الٰہی اور ذکرِ قلبی سے پژمردگی حاصل ہوتی ہے، وہ بہت سی مدت بھوکے پیاسے مرنے سے نہیں حاصل ہوتی اور یہ ظاہر ہے۔ کس لیے کہ ملکیت اور بہیمیت دونوں متضاد قوتیں جیسا کہ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ میں اشارہ ہے، حضرت انسان میں رکھی گئی ہیں جب ان میں سے ایک غالب ہوگی تو اس کی ضد قطعاً مغلوب ہوگی اور جبکہ اس عالمِ محسوسات میں جو کمزور اور مکدر ہے فاعل کا اثر منفعل پر محسوس ہوتا ہے آگ کا بھٹی میں لوہے پر، پھول اور عطر کا کپڑے پر تو اس عالمِ مجردات میں جو نہایت قوی ہے، یہ اثر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، پھر حق سبحانہ کی ذاتِ مقدسہ کے انوار جو فاعلِ قوی ہیں نفسِ ناطقہ یعنی روح پر جو نہایت سریع الانفعال ہے کس قدر اثر پیدا کرسکتے ہیں یہاں تک کہ اس کے ہر جزو میں ملکیت کا سریان ہو کر بندہ کامل حق سبحانہ کا آئینۂ جمال نما ہوجاتا ہے، پھر یہاں نفسِ امارہ اور اس کی بدخواہشوں کا کیا ذکر، اور اسی مرتبہ کو عصمت اور محافظت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ جملہ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ بیان کافی ہے۔

یا یوں کہو کہ بری باتوں سے محفوظ رہنے کو تو لفظ متقین سے سمجھا دیا اور اعتقاد اور ایمان کو کہ جو اعلیٰ جزء ہے یؤمنون بالغیب میں بتلا دیا اور بدنی عبادت کو يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ سے واضح کردیا اور مالی کو مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے منکشف فرمادیا، بس سعادت اور شقاوت کو جو ان کی برخلافی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی حکمتِ نظریہ اور عملیہ کو کہ جس کے حصول پر نجات کا مدار ہے اس آیت میں واضح کردیا۔

تعلیقات: يُؤْمِنُوْنَ لغت میں ایمان تصدیق کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کو سچا جاننا اور یقین کرنا اور یہ امن سے مشتق ہے کہ گویا ایمان لانے والے نے جس پر وہ ایمان لایا ہے اس کو مخالفت اور تکذیب سے امن میں کردیا اور شرع میں ایمان ان چیزوں کا صدقِ دل سے یقین کرنا ہے کہ جن کا دینی ہونا قطعی طور پر ثابت ہوگیا ہو، یعنی قرآن مجید کی ظاہر عبارت یا حدیثِ متواتر یا اجماعِ قطعی سے جو بات ثابت ہو اس پر یقین کرنا جیسا کہ خدائے تعالیٰ کی ذات وصفاتِ کریمیہ علم و قدرت اور ملائکہ اور آسمانی کتابیں اور انبیاء اور مرنے کے بعد حساب و کتاب جزا و سزا کو برحق ماننا۔

پھر اس ایمان کے دو مرتبہ ہیں:

ایمانِ اجمالی: ایمانِ اجمالی کو مجملاً بلا تفصیلِ جزئیاتِ دینِ محمدی کو برحق سمجھنا، جس کا خلاصہ صدق دل سے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا ہے۔

ایمانِ تفصیلی: دوسرا ایمانِ تفصیلی کہ جس قدر امورِ شرح سے یقیناً ثابت ہیں اور جو باتیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے فرمائی ہیں ہر ایک کو برحق ماننا جس چیز پر ایمان اجمالی یا تفصیلی میں ایمان لانا ضرور ہے جو اس پر ایمان نہ لاوے گا انکار یا تکذیب کرے گا، کفرِ شرعی ثابت ہوگا کہ جس کی سزا ابدی جہنم ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔ دراصل ایمانِ حقیقی تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ جیسا کہ دلائلِ عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہے کس لیے کہ ایمان کی ماہیت میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ صرف تصدیق ہے اور اس پر دلائلِ نقلیہ یہ ہیں۔ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ اور وَكَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ اور وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ ان آیات میں ایمان کو قلب سے متعلق کیا گیا ہے اور قلب کا کام محض تصدیق ہے اور یہ بھی آیا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اس آیت میں اعمالِ صالحہ کا عطف ایمان پر کیا گیا اور معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ نفسِ ایمان کا جزو نہیں بلکہ وہ صرف تصدیق ہے اور

بہت سی جگہ اہلِ معاصی کو مومن بھی کہا ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا۔ جس سے معلوم ہوا کہ برے اعمال سے نفسِ ایمان زائل نہیں ہوتا۔ البتہ ترتیبِ احکامِ شرعیہ کے لیے زبان سے اقرار کرنا بھی شرط ہے اور کمالِ ایمان کے لیے اعمالِ صالحہ بھی ضرور ہیں۔ پس جو شخص دل سے تصدیق بھی کرتا ہو اور زبان سے اقرار بھی اور اس کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی عمل میں لاتا ہو وہ بالاتفاق مومنِ کامل قرار دیا جائے گا کیونکہ تصدیق بالجنان اقرار باللسان عمل بالارکان سب پائے گئے اور جو دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اعمال اس کے خراب ہیں تو وہ جمہور اہل سنت کے نزدیک مومن فاسق ہے اور خوارج کے نزدیک کافر ہے اور معتزلہ بلکہ شیعہ کے نزدیک کافر تو نہیں بلکہ ایمان سے خارج ہے کیونکہ اس کے نزدیک اعمالِ صالحہ نفسِ ایمان کا جزو ہیں، مگر یہ زیادتی اور تعصب ہے اور ادلہ شرعیہ کے مخالف۔ ہاں ایمانِ کامل کا جزء اعمالِ صالحہ ہیں۔ پس اگر اعمالِ صالحہ نہ ہوں گے تو ایمان کامل نہ ہوگا نہ یہ کہ نفسِ ایمان بھی نہ ہوگا اور جس کے دل میں تصدیق نہ ہوگی تو وہ کافر ہے اور اگر دل میں تصدیق نہ ہونے پر ظاہری اقرار بھی ہے تو اس کافر کو عرفِ شرع میں منافق کہتے ہیں۔ اب یہ تصدیق خواہ اس کو تقلید سے حاصل ہو (اس کو ایمانِ تقلیدی کہتے ہیں) یا تحقیق سے (اور اس کو ایمانِ تحقیقی کہتے ہیں) اور خواہ یہ تحقیقی استدلالی ہو یا کشفی سب صورتوں میں محققین کے نزدیک ایمان معتبر ہوگا۔

یہ بحث کہ ایمان کم و زیادہ بھی ہوتا ہے یا نہیں اور اس قسم کی دیگر ابحاث محض نزاعِ لفظی ہیں ان کے بیان کرنے سے بجز اس کے سامع کا دماغ پریشان ہو اور کچھ نتیجہ نہیں۔

بالغیب : یہ غاب یغیب کا مصدر ہے غائب کی جگہ اس کو مبالغۃً استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد وہ خفی چیز ہے کہ جو نہ حواس سے معلوم ہو نہ بداہۃً عقل اس کی مقتضی ہو۔ اس کی دو قسم[1] ہیں ایک وہ غیب کہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو جیسا کہ اس آیت میں مراد ہے، وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُہَآ اِلَّا ہُوَ ''کہ خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا''، البتہ اس قسم کے غیب کی قلب (محض حکمِ الٰہی کی وجہ سے) اجمالاً تصدیق کر سکتا ہے۔ دوسرا وہ کہ جس کے لیے دلائلِ عقلیہ باآوازِ بلند گواہی دے رہے ہوں جیسا کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور جزاء و سزا کا دن وغیرہ ذلک اس میں شک نہیں کہ پورا انقیاد اور کمالِ اطاعت بندہ کا جب ہے کہ وہ انبیا علیہم السلام کے فرمانے سے ان چیزوں پر بھی ایمان لاوے کہ جو اس کے مشاہدے سے باہر ہیں اور جن کے مشاہدہ کی اس کو طاقت نہیں ورنہ آنکھ سے دیکھی ہوئی اور ہاتھ سے ٹٹولی ہوئی اور زبان سے چکھی ہوئی چیز کی تو ہر شخص تصدیق کرتا ہے اور یہی حکمت ہے کہ نزع کے وقت کا (جبکہ بندہ کو اس عالمِ غائب کی چیزیں ملائکہ اور دوزخ و جنت دکھائی دینے لگیں) ایمان قبول نہیں اور اس کو ایمانِ یاس کہتے ہیں اور اسی وجہ سے نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم آیندہ آنے والوں کے ایمان کی زیادہ قدردانی کرتے تھے، چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ کتبِ احادیث میں مذکور ہے کہ ایک روز حارث بن قیس نے جماعت صحابہ میں بیان کیا کہ اے صحابۂ محمد ﷺ ہم کو نہایت حسرت و افسوس ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کے

---

[1] غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک اضافی بہ نسبت مخلوق یعنی بعض اشیاء بعض بندوں سے مخفی ہیں، وہی چیزیں بعض دوسروں کے سامنے ہیں، جیسا کہ ایک گھر یا شہر کے رہنے والے کے سامنے اس گھر یا شہر کی چیزیں حاضر اور دور دراز کے شخص کے نزدیک جس نے ان کو نہ کبھی دیکھا نہ سنا، غیب یا غائب ہے۔ اسی طرح عالمِ ملکوت کی اشیاء ملائکہ یا مجردات یا ارواحِ طیبات حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام پر کسی وقت اشیاء حاضر اوروں کی نسبت جن کے نزدیک یہ اشیاء غائب ہیں۔ عام ہے کہ کبھی اس عالمِ ناسوت میں وہ ظہور کریں گی، جیسا کہ آنے والے واقعات مخبرِ صادق کے فرمان کے مطابق جس کو پیشین گوئی کہتے ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے اس حصہ میں غیب دانی سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے اتباع اولیاءِ کرام بمقتضائے مصلحتِ الٰہیہ بہرہ ور ہوئے ہیں۔ دوم غیبِ مطلق جس کو غیب الغیب بھی کہتے ہیں جبروت ولاہوت کے اسرار و دیگر اشیاء ان کا خزانہ اس کے پاس ہے اس میں سے جس مخصوص بندہ کو جس قدر چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے حصہ دیتا ہے اس پر بھی بقول مخبرِ صادق ایمان لانا واجب ہے۔

دیدارے شرف نہ ہوئے، ہائے اس دولت سے محروم رہ گئے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ صحیح مگر ایک نعمت سے ہم محروم رہ گئے وہ تم کو نصیب ہے وہ یہ کہ تم بے دیکھے آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے۔ خدائے تعالیٰ کی قسم جس نے محمد ﷺ کو آنکھ سے دیکھ لیا اس کے نزدیک آپ کی نبوت آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی۔ ایمان تمہارا ہے کہ بغیر دیکھے ایمان لائے۔ طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سفر میں صبح کے وقت ایک بار قافلہ میں وضو کو پانی نہ تھا آنحضرت ﷺ نے ڈھونڈ وایا تو ایک آدمی کے پاس صرف ایک برتن میں قدرے پانی نکلا، آپ ﷺ نے اس میں اپنی انگلیاں ڈال دیں تو وہ فوارے کی طرح جوش مارنے لگا، بلال کو حکم دیا کہ پکارو سب آکر وضو کرلیں، سینکڑوں صحابہ نے وضو کیا اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیا جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمام مخلوقات میں سے کس کا ایمان عجب تر ہے؟ لوگوں نے کہا ملائکہ کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان کے ایمان میں کیا تعجب ہے وہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہیں اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں وہ کیونکر ایمان نہ لاتے۔ لوگوں نے پھر عرض کیا آپ ﷺ کے صحابہ کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ صدہا معجزات دیکھتے ہیں، ان کے ایمان میں کیا تعجب ہے، البتہ عجب ان کا ایمان ہوگا جو میرے بعد پیدا ہوں گے اور میرا نام سن کر صدقِ دل سے ایمان لاویں گے، وہ میرے بھائی ہیں اور تم اصحاب۔ ابوداؤد طیالسی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن تم نے ان آنکھوں سے جناب رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا، ہاں پھر اس نے کہا تم نے اپنی زبان سے آنحضرت ﷺ سے کلام کیا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا تم نے اپنے ہاتھوں کو حضرت کے ہاتھوں میں دے کر بیعت کی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ یہ سن کر وہ شخص حضرت کے شوق میں زار زار رونے لگا اور ایک حالتِ وجد اس پر طاری ہوگئی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا میں تجھ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں کہ جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سنی تھی وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے خوشحالی ہے اس کو جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اور اس سے بھی زیادہ خوشحالی ہے اس کو کہ جو بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لایا۔ یہ روحانی جذبہ جواب تک چلا آتا ہے حضرت ﷺ کا معجزہ ہے۔

یقیمون الصلوٰۃ: اقامت سیدھا کھڑا کرنا، یعنی تعدیلِ ارکان اور نہایت خضوع و خشوع اور حضورِ قلب سے نماز ادا کرنا اور ہر جگہ قرآن میں نماز کو بلفظِ اقامت طلب کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز پڑھنا اور چیز ہے اور اس کو قائم کرنا اور بات ہے، اس کا قائم کرنا یہ ہے کہ حدثِ اصغر و اکبر سے کہ نجاستِ حکمی ہے' پیشاب اور پائخانہ وغیرہ سے کہ نجاستِ حقیقی ہے پاک ہو (کیونکہ اس سے روح کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور خطرات دفع ہوتے ہیں) پھر اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ اٹھائے تاکہ اس طرف اشارہ ہو کہ دین و دنیا غیر اللہ سب سے ہاتھ اٹھا کر اس کے دربار میں حاضر ہوا ہوں، پھر ثناء اور اس کی حمد کرے، پھر سورۃ الحمد پڑھے کہ جس میں اس کی ثناء اور اپنے لیے دعا ہے اس کے بعد کسی قدر اور قرآن مجید پڑھے کہ اس سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہو، پھر زیادہ شوق میں آکر اس کے آگے جھکے اور اس کی با ایں الفاظ سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ نہایت حمد و ثنا کرے پھر کھڑا ہو کر اس کی حمد میں ربنا لک الحمد کہے اور نہایت ادب اور محبت سے اس کے پاؤں میں (حالانکہ وہ ان پاؤں سے پاک ہے) سر رکھ کر عجز و نیاز سے سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہے تاکہ نفس کا تمام کبر و غرور خاک میں مل جائے، پھر اس تقرب کے شکریہ میں دوبارہ سجدہ کرے اور پھر دوسری رکعت میں اسی طرح ادا کرے بعد اس کے باادب اس کے روبرو بیٹھ کر التحیات پڑھے یعنی نہایت حمد و ثناء اور شکریہ ادا کرے اور اپنے لیے دعا مانگے اور سلام پھیر دے کہ ایک سفرِ باطنی سے باز آنا ثابت ہو جائے۔ یہ مختصر سا حال اہلِ اسلام کی نماز کا ہے اور آگے صحابہ رضی اللہ عنہم اور کاملین کا سجدہ میں رونا اور تمام عاشقانہ ہیئت بنا کے ادب کے ساتھ اس کی جنابِ کبریائی میں جانا بیان سے باہر ہے، اب اس نماز کو عیسائیوں اور ہنود وغیرہم مذاہب کی نماز سے مقابلہ کر کے دیکھئے تو دینِ الٰہی اور دینِ [illegible] میں اسی وقت تمیز ہو جائے [illegible] ہنود مجوس [illegible] کہ یہاں تو عناصر اور آفتاب وغیرہ مخلوقات کی پرستش ہے اور حضرات عیسائی بلاطہارت گرجا میں

جا کر باجا بجاتے اور خوب گاتے ہیں۔ آج کل دہلی میں پادریوں نے ایک پریم سبھا قائم کی ہے، جس میں طبلہ، سارنگی اور آلات لہو و لعب بجا کر حضرت مسیح کے بھجن گائے جاتے ہیں، جسے کان کے رسیا دور دور سے سننے آتے اور مزے اڑاتے ہیں۔ ؏ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

نکات : (۱) یُؤْمِنُوْنَ اور یُقِیْمُوْنَ اور یُنْفِقُوْنَ، متقین کی صفت میں تین جملہ فعلیہ آئے ہیں کہ جو تجدد اور حدوث پر دلالت کرتے ہیں تا کہ یہ بات سمجھی جائے کہ صرف ایک بار ان باتوں سے متصف ہو جانا متقی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ وقتاً فوقتاً ان اوصاف کو بالاختیار کام میں لانا چاہیے جیسا کہ جملہ فعلیہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ متقی کسی کا ذاتی اور خاندانی حصہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ کیسی بات ہے کہ جو ایسے کام کرے گا وہ متقی ہوگا اور جو نہ کرے گا تو جنابِ کبریائی سے اس لقب سے محروم رہے گا، خواہ برہمن ہو خواہ بنی اسرائیل ہو خواہ کیانی ہو اور خواہ نبی زادہ ہو خواہ ولی زادہ ہو یا پیر زادہ۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے۔

ذات بھانت پوچھے نا کو ہر کو بھجے سو ہر کا ہو

(۲) ان تینوں جملوں میں ترتیبِ طبعی کو ملحوظ رکھا ہے وہ یہ کہ جس کا مرتبہ مقدم تھا اس کو مقدم اور جس کا مؤخر تھا اس کو پیچھے ذکر کیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام عبادتوں اور سب نیکیوں کی جڑ ایمان ہے چند وجہ سے: (۱) یوں کہ یہ فعلِ قلب ہے جو تمام بدن کا بادشاہ ہے۔ (۲) یہ قوتِ نظریہ سے متعلق ہے جو قوتِ عملیہ سے مقدم اور اشرف ہے کیونکہ موت کے بعد یہ ادراکات انسان کے ساتھ باقی رہتے ہیں اور تکمیلِ نفس کرتے اور جہل کی ظلمت سے آزادی بخشتے ہیں۔ (۳) تمام نیکیوں اور اعمالِ صالحہ پر جو چیز انسان کو حرکت دیتی اور متوجہ کرتی ہے وہ صرف ایمان ہے، لہٰذا شرع نے ایمان والے کو گو اس کے عمل خراب ہوں ابدی جہنم سے محفوظ رکھا ہے اور جس کو ایمان نصیب نہیں اس کے اعمالِ صالحہ کا بھی اعتبار نہیں کیا۔ پس ایمان کو سب پر جملہ، یؤمنون بالغیب میں مقدم کیا، پھر اعمال میں نماز مقدم ہے کیونکہ (۱) یہ اس کی جناب میں حضوری اور اس کے دربارِ عالی میں باریابی ہے۔ (۲) اس میں روزہ اور دیگر عبادات بھی شامل ہیں کس لیے کہ جب تک مومن نماز میں رہتا ہے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ جماع کرتا ہے اور زبان بھی اس میں غیرِ ذکرِ الٰہی سے بند رہتی ہے اور دل اور تمام حواس بلکہ ہاتھ پاؤں سر سب اعضاء بھی مصروف ہو جاتے ہیں اور نماز کے لیے کپڑے اور مکان یعنی مسجد وغیرہ میں اللہ کے نام مال بھی صرف ہوتا ہے (۳) یہ دن رات میں کم از کم پانچ بار ادا کرنی پڑتی ہے، اور زکوٰۃ اور صدقہ کا تو کبھی کبھی اتفاق ہوتا ہے۔ (۴) اس میں غنی اور فقیر سب شریک ہیں اس لیے اس کو زکوٰۃ اور صدقہ پر مقدم کیا۔

(۳) مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ [1] میں من تبعیضیہ کو پہلے ذکر کر کے جتلا دیا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اپنے تمام مال کو دے کر فقیر ہو جاؤ اور پھر آپ مانگتے پھرو اور حیرانی اٹھاؤ کیونکہ یہ بات قانونِ شریعت کے برخلاف ہے۔ نہ عام طبائع اس کو قبول کر سکتی ہے بلکہ یہ کہ کسی قدر خدا کی راہ میں دو اور باقی اپنے نفس اور اہل و عیال کے لیے رکھو، گویا کنایۃً اسراف اور فضول خرچیوں سے بھی منع [2] کر دیا اور اس فضولی سے روک دیا کہ بیاہ شادی یا کسی اور تفاخر اور نامداری کے کام میں یا لڑکوں کی بسم اللہ، ختنہ، عقیقہ، دودھ بڑھانے میں اندھا بن کر صرف کیا جاوے کہ پھر آج جن کے روبرو اتراتے تھے کل ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں، اپنی جائیداد اور تنخواہ یا کسی اور آمدنی کو کسی سود خوار مہاجن کے پاس گرو رکھ کر تمام عمر کے لیے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس کا غلام بنا دیا جائے ہم آج کل ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ ان فضول خرچیوں سے

[1] کس لیے کہ خرچ کرنے سے مراد کارِ خیر میں خرچ کرنا ہے اور یہ بیہودہ خرچ ممنوع ہے کارِ خیر میں خرچ نہ ہونے کے سبب۔ ۱۲ منہ

[2] مَا رَزَقْنَا کا لفظ ہر ایک قسم کی نعمت کو شامل ہے پس جس طرح اپنا مال اللہ کے واسطے خرچ کرنے والے اس آیت کی فضیلت میں داخل ہیں۔ اسی طرح یہ فضیلت ان افراد کے لیے بھی ثابت ہے جو اپنی زبان یا ہاتھ پاؤں یا علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں ...

مسلمانوں کے باغ اور گاؤں اور مکانات ان ہندوؤں کے قبضہ میں آ گئے جو ابتدا میں ان کے ملازم تھے اور اب وہ آقا ہیں اور یہ ان کے قرضدار ہیں اور سود کی بلا میں گرفتار خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔

(۴) مال کا صرف کرنا اور خدا کی راہ میں دینا بھی جواں مردی کا کام ہے۔ بہت سے لوگ ایسے کنڑ ہیں کہ سینکڑوں روزے رکھوا لو، بیشمار نماز پڑھوا لو مگر دینے کا کچھ ذکر نہ کرو، چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے اور یہ بخل دنیا و آخرت میں مضر ہے۔ دنیا کا یہ ضرر ہے کہ جب اقارب اور ماں باپ پر سختی ہے اور وہ اس کی طرف احتیاج لاتے ہیں اور یہ موذی ٹالتا ہے تو ان کو نہایت رنج بلکہ حسد اور کینہ ہوتا ہے، جس سے اس کے ان کاروبار میں کہ جو عزیز اور دوستوں کی مدد اور اعانت سے متعلق ہیں فرق آتا ہے اور یہ سب کی آنکھوں میں حقیر اور مکروہ دکھلائی دیتا ہے، اس کے مرنے کی لوگ آرزو کیا کرتے ہیں۔ الغرض ان ہی وجوہ سے اس پر بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں اور حقداروں کی بددعائیں اس کے لیے مصائب بن جاتی ہیں۔ بخلاف اس کے کہ جب عزیزوں اور دوستوں اور اپنے بیگانوں پر لطف و کرم کرتا ہے تو گویا ان کے دلوں میں اپنی محبت کا سکہ جما دیتا ہے اور ہزاروں دلوں کو مٹھی میں لے لیتا ہے اسی لیے سخی کے ہزار سچے دوست اور بخیل کے اپنے عزیز و اقارب بھی دشمن ہوتے ہیں، اس کے علاوہ جب غریبوں اور یتیموں اور بیکسوں کی پرورش کا دستور نہ رہے گا اور نہ قوم کی درستی اور رفاہِ عام کے لیے اور مخالفوں کے دفع کے لیے۔ سب سے لے کر جمع کیا جاوے گا اور لوگ نہ دیں گے تو یہ تمام قوم مصیبت میں گرفتار اور مخالفوں کے غلام اور تابعدار بن جائے گی اور یہ دولتِ شخصی بھی نہ رہے گی اور آخرت کی یہ قباحت ہے کہ جب دل پر مال کی محبت نقش ہو جاتی ہے تو جب روح اس جسم کو چھوڑ کر اس عالم میں جاتی ہے تو اس محبوب کی جدائی میں بڑے رنج اٹھاتی ہے اور یہ بیجا محبت اس عالم میں سانپ اور بچھو اور آگ کی صورت میں ظہور کر کے خوب ستاتی ہے۔ اس لیے اس اہم مقصود کی تعمیل آسان کرنے کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام میں دو لفظ بڑھا دیے کہ جس سے یہ کلفتِ عمل آسان ہو گئی (۱) من تبعیضیہ ذکر کر کے یہ جتلا دیا کہ کل یا اکثر نہیں بلکہ تھوڑا سا صرف کرو۔ (۲) رزقنا کہہ کے یہ جتلا دیا کہ یہ جو کچھ تم دیتے ہو کچھ اپنے گھر کا نہیں دیتے ہو یہ ہم نے دیا تھا ہم پھر بھی دے سکتے ہیں۔ ہم پر توکل کر کے دو اس میں ایک اور بھی نکتہ ہے وہ یہ کہ مال کے علاوہ اور جو علم و ہنر عقل و تدبیر قوم اور ملک کے کار آمد ہو اس کو بھی مارزقنا شامل ہے، اس کو بھی صرف کرنا چاہیے۔

فائدہ : اس مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سے مراد عام ہے خواہ صدقہ ہو، خواہ زکوٰۃِ مفروضہ اور زکوٰۃ کا سر اور اس کے فضائل اور فوائد ہم آگے بیان کریں گے، انشاء اللہ۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ط ۴

اور ان کی (رہنما ہے) جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ کہ آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے اس پر اور قیامت کے دن پر (بھی) ایمان لاتے ہیں

ترکیب: الذین موصول ثانی اور ما انزل الیك معطوف علیہ اور انزل من قبلك معطوف، یہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں جملے مفعول ہوئے یؤمنون کے یؤمنون اپنے فاعل ضمیر اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر صلہ ہوا الذین کا الذین موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر معطوف ہوا پہلے الذین پر یا متقین پر۔

تفسیر: چونکہ یؤمنون بالغیب سے متبادر اور قریب الفہم خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور ملائکہ تھے اور کتبِ الٰہیہ اور قیامت کے دن پر بھی ایمان لانا ضروری تھا تو اس لیے اس عام بات میں سے ان کو خاص کر کے ذکر کیا اور یہ فصاحت اور بلاغت کی عمدہ بات ہے کہ کسی مطلب

ضروری کو (گو وہ پہلی عبارت سے سمجھا جاتا ہو) جداگانہ بعد میں بھی خصوصیت کے طور پر ذکر کردیا جائے یا یوں کہو کہ جب یہ سورہ نازل ہوئی (اعنی مدینہ میں) تو صاحبِ تقویٰ دو گروہ تھے ایک قدیم عرب کہ جو پہلے شرک و کفر میں گرفتار تھے اور پھر اسلام لائے۔ دوسرے اہل کتاب۔ عبداللہ بن سلام وغیرہ کہ جو پہلے مذہب یہودی یا نصرانی میں تھے اور پھر دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور دونوں گروہوں کو ان صفات میں شامل کرنا ضرور تھا، اس لیے اول جملہ تو اول فریق کے لیے اور دوسرا دوسرے کے لیے ذکر کیا گیا اور یہ بات بتلادی گئی کہ تقویٰ بغیر اس کے تمام نہیں ہوتا کہ جب تک خدا کے تمام صحیفوں پر ایمان نہ لائے یعنی وہ متقی ہیں کہ جو تجھ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تورات و انجیل وغیرہ پہلے انبیاء پر نازل ہوئیں سب کو برحق مانتے ہیں۔

متعلقات: بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے مراد عام ہے خواہ وحیِ متلو ہو کہ جس کو جبرئیل علیہ السلام خدا کی طرف سے الفاظِ مقررہ میں ادا کرتے تھے جس کو قرآن کہتے ہیں، خواہ وحیِ غیر متلو ہو کہ جو آنحضرت ﷺ پر بلا توسطِ جبرئیل یا بغیر الفاظِ مقررہ نازل ہوئی یا جو کچھ انکشافِ روحانی کے طور پر آنحضرت ﷺ کو معلوم کرایا گیا اور پھر آپ ﷺ نے اس کو ارشاد فرمایا سب پر ایمان لانا ضرور ہے جو ایک بات پر بھی ایمان نہ لاوے تو کافر ہو گا۔

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحیفے ہیں، یعنی حضرت ابراہیم و موسیٰ اور داؤد اور عیسیٰ علیہم السلام وغیرہم انبیاء کی کتابیں جو کہ ان کو خدا کی طرف سے ملی تھیں خواہ مضامین الہام ہوئے تھے اپنی عبارتوں میں انہوں نے جمع کر کے لکھوادیا تھا عبارتیں بھی دی گئی ہی عطا ہوئی تھیں۔ ہر چہ باشد والعلم عند اللہ تعالیٰ مگر سب کو برحق ماننا لازم ہے وہ بہت سے صحیفے تھے۔ بہت سے ان میں سے ایسے ہیں کہ جن کے نام بھی باقی نہ رہے اور بعض کے نام اور کسی قدر صحیح اور الٹ پلٹ مضامین اب تک بھی باقی ہیں۔ مشہور کتب سابقہ میں سے یہ ہیں تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ زبور جو حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی اور انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے۔

سوال: یہ اخیر جملہ عبداللہ بن سلام وغیرہ علماء بنی اسرائیل کی مدح میں واقع ہے کہ وہ قرآن پر بھی اور اس سے پہلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جن کتابوں پر ایمان رکھتے تھے وہ برحق تھیں اور اس زمانہ تک موجود تھیں جس لیے اور مواضع قرآن میں بھی تورات و انجیل پر عمل کرنے کی تاکید اور ان کا محلِ نزاع میں طلب کرنا بیان ہوا ہے اور وہ جو اس وقت کتابیں اہلِ کتاب میں موجود تھیں وہ یہ ہی ہیں کہ جواب ہیں جن کے مجموعہ کو بائبل اور اس کے دونوں حصوں کو عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کہتے ہیں۔ پس اہلِ اسلام پر اس وقت کی تورات و انجیل و زبور اور نامہ حواریون اور پولوس کے نامجات کی تصدیق ضرور ہوئی اور ان میں کفارہ اور الوہیتِ مسیح اور تثلیث موجود ہے، پس اس کا ماننا بھی مسلمانوں پر فرض ہوا اور پھر باوجود اس اقرار کے کیوں قرآن نے ان مسائل کو رد کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آسمانی کتاب نہیں۔

جواب: اس سوال کا (کہ جس پر بہت سے پادری بڑے نازاں ہیں) یہ ہے کہ وہ کتابیں بے شک برحق تھیں ہمارا بھی ایمان ہے۔ ہاں یہ بات کہ[1] اس زمانہ میں بھی وہ کتابیں موجود ہیں غیر مسلم ہے کیونکہ انجیل کی نسبت تو تمام عیسائیوں کو بھی اقرار ہے اور خود انجیلِ موجود کے دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجیل حضرت مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) کی نہیں نہ ان پر نازل ہوئی نہ انہوں نے اس کو تصنیف فرمایا، نہ ان کے زمانے میں تالیف ہوئی بلکہ سالہا سال بعد لوگوں نے سنے سنائے اور کسی قدر دیکھے ہوئے حالات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائے ولادت سے موت تک تاریخ کے طور پر جمع کر دیے ہیں اور بہت سے لوگوں نے جمع کیے تھے چنانچہ بعض کا اب نام و نشان بھی نہیں جیسا کہ یوحنا کی انجیل اخیر سے ثابت ہے اور بہت سی انجیلیں (تاریخ کی کتابیں) اب بھی موجود ہیں جیسا کہ انجیل برناباس وغیرہ مگر بھیڑ چال اکثر عیسائی ان

[1] یعنی نزولِ قرآن کے زمانہ میں۔ ۱۲منہ

چاروں[1] کو زیادہ مانتے ہیں اور بہت سے عیسائیوں نے وقتاً فوقتاً انکار بھی کیا ہے چنانچہ پولوس مقدس (کہ جن کو عیسائی بڑا رسول اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں) اپنے اس خط میں کہ جو گلتیون کو لکھا ہے اس کے پہلے باب میں یہ کہتا ہے کہ لوگوں نے انجیل کو الٹ پلٹ کر دیا اور اے لوگو تم اور جعلی انجیلوں کی طرف کیوں مائل ہو گئے اصل انجیل بلا توسط کسی انسان کے حضرت مسیح سے مجھ کو ملی ہے اس کے سوائے جو کوئی اور انجیل تم کو سنائے اس پر لعنت۔ انتہیٰ، ملخصاً اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چاروں انجیلیں پولوس کی وہ انجیل نہیں ہیں[2] پس یہ بھی مقبول و مردود ہیں جو شخص پولوس کے کلام کو الہامی مانتا ہو اس پر لازم ہے کہ وہ ان انجیلوں کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔

یہاں سے ثابت ہوا کہ پولوس اور برناباس اور شمعون اور پطرس وغیرہم اکابر عیسائی ان چاروں انجیلوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے نہ حواریوں کے زمانہ میں ان پر کچھ عملدرآمد رہا ہے اور اسی طرح جس کو تورات کہتے ہیں اس کے بھی صدہا مقامات سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدہا برس بعد کسی نے تاریخ کے طور پر جمع کی ہے چنانچہ بہت سے محققینِ اہل کتاب بھی اس بات کے قائل ہیں اور زبور میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے اور یہی حال اور کتابوں کا ہے اور ان کا محلِ نزاع میں طلب کرنا اور ان پر عمل کی مدح۔ سو یہ اس لیے تھا کہ ان کتابوں میں بیشتر عمدہ اور اصلی کتابوں کے مضامین پائے جاتے ہیں اور نیز مخاطبین ان کو تسلیم کرتے تھے اور اگر یہ کہیے کہ جب وہ اصلی کتابیں موجود نہ تھیں تو ان پر ایمان کیونکر لا سکتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگلے انبیاء موجود نہیں ان پر کس طرح ایمان لاتے تھے، اب ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ موجود نہیں ہیں، پھر کیا کوئی ہمارے ایمان لانے سے یہ کہہ سکتا ہے کہ عبدالحق مؤلف تفسیر حقانی کے زمانہ میں حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام موجود تھے اگر آنحضرت ﷺ کے عہد میں اصلی تورات و انجیل موجود ہوتی تو آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر تورات کے اوراق پڑھنے سے ناخوش نہ ہوتے اور نہ لا تصدقوا اہل الکتاب ولا تکذبواہم فرماتے، پس جب اصلی کتابیں اس عہد میں موجود نہ تھیں بلکہ ان کے نام پر اور کتابیں لوگوں کی تصانیف تھیں کہ جن میں اصلی کتابوں کے بھی مضامین مندرج تھے، تو ان میں کفارہ و تثلیث والوہیتِ مسیح اگر ہو بھی تو کب معتبر ہو سکتی ہے نہ ان پر ہم اہلِ اسلام کو ایمان لانا فرض ہے، بلکہ ایسے لغو مضامین سے احتراز واجب ہے، اگر قرآن نے ان کو رد کیا تو خوب کیا، ان کا اقرار کب کیا تھا، یہ قرآن کے حق ہونے کی دلیلِ قوی ہے، اس بحث کی تحقیق مقدمہ کتاب میں ہو چکی ہے جو چاہے وہاں دیکھ لے۔

نکات: (۱) ایمان کے بارے میں مبداء و معاد کو بترتیب اس آیت میں ذکر کیا ہے اول یؤمنون بالغیب سے ذات و صفاتِ باری کی طرف اشارہ کر دیا بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ میں قیامت کو بیان کر دیا اور اس عالم کی ابتداء انتہا بھی اشارتاً بتلادی۔

(۲) بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ میں صلہ کو مقدم کر کے اور يُوْقِنُوْنَ کو هُمْ پر مبنی کر کے اہلِ کتاب[3] کی پشت پر ایک تازیانہ سا مار دیا کہ آخرت پر یقین کرنا ان ہی کا حصہ ہے کہ جو قرآن کے ذریعہ سے تمام تفاصیلِ آخرت پر مطلع ہو گئے ہیں اور پھر ہر امر میں ان کو آخرت دکھائی دیتی ہے۔ دنیا اور اس کے منصب اور رسم کو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں سمجھتے، تعصب اور عناد کو بھی اس کے خوف سے کام میں نہیں لاتے بخلاف تمہارے، اول تو تمہاری کتبِ موجودہ میں آخرت اور اس عالم کی پوری کیفیت نہیں اس تورات میں بنی اسرائیل کا دوزخ اور جنت دنیا

[1] انجیل متی مرقس، لوقا، یوحنا۔

[2] کس لیے کہ مرقس اور لوقا تو خود پولوس کے شاگرد ہیں اور ان کی یہ تصنیف اس نامہ کے آگے موجود ہونا کسی معتبر ذریعہ سے ثابت بھی نہیں۔ رہی متی کی انجیل اور یوحنا کی اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ پولوس کے اس خط لکھنے سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں اور شائع ہو کر پولوس تک بھی پہنچ گئی تھیں تو ان کی نسبت یہ کیونکر صادق آ سکتا ہے کہ وہ بغیر کسی انسانی واسطے سے اس کو ملی تھیں۔ ۱۲منہ

[3] سوا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ کے۔

کی ناکامی (موت، مرض، قحط وغیرہ سے) یا کامیابی بتلائی ہے اور جو پہلے حصہ میں کچھ ہے تو معما سا ہے اور اس پر دنیا کی محبت اور قوم اور رسم
کی پابندی سے بے انصافی کرکے اس نبی اور کتاب کو تم جھٹلاتے ہو کہ جو تمہارے انبیاء اور کتبِ اصلیہ کی تصدیق اور مدح کرتے ہیں۔
جب یہ ہے تو آخرت پر تمہارا کیا خاک یقین ہے۔ اگر آخرت آنکھوں کے سامنے ہوتی تو یہ باتیں نہ کرتے۔ جب خدائے تعالیٰ متقیوں
کے اوصاف بیان فرما چکا یعنی سعادت کی جب شرح ہو چکی تو اب سعادت کے اس نتیجہ کو ذکر کرتا ہے کہ جو اس پر مترتب ہوتا ہے تاکہ سامع کو
رغبت پیدا ہو۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۵

وہی لوگ اپنے خدا کے رستہ پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں

ترکیب: اُولٰئِكَ مبتدا اور عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر، مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ ہوا، واؤ حرفِ عطف۔ اُولٰٓئِكَ
مبتدا اور هم المفلحون اس کی خبر هم مبتدا المفلحون خبر دونوں مل کر اُولٰئِكَ کی خبر ہوئے۔ یہ مبتدا اپنی خبر سے مل کر جملہ اسمیہ ہو کر
معطوف ہوا۔

تفسیر: پہلے کہا تھا کہ قرآن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے۔ اس کے بعد پرہیز گاروں کے اوصاف بیان کر دیے کہ
وہ ایسے ایسے اوصافِ حمیدہ رکھنے والے ہیں اور یہ اوصاف قرآن سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ طرح طرح کے پُراثر بیانوں سے قرآن نے
انسان کو ان اوصاف کا مشتاق کر دیا ہے اور جس میں یہ اوصاف ہوتے ہیں وہ ہدایت پر ہوتا ہے۔ یہ بدیہی بات ہے پس هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
ایک دعویٰ تھا اس کا ثبوت تقویٰ کے معنیٰ بیان کرکے کر دیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن سے پرہیز گاری حاصل ہوتی ہے اور پرہیز گاری خدا
کی ہدایت ہے یہاں تک سعادت کا بیان تمام ہوا اور کلام مدلل ہو گیا کہ قرآن سے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہدایت کا ثمرہ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ سے بیان فرما دیا کہ جس کو ہدایت خدا کی نصیب ہوتی ہے وہ فلاحِ دارین پاتا ہے۔

نکات: (۱) پہلے الذین کے مقابلہ میں اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ لایا گیا اور جس طرح دوسرا اَلَّذِيْنَ اس کا تتمہ تھا اسی طرح اس کے
مقابلہ میں تتمہ کے طور پر اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ذکر کیا تاکہ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کی جزا وہاں کی فلاح سن کر سامع کا دل بشاش
ہو جائے۔

(۲) جس طرح بالآخرة هم يوقنون میں ایمانداری کا ان پر حصر کیا تھا اس کے بعد فلاح کا بھی هم ضمیر مقدم کرکے ان ہی پر حصر
کر دیا جس سے معلوم ہوا کہ فلاح بھی ان ہی کا حصہ ہے کہ جو ایسے لوگ اور ان اوصاف سے متصف ہیں اور جو ایسے نہیں ہیں وہ کیسی ہی
ریاضت کریں چونکہ راہِ راست پر نہیں کبھی فلاح کو نہ پہنچیں گے۔ پس جو راستے کہ اسلام کے مقابلے میں ہیں اور اس کے برخلاف ہیں ان
سے کبھی مقصود حاصل نہ ہوگا خواہ کوئی کیسی ہی مشقت اٹھائے اس لیے ایک جگہ فرمایا ہے کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اور راستہ چونکہ
صراطِ مستقیم نہیں ان سے وصول الی المطلوب بھی نہیں

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

(۳) اس بات کے بتلانے کو (کہ اہلِ تقویٰ کو کامل ہدایت نصیب ہے اور وہ ہدایت خدا کی طرف کی ہے) لفظ علٰی بولا گیا تاکہ استعلا
اور تمکین پر دلالت کرے اور پھر ہدی کو من ربهم کے ساتھ مقیّد کیا تاکہ خدا کی طرف سے ہدایت کا ہونا پایا جاوے اور پھر اولئك اسم اشارہ لاکر

اور خبر کو معرفہ بنا کر اور بیچ میں هم فصل ذکر کرکے یہ بتلا دیا کہ یہ ہدایت اور فلاح متقین کا حصہ خاص ہے کہ جن میں اوصافِ مذکورہ پائے جاتے
ہیں۔

فائدہ: خوارج اور معتزلہ وغیرہ کہ جو کبیرہ کیا بلکہ صغیرہ سے بھی ابدی جہنم کا مستحق بناتے ہیں۔ (عیسائیوں کا بھی اسی کے قریب عقیدہ
ہے) اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ جنسِ فلاح کا موصوفین مذکورین پر حصر کر دیا ہے۔ پس جو نماز نہ پڑھے گا، زکوٰۃ نہ دے گا خارج از
ایمان ہو کر ہمیشہ جہنم میں جاوے گا، بعض ظاہری بھی ان کے شریک ہیں۔ ان کا جمہور اہلِ اسلام کی طرف سے یہ جواب ہے کہ فلاح سے
مراد بذریعہ الف لام فلاحِ کامل ہے۔ پس جو ان اوصاف سے متصف نہ ہوگا تو اس کو فلاحِ کامل نصیب نہ ہوگی، نہ یہ کہ مطلقاً فلاح سے محروم
ہوگا کیونکہ انتفاءِ فلاح کامل (یعنی مقید) سے انتفاءِ فلاح مطلق لازم نہیں آتا۔ علاوہ اس کے قرآن و احادیث کے متعدد مواضع سے گناہ گارانِ
اسلام کا فلاح پانا جنت میں جانا ثابت ہے۔

جبکہ خدا تعالیٰ نے اہلِ سعادت کا حال اور مآل بیان فرمایا تو ضرور ہوا کہ اہلِ شقاوت کا بھی حال و مآل بیان کیا جاوے تاکہ بحکم
تعرف الاشياء باضدادها سعادت کا مقام خوب سمجھ میں آ جاوے، سو اہلِ شقاوت دو طرح کے ہیں، ایک وہ کہ جو ظاہراً و باطناً حق کے
مخالف ہیں ان کو زبانِ شرع میں کافر کہتے ہیں۔ دوم وہ کہ جو بظاہر موافق اور باطن میں حق کے سخت مخالف ہیں ان کو منافق کہتے ہیں چونکہ
مومنوں سے پوری مضادت (یعنی ظاہراً و باطناً مخالفت) کفار سے ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ پہلے کفار کا حال بیان فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ۶
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝ ۷ ع
ع ۱ ۷

بے شک جو لوگ انکار کر چکے ہیں ان کے لیے تو آپ کا ڈر سنانا (اور) نہ سنانا (دونوں) برابر ہیں وہ ایمان نہ لائیں گے کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں
اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کو بڑا عذاب ہوتا ہے۔

ترکیب: اِنَّ اسم مشبہ اَلَّذِيْنَ موصول كفر و ا اس کا صلہ، موصول اور صلہ دونوں مل کر اس کا اسم ہوئے اور سوآء بمعنی استوا اس کی خبر
ہے اور اس کے مابعد جو ہے وہ اس مصدر کا فاعل بن کر مرفوع ہے گویا کلام یوں ہوا ان الذین کفروا مستوعلیہم انذارک وعدمہ۔ ختم فعل لفظ
الله فاعل علی جار قلوب مجرور مضاف هم مضاف الیہ۔ مضاف اور مضاف الیہ دونوں مل کر معطوف علیہ اور علی سمعهم معطوف۔
معطوف اور معطوف علیہ دونوں مجرور ہوئے جار کے پھر متعلق ہوئے ختم سے۔ ختم اپنے فعل اور متعلق سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ غشاوة مبتداء
مؤخر اور علٰی ابصارهم ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر۔ مبتداء خبر مل کر جملہ اسمیہ ہوا اور جملہ سابقہ پر اس کا عطف ہوا، عذاب موصوف
الیم صفت دونوں مل کر مبتداء موخر اور ولهم خبر مقدم جو متعلق ثابت کے ہے مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ ہو کر پہلے جملہ پر معطوف ہوا۔

تفسیر: پیشتر خدائے تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے اس پر یہ خیال گزرتا تھا کہ کافروں کے لیے کیوں ہدایت نہیں،
حالانکہ ضرور ان ہی کے لیے ہدایت کا ہونا تھا کیونکہ متقی تو خود ہدایت پر تھے اس کا اپنے کلام میں اشارتاً یہ جواب دیا کہ کافر اور متقی سے مراد
ازلی کافر اور ازلی متقی ہیں گو بالفعل ایک شخص طرح طرح کی برائیوں اور انواع و اقسام کے کفر و شرک میں مبتلا ہے، مگر وہ ازل میں انوارِ الٰہی
سے حصہ پا چکا ہے تو اس کو ضرور قرآن سے ہدایت ہوگی اور وہ ایمان بھی لاوے گا اور اچھے اعمال بھی کرے گا اور جو ازل میں اس نور سے

محروم رہا وہ انجام کار محروم ہی رہے گا، اس کو قرآن اور حضرت کے وعظ و پند سے کچھ نفع نہ ہوگا، کس لیے کہ اس میں سرے سے صلاحیت ہی نہیں۔ [۱] اس عدمِ صلاحیت اور اس ازلی بدنصیبی کو جو ازل میں خدا کی طرف سے ظہور میں آئے مہر اور پردہ سے تعبیر کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ عالم اور جس قدر اس عالم کی چیزیں ہیں بلکہ جس قدر اور صدہا عالم فرض کیے جائیں سب خدا تعالیٰ کے وجودِ حقیقی کے اظلال اور پرتوے ہیں۔ اس عالمِ حسی میں جو کچھ وقتاً فوقتاً پایا جاتا ہے وہ اسی وقت موجود نہیں ہو جاتا بلکہ عالمِ مثالی میں موجود ہو چکا ہے۔ وہاں سے وقتاً فوقتاً ظہور کرتا اور پردۂ غیب سے باہر آتا ہے گو وہ شے حادثِ ذاتی یا زمانی سہی مگر اب پیدا نہیں ہوئی اور یہ بات تنزلاتِ ستہ کے معانی میں غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس عالمِ حسی سے ہزارہا سال پیشتر عالمِ مثالی میں خدائے تعالیٰ کی ایک تجلی ہوئی کہ جس میں تمام کائنات عالمِ حسی اس کے دربارِ فیض آثار میں اپنی استعداد کے موافق ہر چیز سے فیض یاب ہوئے

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے
جس چیز کو جس شخص کے قابل نظر آیا

اس جلہ حضرت آدم علیہ السلام [۲] سے تمام ذریت جو ہونہار تھی، چیونٹیوں کی طرح سے نکل پڑی اور اس کا آفتابِ جمال ہر شخص پر نور افگن ہوا، جن میں استعدادِ خداداد کی وجہ سے کچھ بھی صفائی تھی، ان پر وہ نور پڑا اور چمکا اور جن کی اصل میں کدورت تھی ان پر وہ نور نہ پڑا، (جس طرح اس عالم میں آفتاب نکلتا ہے تو شفاف چیزیں منور ہو جاتی ہیں اور مکدر نہیں چمکتیں) اور ہر شخص نے اس کی ربوبیت کا اقرار کیا جن پر وہ نور پڑا تھا وہ لوگ اس عالمِ حسی میں اہلِ سعادت یعنی مومن کہلائے اور جن پر وہ نور نہ پڑا وہ اسی شقاوت کی تاریکی میں اس عالم میں آئے اور کافر و منافق کہلائے۔ قرآن حقائقِ اشیاء کو نہیں بدل سکتا جو وہاں محروم رہا ان کو یہاں کون منور کر سکتا ہے، اس لیے حضرت کی تسلی اللہ تعالیٰ نے کر دی اور جو لوگ دراصل اہلِ سعادت ہیں مگر عوارض وغیرہ سے تاریکی میں گرفتار ہیں ان کو ابھارتا ہے کہ ہمارے قرآن اور آپ کے بیان میں اے نبی کچھ قصور نہیں لیکن جو ازلی بدنصیب ہیں ان کی تقدیر میں بھلائی نہیں۔ واضح ہو کہ اس خداداد ہدایت اور صلاحیتِ ازلی کے لحاظ سے لوگوں کی سات قسم ہیں کس لیے کہ بنصِ قرآنی یا لوگ شقی ہیں یا سعید فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ اور اشقیاء کو اصحاب الشمال یا اصحاب المشئمہ بھی کہتے ہیں، پھر ان اشقیاء کی دو قسم ہیں۔ اول مطرودین کہ جن پر بہیمیت اور تاریکی ہیولانیت نے ایسا غلبہ کیا ہے کہ ان پر نورِ الٰہی پڑنے کی قابلیت ہی نہیں رہی اور چو طرفہ اندھیریوں اور ہر قسم کی تاریکیوں نے ان کو ایسا گھیر لیا کہ گو وہ بظاہر جنسِ انسان میں ہیں لیکن درحقیقت جانور ہیں ان کو کافر بھی کہتے ہیں دیوار اور مہر اور پردہ جو قرآن میں مذکور ہے اس سے یہی ظلمات مراد ہیں۔ ان ہی کی نسبت فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ

۱ یعنی جو ازلی گمراہ اور سیاہ قلب ہیں ان کے لیے قرآن ہدایت نہیں بخشتا خواہ آپ وعظ و نصیحت کریں یا نہ کریں ان کے دلوں میں ایمان قبول کرنے کی قابلیت نہیں الخ۔ ۱۲ منہ

۲ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ خدا نے مخلوق کو ظلمت (طبیعت) میں پیدا کیا اور ان پر اپنا نور ڈالا پس جس شخص پر وہ نور پڑ گیا اس نے ہدایت پائی اور جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہوا اور میں اسی لیے کہتا ہوں کہ احکامِ ازلیہ پر قلم خشک ہو گیا۔ رواہ احمد والترمذی۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے پشتِ آدم سے بمقام نعمان عہد لیا پس اس کی پشت سے تمام ذریت کو نکال کر اس کے سامنے پھیلا دیا اور غنی و فقیر سب کو دکھلا دیا اور انبیاء چراغوں کی مانند چمکتے نظر آئے پھر خدا نے آدم کے روبرو سب سے عہد لیا کہ میں تمہارا رب ہوں تم اس پر قائم رہنا پھر اس کے یاد دلانے کو دنیا میں انبیاء بھیجوں گا تاکہ تم قیامت کو یہ عذر نہ کرو کہ ہم کو معلوم نہ تھا یہ کہ ہمارے آباء و اجداد نے شرک کیا ہم ان کے مقلد رہے ہم پر کیا گناہ ہے انتہی ملخصاً، رواہ احمد۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں پہلے ہی سے علمِ الٰہی میں قرار پا چکا ہے (متفق علیہ) اور فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میرے ہاتھ میں یہ دو کتابیں کیسی ہیں؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ داہنے ہاتھ کی کتاب میں خدا نے تمام اہلِ جنت کے نام لکھ دیے ہیں اور ان کی قوم اور باپ کے نام بھی مندرج ہیں اور بائیں میں تمام اہلِ دوزخ کے نام

كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔

سوال: صدہا کافروں کو ایمان لاتے دیکھا ہے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم پیشتر کافر تھے پھر ایمان لائے۔ متقی اور ہادی اور مہدی کہلائے۔

جواب: جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے وہ دراصل کافر نہ تھے اور ان کو جو اس وقت کافر کہا جاتا تھا تو بحکمِ حالتِ موجودہ ورنہ وہ حقیقت میں متقی تھے جو ہدایت پر آ گئے اور وہ ازلی کافر جیسا کہ ابوجہل وغیرہ ہرگز ایمان نہ لائے نہ لاویں گے نہ ان میں صلاحیت ہے۔ اس لیے ان کی نسبت خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (کہ ہم نے بہت سے جن اور آدمی جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں ان کو دل ملے ہیں مگر سمجھتے نہیں، ان کو آنکھیں دی گئی ہیں مگر ان سے دیکھ نہیں سکتے، کان دیے گئے ان سے سن نہیں سکتے، وہ لوگ بمنزلہ چارپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ اور یہی غافل ہیں)۔ دوم وہ لوگ کہ جن میں کسی قدر استعدادِ ذاتی تو تھی کہ جو کبھی طبیعت کی تاریکیوں میں اس طرح چمکتے تھے جس طرح گھنگور گھٹا میں بجلی، مگر ان لوگوں نے جب جاہ و جلال اور شکوک و شبہات اور پابندی رسم و رواج سے اور شہوت پرستی اور مستی سے اس نور کو بجھا دیا اور اس ذاتی استعداد کو مٹا دیا اس گروہ کو منافق کہتے ہیں۔ ان کا تفصیل سے پچھلی آیتوں میں ذکر آتا ہے اور سعیدوں کی بھی دو قسم ہیں ایک قسم مقربین اور سابقین۔ دوسری اصحاب الیمین جن کو اصحاب المیمنہ و مقتصدین بھی کہتے ہیں۔ پھر مقربین کی بھی دو قسم ہیں اول مجتبیٰ، دوم منیب۔ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ مجتبیٰ کو اہلِ سلوک محبوب اور منیب کو محب بھی کہتے ہیں اور کبھی مجذوب و سالک بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ انبیاء و صدیقین ہیں اور اسی طرح اصحاب الیمین کی بھی کئی قسمیں ہیں اہلِ فضل و ثواب کہ خدا کے فضل سے مقصود کو پہنچے ہیں اور اسی امید پر ایمان و اعمالِ صالحہ عمل میں لاتے ہیں۔ دوم اہلِ عفو کہ جن کے اچھے اعمال میں کچھ برے بھی شامل ہیں، مگر یا تو ان کی قوتِ ایمان اور نورِ معرفت اور رجاءِ صادق سے خدائے تعالیٰ اس گناہ کو معاف کر دیتا ہے یا توبہ اور اس کے مقابلہ میں گریہ و زاری اور اعمالِ صالحہ سے وہ داغ مٹ جاتا ہے خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ کا یہی لوگ مصداق ہیں اور فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ ان ہی کے حق میں فرماتا ہے۔ سوم معذبین کہ بقدرِ گناہ ان کو عذاب ہوگا اور یہ عذاب کبھی تو دنیا ہی میں بصورتِ نقصانِ مال و جان و بیماری و خواری ظہور کرتا ہے اور گناہوں سے صاف کر جاتا ہے جیسا کہ آیات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور کبھی مومن کی روح پر ایک عجیب دہشت اور سخت بے کلی اور تاسف لاحق ہوتا ہے سو وہ بھی اس کا کفارہ ہو جاتا ہے اور کبھی آخرت میں وہ برے اعمال آگ اور سانپ بچھو کی صورت میں ظہور کر کے اس کی روح کو صدمہ پہنچاتے ہیں اور جب ایک مدت تک اس تکلیف کو پا لیتا ہے تو پھر روح منور ہو جاتی ہے اور جنت میں آرام پاتی ہے اور کبھی انبیاء اولیاء و ملائکہ کی شفاعت سے خلاصی ہو جاتی ہے۔ ان پانچ گروہوں کا حال الذین انعمت علیہم میں اور ھدی للمتقین الخ میں ہو چکا اور اشقیاء کے اول فریق کافر کا ان آیات میں بیان ہوا کہ قرآن سے ان کو ہدایت نہیں اور اشقیاء کے دوسرے فریق منافق کا اس کے بعد ومن الناس من یقول الخ میں خدا بیان فرماتا ہے۔

متعلقات: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ہر چند ختم کا اسناد اللہ کی طرف اہلِ حق کے نزدیک اسنادِ حقیقی [۱] ہے لیکن مہر کرنے سے اور ان کی

۱ معتزلہ کے نزدیک اسناد مجازی ہے، اہلِ حق کے نزدیک مجاز لغوی اعنی مسند معنی مجازی میں مستعمل ہے باقی اسنادِ حقیقی ہے۔ معتزلہ اور عیسائی کہتے ہیں کہ خدا کی طرف کفر کا پیدا کرنا اور مہر اور گمراہ کرنا منسوب کرنا نہایت بے ادبی اور اس کی ذاتِ مقدس میں عیب لگانا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی عبارتوں کو مجاز پر محمول کرنا چاہیے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ لوگ اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھے، عقلائیوں کہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس عالم کا وہی خالق ہے تو اعیان و اعراض سب ... خواہ وہ جوہر ہو خواہ عرض (کوئی کام وغیرہ) قدرتِ مستقلہ نہیں اور جو ہو تو وہ خالق ←

آنکھوں پر پردہ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ درحقیقت خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر اس طرح سے مہر لگا دی ہے کہ جس طرح کسی برتن کا منہ بند کر کے اس پر لاکھ سے اس لیے مہر لگا دیتے ہیں کہ اس کے اندر اور کوئی چیز نہ جانے پاوے نہ اندر کی چیز باہر آنے دے اور یچ کا کوئی ٹاٹ یا ترپال کا پردہ ان کی آنکھوں پر ڈال دیا ہے۔ شاید کسی کم فہم نے یہ بات سمجھ کر قرآن مجید پر اعتراض کیا ہو بلکہ اس سے مراد وہ جبلی کجروی اور طبعی تاریکی ہے کہ جس کی وجہ سے کفر و معصیت کی طرف بے خود ہو کے دوڑتا ہے اور امورِ فطرت سے اس کو دلی نفرت ہوتی ہے۔ جس طرح کہ گوہ کے کیڑے کو خوشبودار پھول سے جبلی نفرت اور گندگی سے رغبت ہوتی ہے گویا کہ خوشبو کی طرف رغبت کرنے سے اس کیڑے کے دل پر مہر ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں پر قضاء و قدر سے حجاب پڑا ہوا ہے۔ سو یہ ایک حالت ہے کہ جس کو خدا نے استعارہ کے طور پر ختم اور غشاوہ سے تعبیر کیا ہے اور کبھی اس حالت کو طبع سے تعبیر کیا ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اور کبھی اغفال سے وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اور کبھی اقساء سے وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً اس حالت کا فاعلِ حقیقی خدائے تعالیٰ ہے کیونکہ یہ جتنے امور جبلی ہیں سب قضاء و قدر سے ہیں اور اسی لیے ان کو خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس میں اس کی ذات پاک پر کوئی عیب نہیں لگتا۔ کس لیے کہ اس کا کاسب بندہ ہے اس کو کسی قدر اس میں دخل ہے اس لیے اس کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں اور برائی کا بوجھ اس کے سر پر دھرتے ہیں اور اسی لیے اتمامِ حجت کو ان کے پاس بھی خدا کے انبیاء علیہم السلام پیغامِ ہدایت لاتے ہیں اور پھر وہ اپنی نافرمانی کی سزا دنیا و آخرت میں پاتے ہیں۔ اب جس طرح یہ سوال بیجا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کو مختلف استعداد پر کیوں بنایا اور بعضوں کی جبلت میں یہ تاریکی کیوں رکھی ہے اور پھر ان کو عذاب کیوں دیا؟ کس لیے کہ یہ کسی قدر اختیار پر مبنی ہے اور مختلف استعداد اور رنگ برنگ کی قابلیت دینے

← مستقل ماننے پڑیں، کہ جس کی تسلیم میں سب سے بڑھ کر بے ادبی ہے۔ پس جب یہ ثابت ہوا کہ بندہ کو اپنے افعال پر قدرتِ مستقلہ نہیں ورنہ کبھی کوئی ناکامیاب نہ ہوتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بندہ اپنے افعالِ ارادیہ میں پتھر اور لکڑی کی طرح مجبور نہیں اس کے ارادی کاروبار اس طرح سے سرزد نہیں ہوتے کہ جس طرح رعشہ میں بے خود ہاتھ ہلا کرتا ہے تو ضرور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ نہ جبرِ محض ہے نہ قدرِ محض بلکہ خالق ہر چیز کا اللہ تعالیٰ اور کسی قدر اختیار بندہ کو بھی دیا ہے خواہ وہ ارادہ ہو یا کچھ اور۔ جو کچھ ہو مگر اس کی وجہ سے بندہ کو کاسب کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے بھلائی برائی اس کی طرف منسوب ہوئی ہے اور جزا و سزا پاتا ہے

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

پس اس گمراہی وغیرہ افعال کو خالق ہونے کی وجہ سے خدا کی طرف بھی منسوب کر سکتے ہیں اور خالق ہونے میں کوئی برائی نہیں نہ اس برائی سے وہ متصف ہو سکتا ہے، مثلاً تلوار بنانے والے کا کوئی قصور نہیں نہ اس کو قاتل کہہ سکتے ہیں بلکہ جس نے تلوار کو مارا۔ اسی طرح رنگریز کو اسود نہ کہیں گے بلکہ کپڑے کو جس پر (سواد) سیاہی قائم ہوئی اور چونکہ بندہ کاسب ہے، بمقامِ ذم اس کی طرف بھی نسبت ہوگی جس کی وجہ سے وہ برائی بھلائی سے متصف ہوگا اور چونکہ شیطان یا کوئی اور گمراہ کرنے والا سبب ہوتا ہے تو مجازاً فعل کو سبب کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے جس طرح کہ شیطان کو اسی علاقہ سے مضل کہتے ہیں اسی طرح قرآن یا نبی علیہ السلام کو ہادی۔ نقلاً یوں کہ قرآن و احادیث میں بکثرت یہ انتساب موجود ہے اور حقیقی معنی کو جب تک کوئی مانع نہ ہو، چھوڑنا جائز نہیں اور بائبل میں بھی بہت سے مقامات پر ایسی عبارتیں پائی جاتی ہیں کہ جن میں ان امور کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے از ان جملہ پولوس اپنے دوسرے خط کے چوتھے باب میں جو قرنیتوں کو لکھا ہے یوں کہتا ہے (۳) اور ہماری انجیل اگر پوشیدہ ہووے تو انہیں پر پوشیدہ ہے جو ہلاک ہوتے ہیں۔ (۴) کہ اس جہاں کے خدا نے ان کی عقلوں کو جو بے ایمان ہیں تاریک کر دیا ہے تا کہ مسیح الخ کی جلال والی انجیل کی روشنی ان پر نہ چمکے، یہ عبارت صاف صاف ان آیاتِ قرآنیہ کے مضمون کی تصدیق کر رہی ہے اگلے فقرے میں قدرت کو بالکل خدا کی طرف منسوب کرتا ہے کہ قدرت کی بزرگی ہماری طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے۔ انتہیٰ،، اور ایک جگہ کہتا ہے کمہار سے برتن نہیں کہہ سکتا کہ تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا اسی طرح بندہ نہیں کہہ سکتا، اس پر پادری صاحب اگر قرآن پر اعتراض کریں تو کمال بے انصافی ہے۔

میں وہ خودمختار ہے، جس کو جو کچھ دیا اس کا فضل ہے اور جس کو نہیں دیا تو اس پر کچھ ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح برتن کا کمہار سے یہ کہنا بیجا ہے کہ تو نے مجھ پر ظلم کیا جو آبدست کرنے کی بدھنی بنایا بادشاہوں اور معشوقوں کے پینے کا پیالہ نہ بنایا؟ اس مسئلہ جبر و قدر میں زیادہ گفتگو کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ اس کے اسرار پورے پورے عقل میں مشکل سے آتے ہیں، اس لیے ہم بھی قلم روکتے ہیں۔[1]

قلب: ایک گوشت صنوبری کو کہتے ہیں کہ جو بائیں جانب پہلو میں الٹا لٹکا ہوا ہے اور اسی لیے اس کو قلب کہتے ہیں اور اس میں جگر سے آ کر خون پکتا ہے اور پھر اس کے لطیف ابخرے روحانی بنتے ہیں اور شرائین کے ذریعے سے تمام بدن میں دوڑتے ہیں اور حس و حرکت کا منشا بھی یہی روح ہے جس عضو میں وہ روح نہ جائے تو وہ بے حس و حرکت ہو کر مر جائے اور یہ روحِ ہوائی کہلاتی ہے اور اسی کو نسمہ بھی کہتے ہیں اور روحِ حقیقی یعنی نفسِ ناطقہ کا اصل مرکب یہی ہے اور اس کا مرکب تمام جسم ہے۔ جب اس روح کو ہوائی میں (کہ جس کو روحِ حیوانی اور روحِ طبی بھی کہتے ہیں) سخت فساد آتا ہے تو روحِ حقیقی کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور قطعِ تعلق کا نام موت ہے اور اصطلاحِ شرع میں قلب لطیفہ انسانی کا نام ہے کہ جس سے انسانیت قائم ہے اور جس سے شوق و محبت پیدا ہوتی ہے اور جس سے شرع کے اوامر و نواہی بجالاتے ہیں اور کبھی قلب سے عقل بھی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اور کبھی نفس یا روح بھی مراد ہوتی ہے اس آیت میں یہی لطیفہ مراد ہے کیونکہ استدلال کرنا اسی کا کام ہے اور یہی الہامِ الٰہی کی جگہ ہے اور یہی حق شناسی کی دوربین ہے۔ پس جب اس پر مہر ہو گئی تو یہ سب باتیں مفقود ہو گئیں۔

نکات: (۱) ختم اللہ الخ یہ اس دعوے کی (کہ ان پر ہدایت کا کچھ اثر نہ ہوگا وعظ کرنا نہ کرنا برابر ہے) دلیل ہے اور یہ دلیل اس لیے بیان ہوئی کہ بظاہر اس دعوے کا ثبوت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے ثبوت میں فرمایا کہ یہ اس لیے کہ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے یعنی ان کی جبلت میں تاریکی ہے اور بہیمیت کی اندھیریوں نے ان کو ہر طرف سے محیط گھیر کر اس امر کے قابل ہی نہ رکھا۔

(۲) کسی چیز کا دریافت کرنا تین طرح پر ہوتا ہے۔ یا تو حس سے یا خبرِ صادق سے، یا خود عقل غور کر کے دریافت کرے۔ مگر امورِ آخرت اور خدا کی ذات و صفات حس سے تو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اب ان کو یا خود عقل یقین کرے یا خبرِ صادق سے ان کی تصدیق ہو۔ پھر جب کہ ان کی ازلی گمراہی ثابت کرنی مقصود تھی اور اس لیے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ فرمایا جس سے ادراکِ عقلی اور خبرِ مخبرِ صادق سن کر ایمان لانے کی نفی ہو گئی اور یہ دونوں سبب مفقود ہو گئے یعنی ان کے دلوں پر مہر ہے عقل سے ان امور کا کیونکر یقین کریں اور ان کے کانوں پر بھی مہر ہے وہ مخبرِ صادق کی خبر کیونکر سنیں اور کس طرح ایمان لائیں۔ لیکن کسی قدر حس سے امورِ حسیہ پر ایمان لانے کا احتمال تھا وہ یہ کہ نبی علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان لاویں۔ سو یہ بھی بات ان کو نصیب نہیں۔ وہ ہر چند بیشمار معجزات دیکھ چکے ہیں لیکن بمنزلہ نابینا کے ہیں اس لیے امورِ حسیہ پر بھی ایمان نصیب نہ ہونے کے سبب عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ فرما دیا کہ یہ جنم کے اندھے بھی ہیں ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔

(۳) مہر ایسی چیز پر کیا کرتے ہیں جس پر ہر طرف سے تصرف ہو سکے، پس مہر اس کو ہر طرف سے بند کر دیتی ہے۔ چونکہ کان میں ہر طرف سے اور دل میں ہر طرف سے بات پڑ سکتی ہے ان کے لیے کوئی جہتِ خاص نہیں اس لیے ان پر تو مہر لگانا فرمایا اور آنکھ چونکہ سامنے

---

[1] اہلِ سنت کا اعتقاد ہے کہ انسان کا ہدایت پانا یا گمراہ ہونا سب اللہ کی طرف سے ہے انسان کے پیدا ہونے کے پہلو یہ سب امور ظہور پذیر ہو چکے ہیں اس اعتقاد کو ایمان بالقدر کہتے ہیں یہ مضمون قرآن مجید کی اس آیت میں ظاہر ہو گیا اور آئندہ بھی بہت سی آیتوں سے اس کا بیان آئے گا۔ علیٰ ہذا احدیث میں بھی ... (حقانی)

سے دیکھتی ہے اس کے لیے جہتِ خاص ہے تو اس پر پردہ پڑنا فرمایا کہ سامنے سے پردہ پڑ گیا دیکھنا بھی جاتا رہا۔

جب خدائے تعالیٰ دعوے اور اس کی دلیل بیان فرما چکا تو بعد میں اس پر جو اثر مرتب ہونے والا ہے وہ فرماتا ہے کہ ولھم عذاب الیم یہ عذاب خواہ آگ سے ہو خواہ طوق و زنجیر سے خواہ اور کسی طرح سے کہ جس کی کیفیت ہم کو معلوم نہیں جو کچھ ہو وہ روح کی تاریکی اور اس کی جبلی کج روی کا اثر مرتب ہے جس طرح پانی کا اثر برودت اور آگ کا اثر حرارت ہے، اسی طرح انسان کے برے اعمال کا اثر خاص ہے کہ جو مرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ اعاذنا اللہ منہ، جب خدائے تعالیٰ فریقِ اشقیا کو بیان کر چکا تو اب دوسرے فریق منافقین کا حال بیان فرماتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں کہ جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان دار نہیں ہیں۔

ترکیب: یقول فعل ضمیر ہو راجع مَنْ کی طرف اس کا فاعل اور آمنا باللہ الخ جملہ فعلیہ اس کا مقولہ فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ ہو کر صفت ہوئی مَنْ نکرہ موصوفہ کی من جار الناس مجرور جار مجرور متعلق ثابت یا ثبت کے ہوا جو رافع ہے من کا تقدیرِ کلام یوں ہوئی ومن الناس ناس یقولون یہ جملہ خبریہ ہوا اس کا عطف اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ الخ پر یا قصہ کفار مصرین پر ہے اور ممکن ہے کہ من کو موصولہ مانا جاوے ھم ما کا اسم اور بمؤمنین خبر۔ اسم و خبر مل کر جملہ خبریہ ہوا اور واوِ حالیہ کے ساتھ مل کر حال ہوا۔ فاعل یقول سے جو من ہے من لفظ مفرد ہے مگر معنی میں تثنیہ اور جمع کے بھی آتا ہے اسی لیے علمِ اصول میں اس کو عام گنا ہے۔ پس با اعتبارِ لفظ کے یقول صیغہ واحد بولا گیا اور با اعتبار معنی کے ھم اور امنا جمع کے صیغے بولے گئے۔ بعض یوں بھی کہتے ہیں کہ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الخ مبتدا اور من الناس ثابت کے متعلق ہو کر اس کی خبر ہوئی۔ تنبیہ: کفار کے حال کو بطور عطف کے اس لیے نہیں بیان کیا تھا کہ وہاں متقین کا حال بطورِ ضمنِ کتاب کے تھا اس لیے مضادت مانع عطف ہوئی اور چونکہ کفار کا حال مستقلاً بیان کیا دوسری قسم منافقین کا عطف اس پر زیبا ہوا۔

تفسیر: مدینہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو بظاہر تو یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ اور رسول ﷺ اور قیامت پر ایمان لائے اور مسلمان ہوئے تاکہ مسلمانوں میں مل کر منافعِ دنیا حاصل کریں اور ہر قسم کی سختی سے جو ان پر پیش آنے والی تھی اسلام کو آڑ بنا کر بچیں مگر یہ ایمان درحقیقت ایمان نہ تھا اور بغیر خلوصِ دل زبان سے کہنا خدائے تعالیٰ علام الغیوب کے آگے کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا، اس لیے خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ کرنے کے لیے فرمایا کہ یہی لوگ فریبی ہیں ہرگز مومن نہیں۔ ان لوگوں کو شرع میں منافق کہتے ہیں ان میں سب کا سرگروہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ حضرت ﷺ کے مدینے میں تشریف لانے سے پہلے لوگوں نے چاہا تھا کہ اس کو سرداری کی پگڑی بندھوا دیں اور مدینہ کا سردار بنا دیں لیکن جب حضرت ﷺ تشریف لائے اور روح کی زندہ کرنے والی باتوں سے تمام جہالت کی تاریکیاں لوگوں میں سے دور ہو گئیں اور لوگوں کو ایک نئی زندگانی کا مزہ آ گیا تو پھر ان کے روبرو اس دنیا پرست کی کچھ بھی وقعت نہیں رہی۔ اس لیے اس شخص کو حضرت ﷺ اور اہلِ اسلام سے حسد اور رنج پیدا ہوا مگر غلبۂ اسلام کی وجہ سے یہ خبثِ باطن کو ظاہر نہ کر سکا اور لوگوں کے ساتھ بظاہر آپ بھی اسلام میں شمار ہوا کیا۔ لیکن یہ اور اس کے رفیق یہود جو مدینہ کے آس پاس بستے تھے اور دس پانچ اور اسی کے ہم قوم ہمیشہ در پردہ اسلام کی بیخ کنی کرتے رہے اور اس آفتابِ عالمتاب پر گرد اڑانے اور اس چراغِ جاودانی کے بجھانے میں ہر طرح کی کوشش کرتے رہے۔ سورۂ براءت اور منافقون اور اس سورہ اور دیگر سورتوں میں ان کے اقوال و افعالِ ناشائستہ کا جواب مذکور ہے اور جو کچھ غزوات میں انہوں نے فتور برپا کئے ہیں وہ بھی مسطور، جس سے خدا نے نفاق کی جڑ کو بالکل کاٹ دیا۔

متعلقات: نفاق کی چند قسم ہیں: اول یہ کہ زبان سے اسلام اور ایمان ظاہر کرے مگر در پردہ صاف منکر ہو۔ دوم یہ کہ در پردہ صاف منکر تو نہ ہو مگر یقین بھی نہ ہو بلکہ متردد اور تذبذب ہو۔ سوم یہ کہ دل میں تصدیق تو ہو مگر کامل نہ ہو اور گناہوں اور حبِ دنیا اور غلبۂ شہوات نے اس کو ایسا کر دیا ہو کہ یہ دنیا کے منافع کو ایمان پر مقدم سمجھتا ہو، دنیا کی خاطر لشکرِ اسلام کا مقابلہ او و اہلِ اسلام کی بربادی اور دین کی ہجو اس کے نزدیک کچھ مشکل نہ ہو۔ یہ تینوں خدا کے نزدیک سخت کافر ہیں اور جہنم کے سب سے اسفل طبقہ میں رہیں گے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ، ان تینوں قسم کے منافق مدینہ میں موجود تھے۔ چہارم یہ کہ قال حال کے مطابق نہ ہو۔ زبان سے کچھ کہے دل میں کچھ اور ہو جس کو تقیہ[1] کہتے ہیں۔ اگرچہ اس سے کافر نہیں ہوتا مگر یہ بھی انہیں منافقین کا شیوہ ہے اور سراسر ناراستی ہے، نورِ ایمان اور صداقت کی روشنی ذرا بھی مکر و فریب کو گوارا نہیں کرتی چہ جائیکہ اس پاک مذہب کا رکن قرار دے کر اس کے نورانی چہرہ پر دھبہ لگایا جاوے۔ بلکہ نبی ﷺ کے فیضِ صحبت سے صحابہ رضی اللہ عنہم تو اپنی حالتِ قلبیہ میں ذرا بھی فرق آنے کو نفاق سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حنظلہ بن ربیع اسدی رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں تو منافق ہو گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا تو یہ کیا کہتا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ جب ہم نبی ﷺ کے پاس سے گھر آتے ہیں اور بیوی بچوں میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ کیفیت جو وہاں ہوتی ہے اس کو بھول جاتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میرا بھی یہی حال ہے۔ تب دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں گئے اور حنظلہ رضی اللہ عنہ نے یہ حال بیان کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ اے حنظلہ! اگر تم اسی حالت میں رہو کہ جو میرے پاس ہوتی ہے اور یادِ الٰہی میں رہو تو ملائکہ تم سے گلی کوچوں میں اور بستروں پر مصافحہ کیا کرتے مگر یہ بات کبھی کبھی ہوتی ہے۔

نکات: (۱) منافقین دعویٰ کرتے تھے ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں پس خدا تعالیٰ نے بھی ان کی ادعا کے موافق بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کو خاص کیا تاکہ معلوم ہو کہ جس میں تم کو دعویٰ ہے اس میں بھی تم سچے نہیں کیونکہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے تو اس مکر اور فریب کو خدا اور اس کے رسول ﷺ سے جائز نہ رکھتے اور باتوں میں تو تمہارے ایمان کا کیا اعتبار ہے یعنی جہاں تم کو سچائی کا دعویٰ ہے وہیں جھوٹے ہو، چہ جائیکہ جہاں تم کو خود نفاق مقصود ہو۔

(۲) اگرچہ سیاقِ کلام یہ چاہتا تھا کہ ان کے جواب میں ما آمنوا کہا جاتا تاکہ جواب مطابق ہوتا مگر برعکس اس کے مَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ فرمایا تاکہ ان سے ایمان کی نفی اچھی طرح سے ہو جائے۔ کس لیے کہ زمانہ ماضی میں ان کو ایمان سے باہر بیان کرنا جیسا کہ ما آمنوا سے سمجھا جاتا اس امر میں اتنا فائدہ نہیں بخشتا کہ جو ان کو ہمیشہ کے لیے مَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ سے ایمان سے باہر کر دینا بخشتا ہے۔ علاوہ اس کے ما آمنوا میں بمقابلہ جواب صرف اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے کی نفی سمجھی جاتی اور جبکہ ماھم بمؤمنین کہا اور نفی کو با سے مؤکد کر دیا تو بالکل ایمان سے بے بہرہ ہونا ثابت کر دیا کہ ان کا ایمان نہ اللہ پر ہے، نہ قیامت پر، نہ نبی ﷺ اور قرآن اور اس کے معجزات پر۔ اس کے بعد خدائے تعالیٰ ان کے اس فعل سے جو غرض ہے اس کو بیان فرماتا ہے:

[1] اہلِ اسلام میں اول صدی کے اخیر میں جو کچھ خلافت کی بابت زیادہ نزاع ہوئی تو ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرفداری کا یہاں تک دم بھرنے لگا کہ جس کو وہ خود بھی جائز نہ رکھتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ وہ ایک فریق ہو گیا جس کو شیعہ کہتے ہیں اور یہ فریق اکثر عراق ایران میں پھیلا اور ایران میں مجوس کے ہاں یہ تقیہ ہمیشہ سے چلا آتا تھا۔ چنانچہ دساتیر نامہ ساسان اول کے (۴۰) جملہ میں مرقوم ہے ان کی تقلید سے یہ مسئلہ اس گروہ نے بھی اپنے مذہب میں جاری کیا اور جہاں کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آئمہ اہلبیت سے خلفاءِ ثالثہ کی مدح منقول ہے اس کے جواب میں اس تقیہ سے کام لیا اور کہہ دیا کہ وہ تقیہ کرتے تھے۔ اس لغویات کو روشن دماغ شیعہ بھی ہرگز نہیں تسلیم کرتے اور آئمہ کبار کی نسبت حق پوشی اور نفاق کا عیب لگانے سے از حد ڈرتے ہیں۔ ہاں جو لوگ ملاؤں کی تقلید اور ان کے رطب و یابس روایات حکایات پر غش ہیں وہ اس کو مانتے ہیں۔ ۱۲ منہ

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ۹

وہ اپنے نزدیک اللہ اور ایمانداروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔

ترکیب: یخادعون فعل ضمیر ھم جو راجع ہے منافقین کی طرف اس کا فاعل اور لفظ اللہ اور الذین آمنوا موصول صلہ سے مل کر معطوف ہوا لفظ اللہ پر مفعول فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ بن کر کلام مستانف ہوا یا یہ حال ہے فاعل یقول سے۔ اور مایخدعون فعل بافاعل احدا مفعول محذوف مستثنیٰ منہ الا انفسھم مستثنیٰ فعل فاعل اور مستثنیٰ منہ اور مستثنیٰ سے مل کر جملہ فعلیہ ہو کر بذریعہ واو حال ہوا فاعل یخادعون سے اور مایشعرون جملہ فعلیہ بذریعہ واو کے اس مَا يَخْدَعُوْنَ الخ سے حال واقع ہے۔

تفسیر: یعنی وہ منافقین جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اپنے زعم میں خدا سے اور مسلمانوں سے فریب بازی کر رہے ہیں حالانکہ یہ فریب اپنے تئیں دے رہے ہیں کیونکہ خدا اعلام الغیوب ہے۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی اور وہ مومنوں کو آگاہ کرتا رہے گا۔ سو ان پر تو کچھ بھی اس مخادعت (فریب بازی) کا اثر نہ پڑا الٹا ان ہی پر پڑا کہ دنیا میں بھی رسوائی ہوئی آخرت میں عذاب شدید میں مبتلا ہوں گے مگر ان کے حواسِ سلیمہ میں فتور آ گیا کہ ان کو یہ موٹی سی بات بھی دکھائی نہیں دیتی کہ خدائے تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اس کا الٹا وبال ہم ہی پر پڑے گا۔

متعلقات: خدع لغت میں بری بات چھپانا اور اس کے برعکس دکھانا تاکہ کسی کو فریب دیا جائے۔

نفس ذات شے کو کہتے ہیں خواہ جوہر ہو یا عرض یا دونوں سے بری جیسا کہ ذات باری تعالیٰ لقولہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم مافی نفسك الآیہ اور روح کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ حی کا نفس اسی سے قائم ہے اور قلب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ محلِ روح ہے اور خون کو بھی کہتے ہیں کیونکہ نفس کا قوام اسی سے ہے اور پانی کو بھی کیونکہ اس کی طرف نفس کو زیادہ حاجت ہے اور رائے کو بھی کیونکہ یہ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔

شعور احساس کو کہتے ہیں اور انسان کے مشاعر اس کے حواس ہیں اور اصل اس کی شعر (بال) ہے اور جو لباس جلد کے بالوں سے ملا ہوتا ہے۔ اسی لیے عرب اس کو شعار کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے پھر اور وسیع معانی میں بھی اس لفظ کا اطلاق آتا ہے۔

نکات: (۱) چونکہ منافقین یہ فریب بازی ہمیشہ کرتے تھے اور آیندہ بھی ان سے یہ فعل متوقع تھا تو اس رمز کے لیے مضارع سے ان کے اس حال کو تعبیر کیا تاکہ تجدد اور حدوث پر اور آیندہ کے صدور پر دلالت کرے۔

(۲) ان کی پرلے درجے کی حماقت ثابت کرنے کو وَمَا يَشْعُرُوْنَ کہا يَعْلَمُوْنَ نہ کہا کیونکہ شعور محسوسات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور علم محسوسات معقولات دونوں کے لیے پس جب مَا يَشْعُرُوْنَ کہا تو گویا یہ ثابت کر دیا کہ اس مکر کی برائی ایک محسوس چیز ہے مگر چونکہ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے وہ دیکھ نہیں سکتے اب اگلی آیت میں اس فعل کی وجہ بیان فرماتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں:

فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ ۱۰

ان کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے سو اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا ہے اور ان کو (مرنے کے بعد) سخت عذاب ہے اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے

ترکیب: مرض مبتداء موخر فی قلوبھم خبر دونوں مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا زاد فعل اللہ فاعل ھم مفعول اول مرضاً مفعولِ ثانی۔ فعل فاعل اور دونوں مفعولوں سے مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔ عذاب موصوف الیم اس کی صفت پھر بما کانو ایکذبون جملہ بتاویل مصدر کے ہو کر متعلق کائن کے ہوا اور الیم کی صفت ہوا یہ موصوف اپنی صفات سے مل کر مبتدا لھم خبر مبتداء خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا اور اس کا عطف کلامِ سابق پر ہے۔

تفسیر: یعنی ان کی یہ فریب بازی اس لیے ہے کہ ان کی فطرت میں صحت و سلامتی نہیں اور دل پر مرضِ ناراستی عارض ہے۔ پس جوں جوں فطرت کو درست کرنے والی اور روح کو صحت بخشنے والی باتیں نبی علیہ السلام پر نازل ہوتی گئیں ان کی برخلافی سے اس اصلی مرض میں ترقی ہوتی گئی (ع) مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ جس طرح جسمانی امراض کا نتیجہ موت ہے اسی طرح روحانی امراض کا ثمرہ اس عالم میں عذابِ الیم ہے۔ آسمانی پانی ہر درخت اور تخم کی بالیدگی کا باعث ہے مگر کسی درخت میں اسی پانی سے کانٹے اور کڑوے پھل آتے ہیں اور جس کا تخم اچھا ہوتا ہے اس سے عمدہ اور خوشبودار پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ اسی طرح قرآن جو تخمِ روح کے لیے آسمانی پانی ہے اس سے مومنوں کو شفا ہوتی ہے اور جن کی جبلت میں کجی ہے ان کو زیادہ مرض پیدا ہوتا ہے پھر وہ مرض اس عالم میں بصورتِ عذابِ الیم ظاہر ہوتا ہے۔

متعلقات: مرض: لغت میں بدن کی اس حالتِ غیر طبعی کو کہتے ہیں کہ جو افعالِ طبیعہ میں خلل انداز ہوتی ہے اور مجازاً ان اعراضِ نفسانیہ کو بھی کہتے ہیں کہ جو نفس کے کمالات میں مخل ہوتے ہیں جیسا کہ جہل اور بدعقیدگی اور کینہ اور حسد اور شہوت اور حبِّ دنیا اور جھوٹ اور ظلم وغیرہ کیونکہ جس طرح مرض سے کمالِ بدن یا حیات زائل ہو جاتی ہے اسی طرح ان سے اعراضِ حیاتِ ابدی اور اس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں اور روح پر تاریکی پیدا ہوتی ہے۔

الیم: ای مولم (الم جس کو درد کہتے ہیں) ادراکِ ناملائم ہے۔ ہر چند بدن میں ناملائم حالت تفرق اتصال زخم و شگاف ہو مگر جب تک ادراک نہ ہوگا جیسا کہ دوا بے ہوشی کلورافارم میں ہوتا ہے کچھ دکھ نہ معلوم ہوگا۔ اسی طرح اس عالم میں روح کو طلسمِ دنیا کی کلورافارم نے بے ہوش کر رکھا ہے جب موت کے بعد یہ بے ہوشی دور ہوگی تو ہر شخص کو اپنے روحانی امراض کا دکھ معلوم ہوگا اور اس عالم کو ٹھڈ بندی کا راز مفہوم ہوگا۔

باش تابند روئے بکشایند　　باش تاباتو درحدیث آیند
تاکیاں رانشاندہ بردر　　تاکیاں را گرفتۂ دربر

کذب: یعنی جھوٹ اس خبر کو کہتے ہیں کہ جو خلافِ واقع ہو بعض کہتے ہیں کہ جو خلافِ اعتقاد ہو بعض کہتے ہیں کہ جو اعتقاد اور واقعہ دونوں کے خلاف بیان ہو اس کو کذب کہیں گے۔

نکات: (۱) اس آیت میں بھی خدائے تعالیٰ نے امرِ واقعی کی رعایت رکھی فِىْ قُلُوْبِهِمْ مرض سے یہ بات بتلا دی کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی یا سعادت و شقاوت جو کچھ پیش آتی ہے وہ اصلی استعداد اور جبلی قابلیت کے موافق پیش آتا ہے جو ازلی مریض ہیں اور ان کی روح کا مزاج فاسد ہے ان سے اس عالم میں ویسے ہی افعالِ نامطلوب سرزد ہوتے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ان امور کا اصل خالق خدائے تعالیٰ ہے گو مجازاً کسی اور کی طرف بھی اسناد ہو اور وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ سے یہ بات بتلا دی کہ بندہ اپنے افعال میں مجبور محض نہیں بلکہ اختیار رکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کے افعال پر سزا اور جزا مرتب ہوتی ہے۔

(۲) جس طرح اس آیت بما کانوا الخ سے ان لوگوں کے خیالِ باطل کی رد کی طرف اشارہ ہے کہ جو کہتے ہیں کہ یہ عالم محض توہمات و خیالات ہیں کسی چیز کی کچھ اصل نہیں۔ نہ کوئی کرم (فعل) مؤثر ہے نہ کوئی گیان (علم) آخرت میں نافع ہے نہ مضر جیسا کہ حکماءِ سوفسطائیہ اور بیدانتوں کا مذہب ہے اور عیسائی بھی بموجب فتویٰ پولوس شریعت سے آزاد ہیں۔ اسی طرح فزادھم اللہ مرضًا سے اس فریق کے

خیالِ باطل کی طرف اشارہ ہے کہ جو افعال (کرم) ہی کو مؤثر بالذات جانتے ہیں اور خدائے تعالیٰ کے وجود وقدرت کے منکر ہیں۔ جیسا کہ بودہ میمانسا اہلِ ہند میں سے اس کے معتقد ہیں۔

(۳) بما کانوا سے عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کر دیا تاکہ جو لوگ بطورِ تناسخ یا بطورِ ترقیِ مال وجاہ اسی عالم میں جزاء وسزا کے قائل ہیں ان کا خیال باطل ورَدّ ہو جائے۔

فائدہ: عذاب کو کذب سے متعلق کیا تاکہ اس سے جھوٹ کا حرام ہونا ثابت ہو، اس لیے اسلام میں بالاتفاق جھوٹ بولنا حرام قرار دیا گیا۔ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے قبح پر اکثر بنی آدم متفق ہیں۔ اب اگلی آیتوں میں خدائے تعالیٰ ان کے مرضِ قلب کو ثابت کرتا ہے کہ وہ بری باتیں کرتے ہیں اور ان کو بھلی سمجھتے ہیں۔ جس طرح کوئی مریض کڑوی چیز کو میٹھی یا بالعکس تصور کرتا ہے اور یہ جہلِ مرکب ہے۔ حکماء کے نزدیک یہ مرض لاعلاج ہے۔ پس فرماتا ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ⑫

اور جب ان سے (یہ) کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد نہ کیا کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ دیکھو یہی تو مفسد ہیں لیکن ان کو خبر ہی نہیں

ترکیب: اذا حرف شرط قیل فعل مجہول لھم متعلق قیل کے لاتفسدوا فی الارض مفعول مالم یسم فاعلہ ہوا قیل کا۔ یہ دونوں مل کر شرط ہوئے اور قالوا فعل۔ انمانحن مصلحون جملہ اس کا مفعول فعل اپنے فاعل ضمیر ھم اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر جواب ہوا شرط کا شرط وجزا مل کر جملہ شرطیہ ہو کر معطوف ہوا یکذبون یا یقول پر ان مشبہ بفعل ھم اس کا اسم اور ھم المفسدون مبتداء خبر بن کر اس کی خبر۔ ولکن کلمہ استدراک اس کا مابعد لایشعرون جملہ استدراکیہ۔ الا حرف تنبیہ جو صدر جملہ پر تنبیہ مخاطب کے لیے آتا ہے۔ یہ جملہ خبریہ مستانفہ ہے جواب میں ان کے قول کے۔

تفسیر: یعنی مرضِ قلب ان پر یہاں تک غالب آ گیا ہے کہ ان کو نیک وبد میں تمیز نہیں۔ کس لیے کہ جب کوئی مومن یا رسول خود خدائے تعالیٰ ان سے یہ فرماتا ہے کہ تم ملک میں فساد نہ ڈالو، یعنی گناہ اور چغل خوری اور غمازی نہ کیا کرو تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں وہ اس غمازی اور گناہ کو بھلائی سمجھ گئے۔ خدا فرماتا ہے کہ دیکھو یہی لوگ مفسد ہیں مگر بے شعور ہیں کہ ان کو اپنے فساد اور صلاح میں تمیز نہیں۔ معاذ اللہ جب انسان اپنے عیب کو عیب نہیں سمجھتا تو بڑی خرابی میں پڑتا ہے اور صدہا آدمی دنیا میں ایسے اندھے ہیں کہ ان کو حقیقتِ امر معلوم نہیں ؎

چشم باز و گوش باز و ایں ذکا
خیرہ ام از چشم بندیِ خدا

ایک عالم اس جہلِ مرکب میں گرفتار ہے۔ کوئی خدا کا تقرب سمجھ کر بتوں کو پوجتا ہے، کوئی توحید سمجھ کر تثلیث کی دلدل میں گرفتار ہے، کوئی بامیدِ سلطنت آگ کی دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ کوئی ہوسِ خام کو دل میں پختہ کر کے دریا کے کنارے آسن جمائے بیٹھا ہے۔ ہزاروں لوگ گنگا میں غوطہ لگا کر گناہوں سے پاک سمجھ کر دور دراز سے آتے اور مشقت اٹھاتے ہیں۔ اہلِ دنیا شب وروز میں دینِ بیع وشراء میں غرق ہیں، نہ مرنے کی مہلت اور نہ جینے کی فرصت۔ صدہا دنیا پرست حکام کی خوشامد اور ترقیِ مناصب میں شب وروز گرم اور اسی کو فوزِ کبیر اور مقصدِ اصلی سمجھتے ہیں۔ الغرض ؎

ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد

لیکن جب اس طرف سے آنکھ بند ہو گی اور اس عالم کی چیزیں دکھائی دیں گی تو حسرت وافسوس ہو گا۔ اللھم ارنا حقائق الاشیاء کماھی۔

متعلقات: فساد : کسی شے کا اعتدال سے باہر ہونا اور جو نفع کہ اس سے متصور ہے اس کے قابل نہ رہنا۔ اس کی نقیض صلاح ہے یعنی جس طرح فساد میں بگڑنا ہے ویسا ہی صلاح کے معنی میں سنورنا معتبر ہے۔ اس جگہ فساد سے مراد بقول ابن عباس وحسن وقتادہ معاصی ہیں کیونکہ جب دنیا میں گناہ گاری، چوری، قتل، زنا، فتنہ انگیزی، شرک وکفر کی اشاعت ہوتی ہے تو انتظامِ عالم میں خلل آ جاتا ہے اور قیل کے فاعل یعنی کہنے والے اس جگہ مومن یا رسول یا خدا تعالیٰ ہے نہ کفار واشرار۔[1]

نکات: جس طرح منافقین نے بزعمِ فاسد اپنے فساد کو صلاح بنایا اور اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ میں صلاح کا انحصار اپنے ہی نفس پر کیا تھا اسی طرح اس کی رد میں لفظ الا اور اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ کلمۂ انحصار فرمایا کہ بلاشک یہی مفسد ہیں تاکہ کلام مقتضیِ حال کے مطابق ہو جائے۔ یہ ان منافقوں کی دوسری حرکتِ ناشائستہ تھی۔ اب تیسری حرکت ناشائستہ یہ ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ⑬

اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ تم بھی جیسا کہ اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کیا ہم اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح احمق ایمان لے آئے دیکھو جی یہی لوگ بیوقوف ہیں مگر (یہ) جانتے نہیں۔

ترکیب: اذا حرف شرط قیل فعل مجہول قول اس کا مفعول مالم یسم فاعلہ محذوف اور لھم متعلق ہے قیل کے اور آمنوا فعل بافاعل اس کی تفسیر کما امن الناس بتاویل آمنوا ایمانا مثل ایمان الناس مصدر محذوف کی صفت قالوا فعل بافاعل اور انومن الخ جملہ اس کا مفعول جواب ہوا شرط کا۔ الا حروف تنبیہ انھم الخ اسم وخبر ان کی مل کر جملہ خبریہ مستانفہ ہوا اور ولکن حرفِ استدراک لایعلمون جملہ استدراکیہ۔

تفسیر: یعنی جب ناصح ان سے یہ کہتا ہے کہ ایمانِ حقیقی لاؤ جس سے ترکِ فتنہ وفساد اور نفرتِ دنیا اور اعراض از لذاتِ فانیہ حاصل ہو اور وہ ایمان مردانِ خدا کے ایمان کے مثل ہو کہ جو نفع ونقصانِ دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس عالم کو فانی سمجھ کر عالمِ باقی کے

[1] پس وہ جو تفسیر الفرقان صفحہ ۲۲ میں نیچر مفسر کہتے ہیں (قولہ و اذ اقیل لھم ان آیتوں میں اس گفتگو کا اشارہ ہے جو منافق اور کافر آپس میں کرتے تھے یعنی کافر سمجھتے تھے کہ منافقوں کا اس طرح ظاہر میں اپنے تئیں مسلمان جتانا فساد ڈالنا ہے تو وہ ان سے کہتے تھے کہ تم فساد مت ڈالو اور اپنے تئیں مسلمان مت جتلاؤ جس طرح اور لوگ سچ مچ مسلمان ہو گئے ہیں تم بھی ہو جاؤ۔ الخ) سراسر غلط ہے چند وجہ سے، اول تو یوں کہ کافر منافقوں کے اسی ایمان کو فساد نہیں سمجھتے ہیں بلکہ عین صلاح کہ مسلمانوں سے فریب کر کے ان کے راز ہاتھ لگتے ہیں۔ دوم ان کے قول کی تصدیق کلامِ الٰہی میں آنا اس کی عظمت پر دال ہے حالانکہ یہ خلافِ مقصود ہے۔ سوم کافروں کی یہ ہرگز مرضی نہ تھی کہ تم سچ مچ کے مسلمان ہو جاؤ۔ علاوہ اس کے کوئی مفسر اس کا قائل نہیں بلکہ تفسیر کبیر میں یوں لکھا ہے قولہ صفحہ ۲۸۷ ولا یجوز ان یکون القائل بذلك من لایختص بالدین و النصیحة۔ الخ، خان صاحب کو جب اس قدر وقوف نہ تھا تو تفسیر لکھنے کی کیا ضرورت پڑی تھی

لیے جان و مال صرف کرنے میں کچھ دریغ نہیں کرتے۔ درحقیقت یہی آدمی ہیں ورنہ جو لوگ کہ عالمِ باقی کے مقابلہ میں ان چندروزہ نعمتوں پرمفتون ہیں مجنون ہیں۔ پس اس کے جواب میں وہ منافق کہتے ہیں کیا ہم بیوقوفوں کی مانند ایمان لائیں۔ خیالی جنت و دوزخ کے لیے مطالب و مقاصدِ دنیا چھوڑ بیٹھیں؟ میاں دنیا دین سے مقدم ہے' عالمِ آخرت اور وہاں کے نعماء کس نے دیکھے ہیں جس کو یہاں کے عیش و آرام ہے اس کو ہر جگہ آرام ہے۔ جس طرح ہو سکے دنیا ہاتھ آوے ؎

خرس باش وخوک باش ویا سگِ مردار باش
ہرچہ باشی باش عرفی اند کے زردار باش

اور کسی نے کہا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت واعظ
دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

یہ لطفِ زندگانی اور یہ مزے اور یہ جلسے کون چھوڑے، ادھار پر نقد کو کون ہاتھ سے دے اور کیا ہم ان لوگوں کی مانند ہو جاویں کہ جو دنیا اور ہر طرح کے عیش چھوڑ کر شب و روز خدا کی یاد میں مشغول ہیں۔ اپنے منافع پر بھی نظر نہیں کرتے، مناسب ہے کہ دنیا سازی کی جائے۔ اگر ان مسلمانوں کا دور دورہ رہا تو ان کے یار بنے رہے اور در پردہ مخالفوں سے بھی سازش رہی کیونکہ اگر ان کا وقت آئے گا تو بھی ہمارا مدعا ہاتھ آئے گا۔ ایک طرفہ ہو جانا عقلمندوں کا کام نہیں۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ خبردار یہی لوگ احمق اور بیوقوف ہیں کیونکہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کیسے کیسے نوجوان حسین اور کیسے کیسے بااقبال اور ذی اقتدار اور کیسے کیسے بادشاہِ ہفت کشور اور کیسے کیسے عیش و آرام اٹھانے والے ہزاروں من مٹی کے تلے آتے جاتے ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

اب نہ ان کے وہ سامانِ عیش ہیں نہ اربابِ جلسہ ہیں نہ وہ مال وزران کے پاس موجود ہے۔ پھر جب آخر کار ایک روز یہ عیش و آرام ہاتھ سے جانا ہے (غایۃ الامر دس بیس برس بعد) تو اس چندروزہ دنیا پر دل لگانا عبث ہے ؎

قابو میں ہوں میں تیرے گراب جیا تو پھر کیا
خنجر تلے کسی نے ٹک دم لیا تو پھر کیا

پس اس عالمِ بقاء کے مقابلہ میں کہ جس کا زمانہ غیر متناہی ہے ان لذائذِ حسیہ پر مفتون ہونا اور اس یقینی امر کے لیے کچھ بندوبست نہ کرنا حماقت اور پرلے درجے کی سفاہت ہے۔ جس طرح نادان بچے ذرا سی مٹھائی سے بہل جاتے ہیں اور عمدہ چیز کو ہاتھ سے دے دیتے ہیں اسی طرح یہ لوگ ہیں اور جب عالمِ آخرت حق ہے اور وہاں جانا بھی حق ہے اور اس کے ہادی بھی برحق ہیں اور ان کا وعدہ بھی سچا ہے تو پھر مذبذب رہنا اور بھی حماقت ہے، مگر وہ امراضِ قلب میں گرفتار ہیں ان کو اس امر کی خبر نہیں۔

متعلقات : سفہ: ہلکاپن عرب بولتے ہیں سفہتِ الریح الشیء اڑا لے گئی اس چیز کو ہوا پھر اس کا اطلاق بیوقوفی اور حماقت میں بسبب خفیف ہونے عقل کے آتا ہے سفیہ، بروزن فعیل اسم فاعل بمعنی بیوقوف سفہا اس کی جمع ہے سفاہت کے مقابلہ میں اناءت (کہ جس کوتائی بھی کہتے ہیں) اور حلم آتا ہے کہ جس کے معنی سوچ اور سمجھ کے ہیں۔

میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں انسان ہے اور فلاں آدمی نہیں یعنی کامل انسان ہے کامل آدمی نہیں اور عرب میں بھی اس معنی کے لیے استعمال آیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

بلادٌ بها كنا ونحبها
الناس ناس والزمان زمان

یعنی ''ہمارا وطن عمدہ تھا ہم وہاں رہا کرتے تھے اور اس سے محبت کرتے تھے جبکہ آدمی آدمی تھے اور زمانہ زمانہ تھا۔'' یعنی جب اچھا زمانہ اور اچھے لوگ تھے۔ پس اس تقدیر پر اہلِ ایمان ہی آدمی ہیں کیونکہ جو ایسے نہیں وہ آدمی نہیں۔ یا لام عہدی ہے جس سے اشخاصِ معہود مراد ہیں یعنی صحابہ کبار رضی اللہ عنہم۔

نکات : (۱) فساد کے ذکر میں تو منافقین کو لَا یَشْعُرُوْنَ کا لقب دیا اور ایمان نہ لانے کے بارے میں لَا یَعْلَمُوْنَ فرمایا۔ اس میں ایک یہ نکتہ ہے کہ فساد امرِ محسوس ہے اور لَا یَشْعُرُوْنَ بھی محسوسات میں بولا جاتا ہے بخلاف ایمان کے کہ اس پر مطلع ہونا ازقسمِ علم ہے کہ جو نظر و تامل سے حاصل ہوتا ہے۔ دوم سفہ ایک قسم کا جہل ہے اس کے مقابلہ میں علم کا لانا کمال بلاغت ہے۔

(۲) منافقوں کے قبح بیان کرنے میں ایک اور نکتہ مرعی رکھا ہے وہ یہ کہ لَا یَشْعُرُوْنَ اور لَا یَعْلَمُوْنَ کے مفعول کو ذکر نہیں کیا تاکہ ان کی بے شعوری اور جہالت عام طور پر ثابت ہو جائے یعنی یہ بات نہیں کہ وہ فلاں بات نہیں جانتے بلکہ کچھ بھی نہیں جانتے۔

(۳) نصیحت کو پورا کر دیا اول جملہ میں لَا تُفْسِدُوْا اور دوسرے میں آمنوا فرمایا کیونکہ نیکی کے دو جز ہیں بری باتوں سے بچنا اور اچھی باتوں کو عمل میں لانا۔ اب خدائے تعالیٰ ان کی چوتھی خصلتِ نازیبا بیان فرماتا ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ⑮

اور جب ایمانداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیاطین کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے دل لگی کیا کرتے ہیں حالانکہ اللہ ان سے دل لگی کیا کرتا ہے اور ان کو ان کی گمراہی میں ڈھیل دے رہا ہے وہ اندھے ہو رہے ہیں

ترکیب : واؤ حرفِ عطف کہ جو کلامِ سابق پر ہے اذا حرفِ شرط لقوا کہ دراصل لقیوتھا فعل بافاعل اور الذین آمنوا موصول وصلہ جملہ اس کا مفعول یہ اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر شرط ہوا قالوا فعل بافاعل امنا مفعول سب مل کر جواب ہوا شرط کا اور جملہ شرطیہ ہو کر معطوف علیہ ہوا۔ اذا حرفِ شرط خلوا فعل بافاعل الی شیاطینھم متعلق ہوا خلوا کے یہ سب شرط ہوئی اور قالوا فعل بافاعل انا معکم جملہ اسمیہ اس کا مفعول اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ جملہ اسمیہ اس کی تاکید یا بدل مل کر جواب ہوا شرط کا اور جملہ شرطیہ بن کر عطف ہوا پہلے جملے پر۔ لفظ اللہ مبتداء یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ جملہ اس کی خبر معطوف علیہ و حرف عطف یَمُدُّهُمْ جملہ فعلیہ معطوف فِیْ طُغْیَانِهِمْ متعلق ہے یمد کے یَعْمَهُوْنَ جملہ فعلیہ حال ہے یمدھم کی ضمیر ھم مفعول ہے۔

تفسیر : یعنی جب وہ منافق مسلمانوں سے ملتے تھے تو ان کے خوش کرنے کو کہتے تھے کہ ہم بھی ایمان لائے اور جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو نہایت تاکید سے کہتے کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں ہم تو مسلمانوں سے بطور دل لگی کے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ محمد رسول اللہ کہہ دیتے ہیں، وہ بیوقوف سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ہماری اس بات کو سچ جان کر ہمیں اپنے رازوں اور دلی ارادوں سے مطلع کرتے اور فوائد میں شریک بنا

لیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے کیا دل لگی اور مسخراپن کر رہے ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان سے دل لگی کر رہا ہے کہ ان کو اس حالتِ خراب میں چھوڑ رکھا ہے کہ جس کا نتیجہ دین و دنیا میں خراب اور آخرت میں روح کو سخت عذاب ہے۔

متعلقات: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ: استہزا اور مکر اور خداع وغیرہ اوصاف کو جو آیاتِ قرآنیہ میں خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو مجازاً کیا گیا ہے۔ کس لیے کہ یہ اوصافِ ذمیمہ ہیں۔ ان سے وہ پاک ہے مگر محاورہ میں ایک فعل پر کسی مناسبت سے اکثر دوسرے فعل کا اطلاق آتا ہے بولتے ہیں جس قدر تم پر کوئی ظلم کرے اسی قدر تم بھی اس پر ظلم کرو۔ حالانکہ ظلم کے مقابلہ میں جو کچھ جزائے مناسب دی جائے وہ ظلم نہیں مگر وہ دونوں فعل باہم مناسبت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس پر بھی ظلم کا اطلاق آیا۔ قال تعالیٰ "و جزاء سیئة سیئة"

پس وہ لوگ جو دینداروں کے ساتھ مکر اور ٹھٹھا کرتے ہیں خدائے تعالیٰ ان کو اس فعلِ بد کی جزا دیتا ہے، لیکن اس جزا پر ایک مناسبت سے مکر اور ٹھٹھے کا اطلاق آیا اور خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب ہوا اور یہ ایک محاورے کی بات ہے اس پر طعن کرنا سراسر بیوقوفی ہے۔ بعض پادری اور ہندو مسلمانوں کو ان آیات سے ان الزامات کا جواب دیا کرتے ہیں کہ جو ان کی کتبِ دینیہ سے ثابت ہوتے ہیں جن میں خدائے تعالیٰ کی ذاتِ مقدس میں جسمانیت اور حدوث اور جہل وغیرہ امور کو ثابت کیا ہے مگر یہ سراسر ناانصافی ہے یا ان آیات کے مطالب سے لاعلمی یا عمداً کجروی ہے۔

طغیان: بالضم والکسر ایک جگہ مقرر سے تجاوز کرنا بولتے ہیں طغی الماء جس وقت پانی اپنی حدود سے تجاوز کرتا اور حد سے بڑھ جاتا ہے یہاں اس سے مراد سرکشی اور کفر میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ لفظ شیطان کی تحقیق مقدمۂ کتاب میں ہو چکی ہے۔ یہاں اس سے مراد کفر کے سردار ہیں۔

عمہ: اور عمی دونوں کے معنی اندھاپن اور نابینائی کے ہیں مگر عمی کا اطلاق ظاہری آنکھوں کے اندھا ہونے پر اور عمہ کا دل کی آنکھوں کے اندھا ہونے پر آتا ہے۔

نکات: (۱) منافقین اپنی چالاکی سے ایمانداروں کو ان کے بھولے پنے سے بیوقوف سمجھ کر اپنا ایمان جتلانے میں قسم اور کلامِ مؤکد کی ضرورت نہ سمجھتے تھے سو اس کو تو خدا نے آمنا کے ساتھ تعبیر کیا اور کفار بالخصوص کفر کے سردار تو بڑے چلتے پرزے اور پرلے درجے کے ہوشیار تھے وہ بغیر قسم اور کلامِ مؤکد کے کاہے کو اعتبار کرتے۔ اس لیے ان سے اِنَّا مَعَكُمْ بتاکید کہتے اور بجائے کفر کے ان سے معیت جتلاتے تھے۔

(۲) خدائے تعالیٰ کے مقدس لوگوں سے ہنسی کرنا خدائے تعالیٰ سے ہنسی کرنا ہے اور ان کا ادب اور ان سے محبت کرنا خدائے تعالیٰ کا ادب اور اس سے محبت کرنا ہے۔ اس بات کے بتلانے کو خدا نے یہ فرمایا کہ تم میرے بندوں سے ہنسی کرتے ہو ان کی طرف سے میں تمہارے ساتھ ہنسی کرتا ہوں کہ تم کو گمراہی میں چھوڑ رکھا ہے جس کو تم بھلا سمجھتے ہو اور نتیجہ اس کا برا ہے۔

(۳) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ میں لفظ اللہ کو مقدم کر کے یہ بات جتلا دی کہ کوئی اور نہیں بلکہ خدا تم سے ہنسی کر رہا ہے۔ پھر دیکھو اس کی ہنسی کیسی ہے جس طرح کوئی بادشاہ اپنے نمک حلال نوکر کی طرف سے اس کے مخالف کو یوں کہے کہ تجھ سے بادشاہ مقابلہ کر رہا ہے تا کہ اس کو خوف پیدا ہو اور اپنی حرکتِ ناشائستہ سے باز آئے۔

(۴) اَللّٰهُ مُسْتَهْزِئٌ نہ کہا کہ جو ظاہر میں مطابق تھا مگر اس نکتہ کے لیے یستہزئ جملہ فعلیہ فرمایا کہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرے اور وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے مصائب کا نازل ہونا ان کو معلوم ہو جائے۔ کما قال اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ الآیہ اب اگلی آیتوں میں خدائے تعالیٰ منافقوں کے اس فعلِ بد کا نتیجہ بڑے لطف کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے عمرِ عزیز صرف کر کے کیا حاصل کیا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯

یہ (منافق) وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی سو ان کی تجارت سے کچھ بھی نفع نہ ہوا اور نہ وہ (تجارت کرنا ہی) جانتے تھے۔

ترکیب: اولئك مبتدا۔ الذین موصول اشترو الخ جملہ فعلیہ اس کا صلہ مجموعہ بن کر خبر ہوئی فا تفریعیہ ما حرفِ نفی ربحت فعل تجارتھم فاعل مجموعہ جملہ فعلیہ خبریہ معطوف علیہ اور وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ جملہ اس پر معطوف۔

تفسیر: یعنی وہ جو انسان کو خدا کی طرف سے ایک فطری ہدایت ہے (اگر اس پر کوئی عوارض و موانع پیش نہ آئے تو اس کی وجہ سے نیکی اور حیاتِ ابدی کے رستہ پر چل سکے) ان منافقوں نے اپنے اندر اخلاقِ رذیلہ اور ملکاتِ فاسدہ پیدا کر کے اس نورِ فطرت کو بجھا دیا (جس کو خدائے تعالیٰ نے ہدایت کے بالعوض گمراہی خریدنے کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے) ان لوگوں نے اپنے نزدیک بڑی عمدہ اور نفع دینے والی تجارت کی تھی کہ منہ سے کلمۂ توحید کہہ دیا اور اس کی بدولت منافعِ دنیا کو حاصل کیا۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے اس تجارت میں نفع نہ ہو کیونکہ عمرِ عزیز اور نورِ فطرت کہ جس کی کوئی قیمت نہیں اس کو صرف کر کے دنیا چند روزہ اور شہواتِ نفسانیہ حاصل کرنا درِ بے بہا دے کر مٹی کا کھلونا لینا ایسا ہے جیسا کہ احمق اور لڑکے کرتے ہیں۔

کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے

اور نہ سرے سے ان لوگوں کو تجارت کرنی آئی کیونکہ تجارت یہ تھی کہ اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں صرف کر کے حیاتِ ابدی حاصل کرتے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ الآیات۔ اصل مال فطرتِ سلیمہ کو بھی برباد کر دیا اور نفع بھی نہ ملا۔ اب خدا تعالیٰ ان کی حالت کو اور زیادہ تشریح سے بیان فرماتا ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ⑱

ان کی مثل اس شخص کی سی ہے کہ جس نے آگ سلگائی۔ پس جب اس کے آس پاس روشنی ہوگئی تو خدا نے ان کی روشنی بجھا دی اور ان کو اندھیروں[۱] میں چھوڑ دیا کہ (کسی طرح) نہیں دیکھتے (وہ) گونگے بہرے اندھے ہیں وہ (کسی طرح) راہ پر نہ آئیں گے۔

ترکیب: مثلھم مبتدا کمثل الخ موصول وصلہ سے مل کر اس کی خبر کاف بمعنی مثل ہے اور ممکن ہے کہ محذوف کے متعلق ہو۔ لما حرفِ شرط اضاءت فعل نار اس کا فاعل ماحولہ ای حول استوقد اس کا مفعول۔ ممکن ہے کہ اضاءت لازمی ہو پھر ما اس کا فاعل قرار دیا جائے اور تانیث اضاءت بلحاظ معنی ما ہو کہ جس سے مراد اشیاء یا اماکن ہیں اس تقدیر پر ما ظرف ہوگا۔ لفظ ما کی تین صورت ہیں ایک بمعنی الذی دوم

۱ ظلمات جمع کا صیغہ لایا گیا تا کہ معلوم ہو کہ ایک اندھیری نہ تھی بلکہ بہت سی۔ حبِ جاہ کی حبِ مال کی، حبِ لذات کی دارِ آخرت سے غفلت کی کہ جو سب ظلمتوں سے زیادہ ہے۔ حقانی

نکرہ موصوفہ اے مکاناً حولہ۔ سوم زائدہ۔ ذھب فعل اللہ فاعل بنورھم بواسطہ ہائے تعدیہ مفعول ھم ضمیر جمع راجع ہے طرف الذی کے جو بمعنی جمع ہے یہ سب جملہ معطوف علیہ وترکھم فعل بافاعل مفعول اول فی ظلمات مفعول ثانی۔ کس لیے کہ ترک متضمن بمعنی صَیّر ہے لایبصرون جملہ فعلیہ حال ہے ھم مفعول سے یہ سب جملہ معطوف ہوا معطوف علیہ و معطوف مل کر جواب ہوا لما کا صم الخ مبتدا محذوف کی جو ھم ہے فھم مبتدا لایرجعون خبر جملہ مستانفہ۔

تفسیر: یعنی ان منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ جیسا کسی نے آگ جلائی اور جب اس کی روشنی چمکی تو فوراً گل ہوگئی اور وہ شخص ہکابکا حیران و پریشان رہ گیا، اسی طرح ان کا حال ہے کہ ان کا وہ نورِ فطرت (کہ جو خدا نے ہر انسان میں ودیعت رکھا ہے) ذرا چمکا تھا یعنی ہر خیر و شر کے پہچاننے اور سعادت و شقاوت پر مطلع ہونے کا وقت آیا تھا تو اسی وقت اس کو خدا نے بجھا دیا یعنی ان کے نفاق اور تعصب اور عناد اور حبِ مال و جاہ کی آندھیِ ظلمت خیز نے اس چراغِ فطرت کو گل کر دیا[1]۔ پس اب یہ بہرے ہیں کسی ہادی کی بات سن نہیں سکتے اور گونگے بھی ہیں کہ اپنی بیماریِ دل کو حکیمِ روحانی سے بیان کر کے علاج پذیر بھی نہیں ہو سکتے اور خود بھی اندھے ہیں کہ از خود خدا کے آثارِ قدرت دیکھ کر راہ پر نہیں آ سکتے۔ جب یہ ہے تو اب ان کے ہدایت پر آنے کی کیا صورت؟ یا یوں کہو کہ انہوں نے آگ جلائی اور ارد گرد روشنی ہوئی۔ یعنی دنیا میں کلمۂ توحید کو آڑ بنا کر غنائیم اور حفظِ جان و مال وغیرہ فوائد حاصل کئے مگر مرتے ہی یہ چراغِ فوائد گل ہو گیا تو افعالِ بد اور جہلِ مرکب اور قبر کی تاریکیوں میں ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اب وہاں نہ اکتسابِ حسنات کا کوئی ذریعہ ہے نہ وہاں سے رجوع کر کے پھر دنیا میں آ سکتے ہیں۔

متعلقات: مثلھم: مثل لغت میں بمعنی مثل اور مانند ہے بولتے ہیں مِثْلٌ اور مَثَلَ و مثیل جیسا کہ شِبْہٌ و شَبَہٌ و شبیہ ایک ہی معنی کے لیے آتا ہے۔ پھر مثل اس کہاوتِ مشہور کو کہنے لگے کہ جس میں کسی کی غرابت (عمدگی) کی وجہ سے موقعِ بیان کو اصلی حال کے ساتھ تشبیہ دینا منظور ہو جس طرح ہمارے محاورے میں جہاں کوئی برعکس معاملہ ظہور میں آتا ہے تو یہ مثل کہتے ہیں۔ بیل نہ کودا کودے کون، یہ تماشا دیکھے کون، یعنی جس کا حق کرنے کا تھا اس نے یہ کام نہ کیا اب اس اصلی موقع کو اس کے اصلی حال کے ساتھ جہاں گونا گوں گودنا فرض کیا گیا ہے تشبیہ دی گئی ہے اور مثل میں یہ شرط ہے کہ کوئی نادر بات ہو اس لیے اصل کلام کو نہیں بدلتے۔

تشبیہ اور مثل میں علماءِ بلاغت کے نزدیک یہ فرق ہے کہ مثل کلامِ مرکب ہوتا ہے اور تشبیہ مفرد کو شامل ہے جیسا کہ زید کو شیر کہا جاوے۔ امثال کے بیان کرنے سے دل میں معانی کا عمدہ طور پر جما دینا مقصود ہوتا ہے کیونکہ ایک خیالی اور معنوی بات کو محسوس بنا کر دکھا دیا جاتا ہے، دیکھئے اگر کسی کا ضعف یوں ہی بیان کیا جاوے تو وہ اس قدر مؤثر نہیں ہوتا جس قدر کہ اس کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دے کر بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور اسی رمز کے لیے حکماء اور خطباء اپنے کلام میں اکثر مثال لاتے ہیں اور اسی غرض سے کلامِ الٰہی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ اب تک بائیبل میں بھی بے شمار امثال ہیں۔ قرآن میں بھی ہیں۔

نار: آگ کو کہتے ہیں اور نور اسی سے مشتق ہے جس کے معنی روشنی کے ہیں۔

ظلمات: ظلمت کی جمع ہے جس کے معنی اندھیرا ہے اور چونکہ نار کو نور لازم ہے، اس لیے ایک کا دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

نکات: (۱) اِسْتَوْقَدَ نَارًا کے بعد جو جواب شرط میں ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ فرمانا اور نارھم نہ کہنا یہ بات بتلا دیتا ہے کہ آگ جلانے سے

[1] مدینہ کے لوگ اول تو سب آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے سے خوش ہوئے تھے اور اس ابتدائی حالت میں ان پر اسلامی انوار پرتوفگن ہوئے اور ظلماتِ جہل اور شہوات دور ہو گئے' نیک و بد کا امتیاز ہونے لگا۔ یہ تھی وہ روشنی جس کو خدا نے روشن کیا تھا مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد بعض لوگ اغراضِ دنیا اور حبِ شہوات اور لذاتِ فانیہ میں پھر مبتلا ہو گئے جس کو نفاق سے تعبیر کیا ہے تو وہ انوار بھی ان سے دور ہو گئے۔ پھر اپنی ظلمت میں حیران و پریشان ہو گئے۔ ان کی اس حالت کو اس مثال میں بیان فرمایا۔

...مقصود روشنی تھی اس مقصود کو خدا نے فوت کر دیا۔ انتفاءِ لازم سے انتفاءِ ملزوم کو خوب ثابت کر دیا اور ذہب کو باء کے ساتھ متعدی کیا نہ کہ ہمزہ کے ساتھ تاکہ اس کے بالکل بجھ جانے پر دلالت کرے۔ کہتے ہیں ذھب السلطان بمالہ جبکہ بالکل کچھ نہ چھوڑے اور اسی لیے ضو کو ذکر نہ کیا کیونکہ اگر ذہب اللہ بضوءھم کہتے تو احتمال تھا کہ اصل نور باقی رہ گیا۔ ضو جاتی رہی ہو۔

(۲) مثال میں نور کے گم ہو جانے کو خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب کیا (ذھب اللہ بنورھم) یعنی خدا نے ان آگ جلانے والوں کی آگ بجھا دی حالانکہ اس موقع پر آگ یا چراغ جو بجھ جاتا ہے تو خود بخود یا ہوا سے بجھتا ہے۔ اس میں یہ باریک نکتہ ہے کہ دنیا میں جس قدر چیزیں اپنے اسباب و علل پر مرتب ہوتی ہیں جن کی آنکھ میں نورِ حقیقی نہیں وہ تو اس چیز کا سرزد ہونا اسی سبب اور علت سے جانتے اور اسی کو فاعلِ حقیقی یا موجد سمجھتے ہیں مگر جن کو چشمِ بصیرت عطا ہے وہ اپنی نظر کو قاصر نہیں کرتے بلکہ جس پر ان اسباب و علل کا سلسلہ تمام ہوتا ہے، یعنی جو ان اسباب اور علتوں کا پیدا کرنے والا اور ان سب کی علت اس کی طرف نظر ڈالتے اور ان درمیانی اسباب و علل کو واسطۂ محض جان کر اس فعل کو اس مسبب الاسباب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ پس اس سر بتلانے کے لیے خدا نے ذھب اللہ بنورھم فرمایا اور اسی طرح دیگر مقامات پر بھی ان افعال کو جو بظاہر کسی اور فاعل سے سرزد ہوتے ہیں اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ منجملہ ان کے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى سے کیا۔ خوب کہا ہے کسی عارف نے۔

گر گزندت رسد زخلق مرنج … کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا دان خلافِ دشمن و دوست … کہ دل ہر دو در تصرفِ اوست
گرچہ تیر ازکمان ہمی گزرد … از کماندار بیند اہلِ خرد

فائدہ: بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ذَهَبَ اللّٰهُ الخ الگ جملہ ہے۔ مثال اس سے اول تمام ہو چکی۔ یہ جملہ صرف منافقوں کی حالت بیان کرنے کے لیے آیا ہے۔ اب خدائے تعالیٰ ان منافقوں کے لیے ایک اور مثال بیان کرتا ہے تاکہ اس حالت کی اور بھی وضاحت اور توضیح ثابت ہو جائے، پس فرماتا ہے:

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

یا (ان کی مثال) آسمانی بارش کی ہے جس میں اندھیریاں اور کڑک اور بجلی بھی ہو (اور وہ) اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں موت کے ڈر سے ٹھونسے لیتے ہیں اور خدا کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

ترکیب: مثلھم مبتداء محذوف کصیب اس کی خبر۔ تقدیرِ کلام یوں ہے او مثلھم کمثل اصحاب صیب۔ عطف جملہ کا پہلے جملہ پر ہوا اور یہ کاف موضع رفع میں ہے من السماء کائن کے متعلق ہو کر صیب کی صفت ظلمات و رعد و برق بواؤ عاطفہ مبتداء موخر فیہ خبر مقدم اور ضمیر فیہ کی راجع ہے صیب کی طرف یہ جملہ صیب کی صفت ہوا یجعلون فعل بافاعل اصابعھم مفعول فی آذانھم ظرف۔ اَصَابِعَ مِنَ الصَّوَاعِقِ متعلق يَجْعَلُوْنَ کے حَذَرَ الْمَوْتِ مفعول لہ ہے يَجْعَلُوْنَ کا یہ جملہ مستانفہ ہے جو ان کا حال ظاہر کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ حال ہو ضمیر فیہ سے اللہ مبتداء مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ خبر جملہ معترضہ ہے محیط اصل میں محوط تھا حاط یحوط سے کسرہ واو حاء کی طرف نقل ہوا تو واو یا بن گیا۔

تفسیر: یعنی منافقوں کی مثال آسمانی بارش کی سی ہے کہ جس میں سراسر نفع ہے گو بظاہر اس میں بجلی اور کڑک اور بادلوں اور بارش اور رات کی

اندھیریاں بھی ہوتی ہیں یعنی مشقتِ اعمال۔ مگر جس طرح انسانی طبائع اس کڑک اور بجلی کی چمک سے گھبراتی ہیں' کانوں میں انگلیاں کرتے ہیں، آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں کہ مہیب آواز سنائی نہ دے وہ چمک دکھائی نہ دے یعنی اس سے نفرت کرتے اور بھاگتے ہیں۔ اسی طرح منافق اس آسمانی بارش سے جو حیاتِ ابدیہ کا پانی ہے یعنی اسلام اور قرآن مجید اور اس کے مواعظِ حسنہ اور وعدہ وعید سے جن کی کڑک اور چمک بجلی کی کڑک اور چمک سے زیادہ ہے دور بھاگتے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں کہ وہ آیات اور حضرت ﷺ کے مواعظ سننے میں نہ آویں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح آنے والی مصیبتوں سے جو دنیا و آخرت میں حبِ شہوات و لذاتِ فانیہ سے پیش آنے والی ہیں بچ جائیں۔ مگر ہادیِ برحق کے اس تلخ دواپئے بغیر جس میں روحانی شفا ہے اس مرض الموت سے نجات نہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کا جملہ مخلوق پر بالخصوص کفار پر قدرت کا پورا احاطہ ہے کوئی کہاں بھاگ کر جا سکتا ہے اور کسی کی تدبیر کا بے بنیاد قلعہ کیا پناہ دے سکتا ہے، ذرا سی تلخیِ دوا یعنی مشقتِ پابندیِ احکامِ الٰہی اور قدرے نفس کشی اور نفس کی مار کے بغیر جو اس کو لذاتِ مال و جاہ کے عمیق گڑھے میں لیے جاتا ہے دیگر تدابیرِ باطلہ سے شفاء ڈھونڈنا اور مصائب سے بچنا حمق ہے۔

متعلقات: او: اصل میں شک کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ جہاں دو باتوں میں شک کے طور پر برابری ہو وہاں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ پھر مطلقاً دو چیزوں کی برابری بیان کرنے میں استعمال ہونے لگا کہ یہاں شک مفقود نہیں جیسا کہ بولتے ہیں جالس الحسن او ابن سیرین کہ خواہ تو حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے دونوں کے پاس بیٹھنا برابر ہے۔ اس مقام پر بھی یہ کلمہ اس معنی میں مستعمل ہوتا ہے کہ منافقوں کو خواہ آگ جلانے والوں سے تشبیہ دو خواہ مینہ سے بھاگنے والوں سے دونوں برابر ہیں۔

صیب: فیعل کے وزن پر صوب بمعنی نزول سے مشتق ہے جس کے معنی بارش اور بادل کے ہیں۔ مگر یہاں مراد بارش ہے۔

السماء: چند معانی میں مستعمل ہوتا ہے افق کو بھی کہتے ہیں اور بادل کو بھی اور آسمان کو بھی اصل میں سماء کا اطلاق اوپر والی چیز پر ہوتا ہے خواہ وہ بادل ہو خواہ آسمان۔ اس جگہ بادل مراد ہے کیونکہ بارش وہیں سے نازل ہوتی ہے اور آسمان مراد لینا بھی ممکن ہے۔

رعد: اس آواز یا گرج کو کہتے ہیں کہ جو باہم بادلوں کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ ہوا سے چلتے ہیں۔

برق: وہ چمک اور روشنی ہے کہ جو بادلوں کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے جس کو بجلی کہتے ہیں۔ حکما کہتے ہیں کہ جب قوائے فلکیہ عناصر میں تسخین و تبخیر کرتے ہیں تو عناصر باہم مخلوط ہو جاتے ہیں پھر ان سے گونا گوں مخلوقات پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ جب آفتاب کی گرمی پانی اور زمین پر پڑتی ہے تو دریا سے ابخرہ تبخیر میں سے دھواں سا اٹھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے۔ پس دھواں کبھی کرۂ ہوا سے بھی گزر جاتا ہے اور کرۂ آتش تک پہنچتا ہے تو اس میں آگ لگ اٹھتی ہے۔ پس وہ شعلہ ہو کر کبھی تو رات کو دمدار ستارہ سا نظر آتا ہے اور کبھی نیزہ اور کبھی کوئی اور جانور یا درخت کی صورت میں دکھائی دیتا ہے اگر وہ قدرِ قلیل ہے تو جلد جل کر تمام ہو جاتا ہے اور جو مادہ زیادہ ہوتا ہے تو مدت تک دکھائی دیتا ہے اور اس کی راکھ بھی بسا اوقات جھڑتی ہوئی لوگوں نے دیکھی ہے اور کبھی اس دھوئیں میں شعلہ نہیں پیدا ہوتا تو آسمان زمین کے درمیان ایک عجیب سرخی نمودار ہوتی ہے اور وہ بخارات جو پانی سے اٹھتے ہیں اگر وہ لطیف ہوتے ہیں اور اس قدر اونچے جاتے ہیں کہ جہاں تک زمین کی گرمی نہیں پہنچتی تو وہاں کی سردی سے منجمد ہو جاتے ہیں اور ان کو ابر یا بادل کہتے ہیں اور ان میں سے جو قطرات ٹپکتے ہیں ان کو بارش اور کبھی وہ قطرات برودت کی وجہ سے منجمد ہو کر گرتے ہیں تو ان کو اولے کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بخاراتِ مجتمع پر سردی پہنچی تو وہ برف بن کر زمین پر گرنے لگتے ہیں اور جو پہلے ہی سے سخت ٹھنڈک پہنچتی ہے تو اولے بن کر گرتے ہیں اور کبھی وہ بخارات طبقۂ زمہریریہ[1] پر تک نہیں پہنچتے بلکہ نیچے ہی کسی سرد جگہ میں برودت کی وجہ سے بادل بن جاتے ہیں جیسا کہ لوگوں نے بلند پہاڑوں پر دیکھا ہے کہ نیچے بخارات سے بادل بنا اور برسنے لگا

[1] یہ ہوا کا وہ طبقہ ہے کہ جو نہایت ٹھنڈا ہے جہاں نہ زمین کی گرمی پہنچتی ہے نہ کرۂ آتش کی حرارت اثر کرتی ہے۔ ۱۲منہ

اور جب وہ ابخرے بہت ہی کم ہوتے ہیں تو شب کی سردی سے شبنم بن کر ٹپکتے ہیں اور جب ان بخارات کے ساتھ زمین سے دھواں بھی مل کر اوپر چڑھتا ہے اور طبقۂ زمہریریہ میں بخارات تو سردی کی وجہ سے جم کر بادل ہو جاتے ہیں اور وہ دھواں اپنی حرارت سے بادل کو توڑ کر اوپر یا نیچے جانا چاہتا ہے تو ایک سخت آواز پیدا ہوتی ہے جس کو رعد کہتے ہیں یعنی گرج اور کڑک اور جو اس دھوئیں میں دہنیت (چکنائی) کی وجہ سے اس حرکتِ عنیفہ سے شعلہ نکلتا ہے وہ اگر لطیف ہے تو اس کو برق[1] کہتے ہیں یعنی بجلی اور جو کثیف ہے تو اس کو صاعقہ کہتے ہیں جس کی جمع صواعق آتی ہے یعنی وہ بجلی کہ جو زمین پر گرتی اور آدمی کیا بلکہ درختوں کو بھی جلاتی اور پہاڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے اور اسی طرح زلزلہ اور چشموں کے جاری ہونے اور پہاڑوں میں سے آگ نکلنے اور دیگر عجائباتِ قدرت کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے پیدا ہونے کے یہی اسباب نہیں بلکہ ان کے ساتھ اور بھی اسباب و علل ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے جو مسبب اسباب و علل کا پیدا کرنے والا ہے مواد اور صورتوں پر ارواحِ مدبرہ موکل کر رکھی ہیں کہ جن کو زبانِ شرع میں ملائکہ کہتے ہیں جن کو ان اشیاء کے وجود میں دخل ہے ورنہ صدہا بار ایسے بخارات اور ادخنہ اٹھتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ یہ چیزیں نہیں[2] پیدا ہوتیں؟ وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ ملائکہ بادلوں کو کھینچتے ہیں اور رعد فرشتے کا کوڑا ہے ان سے یہی مراد ہے لیکن عقلِ ناقص تو انہیں اسبابِ ظاہرہ تک پہنچ کر رہ جاتی ہے اور اسی لیے سینکڑوں کم عقل خدا کے منکر ہو کر دہریہ ہو گئے مگر عقلِ کامل ان اسباب و علل کا سلسلہ جنابِ باری تک پہنچا کر ہر ایک چیز کو اس کے یدِ قدرت سے جانتی ہے اور پھر ان عجائباتِ قدرت سے اس کی عظمت و جلال پر ایمان لاتی ہے۔ اس لیے انبیاء اور حکماء میں فرق ہے۔ اب اس آیت میں خدائے تعالیٰ اس مثال کی اور زیادہ تشریح کرتا ہے:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ
عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
ع ۲ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳

بجلی ان کی بینائی کو اچکے لیتی ہے جب ان کو روشنی معلوم ہوتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں اور اگر خدا چاہے تو ان کی شنوائی اور بینائی کو کھو دے' بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے

ترکیب: یکاد فعل البرق اسم یکاد **یخطف ابصارھم** جملہ فعلیہ اس کی خبر یہ اپنے اسم اور خبر سے مل کر جملہ مستانفہ ہوا گویا کہ کوئی پوچھتا تھا کہ اس کڑک میں ان کا کیا حال ہے فرمایا کہ گویا بجلی کی چمک سے اندھے ہی ہو جاویں گے۔ کلما کلمہ شرط اضاءلھم بمعنی لمع لھم شرط مشوفیہ جملہ جواب شرط فیہ ای فی ضوء البرق یہ جملہ بھی مستانفہ ہے گویا کوئی سوال کرتا تھا کہ اس چمکنے اور تھم جانے میں وہ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا ذرا روشنی ہوئی تو چل پڑے ورنہ وہیں کھڑے رہے۔ اذا کلمۂ شرط **اظلم علیھم** جملہ شرط قاموا جملہ فعلیہ جواب شرط لو حرف شرط شاء فعل اللہ فاعل لذھب الخ جملہ اس کا جواب اور مفعول شاء کا ان یذھب بسمعھم محذوف۔ کس لیے کہ جواب اس پر دلالت کرتا

[1] ممکن ہے کہ برق اور رعد اور صاعقہ اس وجہ سے بھی ہوتی ہوں اور باہم بادلوں کی سخت رگڑ سے بھی۔ ۱۲منہ

[2] بعض حمقا نے جو علم طبیعات کے دو چار رسالے پڑھ لیتے ہیں یہ کہا کہ خدا کی کیا ضرورت ہے اگر توپ کے ہزار دو ہزار فیر کر دیے جائیں تو دھوئیں کا بادل بن کر برسنے لگے چنانچہ امریکہ میں فلاں نے ایسا کیا اور بچہ پیدا ہونے کے لیے فلاں مسٹر نے ایک آلہ تیار کیا ہے اگر اس میں منی ڈال دی جائے تو بچہ بن جاتا ہے افسوس کہ یورپ کی روشنی نے ان حمقا کو اور بھی اندھا کر دیا۔ ۱۲منہ

ہے ان مشبہ بفعل اللہ اس کا اسم اور علی کل شیءٍ قدیر اس کی خبر۔

تفسیر: یعنی جس طرح بارش میں بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھاتیں اور بند ہو جاتی ہیں اور جب بجلی کی چمک ہوتی ہے تو انسان چلنے لگتا ہے ورنہ خوفِ راہ سے اندھیرے میں ٹھہر جاتا ہے یہی حال ان منافقوں کا برقِ ایمان اور نورِ قرآن سے ہے کہ ان کی آنکھیں خیرہ اور چندھیائی جاتی ہیں اور اس روشنیِ حق کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی ہیں جب اسلام کی بجلی چمکتی ہے تو چلتے ہیں یعنی جب فوائدِ ظاہریہ غنیمت وغیرہا پیش آتے ہیں تو راہِ اسلام پر چلنے لگتے ہیں ورنہ پھر اپنی جبلی کجروی سے رک جاتے ہیں یا یوں کہو کہ جب آنحضرت علیہ السلام کے معجزات و آیاتِ بینات کی برق چمکتی ہے تو اس وقت اضطرارِ دل سے تصدیق کر لیتے ہیں ورنہ پھر تاریکیِ شکوک وشبہات میں آ کر رک جاتے ہیں اور برقِ قرآن کی روشنی سے آنکھیں بند کرنا بے فائدہ ہے۔ اول تو اس سے بصیرت دور نہیں ہوتی اور جو خدا چاہے تو یوں بھی ان کو اندھا اور بہرا کر سکتا ہے کس لیے کہ وہ ہر بات پر قادر ہے۔

نکات: (۱) لفظ لو سے یہ بات ثابت کر دی کہ ہر چند انسان کے آلاتِ ادراک خدائے تعالیٰ کی طرف سے عطا ہیں مگر جب وہ ان کو اس کے حکم کے موافق استعمال میں نہیں لاتا تو خوف کرنا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ ان کو معدوم نہ کر دے اور جتنی دیر وہ معدوم نہیں ہوئے اس میں غرہ نہ کرنا چاہیے۔ کس لیے کہ ہر گناہ کی سزا میں جو دیر ہو تو مغرور نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ سزا اس کی قدرت سے باہر نہیں یہ دیر کسی مصلحت یا رحمت سے ہے۔

(۲) اس جملہ ولو شاء اللہ الخ کو ذکر کر کے بعد میں ان اللہ علی کل شی ء قدیر کہنا دعوے کو دلیل سے ثابت کر دیتا ہے اور اس کا لطف اربابِ فہم پر مخفی نہیں ہے۔

(۳) اگرچہ کلما واذا کلماتِ شرط ہیں مگر تاہم باہم فرق ہے کلما میں معنی شرط زائد ہیں اس لیے اس کو اضاءلھم کے ساتھ اور اذا کو اظلم کے ساتھ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ان کو اس ابرِ رحمت سے بھاگنے کی نہایت حرص اور سخت رغبت تھی اور ذرا مینہ میں ٹھہرتے ہیں تو بجبرِ جابر اور قصرِ قاصر ورنہ بالطبع اس حیاتِ ابدی کے مینہ سے بھاگتے ہیں۔

ربط: سب سے پیشتر نبی کو یہ ضرور ہے کہ اپنی کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا ثابت کر دے اور جب اس کو محکم دلائل سے ثابت کر چکے اور یہ اول مرحلہ طے ہو چکے تو پھر جو کچھ مقصودِ اصلی ہو اس کو بیان فرما دے کہ جس کے لیے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے اور جس لیے اس کی اطاعت بندگانِ خدا پر فرض ہوئی ہے اس لیے خدا نے الم ذٰلِكَ الْكِتٰبُ الخ میں قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا بیان کیا اور اس کی یہ خاصیت بتائی کہ اس سے ازلی نیک بختوں یعنی متقیوں کو ہدایت ہوتی ہے اور وہ ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں اور جب ان نیکوں یعنی متقیوں کا ذکر کیا تو ان کے مقابلہ میں بحکم تعرف الاشیاء باضداد ہابد بختوں کے دونوں گروہوں کفار اور منافقین کا بھی ذکر کیا تاکہ تقویٰ اور ہدایت کی بھلائی اور کفر ونفاق کی برائی مخاطب کے سامنے محسوس ہو جائے۔ پس جب یہ مرحلہ طے ہو چکا اور بندے کو سعادت اور ہدایت کا از بس مشتاق کر دیا تو مقصودِ اصلی یعنی عبادت کا ذکر کیا اور یہ بتلا دیا کہ اس عبادت سے وہ وصفِ تقویٰ کہ جس کے تم مشتاق ہو اور جو سعادتِ ابدی اور ہدایتِ قرآنی کا ذریعہ ہے تم کو حاصل ہو جاوے گا۔ پس فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

لوگو اپنے اس رب کی عبادت کیا کرو کہ جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ جس نے کہ تمہارے لیے زمین کا فرش اور آسمان کی چھت بنادی اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل نکالے پھر کسی کو بھی خدا کا شریک نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔

ترکیب: یا حرفِ ندا ایھا الناس منادیٰ اعبدوا فعل بافاعل ربکم اس کا مفعول موصوف الذی موصول خلقکم صلہ جملہ فعلیہ معطوف علیہ و الذین من قبلکم ای والذین خلقھم من قبل خلقکم صلہ موصول جملہ ہو کر معطوف ہوا معطوف علیہ اور معطوف مل کر دونوں صفت ہوئے ربکم کی۔ لعل مشبہ بفعل کم اسم تتقون جملہ اس کی خبر الذی موصول جعل فعل بافاعل لکم متعلق بجعل الارض مفعول اول فراشا مفعول ثانی۔ واؤ حرفِ عطف السماء معطوف برالارض یعنی جعل السماء بناء مفعول ثانی یہ سب جملہ صلہ ہوا الذی کا وانزل فعل بافاعل من السماء من ابتدائیہ متعلق ہے انزل سے ماءً مفعول انزل کا فاخرج فعل بافاعل بہ ای بالماء متعلق ہے اخرج کے من الثمرات میں من تبعیضیہ بمعنی بعض الثمرات مفعول ہوا اخرج کا اور رزقا لکم مفعول لہ ہوا یا رزقا مفعول بہ ہے اخرج کا اور من الثمرات اس کا بیان ہے فلا تجعلوا فعل بافاعل للہ متعلق ہے لاتجعلوا کے اندادًا مفعول ہے اور انتم تعلمون جملہ فعلیہ خبر یہ حال ہے ضمیر فاعل لاتجعلوا سے پس انزل معہ جمیع متعلقات معطوف ہوا جعل پر اور صلہ میں داخل ہوا اور یہ موصول وصلہ دوسری صفت ہے رب کی۔

تفسیر: یعنی اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو کہ جس نے تم کو اور تم سے جس قدر پہلے ہیں سب کو معدوم سے موجود کر دیا پھر جو اس قدر قدرت وعظمت رکھتا ہے وہی مستحقِ عبادت ہے نہ کہ تمہارے خیالی معبود اور وہمی پروردگار اور عبادت اس لیے کرو کہ اس سے تم کو صفتِ تقویٰ حاصل ہو جائے گی کیونکہ عبادت ہمہ تن جنابِ باری کی طرف بعجز وانکسار متوجہ ہونے کو کہتے ہیں۔ پس جب بندہ اپنی روح سے اور اپنے جسم سے اس کی طرف متوجہ ہوتا اور اس کے آگے سرِ عجز ونیاز رکھتا ہے تو اس کی روح پر انوارِ باری تعالیٰ کی ایسی چمک پڑتی ہے جیسی آفتاب کی آئینہ میں۔ جب یہ حال ہوگا تو بالضرور متقی ہو جاوے گا اور سعادتِ ابدی کا حصہ پاوے گا۔ دنیا میں دیکھئے جب گھڑی دو گھڑی لوہا آگ میں رہتا ہے تو اس کی صحبت سے گرم بلکہ انگارا ہو جاتا ہے اور جب پھول کو کسی کپڑے میں رکھتے ہیں تو وہ خوشبو سے بس جاتا ہے۔ الغرض ہر مؤثر کا متاثر میں اثر ہوتا ہے۔ پھر جنابِ باری کا روح پر اثر نہ پڑنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ ضرور قوی اثر پڑتا ہے کہ جس سے کبھی کبھی بندہ سے برخلاف اسبابِ عادیہ وہ باتیں بھی سرزد ہونے لگتی ہیں جو فوقِ قدرتِ انسانیہ سمجھی جاتی ہیں اور چونکہ عبادت بندہ اور خالق میں ایک عجیب رابطہ اور نسبتِ شریفہ ہے تو اس لیے ضرور ہوا کہ یہ فعل کسی اور کے ساتھ نہ کیا جائے لہٰذا معبود کی شناخت بھی بیان کر دی ہے کہ رب وہ ہے جس نے تم کو اور تم سے سب پہلوں کو پیدا کیا اور وہ ہے کہ جس نے تمہارے آرام کے لیے زمین کو فرش بنا دیا یعنی اس کے ایک ٹکڑے کو چوطرفہ پانی سے باہر لایا اور پھر اس کو نہ ایسا نرم کیا جیسا کہ گارا یا ہوا۔ نہ ایسا سخت ومدور کیا کہ جس پر سے انسان لڑک پڑے بلکہ ایسا کہ اس پر تمام لوگ رہتے اور سوتے اور بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہیں یہ بڑی بھاری نعمت ہے اور رب وہ ہے کہ جس نے آسمان کو تم پر خیمہ بنا دیا گویا زمین فرش اور آسمان اس کی چھت ہے اور پھر اس رب نے اس گھر میں رکھ کر تمہاری روزمرہ دعوت اور ضیافت کا بھی عجیب سامان کیا کہ اوپر سے پانی برسایا اور اس سے رنگ برنگ کے پھول اور پھل پیدا کئے کہ جن کو تم کھاتے، آرام وراحت پاتے ہو اور جس میں یہ تین وصف نہیں وہ

بزرگوں کا اور ان سے پہلے جس قدر چیزیں ہیں کہ جن کو اس کے وجود سے نہایت تعلق ہے اور جن کو جاہل خالق یا شریکِ خالق سمجھ بیٹھا ہے پیدا کرنا۔(۳) زمین کا اس ہیئت سے پیدا کرنا کہ جس پر لوگ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔(۴) آسمان کا پیدا کرنا کہ جس کی تاثیرات سے زمین کی چیزیں نشوونما پاتی ہیں۔(۵) بارش سے ہر قسم کا غلہ اور پھل اور اناج کا پیدا کرنا کہ جو حیوانات کی زندگی کا سبب ہے۔

(۳) ان دلائل کے بیان کرنے میں بھی ایک عجیب لطف رکھا ہے اور وہ یہ کہ مخاطب کے ذہن میں جو چیز مقدم تر قابلِ استدلال تھی اس کو مقدم کیا اور جو مؤخر تھی اس کو بعد میں ذکر کیا۔ پس سب سے مقدم انسان اپنی ذات اور اپنے حالات پر بخوبی غور کر سکتا ہے اور اسی لیے کسی عارف نے فرمایا ہے من عرف نفسه فقد عرف ربه اس لیے سب سے پیشتر یہ فرمایا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ انسان جب اپنے حالات پر غور کرے گا اور یہ دیکھے گا کہ میں ہمیشہ سے نہیں ہوں بلکہ آنا فانا میرا وجود اور اس کے متعلق سب باتیں کہیں اور سے عطا ہوتی ہیں اور یہ بھی سمجھے گا کہ وہ معطی نہ انسان ہے (کیونکہ انسان باہم برابر ہیں) نہ کوئی اور ممکن کیونکہ ہر ممکن محتاج ہے پھر اسی طرح جب اپنے قوائے باطنہ اور ظاہرہ میں غور کرے گا تو بلاشک جہل کا پردہ اٹھ جاوے گا اور اس کو چشمِ بصیرت سے ممکنات سے بالاتر ایک واجب الوجود نظر آئے گا۔ جس کے وجود کے سامنے جملہ وجودات نیست ہیں چہ جائیکہ کوئی اس کا شریک ہو ع

بخدا غیرِ خدا در دو جہاں چیزے نیست

اور وہ واجب الوجود جملہ صفاتِ کمال سے آراستہ و پیراستہ بھی دکھائی دے گا اور جب وہ معبودِ حقیقی جو جمال و کمال ہے اس طرح اور اس خوبی سے متجلی ہوگا تو پھر کس پروانہ کی مجال ہے کہ اس پر فدا نہ ہو

سرو می جنبد بصحنِ بوستان
در ہوائے قامتِ دلجوئے تو

یہ ہیں معنی اس آیت کے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا الآیہ اور اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ الخ اور اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا پہلے الذی سے دلائل النفس شروع ہوتے ہیں کیونکہ اور مخلوق میں نظر و استدلال کر کے مقصود تک پہنچنے کی بہ نسبت اپنے اندرونہ و بیرونہ حالات اور ظاہرو باطن صفات میں غور کر کے شاہدِ مقصود کی بارگاہِ اقدس تک پہنچنا اسہل ہے۔ کس لیے کہ حضرتِ انسان بجائے خود ایک جہاں ہے جس میں سینکڑوں ہزاروں قدرت کے نمونہ ہیں اور ہر ایک نمونۂ قدرت جمالِ جہاں آرا کے لیے آئینہ ہے اور ہر ایک آئینہ بغور نظر کرنے کے بعد معبودِ حقیقی کا رونما ہے۔ پھر اس عالمِ صغیر کی بھی دو قسم ہیں ایک تو یہی غور کرنے والا خود ہی اس کی دلیل ہے۔ دوم اس کے ہم نوع و ہم جنس و ہم صنف دیگر لاکھوں کروڑوں قسم قسم کے انسان جو اس سے پہلے آئے اور چلے گئے ان میں غور و نظر کرنے سے ایک تو وہی قدرت کے نمونہ نظر آئیں گے دوسرے ان کی وہ آمد و شد ایک دوسرا جلوۂ قدرت دکھائے گی کہ یارب یہ بیشمار مخلوق جن میں بڑے بڑے زور آور، قد آور، حسین و جمیل، والیِ ملک، اہلِ کمال بھی تھے جن کی یادگاریں اب تک ان کے حال پر آیہ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ پڑھ کر اشکِ حسرت بہا رہی ہیں۔ کہاں سے آئے تھے اور کیوں آئے اور کیوں چلے گئے اور کہاں گئے اور اب جو آ رہے اور جا رہے ہیں کہاں جاتے ہیں کیا کوئی اور جہان ہے جہاں سب جمع ہوتے جاتے ہیں؟ کیا بااختیارِ خود آئے یا بے اختیار اور بے اختیار ہی چل دیے ؎

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

تھوڑی دیر اس کتابِ قدرت کے مطالعہ کے بعد قلب پر ایک عجیب نورانیت پیدا ہو جاتی ہے اور پردۂ راز کھل جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اکتسابِ حسنات و سعادت کے لیے آئے تھے جو ایک جمال کا تو شا...

وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ کا حکم محکم اس قادرِ کریم کی عین رحمت ہے۔

اس کے بعد دلائلِ آفاق قائم کیے جن سے رب اور اس کی ربوبیت اور پھر اس کے لیے عبادت قائم کرنا ان اشیاءِ مذکورہ ذیل میں نظر کرنے سے بخوبی منکشف ہو جاتا ہے فقال اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا یعنی اس رب کی عبادت کرو کہ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنادیا اس مقام پر اپنی قدرت و ربوبیت کے تین نشان بتائے اول یہ کہ اس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا، زمین جو پانی یعنی سطحِ بحر سے منکشف ہے جس کا بہت سا حصہ خطِ استویٰ سے شمالی طرف اور قدرے جنوبی طرف ہے جس کی تصریح جغرافیوں میں ہے وہی مسکنِ حیوانات و اشجار بلکہ وطنِ بنی آدم ہے۔ یا یوں کہو ان چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، دل لبھانے والے اشجار کا یہی کھیت ہے اب خواہ اس کو ساکن کہو یا متحرک کروی کہو یا بیضوی اس تحقیقِ فلسفیانہ سے کوئی بحث نہیں مگر اس کو قابلِ سکونتِ بنی آدم کر دیا ہے۔ نہ پانی کی طرح نرم نہ ایسی سخت کہ اس پر نباتات نہ اگیں نہ اس کی کرویت بنی آدم کی بود و باش کے منافی ہے بلکہ اس پر رہ کر ہر طرح سے آرام پاتے، اس کے منافع حاصل کرتے ہیں۔ یہ مراد ہے فرش بنانے سے جو چیز کسی کے لیے مسخر ہوتی ہے اس کو بھی محاورۂ عرب میں فرش سے بطور استعارہ و کنایہ تعبیر کرتے ہیں۔ اب اس میں تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کرۂ ارض جس کی طبیعت ایک ہے کس نے ان مقامات سے بلند کر دی۔ اگر یہ اس کا طبعی کام ہوتا تو ہر جگہ مساوی ہونا چاہیے تھا پھر صرف بلند کر کے سطح بھر سے بالا ہی نہیں کیا بلکہ اس میں پہاڑ اور پہاڑوں میں سے چشمے اور انہار اور گوناگوں اشجار ایسے پیدا کیے جن کے بغیر انسانی تمدن باطل یا ناقص ہے اور یہ سب کچھ اتفاقی کام نہیں بلکہ ایک بڑے مدبرِ عاقبت اندیش کا ایسا حکیمانہ فعل ہے جس میں عمیق نظر اور کامل غور کے بعد (صدہا باریکیاں واضح ہوتی جاتی ہیں) وہی رب نظر آتا ہے۔ اسی کو عقل ولی النعمۃ اور آقا اور وحدہٗ لاشریک مانتی ہے پھر ایسا آقا جو بنی آدم کے لیے ایک ایسا مسکن ایسی حکمت سے بنائے اگر وہ عبادت کے قابل نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد دوسرے نمونۂ قدرت کا ذکر فرماتا ہے اس میں اسفل سے اعلیٰ کی طرف رجوع ہے اور یہ مناسب بھی ہے کس لیے کہ زمین کا فرش ہونا ہر ایک کے پیشِ نظر ہے جس میں کسی کو بھی شک نہیں۔ برخلاف اس دوسرے نمونہ کے وہ کیا ہے وَالسَّمَاءَ بِنَاءً کہ آسمان کو تمہارے لیے بنایا یعنی چھت بنا دیا جیسا کہ ایک جگہ آیا ہے وَالسَّمَاءَ سُقْفًا مَّحْفُوْظًا، اتنی بات کہ ہمارے اوپر ایک نیلگوں گنبد بنا ہوا ہے جس میں صدہا ثوابت و سیارے، چاند سورج کس صنعت سے دورے کرتے ہیں کہ جہاں عقل حیران ہوتی ہے مسلم الکل ہے۔ اس قدر مضمون میں تو نئے فلسفہ کا اختلاف ہے نہ پرانے کا اور تورات و انا جیل و دیگر کتبِ سماویہ یا مذہبیہ میں جہاں خدا یا اس کے پیغمبروں نے خدا کے آثارِ قدرت و جبروت کا نشان دیا ہے اور آسمان کو نمونۂ قدرت بنایا ہے وہاں آسمان سے یہی معنی مراد ہیں جو عامۂ بنی انسان کی فہم میں آتے ہیں اور جس کو وہ اپنے محاورات میں مستعمل کرتے ہیں مگر عقلا نے جو حقائق الاشیاء دریافت کرنے میں موشگافی کی اور زمین کا مرحلہ طے کر کے آسمان تک پہنچے تو بلحاظِ تحقیقات اختلاف پیدا ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا کس لیے کہ حکمائے قدیم کا مدار استدلال پر تھا اب کا اور ہے جوں جوں علوم و فنون ترقی کرتے گئے اور آلاتِ تحقیقات نئے نئے ایجاد ہوتے گئے ان پہلی تحقیقات کے خلاف باتیں ثابت ہوتی گئیں اور یہ سلسلہ نہ کسی حد پر جا کر منتہی ہوا ہے نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ آج کل کی جدید تحقیقات آئندہ کسی زمانے میں غلط اور جاہلانہ خیالات ثابت ہو جائیں اس لیے اسلام اور الہام اور الہامی کتابوں کو ان حقائق سے کوئی بحث نہیں نہ ان کا فرضِ منصبی ہے۔ یہ ادنیٰ کام یہاں کے عقلاء و حکماء کے سپرد ہے ان کا کام (علومِ روحانیہ و تزکیۂ نفس اور مرنے کے بعد آنے والی نئی زندگانی کے مفید کام اور سچا اعتقاد) بتانا ہے۔

حکمائے قدیم و جدید کا آسمانوں کی حقیقت میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ قدیم حکماء، کرہ ارضی، مائی، ہوائی، ناری کو یکے بعد دیگرے پیاز کے چھلکوں کی طرح باہم لپٹا ہوا بتلا کر ان کے اوپر یکے بعد دیگرے سات آسمان اور ان پر آٹھواں آسمان اور اس پر نواں فلک الافلاک

بتلاتے ہیں اور ہمارے اکثر علماء آٹھوں کو عرش نویں کو کرسی کہتے ہیں اور اس تحقیقِ قدیم کی طرف زیادہ مائل ہیں حکماءِ قدیم یہ بھی کہتے ہیں کہ زمین ساکن ہے اور آسمان مع ان ثوابت و سیارات کے ان میں جڑے ہوئے ہیں زمین کے گرداگرد گھومتے ہیں۔ قرآن اس سے ساکت ہے مگر بعض احادیث اس کے قدرے مؤید معلوم ہوتی ہیں حکماءِ جدید کہتے ہیں کہ آسمان فضاءِ محض کا نام ہے کوئی جسم نہیں زمین بھی دیگر سیارات و ثوابت کی طرح ایک تارا ہے جس طرح اور تارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں زمین بھی گھومتی ہے اور ستاروں میں لاکھوں کروڑوں کوس کا فاصلہ ہے اور ایک دوسرے سے لاکھوں ہزاروں حصہ بڑا ہے اور حرکت بھی ان کی ایسی تیز ہے کہ بعض ستارے ایک گھنٹہ میں بیس بیس ہزار میل سے زیادہ مسافت طے کر جاتے ہیں مگر ایک ایسے بالاتر مدبر نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ وہ باہم ٹکرانے نہیں پاتے۔ عقلا نے ریلوں کے کیا کیا انتظام کیے مگر پھر باہم لڑ جاتی ہیں یہ اس کی قدرتِ کاملہ کا بڑا نمونہ ہے۔

جو کچھ ہو بہرطور آسمان قدرتِ الٰہیہ کا ایک بڑا نمونہ ہے اور قرآن مجید کا یہی مقصود ہے جس پر نہ حکمتِ قدیم حملہ کر سکتی ہے نہ نیا فلسفہ۔ اگر کسی ستارے اور اس کی بناوٹ اور اس کے نور کی طرف غور کیا جائے اور اس کروڑوں پدموں کوسوں کی فضا کو دیکھا جائے (جس میں زمین سے ہزاروں لاکھوں حصہ بڑھ کر کرہ ہیں اور جس طرح یہ چھوٹا سا کرہ ایک عالم ہے اور اس میں کیا کیا حیوانات و نباتات ہیں۔ ان میں جو ہزاروں کروڑوں عالم ہیں کیا کچھ ہوگا اور وہ اتنے ہیں کہ جن کی تعداد نہ فلسفۂ قدیم بتلا سکتا ہے نہ جدید، بلکہ کروڑوں کراتِ عظیمہ تو بعد مسافت کی وجہ سے نظر ہی نہیں آسکتے۔ اب کوئی حکیمِ جدید و قدیم ان کے اندر کی کائنات اور وہاں کے اسبابِ تعیش اور وہاں کی سردی و گرمی، نور اندھیری کی کیفیتِ تامہ بتا سکتا ہے تو اس کی عظمت، وسعت، قدرت آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ تیسرا نمونۂ قدرت وانزل من السماء ماء ہے کہ اس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس سے انسانی خورش گوناگوں پیدا کی جن میں درجات متفاوتہ رکھے اور اس گھر کا یہ دسترخوانِ الٰہی ہے جس پر دوست و دشمن سب کھاتے ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عامِ اوست
چہ دشمن بر ایں خوانِ یغما چہ دوست

آسمان سے پانی اتارا یعنی ابر سے۔ اب ابر کی حقیقت (کہ وہ ابخراتِ ارضیہ ہیں جو اوپر جا کر برودت کی وجہ سے متکاثف ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے پانی برستا ہے) خدا نے بیان نہیں فرمائی جو کچھ ہو مگر اس میں بھی تامل اور غور کرنے سے عقل حیران ہو کر قدم قدم پر کھڑی ہو جاتی اور زبانِ حال سے پھر پکار اٹھتی ہے کہ اے خدا تو ہی ہے سب اسباب کا سلسلہ تیری ہے ہاتھوں میں ہے تو جب چاہتا ہے سلسلۂ اسباب میں رخنہ ڈال دیتا ہے اس پر اثر مرتب نہیں ہونے دیتا۔ ان سب باتوں کو بتا کر فرماتا ہے اب تو تم کو اس کا جلال و کمال معلوم ہو گیا اب جان بوجھ کر رسم و تقلیدِ آبائی میں اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

مسئلہ: شرک حرام ہے خدائے تعالیٰ کے سوا نہ کسی کی عبادت کرنا چاہیے نہ کسی کو اس کی ذات و صفات میں حصہ دار ٹھہرانا چاہیے۔

فائدہ: چونکہ اعمالِ صالحہ کے لیے ایمان شرط ہے اس لیے کفار و مشرکین پر صرف ایمان و توحید فرض ہے اس کے بعد دیگر احکام فرض ہوں گے۔ جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ کفار و مشرکین صرف اپنے فریضۂ ایمان و توحید کے ترک کرنے کے عذاب میں معذوب ہوں گے نہ دیگر احکام کے لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ دیگر احکام بھی ان پر فرض ہیں کس لیے کہ اس آیت میں لفظ الناس کافر اور مومن سب کو شامل ہے اور سب سے عبادت طلب ہے حالانکہ عبادت اعمال و احکام میں داخل ہے۔ اس لیے اول فریق نے جواب دیا کہ عبادت سے مراد توحید ہے۔ مگر یہ توجیہ بعید ہے بلکہ کفار سے بھی اعمالِ صالحہ مطلوب ہیں اور ان کا کفران عبادات سے مانع نہیں جس طرح کہ حدث وجوبِ صلوٰۃ سے مانع نہیں بلکہ یہ معنی کہ اے کفار عبادت کرو ایمان لا کر نماز پڑھو یعنی وضو کر کے فان من لوازم وجوب الشیء وجوب ما لا یتم الا بہ۔

ہاں یہ مسلم ہے کہ ایمان لانے کے بعد حالتِ کفر کی عبادات کی قضا اس پر لازم نہیں آتی۔

ربط: اس سے پہلے آیت میں خدا نے عبادت کا حکم دیا تھا اور عبادت مقبول عند اللہ اور غیر مقبول عند اللہ کا فرق صرف عقل سے نہیں ہو سکتا اس میں نبی اور الہام کی سخت ضرورت ہے جب تک نبی کا دامن ہاتھ میں نہ ہوگا کوئی شخص اس دریائے بیکنار سے پار نہ ہو سکے گا۔

محال ست سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

اس لیے ضرور ہوا کہ جناب نبی علیہ السلام کی نبوت بھی اس دلیل سے ثابت کی جاوے کہ جو قرآن کا منجانب اللہ ہونا بھی ثابت کرے تاکہ نبی اور اس کی کتاب کی پابندی اور اتباع سے خدا تعالیٰ کی عبادتِ مرغوبہ سرزد ہو اور متقی ہو کر دارین میں صلاح و فلاح پائے یا یوں کہو کہ حق سبحانہ مادہ اور مادیات سے پاک، بندہ مادی، یہ نہ اس کو دیکھ سکتا ہے نہ اس سے بات کر سکتا ہے۔ اب اس کی مرضی اور غیر مرضی کا علم ہو تو کیونکر۔ رہا ادراکِ عقلی اول تو عقول متفاوت پھر قوتِ متوہمہ اور متخیلہ کا تعارض جن میں عادات و رسم و رواج، صحت و مرض، جوانی و بڑھاپے تجربہ اور غیر تجربہ کو بہت دخل ہے اس لیے یہ جوہرِ نورانی ان اشیاء کے تلے ایسا دبا رہتا ہے جیسا کہ آفتاب سخت آندھیوں اور ابر کے تلے۔ اس لیے ادراکِ عقلیہ میں بنی آدم کے عقلاء کی آراء میں سخت مخالفت پیدا ہوتی ہے کوئی ایک چیز کو پسندیدۂ خدا اور موجبِ ثواب جانتا ہے۔ دوسرا اسی کو موجبِ غضبِ الٰہی اور باعثِ عذاب تصور کرتا ہے۔ اس لیے ایک نفسِ قدسی کی ضرورت ہوئی جس کی عقل ان چیزوں سے پاک ہو اور اس کو روحانی انکشاف ہو اس کا مادہ اس کی روح پر غالب نہ ہو اس پر وہ مؤید من اللہ بھی ہو جس کے کشف و ادراک کی صحت و درستی کا بندوں کی ہدایت کے لیے اس رحیم نے ذمہ بھی لے لیا ہو ایسے شخص کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ یہی خدا کی مرضی اور عدم مرضی اور اس کی ذات و صفات اور دیگر رازِ سربستہ سے بندوں کو خبر دے سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بغیر نبی کے اتباع کے انسان اس وادیِ پرخار اور بحرِ ذخار سے پار نہیں ہو سکتا اور اقرارِ رسالت[1] نجات کے لیے ضروری ثابت ہو گیا۔ اب ان آیات میں خدا تعالیٰ اپنے نبی کی نبوت عربوں کے مذاق کے مطابق ثابت کرتا ہے جس طرح کہ پہلی آیات میں اپنی توحید ثابت کی تھی فقال:

---

[1] کلکتہ میں عرصہ گزرا کہ ایک تیز طبع راجہ رام موہن نام بنگالی اہلِ اسلام اور پادریوں کی کتابوں سے واقف ہو کر اپنے قدیم مذہب بت پرستی اور عجائب پرستی سے بیزار ہوا مگر وہ شخص جویا خدا نہ تھا اس لیے اس نے مذہبِ حقانی کو قبول کرنا اپنی قوم کے روبرو نہایت شاق جان کر ایک اور نیا مذہب اسلام سے اخذ کیا اور اس میں کسی قدر یورپ کے ملحدوں کے خیالات اور کچھ عیسائیوں کی عبادات کو بھی ملا کر ایک معجون مرکب بنایا اور برائے نام اس کو قدیم مذہب ہنود کا عطر کہہ کے براہم دھرم نام رکھا اور حکیمانہ تقریروں پر اس کی شہرت اور شیوع کا دارومدار رکھا پھر اس کے بعد ایک شخص دربندوناتھ اس کے خلفاء میں سے کھڑا ہوا اور اس مذہب کو فروغ دیتا رہا اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں بابو کیسب چندر سین جو انگریزی میں خوب یدِ طولیٰ رکھتے تھے اس مذہب کے سرپرست بنے اور بعض یورپ کے شہروں میں اپنے خیالاتِ حکیمانہ پھیلاتے پھرتے۔ یورپ کے لوگ مذہب عیسوی کے بے ہودہ عقائد سے از حد نفور ہیں انہوں نے شاید اس کو غنیمت جان کے قبول بھی کیا ہو۔ اس مذہب کے یہ اصول ہیں: آسمانی کتاب قران یا وید تورات وغیرہ کوئی بھی نہیں بلکہ آسمانی دو کتاب ہیں، اول طبعی خیالات، دوم وہ اصلی صداقتیں جو اخلاق، خدا اور بقا کی بابت ہیں۔ انبیاء علیہم السلام سے نہ معجزہ ممکن ہے نہ کبھی سرزد ہوا ہے اور نہ ان سے خدا نے بطریقِ وحی یا الہام کلام کیا ہے نہ اس قسم کی نبوت کی کچھ ضرورت ہے بلکہ عقل کافی ہے اور انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے وقت میں بزرگ اور ناصح اور اموراتِ دینی میں فائدہ بخش تھے مگر وہ معصوم نہ تھے، نہ ان پر دینی ترقی کا خاتمہ ہو گیا بلکہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے اس میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ و محمد و نانک و کبیر سب شریک ہیں یعنی نبوت کے جو معنی اہل اسلام اور اہل کتاب کے ذہن میں ہیں یہ اس کے منکر ہیں۔ اس مذہب میں ہندو، عیسائی، مجوسی جو ان باتوں کے معتقد ہیں سب شریک ہیں۔ مرنے کے بعد صرف عمدہ کمالات کی خوشی کا نام جنت اور برے ملکات سے تاسف کرنے کا نام جہنم ہے۔ وسیلہ نجات عبادت ہے اور عبادت کے چار رکن ہیں۔ حمد الٰہی، روحِ الٰہی کا اپنی روح میں مراقبہ کرنا، خالق کا ہر دم شکر گزار رہنا، اس سے دعا مانگنا، برہمو سماج مذہب ←

کا خلاصہ ہے اور جو تفصیل چاہیے تو ان کے رسائل اور کتب کو دیکھئے، بالخصوص رسالہ خلاصۃ الاصول کو۔ اب چندروز ہوئے کہ بابو کسیب چندر سین مر گئے مگر صدہا بنگالی اور بہت سے اور لوگ بھی اس کی فصاحت و بلاغت سے ان کو اس زمانے کا نبی مانتے ہیں نعوذ باللہ منہ۔ اس مذہب کی ایجاد سے موجد کی دو غرض تھیں۔ ایک یہ کہ یہ مذہب صلح کل ہے، رعایا اور گورنمنٹ میں جس قدر رخزشہ مخالفت مذہبیہ سے پیش آتے ہیں وہ سب فرو ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ دوم یہ مذہب برائے نام تو وہی قدیم مذہب ہنود کہلائے گا مگر مخالفوں کے اعتراضات سے کہ جو پیشتر اس مذہب پر پڑتے ہیں نجات حاصل ہو جائے گی۔ کھانے پینے کی جو بیجا قیودات اس مذہب میں تھیں سب اٹھ جاویں گی۔ سفر یورپ اور وہاں سے تعلیم پانے کے مواقع جاتے رہیں گے۔

مذہبِ نیچری: شہر دہلی جب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں نہایت تنزل کو پہنچا اور وہاں کے علماء، شرفاء، اہلِ ہنر جو عہدِ سلطنتِ حضرت شاہجہاں سے آباد تھے، ادھر اُدھر پریشان ہو کر نکل گئے تو اس زمانہ میں خاص کشمیر یا اس کے نواح کے کچھ لوگ آ بسے، فدا حسین رسول شاہی اور دیگر قلندر بنگ نوش شبلی ٹوپی والے آزاد اسی قوم میں گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض خان صاحب اور بعض مرزا اور بعض سید اور میر صاحب کہلاتے ہیں۔ اس قوم کے بعض لوگوں نے اس بڑی سلطنت میں کچھ رسوخ بھی حاصل کیا تھا اور کوئی مقرر لقب بھی خریدا تھا اسی کنبے میں سے ایک شخص سید احمد خان صاحب بہادر بھی پیدا ہوئے۔ یہ شخص ابتدا میں مولوی مخصوص اللہ صاحب نبیرۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر کسی قدر صرف و نحو سے آشنا ہوئے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے لیکن جب یہ نسخہ نہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خداداد سے کوئی اچھا عہدہ بھی پایا پھر تو پکے وہابی متبع مولوی اسماعیل صاحب ہو گئے اور ایک کتاب آثار الصنادید☆ لکھ کر شہر کے اہلِ علم و فضل میں بھی شہرت اور عزت حاصل کی اس عرصہ میں غدر ہو گیا اور سید صاحب اپنی خیر خواہی اور حکام رسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر یا رفارمر مانے گئے اور سی ایس آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش ۱۸۵۷ء کے فساد سے (کہ جس کا منشاء صرف توہماتِ جاہلانہ تھے) پر غدر ہوا اور سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالات مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑا اٹھایا ہو یا اپنی ترقی اور خیر خواہی کے لیے یہ خیال از خود سید صاحب نے پیدا کیا ہو اور غالباً یوں ہی ہوگا کیونکہ گورنمنٹ کو ان باتوں کی طرف چنداں خیال نہیں خیر ہر چہ باشد مگر اس شخص نے اسی ارادہ سے ایک کتاب تبیین الکلام بائبل کی تفسیر میں لکھ کر عیسائیوں اور مسلمانوں کو باہم ملانا اور ایک بنانا چاہا مگر اس امرِ محال کے وقوع میں سید صاحب ناکام رہے۔ اس عرصہ میں سید صاحب نے کلکتہ میں برہمو سماج مذہب کو ہونہار دیکھا اور اس کے اصول کو یورپ کے فلاسفروں اور ایشیا کے معلموں کے مطابق خیال پا کر از حد پسند کیا اور جو دل میں مراد تھی اس کو بلا محنت و مشقت پا لیا، لیکن یہ بات نہ تنہا ان کے دلی مقصد بلکہ ان کے شان کے بھی خلاف تھی کہ وہ کھلم کھلا اسلام کو ترک کر کے ایک بنگالی بابو کے مرید اور امت کہلاتے مگر دل میں یہ سوچا کہ برائے نام تو اسلام ہو مگر اس کو برہمو سماج مذہب کے مطابق کیجئے۔ لفظ نبی اور ملائکہ اور جبریل اور جنت دوزخ و وحی والہام و شیطان بلکہ سماء جن کو تو بحالِ خود رہنے دیجئے اور ہر مسلمان سے کہئے کہ میں ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہوں تا کہ مسلمانوں کو مجالِ تکفیر نہ ہو اور ان الفاظ کے معانی بالکل پلٹ دیجئے۔ نبی صرف رفارمر کہ جس میں بڑھئی لوہار کے کام کے مانند اس وعظ گوئی کا ملکہ ہو اور نبوت ہر زمانے میں پائی جاتی ہے بلکہ ہر قوم اور پیشہ میں دیکھو۔ نظامی و جامی کو پیغمبرانِ سخن کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بابو کسیب چندر سین بھی نبی ہیں اور انگلینڈ میں بھی فلاں فلاں شخص نبی ہیں۔ نبی کے لیے معجزہ یا کرامت جس کو خرقِ عادات کہتے ہیں شرط نہیں۔ یہ صرف پرانے خیالات ہیں بلکہ خرقِ عادات ممکن ہی نہیں۔ الہام یا وحی خیالاتِ فطری کا جوش ہے اور جبریل جو اس کو لاتا ہے کوئی شخصِ خاص نہیں وہ اس نبی کی قوت ہے جو فطرت کے موافق فوارہ کی طرح اچھل کر اسی پر گرتی

☆ دراصل آثار الصنادید سید صاحب کی تالیف کردہ کتاب نہیں ہے بلکہ مرزا سنگین بیگ شاہ جہاں تہار کے رہنے والے مولانا بخشی محمود کے پوتے بحکم سر جان چارلس متکاف ایک کتاب موسوم بہ سیر المنازل لکھی جو دراصل فارسی میں ہے جس کو میں نے قلعہ کے عجائب خانہ میں داخل کر دیا ہے جس کا دل چاہے جا کر دیکھ لے اور آثار صنادید سے مقابلہ کرے۔ حضرات دہلی کے حالات جو کہ آخر کتاب آثار الصنادید میں مذکور ہیں یہ سید صاحب کی ذاتی تحقیق ہے۔۱۲ حقانی

ہے اور یہی معنی نزول کے ہیں ملائکہ اشخاص متحیزہ بالذات نہیں قرآن میں جو لفظ ملائکہ یا ملک یا جبرئیل آیا ہے اس سے انسان کی قوتِ ملکیہ مراد ہے۔ جس طرح شیطان سے قوتِ بہیمیہ اور جن سے ایک جنگلی قوم کہ جو لوگوں سے پوشیدہ رہتے تھے اور جنت و دوزخ صرف خوشی و غمی کا نام ہے۔ باقی حوریں اور نہریں اور میوے جو قرآن اور نبی علیہ السلام نے بیان فرمائی ہیں وہ محض رغبت اور خوف دلانے کو اس خوشی و غم کو ان چیزوں کے ساتھ تفسیر یا تشریح کر دی ہے ورنہ کچھ نہیں۔ آسمان سے مراد بلندی اور جو ہے اور چونکہ یہ بُعدِ غیر متناہی اور متصل یکے بعد دیگرے ہے اس لیے اس کو سبع سمٰوات کے ساتھ تعبیر کیا۔ وقس علی ہذا۔ یہ باتیں سید صاحب کی تفسیر اور پرچہ تہذیب الاخلاق میں موجود ہیں۔ مقدمہ تفسیر میں ان کے حوالے بقیدِ سطر و صفحہ مندرج ہیں اور آئندہ بھی ہم ان اقوال کو نقل کریں گے اب یہ کچھ ضرور نہیں کہ سید صاحب حرف بہ حرف بنگالی بابو کے معتقد ہوں بلکہ ممکن ہے کہ ان سے بھی ترقی کر جائیں، کیونکہ اول تو سید صاحب دلی کے رہنے والے ہیں، دوم اس خاندان کے نونہال (یا اب شجرِ کہنہ) کہ جو مذاہب میں پیشوا ہونے کے جبلی لیاقت رکھتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک بنگالی دال بھات کھانے والے سے کہ جس کا بڑا سرمایہ انگریزی دانی ہے پیچھے رہ جائیں؟ اس لیے سید صاحب نے ایک جدید اسلام کی بنیاد ڈالی اور پرچہ تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۲۹۶ ہجری صفحہ ۱۴۱ سے ۱۴۳ و ۱۰۰ میں یوں تحریر فرمایا ہے الاسلام هو الفطرة و الفطرة هو الاسلام اسلام جو ہے وہ فطرت ہے اور فطرۃ جو ہے وہ اسلام ہے اور فطرت اسلام کا دوسرا نام ہے۔ لامذہبی بھی درحقیقت اسلام ہے کیونکہ لامذہب بھی کوئی مذہب رکھتا ہے اور وہی اسلام ہے الخ اور وہی عین فطرت و نیچر ہے جو آدمی نہ کسی نبی کو مانتا ہو اور نہ کسی اوتار کو اور نہ کسی کتابِ الہامی کو اور نہ کسی حکم کو کہ جو مذاہب میں فرض اور واجب سے تعبیر کئے گئے ہیں بلکہ صرف خدائے واحد پر یقین رکھتا ہو وہ آدمی کسی مذہب میں نہیں ہے مگر مسلمان ہے اور جو لوگ خدا کے بھی قائل نہیں ہیں وہ بھی مسلمان ہیں کیونکہ الخ ان کے اہلِ جنت ہونے میں کیا شک باقی رہا، انتہا اس تائید میں سید صاحب اس حدیث کو پیش کرتے ہیں۔ من قال لا اله الا لله دخل الجنة و ان زنی و ان سرق علی رغم انف ابی ذر۔ سید صاحب کی تعریفِ اسلامِ جدید کے بموجب تو جو شخص جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کا منکر بلکہ سخت مخالف ہو جیسا کہ ابو جہل وغیرہ وہ بھی مسلمان اور جنتی ہے بلکہ کل بنی آدم اول سے اخیر تک مسلمان اور جنتی ہیں خواہ وہ کیسا ہی عقیدہ رکھیں اور کچھ ہی کریں۔ اس اسلامِ جدید کی اس قدر حدود وسیع کرنے سے سید صاحب کے چند اغراض اور ایک وجہ ہے۔ غرض اول یہ کہ نہ تنہا بنگالی بابو نے اپنے مذہب کو ایسا وسیع کیا کہ کسی طرح ہندو دھرم سے باہر ہی نہیں ہوتا خواہ گائے کا گوشت کھائے خواہ وید اور اوتاروں کا منکر ہو بلکہ سید صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر اسلامِ جدید کو وسعت دی کہ کفرِ منصوص کو بھی اسلام کا مصداق بنا دیا تا کہ ان کے مریدوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل رہے۔ دوم یہ کہ جو چیزیں اسلامِ حقیقی کے بالکل برخلاف ہیں اور ان پر پابندی کی سخت تاکید اور ان کی مخالفت پر بڑی تہدید ہے ان کے ترک و استعمال سے کچھ محذور لازم نہ آوے۔ پھر حکام کی خوشنودی یا نفس کی خواہش سے ان کو عمل میں لائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کوئی خانہ کعبہ ہی کیوں نہ گرائے اور قرآن مجید اور اس کی ہدایتوں پر قہقہہ ہی کیوں نہ اڑائے۔ نعوذ باللہ آنحضرت علیہ السلام سے جس قدر چاہے دشمنی کرے اور سور کھائے، شراب پیے تو بھی پکا مسلمان جنتی رہتا ہے۔ اس پر اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض کا محل نہیں۔ سوم اس وقت جو عیسائی حاکم ہیں ان کو بھی غیر نہ جانیں نہ مخالفتِ مذہبی نہ ان کے تعصبات کو خیال میں لائیں کیونکہ وہ بھی تو مسلمان ہیں۔ حقیقت میں حکام رسی کا یہ عمدہ ذریعہ سید صاحب کے ہاتھ آیا۔ صرف برائے نام مسلمان رہ کر جو چاہو سو کرو اور وجہ یہ ہے کہ جب سید صاحب بابو کسیب چندر سین کی تقلید میں لندن تشریف لے گئے اور وہاں خطباتِ احمدیہ ایک کتاب لکھ کر بابو صاحب کی طرح یورپین کو اپنا مرید بنانا چاہا تو لوگوں نے سید صاحب پر اعتراض کرنا شروع کیا کہ نیچر اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر اتباعِ نبی عربی کوئی شخص مہذب اور نہایت علوم کا ماہر نجات نہ پائے اور باستثنائے اہلِ اسلام تمام یورپ بلکہ کل بنی آدم جہنم میں جائیں، اس لیے سید صاحب نے اسلامِ جدید کو وسیع کیا پھر سید صاحب نے اپنے خیالات کی ترقی کے لیے ایک مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا اور ایک اخبار تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس پر بس نہ کر کے قرآن مجید کی تفسیر اور قرآن مجید کو اپنے اسلامِ جدید کے مطابق بنانا چاہا۔ اس زمانے کے امراء تو نام پر مرتے ہیں جہاں ان کو سبز باغ دکھلایا (کہ اس مدرسہ سے اہلِ اسلام کو دینی و دنیوی ترقی ہوگی) جھٹ معین و مددگار ہو گئے اور گورنمنٹ برٹش میں ان کی معیت کو عمدہ ذریعۂ تقرب سمجھا۔ اور بعض وہ لوگ بھی کہ جن کو انگریزی خیالات نے بے قید کر دیا اور وہ برائے نام مسلمان ہونا کافی سمجھتے ہیں۔ اس مذہب کے معین و مددگار بن گئے اور بعض تو صرف کوٹ پتلون پہن کر جنٹلمین کہلانے کے لیے سید صاحب کے

دین میں آئے۔

ایک پادری صاحب اپنے ایک رسالہ تنقید الخیالات مطبوعہ الٰہ آباد مشن پریس ۱۸۸۲ء میں سید صاحب کے اس ایجادِ خاندانی کو اور بات پر محمول کرتے ہیں یہ کہ سید صاحب کی نظروں میں پادریوں اور حکماءِ یورپ کی روشنیِ علم وتحقیقات سے اصولِ اسلام نہایت کمزور اور لغو معلوم ہوئے لیکن سید صاحب نے اسلام کو ترک کرنا مناسب نہ جانا۔ برائے نام اس کو قائم رکھ کر ایک نیا اسلام ایجاد کیا کہ جو اصول حکماءِ یورپ پر مبنی ہو اور جس پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہ ہو اور نیز باعتبارِ مشقتِ عمل وقیدِ حلال وحرام کے بھی بہت آسان ہو۔

میرے نزدیک پادری صاحب کا یہ خیال خام ہے کیونکہ سید صاحب کو مذہبِ عیسوی کی حقیقت معلوم ہے۔ شاید حکمائے یورپ ودہریانِ فرنگ کے ملمع کار خیالات نے پریشان کیا ہو تو کیا عجب مگر سید صاحب نہ علومِ قدیم سے واقف نہ نئے علوم اور جدید فلسفہ سے بہرہ رکھتے ہیں۔ اپنی علمی کمزوری سے فلسفۂ جدید سے اسلام کا شکست کھانا تسلیم کر بیٹھے اور اصولِ اسلام کی تاویلیں کرنے لگے، حالانکہ اسلامی اصول پر فلسفۂ جدید کا کوئی قوی اعتراض ہی نہیں پڑتا۔ دوم فلسفۂ جدید اور سائنس حال کا یہ حال ہے کہ یوماً فیوماً اس میں تنسیخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جن بعض مسائل کو دس برس آگے یورپ میں حق سمجھا جاتا تھا آج ان کے معتقد کو جاہل خیال کیا جاتا ہے پھر آیندہ کون ضمانت کر سکتا ہے کہ موجودہ مسائل غلط ثابت نہ ہوں گے۔ جن کے زور پر اسلام پر اعتراض قائم کیا جاتا ہے۔ اب میں پادری صاحب کے باقی اقوال نقل کرتا ہوں تا کہ ناظرین کو میری رائے کی تصدیق ہو۔ قولہ سید صاحب تہذیب الاخلاق جمادی الاول ۱۲۹۶ھ صفحہ ۲۰۱ و ۱۲۹۷ ہجری صفحہ ۲۰۲ وغیرہ میں فرماتے ہیں کہ اسلام کی وہ حالتِ مجموعی جو تیرہ سو برس سے دنیا میں کہلایا درحقیقت وہ اسلام نہ تھا وہ تو علماءِ محمدیہ کا تراشا ہوا یا قرآن وحدیث کے درست مطلب نہ سمجھ کر نکالا ہوا اسلام تھا اگرچہ اس میں درست بھی ہے تو اسی قدر درست تھا جس پر کچھ اعتراض نہ پڑتا ہو اور جتنی باتوں پر علوم سے یا غیر اشخاص سے اعتراض وارد ہوئے ہیں وہ سب نقصان کی باتیں ہمارے بزرگ عالموں کی غلطی سے اسلام میں قرار پکڑے ہوئے تھیں وہ حقیقی خیالات اسلام کے نہ تھے وہ گویا کاٹ کی ہنڈیا تھی جو اس وقت جل رہی ہے۔

مراد ان کی یہ ہے کہ جس کو آج تک امت محمدیہ نے اسلام سمجھا وہ اسلام نہ تھا اسی لیے تو جو اعتراض دنیاوی علوم کی روشنی سے یا مخالفوں سے اس پر وارد ہوئے وہ سب برحق نکلے اور وہ اسلام پوری شکست کھا گیا۔ فی الحقیقت جو سچا اسلام ہے وہ درست ہے اور مضبوط۔ گویا وہ اسپات کی ہنڈیا ہے اور وہ آج تک سب محمدی علماء سے پوشیدہ رہا۔ اب ہم اس کو تیرہ سو برس بعد ظاہر کرتے ہیں اور اس کا خیال اس زمانے میں صرف مجھ سید احمد خاں ہی کو آیا ہے اور میں اپنا فرض سمجھ کر ان خیالوں کو ظاہر کرتا ہوں۔ الخ

لیکن سید صاحب یہ نہیں بتا سکتے کہ کس عہد تک اس درست راہ پر مسلمان رہے تھے تا کہ ہم اس عہد کے خیالات کا مقابلہ سید احمد خاں صاحب کے خیالات سے کریں۔ الخ پس میں نے سید صاحب کے خیالات پر حتی المقدور بہت فکر کیا کہ وہ کیا کہتے ہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ سید صاحب کا خیال ہرگز درست نہیں محض غلط بات ہے کہ اسلام قدیم اسلام نہ تھا اور اسلامِ جدید جو سید صاحب دکھاتے ہیں درست اسلام ہے۔

قدیمی اسلام جس کو وہ کاٹ کی جلتی ہنڈیا بتلاتے ہیں یقیناً وہی حقیقی اسلام ہے جو محمد ﷺ نے اپنی امت کو دیا تھا۔ پر وہ نیا اسلام جس کو انہوں نے اس زمانے میں نکالا اور اہلِ ہند کے سامنے پیش کیا ہے وہ ہرگز اسلام نہیں ہے بلکہ اس میں اکثر وہ خیالات بھرے گئے ہیں جو ہندوؤں کے ایک برہمو فرقے کے ہیں اور وہ یہی چندروز سے شہر کلکتہ میں نکلے ہیں یا ان لوگوں کے بعض خیالات اسلام میں داخل کئے ہیں جو قدیم زمانہ سے آج تک انبیائی سلسلہ کے مخالف ہیں جن کو دنیاوی عقلمند کہتے ہیں۔ ان خیالوں کو سید صاحب نقرات میں لپیٹ کر اسلام میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دعویٰ سن کر شروع میں مجھے خیال آیا تھا کہ شاید سید صاحب اسلام کے وہ زوائد جو پیچھے سے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کاٹ چھانٹ کر دکھا دیں گے لیکن اب جو کچھ کہ انہوں نے دکھلایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ تو کہیں سے کہیں چلے گئے۔ حقیقی اسلام ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور ایسا چھوٹا کہ بہت ہی دور رہ گیا۔ اس لیے علماءِ محمدیہ نے ان کی نسبت سخت فتوے لکھے ہیں۔ اسلام فی الحقیقت وہی ہے کہ جس کو مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ سے پایا۔ یا یوں کہو کہ اسلام وہ ہے کہ جو قرآن وحدیث سے متبادر اہلِ زبان کے ذہن میں آیا اور ابتدائے دعویٰ نبوت سے بیس برس تک دنیا میں حضرت محمد ﷺ نے قولاً وفعلاً اس کی تعلیم دی ہے۔ یہ بات تو

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم کو اس چیز میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے شک ہو تو تم بھی اس کی مانند کوئی سورۃ بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس قدر تمہارے حمایتی ہوں (مدد کے لیے) بلا لو۔ اگر تم سچے ہو پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے بنائی گئی ہے۔

دیکھی جاتی ہے کہ کسی مرشدِ برحق یا غیر برحق کے خیالات پر اہلِ غرض اور بے احتیاط مفسر کبھی کبھی اپنے خیالات کی قلعی چڑھا لیا کرتے ہیں الخ اگر سید صاحب زوائدِ اسلام کو خارج کر کے اسلام جو قرآن وحدیث میں ہے دکھلاتے اور پھر ثابت کرتے کہ علوم کی روشنی اور مخالفوں کے اعتراض سے محفوظ ہے تو ان کی یہ کوشش قابلِ تحسین وشکر تھی لیکن سید صاحب نے ملحدوں اور لامذہبوں اور حکماءِ مخالفینِ انبیاء کے اصول اور کلکتہ کے بنگالیوں کے خیالات جن کے دلوں میں سے بت پرستی کو انگریزی تعلیم نے نکالا اور ملحد انگریزوں کے اصولوں کو جمع کر کے قرآن وحدیث میں جمع کرنے کا پورا بندوبست کر لیا اور یہ بھی اس طرح پر کہ قرآن وحدیث کے صاف وصریح مطلب کو تحریفِ معنوی اور اجنبی تاویلوں سے دھکے دے کر وہاں سے نکالتے ہیں اور اپنے مرغوب خیالوں کو وہاں بٹھلاتے ہیں جو ہرگز نہ بیٹھ سکتے اور یہ کام اس مراد سے ہے کہ اسلامِ قدیم کے اصول مخالفین سے شکست کھا چکے ہیں لیکن جب وہ اس طرح الٹ پلٹ اس میں کریں گے تو پھر اس اسلامِ جدید پر یہ اعتراضات نہ ہوں گے کیونکہ سید صاحب کے گمان میں ملحدوں کے خیالات انبیائی خیالات سے مضبوط اور استوار ہیں۔ اس صورت میں سید صاحب کو ایک بڑی مشکل پیش آئی کہ تمام کتبِ مسلمہ اہلِ اسلام کو چھوڑنا پڑا اور بہت سی تواریخی باتوں کو بھی تبدیل کر کے اپنے دل سے نئی تواریخ تصنیف کرنی پڑی تاہم ایک سخت مشکل باقی رہ گئی کہ ان خیالات کی سند جن کو وہ دکھلاتے ہیں حضور انور ﷺ تک نہ پہنچی گویا کہ قرآن کو حضرت محمد ﷺ نے دیا اور معنی اس میں تیرہ سو برس بعد سید صاحب نے ڈالے اور سند ان معنوں کی نہ حضور انور ﷺ تک مگر اہلِ الحاد تک پہنچی۔ اس کے علاوہ اسلامِ جدید میں اسلامِ قدیم کے برخلاف نیا الہام اور نئی وحی اور نیا خدا اور نیا نبی تجویز کرنا پڑا اور اسی طرح دوزخ اور بہشت اور اصولی باتوں میں بہت ہی بڑی تبدیلی کرنی پڑی۔ باوجود اس کے یہ اسلامِ جدید زیادہ ترمحلِ اعتراض ہے اپنی تصانیف میں جہاں تک سید صاحب نے علوم کی روشنی سے اسلامِ قدیم کی شکست دکھلائی ہے میرے گمان میں تو یہ اس کی کچھ بھی شکست نہیں کیونکہ حکماءِ مخالفینِ انبیاء کے چند خیالات ہیں۔ جن سے کوئی مذہب مدعیِ الہام ونبوت شکست نہیں کھا سکتا بلکہ وہ حکما ہی طالبانِ حق کی نظروں میں حقیر ہیں اور رہیں گے۔ مثلاً خدا کا محالاتِ عادیہ پر قادر ہونا حکیم نہیں مانتے۔ اسلام اس کا قائل ہے اس مکروہ خیال سے اسلام کو شکست نہیں ہوئی بلکہ اس خیالِ مکروہ کو الخ انتہٰی مخلصاً۔ پھر یہ پادری صاحب اپنے اس رسالہ کے ۴ صفحہ میں یہ کہتے ہیں قولہ ''پہلے سید صاحب نے تبیین الکلام ایک کتاب لکھی تھی اور اس میں خدا کے کلامِ برحق کی تفسیر اکثر مقامات میں کچھ اپنے طور سے کر کے عیسائیوں اور محمدیوں کو قریب قریب ایک حکمت سے لایا چاہتے ہیں لیکن جو تفسیر خلافِ حق ہو وہ کب مقبول ہو سکتی ہے اس لیے انہوں نے اپنے پہلے خیالات کو چھوڑ دیا اور اب وہ اسلام کی مرمت کے درپے ہیں مگر یہ بھی انہونی بات ہے کیونکہ نام تو مرمت کا لیا ہے مگر بنیاد اور ہی ڈالی ہے جس کو ہرگز اسلام نہیں کہہ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ علمائے محمدیہ ان کے برخلاف ہیں۔ ہاں بعض محمدی کہ جو اہلِ یورپ کے خیالات سے بہرہ یاب ہیں وہ سید صاحب کے ساتھ موافق ہیں نہ اس لیے کہ سید صاحب ٹھیک اسلام کے موافق بول رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ انگریزی خیالات سے ان کے خیالات کچھ اور ہی طرح کے ہوں گے اور محمدی اسلام انہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا اور کسی مذہب میں اس کو چھوڑ کر کسی وجہ سے شامل ہونا بھی نہیں چاہتے۔ ان کو تو صرف قومی آرام و آسائشِ دنیا اور آبائی نام کے لیے اسلام کا نام ہی کافی ہے۔ جس عقلی راہ پر ان کو چاہو لے چلو وہ تیار ہیں کیونکہ وہ اپنی اس طبیعت کے مطیع ہیں جو انگریزی خیالوں سے ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ان خیالات کے کچھ درپے نہیں کہ جو ان کے آباء کو محمد صاحب نے دیے تھے۔ انتہٰی ملخصاً۔ ۱۲ منہ

ترکیب: ان کنتم فی ریب الخ شرط فاتوا بسورۃ من مثلہ جزا یعنی جواب مما نزلنا موضع جر میں صفت ہے ریب کی ای کائن مما نزلنا اور عائد محذوف ہے ای نزلناہ اور ما بمعنی الذی ہے من مثلہ صفت ہے سورۃ کی ای بسورۃ کائنۃ من مثلہ اور ضمیر مثلہ کی یا انزلنا کی طرف رجوع کرتی ہے اور من تبعیضیہ ہے یا بیانیہ ای بسورۃ مماثلۃ القرآن فی البلاغۃ یا ضمیر مثلہ کی عبدنا کی طرف رجوع کرتی ہے پس اس وقت میں من ابتدائیہ ہے اب یہ معنی ہوئے کہ کوئی صورت مثل محمد ﷺ کی سی بنوا کر لاؤ کہ جو امی ہو اور جس نے کبھی شعر و سخن کی مشاقی بھی نہ کی ہو وادعوا شھداء کم جملہ انشائیہ معطوف ہے فاتوا پر من دون اللہ موضع حال میں ہے شھداء سے یعنی شہداء کم منفردین عن اللہ ان کنتم صادقین شرط اس کا جواب محذوف ہے اس پر کلام سابق دال ہے اعنی فاتوا وادعو، فان لم تفعلوا شرط اور فاتقوا النار الخ اس کا جواب اور لن تفعلوا جملہ معترضہ۔ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ جملہ خبریہ موضع حال میں ہے النار سے اور عامل اس میں فاتقوا ہے۔

تفسیر: یعنی اگر تم کو ہمارے اس کلام میں کہ جس کو ہم نے اپنے بندے محمد ﷺ پر نازل کیا ہے (قرآن) کچھ شک ہو کہ آیا یہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں اور یہ نبیِ برحق ہے یا نہیں تو قطع نظر اور معجزات و آیاتِ بینات کہ جن میں تمہارا عجز ظاہر ہے تم خاص اس کلام ہی کا مقابلہ کر کے دیکھو کہ جس کی تعمیل (معجزات سے) مقصود بالذات ہے کیونکہ ہر قسم کے کلام مرکب کرنے میں تم آنحضرت ﷺ سے کسی بات میں کم نہیں۔ تم بھی اہلِ زبان ہو اور تم بھی خاص اسی شہر اور اسی ملک اور اسی قوم کے لوگ ہو کہ جس کے نبی ﷺ ہیں بلکہ تم ان سے اس امر میں کہیں بڑھ کر ہو کیونکہ اول تو شعر و سخن کے مشاق ہو اور نبی ﷺ کو تم ابتدائے عمر سے عبادت و ریاضت اور گوشۂ تنہائی میں ساکت و صامت دیکھتے ہو دوم ہر مجلس و میلہ اور ہر ایک قسم کے مجمع میں کہ جہاں اہلِ سخن جمع ہوا کرتے ہیں اپنے اشعار کو جلا دیتے اور اس کی مشاقی بہم پہنچاتے ہو اور حضرت ﷺ تو اس قسم کے مجامع میں مدت العمر میں ایک بار بھی تشریف نہیں لے گئے تھے۔ سوم تم کو مبالغہ اور زیادہ گوئی میں اور ہر قسم کی لفاظی میں کچھ بھی احتیاط نہیں اور یہ امور فصاحت و بلاغت کے سامان اور خوش بیانی کے مصالح ہیں۔ پس باوجود اس کے تم سے ایک سورہ کے برابر بھی کلام مرکب نہیں کیا جاتا اور تم کو نہایت زور اور دعوے سے کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی اجازت دی جاتی ہے کہ ایک نہیں بلکہ سب مل کر بنا لاؤ اور اپنے ان معبودوں سے بھی مدد لو کہ جن کو تم ہر قسم کی قدرت اور اختیار کا مبدء اور ہر طرح کا حاجت روا جان کو پوجتے ہو جب بھی تم سے ایک سورہ کے برابر بھی کلام نہ بن سکا اور نہ کبھی بن سکے گا تو یقین کر لو کہ یہ اس کا کلام ہے کہ جو تمام لوگوں اور غیر اللہ سب معبودوں سے بڑھ کر ہے اور وہ خدائے تعالیٰ ہے کہ جو ہر بات میں سب سے نرالا ہے جب یہ ہے تو خدائے قادر کا مقابلہ اور اس کے کلام کو جھٹلانا جہنم میں (کہ جس کی آگ یہاں کی آگ سے سخت اور تیز ہے جس میں پتھر اور آدمی جلتے ہیں) ٹھکانا بنانا ہے۔ اب تم کو لازم ہے کہ اس آگ سے بچنے کا سامان کرو۔ یعنی اس کلام پر صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور اس حیات بخش کلام کو اپنا دستور العمل بناؤ۔

متعلقات: معجزہ: اس امرِ خارقِ عادت کو کہتے ہیں جو مدعیِ نبوت سے سرزد ہو خواہ وہ کلام ہو یا کوئی اور کام ہو اور چونکہ مخالف کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ویسے امر جمانے کی قدرت نہیں ہوتی بلکہ وہ عاجز ہوتا ہے اس لیے اس کو معجزہ کہتے ہیں اور اسی لیے یہ معجزہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جس کے ہاتھ سے یہ سرزد ہوا ہے وہ مؤید من اللہ ہے یعنی اس عالمِ اسباب میں جس قدر امور واقع ہوتے ہیں وہ اسباب پر مبنی ہوتے ہیں اور ان اسباب کا سلسلہ جنابِ باری پر ختم ہوتا ہے۔ اس لیے ان امور کو ظاہر اسباب پر نظر کر کے اسباب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور جن کی چشمِ حق بین نورِ الہام سے روشن ہے وہ ان اسباب سے قطع نظر کر کے اس مسبب الاسباب کی طرف اس فعل کو منسوب کر دیتے ہیں۔ لیکن جب خدائے تعالیٰ کو اپنے ہادی کی عام لوگوں کے روبرو تصدیق منظور ہوتی ہے تو وہ خلافِ عادات ان اسباب کو درمیان سے اٹھا کر بغیر ان کے کوئی کام اس نبی کی معرفت سرزد کرا دیتا ہے تاکہ اسباب کی طرف نظر نہ پڑے اور یہ فعل اسی کا معلوم ہو۔ مگر یہ کام خدا کا ہے جب چاہے کرتا ہے نبی گو چاہے اور وہ کسی مصلحت سے نہ چاہے تو نہیں کرتا۔ یورپ کے بہت سے حکماء کہ جن کو صرف ظاہر بین آنکھیں عطا

ہوئی ہیں اس امرِ خارقِ عادت کا انکار کرتے ہیں اور ان کی تقلید سے فرقہ برہمو سماج بھی منکر ہے اور ان کی تقلید سے سید احمد خان صاحب و غیرہم بھی اصولِ اسلام کے برخلاف اس کا انکار کرتے ہیں اور بلا دلیل ناممکن اور محال بتلاتے ہیں اور لطف یہ کہ اب تک امکان اور وجوب اور محال کے معانی سے بھی بے خبر ہیں۔ یہ انکار اس لیے ہے کہ انہوں نے کبھی معجزہ یا خارقِ عادت بات دیکھی نہیں اور یہ طبائعِ عامہ کا جبلی خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو مدت العمر دیکھتے نہیں اس کے وجود بلکہ امکان میں بھی شک کرتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے ریگستان میں کہ جس نے مدت العمر کوئی ندی یا دریا نہ دیکھا تھا دریا کا مفہوم سن کر بڑا تعجب کیا اور پھر سمندر کا حال سن کر تو دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ دیا واللہ لایمکن ثم باللہ لایمکن۔

اہلِ اسلام[1] کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے اور اس کی مانند بنانا طاقتِ بشریہ سے خارج ہے۔ خواہ مضامین کی خوبی سے ہو یا اس کے ساتھ عبارت بھی حدِ اعجاز کو پہنچ گئی ہو یا کوئی اور سر ہو مگر جمہور اہلِ اسلام یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت میں بھی بے مثل ہے اور اس کا مثل بنانا بشر سے محال ہے اور یہ بات خدا نے اس لیے قرآن میں رکھی کہ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ خدا تعالیٰ نے اس میں ان کو عاجز کر کے اس کا منجانب اللہ ہونا بتلا دیا۔[2]

---

[1] بعض نادان نافہم اپنی جہالت سے مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کرنے کا شوق رکھتے ہیں مگر ان کی بدنصیبی کہ مسلمانوں نے جو کچھ اسلام کے معارف کی بابت لکھا ہے ان کتابوں کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ اعتراض کرتے ہیں قرآن محمد صاحب ۔ کے زمانہ میں تو لکھا نہیں گیا۔ برسوں بعد خلیفہ عثمان نے جمع کیا لہٰذا کیا ثبوت ہے کہ اس میں تغیر و تبدل نہ ہوا ہو۔ **جواب:** صحیح تواریخ و روایات سے ثابت کر دیا گیا ہے کہ تمام قرآن آنحضرت ﷺ کے عہد میں لکھا گیا تھا مگر اجزاء متفرق تھے۔ حفاظ موجود تھے آج کل کے حافظوں سے زیادہ۔ ممکن نہیں کہ ایک زبر و زیر کا بھی فرق ہو جائے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر کے عہد کے قرآن سے چند نسخے لکھوا کر جا بجا تمام ملک شام مصر وغیرہ ممالک میں بھیجے تھے۔ زید بن ثابت وغیرہ بڑے بڑے حافظوں کی نگرانی تھی۔ اس پر یہ احتمال کرنا کہ کہیں کم زیادہ نہ ہو گیا ہو گویا اپنی کتابوں پر قیاس ہے جن کا نہ ابتدا میں کوئی حافظ تھا نہ آج کل ہے۔ اپنی کتابوں کو جو درختوں کے پتوں پر لکھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی حادثۂ عظیم سے پتے گم ہو گئے ہوں اور اصل کتاب میں کمی بیشی ہو گئی ہو مگر قرآن مجید حافظوں کے سینہ میں تھا آنحضرت ﷺ کے روبرو بہت حافظ تھے۔ اگر ایک حرف بھی نہ لکھواتے تو بھی وہ ویسا ہی محفوظ رہتا جیسا کہ حق ہے۔ یہ وصف خاص کتاب اور قرآن کو ہی حاصل ہے دنیا میں یہ بات کبھی کسی کتاب کو حاصل ہوئی نہ ہوگی۔ قرآن کے حافظ ہر ملک میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ سات برس کا بچہ اور سو برس کا بوڑھا از اول تا آخر بغیر کسی تکان کے مجلس میں سناتا ہے اور کوئی کتاب کہ جس کے معتقد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کل تو کیا نصف حصہ بھی حفظ نہیں سنا سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا اعجاز خاص ہے جس کا کوئی مخالف انکار نہیں کر سکتا۔۱۲حقانی

[2] سید صاحب فرماتے ہیں قولہ صفحہ ۳۳ مگر یہ بات کہ اس کی مثل کوئی نہیں کہہ سکتا اس کے من اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی، کسی کلام کی نظیر نہ ہونا اس بات کی تو بلاشبہ دلیل ہے کہ اس کی مانند دوسرا کلام موجود نہیں ہے مگر اس کی دلیل نہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ بہت سے کلام انسانوں کے دنیا میں ایسے ہیں کہ ان کی مثل فصاحت و بلاغت میں دوسرا کلام نہیں ہوا مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ الخ اول تو انسان کا کون سا ایسا کلام ہے جس کا مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک باوجود تحدی کے دوسرا کلام نہیں ہو سکا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی نے کوئی عمدہ کتاب تصنیف کی مگر اس وقت کے تمام فصیحوں بلیغوں کو عار دلا کر اس کے مثل بنانے کا اشتہار نہ دیا۔ اتفاقاً مدت تک کسی نے اس بارہ میں قلم نہ اٹھایا۔ بلاشک اس وجہ سے یہ کتاب من اللہ تسلیم نہیں ہوتی اور جب کہ بڑے زور سے دعویٰ کیا ہو اور سب کو اس میں شریک ہونے کی اجازت دی ہو اور اپنے کلام کے ایک ٹکڑے کے برابر بنانے کی درخواست کی ہو اور لوگوں نے اس امر میں حوصلہ بھی کیا ہو اور پھر اپنے اپنے مسودات اور کلمات کو معیوب سمجھ کر پیش نہ کر سکے ہوں بلکہ خود انہی کے لوگوں نے اس پر قہقہہ اڑایا ہو یہ من اللہ ہونے کی صریح دلیل ہے۔ دوم اگر ہادی ہونے میں تحدی تھی تو یہ کلام یعنی قرآن سے متعلق تھی پھر اس کا مثل نہ بنانا وہی بات ہے کہ سر کے پیچھے سے ہاتھ پھرا کر ناک بتانی فضول امر ہے۔۱۲منہ

نکات: سورہ: شروع قرآن مجید کے اس حصہ کو کہتے ہیں کہ جس میں کم از کم تین آیتیں ہوں اور اس حصہ کا کوئی نام معین بھی ہو جیسا کہ فاتحہ۔

بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ اس کا واؤ اصلی ہے اس بناء پر یہ سورۃ البلد (شہر پناہ) سے ماخوذ ہے۔ اس مناسبت سے کہ سورۃ البلد جس طرح شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اسی طرح سورہ بھی چند آیات یا ہر قسم کے مضامین کو گھیرے ہوئے ہے یا سورۃ بمعنی رتبہ سے ماخوذ ہے کیونکہ ہر ایک سورہ کو اس خاص خوبی میں ایک فوقیت اور مرتبہ ہے یا ان کے باہم شرف اور طول وقصر میں مراتب جداگانہ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ واؤ اصلی نہیں بلکہ ہمزہ تھی اس کو واؤ بنالیا ہے اور باہم مبادلہ ہوگیا ہے اس تقدیر پر اس کی اصل سورہ ہے، جس کی معنی کسی چیز کا بقیہ اور ٹکڑا ہے۔ یعنی یہ قرآن کا ایک ٹکڑا ہے اس لیے اس کو سورہ کہنے لگے یہاں تک وجہ تسمیہ کا بیان تھا۔ قرآن مجید کا سورتوں پر منقسم ہونا اس حکمت کے لیے ہے کہ ایک مضمون دوسرے مضمون سے جدا ہو جائے اور ایک قسم کی نظم جو باہم مناسبت رکھتی ہے دوسری قسم سے علیحدہ شمار کی جاوے اور پڑھنے والے کو سہولت اور فرحت اور حفظ کرنے میں سہولت اور فراغت حاصل ہو کیونکہ جب وہ ایک سورہ کو تمام کرے گا تو دل میں فرحت پیدا ہوگی جس طرح مسافر جب ایک منزل طے کر لیتا ہے تو دل میں خوش ہوتا ہے کہ اس مسافت کا اس قدر حصہ میں نے طے کرلیا اسی مقصد کے لیے مصنفین اپنی کتابوں میں فصل اور باب مقرر کرتے ہیں ورنہ ایک کلام مسلسل سے دل گھبراتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی حکمتیں ہیں۔ سورتوں کے آنحضرت علیہ السلام کے عہد میں نام مقرر ہو چکے تھے۔

شہداء: شہید کی جمع ہے۔ جس کے معنی حاضر اور گواہی دینے والا اور مدد کرنے والا اور حاکم کے ہیں۔ اس کا سر یہ ہے کہ لفظ شہید یعنی اس ترکیب میں حاضر ہونے کے معنی ملحوظ ہیں خواہ یہ حضور بالذات ہو یا بالتصور۔ پس مدد کرنے والے اور حاکم اور حاضر میں تو بالذات حضور پایا جاتا ہے۔ کس لیے کہ حاضر تو موقع پر حاضر ہوتا ہے مگر مدد کرنے والا بھی موقع پر حاضر ہوتا ہے اور حاکم کے حضور (روبرو) مقدمات فیصلہ ہوتے ہیں اور گواہی دینے والے میں حضور کے معنی بالتصور پائے جاتے ہیں یعنی جب وہ گواہی دیتا ہے تو اپنے خیالات میں اس بات کو حاضر کرتا ہے اور جو شخص خدا کی راہ میں مارا جاوے اس کو بھی اس لیے شہید کہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے پاس حاضر ہوگیا اور اس کا بدلہ ثواب آخرت اور اس کے مصاحب ملائکہ اس کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں۔ اللهم ارزقني شهادة في سبيلك۔ اس مقام پر یہ چاروں معانی مراد ہو سکتے ہیں یعنی قرآن کے سورہ کے مثل بنانے میں جو لوگ اس وقت بڑے فصیح وبلیغ، حاضر اور موجود ہیں ان کو بلاؤ اور ان سے مدد لو اور جو تمہارے کلام پر سورہ کے مثل ہونے کی گواہی دیں ان کو بھی بلاؤ اور جو لوگ تمہارے زعم میں تمہارے مددگار اور حاجت روا ہیں اور ان کے نام کی تم دہائی دیتے ہو اور جن کی عبادت کرتے ہو، ان سے بھی مدد لے دیکھو۔ الغرض سب زور لگالو اور پھر حاکموں کے پاس اس منازعت کے فیصلہ کے لیے بھی چلو دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؟

دُوْنِ اللّٰهِ: دون کے معنی پاس اور قریب جگہ کے ہیں اور اسی لیے کتابوں کے تصنیف کرنے کو تدوین کہتے ہیں کہ ایک مضمون کو دوسرے مضمون کے ساتھ متصل اور پاس کیا جاتا ہے۔ پھر بطور مجاز کے رتبہ میں بھی اس لفظ کا استعمال ہونے لگا۔ کہتے ہیں کہ زید دون عمرو یعنی زید عمرو سے کم رتبہ ہے اور اسی لیے حقیر چیز کو دون یا دنی کہتے ہیں اور اسی لیے اس عالم کو کہ حقیر وذلیل ہے دنیا کہتے ہیں (مونث کا صیغہ) یا اس لیے کہ یہ قریب اور پاس اور وہ عالم بعید ہے۔ پھر اس میں بھی وسعت دی گئی ہے اور اس کلمہ کا ایک چیز کو چھوڑ کر دوسرے کے اختیار کرنے پر اطلاق ہوا اور لفظ غیر کے قریب المعنی ہوگیا۔ اس مقام پر اس کے معنی غیر کے ہیں یعنی خدا کے غیر اور اس کے سوا جس قدر تمہارے مددگار ہیں سب سے مدد لو۔

نیچے کسی چیز کا اترنا اس جگہ قرآن مجید مراد ہے کہ بواسطہ جبریل علیہ السلام عالم بالا سے حضرت نبی ﷺ پر اترا۔

مِمَّا نَزَّلْنَا: نزول اوپر سے

نکات: (۱) نزلنا فرمایا انزلنا نہ کہا اس لیے کہ تنزیل کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرکے نازل کرنا اور انزال کے معنی ایک بار نازل کرنا ہے گو قرآن مجید لوح محفوظ سے بیت المعمور تک ایک بار نازل ہوا مگر وہاں سے دنیا میں آنحضرت ﷺ کے پاس حسب حاجت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوتا تھا اور اس بات سے بیوقوفوں کو شک پیدا ہوتا تھا کہ یہ تو شاعروں اور دیگر مصنفین کی طرح تھوڑا تھوڑا تصنیف کرکے سناتا ہے اگر منجانب اللہ ہوتا تو تمام قرآن کو ایک بار ہی دکھلاتا بلکہ کاغذوں میں لکھا ہوا اور جلد بندھا ہوا لاکر سامنے دھر دیتا کہ دیکھو مجھ پر یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً۔ چونکہ وہ جاہل اس پارہ پارہ نازل ہونے کے سر سے واقف نہ تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ کسی نبی پر آج تک بنی بنائی کتاب نازل نہیں ہوئی ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے اس امر سے درگزر فرما کر اسی تقدیر پر قائل کیا کہ اچھا یوں ہی سہی تم بھی پوری کتاب نہیں بلکہ اُس کے ایک ہی ٹکڑے کے برابر تو بنالاؤ اس لیے لفظ نزلنا فرمایا انزلنا نہ کہا۔

(۲) اس تحدی (معارضہ) کو خدا تعالیٰ نے ایک نکتہ کے لیے کئی سورتوں میں مختلف طور سے بیان کیا، اس سورہ میں اور سورہ یونس میں تو اس طرح فرمایا اور سورہ ہود میں یوں فرمایا فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ "کہ اس کے دسویں حصہ ہی کے مانند بنالاؤ اور خدا کے سوا جس سے چاہو مدد لو" اور سورۂ اسریٰ میں یوں فرمایا قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ "اگر تمام جن وانس اس قرآن کی مثل

---

۱ تفسیر القرآن کے مؤلف نے اس مقام پر صفحہ ۲۶ سے لے کر ۳۱ تک اپنے خیالاتِ فاسدہ کو بہت کچھ طول دیا ہے اور چند ابحاث لکھی ہیں: (۱) مما نزلنا پر جس کا خلاصہ امام رازی پر نزول وحی کے بارے میں اعتراض اور تمام علمائے اسلام پر طعن کے بعد یہ ہے کہ خدا اور پیغمبر میں جبرئیل وغیرہ کوئی واسطہ نہیں صرف اسی کے خیالات جس طرح کہ مجنونوں کو مجسم نظر آیا کرتے ہیں اور کوئی باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے آوازیں سنائی دیتی ہیں، اسی طرح اس نبی کو نظر آتے باتیں کرتے ہیں اسی کے دل سے خیالات اٹھ کر دل پر فوارہ کی طرح اچھلتے ہیں اور یہی نزول وحی ہے۔

(۲) بحثِ نبوت کی بابت ہے کہ نبوت خدا کی طرف سے ایک ایسا عہدہ سمجھنا کہ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ) اہل اسلام کا غلط عقیدہ ہے، بلکہ نبوت ایک فطری ملکہ ہے کہ جس طرح انسان کے اندر اور صدہا فطری ملکات ہیں یہ بھی ایک ملکہ ہے کہ جو جسم کے قویٰ وضعیف ہونے سے قوی وضعیف ہوتا ہے پس جس میں اخلاقِ انسانی کی تعلیم وتربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے (پھر یہ پیغمبر کسی شخص اور کسی زمانہ میں منحصر نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر زمانے میں ایسے لوگ کہ جو ریفارمر کہلاتے ہیں نبی ہیں، چنانچہ ہندوستان میں دیانند سرسوتی اور بنگالہ میں بابو کسیب چندر سین اور انگلستان میں فلاں فلاں صاحب اب بھی نبی ہیں) (تہذیب الاخلاق مطبوعہ ۱۲۹۳ھ) (۳) لفظ اعدت سے دوزخ اور جنت کا بالفعل موجود ہونا خیال کرنا جیسا کہ جمہور اہل سنت والجماعت عقیدہ رکھتے ہیں غلط ہے کیونکہ قطعی الوقوع چیز کو قرآن بلفظ ماضی تعبیر کرتا ہے۔ (۴) بحثِ دوزخ وجنت کی بابت ہے کہ جنت کی حقیقت کا بیان کرنا خدا کو بھی محال ہے۔ جنت ودوزخ صرف راحت وتکلیف کا نام ہے۔ موسیٰ نے اس کی تفسیر کثرتِ اولاد اور پیدائشِ مال کے ساتھ کی ہے اور دوزخ ان چیزوں کے نقصان اور ہیضہ وغیرہ مصائب کو بتلایا ہے۔ محمد ﷺ نے قرآن میں لوگوں کو رغبت اور خوف دلانے کی مصلحت سے اس کی تفسیر حور وقصور، باغ اور نہریں اور شعلۂ آتش اور زقوم وحمیم کے ساتھ کردی اور دراصل یہ چیزیں جنت ودوزخ میں نہیں اگر یہی جنت ہے تو اس سے ہماری خرابات بہتر ہے۔ الخ قول یہ ان کے اقوال کا خلاصۂ مطلب ہے اب ناظرین دیکھ لیں کہ یہ باتیں بلا دلیل جو خان صاحب نے بیان کی ہیں، محض فرقہ برہمو سماج کی تقلید ہے یا نہیں؟ اور ان خیالات کو نہ تنہا اسلام بلکہ آسمانی مذاہب سے کس قدر مباینت ہے اور اس وقت جو الحاد یورپ کے دریائے ناپیدا کنار کی موجیں ہندوستان کو دوبالا کر رہی ہیں (جس سے ہزاروں کوڑ مغز کہ جن کو نہ علومِ اسلامیہ سے بہرہ نہ فنونِ عقلیہ سے حصہ نہ دینی برکتوں سے نصیبہ بلکہ پکے دنیا دار جاہ ومال کے بندے نفسانیت سے بھرے ہوئے کسی قدر ثروتِ دنیا حاصل کرکے بانیٔ مذہبِ جدید ہو گئے اور سینکڑوں بندگانِ خدا کو گمراہ کردیا اور حیاتِ ابدی سے محروم بنا دیا) ان سے کس قدر مناسبت ہے ان خیالات کا بطلان مقدمہ کتاب میں ہو چکا ہے۔ فمن شاء فلیرجع الیها۔

بنانے پر متفق ہو جائیں اور ایک دوسرے کی مدد بھی کریں تب بھی اس کے مانند نہ بنا سکیں گے'' اور سورہ قصص میں یوں فرمایا: قل فاتوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ '' کہ ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو خدا کے ہاں سے کوئی اور کتاب لا کر دکھاؤ کہ جو قرآن و توریت سے زیادہ ہادی ہو۔ میں بھی اس کو مانوں گا''۔ پس ان سب آیات کو ملا کر یہ نکتہ پیدا ہوا کہ خواہ تم ایک سورہ کی برابر خواہ دس کی خواہ تمام قرآن کی برابر بنا کر دکھاؤ یہ سخت معارضہ ہے گویا یوں فرمایا کہ اس کی برابر بناؤ یا اس کے نصف کے برابر یا اس کے ربع کے برابر، بناؤ تو سہی۔

(۳) وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ فرمایا کہ آتشِ جہنم میں آدمی اور پتھر جلتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو پوجتے ہیں اور ان کو حاجت روا سمجھتے اور ان کے نام کی دہائی دیتے اور نذر و نیاز دیتے ہیں وہ عابد اور معبود دونوں خدائے جبار کے قہر میں مبتلا ہیں خدا کا قہر آگ کی صورت میں متمثل ہو کر ان کو جلا دے گا اور جہنم کا ایندھن بنا دے گا اور عرب کے لوگ اکثر پتھر کے بت بنا کر پوجتے تھے اس لیے حجارۃ کہا۔ الغرض اس لطف کے ساتھ ان کی بت پرستی کی سزا اور بتوں کی وقعت اور اقتدار کا اندازہ ظاہر کر دیا۔

اس تھوڑے سے کلام میں خدا تعالیٰ نے ان چند مقاصدِ ضرور یہ کو کس خوبی کے ساتھ ادا کر دیا کہ جس کا کچھ بیان نہیں۔ (۱) جس امر میں مخالفوں کو بڑا دعویٰ تھا اسی میں ان کو عاجز بنا کر قرآن کا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا۔ (۲) اس کے ضمن میں اس معجزۂ قرآنیہ سے نبی ﷺ کی نبوت کو مخالفوں کے روبرو متیقن اور ثابت کر دیا، حتیٰ کہ پھر جو کوئی انکار کرتا تو عناد سے کرتا تھا۔ لِاَنَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔

(۳) وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ سے خدا کے سوا جس قدر معبود لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے اور ان کو حاجت روا یا قادرِ مطلق یا قادرِ مطلق کا مختارِ عام یا داروغہ با اختیار جانتے ہیں (جیسا کہ ہنود کالی، بھوانی، بھیروں، ہنومان، کرشن، بشن، مہادیو، راجہ رام چندر، کواکب و عناصر و ارواح وغیرہا اشیاء کو اب تک ایسا جانتے اور ان کے نام کے پتھر، تانبے، پیتل کے بت بنا کر پوجتے ہیں، جس کو یقین نہ آئے تو بنارس[1] جا کر دیکھ لے) ان کا عاجز ہونا ثابت کر دیا گویا یہ توحید کے لیے ایک برہانِ قاطع اور ابطالِ شرک کے لیے دلیلِ ساطع[2] ہے۔

(۴) وَلَنْ تَفْعَلُوْا سے قیامت تک پیشین گوئی کر کے آنحضرت علیہ السلام کو کامل اطمینان دلا دیا۔ جس سے آنحضرت علیہ السلام نے اس دعوے کو نہایت اطمینان سے لوگوں کو سنا کر اپنی نبوت کو ثابت کر دیا۔

(۵) فَاتَّقُوا النَّارَ سے عالمِ آخرت اور وہاں کے احوالِ عذاب و ثواب اور بت پرستی اور کفر کی سزا جہنمِ ابدی کو بیان اور نتیجۂ اعمال کو عیاں کر دیا۔

(۶) الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ آگ یہاں کی آگ سے بہت تیز ہے یہاں کی آگ لکڑیوں سے جلتی ہے وہ آگ ارواحِ کفار اور سخت پتھروں سے سلگتی ہے اور یہ کہ وہ معبود کہ جن کو لوگ پوجتے ہیں محض بے حقیقت ہیں اور کا تو کیا بھلا کریں گے اپنے ہی تئیں مؤاخذہ سے بری نہ کر سکیں گے۔ جب مکہ میں حضرت علیہ السلام نے انوارِ توحید کو پھیلایا اور آفتابِ نبوت بلند ہوا تو بتوں میں

[1] بنارس جانے کی کیا ضرورت ہے ہر گاؤں اور ہر شہر میں یہی صورت ہے۔

[2] ادعوا شهداء کم فرمانے میں ایک اور نکتہ بھی ہے کہ ایامِ جاہلیت میں بعض کاہنوں سے جن مقفّی مسجع کلام کیا کرتے تھے اور اس کلام کو وہ جاہل بہت ہی بڑا فصیح و بلیغ سمجھ کر مجامع میں پڑھتے تھے اس آیت میں اس پر بھی تعریض فرما دی کہ یہ کسی جن کا کلام نہیں اور نہ حضرت علیہ السلام کاہن ہیں اگر تمہارا یہ خیال ہے تو تم خود بھی زور لگا کر دیکھو اور اپنے بھوت دیوتاؤں سے بھی مدد لے دیکھو کہ تم اور وہ سب جمع ہو کر اس کے ایک ٹکڑے کے برابر بھی بنا سکتے ہیں، ہرگز نہیں۔ ۱۲ منہ

آوازیں آیا کرتی تھیں کہ اب ہماری پرستش کا زمانہ ختم ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے سے تھوڑے دنوں پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ایک بت کے آگے قربانی لے کر گئے تو اس کے اندر سے نوحہ کی آواز آئی اور چند اشعار نبی ﷺ کی شوکت کی بابت سنائی دیے اور اسی آوازِ غیبی نے پھر کلماتِ الوداع پڑھ کر حسرت و افسوس ظاہر کیا۔ اس قصہ کو بیہقی نے دلائل النبوت میں روایت کیا ہے۔

(۷) اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ سے یہ بات ثابت کر دی کہ جنت و دوزخ بلکہ جو کچھ عالمِ ظہور میں آنے والا ہے وہ سب کچھ عالمِ مثال میں قائم ہو چکا ہے۔ یہ مسلم کہ قرآن مجید میں آئندہ ہونے والی چیزوں کو کہ جو قطعاً واقع ہوں گی، ماضی کے صیغہ سے تعبیر کیا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس چیز کو اس لفظ سے بیان کیا ہو وہ ہنوز واقع نہیں ہوئی، آئندہ ہو گی پس ان دونوں چیزوں میں مساوات سمجھ کر یہ کہہ دینا کہ دوزخ و جنت ہنوز پیدا نہیں ہوئی بڑی غلطی ہے، اس لیے جمہور اہلِ سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دوزخ و جنت اب بھی موجود ہے نہ یہ کہ قیامت کو موجود ہوں گی۔ جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کس لیے کہ اگر یہ ہو تو جس قدر عہد آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک لوگ نیک اور متقی مرے ہیں وہ جنت اور وہاں کے نعماء سے محروم رہیں اور برے لوگ جہنم سے بچے رہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے عرصہ دراز تک کیوں اعمال کی جزا و سزا نہیں ملتی ہے۔

علاوہ اس کے قرآن و حدیث اس پر گواہِ صادق ہیں، خود حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے تھے۔ نبی ﷺ نے شبِ معراج میں جنت و دوزخ کی سیر کی اور ایک بار نماز پڑھتے میں دوزخ و جنت کو دیکھا اور یوں بعض شخصوں کو دوزخ و جنت دیکھ کر خبر دی اور ان باتوں کو ایک صحابی نے نہیں بلکہ بہت سے صحابہ نے روایت کیا ہے اور کتبِ احادیث صحاح ستہ وغیرہا میں بہت سے طرق سے یہ روایات مروی ہیں۔

تحقیق: اس مسئلہ دارِ آخرت کی یہ ہے کہ قدیم سے علمائے بنی آدم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان صرف اس پیکرِ جسمانی کا نام نہیں، نہ حس و ادراک اس کا کام ہے، مثلاً کان نہیں سنتے بلکہ اس دریچہ سے کوئی اور سنتا ہے۔ آنکھ نہیں دیکھتی اس کھڑکی سے کوئی اور دیکھتا ہے اگر شنوائی یا بینائی کی قوتیں ہاتھ یا پاؤں یا پشت میں رکھی جاتیں تو وہ اصلی انسان جس کو روح یا نفسِ ناطقہ یا آتما کہتے ہیں وہیں سنتا دیکھتا ہے۔ اسی پر اور قوتوں تکلم وغیرہ کو قیاس کر لیجئے اور اصلی انسان کا یہ پیکرِ جسمانی اس عالمِ عنصری میں ایک آلہ ہے جب وہ اس پیکرِ جسمانی کو چھوڑ دیتا ہے جس کو موت عرفِ عام میں کہتے ہیں تب وہ سننے میں اس کان کا، دیکھنے میں اس آنکھ کا، بات کرنے میں اس زبان کا محتاج نہیں۔ رنج و راحت بھی جو کچھ ہے اس اصلی انسان کو ہے۔ جسمانی امراض سے جو الم ایک تعلقِ خاص کی وجہ سے پہنچتا ہے اسی کو ادراک کی قوت کے سبب سے پہنچتا ہے اگر کسی دوا سے جیسا کہ کلورافارم سے اس ادراک کو معطل کر دیا جائے تو کوئی الم و درد نہیں ہوتا خواہ جسم کو پارہ پارہ کر دیجئے، یا اس تعلق کو قطع کر دیجئے۔ ہاتھ پاؤں کو کاٹ ڈالئے گو قطعِ تعلق کے وقت درد ہو گا مگر اس کے بعد آنکھوں کے سامنے اس ہاتھ پاؤں بریدہ کو کاٹئے جلائیے اصل انسان کو کچھ بھی درد و الم نہیں ہوتا۔ دیکھئے خواب میں انسان چلتا ہے مگر نہ ان پاؤں سے، دیکھتا ہے مگر نہ ان آنکھوں سے، سنتا ہے مگر نہ ان کانوں سے، کھاتا پیتا ہے لذت و الم اٹھاتا ہے نہ اس جسم سے وہاں اس کے لیے اور ہی ہاتھ پاؤں اور اور ہی ناک کان آنکھ ہے اور اور ہی زبان ہے۔ اس تمثیل پر فلاسفی کا ایک شبہ ہے کہ یہ جو خواب میں ہوتا ہے صرف عالمِ بیداری کے تخیلات ہیں باقی کچھ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور خواب میں عالمِ بیداری کے خیالات بھی ہوتے ہیں اس سے انکار نہیں مگر اس پر حصر کر دینا ایک بڑی نادانی ہے۔ کس لیے کہ بارہا خواب میں آئندہ آنے والے واقعات ہو بہو دکھائی دیتے ہیں جواب تک پیش نہیں آئے تھے۔ ان پر تخیلاتِ بیداری کا اطلاق بیجا ہے۔ تخیلات گزشتہ واقعات ہو سکتے ہیں کہ جن کی تصویر خزانۂ خیال میں گزر جانے کے بعد باقی رہتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک شہر میں گئے ہیں کہ جس کو کبھی دیکھا نہ سنا اور وہاں کے بازار اور مکان دیکھے، وہاں کے آدمیوں سے ملے اور ان سے فلاں فلاں معاملات پیش آئے۔ پھر بیداری میں تھوڑے دنوں بعد یا ایک عرصے کے بعد بعینہٖ وہی شہر اور وہی بازار اور وہی آدمی اور وہی معاملات اس عالم میں دیکھے

گئے۔اب اس قسم کے رؤیا میں جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا جو کچھ رنج و راحت اٹھایا جو کچھ کھایا پیا عورتوں سے صحبت ہوئی، جس کو بیداری میں ہو بہو پایا کیا اس جسم اور اس پیکرِ جسمانی سے تھی، ہرگز نہیں۔ یہ تو محلِ استراحت میں پڑا تھا، گو بیداری میں جب وہ چیزیں پیش آئیں، یہ جسمانی پتلا بھی ساتھ ساتھ ہولیا اور پھر رنج و راحت کا یہی آلہ بن گیا۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس اصلی انسان اور پیکرِ انسانی میں باہم کیا تعلق ہے اور کیوں منقطع ہو جاتا ہے اور اس انقطاع کو موت کہا جاتا ہے اور دراصل وہ اصلی انسان کیا ہے اور بعد انقطاعِ تعلق اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ان تینوں سوالوں کا جواب ایک سِرِّ روحانی ہے جہاں اس فلسفہ اور حکمت کا گزر بھی نہیں کیونکہ یہ فلسفہ جہاں تک اس کی وسعت تسلیم کی جائے عالمِ محسوس سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا یعنی اس کی تحقیقات کا دائرہ انہی چیزوں تک محدود تھا جو محسوس ہیں مثلاً جو اس آنکھ سے دکھائی دے سکتی ہیں۔ عناصر، زمین ستارے، حجر و شجر بحر و بر معدنیات وغیرہ۔ فلسفہ نے ان چیزوں میں موشگافی کی ہے انہی کے متعلق حیرت انگیز کام کئے ہیں جیسا کہ قوتِ برقی کا استعمال، ابخراتِ مائی سے انجنوں کے ذریعہ سے حیرت انگیز کام لینا۔ اسٹیمر، ریل گاڑی وغیرہ یا معدنیات کے آثارِ مخفیہ کا انکشاف یا نباتات کے آثارِ غریبہ کا انکشاف یا دوربینوں خوردبینوں سے کرۂ ہوا کی عجائب مخلوقات کا انکشاف وغیرہ وغیرہ۔ جس نے عامہ عقول کو حیرت میں ڈال دیا اور ان فنون کے ماہر و موجد نے خود پسندی سے علم کا انحصار ان ہی پر کر دیا۔ جس طرح ایک لائق معمار کو باورچی کے کام سے بیخبری ہے یا ایک لائق پلیڈر' قانون داں کو لوہار کے کام سے ناآشنائی ہے۔ اسی طرح اس فلسفہ کو مسائلِ روحانیہ سے بے خبری ہے۔ مگر یہ ناچیز بندہ اس علمِ روحانی سے جو اس کو اس فن کے استادوں سے حاصل ہوا ہے مختصراً جواب دیتا ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

(۱) پیکرِ جسمانی دراصل انسان کے تعلق کا ایک بہت بڑا باریک مسئلہ ہے جس کی تصریح کے لیے نہ مجھے کوئی مثال ملتی ہے نہ اس کی تعبیر کے لیے میرے پاس الفاظ ہیں۔ اس مشکل پر جو کچھ بیان کیا جاوے وہ کافی سمجھا جاوے۔ پیکرِ انسانی میں اغذیہ کے باقاعدہ تصرف میں لانے سے جو خون پیدا ہوتا ہے اور اس سے لطیف ابخرات پیدا ہو کر عروق وغیرہ کے ذریعہ سے تمام جسم میں علیٰ قدرِ ضرورت پہنچتے ہیں اس کو عربی زبان میں نسمہ کہا جاتا ہے اور اسی کو روحِ طبی بھی کہتے ہیں یہ نسمہ اس اصلی انسان یعنی نفسِ ناطقہ کا مرکب ہے ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو پھول اور اس کی خوشبو میں، یا جو دہکتے کوئلوں اور آگ میں۔ نفسِ ناطقہ اس نسمہ میں تدبیر اور تصرف کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام بدن کا انصرام ہوتا ہے جس طرح نفسِ ناطقہ کا مرکب نسمہ ہے اسی طرح نسمہ کا مرکب خون ہے۔ اب ان اسبابِ تعلق میں سے جو کوئی سبب اپنی حالت پر باقی نہ رہے گا وہ تعلق منقطع ہو جائے گا۔ جس طرح تیل نہ ہونے سے بتی کی لو جاتی رہے گی اور لو کے جانے سے وہ روشنی چلی جائے گی جس نے تمام مکان کو روشن کر رکھا تھا۔ اب تیل اور اس روشنی میں دیکھئے کیا نسبت ہے۔ الغرض اس تعلق کا انقطاع یا اس جسم کو کلًا یا جزءًا سے فنا کر دینے سے مرجاتا ہے اسی طرح دم گھونٹ دینے یا گردن مار دینے سے' سمی دوا کھلا دینے سے' امراضِ شدیدہ سے' یعنی ان چیزوں سے جو اس انتظام کو درہم و برہم کرنے والی ہوں۔ یہ تو عارضی انقطاعِ تعلق تھا اور طبعی بھی ہوتا ہے کہ اس کے جسم کے قویٰ یعنی چراغ اور اس کا تیل انحلال پذیر ہو جانے سے اس کو موتِ طبعی کہتے ہیں پھر اس خول سے وہ اصلی انسان اس طرح باہر ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے سے پھل اس چھلکے اور اس کے اندر کے پھل میں جس طرح ایک قسم کی صورت میں مناسبت ہوتی ہے اسی طرح اس پیکر اور اصلی انسان میں مگر کہاں یہ صورت کہاں وہ شکل اور یہ استحالہ اور انقلاب اس پیکر پر کوئی نئی بات نہیں۔ غذاؤں، اناج، گوشت وغیرہ نے معدہ میں جا کر کئی الٹی پلٹیوں کے بعد منی کی صورت اختیار کی تھی پھر اس منی نے عورت کے رحم میں جا کر کیا کیا بہروپ بدلے، خون ہوئی پھر گوشت کا لوتھڑا ہو گئی، پھر اس میں ہاتھ پاؤں اعضائے جسمانی نمودار ہو گئے۔ پھر ایک زمانہ تک وہاں قدرے پختہ ہو کر انسانی پیکر بن کر رحم سے باہر آئی پھر یہ پیکر بھی دن بدن کیا روپ بدلتا رہا آخر کار انحطاط شروع ہوا اور ہوتے ہوتے اس میں سے انسان نکل جانے کے بعد گل سڑ گیا، مٹی میں مٹی مل گئی

اور پھر وہی مٹی بن گئی جو ترکاری وغیرہ بن کر معدہ میں جا کر کیا کیا بنی تھی۔ فتبارک اللہ احسن الخٰلقین ۔ کہاں چلے گئے اس پیکر یا اس خول میں سے جو انسان برآمد ہوتا ہے اس کے حالات بیان فرمائیے۔ یہ بات کہ اس پیکر سے انسان برآمد ہوتا ہے اس پر کوئی برہان ہندسی یا دلیلِ ریاضی و طبعی قائم نہیں ہو سکتی اور ہو سکتی ہو مگر مجھے معلوم نہیں۔ یہ ایک سِرِّ روحانی ہے جس کو فنِ روحانیت میں کچھ بھی دخل ہے وہ اس کو دیکھ سکتا ہے بلکہ روز دیکھتا ہے۔ مگر اطمینانِ منکر کے لیے اتنی بات کہے بغیر نہیں رک سکتا کہ جس قدر دنیا میں متمدن قومیں اور بزرگ گزرے ہیں ہزاروں سینکڑوں برسوں سے اس کے قائل ہیں۔ ہندو، پارسی، یہودی، بودھ، مسلمان، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت محمد ﷺ اور وہ اپنی قوموں سے یہی بات فرما بھی گئے ہیں۔ حکماءِ یونان بھی اس کے قائل ہیں۔ حال کے حکمائے یورپ میں بھی اب اس طرف توجہ ہو رہی ہے اور بڑے بڑے سائنس ڈاکٹر اس کے قائل ہوتے جاتے ہیں اور سالانہ جلسوں میں جو اسی بابت منعقد ہوا کرتے ہیں ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف کا حال مختلف تقریروں میں بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو حدیقۃ الفکر مصنفہ فرید آفندی مطبوعہ مصر)۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ اصل انسان جو ایک جوہرِ نورانی ہے اس کے لیے جسم ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضا بھی ہوتے ہیں' بات چیت بھی کرتا ہے مگر اس کے لیے جسم اور اس کے ہاتھ پاؤں اس جسمِ عنصری کے سے نہیں۔ وہ جسم بھی ایک طرح کا لطیف ہے بلحاظ اس مادہ کے اور اس تجرد کی وجہ سے اس کو وہ رنج و آلام بیماری وغیرہ بھی لاحق نہیں ہوتیں جو اس حالت میں ہوتی ہیں مگر اس حالت کے درد دکھ اور ہیں اور بڑے سخت ہیں مگر نہ اس قسم کے اسی طرح لذات و عیش بھی ہیں اور یہاں سے کہیں زیادہ ہیں مگر نہ اس قسم کے۔

اب ہم تیسرے سوال کا جواب دیتے ہیں کہ اس انقطاعِ تعلقِ جسمانی کے بعد اصل انسان یا روح کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اس مسئلہ میں قدرے اختلاف ہے۔ بعض حکما اور اہلِ ہنود جو ویدوں کے ماننے والے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اس کا پھر اسی عالمِ حسی میں بمناسبِ اعمال و اعتقاد (گیان و کرم) کسی دوسرے جسم سے پھر وہی تعلق پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ دور تک جاتا ہے۔ اس کو وہ (آواگون) یعنی تناسخ کہتے ہیں۔ اس خیال کی اگر یہ تاویل نہ کی جائے (کہ دوسرے جسم سے تعلق پیدا ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو روحانی جسم دیا جاتا ہے جس کا یہ جسم بمنزلہ پوست اور وہ بمنزلہ مغز کے ہوتا ہے) تو یہ خیال بچند وجوہ غلط ہے جن کی تشریح مطولات میں ہے۔ بعض قوموں کا یہ خیال ہے کہ جسمِ عنصری سے تو تعلق نہیں رہتا مگر اس کا مسکن بھی یہی عالمِ عنصری رہتا ہے اور وہ جنوں کی طرح رہتے ہیں، اسی لیے وہ ارواح کبھی کسی پر مسلط بھی ہو جاتے ہیں اور ان کے افعالِ حیرت انگیز بھی مشاہدہ ہوتے ہیں۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ کبھی ان کا اس عالمِ سفلی کی طرف بھی نزول ہوتا ہے اور وہ جس کو چاہتے ہیں دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اور شہدائے عظام فرشتوں کی خاصیت ان میں ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت رسول کریم ﷺ کا بعض ارواحِ طیبات سے اس عالم میں ملاقات کرنا اس کی دلیل ہے۔ فرمایا رائت یونس وهو يلبی، رائت موسیٰ وهو يصلی۔

اسی طرح بعض ارواح کسی مدت تک جن میں باعتبار تزکیہ کے بالاتر جانے کی صلاحیت نہ تھی، اسی عالم میں چندے قیام کرتی ہیں مگر محسوس نہیں ہوتیں اور کبھی بعض ارواحِ خبیثہ کو اسی عالم میں عذاب دیا جاتا ہے جس کو بعض ادراک بھی کرتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ چند کہنہ قبروں کے پاس سے گزرے اور آپ کا خچر یا بو جس پر سوار تھے، بدکا۔ آپ نے پوچھا کہ یہاں کن لوگوں کی قبریں ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ مشرکین کی۔ آپ نے فرمایا اگر تم مردے گاڑنا بند نہ کر دیتے تو میں ان پر جو عذاب ہو رہا ہے تم کو دکھا دیتا۔ جس کو انسان کے سوا سب دیکھ رہے ہیں، اسی لیے قبورِ صلحاء اور قبورِ فساق و کفار پر کبھی نیک و بد آثار لوگوں کو محسوس ہوتے ہیں۔

مگر عام قاعدہ جس کا گروہِ انبیاء علیہم السلام قائل ہے اور جس کی خبر دینے پر وہ مامور کئے گئے تھے یہی ہے کہ نیک بندہ حسبِ اعمال و

ایمان اس پیکر کو چھوڑ کر عالمِ بالا تک پرواز کر کے جاتا ہے اور فرشتے اس کو نہایت عزت واحترام سے عالمِ بالا تک پہنچاتے ہیں اور وہیں کہیں اپنے مناسب مقام پر ارواح میں ملتے اور ہر قسم کا عیش وآرام پاتے ہیں۔ پھر اس میں درجات متفاوت ہیں اور اس مقام کو مقامِ علیین کہا جاتا ہے اور بد اور بدکار اس کے برخلاف برے حالوں میں مبتلا ہو کر عالمِ سفلی میں معذب ہوتے ہیں جس کو سجین کہتے ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں اس کی تصریح بہت کچھ ہے۔ مگر میں نصف کے قریب بنی آدم کی تسلی کے لیے ایک ایسے شخص کا قول نقل کرتا ہوں کہ جس کو ایک عالم مانتا ہے۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کا اور ان پر روحانیت کا یہاں تک غلبہ بھی تھا کہ جس کی وجہ سے لوگ ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے، یعنی اس صفت سے اشتباہ میں پڑ گئے الوہیت اور ملکیت کے مراتب کا امتیاز نہ رہا۔

اس قول کو لوقا نے اپنی انجیل کے سولہویں باب میں ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں اگلے زمانے میں ایک دیندار مگر سخت مفلس اور بیکس شخص لعزر تھا جس کے زخموں کو کتے چاٹتے تھے اور اسی جگہ ایک دولت مند فاسق و فاجر عیش ونعیم میں سرشار رہتا تھا۔ لعزر کو تمنا تھی کہ کہیں اس کے دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑے ہی مجھے مل جایا کریں۔ قضارا دونوں مر گئے۔ اس دولت مند نے جہنم اور عذابوں میں سے ابراہیم علیہ السلام کو دور سے دیکھا کہ ان کے پاس لعزر بھی بیٹھا ہے تب اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ ابراہیم علیہ السلام مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان تر کرے کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔ تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اے فرزند تو اپنے مزے دنیا میں پا چکا اب تیرے لیے کچھ نہیں۔ دوسرے ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا عمیق گڑھا حائل ہے۔ جس سے نہ یہاں کا وہاں اور نہ وہاں کا یہاں آ سکتا ہے۔ تب اس نے کہا اے ابراہیم! میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو لعزر کو میرے باپ کے گھر بھیج کہ وہ جا کر خبر کرے اور شہادت دے تا کہ میرے پانچ بھائی جو وہاں ہیں ایمان لائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آئیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ان کے پاس موسیٰ اور دیگر انبیاء ہیں ان کو چاہیے کہ ان کی سنیں۔ اس نے کہا نہیں اے باپ اگر کوئی مردوں میں سے ان کے پاس جا کر گواہی دے تو اس کو باور کریں گے اور توبہ کریں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب وہ موسیٰ اور نبیوں کی نہیں سنتے تو مردوں میں سے اگر کوئی ان کے پاس جا کر خبر دے گا تو اس کی کب مانیں گے۔ انتہیٰ۔ اس بیان سے چند باتیں معلوم ہوئیں: (۱) یہ کہ مرنے کے بعد ایک دوسرے عالم میں انسان جاتا ہے جہاں اس کے اعضائے بدن بھی ہوتے ہیں اور جسمِ اول کے مناسب ایک دوسرا جسم بھی ہوتا ہے جس سے ایک دوسرے کو پہچانتا ہے۔

(۲) یہ کہ وہاں عذاب لو، پیاس، گرمی وغیرہ بھی ہے اور ثواب بھی جہاں سرد پانی وغیرہ اشیاء بھی ہیں۔ پھر جہاں اعضائے بدن انسانی بھی ہوں گے اور سرد پانی اور لو وغیرہ اشیاء بھی ہوں گی تو پھر کیا کھانا دانا نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا کیونکہ یہ بھی سامانِ راحت ہے۔ پھر کیا وہاں عمدہ مکان نہ ہوں گے، جن میں نہریں بہتی ہوں گی اور پھر کیا وہاں ازواجِ مطہرات نہ ہوں گی، کیا مرد ہی راحت وثواب کے مستحق ہوں گے، عورتوں سے وہ جگہ بالکل خالی ہوگی؟ کیا عورتیں جہنم ہی کے قابل ہیں؟ ہرگز نہیں۔ وہ بھی مردوں کے قدم بقدم ثواب وعذاب میں ہوں گی۔ پھر جب ہر قسم کی راحت اور پانی اور عمدہ مکان اور عمدہ کھانے ہوں گے اور بیبیاں بھی ہوں گی اور جسم بھی ہوگا اور اس کے اعضاء اور صحت بھی ہوگی تو کیا مرد نامرد ہو جاویں گے! ہرگز نہیں۔ ان اسرار کو قرآن نے کھول کھول کر بیان فرمایا ہے تو کیا یہ محلِ اعتراض ہے اور کس لیے ان نعماء کی بہ تقلیدِ فلاسفہ تاویل کی جاتی ہے۔

(۳) مرنے کے بعد دنیا کی سب باتیں یاد رہیں گی اور اپنے اعزہ کی محبت باقی رہتی ہے۔

(۴) بزرگوں کی صرف اولاد ہونا بغیر ایمان اور اعمالِ صالحہ کے کچھ بھی فائدہ مند نہیں۔

واضح ہو کہ قرآن مجید کی بلاغت واعجاز بھی یہ ہے کہ کسی مضمون کو ناتمام نہیں چھوڑتا

آیات میں غور کرو کہ اول عبادت کا حکم دیا اور معبودِ حقیقی کا نشان اس کے آثارِ قدرت سے بتا دیا کہ وہ ہے جس نے تم کو اور تم سے پہلوؤں کو بنایا اور جس نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسا کر تمہارے لیے رزق اور روزی کا سامان کیا، اب بتاؤ ان باتوں میں کون شریک ہے۔ اس میں ذات وصفات اور توحید وشرک بیان ہو گیا دلیل کے بعد خود ہی نتیجہ کے پیرائے میں بیان فرما دیا کہ پھر جان بوجھ کر کسی کو اس کا شریک نہ کرو یعنی اس عبادت کا وہی مستحق ہے مگر عباداتِ مقبول اور غیر مقبول کا فیصلہ نبی بغیر ہو نہیں سکتا، اس لیے نبی کی صداقت اور قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا جو عبادات اور جملہ احکامِ الٰہی کا دفتر ہے۔ اس آیت وان کنتم فی ریب میں بیان فرمایا اور ضمن میں منکرین کا انجام جہنم بھی بیان کر دیا اس کلام میں خدا کی توحید اور اس کے صفات اور نبوت اور قرآن کی حقانیت جو امہات المسائل تھے یکے بعد دیگرے کس طرح مسلسل بیان ہوئے اور عالمِ آخرت کا بیان کس مناسبت سے شروع ہوا۔ اول دوزخ اور اس کی ہیبت ناک اجمالی کیفیت (کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) منکرین کے خوف دلانے کے لیے اول یوں بیان فرمائی کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم اور اہم تر ہے۔ اس کے بعد عبادت اور خدا اور اس کی صفات پر ایمان لانے کی اور اس کی توحید کی جزا بھی بیان فرمانا ضروری ہوا، تا کہ اس عالمِ باقی کی نعماء اور حیاتِ ابدی کی بشارت سن کر نفوسِ بشریہ اس طرف متوجہ ہوں اور عبادت کی مشقت کو خیال میں نہ لائیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ دارِ آخرت کا بیان مژدہ اور خوش خبری کے پیرایہ سے شروع فرمایا اور مژدہ کا مدار اسی ایمان اور اعمالِ صالحہ پر رکھا جو اول دوسرے عنوان سے بیان ہوا تھا۔ فقال:

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْھَا مِنْ ثَمَرَۃٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا ؕ وَلَھُمْ فِیْھَا اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ ۙ وَّھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام بھی کیے اس بات کا مژدہ دیجیے کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے پڑی نہریں بہ رہی ہوں گی جب ان کو وہاں پھل کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم پہلے ہی کھا چکے ہیں اور ان کو ہم شکل چیزیں دی جاتی رہیں گی اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیبیاں ہوں گی اور وہاں سدا رہیں گے۔

ترکیب: الذین فعل بافاعل الذین آمنوا وعملو الصالحات صلہ وموصول جملہ اس کا مفعول جنت اسم ہے ان کا موصوف تجری من تحتھا الانھار جملہ فعلیہ اس کی صفت لھم خبر ان کی پس یہ ان اپنے اسم وخبر کے ساتھ مجرور ہے باء کا تقدیرہ بان اور متعلق ہے بشر کے کلما شرط رزقوا الخ قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل جملہ فعلیہ اس کا جواب شرط وجزا مل کر دوسری صفت ہوئی جنت کی یا خبر مبتداء محذوف کی ای ھم او ہی یا جملہ مستانفہ ہے رزقاً مفعول بہ ہے رزقوا کا اور منھا من ثمرۃ میں من ابتدائیہ ہے دونوں حال ہیں رزقاً سے علی سبیل تداخل یہ تمام جملہ عطف ہے جملہ سابقہ پر واتوابہ متشابھا جملہ معترضہ ہے گویا اس کہنے کا سبب اس میں بیان ہے یعنی وہ یہ بات اس لیے کہیں گے کہ ان کو یہ پھل یکساں صورت کے دیے جائیں گے۔ ضمیر بہ کی ما رزقوا کی طرف راجع ہے متشابھا حال ہے ضمیر بہ سے ازواج موصوف مطھرۃ صفت دونوں مل کر مبتداء لھم خبر مقدم جملہ مستانفہ ہے ھم مبتدا۔ خالدون خبر فیھا اس کے متعلق یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے لھم سے۔

کے بعد اس عالم میں ایسے باغ عنایت ہوں گے جن میں نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں کے میووں میں عجب لطف ہوگا کہ رنگ و بو اور شکل وصورت یکساں اور مزے الگ الگ یہاں تک کہ جب کوئی میوہ ان کو ملے گا تو اس مشابہت سے یہ سمجھیں گے کہ یہ تو ہم ابھی کھا چکے ہیں مگر جب کھائیں گے تو نیا لطف پائیں گے اور ان کو جس طرح مکانات اور کھانے عمدہ عنایت ہوں گے اسی طرح انس وصحبت کے لیے پاکیزہ بیویاں ملیں گی کہ جو نفرت کی باتیں ہوتی ہیں وہ ان میں نہ ہوں گی، نہ صورت میں نہ سیرت میں۔ اس پر ان کو بڑھاپے اور موت یا افلاس کا غم نہ ہوگا بلکہ وہ اسی عیش وآرام کے ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔

نکات: (۱) کتبِ الہامیہ کا زیادہ تر مقصود تین چیزوں کا بتلانا ہوتا ہے: (۱) علمِ مبدء کہ پیشتر کیا تھا اور اس عالم کو کس نے بنایا ہے اور میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ (۲) علمِ معاش کہ بندہ یا اور چیزیں پیدا ہونے کے بعد خود مختار ہیں اور ہر چیز کی قدرتِ مستقلہ رکھتے ہیں یا ہر دم معاش میں بھی اسی کے محتاج ہیں۔ وہی اسبابِ معاش پیدا کرتا ہے اور ہماری سعی وکوشش تو صرف یہ ہے کہ ہم ان اسباب کو کام میں لاتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ کسی وقت اس سے بے پروائی اور استغنٰی نہیں ہوسکتا۔ (۳) علمِ معاد کہ آخر کار میرا کیا ہونا ہے؟ مجھ کو یہاں سے کہیں اور جگہ بھی جانا ہے وہاں اپنے اعمال کا ثمرہ بھی پانا ہے۔ پس خدائے تعالیٰ نے اوصافِ کتاب اور مراتبِ سعداء واشقیاء بیان فرما کر ان تینوں علوم کو بیان کر دیا۔ اول کو اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ میں اور پھر اس کو اور دوم کو اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً سے لے کر رِزْقًا لَّکُمْ تک (سوم) کو فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ سے لے کر خالدون تک۔

(۲) انسان کی جبلی عادت ہے کہ جب وہ کسی چیز کی مضرت سے واقف ہوتا ہے تو اس سے ڈرتا اور کسی منفعت کی طمع میں کوئی کام کرتا ہے اس لیے خدا کے کفر کا نتیجہ فاتقوا النار الخ اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ثمرہ وبشر الذین الخ بیان کر دیا اور اسی حکمت سے جہاں ترہیب ہے ترغیب بھی تا کہ خوف ورجا کے دونوں پلے مساوی رہیں۔

(۳) کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ میں عالمِ آخرت کے اسرار کی طرف اشارہ کیا، کس لیے کہ کلما عموم کو چاہتا ہے، لیکن یہ بات جنت میں اول مرتبہ ثمرہ کھانے پر صادق نہیں آتی کیونکہ اس سے پہلے وہ کہاں پا چکے تھے؟ دنیا کے ثمرات اول تو صدہا مفلس اور غریب اہلِ جنت کو دنیا میں نصیب ہی نہ ہوئے تھے پھر ان کو جنت کے ثمرات سے کیا نسبت بلکہ اس سے مراد ہے کہ اس عالم میں انسان کے معارف واعمال اپنی مناسب کسی شکل میں ظہور کریں گے جس طرح کہ معانی خواب میں اپنے مناسب اشکال میں دکھائے جاتے ہیں جنت کے ثمرات یہی دنیا کے معارف واعمالِ صالحہ ہیں۔ جب ان کو وہاں دیکھیں گے تو اصلی مناسبت کا ادراک یہاں تک کامل ہوگا کہ دونوں کو ایک جان کر یہ کہیں گے کہ یہ تو ہم پہلے پا چکے اور دنیا میں کھا چکے ہیں (واللہ اعلم بمرادہ) پس کفر والحاد اور انبیا کی نافرمانی اور بدکاری آگ اور جہنم مردم سوز کی صورت میں اور ایمان اور اچھے اعمال جنت وثمرات وازواج وانہار کی صورت میں ظہور کریں گے۔ واضح ہو کہ انسان کی رغبت تین چیزوں سے زیادہ ہوتی ہے اور ان ہی کی طرف زیادہ احتیاج پڑتی ہے۔ (۱) مکان عمدہ، (۲) اچھے سامان عمدہ کھانا پینا، (۳) عورت حسین۔ پس اول کو لَهُمْ جَنّٰتٍ میں اور دوسرے کو کُلَّمَا رُزِقُوْا الخ میں تیسرے کو لَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ میں بیان کر دیا۔ اور اس پر ایک کھٹکا ان چیزوں کے فنا ہو جانے اور اپنے مر جانے کا بھی ہوتا ہے کہ جو تمام لذت کو خاک میں ملا دیتا ہے

مرادر منزلِ جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

پس اس کھٹکے کو بھی ...

تحقیقات: سوال: انسان اور دیگر ابدان اجزاءِ متضادۃ الکیفیت سے مرکب ہیں کہ جن میں طرح طرح کے استحالات وانقلابات ہوتے رہتے ہیں کہ جن سے انجام کار انحلال وانفکاک ہوتا ہے اور اس مرکب کے اجزا علیحدہ ہو کر یہ مرکب فنا ہو جاتا ہے۔ پس جب یہ ہے تو جنت میں ہمیشہ رہنا کس طرح ہوسکتا ہے؟

جواب: ہم پیشتر بھی جنت کی حقیقت بیان کر چکے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ جنت میں جسم عنصری تو کیا بلکہ جرمِ فلکی کی قسم سے بھی کوئی جسم نہیں بلکہ وہ عالم اس عالم سے غیر اس عالم پر قیاس کر کے انفکاک وفسادِ ترکیب کا احتمال نکالنا قیاس مع الفارق ہے۔ قال تعالیٰ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ کہ یہ زمین اور یہ آسمان اس روز نہ رہے گا بلکہ اس کے بدلے میں اور نئی زمین اور نیا آسمان ہوگا کہ جن کی جسمیت ان کی جسمیت سے بالکل مختلف الماہیۃ ہوگی۔ یوحنا بھی اپنے مکاشفات کے ۲۱ باب میں کہتے ہیں: (پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا، کیونکہ اگلا آسمان اور اگلی زمین جاتی رہی تھی۔) انتہٰی وہاں کے اجسام لطافت میں روح کے ہم پلہ ہیں۔ پس جس طرح روح ہمیشہ رہ سکتی ہے وہ بھی۔ اس شبہ کی بنیاد ایک فلسفی وسوسہ پر ہے کہ جو نہایت کمزور اور بودا ہے۔

سوال: وہ عالم اگر تسلیم بھی کیا جائے تو وہ ایک عالمِ قدس ہوگا کہ جس میں کھانا پینا عورتوں سے لذت اٹھانا یا عمدہ عمدہ باغ اور نہریں اور خوبصورت عورتیں عیش اڑانے کو کہاں؟ جنت یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ اپنے ادراکات سے حظ اٹھائے گا اور جہنم اور آگ یہ ہے کہ اپنے ملکات رذیلہ اور حقائق الاشیاء کے نہ جاننے پر بڑا تاسف کرے گا، پچھتائے گا۔

جواب: یہ سب چیزیں عالمِ قدس میں موجود ہیں اور پھر عالمِ قدس کے تقدس میں کوئی بھی فرق لازم نہیں آتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ عالم اس عالم کا دوسرا پہلو ہے۔ یہاں جو کچھ ہے وہ وہیں کا ظل ہے اور پھر یہاں کی چیزیں وہاں جا کر متمثل ہو جاتی ہیں اس سِرِّ مکتوم کا اظہار نہ تحریر سے ہوسکتا ہے نہ تقریر سے، انبیاء علیہم السلام یا ان کے متبعین پر کچھ کشف وشہود سے یہ راز کھلا وہی خوب جانتے ہیں۔ البتہ سمجھانے کے لیے ایک مثال یا نظیر (کہ جس کو اصل ممثل لہ سے ادنیٰ سی مناسبت ہے ورنہ زمین وآسمان کا فرق ہے) بیان کرتا ہوں اور وہ یہ کہ آئینہ میں ہاتھی گھوڑے، درخت، بڑے بڑے پہاڑ اپنی حقیقی صورت پر دکھائی دیتے ہیں اور جس طرح آئینہ سے بیرونی وجود میں باہم امتیاز ہے اسی طرح آئینہ کے وجود میں بھی ان چیزوں میں حقیقی امتیاز ہے۔ گھوڑا جدا دکھائی دیتا ہے اور ہاتھی الگ پھرتا چلتا ہوا اور پہاڑ وقار سے زانو جمائے ہوئے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے آسمان وزمین بھی باوجود اس وسعت کے آئینہ میں موجود ہیں حالانکہ بالشت دو بالشت کا آئینہ ہے اور اس میں ایسی بڑی بڑی چیزیں موجود ہیں پھر کیا بات صرف یہ کہ یہ چیزیں تو وہی ہیں مگر یہاں اور حال ہے اور باہر اور پس باہر کے حالات کو آئینہ فرض کر کے محال جاننا اور انکار کرنا کوتاہ فہمی ہے۔

اور سنیے خواب میں جب کہ ہم لحاف میں منہ لپیٹ کر سوتے ہیں تو ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں۔ کبھی باغوں میں جاتے، کھانا کھاتے، جماع کرتے ہیں، انزال کا اثر صبح کو کپڑے پر پاتے ہیں۔ اسی طرح صدہا مصائب بھی دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ صورتیں صرف خیال میں ہوتی ہیں کہ جس میں ہاتھ بھر کی چیز کی بھی گنجائش نہیں۔ نہ اس میں عورت آسکتی ہے، نہ درخت گھس سکتا ہے۔ پس ان چیزوں کے وجودِ خارجی کے حالات سے وجودِ خیالی کا انکار کرنا اور یہ کہنا کہ ان کی وسعت کے مخالف ہے جہلِ مرکب ہے۔ یہی حال اس عالم کا ہے کہ وہاں سب کچھ ہے مگر یہاں جسمِ عنصری فانی اور وہاں لطیف باقی۔ اس رمز کی طرف اس آیت میں اشارہ کر دیا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ الآیہ۔ اور اسی طرح حدیث میں وارد ہے قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین مالا اعین رات ولا اذن سمعت وما خطر علیٰ قلب بشر (رواہ البخاری ومسلم) یہ شبہ بھی بے بنیاد وسوسہ ہے۔

واضح ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تھوڑے ہی دنوں بعد اس حقانی مذہب میں ایسا خلط ملط ہوگیا کہ کچھ کا کچھ ہوگیا، جھوٹی انجیلیں اور
جھوٹے نامجات حواریوں کے نام سے تصنیف ہونے شروع ہوگئے جس شخص کے جو جی میں آیا اس نے روح القدس نازل ہونے کے پیرایہ
میں لوگوں میں جاری کر دیا چنانچہ پولوس کے خطوط سے بھی یہ بات ثابت ہے (بلکہ پولوس بھی ان ہی میں سے ایک شخص تھا)۔ پھر قوم گریک
یعنی یونانی بھی اس مذہب میں آئے تو انہوں نے اپنے خیالاتِ حکیمانہ کو اس مذہب میں ملایا۔ ہوتے ہوتے پچھلی صدیوں میں [1] مارٹین لوتھر
اور اس کے شاگرد کالون وغیرہ فرقہ پراٹسٹنٹ کے پیشوا ظاہر ہوئے تو اور بھی الحاد اور دہریت کو ترقی ہوگئی۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی میں
فرانس اور جرمن میں سینکڑوں ایسے لوگ صاحبِ تصانیف ظاہر ہوئے کہ جو صرف خدا کے قائل تھے باقی انبیاء اور ان کے معجزات اور امور
آخرت اور جن وملائکہ بلکہ وجودِ آسمان سب کو قصہ کہانی جانتے تھے اور پھر تو انگلستان میں بھی اس کا چرچا پھیلا اور لارڈ ہربراٹ اور مسٹر
بلاونٹ اور ہوبس اور ارل شاف جیسے معزز بھی ملحد ہوگئے اور اس بارے میں بہت سی کتابیں انہوں نے تصنیف کیں اور پھر تو امریکہ، ہسپانیہ
وغیرہ جمیع بلادِ یورپ میں بھی یہ بلا پھیل گئی اور ان نام کے عیسائیوں کی یہ بلا ہندوستان میں بھی آئی اور کلکتہ میں رام موہن نامی بنگالی نے
۱۸۴۰ء میں ان ہی اصول پر بت پرستی سے ناراض ہو کر ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس کا برہموسماج نام دھرا۔ پھر اس کے شاگردوں
نے انگریزی خوان بنگالیوں میں اس کا بہت رواج دیا اور ان کی تقلید سے ایک شخص دہلی کے رہنے والے سید احمد خاں نے بھی مذہبِ اسلام کو
برائے نام قائم رکھ کر ایک جدید مذہب کی ان ہی اصولِ ملحدانہ پر بنیاد ڈالی اور قرآن مجید کو تفسیر کے پیرایہ میں اپنے خیالاتِ ملحدانہ کے تابع
بنایا۔ مگر یہ کب ہوسکتا ہے؟ اب ہم ان برائے نام عیسائیوں اور برہموسماج اور اس شخص کے ان اعتراضات کو سناتے ہیں کہ جو بہ تقلید حکمائے
یونان انہوں نے بے سمجھے بوجھے جنت ودوزخ پر کئے ہیں۔ منجملہ ان کے پادری فنڈر اپنی کتاب میزان الحق کے ۳ باب کے ۳ فصل میں
قرآن مجید کی ان آیت کا ترجمہ کر کے کہ جن میں جنت کی جزئیات مذکور ہیں جیسا کہ حور، نہریں وغیرہ، یہ کہتا ہے: **قولہ** محمدیوں کا اعتقادی
بہشت بالکل مجازی اور جسمانی ہے اس نہج پر کہ جو چیز آدمی کے خیال میں آوے سو وہ وہاں موجود ہے اور نفسانی وجسمانی ہر ایک لذت وعیش
جس پر انسان کا دل مائل ہو وہاں ملتی ہے، پس ظاہر ہے کہ ایسے بہشت کا امیدوار کرنا آدمی کو دل کی پاکی اور نیک فکر سے روک کر نفسانی
خواہشوں کو قوت وقدرت دیتا ہے۔ سو ایسا بہشت خدا کے تقدس کے لائق کیونکر ہوسکتا ہے۔ الخ اور اس سے پیشتر قرآن مجید کی آیات کو غلط
ثابت کرنے کے لیے لوقا اور پولوس کے اقوال نقل کئے ہیں کہ جن کو اہلِ اسلام حضرت مسیح علیہ السلام کے دین کا مخرب سمجھتے ہیں، چنانچہ اس کا ثبوت
مقدمۂ کتاب میں گزرا اور آئندہ بھی کچھ ہوگا۔

قولہ: مسیح نے تو لوقا کے ۲۰ باب کی ۳۴ سے ۳۶ تک یوں فرمایا کہ اس جہان کے لوگ یعنی بہشت کے لوگ نہ بیاہ کرتے ہیں، نہ
بیاہے جاتے ہیں کیونکہ وہ فرشتوں کی مانند ہیں اور رومیوں کے ۱۴ باب کی سترہ آیت میں مرقوم ہے کہ خدا کی بادشاہت کھانا پینا نہیں بلکہ
راستی اور سلامتی اور روحِ قدس سے خوش وقتی ہے، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں اس کے برخلاف فرمایا ہے کہ بہشت میں کھانا پینا اور حوروں
کے ساتھ رہنا ہے۔ انتہٰی۔

اقول: آپ کی مجازیت وجسمانی کا جوابِ تحقیقی تو ابھی بیان ہو چکا اور الزامی یہ ہے کہ یہ آپ بھی مانتے ہیں کہ جنت میں ایک شخص
دوسرے کو نظر آوے گا، کلام کرے گا، پس جب یہ ہے تو جسمانیت ثابت ہوئی، خواہ وہ کسی قسم کی جسمانیت ہو، عنصریت نہ ہو نہ سہی۔ جب
جسم ثابت ہے تو ہر جسم کو مکان کی ضرورت ہے اور دیگر اس کے لوازمات بھی ضرور ہیں۔ لان الشيء اذا ثبت ثبت بجميع لوازمه حکما کا

[1] یعنی سولہویں صدی مسیحی میں جبکہ پوپ لوگ جو حضرت مسیح کے نائب کہلاتے تھے ان کی سلطنت میں فتور آیا۔ ان پوپوں کو عیسائی پادری دجال اور شیطان
بتلاتے ہیں حالانکہ حضرت مسیح کے یہ لوگ سینکڑ [illegible]

مقولہ ہے۔ جب یہ ہے تو ان لوازمات کا حسبِ مرضی ہونا (کہ جس کو جنت کے معنی چاہتے ہیں، بہشت آنجا کہ آزارے نباشد) کچھ
خلافِ عقل نہیں اور جو کہے تو کوئی دلیل پیش کرے اور آپ کے عقلی دلائل کا یہ جواب ہے: اول تو لوقا حضرت مسیح کے قول کو نقل کرتا ہے اور
یہ راوی معتبر نہیں اور نہ یہ شخص حواری ہے، نہ اس سے کبھی معجزہ وکرامت سرزد ہوا ہے، نہ حواریوں میں اس کی قدر ومنزلت تھی بلکہ یہ پولوس کا
شاگرد ہے جو دینیات میں جھوٹ بولنا ثواب سمجھتا ہے۔ جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں مذکور ہوا اور یہ خود کہتا ہے کہ میں سن کر مسیح کا حال لکھتا
ہوں۔ دوم اگر اس کو معتبر شخص بھی تسلیم کیا جائے تو ممکن ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ مراد ہو کہ دنیا کی طرح وہاں بکھیڑے نہ ہوں گے۔ کس
لیے کہ یہ بات حضرت نے صدوقیوں کے جواب میں بیان فرمائی تھی کہ جو قیامت کے منکر تھے اور جنہوں نے ایک عورت چند شوہر دار کا
سوال حضرت سے کیا تھا کہ وہ کس شوہر کو ملے گی۔ سوم یوں بھی نہ ہو تو پھر خود حضرت مسیح علیہ السلام کے قول سے (انجیل متی کے ۲۶ باب ۲۹
ورس) جنت میں انگور کا شیرہ پینا ثابت ہے تو جب وہاں پینا ہے تو کیا کھانا نہ ہوگا۔ اور جب شراب ہے تو کیا عورتیں نہ ہوں گی؟ ہاں یہ اور
بات ہے کہ عیسائیوں کی جنت میں صرف انگور کا شیرہ ہو نہ باغ ہو، نہ انیس ہو، نہ اور کچھ کھانا ہو جیسا کہ دنیا میں بھنگڑ کہا کرتے ہیں کہ بنگ ہی
کا مکان ہو، اسی کا اوڑھنا، اسی کا بچھونا ہو۔ سچ ہے۔ فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست، علاوہ اس کے مکاشفات یوحنا کے ۷ باب اور ۲۱ و ۲۲ میں
بھی اس قسم کا بیان ہے اور پولوس کے قول کا مسیح کے قول کے مقابلہ میں کیا اعتبار ہے۔ علاوہ اس کے وہ دنیا کی نسبت یہ کہتا ہے جیسا کہ سیاقِ
کلام سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ پیشتر وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا میں حلال وحرام اور پاک وناپاک چیز کی کوئی احتیاط نہیں بلکہ پاک لوگوں کو ہر چیز پاک
ہے۔ پس اس ملحدانہ اعتراض سے اسرارِ نبوت میں کیا دھبہ لگتا ہے؟ پھر ان کے مقلد برہموسماج رسالہ خلاصۃ الاصول مطبوعہ وکیل ہندوستان
پریس امرتسر ۱۸۷۵ء کے صفحہ ۱۷ میں یہ لکھتے ہیں کہ صرف روح کا تقربِ الٰہی میں مسرور ہونا بہشت ہے اور یہ تقربِ الٰہی ابد الآباد بڑھتا
جائے گا۔ اگرچہ یہ قول محققینِ اسلام سے لیا گیا ہے اور قرآن مجید بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ۔ بلکہ
قرآن واحادیثِ صحیحہ قاطبۃً اس بات پر متفق ہیں کہ خدائے عزوجل کا قرب اور روح کا اس کے دیدار فرحت آثار سے بشاش ہونا تمام نعماءِ
جنت سے بڑھ کر ہے اور یہ کوئی بھی مسلمان نہیں کہتا ہے کہ جنت صرف اس عالمِ شہوات وتکدرات میں کامیابی حاصل کرنا ہے، شاید کسی نے
نافہمی سے یہ سمجھ کر یوں کہا ہو تو کہا ہو بلکہ کل اہلِ اسلام اس پر متفق ہیں کہ وہ عالمِ قدس ہے۔ وہاں موت، بیماری، دکھ، درد، بڑھاپا وغیرہ
عوارضاتِ جسمِ عنصری کچھ نہیں اور بالخصوص ابرار تو ہمیشہ مسرتِ دیدار ہی میں مستغرق رہیں گے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ انسان کے اعمالِ
صالحہ ومعارف عمدہ عمدہ شکلوں میں ظہور کریں گے اور ان حور وباغ اور نہروں کا یہی سر ہے۔ پس ان چیزوں کو دنیا کی چیزیں سمجھ کر اعتراض
کرنا اور اہلِ اسلام کا یہی جسمانی ومجازی بہشت قرار دینا بڑی غلطی ہے۔ مگر برہمو کا لفظ صرف اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر یہ ہے تو بڑے
دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

خان صاحب بہادر نے تو اپنی تفسیر کے صفحہ ۳۶ میں ان دونوں کے مقلد ہو کر جوش وخروش میں آ کر علماءِ اسلام اور سلف کو بہت کچھ کہا
ہے اور جنت کی نسبت بھی بڑی دریدہ دہنی کی ہے، پھکڑ اڑایا ہے تاکہ اہلِ اسلام خجل ہو کر اس عقیدہ سے نفرت کریں۔ سب سے پہلے میں
خان صاحب کے قول کو مختصراً ملخص کر کے بیان کرتا ہوں اور پھر ان کی پھکڑ بازی کو۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ جنت کی ماہیت جو خدا اور
رسول نے (آیت فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ اور حدیث اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت
ولا خطر علی قلب بشر) میں بتلائی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو کوئی نہیں جانتا، کس لیے کہ انسان اسی چیز کو جان سکتا ہے کہ جو حواسِ خمسہ سے
محسوس ہو اور جنت کا کسی انسان نے حواسِ خمسہ سے حس نہیں کیا۔ پس اس کا بیان کرنا (گو خدائے تعالیٰ ہی چاہے) محال بلکہ محال سے بھی
[illegible] رنج وخوشی کی بھی کوئی کیفیت نہیں بتا سکتا۔ اس تقدیر پر اگر جنت کی حقیقت یہی باغ اور نہریں

اور موتی اور چاندی اور سونے کی اینٹوں کے مکانات اور دودھ اور شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوبصورت عورتیں اور لونڈی ہوں تو یہ آیت وحدیث کے برخلاف ہے، کیونکہ ان کو تو انسان جان سکتا ہے۔ غایۃ الامر اس قسم کی عمدہ چیزوں کو حواس سے نہیں جانتا تو یہ کچھ بات نہیں کیونکہ عمدگی ایک امرِ اضافی ہے اس کو جہاں تک ترقی دیتے جاؤ انسان کے دل میں اس کا خیال گزر سکتا ہے۔ پس یہ چیزیں بہ قدر طاقتِ بشری تمثیل کے طور پر سمجھانے کے لیے مذکور ہوئی ہیں۔ ورنہ درحقیقت یہ بہشت میں نہیں اور بہشت و دوزخ راحتوں اور لذتوں اور رنج و تکلیفوں کا نام ہے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کے واسطے مصلحتاً بہت سی باتوں سے منع کرنا اور بہت سی باتوں کا عمل میں لانا بیان کرنا پڑتا ہے اور آدمی کو جبلی بات ہے کہ وہ کسی کام سے جو باز رہتا ہے تو کسی خوف سے اور کرتا ہے تو کسی لالچ سے۔ پس اس راحت و رنج کو ہر نبی نے لوگوں کے حسبِ حال تعبیر کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جنت کو فراغ دستی' کثرتِ اولاد و مال وصحت و فتح مندی کے ساتھ اور دوزخ کو قحط' وبا' مغلوبی کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل ان ہی باتوں سے رغبت اور ان ہی چیزوں سے نفرت رکھتے تھے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایسی تشبیہوں میں بیان کیا ہے کہ جو تمام جہان کی طبیعتوں پر حاوی ہے۔ کس لیے کہ خواہ کوئی کسی گرم و سرد ملک کا رہنے والا ہو اس کو عمدہ مکان اور باغ اور خوبصورت عورت اور لذیذ کھانوں سے رغبت ہوتی ہے اور آگ میں جلنے اور لہو پیپ کھانے سے دل ڈرتا ہے اور رفارمر یعنی ناصحوں کا یہی کام ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔ اس قول کا تفصیلی جواب تو ہم مقدمۂ کتاب میں دے چکے ہیں۔ مگر اجمالاً یہاں اس قدر کہتا ہوں: (۱) کہ آیت اور حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جنت کو کوئی نہیں جان سکتا، بلکہ یہ مطلب ہے کہ جنت میں جو کچھ جزئیاتِ امور یوماً فیوماً پیش آویں گے اور تفصیلی حالات ہیں ان کو کوئی شخص نہیں جان سکتا اور نہ دل میں ان کا خیال آ سکتا ہے، کس لیے کہ اس عالم کا اور ہی حال ہے اسی عالم میں دیکھئے جنہوں نے لندن اور پیرس کے مکانات اور دیگر لوازماتِ عیش نہیں دیکھے، نہ ان کا نقشہ دیکھا، نہ تفصیلاً حال سنا اور اس پر یہ شخص کسی گاؤں کا رہنے والا بھی ہو کہ جہاں چھپر اور کھپریل کے سوا اور کچھ نہ ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ جزئیات تفصیلاً اس کے خیال میں نہیں آ سکتے ہیں باوجودے کہ اس سے وہاں کے اجمالی حالات بھی بیان کئے جاویں (کہ وہاں عمدہ عمدہ کمرے اور نفیس نفیس بلور و شیشے کے آلات و ظروف اور نہایت خوبصورت خدام اور نہایت عمدہ کھانے ہیں) مگر تب بھی باعتبارِ علم تفصیلی کے اس پر یہ صادق آتا ہے کہ اس نے نہ ان چیزوں کو آنکھوں سے دیکھا ہے نہ کانوں سے سنا ہے نہ اس کے دل میں ان چیزوں کا خیال گزرا ہے۔ الغرض اجمالاً علم ہونا اور تفصیلاً اس علم کا سلب کرنا کچھ منافات نہیں رکھتا، جس نے ایساغوجی بھی پڑھی ہوگی یہ تو وہ بھی جانتا ہوگا کہ تناقض میں اتحاد جہتِ شرط ہے۔ پس جنت میں حور اور باغ اور دیگر

(۳) اگر بہ فرضِ محال علم اور ادراک کا انحصار حواسِ خمسہ ہی پر تسلیم کیا جاوے تو بندہ کے قصور سے خداوند تعالیٰ قادر میں کیوں عجز لازم آیا کہ جو اس کو جنت کا بتلانا محال بلکہ محال سے بھی بڑھ کر ہو گیا، باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ آپ نے بیان کر دیا، ب عام ہے کہ حقیقتِ جنت کو علم بالکنہ ہو یا بکنہ ہو بالوجہ ہو یا بوجہ ہو۔

(۴) آپ کے نزدیک جنت اس راحت کا نام ہے کہ جس کو موسیٰ علیہ السلام نے ترقیِ رزق وغیرہ امورِ دنیا سے تعبیر کیا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عالم میں آرام پانا جنت ہے۔ وذالک فاسد لا یقول بہ احد من اہل الکتاب و اہل الاسلام۔

(۵) آپ کے بیان سے ثابت ہوا کہ دراصل جنت و دوزخ کچھ نہیں۔ پیغمبر یا رفارمروں کو جب لوگوں کو کسی فعل یا اس کے ترک پر آمادہ کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ جنت و دوزخ کا ازتلہ بنا کر بیان کرتے ہیں اور محض بے اصل بات کو (یعنی حور و قصور باغ و انہار کو، یا آگ و زقوم کو) شاعروں کی طرح خیالات بندی کر کے دکھلاتے ہیں۔ معاذ اللہ اس سے بڑھ کر کیا الحاد ہوگا، چند روز صبر کیجئے معلوم ہو جائے گا اور فرض آپ کا خیال صحیح نکلا تو ہمیں کیا فکر ہے مگر جب آپ کا خیال غلط نکلا تو دیکھئے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

خان صاحب کی پھکڑ بازی کے اقوال یہ ہیں۔ قولہ صفحہ ۳۸، یہ نہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں سنگِ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ ہیں، شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے۔ ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے۔ ایک نے لبِ جاں بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونہ میں کچھ کر رہا ہے۔ ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ ہمارے علماءِ اسلام نے الخ بسبب اپنی رقتِ قلبی کے الخ یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ الخ اس واسطے وہ بزرگ تمام ان چیزوں کو تسلیم کرتے ہیں کہ جن کو کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا اور جو عقل و مذہب کی بزرگی اور تقدیس کے برخلاف ہیں۔ وقال صفحہ ۴۰ اور ایک کوڑھ مغز ملا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیویں گے، میوے کھائیں گے۔ الخ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا
مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ وقف لازم
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

بے شک اللہ کسی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور کمتر خبر کی) پھر جو ایماندار ہیں وہ تو اس کو اپنے رب کی طرف سے صحیح جانتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کے لیے اس سے کیا غرض ہے (اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے) وہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے ہدایت کرتا ہے اور گمراہ تو اس سے بدکاروں ہی کو کیا کرتا ہے کہ جو اللہ کے عہد کو (مضبوط) باندھ کر توڑ دیتے ہیں اور جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو توڑ ڈالتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے پھرتے ہیں یہی نقصان میں بھی پڑے ہوئے ہیں۔

ترکیب: اللہ اسم ان لایستحی الخ اس کی خبر جملہ اسمیہ مستانفہ ہو الایستحیی بمعنی لایترک فعل بافاعل مثلاً مفعول یضرب ما ابہامیہ کہ جو نکرہ کو ابہام اور شیوع کو زیادہ دیتا ہے کقولک اعطنی کتابا ما ای کتاب کان یا زائدہ ہے جیسا کہ اس قول میں فبما رحمۃ من اللہ ای برحمۃ من اللہ بعوضۃ عطف بیان ہے مثلاً کا۔ ممکن ہے کہ ما نکرہ کو موصوفہ اور بعوضۃ کو اس کی صفت قرار دیا جائے فما فای عطف کے لیے اور ما نکرہ موصوفہ فوقہا اس کی صفت بعوضۃ معطوف علیہ پس یضرب اپنے فاعل اور مفعول اور اس کے متعلقات سے مل کر ان مصدریہ کی وجہ سے تاویلِ صدر میں ہو کر مفعول ہوا۔ لایستحیی کا فاما فائے تعقیبیہ ہے کس لیے کہ مرتبہ تفصیل اجمال کے بعد ہے اما وہ حرف ہے کہ جو کسی امرِ محل کی تفصیل کے لیے آتا ہے اور اس میں شرطیہ کے معنی بھی ہیں اس لیے اس کے جواب میں فائے آتی ہے اس کے بعد جو اسم آتا ہے اس کو متبدا اور جس پر فائے داخل ہوتی ہے اس کو خبر کہتے ہیں پس الذین آمنوا مبتدا اور فیعلمون الخ اس کی خبر اور اسی طرح واما الذین کفروا ... استفہامیہ ذا بمعنی الذی اراد اللہ بہذا الخ اس کا صلہ مجموعہ خبر ما اور ممکن ہے کہ ماذا کل اسم ہو بمعنی ای شیء اور یہ

منصوب المحل ہوا راد سے مثلاً حال ہے ھذا سے یا تمیز ہے یضل بہ ویھدی بہ الخ معطوف اور معطوف علیہ مل کر جملہ مستانفہ ہے یا جواب ہے اذا کا یا ان دونوں جملوں کا کہ جن کے ابتدا میں اما ہے بیان ہے میثاقہ مصدر بمعنی الایثاق یا اسم لما یقع بہ الوثاقۃ باقی سب ترکیب واضح ہے۔

تفسیر: اس سے پیشتر جبکہ خدا تعالیٰ نے منافقوں کا حال آگ جلانے والوں اور مینہ والوں کے ساتھ مثال دے کر بیان کیا اور پھر اثبات نبوت میں آ کر یہ فرمایا کہ اگر تم اس قرآن کو خوبی میں الاعلیٰ نہیں تسلیم کرتے کہ جو بشر کی طاقت سے باہر ہے، یعنی اگر تم اس کو منجانب اللہ نہیں مانتے تو تم بھی اس کے برابر بنا کے دکھاؤ، پس جب وہ عاجز آئے (حالانکہ اس بارے میں انہوں نے مجلسیں بھی منعقد کیں، بڑے بڑے نامور شاعروں اور جادوگروں اور کاہنوں کو بھی شریک کیا، مگر کسی کی جرأت نہ پڑی اور جو کسی نے کچھ جواب میں کہا جیسا کہ یمامہ کا ایک شخص مسیلمہ[1] کذاب نے والنساء ذات الفروج الخ اور الفیل وما ادراک ما الفیل ذنبہ قلیل وخرطومہ طویل وانہ من خلقۃ ربک لقلیل وغیرہ وغیرہ خرافات بنا کر لایا تو قبل ازیں کہ آنحضرت علیہ السلام کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا، اس پر وہیں اس کے ہم قوم اور ہم زبان نے قہقہہ اڑایا) تو اور کوئی بات تو بن نہ آئی مگر یہ عیب نکالا کہ اگر یہ خدا کا کلام ہے تو تعجب کا مقام ہے کہ وہ ایسا جلیل القدر ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ مثال دے کر بیان کرتا ہے۔ خدائے تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ خدا کو مچھر یا اس سے چھوٹی چیز کے ساتھ مثال دینے سے شرم نہیں آتی۔ کس لیے کہ مثال سے غرض ایک حال کا اظہار ہے اور امرِ معقول کو محسوس بنا کے دکھانا اور سمجھانا مقصود ہوتا ہے جیسا حال ہوگا اسی قسم کی چیز سے مثال دی جائے گی یا یوں کہو یہاں تک خدائے تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات اور توحید کا اثبات دلائلِ آفاق وانفس سے کر کے مسئلۂ نبوت وصداقتِ قرآن کو مستحکم دلیل سے ثابت کیا تھا کہ اگر یہ فوق القدرت کام نہیں تو تم بھی ایسی کتاب کوئی بنا لاؤ۔ یہ اس لیے کہ اس کے بعد عالمِ آخرت اور انسان کے انجام کار اور اس کی دنیاویہ کوششوں، نیک وبد نتائج کا بیان بطور تفصیلی نبی اور قرآن کے بتانے پر موقوف ہے۔ اس مسلسل بیان پر کور باطن اشخاص کو یہ شبہ پیدا ہوا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بایں عظمت وجبروت وبایں استغنیٰ وکبریا عالمِ آخرت کے حالات اور اعمال کے نتائج، انہار وحور ونعماء یا جہنم اور اس کے عقوبات بیان کرنے سے کیا غرض۔ کہاں وہ اور اس کی عظمت اور کہاں بیانِ ازواجِ مطہرات اور جنت کے نعیم۔ اس کا جواب دیتا ہے اس کی عظمت وشان کسی واقعی امر کے بیان کرنے کو نہیں روکتی، خواہ وہ واقعی بیان بڑی چیز کا ہو یا چھوٹی چیز کا یہاں تک کہ اس کو مچھر یا اس سے بھی کمتر چیز کے ساتھ مثال دینے میں کوئی شرم نہیں۔ الہامی بیان کی مثال پانی کی ہے جس سے شور زمین میں خار وخس اور عمدہ میں گلِ لالہ اگتے ہیں۔ بعض کو یہ بیان باعثِ ہدایت ہوتا ہے ان کے رغباتِ دل آخرت کی طرف مائل ہوتے ہیں، ان کے روحانی جذبات عالمِ قدس اور ذاتِ حق کی طرف جوش میں آتے ہیں اور بعض کو موجبِ ضلالت ہو جاتا ہے کیونکہ قوائے بہیمیہ کا غلبہ، شہوات ولذاتِ فانیہ کا انہماک ایسے بیان کی تکذیب پر آمادہ کر دیتا ہے مگر کن کو؟ فاسقوں کو جو جادۂ انسانیت سے باہر نکل گئے ہیں، وہ کون ہیں؟ جن کی قوتِ نظریہ وعملیہ دونوں بگڑ گئے۔ علم وعمل گیان وکرم دونوں گئے گزرے۔ کس لیے کہ انسان جب اس عالم میں آتا ہے اور اس کے قوائے ملکوتیہ کے ساتھ قوائے بہیمیہ کا جو جسمانی آثار میں جوڑا بندر رہتا ہے تو اس سے نظری طور پر ایک عہدِ مؤثق لیا جاتا ہے کہ

[1] آج کل بعض پادریوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن مجید کے بے مثل نہ ہونے پر یہ حجت پیش کی کہ ایسی عبارت تو مسیلمہ کذاب نے بھی بنائی تھی اور مقاماتِ حریری کی بھی ایسی ہی عبارت ہے۔ اور شیعہ کے علماء سورۂ فاطمہ اور سورۂ حسنین قرآن میں ویسی ہی بنا کر ملا دی ہے الخ میں ان پادریوں کی سمجھ پر نہایت افسوس کرتا ہوں بقول شخصے مدعی سست گواہ چست۔ ان کلاموں کے مؤلف تو خود قرآن کے مقابلہ میں لاتے ہوئے شرماتے ہیں اور پادری کہ جن کو عربیت سے کچھ بھی مس نہیں وہ سند بتا کے لاتے ہیں۔ ۱۲منہ

دیکھو دونوں کے اعتدال کے ذمہ دار ہوا ایسا نہ کرنا کہ لذائذِ فانیہ پر فریفتہ ہو کر صفاتِ ملکیہ کو کھو بیٹھو، مگر ازلی بے نصیب اس عالمِ حسّی میں نفسانی خواہشوں پر ایسے ریجھتے ہیں کہ جن نیک اعمال واعتقاد کا حکم دیا تھا ان کو نہیں کرتے مواصلت کی جگہ ان سے مقاطعہ کرتے ہیں اور جن برے اعمال اور علوم سے مقاطعہ کرنے کا حکم دیا تھا ان سے مواصلت کرتے ہیں۔ اس عالمِ حسی میں شتر بے مہار بن کر پھرتے ہیں، گویا باغیانہ طور پر خدا کے ملک میں رہتے ہیں مگر تا کجے آخر اس کے حکمِ قضاء وقدر سے مجبوری ہے اب سزا کے سوا انعام کہاں، اس سے زیادہ کون زیاں کار ہو سکتا ہے۔

متعلقات: **حیاء:** نفسِ انسان کا بدنامی اور برائی کے خوف سے منقبض اور متغیر ہو جانا۔ یہ انسان کی وہ حالتِ متوسط ہے کہ جس کے نیچے خجالت ہے کہ جو نفس کو کسی کام سے بالکل باز رکھتی ہے اور اس کے اوپر وقاحت ہے یعنی بے شرمی کی باتوں پر جرأت کرنا۔ یہ حیات سے مشتق ہے اس مناسبت سے کہ یہ حیا قوائے حیوانیہ کو ان کے افعال سے روکتی ہے پھر اس لفظ اور اس قسم کے دیگر الفاظ کا اطلاق جنابِ باری پر (کہ جو نفس اور انقباض سے پاک ہے) حقیقی طور پر نہیں بلکہ ان معانی کا لازم مراد ہے۔ مثلاً حیا کو لازم ہے کہ جس کام سے حیا کرے اس کو ترک کرے اور غضب کو لازم انتقام ہے۔ پس اس سے مراد ترک اور اس سے مراد انتقام اور رحمت سے مراد نفع پہنچانا ہے اور یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ اس کو اور ان مقامات پر بھی کہ جہاں ذاتِ باری پر وہ الفاظ بولے گئے ہیں کہ جو بندوں کے اوصاف پر بولے جاتے ہیں لحاظ رکھنا چاہیے۔

یضل بہ گمراہ کرنا اور دلوں پر مہر لگانا جو قرآنِ مجید میں مذکور ہے اس سے بعض ناسمجھ عیسائی اور دیگر نکتہ چین اسلام پر عیب لگایا کرتے ہیں مگر اس کا جواب اجمالی اور تفصیلی ختم اللہ کی تفسیر میں دے چکے وہاں ملاحظہ کر لو۔

فاسقین: فسق نکلنے کو کہتے ہیں عرب بولتے ہیں فسقت الرطبۃ عن قشرھا کہ "چھوہارا اپنے پوست سے باہر ہو گیا" اور عرفِ شرع میں فسق خدا کی فرمانبرداری سے گناہ کر کے خارج ہونے کو کہتے ہیں اور اس کے تین درجے ہیں (۱) تغابی یعنی باوجودیکہ گناہ کو برا سمجھتا ہے مگر کبھی خواہشِ نفسانی سے اس کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ (۲) انہماک یعنی گناہ کرنے کی عادت کر لے اور کچھ پروانہ کرے۔ (۳) جحود وہ یہ کہ گناہ کو اچھا جان کر عمل میں لاوے اور خدا اور رسول ﷺ کے فرمان کی کچھ حقیقت نہ سمجھے۔ اس تیسرے درجے میں انسان کافر ہو جاتا ہے اور پہلے دونوں درجوں تک مومن رہتا ہے کس لیے کہ تصدیق جو اصل ایمان ہے اس کے دل میں باقی ہے اور دلیل اس بات پر کہ گناہ کرنے سے ایمان نہیں جاتا۔ آیات اور احادیث اور اجماعِ صحابہ ہے قال تعالیٰ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا۔ الآیہ "اگر اہلِ ایمان کے دو گروہ باہم جنگ کریں" الخ حالانکہ جنگِ باہمی گناہ ہے مگر اس کے مرتکب کو بھی خدا تعالیٰ نے مومن کہا ہے۔

خوارج: چونکہ ایمان کا اعمالِ صالحہ کو جزو قرار دیتے ہیں تو گناہ کرنے والے کو کافر کہتے ہیں اور معتزلہ چونکہ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان اور اعمالِ صالحہ کے مجموعہ مرکب کو ایمان کہتے ہیں تو اس شخص کو مومن نہیں کہتے، کیونکہ مجموعہ میں سے ایک جزء اعمالِ صالحہ نہیں پایا جاتا مگر اس کو کافر بھی نہیں کہتے کیونکہ کفر میں انکارِ حق شرط ہے اور انکار پایا نہیں گیا اس لیے ایمان اور کفر میں وہ ایک تیسرا مرتبہ فرض کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ اگر انسان سے بمقتضائے بشریت کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کرے دل میں نادم ہو، خدائے تعالیٰ سے بعجز وانکسار وبچشمِ اشکبار معافی چاہے اور استغفار کرے وہ غفور رحیم ہے، معافی اس کا عام دستور ہے۔

عہد: عہد لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کی محافظت اور رعایت کی جاتی ہے جیسا کہ وصیت اور قسم اور گھر کو بھی عرب اس لیے عہد بولتے ہیں کہ ہر پھر کے انسان وہاں آتا اور اس کی طرف خیال رکھتا ہے اور تاریخ کو بھی اس لیے عہد کہتے ہیں کہ اس کی محافظت ہوتی ہے اور عہد اللہ وہ ہے کہ جو روزِ ازل اس نے عالمِ روحانی میں تمام ارواح کو موجود کر کے باندھا تھا اور سب سے یہ اقرار کروایا تھا کہ میرے سوا کسی کو [illegible] کی طرف اشارہ ہے: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ الآیہ پھر اس کی شرح

اس حدیث میں کہ جس کو امام احمد نے ابن عباس اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ خدا نے آدم کی پشت سے اس کی تمام اولاد کو نکال کر پھیلا دیا اور ان سے یہ کلام کیا: ''الست بربکم کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں؟ سب نے کہا بلیٰ کہ ہاں تو ہمارا رب ہے۔ تب خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اس پر میں تمہارے باپ آدم اور آسمان و زمین کو گواہ کرتا ہوں تا کہ قیامت کو یوں نہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب تم جانو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میرا کسی کو شریک نہ بنانا اور میں دنیا میں تمہارے پاس کتابیں دے کر اپنے رسول اس عہد کے یاد دلانے کو بھیجوں گا۔ الحدیث۔ یہ عہدِ ازلی ہے اور اس کا تذکرہ انسان کی عقلِ خداداد اور فطرتِ سلیمہ بھی ہے اور اسی عہد کو بارِ امانت بھی کہتے ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ الآیۃ پھر الہامِ الٰہی اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے معجزات اور آیات و کتاب اس عہد کی توثیق و تذکیر کرتے ہیں، اس لیے جہاں انبیاء نہیں آئے، وہاں صرف توحید پر قائم رہنا عہدِ الست کا قائم رکھنا ہے۔ اگر شرک کریں گے تو جہنم میں بدعہدی کی سزا پاویں گے، جہاں انبیاء علیہم السلام کا فیضِ نبوت پہنچ چکا تو وہاں بموجب اس عہد کے نبوت اور احکام کا ماننا بھی ضروری ہوگیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا اور اس کی مضبوطی دیگر انبیاء علیہم السلام کی معرفت کی گئی تھی کہ میرے انبیاء کو ماننا، شرک نہ کرنا، قتل نہ کرنا، احکامِ عشرہ وغیرہا۔ اس تقدیر پر اس آیت کے مخاطب یہود یا نصاریٰ ہیں پھر یہ عہد ہر شخص کے ساتھ اور بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ بادشاہوں کے ساتھ یہ خصوصیت کہ وہ عدل و انصاف کریں، علماء سے یہ کہ حق نہ چھپاویں، مداہنت نہ کریں۔ انبیاء سے یہ کہ اس کے دین کو قائم کریں جس چیز کے وصل یعنی ملانے کا خدا نے حکم دیا وہ حقوقِ قرابت و حقوقِ محبت و حقوقِ وطن و حقوقِ ملت ہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

تم اللہ کا کیونکر انکار کر سکتے ہو؟ حالانکہ تم مردے (معدوم) تھے پس تم کو زندہ (موجود) کیا پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کے پاس جاؤ گے۔

ترکیب: کیف استفہام حال کے لیے ہے اور یہاں استفہامِ انکاری ہے تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ جملہ استفہامیہ اور ضمیر انتم جو تکفرون کا فاعل ہے ذی الحال اور یہ جملے معطوف مع معطوف علیہ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا الخ حال واقع ہوئے ہیں۔

تفسیر: جب مسئلۂ توحید اور مسئلۂ نبوت و مسئلۂ معاد بخوبی مسلسل ثابت ہو چکے اور اس کے ضمن میں خطرات و شبہات کے جواب بھی گزر گئے تب ان معاندین کو جو اپنے انکار پر اڑے ہوئے ہیں بالخصوص مخاطب کر کے ایک نئی دلیل نئے اسلوب سے بیان فرماتا ہے جو ان کے قوی انکار کا ازالہ کر دے۔ کس لیے کہ جس قدر مرض قوی ہوتا ہے دوا بھی ویسی ہی قوی دی جاتی ہے اور لطفِ بیان یہ ہے کہ اپنے انعامات حال و آیندہ کا بھی بضمنِ دلیل ذکر ہے تا کہ طبائعِ سرکش کا منعمِ حقیقی کی طرف میلان ہو۔ دلوں میں ولولہ پیدا ہو، نزولِ قرآن مجید کے وقت اور شاید اب بھی ہوں چند قسم کے منکر تھے: اول وہ جو موجودات کے دائرہ کو محسوسات تک ہی محدود سمجھتے تھے جس کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے، کانوں سے نہیں سنتے تھے، ہاتھ سے ٹٹول نہ سکتے تھے، زبان سے چکھ نہ سکتے تھے، ناک سے سونگھ نہ سکتے تھے، نہیں مانتے تھے اس لیے صانعِ عالم اور مجردات ملائکہ وروح کے مرنے کے بعد کی دوسری زندگانی اور عالمِ برزخ اور حشر اور وہاں کے عقاب و ثواب سب کے منکر تھے اور ایسی چیزوں کے وجود کو وہم و خیال جانتے تھے جیسا کہ موجودہ حکما کا یہ خیال اللہ تعالیٰ اور جزا و سزا سے بے خوف کر کے لذاتِ بہیمیہ پر مائل کرتا ہے ہر قسم کے ظلم و عیاری کو اپنے حصولِ مطالب کے لیے کام میں لینا عاقلانہ زندگی سمجھتا ہے مگر اس قسم کی زندگی ایسی ناپاک زندگانی

ہے جس کے بدنتائج اس عالم میں بھی پیش آتے اور برا مزا چکھاتے ہیں۔ دوم وہ جو اللہ تعالیٰ اور مجردات ملائکہ و جن و ارواح کے تو قائل تھے مگر مرنے کے بعد دوسری زندگی اور اعمال کے نیک و بدنتائجِ اخرویہ کے قائل نہ تھے بلکہ نیک و بدنتائج اسی زندگی میں کثرتِ اولاد اور مال وصحت و فتح مندی یا افلاس و ادبار اور موتِ اولاد و اموال کو خیال کرتے تھے یہ گروہ گو بظاہر اللہ جل و علا کا منکر نہیں مگر جب اس نے ایک نئی زندگانی اور حشر و نشر اور وہاں کے اعمال کے نتائج کا انکار کیا تو درحقیقت خدا ہی کا انکار کیا، کیونکہ خدا نے ان چیزوں کی اپنے رسولوں کی معرفت خبر دی ہے اور نیز اس میں اس کی صفاتِ حمیدہ کا بھی انکار ہے، یہ زندگانی بھی سخت ناپاک اور ظلمانی زندگی ہے۔

سوم وہ لوگ تھے کہ ان سب باتوں کے تو قائل تھے مگر رسالت کے منکر تھے وہ کہتے تھے کہ خدا اور بندہ میں مجرد اور مادی ہونے کے سبب کوئی مناسبت نہیں۔ پھر آدمی سے ہمکلامی اور اس کی پیغام رسانی ایک خیالِ باطل ہے۔ جیسا کہ حکماء اور ہنود کا فرقہ براہمہ۔ یہ گروہ بھی خدا کی عظمت اور اس کے اوصافِ حمیدہ کا منکر ہے۔ یہ زندگی بھی شکی زندگی ہے۔

ان سب کو خدا کا منکر قرار دے کر ان سے یوں خطاب کیا جاتا ہے كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ اس کے بعد بطور جملہ حالیہ کے ان کے اطمینانِ قلبی کے لیے یہ دلیل پیش ہوتی ہے كُنْتُمْ اَمْوَاتًا کہ تم مردے تھے یعنی معدوم اس مقدمہ میں کسی کو شک نہیں ایک جاہل اور بڑے سے بڑے فلسفی سے جب پوچھئے گا تو وہ اپنی عمر کی ایک ابتدا بتلا دے گا۔ دس، بیس، پچاس، ساٹھ سو برس جس سے یہ اقرار ہے کہ ہم اس سے پہلے معدوم تھے، دنیا میں نہ آئے تھے فَاَحْيَاكُمْ پھر معدوم سے موجود ہوئے، کوئی زبردست قوت ہے جس کو ہمارے عدم اور وجود کا اختیار ہے۔ ہر حادث کے، لیے کوئی محدث ضرور ہے اور یہ زندگی بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس محدث قادر کے لیے کہ وہ ہمارے بے اختیار ہم کو مردہ کرتا ہے ہم لاکھ جتن کریں جس طرح لڑکپن کو جاتے ہوئے نہ روک سکے اسی طرح جوانی جو ہر روز اپنے کارواں ہمارے سامنے روانہ کرتی ہے، اس کو بھی نہیں روک سکتے، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ آخر وہ قادرِ مطلق ایک روز پھر معدوم کر دیتا ہے۔ صفحۂ ہستی پر نام و نشان بھی باقی نہیں رکھتا، خاک میں خاک مل جاتی ہے یہ مقدمات بھی یقینی ہیں ان میں بھی کسی بشر کو انکار نہیں پھر جس کے ہاتھ میں وجود اور عدم ہے معدوم سے موجود اور موجود سے معدوم کرتا ہے جس کا بنی آدم ہر روز مشاہدہ کر رہے ہیں تو پھر وہ قادرِ مطلق اس عدم کے بعد کیا دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا؟ ضرور کر سکتا ہے اور یقیناً کرے گا ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اور یہ دوبارہ زندگی کس لیے عطا کرے گا؟ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کہ تم اس کی بارگاہِ کبریائی میں حاضر کئے جاؤ اور اپنی اس حیاتِ دنیا کا نیک و بد بدلہ پاؤ اس برہان میں غور کرنے سے پھر کسی منکر کو جائے انکار باقی نہیں رہتی۔

فوائد: ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ کہ مر کر پھر زندہ ہونا ہے اس دلیل سے ظاہر ہے کہ جس نے ابتداءً زندہ کر دیا دوبارہ زندہ کرنا اس کو کیا مشکل ہے؟ جب یہ ہے تو ثم الیہ ترجعون میں کہ اس کے پاس حساب و کتاب کے لیے پھر جانا ہے، کیا شک ہے؟ گویا یوں کہنا چاہیے کہ انسان ملکِ عدم سے کوچ کر کے ملکِ ہستی میں آیا پھر یہاں سے انتقال کر کے ایک اور عالم میں جائے گا کہ جس کو باعتبار اس حیات کے موت کہتے ہیں لیکن چندے وہاں آلودگیِ جسمانی کے اثر میں مبتلا رہے گا پھر اس سے پاک ہو کر ایک کامل حیات پاوے گا اور جب یہ تکدر بالکل جاتا رہے گا تو خدا تعالیٰ کے روبرو ظہورِ کلی یعنی حشر کے روز حاضر ہوگا، اس تھوڑے سے کلام میں کس قدر مبدء و معاد کے احوال اجمالاً مذکور ہیں۔

نکات: (۱) اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام عالم بالخصوص انسان محض اس کے وجود کا ظل ہے جس طرح کہ دھوپ آفتاب کا ظل ہے پس جس طرح یہ تخصیصِ شیونات ہر چیز بالخصوص انسان اس مبدا سے چلا ہے اسی طرح پھر اس کی طرف تجرد ہوتے ہوتے (کہ جو موت سے حاصل ہوتا ہے اور اسی لیے موت کو نعماء میں شمار کیا ہے ورنہ موت فی نفسہ نعمت نہیں) وہیں جا کر منتہی ہوگا کیونکہ رجوع کے معنی یہ ہیں کہ جہاں سے جاوے پھر وہیں ہٹ کر آوے جس طرح کرہ میں جہاں سے ابتدا ہوتی ہے وہیں آ کر انتہا ہوتی ہے، اسی طرح خدا تعالیٰ چونکہ ہر شے پر محیط ہے (اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ) اسی سے ابتدا ہے پھر اس کی طرف انتہا ہے لیکن یہ احاطہ جسمانی نہیں مگر کفر و الحاد ہر

طرح کی بیدینی، شہوت پرستی روح کے لیے اس کی طرف رجوع ہونے میں چونکہ موانع اور عوائق ہیں جیسا سڑک پر چلنے والے کے لیے غار و دیوار یا اینٹ پتھر۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام اس سلوک کو تمام کرنے کے لیے ان چیزوں سے منع کرتے ہیں کیونکہ اس کے پاس پہنچنا کہ جو مرکزِ اصلی ہے نجات ہے اور عوائق کے سبب دور رہنا ہلاکت ہے۔ مگر آیت میں رجوع کرنے سے مجبوراً بارگاہِ کبریائی میں حساب و کتاب کے لیے حاضر کیا جانا مراد ہے۔

(۲) اگرچہ بظاہر فاعل تکفرون سے وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا حال نہیں ہوسکتا کس لیے کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہوتا ہے اور اس لیے جملہ ماضیہ کو جو حال بناتے ہیں تو پہلے لفظ قد لاتے ہیں اور یہاں اتحادِ زمانہ ہی نہیں کیونکہ انسان کے معدوم ہونے اور پھر موجود ہوکر کفر کرنے میں بڑا فاصلہ ہے۔ پیدا ہوکر عاقل بالغ ہووے گا تب کہیں اس کا انکار کرنے گا۔ لیکن اس رمز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حال بنایا کہ گو وہ زمانہ بعید ہے مگر ایامِ زندگانی چونکہ بادِ صبا کی طرح یوں ہی گزر جاتے ہیں جس کی سو برس کی عمر ہوتی ہے وہ بھی ایامِ طفولیت کے وقائع کو کل کی بات کہا کرتا ہے خواجہ درد فرماتے ہیں۔

گزروں ہوں جس خرابہ پہ کہتے ہیں وہاں یہ لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

اور مرنے کے بعد تو ہزارہا سال کے زمانے کو یَوْمِ اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ کہیں گے۔ اس لیے اس کو حال بنایا اور اس لیے بھی۔

(۳) اس تقدیر پر ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ کا بظاہر عطف وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا پر صحیح نہیں ہوتا کیونکہ یہ امور تو زمانۂ آیندہ میں پیش آئیں گے، پس تکفرون سے بذریعہ عطف کہ جو زمانۂ حال کو چاہتا ہے حال نہیں بن سکتے مگر یہاں بھی وہی نکتہ مرعی ہے کہ گویہ امور ایک عرصہ بعد پیش آویں گے جیسا کہ لفظ ثم باآواز بلند کہہ رہا ہے مگر بقولِ عرب مااقرب ماھو آت وما ابعد ماھو فات آنے والی چیز گویا عاقل کے روبرو کھڑی ہے پس اس نکتہ کے لیے اس زمانۂ آیندہ کو حال بنایا، گویا یہ بات بتلادی کہ تمہارے بعد پیدا ہونے کا اور پھر مرنے کا زمانہ دونوں ملے ہوئے ہیں پس جب یہ ہے تو اس وجود بین العدمین کالطھر بین الدمین پر پھول کر خدا کو بھولنا اور اس بے حقیقت ہستی کے گھمنڈ میں خدا تعالیٰ سے اکڑنا، کفر کرنا بڑی حماقت ہے۔ بلغاء کا عام دستور ہے کہ وہ وجودِ شی کو عدم اور عدم کو وجود اور بُعد کو قرب اور قرب کو بُعد اعتباراتِ لطیفہ سے قرار دے کر کلام کرتے ہیں۔

(۴) اس کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا اور اس کو اول کلام کا تتمہ یا نتیجہ اور اس کے بعد کے کلام کا توطیہ، تمہید کہیں تو بجا ہے۔ پس اس کے بعد اس دوسری نعمت کو بیان کرتا ہے کہ جس کو وجودِ انسان ازبس مقتضی ہے اور جس کے بغیر اس کو دم بھر بھی چارہ نہیں، پس فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ
سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۹) ع ۳

اللہ وہ ہے کہ جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو سات آسمان بنادیا اور وہ ہر چیز (بنانا) جانتا ہے۔

ترکیب : ھو مبتدا الذی موصول خلق فعل بافاعل لکم متعلق ہے خلق کے ما موصول ثانی ذی الحال فِی الْاَرْضِ ثبت کے متعلق ہوکر اس کا صلہ ہوا جَمِیْعًا بمعنی مجتمعاً حال ہے یہ ما اپنے صلہ اور حال سے مل کر مفعول ہوا خلق کا اور پھر خلق تمام جملہ مل کر صلہ ہوا الذی کا پھر الذی

خبر ہوئی ہو کی ثم کلمۂ تراخی استوی بمعنی قصد فعل بافاعل الی السماء متعلق ہے استوی کے فسوھن میں سوی بمعنی عدل و خلق فعل ضمیر اس کی فاعل ھن ضمیر جمع مؤنث راجع ہے السماء کی طرف اگر اس سے مراد اجرام لیا جاوے ورنہ مبہم ہے اس کی تفسیر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ہے اور اول تقدیر بدل ہے ھو مبتداء بکل شیء علیم خبر۔

تفسیر : یہ دوسری نعمت خدا تعالیٰ یاد دلاتا ہے کہ جو پہلی نعمت پر مترتب ہے۔ یعنی تم اس خدا سے کیونکر روگردانی کرتے ہو کہ جس نے تم کو معدوم سے موجود کردیا اور پھر موجود کرکے یوں ہی پریشان اور بے سامان نہیں چھوڑا بلکہ تمہارے فائدے کے لیے زمین کی ہر ایک چیز کو پیدا کیا ع ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند۔ پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی تو اس کے طبقے بنادیے، کیونکہ زمین کی چیزوں کا سرانجام پانا آسمانی اور علویات کی تاثیر بغیر نہیں ہوسکتا، اگر آفتاب نہ ہوتا یا مہتاب اور ستارے نہ ہوتے تو پھل پھول ہزاروں چیزیں نہ ہوتیں۔ الغرض زمین کی چیزوں کو آسمانوں اور آسمانی چیزوں سے ایک عجیب ارتباط ہے کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ رزق و روزی ہے وہ آسمان سے اترتی ہے وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ اور یہ اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ہر چیز کی مصلحتیں اور اسرار اس کو معلوم ہیں۔

متعلقات : استوی کے معنی لغت میں قصد کرنے کے ہیں، بولتے ہیں استوی الیہ کالسھم المرسل جبکہ کوئی کسی چیز کا قصد مصمم کرے اور ادھر ادھر نہ ہٹے اور اصل استواء کی طلب مساوات ہے اور سیدھی چیز کو مستوی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء باہم مساوی یعنی برابر ہوتے ہیں جیسا کہ سطح اور خط اور جسم مگر یہ معنی جنابِ باری کے لیے تجویز کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ جسمیت سے پاک ہے اور جن لوگوں نے اس قسم کے الفاظ سے یہ بات نکالی (کہ وہ آسمان یا عرش پر سیدھا کھڑا ہوتا ہے یا بیٹھتا ہے جس طرح کوئی اپنی کرسی یا تخت پر بیٹھتا ہے اور پھر اس کی تائید میں کچھ احادیث لائے ہیں کہ جن میں بیشتر تیسری چوتھی صدیوں کے محدثین کی وہ احادیث ہیں جو رطب و یابس کا مجموعہ ہیں) بڑی غلطی کی ہے اور پھر اصرار اور غلو کرکے رسائل لکھنا اور عرشی فرشی کہلانا ایک سادہ لوحی اور تعصبِ بیجا ہے اعاذنا اللہ منہ۔

السماء کی ہمزہ واؤ سے بدل گئی پیشتر واؤ تھا اور جو واؤ کہ الف کے بعد زائد ہوتا ہے بیشتر عرب اس کو ہمزہ سے بدل لیتے ہیں۔ لغت میں لفظ سماء کا چند معانی پر اطلاق ہوا ہے۔ بادل کو بھی کہتے ہیں اور افق کو بھی ایک شاعر کہتا ہے ؎

فاوّاہ الذکر بہا اذا ما ذکرتہا
و من بعض ارض بیننا و سماء

”کہ جب میں اس محبوبہ کو اور پھر وہ جو مجھ میں اور اس میں زمین کے ٹکڑے اور ان کے اوپر کے آسمان فاصل ہیں ان کو خیال کرتا ہوں تو دل سے ایک آہ نکلتی ہے۔“

اور اوپر کی جانب کو بھی اور اس نیلی چھت کو بھی کہ جو ایک گول گنبد سا نظر آتا ہے قرآن میں جو جابجا سماء کا ذکر ہے کہ ہم نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ، اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ کہ ہم نے پہلے آسمان کو ستاروں سے زینت دی۔ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ کیا نہیں دیکھا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو کس طرح بنایا ہم نے ان کو اور کیسی زینت دی اور ان میں کوئی درز بھی نہیں۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ۔ ”اس نے سات آسمانوں کو اوپر تلے بنایا، اے دیکھنے والے تجھ کو خدا کی پیدائش میں کچھ تفاوت نہ معلوم ہوگا دوبارہ نظر آسمانوں کی طرف پھرا تیری نگاہ تھک کر خیرہ ہوکر رہ جائے گی“ وغیرہا من الآیات پس اس سے وہی اخیر معنی مراد ہیں کہ جس کو ہماری زبان میں آسمان اور ہندی میں آکاش اور انبر کہتے ہیں اور ہر زبان میں اس کا نام ہے اور جس کو تمام عرب و عجم، ہند و روم، اہلِ یورپ قدیم زمانہ سے اب تک ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ خدا نے آسمانوں کو

بنایا ہے ہم ان کو دیکھتے ہیں ان میں کوئی شگاف اور درز نہیں کہ جو خدا کی صنعت میں قصور ثابت کرے اور یہ ستارے آسمان پر لگے ہوئے ہیں اگر کسی پڑھے ہوئے سے پوچھئے گا تو وہ بھی یہی کہے گا اور ان پڑھ بلکہ جنگل کے رہنے والے وحشیوں سے دریافت فرمائیے گا تو وہ بھی یونہی کہیں گے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے کہ جس کا علم انسان کی فطرت اور جبلت میں یکساں رکھا گیا ہے اور اسی فطری علم پر خدائے تعالیٰ اپنے کلام میں انسان کو مخاطب کر کے اپنے عجائباتِ قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام بھی اسی نہج پر کلام کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ توراتِ اول کے پہلے باب میں یہ لکھا ہے ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا (۸) اور خدا نے فضا کو آسمان کہا۔ (۱۰) اور خدا نے خشکی کو زمین کہا پھر اسی کتاب کے ۷ باب میں طوفانِ نوح کے بیان میں یہ جملہ بھی ہے جب نوح کی عمر چھ سو برس کی ہوئی دوسرے مہینے کی سترہویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کی سب سوتیں پھوٹ کر نکلیں اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور ۸ باب میں یہ جملہ ہے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہو گئیں اور آسمان سے مینہ تھم گیا پھر اسی کتاب کے ۱۹ باب میں قومِ لوط کی نسبت یہ ہے تب خداوند نے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ خداوند کی طرف سے آسمان پر سے برسائی۔ انجیل متی کے ۳ باب میں ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے اصطباغ یعنی دریا میں غوطہ لگا کر باہر آئے تو ان کے لیے آسمان کھل گیا۔ انجیل لوقا کے ۱۸ باب میں یہ جملہ ہے پر اس محصول لینے والے نے دور سے کھڑا ہو کے اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھاوے بلکہ چھاتی پیٹتا اور کہتا تھا کہ اے خدا مجھ گناہ گار پر رحم کر اور مکاشفاتِ یوحنا کے ۸ باب اور دیگر ابواب سے صاف آسمان پر ستاروں کا ہونا اور ان کے دروازے کھلنا اور وہاں سے آواز آنا وغیرہ وہ باتیں مذکور ہیں کہ جو قرآن و احادیث کے مطابق ہیں اسی طرح ہنود کے وید اور پارسیوں کے دساتیر سے بھی آسمانوں کی بابت اس طرح کے مضامین مفہوم ہوتے ہیں۔ الغرض ہزارہا برس سے الہامی اور غیر الہامی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام اور دیگر لوگوں کا اس امر میں اتفاق ہے لیکن گریک یعنی یونان کے فیلسوفوں نے جس طرح اور چیزوں کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنے میں عقل کے گھوڑے

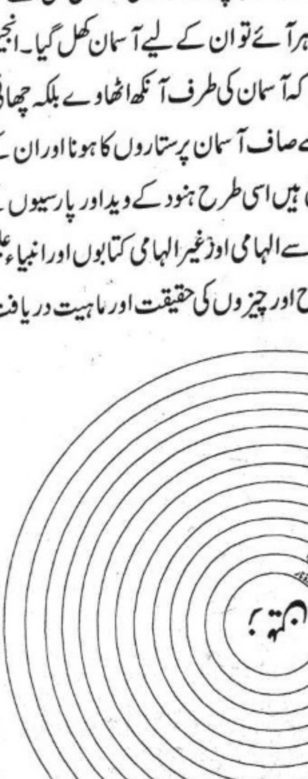

دوڑائے اور جو باتیں ان کو اپنے قیاس اور تخمین یا تجربہ اور آلاتِ رصد وغیرہا سے دریافت ہوئیں تو ان کو قلمبند کیا اور اس کا نام حکمت رکھا کہ جس کی شاخیں ہیئت اور طبعیات اور آلہیات وغیرہا علوم ہیں کہ جن پر بہت سے کوتاہ بینوں کو ناز ہے مگر آسمانوں کی تحقیق میں ان کے دو فریق ہو گئے ایک گروہ کے پیشوا کا فیثاغورس نام ہے وہ کہتے ہیں آسمانوں کا وجود نہیں یہ ستارے بذاتِ خود قائم ہیں کسی میں جڑے ہوئے نہیں پھر خود اس فریق کے بھی دو قول ہیں بعض کہتے ہیں ستارے اور ثوابت متحرک نہیں صرف زمین حرکت کرتی ہے اس کی وجہ سے یہ چیزیں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس طرح کہ ریل گاڑی میں درخت اور پتھر حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں دوسرا گروہ کہتا ہے کہ زمین بھی متحرک ہے اور ستارے بھی۔ آفتاب کو مدار ٹھہرا کر اس کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ ہاں چھوٹے چھوٹے ستارے کہ جن کو ثوابت کہتے ہیں وہ حرکت نہیں کرتے ان کی حرکت زمین کی حرکت سے محسوس ہوتی ہے اور جس طرح ستارے آفتاب کے ایک فاصلہ معین پر حرکت دوری کرتے ہیں اسی طرح

زمین بھی اپنے بعد معین پر اس کے ارد گرد پھرتی ہے اور ستارے صرف یہ زحل، مشتری، مریخ، عطارد، زہرہ، شمس، قمر ہی نہیں ان کے سوا اور بھی رصد سے ثابت ہوئے ہیں۔ یہ مذہب فیثاغورس مدت تک تو حکماء کے نزدیک اس کے دیگر اقوال کی طرح مردود اور بے قدر رہا مگر اب چند عرصہ سے اس لیے یورپ میں بڑا رواج پایا اور یورپ کے بڑے بڑے محقق اسی کے مقلد ہو کر ان ہی باتوں کو الہامی اور لوحِ محفوظ کی باتیں سمجھنے لگے بلکہ اپنی تحقیقات سے اس پر اور کچھ بڑھایا اور چاند اور سیاروں میں پہاڑ اور دیگر اجرامِ عنصری بلکہ حیوانات کے وجود کے بھی بعض لوگ قائل ہو گئے اور بہت سی عجیب و غریب باتیں پیدا کیں۔[1] دوسرے گروہ کے سرِ دفتر حکیم بطلیموس ہیں وہ کہتے ہیں کہ زمین گول کروی ہے کسی قدر یعنی تخمیناً چوتھائی حصہ اس کا ناہمواری کی وجہ سے اونچا اٹھا ہوا ہے باقی اس کے گرد پانی لپٹا ہوا ہے جس کو سمندر کہتے ہیں۔ پانی کے ارد گرد کرہ ہوا لپٹا ہوا ہے اس کے اوپر آگ کوسوں تک ہر طرف سے لپٹی ہوئی ہے۔ یہ چار کرہ عناصر کے ہوئے اب یہ جس قدر زمین پانی سے اوپر اٹھی ہوئی ہے اس پر سب لوگ بستے ہیں ان چاروں کروں کے چوطرف پہلا آسمان ہے جس کو فلک القمر بھی کہتے ہیں یعنی اس آسمان میں چاند ہے جیسا کہ نیلے جسم پر ایک سفید گول نشان ہو جاتا ہے اس کے اوپر فلک العطارد ہے۔ فلک زہرہ اس کے اوپر فلک شمس ہے یعنی چوتھا آسمان جہاں آفتاب ہے اس کے اوپر فلک مریخ کہ جہاں مریخ ستارہ ہے اس کے اوپر فلک مشتری اس کے اوپر کہ جہاں مشتری ستارہ ہے اس کے اوپر فلک زحل کہ جہاں زحل ستارہ ہے اس کے اوپر فلک الثوابت کہ جہاں پر سینکڑوں ان گنت ستارے ہیں کہ جو از خود حرکت کرتے معلوم نہیں ہوتے یعنی ایک جگہ ہمیشہ ثابت رہتے ہیں۔ چونکہ نیچے کے آسمان بلکہ کل آسمان نہایت شفاف اور صاف ہیں وہ اوپر کے ستارے سب نظر آتے ہیں۔ اس کے اوپر فلک الافلاک کہ جس کو فلکِ اطلس کہتے ہیں یعنی سادہ اس پر کوئی تارہ نہیں وہ دن رات میں مشرق سے مغرب کی طرف ایک جگہ چرخہ کی طرح پھر کر دورہ تمام کرتا ہے اور اس کی وجہ سے سب آسمان اور تارے دورہ تمام کرتے ہیں کہ جس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں یعنی جہاں سامنے آفتاب آ گیا وہاں دن ہو گیا اور جہاں سامنے سے بالکل ہٹ گیا رات ہو گئی اور تمام ستارے از خود بھی ایک حرکت مغرب سے مشرق کی طرف کر کے دورہ تمام کرتے ہیں۔ چاند تو مہینہ بھر میں اس دورہ کو تمام کر لیتا ہے دراصل گھٹتا بڑھتا نہیں بلکہ جس قدر وہ آفتاب کے مقابلہ میں آتا ہے اور اسی قدر اس پر روشنی پڑتی ہے اتنا ہی ہم کو دکھائی دیتا ہے ورنہ وہ گول بڑا بھاری جسم ہے زمین سے کہیں زائد ہے اور آفتاب اپنے دورہ کو دائرہ منطقۃ البروج[2] پر برس میں تمام کرتا ہے۔ اسی لیے مختلف فصلیں سردی اور گرمی کی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کل تیرہ کرے ہوئے جن میں نو آسمان ہیں سات تو یہ کہ جن کو شرع نے سبع سمٰوٰت کہا ہے اور دو وہ کہ جن کو عرش و کرسی کہا ہے کرسی فلک الثوابت' عرش فلک الافلاک ہے۔ اس صورت پر اور آسمانوں کا کوئی رنگ نہیں کیونکہ اگر رنگ ہوتا تو اوپر

[1] منجملہ ان کے سید احمد خان صاحب ہیں کہ جو اپنی تفسیر کے صفحہ ۴۵ میں اول تو لفظ سماء کا اطلاق ستاروں پر از خود فرض کرتے ہیں اور پھر سبع سمٰوات سے بتقلیدِ حکماءِ یونان و یورپ وہ وسعت مراد لیتے ہیں کہ جو انسان کے اوپر دکھائی دیتی ہے بقرینہ سبع سیارہ اس کو سبع یعنی سات کہہ دیا ورنہ سات میں کچھ حصر نہیں اور بیضاوی نے عرش و کرسی ثابت کرنے کے لیے جو یہ کہہ دیا تھا کہ سات کہنے سے زائد کی نفی نہیں ہو سکتی اس کو اپنے مدار کے لیے دلیل بنایا اور جہاں بیضاوی نے صرف لفظ السماء کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اس لفظ سے مراد اجرامِ علویہ یا جہاتِ علو ہے تو حضرت یہ سمجھ گئے کہ بیضاوی اس آیت میں اس لفظ سے دونوں مراد لینا جائز رکھتے ہیں اس پر طرہ یہ الٹا کہ سب علماء اور مفسرین پر کہ جو تقلیدِ حکماء نہیں کرتے طعن کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وسعت یعنی فضا کوئی مجسم چیز نہیں صرف بُعدِ موہوم ہے حالانکہ قرآن مجید اور دیگر کتبِ الہامیہ سے آسمان کا مجسم ہونا ثابت ہے اور یہ کہ وہ قیامت کو پھٹ جائے گا۔

[2] اور اسی کو فلک البروج بھی کہتے ہیں برج سے مراد قلعہ جات کے برج نہیں بلکہ دوائر کی وجہ سے آسمانوں کے بارہ حصہ اس طرح قائم کئے ہیں کہ جس طرح خربزہ کی پھانکیں اور ستاروں کی ہیئت اجتماعی سے کہیں شیر کی صورت پیدا ہو گئی تو برج اسد کہنے لگے اور کہیں کیکڑے کی تو اس کو سرطان اور کہیں بچھو کی تو اس کو عقرب وقس علیٰ ہذا۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں بھی عرب ان بروج سے واقف تھے اسی لیے خدا نے والسماء ذات البروج فرمایا۔

کی چیزیں دکھائی نہ دیتیں اور یہ جو نیلگوں معلوم ہوتا ہے یہ آسمان کی شفافی اور غبارات کی تیرگی سے پیدا ہوا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب سفیدی اور سیاہی ملتی ہیں تو نیلی رنگت پیدا ہو جاتی ہے یا یوں کہو کہ اجزائے شفاف ہیں اجزائے غباری کہ جو سیاہ ہیں ان کے ملنے سے یہ نیلگونی پیدا ہو گئی یا یہ کہ ہوا کے اجزاءِ شفاف میں جب ان کو دیکھتے ہیں تو نظر میں ایک تیرگی پیدا ہوتی ہے ان دونوں کے ملنے سے نیلگونی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ سمندر کا پانی نیلا دکھائی دیتا ہے اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل اس حکیم اور اس کی جماعت کے ہیں اور چونکہ یہ مسائل کسی قدر الہامی کتابوں کے موافق ہیں اس لیے اس حکمت کا جس طرح حکماءِ یونان میں رواج ہوا اسی طرح جب حکمتِ یونانیہ عربی میں ترجمہ ہو کر آئی اہلِ اسلام نے بھی اس کو پسند کیا چنانچہ اب تک شرح چغمینی اور تذکرہ وغیرہما اسی حکمت کی کتابیں درس میں داخل ہیں بلکہ ایشیائی ملکوں میں ہندو اور ایرانی وغیرہما سب لوگ اور قدیم عیسائی اور یہودی بھی انہیں مسائل کے معتقد ہیں لیکن نہ اسلام کو اس ہیئت سے کچھ بحث ہے، نہ اس سے۔ اگر یہ غلط ہوا تو اسلام کی صداقت میں کیا نقصان آتا ہے؟ اور جو وہ سراسر غلط ہو تو کیا نقصان ہے البتہ آسمانوں کی بابت علی سبیل فکرِ آیاتِ قدرت جو کچھ قرآن یا دیگر کتبِ الہامیہ میں مذکور ہے اس کے تمام بنی آدم قائل ہیں وہ علمِ فطری ہے جب بطلیموس اور فیثاغورس نہ تھے جب بھی لوگ ان باتوں کو مانتے تھے۔

اول تو یہ مسلم نہیں کہ اگر آسمانوں کا کوئی رنگ ہو تو نیچے کے آسمان کی وجہ سے اوپر کے آسمان کی چیزیں نظر نہ آویں باوجودیکہ پانی اور بلور اور آئینہ میں رنگت ہوتی ہے پھر بھی وہ نفوذِ بصر کو مانع نہیں اس کے پرلی طرف والی چیز برابر نظر آتی ہے (دوم) ممکن ہے کہ نویں یا آٹھویں آسمان کی رنگت نیلگوں ہو اگر اوپر کی چیز کے نظر آنے میں مانع ہوگا تو وہ ہوگا باقی نیچے کے آسمان مانع نہ ہوں گے اور ان کے اوپر کوئی ستارہ نہیں اور ان کی رنگت اوپر تلے آئینوں میں جس طرح اوپر کے آئینہ کی رنگت تلے دکھائی دیتی ہے اور نیلا رنگ کچھ ان ہی صورتوں میں کہ جن کو مستدل نے ذکر کیا منحصر نہیں اور یہ جو سب کچھ تسلیم بھی کیا جاوے تو قرآن سے صرف یہ ثابت ہے کہ آسمانوں کی طرف نظر کر سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر یہ نیلا رنگ گو آسمان کا رنگ نہ ہو مگر جب یہ آسمان کے ساتھ وہ علاقہ رکھتا ہے جو کہ سمندر کے پانی کے ساتھ اس کا رنگ پھر جس طرح سمندر کا نیلا رنگ اس کی روئیت اور نظر کرنے میں قادح نہیں اسی طرح آسمان کی طرف نظر کرنے میں یہ مانع نہیں یا یوں کہو کہ کسی جسم پر کوئی کپڑا لپیٹ کر دکھایا جاوے تو وہ دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہم نے وہ جسم دیکھا، آدمی پائجامہ کرتا پہنے ہوئے جب دکھائی دیتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو دیکھا، اسی طرح اگر آسمانوں کے نیچے خدا نے یہ قدرتی نیلگوں چھت گیری لگا دی ہے تو اس کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں کرتی اور یوں تو حقیقۃً کوئی جسم دکھائی ہی نہیں دیتا جب نظر پڑے گی تو اس کے عوارض ہی پر پڑے گی کما ہو الحق عند الحکماء۔

الہامی کتابوں بالخصوص قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ آسمان کوئی مجسم چیز ہے کہ جو قیامت کو پھٹ جاوے گی، عام ہے کہ وہ کوئی جسم اور کسی قسم کا ہو۔ قال اللہ تعالیٰ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وقال اذا السَّمَآءُ کُشِطَتْ وَقَالَ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ وقال لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ۔ الآیۃ کیونکہ اگر آسمان فضا یا بُعدِ موہوم کا نام ہوتا جیسا کہ بعض مقلدینِ یورپ کا قول ہے تو وہ ایک عدمی چیز ہے اس کا پھٹنا اور اس کے چھلکوں یعنی طبقات کا اکھڑنا اور اس کو پیدا کرنا اور بنانا جس طرح کہ زمین اور اس کی چیزیں بنائیں یا اس کی کھڑکیاں کھلنا جس کا کہ تورات میں ذکر ہے اور اس کو سقفِ محفوظ کہنا چہ معنی دارد؟ البتہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ اکابر سے جو کچھ آسمان کے باہمی فاصلہ کی نسبت مروی ہے اور یہ کہ فلاں آسمان چاندی کا اور فلاں زبرجد کا اور فلاں اس کا اگر بسند صحیح ثابت ہے تو تشبیہ اور مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر پھر اس پر اعتراض محض بے جا ہے۔

فوائد : (۱) عالم کے پیدا ہونے میں لوگوں کے گوناگوں مذاہب اور مختلف اقوال ہیں۔ ہندو جو اپنی کتابوں بالخصوص چاروں وید اور پرانوں کو تمام دنیا کی کتابوں سے قدیم سمجھتے ہیں اور ان کے پنڈت اپنے علوم پر بڑے نازاں ہیں اور سوائے ہندوؤں کے کل عالم کو ملیچھ کہتے

ہیں یعنی ناپاک اور کسی کو نجات اور سرگ (بہشت) کا مستحق نہیں جانتے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنے مذہب میں بھی ملانا روا نہیں سمجھتے ان کے ابتدائے عالم اور آفرینشِ جہان کی بابت اس قدر مختلف اقوال ہیں کہ جن کے سننے سے عاقل کے سر میں درد ہوتا ہے

قول اول: چنانچہ رگ وید کے آتیریہ ارینہ میں لکھا ہے کہ شروع میں یہ سنسار (عالم) صرف آتما یعنی روح تھا اور کچھ نہ تھا پس اس نے چاہا کہ میں جگت کو پیدا کروں پس اس نے پانی، روشنی، جاندار وغیرہ طرح طرح کے عالم پیدا کئے پھر خیال کیا کہ ان کا نگہبان پیدا کروں۔ تب اس نے ایک پرش یعنی شخص کو پانی سے نکالا اور اس میں غور سے نگاہ کی تو اس کا منہ انڈے کی طرح کھل گیا اور اس میں سے ایک شبد یعنی آواز نکلی اور اس آواز سے آگ پیدا ہوئی پھر اس کے نتھنے کھل گئے اور سانس آنے لگے۔ اس سانس سے آکاش یعنی آسمان پیدا ہوئے پھر آنکھ کھل گئی ان سے جوت (روشنی) اور اس سے سورج پیدا ہوا اور کان کھل گئے ان سے چاروں کونوں کا پھیلاؤ ہوا پھر اس کے چمڑے سے بال نمودار ہوئے ان سے نباتات پیدا ہوئے اور اس کی چھاتی کھل گئی اس سے بدھ اور بدھ سے چاند پیدا ہوا پھر ناف کھل گئی اس سے رپان جس سے موت پیدا ہوئی اس کے بعد لنگ (آلۂ تناسل) کھل گیا اس سے منی نکلی اور اس منی سے پانی پیدا ہوا پھر وہ برہما یہ سوچا کہ یہ پرش مجھ بغیر کس طرح رہ سکے گا اس لیے وہ اس کے سر میں سما گیا الخ۔

اس بیان میں چند خرابیاں ہیں (۱) یہ کہ جب وہ خود لکھتا ہے کہ اس نے تمام عالم پانی روشنی سب کچھ پیدا کر لیا تو ان کی محافظت کے لیے اس پرش کو پیدا کیا پھر یہ کہنا کہ اس پرش کے منہ سے آگ اور آلۂ تناسل سے پانی اور سانس سے آکاش اور آنکھ سے آفتاب پیدا ہوا صریح غلط ہے۔ (۲) جب پانی اس کی منی سے پیدا ہوا تو پھر یہ کہنا کہ پرش کو پانی سے نکالا بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے پہلے پانی کہاں تھا اور تھا تو یہ کیوں کہا کہ اس کی منی سے پیدا ہوا۔ (۳) منی غذاؤں کے کھانے سے پیدا ہوتی ہے اس سے تو تمام نباتات اور پانی پیدا ہوا پھر اس سے پہلے کیا کھا پی کر منی پیدا ہوئی۔ (۴) اس قول کے بموجب اس پرش اور تمام عالم کا پیدا کرنے والا برہما ثابت ہوتا ہے حالانکہ اس کے برخلاف وید اور پورانوں سے ثابت ہوتا ہے۔

قول دوم: برہمہ دیوت پران کے برہم کھنڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرشن سرشت کرتار یعنی خالق ہے اس کے دائیں طرف سے وشنو اور بائیں سے شیو اور ناف سے برہما پیدا ہوا اور ان تینوں نے اس کی پوجا کی یہ قول اول اقوال کے صریح برخلاف ہے۔

قول سوم: بھاگوت اور شیو پران میں لکھا ہے کہ وشن کی ناف سے کنول کا پھول نکلا اس سے برہما پیدا ہوا جس نے وشن سے جھگڑا کیا۔

قول چہارم: متیہ پران میں لکھا ہے کہ برہما سے شیو پیدا ہوا یعنی مہادیو یہ اول اور دوم اور سوم سب کے مخالف ہے۔

قول پنجم: لنگ پران میں لکھا ہے کہ شیو برمہانڈ سے نکلا اور صورت پکڑ کے اپنی بائیں طرف سے وشن اور لکھشمی کو اور دائیں طرف سے برہما اور سرستی کو پیدا کیا اور یہ پہلے قول سے بالکل مخالف ہے۔

قول ششم: ویدانت اور سانکھ سار اور دیگر پرانوں سے ثابت ہے کہ سرشٹ کے وقت برمّہ سے اور بدھ سے اہنکار اور اہنکار سے آکاش اور آکاش سے اگن اور اگن سے جل اور جل سے پرتھوی اور ان سے سب چیزیں پیدا ہوئیں۔

قول ہفتم: یجروید میں لکھا ہے کہ دراج پرش سے سرشٹ ہوئی اس طرح پر کہ اس نے مرد و عورت کی شکل ایک شخص کو پیدا کیا پھر وہ دو شخص ایک مرد ایک عورت بن گئے اور جورو خصم بن گئے وہ عورت مرد سے شرما کر گائے بن گئی تو مرد بیل بن گیا، اس سے بیل و گائے کی نسل جاری ہوئی پھر وہ گھوڑی تو یہ گھوڑا بن گیا اور وہ گدھی تو یہ گدھا بن گیا اور وہ کتیا تو وہ کتا بن گیا۔ الغرض جس قدر کائناتِ عالم ہے اس کی صورت میں وہ مرد عورت آتے گئے اور وہ چیزیں عالم میں ظہور پاتی گئیں۔ اس قصہ کو سن کر ناظرین بے اختیار ہنسیں گے۔

قول ہشتم: منو کے شاستر میں کہ جس کو دھرم شاستر کہتے ہیں، یہ لکھا ہے کہ پہلے ایسا اندھیرا تھا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا، تب ایشر نے

پر تھمی ظاہر کرنے کے لیے مہاتت اور بھوت وغیرہ کی صورت میں ظہور کیا تب برہما نے خلقت کو پیدا کرنے کا ارادہ کر کے اول جل (پانی) کو پیدا کیا اور اس جل میں اپنی منی ڈالی جس سے سونے کا چمکتا ہوا انڈا پیدا ہوا، اس انڈے میں سب کا باپ آپ برہما ہو کے پیدا ہوا، پھر کے برس تک برہما اس انڈے کے خیال میں رہا اس کے بعد اس کو توڑ کر دو ٹکڑے کر دیے اور ان سے آسمان اور زمین بنایا الخ یہ ہذیان بھی قابلِ غور ہے۔

قول نہم: کرم پران میں لکھا ہے میں نارائن دیو جو ہوں سرشت کے پہلے تھا پر میرے رہنے کو استھان (جگہ) نہ تھا تب اوے ہو کر شیش ناگ کو پلنگ پر بنا کر آرام کیا اس کے پیچھے میری مہربانی سے چومکھی برہما پیدا ہوا جو تمام دنیا کا دادا ہے پھر برہما نے اپنی مانند پانچ شخص بنائے۔سنک، سناتن، سنندن، رورو اور سنت کمار الخ، تب مہامنی وشنو نے اپنے پتر (پسر) برہما کو تسلی دی جس سے وہ عبادت کرنے لگا لیکن جب اس کا کچھ پھل نہ ملا تو غصہ میں آکر رونے لگا اور ان آنسوؤں سے مہادیو پیدا ہوا پھر اس نے اور خلقت کو پیدا کیا الخ ان سب کے علاوہ بیدانتی لوگ کچھ اور ہی کہتے ہیں ان سے بڑھ کر یہ اقوال حیرت افزا ہیں مارکنڈ اور سری بھاگوت میں لکھا ہے کہ کھاری پانی کا سمندر ایکھ کے رس کا سمندر، شراب کا سمندر، گھی کا سمندر، دودھ کا سمندر، چھاچھ کا سمندر، میٹھے پانی کا سمندر یہ ساتوں سمندر سمیر[1] کے چاروں طرف بہتے ہیں، مگر نہ اس سمیر کا پتا ہے نہ ان سمندروں کا کہیں نشان ہے۔بعض پرانوں میں ہے کہ زمین کچھوے کے پیٹ پر ہے اور بعض میں ہے کہ نادیہ بیل کے دونوں سینگوں پر زمین ہے اور وہ بیل مچھلی پر کھڑا ہے اور جب وہ بیل سر ہلاتا ہے تو زلزلہ آتا ہے اور بعض میں ہے کہ شیش ناگ کے سر پر ہے اس خیالِ سوداوی کا کچھ ٹھکانا ہے۔وید اور شاستروں اور پرانوں میں یہ لکھا ہے کہ سمیر پربت زمین کے بیچوں بیچ ایک پہاڑ ہے جس کی بلندی تین لاکھ کوس ہے اور اس کی جڑ کی مٹائی چونسٹھ ہزار کوس کی ہے اور اس کے اوپر مہادشن، شیو، اندر اور دیوتاؤں کا استھان ہے اس کے آس پاس اور بہت پہاڑ ہیں جنہوں کے اوپر ایک ایک درخت چار چار ہزار سو کوس کا اونچا ہے۔ہنود کی بعض کتابوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ کرم یعنی افعال خالق ہیں اور بعض پراکرت یعنی زمانہ کو خالق جانتے ہیں خدائے تعالیٰ کے منکر ہیں۔بعض مایا کے قائل ہیں۔بعض کہتے ہیں وہ خود اپنی صورتیں بدل کر عالم میں ظاہر ہوا کبھی درخت کبھی پتھر بنا۔اب میں حکماءِ یونان کے اقوال اس بارہ میں نقل کرتا ہوں:

واضح ہو کہ حکماء کے دو گروہ ہیں ایک گروہ متقدمین یعنی افلاطون سے پہلے اور خود افلاطون ایک گروہ متاخرین ارسطاطالیس اور اس کے معاصر اور بعد کے حکماءِ قدما کے مختلف اقوال ہیں چنانچہ ثالیس ملیطی یہ کہتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی عالم کا مبدع[2] اور وہ پانی ہے کیونکہ ہر قسم کی صورت قبول کر سکتا ہے۔اسی سے آسمان و زمین عناصر مرکبات ہر چیز بنی ہے پس جو پانی کہ منجمد ہو گیا یعنی جم گیا وہ زمین ہے اور پانی کے تحلیل ہونے سے ہوا پیدا ہوئی ہے اور تموجِ بحر اور جھاگ سے آگ بنی اور پھر پانی اور آگ کے ابخرات اور دھوؤں سے آسمان بنا اور ان ارضیات میں جو اشتعال واقع ہوا اس سے ستارے آفتاب و ماہتاب بنے۔پس اسی لیے یہ آسمان پانی کے گرداگرد حرکتِ دوری کرتا ہے گویا کہ مسبب اپنے سبب اور عاشق اپنے معشوق پر قربان ہوتا ہے شاید مبدع سے مراد مبدء[3] ہے اس تقدیر پر یہ مذہب تورات اور کتبِ الہامیہ سے کسی قدر مطابق ہو جاوے گا اور کچھ عجب نہیں کہ ثالیس نے انبیاء علیہم السلام سے فیض حاصل کیا ہو۔

حکیم انکیماس یہ بھی ملیطی[4] ہے یہ کہتا ہے کہ کل عالم کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے پس یہ جو کچھ موجود ہوا ہے یہ سب اس کے علمِ ازلی

[1] سمیر ہندوؤں کے نزدیک ایک فرضی پہاڑ کا نام ہے جس طرح کہ مانسرور ایک تالاب ہے کہ جس کے ہنس موتی کھاتے ہیں شاید یہ باتیں عالمِ خیال میں ہوں تو ہوں برہمنوں کے تصور میں ورنہ ان کا کہیں پتا نہیں۔۱۲منہ

[2] ابتداءً پیدا کرنے والا۔۱۲منہ [3] یعنی وہ چیز کہ جس کو سب سے اول اللہ تعالیٰ نے بنایا اور پھر اس سے اور چیزیں بنائیں۔۱۲منہ

[4] یعنی ملیطہ کا رہنے والا ہے کہ جس کو مالٹا کہتے ہیں۔یہ ایک جزیرہ ہے ... کو یونان ... سے پہلے بڑا تعلق تھا۔۱۲منہ

میں تھا۔سب سے اول اس نے عنصر کی صورت پھر عقل کی صورت پیدا کی پھر بقدرِ انوار و آثار عنصر نے عقل میں بیشمار دفعہ صورتوں کے رنگ مرتب کر دیے جس طرح کہ صاف آئینہ میں صدہا صورتیں یکبارگی پیدا ہو جاویں مگر ہیولیٰ میں بغیر ترتیب و زمان کے یکبارگی سب صورتیں مرتب نہیں ہو سکتیں۔پس اس لیے ہیولیٰ ایک عالم سے دوسرے عالم میں صورتیں بدل کر نمودار ہوتا گیا یہاں تک کہ جو صورتیں کہ ہیولیٰ میں ہیں ان کے اور خود ہیولیٰ کے انوار کم ہو گئے اور خاص وہ رذیل صورت رہ گئی کہ جو نہ نفسِ روحانیہ نہ نفسِ حیوانیہ نہ نباتیہ قبول کر سکتی ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس عالم کو اس عالم سے وہ نسبت ہے کہ جو چھلکے کو مغز سے یعنی یہ عالم اس عالم کا ظل ہے اور جب تک اس عالم کا نور اس عالم میں باقی ہے تو یہ قائم ہے اور اس سے یہ بھی منقول ہے کہ سب سے پیشتر جو اس عالم میں پیدا ہوا وہ ہوا ہے پھر جس قدر اجرامِ علویہ اور سفلیہ ہیں سب اسی سے ہوئے ہیں پس جو چیز لطیف ہوا سے پیدا ہوئی ہے وہ روحانی اور لطیف ہے نہ وہ بگڑے گی نہ اس میں کچھ خرابی ظہور کرے گی اور جو کثیف ہوا سے پیدا ہوئی ہے وہ کثیف اور جسمانی ہے یہ ایک روز خراب ہوگی۔یہ حکیم ثالیس کے مذہب پر ہے۔شاید اس نے موجوداتِ جسمانی میں ہوا کو سب سے اول مانا جس طرح کہ موجوداتِ روحانی میں عنصر کو مبدءِ اول قرار دیا جس طرح کہ ثالیس نے پانی کو مبدءِ اول مانا تھا اور یہ عنصر کو بمنزلۂ قلم کے اور عقل کو بمنزلۂ لوح کے قرار دیتا ہے کہ جو ہر طرح کی صورتیں قبول کرتی ہے حکیم امبذقلس یہ حضرت لقمان حکیم کے شاگرد ہیں ان سے حکمت حاصل کر کے یونان میں آئے۔یہ کہتے ہیں کہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے۔اس نے سب سے پیشتر ایک بسیط چیز کو یعنی عنصر کو پیدا کیا۔یہ عنصر جو معلولِ اول ہے بالکل بسیط نہیں کس لیے کہ ہر معلول عقلاً یا حسناً مرکب ہوتا ہے پس عنصر بھی فی ذاتہٖ محبت اور غلبہ سے مرکب ہے پھر ان دونوں سے سب چیزیں پیدا ہوئیں ہیں اس طرح پر کہ تمام روحانیات پر محبتِ خالصہ منطبق ہے اور جسمانیات پر غلبہ اور جو دونوں سے مرکب ہے اس میں یہ دونوں ہیں اور یہ باری تعالیٰ کے لیے ایک قسم کی حرکت و سکون بھی ثابت کرتا ہے۔یہ مذہب فیثاغورس سے لے کر افلاطون تک حکماء میں مسلم رہا اور سب قدماء عالم کو حادث کہتے رہے مگر افلاطون کے شاگرد ارسطاطالیس کا جب زمانہ آیا تو وہ جو کچھ ریاضات اور مکاشفات تھے ان میں فرق آ گیا۔پھر تو صرف تخمینی باتوں اور خیالی مقدمات سے مرکب دلیلوں پر حکمت کا دارومدار رہ گیا اس لیے اس گروہ کو مشائین کہنے لگے اور چونکہ یہ ارسطو سکندر رومی کا وزیر تھا کہ جس نے ایران کو فتح کر کے ایشیائی ملکوں میں بھی اپنا نام پیدا کیا تھا اس لیے ارسطو کے مذہب کی زیادہ شہرت ہوئی۔ اب میں قبل اس کے کہ ارسطو اور اس کے متبعین متاخرین کا مذہبِ اسباب بیان کروں وہ چار مقدمات گوش گزار کرتا ہوں کہ جن پر اس مذہب کی بنیاد ہے۔

(۱) یہ کہ ایک شخص سے (کہ جو من کل الوجہ واحد ہو جیسا کہ باری تعالیٰ) دو چیز صادر نہیں ہو سکتیں کیونکہ اگر دو صادر ہوں تو اس میں دو جہت ثابت ہو جاویں اور ترکیب لازم آوے۔ (۲) یہ کہ ستاروں کی مختلف حرکات سے نو آسمان ثابت ہوتے ہیں۔ (۳) یہ کہ ان آسمانوں کی حرکتِ دوری قدیم ہے اور ان کے محرک نفوسِ فلکیہ ہیں کہ جن کو عقل و شعور ہے۔ (۴) جو چیز حادث ہے یعنی جو معدوم ہو کر موجود ہو ضرور ہے پہلے سے اس کے لیے مادہ ہو ورنہ اس شے کی جو صفتِ امکان ہے کس کے ساتھ قائم ہو گی؟ جب یہ مقدمات اپنے خیال میں ان لوگوں نے مضبوط کر لیے تو کہنے لگے کہ عالم قدیم ہے یعنی یہ آسمان و زمین اور کل بسائط سب ہمیشہ سے ہیں ہاں یہ مرکبات حادث ہیں جیسا کہ حیوانات، نباتات، جمادات اور یہی فانی بھی ہیں کہ یہ ترکیب منحل ہو جاتی ہے۔ہر عنصر اپنے اپنے حیزِ اصلی میں آملتا ہے اور کل عالم کا بانی خدائے تعالیٰ ہے جب سے وہ ہے تب ہی سے یہ عالم بھی ہے عالم کو حادثِ ذاتی کہہ سکتے ہیں اور اس کا صدور اس سے یوں ہوا ہے کہ سب سے اول اس نے عقلِ اول[1] کو پیدا کیا۔کس لیے کہ وہ بسیط ہے، دو یا کئی چیزیں پیدا نہیں کر سکتا، اب عقلِ اول میں تین اعتبار ہیں۔ایک وجوده فی نفسه، دوسرا وجوده بالغیر تیسرا امکانه لذاته، پس اس نے پہلے اعتبار سے کہ جو اشرف تھا عقل دوم کو پیدا کیا، یہ بھی اشرف ہے اور

[1] عقل ... کہ عقل نہیں کہ جس کو ذہن اور فہم بھی کہتے ہیں بلکہ جو ہر مجرد جیسا کہ ملائکہ جس کو عرفِ شرع میں قلم کہتے ہیں۔حقانی

فائدہ (۵): وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بابت جو لوگ کتاب الٰہی کے مخالف کہتے ہیں وہ جانتے نہیں یوں ہی اٹکل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

اور جب کہ آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں وہ بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص کو خلیفہ کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کیا کرے حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کہتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں (اللہ نے کہا) میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

ترکیب: اذ مفعول بہ ہے اذکر محذوف کا بعض کہتے ہیں مبتداء محذوف کی خبر ہے تقدیرہ وابتداء خلقی اذقال بعض کہتے ہیں زائدہ ہے قال فعل ربك فاعل للملائكة متعلق ہے فعل کے انی جاعل فی الارض خلیفة جملہ مقولہ ہے قول کا یعنی مفعول قال کا جاعل مستقبل کے معنی میں ہے اسی لیے عمل کرتا ہے ممکن ہے کہ بمعنی خالق ہو تو ایک مفعول چاہے گا جو خلیفہ ہے اور ممکن ہے کہ بمعنی مصیر ہو تو اس تقدیر پر فی الارض مفعول ثانی ہوگا قالوا فعل ضمیر فاعل اہمزہ استفہام ارشاد کے لیے تجعل فعل انت فاعل من یفسد و یسفك الدما سب اس کا مفعول پھر یہ تمام جملہ مفعول ہوا قالوا کا ونحن نسبح الخ جملہ اسمیہ حال ہے فاعل تجعل سے یہ حال جہت اشکال کو ثابت کرنے کے لیے ہے قال فعل بافاعل انی اعلم الخ جملہ اس کا مفعول۔ اعلم فعل مضارع ما موصولہ لَا تَعْلَمُونَ صلہ اصلہ لاتعلمونہ ضمیر محذوف بعض نے کہا ہے کہ اعلم اسم ہے مثل افضل کے پھر ماموضع جر میں ہے بسبب اضافت کے۔ (تبیان فی اعراب القرآن)

تفسیر: یہ تیسری نعمت خدا تعالیٰ یاد دلاتا ہے۔ پیشتر کہا تھا کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا اور اس نے تمہارے لیے زمین و آسمان کو اور ان کی سب چیزوں کو بنایا ہے اور اس نے تمہارے دادا ابو البشر آدم علیہ السلام کو وہ عزت و حرمت بخشی کہ فرشتوں کو ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی خبر کر دی تھی کہ ہم زمین پر اپنا نائب یعنی آدم پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے اور اس کی اولاد انبیاء علیہم السلام کی معرفت ہم اپنے احکام جاری کریں گے جب ملائکہ نے یہ سنا تو معلوم ہوا کہ آدم خدا کا بڑا برگزیدہ ہوگا دو وجہ سے ایک یہ کہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کی منادی کی گئی۔ دوم یہ کہ وہ خدا کا نائب ہو کر زمین پر حکومت کرے گا مگر اس کے ساتھ جب ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ (اس کا خمیر اور مادہ ایسے اجسام مختلف الطبائع سے ہوگا کہ جن کو قوت شہویہ اور غضبیہ لازم ہے کہ جس سے خواہ مخواہ زنا وغیرہ فساد ظہور میں آتا ہے) تو بڑا تعجب ہوا کہ جس میں دو بری قوتیں اور ایک قوت عقلیہ عمدہ ہو اس کا تو پیدا کرنا بھی مقتضی حکمت نہیں چہ جائیکہ اس کو خلیفہ بنایا جاوے۔ پس اس لیے (نہ اعتراض و مباحثہ اور حسد کے طور پر بلکہ) نہایت عجز و انکسار سے یہ سوال کیا کہ الٰہی جب اس کا یہ حال ہے تو پھر اس کو خلیفہ بنانا اس میں کیا حکمت ہے؟ رہی تیری تسبیح و تقدیس سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ سبوح قدوس کہنا اس کے لیے ہم ملائکہ موجود ہیں جن میں قوت غضبیہ و شہویہ کا مادہ ہی نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے مجملاً یہ جواب دیا کہ اس میں جو کچھ حکمت ہے وہ تم کو معلوم نہیں کہ ان دونوں قوتوں اعنی غضبیہ اور شہویہ کو ترکیب دے کر جب مہذب کر لیا جاتا ہے تو ان سے انصاف اور شجاعت اور عفت اور مجاہدۂ نفس وغیرہ صفات حمیدہ پیدا ہوتی ہیں اور جو کچھ ان کے باہم مرکب ہونے سے عمدگیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تنہا ایک صفت سے پیدا نہیں ہوتیں جیسا کہ جزئیات امور کا احاطہ اور طرح طرح کی صنعتوں کا ایجاد کرنا اور منافع کائنات کو قوت کے مرتبہ سے فعلیت کی طرف لانا حالانکہ خلافت سے یہی باتیں مقصود ہوتی ہیں، سو یہ باتیں آدم میں

ودیعت رکھی گئی ہیں فرشتوں میں نہیں، اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کی فضیلت علم دکھا کر ان کو سجدہ کا حکم دیا اور فرشتے اپنے سوال پر نادم ہو کر سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا کہنے لگے۔ پس تم ایسے محسن خدا کی کیونکر نافرمانی کرتے ہو اور اس کے احکام اور اس کے اخیر نبی ﷺ سے کس طرح سرتابی کرتے ہو۔

متعلقات: اِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔ پیشتر مقدمہ کتاب میں ملائکہ کی تحقیق ہو چکی ہے اور جو کچھ نافہم لوگوں نے اس سوال کو مباحثہ اور اعتراض خیال کر کے ملحدوں کی تقلید میں آ کر زبان درازی کی اور پھر نہایت ضعیف تاویل کر کے کلام الٰہی کو بگاڑا ہے۔ سب کا مفصل جواب وہاں دیکھو خلیفہ فعیل کے وزن پر ہے اس لیے اس کی جمع خلفاء آتی ہے مگر مبالغہ کے لیے ت کو زیادہ کر دیا۔ اس کے معنی نائب کے ہیں کہ جو پیچھے کام کرے یہ خلف سے مشتق ہے۔ اگرچہ خدا تعالیٰ ہر وقت موجود ہے اس کو خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں مگر بندوں کو واسطے کی ضرورت ہے۔

یسفك: کے معنی بہانے کے ہیں سفک اور سبک اور سفح اور شن قریب المعنی ہیں صرف فرق یہ ہے کہ سفک آنسو اور خون بہانے میں مستعمل ہوتا ہے اور سبک سونا چاندی وغیرہ پگھلانے میں اور سفح اونچے سے پانی وغیرہ ڈالنے میں اور شن مشکیزہ وغیرہ کے منہ سے پانی گرانے میں، اور شن آہستہ آہستہ پانی ڈالنے میں مستعمل ہوتا ہے۔

تسبیح: خدا تعالیٰ کی جمیع عیوب سے پاکی بیان کرنا اور اسی طرح تقدیس خواہ زبان سے ہو خواہ دل سے ہو، خواہ دلالت حال سے بیان کی جائے، اس میں تمام مخلوقات شریک ہے۔ ہر چیز بزبان حال اپنے صانع کی خوبیوں اور پاکیزگیوں کو بیان کر رہی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ کہ ہر چیز خدا کی تسبیح کر رہی ہے۔

نکتہ: ملائکہ کو یہ معلوم تھا کہ انسان میں ضرور دو قوت ہوں گی شہویہ کہ جس کا مقتضاء زنا کاری وغیرہ فساد ہے جس کو یفسد کے ساتھ تعبیر کیا۔ دوسری غضبیہ جس کا مقتضاء قتل و ضرب ہے جس کو یسفك الدماء کے ساتھ تعبیر کیا اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہم میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔ پس بارگاہ کبریا میں ادب کے مارے یہ تو نہ کہہ سکے کہ ہم یہ دونوں کام نہیں کرتے ہیں مگر ان کے مقابلہ میں دو اور باتیں خدائے تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرنے والی کہیں اور ان سے اشارۃً ان عیبوں کی بھی نفی کر دی اس لیے نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کو يُفْسِدُ فِيهَا کے مقابلے میں اور نُقَدِّسُ لَكَ کو يَسْفِكُ الدِّمَاءَ کے مقابلہ میں ذکر کیا۔ ولطفہ لایخفی۔ اب آدم کی عظمت کو خدا ابتلاتا ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣١﴾

اور (خدا) نے آدم کو سب نام سکھائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر کے (یہ) کہا کہ مجھ کو ان چیزوں کے نام بتلاؤ اگر تم سچے ہو؟

ترکیب: علم فعل ضمیر راجع طرف اللہ کے فاعل۔ آدم مفعول اول الاسماء کلھا تاکید اور مؤکد مفعول ثانی یہ جملہ مستانفہ ہوا۔ عرض فعل بافاعل ھم ضمیر راجع طرف مسمیات کے کہ جو ضمناً سمجھی جاتی ہے، اس لیے کہ تقدیر کلام یہ ہے اسماء المسمیات مضاف الیہ کو حذف کر دیا۔ اس لیے کہ مضاف دلالت کر رہا ہے۔ علی الملائکۃ جار مجرور متعلق عرض کے ہوا اور قال فعل ضمیر راجع طرف اللہ کے وہ فاعل انبئونی الخ جملہ مقولہ ہے۔ ان کنتم صادقین جملہ شرطیہ اور انبئونی دال بر جزاء۔

تفسیر : کیفیتِ پیدائشِ آدم علیہ السلام : پس خدائے تعالیٰ نے حسبِ تجویز حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اس پیدا ہونے کی کیفیت احادیث میں یوں مرقوم ہے کہ خدا نے فرشتہ کو حکم دیا کہ زمین سے تھوڑی تھوڑی ہر جگہ کی مٹی لے کر اس کا خمیر کرے اور ایک پتلا بنادے۔ چنانچہ فرشتے نے حسب الحکم مکہ اور طائف کے بیچ میں بمقام لغمان اسی طرح پتلا بنایا اور خدا نے اپنے یدِ قدرت سے اس کی صورت ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ بنائی اور چند مدت تک اس خاک کے پتلے کو اسی حالت میں رکھا اور وہ فرشتے بھی اس عجیب وغریب کو دیکھ کر حیران ہوتے اور تعجب کرتے تھے کہ جانے اس میں کیا سر ہے جو یہ خلیفہ بنایا جائے گا اور ابلیس اس کو دیکھ کر دل میں یہ کہتا تھا کہ جانے یہ کیا سر ہے؟ مگر جب قلب کو دیکھا تو حیران رہ گیا کہ عجب نہیں کہ اس میں کوئی لطیفہ ربانی رکھا جائے۔ پس جب روح اس تنگ وتاریک پتلہ خاکی میں بحکمِ الٰہی آئی اور اسی وقت آدم کو چھینک آئی تو الہامِ الٰہی سے الحمد للہ کہا اور خدا کی طرف سے یرحمک اللہ کا جواب عطا ہوا۔ پھر آدم کو حکم ہوا کہ تو جماعت فرشتوں کے پاس جا کر السلام علیکم کہہ، جو کچھ وہ جواب دیں گے وہی تیرے لیے اور تیری اولاد کے لیے تحیہ مقرر ہوگا۔ انتہی۔ جب آدم پیدا ہوئے اور فرشتوں نے ہر چند آدم کی چھینک پر الحمد للہ کہنے اور جماعت ملائکہ کو السلام علیکم کہنے سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ یہ کوئی ہونہار ہے۔ ہر چند ہنوز اس کے استحقاقِ خلافت کی کوئی فضیلتِ خاص معلوم نہ ہوئی تھی۔ اس لیے خدائے تعالیٰ نے آدم کے دل میں یہ القا کر دیا کہ فلاں شے کا یہ نام ہے، فلاں کا یہ۔ یعنی آدم کی سرشت میں وہ اجزائے مختلفہ اور قوائے متبائنہ رکھے کہ جس نے اس کو طرح طرح کے معقولات اور محسوسات ومتخیلات ومتوہمات اور حقائقِ اشیاء اور ان کے خواص اور نام اور اصولِ علم وقوانینِ صفت اور ان کے آلات کی کیفیت کا علم معلوم ہوسکے۔ پھر جب آدم کو فضیلتِ علم حاصل ہوگئی کہ جو تمام صفاتِ کمالیہ کا سرتاج ہے اور جس پر مدارِ خلافت ونیابت ہے کس لیے کہ خلیفہ جب تک اشیاء کو نہ جانے گا تو حکم نہ کر سکے گا۔ تب خدا نے ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر کے دربارِ عام میں یہ پوچھا کہ مجھ کو ان چیزوں کے نام تو بتاؤ اگر اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم ہی تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں (اور تسبیح وتقدیس کو علمِ اشیاء لازم ہے) لیکن چونکہ فرشتوں میں وہ مادہ موجود نہ تھا کہ جس کی وجہ سے حقائقِ اشیاء اور ان کے جزئیاتِ امور کا علم حاصل ہو اس لیے نہ بتلا سکے پھر خدا نے آدم سے کہا کہ تو ان کو بتلا دے۔ آدم نے بتلا دیا تو تمام ملائکہ اس کی فضیلتِ علم کے قائل ہوگئے اور اپنے قصورِ فہم اور نقصانِ علم کے قائل ہو کر سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا کہنے لگے۔ جب آدم کی یہ فضیلت ثابت ہو چکی تو خدا نے آدم کو اپنی نیابت عطا فرمائی اور سب کو اس تخت نشینی سے مطلع کر کے سجود وتعظیم کی نذر ونیاز کا حکم دیا۔ سب فرشتے حکمِ الٰہی بجالائے اور سب نے آدم کو سجدہ کیا، مگر ابلیس کو کہ دراصل جن تھا فرشتوں میں عبادت وریاضت کی وجہ سے جاملا تھا، حسد ہوا اور آدم کی فضیلت کا مقر نہ ہوا اور کہا یہ خاک سے بنا ہے تو میں آگ سے بنا ہوں میں اس سے بہتر ہوں، مجھ پر اس کو کیا فضیلت ہے؟ آخر الامر سجدہ نہ کیا اور اس عتاب میں دربارِ خدائی سے نکالا گیا اور پھر آدم کی خوشیِ خاطر کے لیے ایک عورت حوا خدا نے پیدا کی اور دونوں کو جنت میں رہنے کا حکم دیا اور ایک درخت کے کھانے سے کسی حکمت کی وجہ سے منع کر دیا تھا۔ شیطان وہاں سانپ کی صورت میں ہو کر پہنچا اور حضرت حوا کو بہکا کر اس درخت کے کھانے پر آمادہ کیا اور حوا کے کہنے سے حضرت آدم علیہ السلام نے بھی کھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں سے نکالے اور دنیا میں ڈالے گئے اور سب طرح کی تکلیفات اٹھا کر حضرت آدم نے اپنی زندگی تمام کی اور ان کی نسل دنیا پر پھیلی۔ پھر ہمیشہ سے بدلوگوں کے سمجھانے کے لیے خدا کی طرف سے برگزیدہ لوگ کہ جن کو انبیاء علیہم السلام بھی کہتے ہیں، آتے اور سمجھاتے رہے۔ یہ مختصراً حضرت آدم علیہ السلام کی سرگزشت ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ نے اگلی آیات اور دیگر مقامات میں نئے نئے عنوانات سے بیان فرمایا ہے اور تورات میں بھی اسی طرح سے ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواری بھی بلکہ جمیع انبیاء یوں ہی سمجھتے آئے ہیں گو عنوان اور طرزِ بیان میں کچھ فرق ہے مگر بعض دہریوں نے اس کا انکار اور آیات کی تاویل کی ہے۔

سوال : عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے تمام محققین نے یہ مراد لی ہے کہ اسماء سے مراد نام نہیں بلکہ اشیاء کے حقیقت اور خواص واوصاف

ہیں کیونکہ نام پوچھنے میں کیا آدم کی فوقیت ثابت ہوتی ہے، اس تقدیر پر یہ بحث کرنا (کہ لغات کا واضع خدا ہے یا کون وغیر ذالک من الابحاث) بے فائدہ ہے اور تعلیم کے معنی بھی الہام اور القاء کے ہیں مگر کلھا سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چیز کی حقیقت خدا نے آدم کو بتلا دی تھی اور پھر ہر چیز کا فرشتوں کے روبرو لا کر سوال کرنا بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب : مراد یہ ہے کہ آدم میں ہر چیز کے جاننے کا مادہ اور قابلیت پیدا کر دی تھی کہ جب توجہ کرے جان سکے اور پھر کل اشیاء کو اسی حیثیت سے پیش کیا تھا اور اسی حیثیت سے عرضھم میں ھم کی ضمیر ان کی طرف پھرتی ہے۔

سوال : ضمیر ھم مذکر کی طرف اور ذی عقل کی طرف پھرتی ہے اور اشیاء کی طرف ضمیر ہا پھرانی چاہیے تھی۔ عرضہا کہنا چاہیے تھا۔

جواب: چونکہ اشیاء میں عقلا بھی تھے، اس لیے بقاعدۂ تغلیب یہ ضمیر لائی گئی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

(فرشتوں نے) کہا تو پاک ہے ہم تو اسی قدر جانتے ہیں کہ جس قدر تو نے ہم کو بتلایا ہے بے شک تو ہی بڑا جاننے والا حکمت والا ہے۔ تب (خدا نے) فرمایا اے آدم (فرشتوں) کو ان چیزوں کے نام تم بتا دو پھر جب آدم نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیے تو (خدا نے) فرمایا کہ میں نے تم سے نہ کہہ دیا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور پوشیدہ رکھتے ہو اس کو بھی جانتا ہوں۔

ترکیب : قالوا فعل ضمیر راجع ملائکہ کی طرف اس کا فاعل سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا الخ تمام جملہ مفعول بہ سبحان اسم ہے مصدر کی جگہ واقع ہوا ہے اور کبھی اس سے سبحت مشتق کیا جاتا ہے اور یہ اکثر مضاف ہو کر مستعمل ہوتا ہے اور منسوب ہوتا ہے سبحت اللہ تسبیحاً جیسے کہ معاذ اللہ اور جب یہ اضافت سے مجرد ہوتا ہے تو علم تسبیح ہو کر عثمان کی طرح تعریف اور الف اور نون کی وجہ سے غیر منصرف ہوتا ہے۔ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ما مصدریہ ہے۔ ای الاعلما علمتنا اور یہ موضع لا سے بدل ہو کر مرفوع المحل ہے۔ جیسا کہ لا الٰہ الا اللہ مبتداء العلیم اس کی خبر الحکیم خبر ثانی۔ یہ سب جملہ خبر ان ہوا اور ممکن ہے کہ انت تاکید ہو کاف انک کی۔ باقی ترکیب واضح ہے۔

تفسیر : تفسیر بھی اس کلام کی واضح ہے لیکن اس سب کلام کی تقدیر یوں ہے جب فرشتے نہ بتا سکے تو معذرت کرنے لگے پھر خدا نے آدم سے فرمایا تو اس نے بتلا دیا جب فرشتوں کا بخوبی عجز ثابت ہوگیا تو خدائے تعالیٰ نے ان کے متنبہ کرنے کو فرمایا کہ تم اپنے دل میں کہتے تھے میں تو ہر چیز کی حکمت اور مصلحت اور ہر آسمان وزمین کی پوشیدہ بات جانتا ہوں اور تمہارے دلوں کے مطالب اور ظاہر حال سے بھی واقف ہوں اور اب اس آیت میں اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی خوب تشریح ہوگئی یعنی تمہارا استعجاب بیجا تھا میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں حکمتیں ہوتی ہیں۔

فوائد : اس آیت سے چند باتیں مستفاد ہوئیں: (۱) یہ کہ علم کو جمیع صفات پر فوقیت ہے یہاں تک کہ ملائکہ تسبیح وتقدیس میں ہمہ تن مصروف تھے اور آدم میں گناہ کا بھی مادہ رکھا تھا مگر علم کی وجہ سے خلافت کا مستحق اور فرشتوں کا استاذ ہوگیا۔ قرآن اور احادیث اور کلام حکماء میں جس قدر علم کے فضائل ہیں ان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ (۲) یہ کہ حکمت علم سے زائد چیز ہے ورنہ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ میں یہ لفظ نہ لایا جاتا۔ اس لیے حکمت کی تعریف اور اقسام کو علم سے غیر طور پر بیان کیا گیا ہے مگر حکمتِ الٰہی کے یہ معنی ہیں کہ خدائے تعالیٰ اس

کرے کہ جس میں بالفعل اور آیندہ بندوں کی بھلائی ہو۔

واضح ہو کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا حقِ خلافت اور استاذ ہونا ثابت ہو گیا تو خدائے تعالیٰ نے ملائکہ کو اس کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا اور آدم اور اس کی اولاد پر احسان کیا اس بات کا آیندہ آیت میں ذکر کرتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۞۳۴

اور جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ تھا بھی کافروں میں کا

ترکیب: واؤ حرفِ عطف۔ اگر اس کو اذکر مضمر سے نصب دیا جائے گا تو ظرف کا ظرف پر عطف ہوگا اور اگر قالوا یا انقادوا کے ساتھ متعلق کیا جاوے گا تو جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا بلکہ ایک پورے قصہ کا دوسرے پورے قصہ پر۔ قلنا فعل بافاعل للملئکة متعلق ہے فعل سے اسجدوا الخ یہ تمام جملہ ماول ہو کر مقولہ ہوا قلنا کا۔ جو لوگ ابلیس[1] کو ملائکہ ارضیہ میں سے کہتے ہیں اور عصمت سب فرشتوں کے لیے شرط نہیں کرتے بلکہ علوی اور آسمانوں کے لیے تو وہ الا کا استثناء ملائکہ سے متصل جانتے ہیں اور جو اس کو غیر ملائکہ از قسم جن بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنی آدم سے پیشتر دنیا پر جنوں کا تسلط تھا پھر جب انہوں نے زمین کو گناہوں سے ناپاک کر دیا تو خدا نے ان کی شوکت کو توڑ دیا اکثر ملائکہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور جو کچھ بچ گئے غاروں اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے۔ منجملہ ان کے ابلیس تھا۔ یہ تائب اور گریاں ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوا۔ ملائکہ ارضیہ میں مل گیا، مگر خلافت کا امیدوار رہا۔ پھر جب آدم کو خلیفہ بنایا تو اس کو از حد حسد آیا، ملائکہ کے ساتھ اس کو بھی سجدہ کا حکم ہوا، اس نے تکبرانہ انکار کیا، اس لیے وہ غیر متصل کہتے ہیں۔ اول حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے دوسرا حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا۔

تفسیر: یہ چوتھی نعمت ہے تمام بنی آدم پر کہ ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو یہاں تک عزت دی کہ ملائکہ کو (بعض کہتے ہیں کہ زمین کے ملائکہ کو بعض کہتے ہیں سب کو) سجدہ کا حکم دیا سب نے تعمیل کی مگر ابلیس نے کہ جس کو شیطان کہتے ہیں تکبر سے حکم عدولی کی اور دراصل وہ علمِ الٰہی میں کافروں میں شمار تھا۔

سجدہ: لغت میں سر جھکا کر عاجزی اور فرمانبرداری ظاہر کرتا ہے۔ کوئی شاعر عرب کہتا ہے ؎

بجمع تضل البلق فی حجراته   تری الاکم فیه سجدا للحوافر

ابو منکلف شاعر بنی عامر سے کہتا ہے کہ مجھ کو جب تم جانو گے کہ میں لشکرِ عظیم لے کر تم پر حملہ آور ہوں گا کہ جس کے اطراف میں ابلق گھوڑوں کا پتا نہ لگے اور جس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے آگے ٹیلے سجدہ کریں گے یعنی جھکیں گے۔ وقال ؎

فقد ن لها وهما ابیا خطا مه   وقلن له اسجد لیلی فاسجد

[1] کیونکہ ممکن ہے کہ جن کا مادہ شعلۂ آتش ہے ان میں دو قسم کے لوگ ہیں نیک جو وہ بھی ایک قسم کے ملائکہ ارضیہ اور بد وہ شیاطین ہوں۔ پس اس اعتبار سے ابلیس کو فرشتوں میں بھی شمار کر سکتے ہیں اور شیطان بھی کہتے ہیں ہاں ان فرشتوں میں شمار نہ ہوگا کہ جو اعلیٰ نوع کے ہیں اور اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ کہ ابلیس جن تھا حکمِ الٰہی سے نافرمان ہو گیا۔ ملائکہ کے لیے جو عصمت شرط ہے تو اعلیٰ قسم کے لیے ہے۔ کذا فی تفسیر البیضاوی ۔۱۲ منہ

عورتیں ایک سخت منہ زور اونٹ کو لیلیٰ کے پاس کھینچ کر لائیں اور کہا کہ لیلی کو سجدہ کر۔ یعنی اس کے آگے جھک جا تو اس نے گردن جھکا دی۔ الغرض سجدہ کے معنی لغت میں جھکنا ہے اور شرع نے اس کو خاص کر لیا اور اس کے معنی زمین پر پیشانی رکھنا قرار دیا۔ اس میں نہایت درجہ کی تعظیم ہے، اس لیے شریعت نے اس کو غیر اللہ کے لیے حرام کر دیا۔ احادیثِ صحیحہ اس میں بکثرت ہیں وقال وَلَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ '' کہ نہ آفتاب کو نہ ماہتاب کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا اس کو سجدہ کرو'' اور انجیل متی کے چوتھے باب میں یہ ہے کہ شیطان نے مسیح سے کہا کہ تو مجھے سجدہ کرے تو تجھے سب کچھ دوں (۱۰) تب مسیح نے اسے کہا کہ اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کے لیے بندگی کر۔ انتہی۔

اس تقدیر پر خدا نے فرشتوں کو ایسا حکم کہ جو اس کی ذاتِ مقدسہ کے لیے مخصوص ہے دوسرے کے لیے کیوں دیا، جواب یہ ہے کہ سجدہ سے مراد لغوی معنی ہیں یعنی جھکنا اور تعظیم کرنا سو یہ حکم مختص بعبودیت نہیں بلکہ چھوٹا بڑے کے آگے اور شاگرد استاد کے آگے تعظیم وتکریم سے پیش آتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اور باپ بھی اسی طرح اس سے پیش آئے تھے وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا اور جو سجدے کے شرعی معنی مراد رکھے جاویں تو آدم مسجودِ حقیقی نہ تھے بلکہ آدم اس جہت سے (کہ تمام خدائی کا مجموعہ اور اسرارِ خدائی کا نمونہ اور اس کے جمال باکمال کا آئینہ تھے قبلۂ سجود تھے) یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منہ کر کے خدا کو سجدہ کرو اسجدوا لآدم میں لام بمعنی اِلیٰ ہے۔ یعنی لام کے معنی واسطے کے نہیں بلکہ طرف کے ہیں جیسا کہ اس شعر میں ؎

الیس اول من صلی لقبلتکم   و اعرف الناس بالقرآن والسنن

الاباء: باختیارِ خود کسی چیز سے انکار کرنا۔ **تکبر:** اپنے آپ کو غیر سے بڑا سمجھنا۔ **استکبار:** کسی امر کو بتزیین اختیار کرنا۔

واضح ہو کہ جس طرح بعض دہریوں نے زمانۂ قدیم میں وجودِ شیطان اور اس کے انکارِ سجود اور آدم کے مبدعِ نوعِ انسانی ہونے کا انکار کیا ہے اور بخوفِ مناظرہ اہلِ اسلام اور اہلِ کتاب آیاتِ قرآنیہ وعباراتِ عہدِ عتیق و جدید کی تاویل بھی کی ہے۔ جیسا کہ ملل ونحل اور دبستان المذاہب میں اس کا بیان ہے۔ اسی طرح ان کے مقلدین نے بھی بذریعہ تفسیر آج کل یہ کام کر کے اپنے زعمِ فاسد میں بڑی لیاقت حاصل کی ہے، مگر اس ہذیان کا جواب مقدمۂ کتاب میں تفصیلاً مذکور ہے وہاں ملاحظہ کر لو۔ زیادہ تر قابلِ تعجب یہ بات ہے کہ بعض پادریوں نے بھی اپنے یوروپی الحاد کے خمار میں اس قصۂ آدم پر اعتراض کیا ہے لیکن اس کا جواب بھی مقدمہ میں مذکور ہے۔ یہاں سے چند باتیں مستفاد ہوئیں: (۱) یہ کہ حسد سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے جس نے شیطان کا ستیاناس کیا۔ (۲) یہ کہ خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ شیطان چونکہ اس کی رضا پر راضی نہ ہوا اس کی کہاں تک نوبت پہنچی۔ (۳) اپنے علم وعبادت وریاضت پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ انجام کا اعتبار ہے دیکھئے شیطان کا کیا انجام ہوا۔ (۴) خدا تعالیٰ کے روبرو گستاخی کرنا سخت گناہ ہے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرتا ہے تاکہ ناظرین کو عبرت ہو اور خدا کی کسی نعمت پر مغرور ہو کر نافرمانی نہ کریں اور اگر بشریت سے کچھ خطا ہو جائے تو اپنے باپ آدم کی طرح اس پر ہمیشہ تاسف اور ندامت اور توبہ واستغفار کیا کریں تاکہ وہ غفور رحیم اپنی صفتِ مغفرت کو ظاہر کرے نہ کہ اپنے بزرگوں کے قدیم دشمن ابلیس کی پیروی کر کے اس پر اصرار کرے اور اسی طرح اس پر جما رہے ورنہ اس کی درگاہ سے راندہ ہو جائے گا اور پھر کہیں ٹھکانا نہ پاوے گا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا

تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا
مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

اور ہم نے کہا، اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں جابسو اور وہاں دل بھر کر جہاں سے چاہو کھاؤ (پیو) اور اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا، ورنہ براخمیازہ بھگتو گے۔ پھر شیطان نے ان کو وہاں سے ڈگمگا دیا پھر جس عیش میں وہ تھے ان سے نکلوا کر رہا اور ہم نے حکم دیا تھا کہ تم نیچے اترو کہ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہے اور تمہارا ایک وقت تک زمین پر ٹھکانا اور سامان ہے۔

ترکیب: واؤ حرف عطف کہ عطف جملہ کا پہلے جملہ پر ہے۔ قلنا فعل ضمیر فاعل یا حرف ندا آدم منادی اسکن فعل ضمیر مستتر اس کی فاعل انت اس کی تاکید تاکہ ضمیر مستتر پر عطف صحیح ہو جاوے و حرف عطف زوجك معطوف بر انت الجنۃ مفعول یہ تمام جملہ معطوف علیہ و کلا الخ جملہ معطوف رغداً صفت ہے مصدر محذوف کی ای اکلا رغدا ای طیباً ہنیئاً حیث ظرف مکان اور عامل اس میں کلا ہے اور ممکن ہے کہ جنت سے بدل ہو کر مفعول بہ ہو جاوے ولا تقربا فعل نہی انتما ضمیر اس کا فاعل ھذہ موصوف الشجرۃ اس کی صفت یہ دونوں مفعول بہ ہیں یعنی منہی عنہما فتکونا جواب نہی ہے اسی لیے نون حالت جری میں گر پڑا۔ تقدیرہ ان تقربا تکون۔

فازل مشدد زلت بمعنی لغزش اور بعض نے اس کو ازال زوال سے لیا ہے جس کے معنی اکھیڑ دینا ہے۔ یہ فعل ھما مفعول بہ الشیطن فاعل عنہا ای عن الجنۃ متعلق ہے۔ ازل سے فاخرجھما جملہ معطوفہ مما میں ما بمعنی الذی ای من نعیم اھبطوا فعل ہبوط بمعنی نزول سے یعنی اترنا۔ انتم اس کا فاعل جس سے مراد آدم و حوا اور شیطان یا آدم اور اس کی ذریت جو اس کی پشت میں تھی بعضکم لبعض عدو جملہ موضع حال میں ہے واؤ اھبطوا سے اور اسی طرح و لکم فی الارض مستقر الخ جملہ بھی اسی سے حال ہے اور ممکن ہے کہ جملہ مستانفہ ہو۔ مستقر مصدر میمی اور ظرف دونوں ہو سکتا ہے۔ حین کے معنی وقت یعنی وقتِ موت تک تمہارا زمین پر قرار ہے۔

تفسیر: یعنی جبکہ آدم کے سر پر دستارِ خلافت بندھ چکی اور ملائکہ نے نذرانۂ سجود پیش کر دیا تو خدا فرماتا ہے ہم نے آدم اور اس کی بیوی حوا کو یہ حکم دیا کہ تم جنت میں رہا کرو اور وہاں تم پر کوئی روک ٹوک نہیں جہاں سے جو جی چاہے خوب کھاؤ پیو مگر اس درخت (گندم) بعض کہتے ہیں کہ انجیر بعض کہتے ہیں کہ انگور کا درخت تھا، بعض کہتے ہیں کوئی اور قسم کا درخت تھا کہ جس کی تاثیر یہ تھی کہ جو اس کو کھاتا تھا آلودگیِ جسمانی میں مبتلا ہو جاتا تھا (اور اسی مصلحت سے منع کیا تھا) کے پاس بھی نہ جانا چہ جائیکہ کھانا اور جو ایسا کرو گے تو خرابی میں پڑ جاؤ گے (کیونکہ ظلم ایک چیز کو بے موقع رکھنے کا نام ہے اور یہاں غیر پر ظلم کرنا مراد نہیں بلکہ اپنی جان پر اور اسی لیے جو گناہ گار گناہ کرتا ہے اپنی جان پر آفت ڈھاتا ہے کہ اس کا بدنتیجہ دنیا یا آخرت میں آپ ہی پاتا ہے، لیکن اس دشمنِ جانی یعنی شیطان نے وہاں جا کر یہ کہا یٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طہ) وقال مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (اعراف) ''کہ اے آدم میں تجھ کو ایک ایسا درخت بتلاتا ہوں کہ جس کے کھانے سے تو ہمیشہ جیتا رہے اور تجھے ہمیشہ کی سلطنت ملے اور تمہارے رب نے جو اس کے کھانے سے منع کیا ہے تو صرف اس خوف سے کہ تم فرشتہ نہ ہو جاؤ۔ یا ہمیشہ زندہ رہو اور میں قسم کھا کر تم سے کہتا ہوں کہ میں تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں''۔ آخر الامر اس کہنے سے خداوند تعالیٰ کے حکم کو بھول گئے اور فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف) اور دونوں نے اس درخت کو چکھ لیا۔

پھر تو کیا تھا اس کے کھاتے ہی اس کی تاثیر یہ ظاہر ہوئی کہ آدم و حوا برہنہ ہو گئے اور شرم کے مارے درختوں کے پتے چمٹانے لگے اور عتابِ الٰہی شروع ہوا کہ نکلو یہ جگہ اب تمہارے رہنے کے قابل نہیں چلو اترو زمین پر جا کر رہو، وہاں باہمی عداوت کی تکلیف اٹھاؤ اور موت تک وہیں رہو اور اپنی معیشت کے سامان بہم پہنچاؤ، وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (اعراف) ''اور خدا تعالیٰ نے ان کو یہ کہا کہ میں نے تم کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور یہ نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا ظاہر دشمن ہے۔''

متعلقات: اس مقام پر چند امور قابل غور ہیں۔ (۱) یہ کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے کون سی جنت میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ جمہور اہلِ سنت و جماعت کا یہ قول ہے کہ بہشت میں رہنے کا حکم دیا تھا اور وہ بنی آدم کے مخلوق ہونے سے پہلے قائم ہے کیونکہ وہ لطفِ رحمانی کا مظہر ہے اور عالمِ حسی سے الگ ہے اور وہاں اس کے مناسب درخت اور میوے سب کچھ ہیں، نہ یہ درخت و میوے کہ جو جسمانیت و تکدر سے آلودہ ہیں بچند وجوہ۔

(وجہ اول) کہ گو حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کی بنیاد اس عالمِ عنصری سے قائم تھی جیسا کہ احادیثِ صحیحہ و آثارِ قویہ سے ثابت ہے اور نیز یہ کہ وہ مکہ اور طائف کے درمیان میں بنائی گئی ہے اور گو آدم زمین کی خلافت کے لیے مقرر ہوئے تھے مگر انعاماتِ الٰہی اور تقربِ غیر متناہی سے حضرت آدم پر وہ روحانیت غالب آ گئی تھی کہ جس سے ملائکہ بلا تکلف ہر وقت ان کو دکھائی دیتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا کے دربارِ عام میں نہایت عزت و منزلت حاصل کر چکے تھے پس جس طرح بعد مفارقتِ بدن ہر شخص پر اس عالم کا راز کھل جاتا ہے اور وہاں کی چیزیں جنت اور دوزخ عیاناً دکھائی دیتی ہیں اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو اس جسم سے یہ بات نصیب ہو گئی تھی اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اکثر مقربانِ الٰہی پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہے اور شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر تشریف لے جانا اور جنت و دوزخ کی سیر کرنا ایک امر قرینِ فہمِ مستقیم ہے اور بائبل سے بعض بعض اور انبیاء کے ایسے حالات ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت الیاس کا ملائکہ اور روحانیت میں مل جانا ثابت ہے۔ پس قرینِ قیاس ہے کہ حضرت آدم کو عالمِ قدس میں چند روز کے لیے اس لیے لے جا کر رکھا کہ زمین کی خلافت میں ایسا مست و مدہوش نہ ہو جائے کہ ادھر کا خیال نہ آئے اور اس مرکزِ اصلی کو بھول جائے، بلکہ اس عالم میں اس عالم کے شوق میں ہر دم ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا رہے اور وہ اور اس کی ذریت اس عالم کے خیال میں ہر طرح کی نیکی کو عمل میں لاویں۔ دنیا اور اس کے مال و زر کی کچھ وقعت آنکھوں میں نہ رہے اپنے آپ کو مسافر تیز رو جانیں کیونکہ اگر یہ مضمون پیشِ نظر نہیں تو پھر صدہا فساد اور خونریزیاں زمین پر ہوتی ہیں۔ خلافت کا نتیجہ حاصل نہیں ہوتا مگر اس جگہ خدا نے اپنی قدرت سے ایک درخت ایسا پیدا کیا تھا کہ جس کی تاثیر آلودگی تھی اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس عالمِ عجائب کی عجائب تاثیرات میں قضا و قدر میں آدم کا زمین پر آنا اور اس کی اولاد سے زمین کا آباد ہونا لکھا تھا کھا لیا اس کی تاثیر سے نکالے گئے معتوب ہوئے۔

(وجہ دوم) علاوہ احادیثِ صحیحہ و اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خود قرآن مجید کے طرزِ تکلم اور بعض الفاظ سے جو اس مطلب کے بیان میں وارد ہے یہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ ازاں جملہ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ یہ کہہ رہا ہے کہ وہ جگہ زمین کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی جس کی نسبت اِهْبِطُوْا بھی آیا ہے ورنہ اس کے کیا معنی ہیں کہ یہاں سے نکل جاؤ اور زمین پر ایک مدت تک رہو اور گزران کرو، کس لیے کہ اگر وہ جنت میں نہ تھے تو خود وہاں بھی ارض موجود تھی اور بھی وجوہ ہیں۔ معتزلہ اور اسی قسم کے ظاہر پرست یہ کہتے ہیں کہ جنت سے مراد وہ جنت نہیں بلکہ زمین پر ایک باغ تھا پھر اس میں اختلاف ہے کہ کہاں تھا۔ بعض کہتے ہیں کرمان کے متصل اور بعض کہتے ہیں فلسطین میں تھا اور اہلِ کتاب عدن میں کہتے ہیں۔ چنانچہ توراتِ اول میں اس کی تصریح ہے (اگر عدن سے مراد جنت ہے تو ٹھیک ہے اور وہاں سے چاروں دریا نکلنے کی بھی توجیہ ہو سکتی ہے ورنہ وہ عدن کہ جو عرب میں سمندر کے کنارے پر واقع ہے وہاں تو چاروں نہریں کیا بلکہ حاجیوں کو میٹھا پانی

بھی پینے کو نہیں ملتا اور کوئی عدن ہو تو معلوم نہیں) معتزلہ کہتے ہیں کہ خلیفہ جو زمین کے بنے تھے تو ضرور تھا کہ زمین پر رہتے۔ اس کا جواب ہو چکا۔ پھر کہتے ہیں اھبطوا کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہے جیسا کہ اھبطوا مصرًا آیا ہے پس اس باغ سے نکال کر خدا نے اس کو سراندیپ میں ڈال دیا تھا۔

(۲) اکثر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکال کر سراندیپ میں ڈالے گئے کہ جہاں اب تک ان کے آثار و تبرکات پائے جاتے ہیں اور ہزار ہا ہندو اور مسلمان اس پہاڑ کی زیارت کو آتے ہیں۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے انہوں نے یہ گناہ کیوں کیا؟

واضح ہو کہ انبیاء کے عقائد اور تبلیغ اور فتویٰ میں عمداً یا سہواً خطا واقع ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ تمام اہلِ اسلام ان تینوں باتوں میں معصوم ہونے کے مقر ہیں ہاں ان کے افعال و عادات میں کچھ اقوال ہیں۔ چنانچہ شیعہ کہتے ہیں کہ نہ ان سے صغیرہ نہ کبیرہ نہ علیٰ سبیل قصد نہ سہواً نہ تاویلاً سرزد ہوا ہے اکثر معتزلہ کہتے ہیں کہ عمداً کبائر کا سرزد ہونا انبیاء سے ممتنع ہے ہاں صغائر سرزد ہو سکتے ہیں مگر جن میں رذالت ہے جیسا کہ کم تولنا وہ بھی سرزد نہیں ہو سکتے مگر جمہور اہلِ سنت و جماعت کا یہ قول ہے کہ کفر و شرک اور کوئی کبیرہ یا صغیرہ عمداً کسی نبی سے سرزد نہیں ہوا ہاں سہواً اور خطاءً کوئی صغیرہ کہ جس سے شانِ نبوت میں فرق نہ آئے اگر سرزد ہو گیا ہو تو ممکن ہے کہ جس کو زلت یعنی لغزش کہتے ہیں۔ سو ان لغزشوں پر عام مسلمین معاف ہیں مگر چونکہ نبوت کی بڑی شان ہے ان کو اس پر بھی چند در چند مصلحتوں سے عتاب ہوتا ہے جس پر وہ روتے اور ہر دم خدا کی یاد میں سرگرم رہتے ہیں اور یہ بات جس پر عوام سے مؤاخذہ نہ ہو خواص سے ہو کچھ عقلاً و نقلاً بعید الفہم نہیں حسنات الابرار سیئات المقربین مشہور ہے اور دلائل عصمتِ انبیاء کے آیات و احادیث صحیحہ میں کہ جو شرحِ مواقف وغیرہ کتبِ کلامیہ میں مذکور ہیں۔

عصمتِ انبیاء: پس وہ جو انبیاء علیہم السلام کی نسبت اس قسم کی روایات مذکور ہیں کہ جو شرک و کفر اور زنا اور جھوٹ بولنے پر دال ہیں یا اور کبائر پر مشعر ہیں وہ جھوٹی ہیں یا ماؤل۔ حاشا و کلا کبھی انبیاء علیہم السلام کی جناب میں بدگمانی کرنا نہ چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم علیہ السلام نے جو یہ درخت کھایا اور گناہ کیا تو اول تو یہ قبلِ نبوت تھا و لا کلام فیہ دوم یہ کبیرہ نہ تھا۔ محض آدم علیہ السلام کی بھلائی کے لیے خدا نے ارشاد کیا تھا جس کے خلاف انہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ربنا ظلمنا انفسنا فرمایا۔ سوم یہ سہواً سرزد ہوا تھا جیسا کہ آدم علیہ السلام کو بروقت کھانے کے وہ ممانعت یاد نہ رہی تھی[1] پھر جنت سے جو وہ نکالے گئے تھے تو اس درخت کی تاثیر تھی اور یوں بھی تسلیم کیا جاوے تو اس بے احتیاطی اور لغزش کی سزا تھی۔

فائدہ: ازلھما الشیطان یہاں پھسلانے کو جو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے تو مجازاً کیونکہ شیطان اس پھسلنے کا سبب تھا یہ اسناد مجازی ہے۔

ربط: اس کے بعد خدا تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی گریہ وزاری اور توبہ معاف ہونا فرماتا ہے:

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات حاصل کئے تب (خدا نے) آدم کو معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔

ترکیب: تلقی فعل آدم فاعل کلمات مفعول بہ من ربہ کائنۃ کے متعلق ہو کر صفت کلمات کی مگر جب کہ اس کو مقدم کر دیا گیا تو حال کی صورت میں منسوب المحل ہوا۔ فتاب فعل ضمیر ھو راجع رب کی طرف فاعل علیہ متعلق تاب کے ہے۔ انہ ھو ضمیر متصل کی تاکید التواب

[1] کیونکہ خدا خود فرماتا ہے ولم نجد لہ عزما

الرحیم صفت و موصوف خبر۔

تفسیر: جب آدم جنت سے نکالے گئے تو مدت تک زمین پر بحالتِ پریشانی اپنے گناہ پر روتے رہے آخر خدا تعالیٰ کو اپنے بندہ کی آہ وزاری و ندامت پر بیقراری پر رحم آیا۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریانِ اوست — وے ہمایوں دل کہ آں بریانِ اوست
در پے ہر گریہ آخر خندہ ایست — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور یہ کلمات آدم کے دل میں القا کیے گئے۔ رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۔ جب انہوں نے ان کلمات سے دعا کرنی شروع کی تو خدا کو رحم آیا۔ آدم کا گناہ معاف کر دیا کس لیے کہ وہ توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ بعض احادیث میں کچھ اور کلمات اور آدم کی گریہ وزاری کے دیگر حالات بھی مرقوم ہیں۔

متعلقات: التلقی ملنا کسی چیز کا پانا، حاصل کرنا، یہ کلمات آدم کو بطور الہام کے عطا ہوئے تھے۔ عام ہے کہ فرشتے نے آ کر کہے تھے یا دل میں القا ہوا تھا۔ التوبہ رجوع کرنا لیکن جب یہ لفظ بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو لفظ الی کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ تبت الیك اور تاب الی اللہ جس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ گناہ چھوڑ کر غفلت سے منہ موڑ کر بندہ خدا کی طرف رجوع ہوا۔ بندہ کو تائب اور تواب کہیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوّٰبِیۡنَ، مگر اس قدر فرق ہے کہ غفلت چھوڑ کر بندہ جب اس کی طرف رجوع ہوتا ہے تو اس کو آئب کہتے ہیں اور اواب بھی۔ توبہ تین چیزوں سے مرکب ہے۔ علمِ معصیت کہ گناہ کو برا اور جرم اور باعثِ خرابیٔ دنیا و آخرت جانے تا کہ دل میں بیقراری پیدا ہو اور ندامت دل میں آئے۔ ترکِ فی الحال یعنی اسی وقت اس کام کو چھوڑ دے۔ عزمِ مستقبل یعنی آئندہ کے لیے دل میں مصمم ارادہ کر لے کہ میں اس کام کو ہرگز نہ کروں گا اور جو کچھ حقوقِ الٰہی یا حقوقِ عباد ہیں ان کے ادا کرنے کا بھی قصد کرے۔ پس جب ان شرائط سے بندہ توبہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بندے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ احادیثِ صحیحہ اور آیاتِ قرآنیہ اور کلامِ انبیاء میں جس قدر توبہ کی تاکید اور فضائل و اوصاف مذکور ہیں ان کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بندہ گناہ کر کے مقر اور تائب ہوتا ہے تو خدا اس کے گناہ معاف کرتا ہے۔ (رواہ البخاری و مسلم) اور جب توبہ کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تو بلفظ علیٰ کا استعمال آتا ہے تاب اللہ علیہ تاب علیہ بولتے ہیں جس کے معنی یہ کہ خدا نے رحمت کے ساتھ بندہ کی طرف رجوع کیا یعنی معاف کر دیا اور اس کے عذاب سے درگزرا اس لیے خدا کو صرف تواب کہتے ہیں نہ تائب۔ الٰہی تیری رحمت اور مغفرت پر بڑا بھروسہ ہے۔

فائدہ: خدا نے آدم کا توبہ کرنا بیان فرمایا حوا کا توبہ کرنا ذکر نہ کیا اس لیے کہ عورت احکام میں تابع ہے مرد کے۔ اور اسی لیے قرآن میں اکثر مرد مخاطب ہیں۔

اب اس کے بعد خدائے تعالیٰ بنی آدم کے زمین پر پھیلنے کا اور ان کے پاس انبیاء علیہم السلام کا حکمِ الٰہی لے کر آنے کا مجملاً ذکر کر کے اس تمام قصہ کا نتیجہ نکالتا ہے:

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع

ہم نے کہہ دیا تھا تم سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے (تو اس پر عمل کرنا) جو میری ہدایت پر چلیں گے تو ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی جہنمی بھی ہوں گے جو اسی میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

ترکیب: قلنا فعل ضمیر نحن اس کا فاعل اهبطو امنها جميعًا اس کا مقولہ جميعًا لفظًا تو اهبطوا سے حال ہے اور معناً تاکید ہے یعنی سب اترو خواہ مجتمع ہو کر خواہ الگ الگ فاما ان ما تھا ان حرف شرط اور ما اس کی تاکید ہے ادغام ہو کر اما ہو گیا۔ یاتینکم میں یاتین فعل مضارع کم مفعول منی متعلق فعل سے هدی فاعل یہ سارا جملہ شرطیہ ہوا۔ فمن میں فا تفریع کے لیے من شرطیہ مبتدا محلاً مرفوع طبع اس کی خبر اس کی ضمیر راجع ہے من کی طرف یہ محلاً مجزوم فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ جملہ اسمیہ اس کا جواب پس من شرطیہ اپنے جواب سے مل کر جملہ اسمیہ ہو کر جواب ہوا اما یاتینکم کا۔ والذين الخ عطف ہے فمن تبع الخ پر اس کا قسیم ہے الذين موصول كفروا و كذبوا بآياتنا صلہ تمام مبتدا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ جملہ اسمیہ اس کی خبر هم فيها خالدون مبتدا و خبر یہ حال ہے اولئك اصحاب النار سے اور عامل اس میں معنی اضافت ہیں یا لام مقدرہ۔

تفسیر: یعنی ہم نے کہا کہ تم سب اترو جنت سے نکل کر زمین پر جاؤ وہاں بھی تم پر میری نظرِ عنایت رہے گی۔ میں تمہارے پاس اپنی ہدایت (عقلِ سلیم وفکرِ عجائباتِ قدرت اور انبیاء اور کتابیں اور پھر انبیاء کے نائب) بھیجوں گا، دیکھو اب تو چوکے سوچو کے آیندہ ایسا نہ کرنا۔ ہدایت کے بموجب چلنا، پس جو اس کے موافق عمل کرے گا تو اس کو نہ آیندہ کا خوف ہوگا اور نہ وہ کبھی عمرِ گزشتہ سے غمگین ہوگا بلکہ اس عالم میں اور یہاں سے جا کر اس عالم میں بھی شاد و خرم رہے گا اور جو میری ہدایت کو نہ مانے گا اور کفر کرے گا اور ہماری کتاب کی آیات کو یا ہماری نشانیوں کو کہ (جو ہمارے وجود اور انبیاء کی صداقت اور عالمِ آخرت کے حق ہونے پر دلالت کر رہے ہیں حتیٰ کہ صاحبِ بصیرت کے سامنے نورانی قلم سے آسمان و زمین و حجر و شجر اور در و دیوار پر لکھی ہوئی ہیں) جھٹلا دے گا یا غور و تامل نہ کرے گا اور ان باتوں کا دل میں یقین نہ لاوے گا بلکہ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور دنیا کے مزے اڑانے ہی کو مقصودِ اصلی سمجھے گا تو وہ ہمیشہ آتشِ جہنم میں جلے گا۔ ان کے ملکاتِ رذیلہ جو ان کے دل پر سرایت کر گئے اور جو ان سے کسی وقت جدا نہیں ہوتے وہ وہاں آتشِ جہنم بن کر ہر وقت جلاویں گے۔ العیاذ باللہ۔

متعلقات: خوف کسی آیندہ چیز کے ڈر کو کہتے ہیں۔ حزن کسی دل پسند چیز کے جاتے رہنے پر رنج کو کہتے ہیں۔

نکات: (۱) اگرچہ ایک بار اهبطوا خدا تعالیٰ فرما چکا تھا مگر اس آیت میں پھر اس کلمہ کا ادعا کیا تاکہ فاما یاتینکم الخ کا پورا پورا ارتباط اس کے ساتھ ہو جائے یعنی ایک بار تو خدائے تعالیٰ فرما چکا تھا کہ یہاں سے اترو مگر اس آیت میں پھر فرما دیا تاکہ وہ جو آدم کے خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجنے کا نتیجہ ہے وہ واضح ہو جائے کہ یہاں سے نکل کر سب زمین پر جاؤ۔ وہاں تمہاری باہم عداوت قائم ہوگی۔ شیطان جو سانپ بن کر بہکانے گیا تھا اس کے مظہر کو دنیا میں لوگ ماریں گے وہ لوگوں کو کاٹے گا اور باہم بھی ایک دوسرے سے عداوت کرے گا، اس پر انبیاء اور اس کے نائب ہادی ہوں گے۔ الخ

فائدہ: چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے۔ یقیناً یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت آدم علیہ السلام کس ملک میں آکر رہے تھے لیکن اس میں بھی کوئی ذرا شک نہیں کہ ایشیائی ملکوں میں رہے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ عرب بالخصوص حجاز میں رہے تھے اور وہیں کہیں ان کی قبر ہے اور شہر جدہ میں ان کی بیوی حوا کی قبر ہے کہ جس کا اب تک نشان باقی ہے اور مقامِ عرفات میں میاں بیوی دونوں کی فراقِ آسمانی کے بعد ملاقات ہوئی تھی، ایک نے دوسرے کو پہچانا تھا۔ اسی لیے عرفات کو عرفات کہتے ہیں اور جس طرح دادی کی قبر کی وجہ سے شہر جدہ کو جدہ کہتے ہیں۔ چونکہ جدہ عرب میں دادی کو کہتے ہیں۔

اور کعبہ حضرت آدم نے بنایا تھا اس تقدیر پر روئے زمین پر سب مساجد سے پہلے یہ مسجد ہے اور یہ مسجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بعد

طوفان کے اسی لیے ملک شام سے آکر پھر اس کو بنایا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان عربی تھی پھر اس کی اولاد کی زبان بگڑ کر عبرانی ہوئی پھر اختلافِ بلاد اور زمانہ سے اور زبانیں پیدا ہوتی گئیں۔ دیکھئے ایک ہی ملک میں پہلے کچھ اور زبان ہوتی ہے پھر کچھ اور۔ ایران میں پہلے پاژندی پھر دری پھر پہلوی زبان مروج ہوئی۔ ہندوستان میں پہلے کچھ اور زبان تھی پھر آریہ لوگوں سے سنسکرت نے رواج پایا پھر بھاشا ہوئی پھر خراب اردو ہوا وہ منجھ کر اب صاف اردو ہو گئی۔ زمانہ کی گردش جس طرح اور چیزوں پر اثر کرتی ہے اسی طرح زبان پر بھی اس کا اثر جلدی پڑتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شام یا فلسطین کے ملک میں آباد ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ بابل کے آس پاس۔ قدماءِ ایران اپنے ملک اور اہلِ ہند اپنے ملک میں آباد ہونا بیان کرتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔ بعض ملک مصر کو سب بنی آدم کا اصلی وطن کہتے ہیں یہ بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ والعلم عند اللہ۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بہت کچھ پیدا ہوئی اور نو سو تیس برس کی عمر میں حضرت آدم نے وفات پائی۔

(۲) جس طرح کفار کی نسبت اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ فرمایا تھا اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی نسبت اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کہنا چاہیے تھا مگر یہ کمالِ بلاغت ہے کہ لازم بول کر ملزوم مراد لیا جاوے اور کنایہ کے طور پر کسی مراد کو ظاہر کر دیا جائے۔ اس لیے جنت میں ہمیشہ رہنے کو دو بات لازم ہیں ایک یہ کہ وہاں سے نکلنے کا خوف نہ ہو۔ دوم یہ کہ کسی راحتِ مرغوبِ دل کے فوت ہونے پر حزن نہ ہو اس لیے اس مراد کو اس عنوان اور اس عبارت سے بیان کیا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

(۳) لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا یعنی خوف کی جو نفی کی تو جملہ اسمیہ سے جو حال اور استقبال سب زمانوں کو مستغرق ہے تاکہ یہ بات معلوم ہو کہ جو ہدایت کے تابع ہیں اب بھی ان کو کسی مصیبت کا خوف نہیں اور نہ آیندہ ہوگا پورا اطمینانِ قلب حاصل ہے اور حزن کو جملہ فعلیہ بالخصوص مضارع کے صیغہ سے تعبیر کیا کہ جس سے بقرینۂ کلام استقبال سمجھا جاتا ہے۔ اس رمز کے لیے کہ اب کیا حزن ہے۔ حزن کا زمانہ تو آیندہ ہے کہ جب انسان کی آنکھ کھلے گی۔ سو جب بھی ان لوگوں کو حزن نہ ہوگا۔

فوائد: (۱) خدا تعالیٰ نے ابتدا سورۂ بقر سے لے کر یہاں تک کس خوبی کے ساتھ قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبیِ برحق ہونا بیان کیا کہ جو تمام انبیاء اور ان کی کتابوں کا لبِ لباب ہے اور روحِ خالص ہے۔ از انجملہ یہ کہ سب سے پیشتر ازلی سعادت مندی اور ازلی بدبختی بیان کر دی اور مومن و کافر و منافق (ان ازلی سعادت مندوں اور ازلی بدبختوں) کے اقسام ہیں ان کے خواص بیان کر دیے کہ ان پر ناصح کی نصیحت کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ الخ از ان جملہ اپنے عام احسانات کے ضمن میں انسان کے گزشتہ اور آیندہ حالات کا نقشہ کھینچ دیا تاکہ مردِ دانا غافل نہ رہے۔ از ان جملہ ایسی تعلیم حمید اور پندِ مفید اور بیانِ اعجازِ قرآن اور صداقتِ نبوتِ نبیِ آخر الزمان کے ضمن میں عالم کی ابتداء و انتہا آسمانوں زمینوں اور بنی آدم کے پیدا ہونے کی وہ صحیح صحیح کیفیت بیان کر دی کہ جس کے ادراک سے عقل قاصر تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کی ساری تاریخ اور ان کے حریف کی داستان اور پھر فرمانبرداری اور نافرمانی کے نتائج اور گناہ کے بعد توبہ پھر رحمتِ الٰہی کا دستگیر ہونا نہایت عمدگی سے بیان کر دیا اور تورات موجودہ میں جو کچھ اس بیان میں کمی زیادتی ہے اس کی نہایت مہذبانہ طور پر اصلاح کر دی۔ کیونکہ کتابِ تورات کتاب پیدائش کے دوم اور سوم اور چہارم باب میں کسی یہودی عالم نے سن سنا کر یوں لکھ رکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو باغِ عدن میں رکھا کہ اس کی نگہبانی اور باغبانی کرے اور خدا نے اس باغ کے بیچوں بیچ دو درخت لگائے تھے ایک حیات کا درخت (کہ جس کے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہے جس کو شیطان نے کھایا تھا) اور دوسرا نیک و بد کی پہچان کا درخت۔ خدا نے آدم سے کہا کہ اس باغ میں اس درخت کو نہ کھانا ورنہ تو مر جائے گا اور خدا نے زمین کے ہر ایک جانور اور آسمان کے ہر ایک پرند کو آدم کے پاس بھیجا تاکہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھے سو جو آدم نے ہر ایک جانور کو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ الخ۔ قصہ کو الٹ پلٹ کے بیان کیا اور خدا آدم کی دلبستگی کے لیے آدم کو سوتا ہوا پا کر اس کی ایک پسلی کو نکال کر اس کی عورت بنا

کر آدم کے پاس لایا۔ پس آدم اور اس کی بیوی برہنہ رہتے تھے اور شرماتے نہ تھے۔ زمین کے سب جانوروں میں ہوشیار سانپ تھا۔ اس نے آکر حوا سے کہا کہ سچ مچ خدا نے تم کو اس درخت کے کھانے سے منع کیا ہے اس نے کہا ہاں بلکہ یہ کہا ہے کہ اگر کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ سانپ نے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جب تم اس کو کھاؤ گے نیک بد کی پہچان میں خدا کی مانند ہو جاؤ گے اور تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ تب حوا نے خوشنما اور خوش مزا جان کر اس درخت کو کھایا اور آدم کو کھلایا۔ تب ان کی آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ہم برہنہ ہیں۔ پس انجیر کے پتے بدن پر چپکانے لگے۔ ٹھنڈے وقت جو خدا باغ میں پھرتا تھا اس کی آواز آدم نے سن کر اپنے تئیں برہنگی سے شرما کر درختوں میں چھپایا۔ تب آدم کو خدا نے پکارا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں آپ سے شرما کر درختوں میں چھپ گیا ہوں۔ خدا نے فرمایا کہ تجھ کو کس نے بتلایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کو کھایا کہ جس سے میں نے تجھ کو منع کیا تھا؟ اس نے کہا مجھ کو اس عورت نے دیا۔ عورت نے کہا مجھ کو سانپ نے بہکایا۔ پس خدا نے سانپ سے کہا تو ملعون ہوا ہمیشہ پیٹ کے بل چلے گا، مٹی کھائے گا اور عورت کی نسل میں اور تجھ میں عداوت ہوگی وہ تیرا سر کچلیں گے اور تو ان کی ایڑی کاٹے گا اور عورت جنے میں دردِزہ کی مصیبت اٹھائے گی اور خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور اے آدم تو زمین پر بڑی مشقت سے روزی پیدا کر کے کھائے گا (۲۲) خدا کو فکر و تشویش ہوئی کہ آدم نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کے مانند ہو گیا اب ایسا نہ ہو کہ حیات کے درخت سے بھی کھالے اور پھر ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خدا نے آدم کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔ انتہٰی ملخصاً۔ افسوس قصہ کو کس قدر الٹ پلٹ کر دیا۔ اول تو خدا کو جھوٹ بولنے سے کیا کام تھا کہ تو اس درخت کو کھا کر مر جائے گا۔ دوم اس بخل سے کیا مقصد تھا کیا ان کو ننگا رہنا پسند تھا۔ سوم سانپ مسخرے کو کیونکر اس درخت کی تاثیر اور خدا کا مکر معلوم ہو گیا۔ آدم کو نہ معلوم ہوا۔ چہارم خدا کا باغ کجا پھر ٹھنڈے وقت سیر کرنا اور آواز دینا چہ معنی دارد؟ پنجم خدا کا آدم کے ہمیشہ زندہ رہنے سے اندیشہ کر کے باغ سے نکالنا سمجھ میں نہیں آتا پس صحیح بات وہ ہے کہ جس کو خدا نے قرآن میں واضح کیا۔

فائدہ۲: قرآن مجید میں اس قصہ کو مختلف عنوان سے آٹھ سورتوں میں نقل کیا ہے کہیں اجمال سے کہیں تفصیل سے۔ سورۂ بقر، آل عمران، اعراف، حجر، کہف، بنی اسرائیل، طٰہٰ، صٓ، ان سب کے مجموعہ سے وہ بات نکلتی ہے کہ جس کو ہم نے تفسیر میں بیان کیا اور ان آیات کو جمع کرنا اور باہم ترتیب دینا محض تکلفِ لاحاصل ہے کیونکہ ہر سورہ میں بیان ناتمام نہیں ہے کہ جن کے ملانے سے تمام کیا جائے۔

ربط: اس کے بعد خدا تعالیٰ اپنے خاص انعامات کا ذکر کرتا ہے کہ جو بنی اسرائیل سے متعلق ہیں اور چونکہ دنیا میں یہ خاندانِ نبوت سب پر فائق تھا اس لیے اس کی طرف التفات بھی عام احسانات کے بعد ضرور تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا
اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

بنی اسرائیل میری وہ نعمتیں یاد کرو کہ جو میں نے تم کو بخشی تھیں اور میرے اقرار کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے اقرار کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ اور اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ کہ جس کو میں نے تمہارے اصول دین کی تصدیق کرتا ہے نازل کیا ہے اور سب سے پہلے تم اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کی تھوڑی سی قیمت دے کر نہ بیچو اور مجھ ہی سے ڈرا کرو۔

ترکیب: یا حرف ندا بنی منادی مضاف اسرائیل مضاف الیہ اذکروا فعل انتم ضمیر فاعل نعمتی مفعول موصوف التی انعمت الخ

موصول وصلہ جملہ خبریہ بن کر اس کی صفت واو حرفِ عطف بر اذکروا اوفوا فعل انتم ضمیر فاعل بعہدی مفعول اوف بعهدکم جملہ جزا ہے جملہ اولیٰ کی کہ جو شرطیہ کی بود ے رہا ہے اور اسی لیے اوف میں سے ی حذف ہو گئی ایای منصوب ہے فعل محذوف سے کہ جس پر فارھبون دلالت کرتا ہے تقدیرہ ایای فارھبوا اور فارھبون کی اصل فارھبونی ہے وقفِ آیت سے ی گر پڑی نون وقایہ باقی رہ گیا مگر زیر اس پر رکھا تا کہ دلالت کرے حذفِ ی پر و آمنوا عطف ہے اوفوا پر فعل بافاعل بما انزلت (تقدیرہ بما انزلتہ) الخ صلہ موصول مفعول مصدقاً حال مؤکد ہے حال محذوفہ سے کہ جو انزلت میں ہے معکم منصوب ہے علی الظرف والعامل فیہ الاستقرار ولا تکونوا معطوف ہے آمنوا پر انتم اس کا اسم اول کافر بہ خبر اول افعل ہے اور اس کی ف اور ع کلمہ میں سیبویہ کے نزدیک واؤ ہے اور اس سے کوئی فعل نہیں بنا اور اس کی تانیث اولیٰ ہے کافر لفظ میں واحد اور معنی میں جمع ہے ای اول الکفار کما یقال ھو احسن رجل وقیل تقدیرہ اول کافر۔

تفسیر: جبکہ خدا تعالیٰ توحید اور نبوت اور معاد کے دلائل بیان کر چکا اور اس کے تائید میں عام نعمتوں کو ذکر فرما چکا تو اب بنی اسرائیل کو مخصوص نعمتیں یاد دلا کر اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ میں تمہارا قدیم منعم ہوں میں تمہاری بہتری اور بھلائی ہمیشہ مدنظر رکھتا آیا ہوں۔ اب میں نے تمہارے دین کی اصلاح کرنے کے لیے (کہ جس کو حوادثِ زمانہ میں لوگوں کی افراط و تفریط نے الٹ پلٹ کر دیا ہے) قرآن اور نبیِ آخر الزمان کو بھیجا ہے۔ تم میری مہربانیوں اور عنایتوں پر خیال کر کے جو وقتاً فوقتاً تمہارے ساتھ کی ہیں۔ میرے عہد کو پورا کرو (کہ جو تم نے بروزِ میثاق مجھ سے باندھا تھا کہ ہم تیری اطاعت کریں گے اور تیرے پیغمبروں کا کہا مانیں گے اور پھر وقتاً فوقتاً حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء کی زبانی بھی تجدید اس عہد کی کرتے چلے آئے ہو) میں بھی اپنے عہد کو پورا کروں کہ دنیا میں تمہاری عزت و آبرو، شوکت و سلطنتِ باز رفتہ کو پھیر دوں اور آخرت میں تمہیں حیات و نجات کے ثمرات سے بہرہ اندوز کروں اور اس عہد کا وفا کرنا یہ ہے کہ اس نبی آخر الزماں اور قرآن پر ایمان لاؤ کہ جو تمہارے اصولِ دین اور مطالبِ تورات و دیگر کتبِ انبیاء کی تصدیق کر رہا ہے اور ان کو سچ بتا رہا ہے۔ پس جب یہ ہے تو اب تم اہلِ علم میں سب سے اول منکر بن کر مطالب و اغراضِ دنیائے دوں اور اتباعِ نفسِ زبوں کے بدلہ میں میری آیاتِ بینات کو نہ بیچو۔ یعنی دنیا کے لیے حق کو نہ چھوڑو ایمان اور نعماءِ اخرویہ کھو کر چند روزہ دنیا مول نہ لو اور مجھ سے ڈرو۔

متعلقات: بنی اسرائیل: اسرائیل حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کا لقب ہے جس کے معنی عبرانی میں صفوۃ اللہ یا عبداللہ کے ہیں۔ بنی مخفف بنین جمع ابن کا ہے نون اضافت سے گر گیا۔ اس لفظ کی جمع ابناء بھی آتی ہے۔ اگرچہ ابن کے معنی بیٹے کے ہیں مگر پوتے اور اس کی اولاد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے اس وقت کے لوگوں کو بھی بنی آدم کہتے ہیں اور اس مقام پر بھی یہی مراد ہے یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ حران سے ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک کنعان میں بمقام حبرون[1] آ بسے تھے ان کے آٹھ بیٹے[2] تھے ان میں سے اسماعیل علیہ السلام عرب میں آ رہے تھے اس لیے آنحضرت علیہ السلام اور دیگر قبائل کو کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں بنی اسماعیل کہتے ہیں اور حضرت اسحاق علیہ السلام وہیں رہے۔ ان کے دو بیٹے تھے عیص، ان کی بہت سی اولاد شام اور اس کے اطراف میں پھیلی دوسرے یعقوب، ان کے بارہ بیٹے تھے۔ روبن، شمعون، لاوی، یہوداہ، اسکار، زبلون، یوسف، بنیامین، دان، نفتالی، جد، آشر، ان کے بارہ بیٹوں کے نام سے بارہ قبائل ان میں مشہور ہوئے اور ہر ایک کو سبط کہتے ہیں جس کی جمع اسباط آتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون اور داؤد اور سلیمان علیہم السلام وغیرہ

[1] یہ بابل کے پاس کسدیوں میں رہتے تھے (بلکہ اس شہر کا نام اُر تھا چنانچہ آج کل محکمہ آثار قدیمہ نے اس کو برآمد کر لیا ہے) وہاں سے ابراہیم علیہ السلام کا باپ تارہ کہ جس کو آذر بھی کہتے ہیں اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور بیوی سارہ کو لے کر وہاں سے جنوب کی طرف بمقام حران آ بسے تھے وہیں آذر نے وفات پائی پھر وہاں سے ستر برس کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور لوط کو لے کر ملک کنعان میں آئے اور حیتون میں بمقام حبرون مقام کیا۔

[2] ابراہیم کی اولاد سارہ کے پیٹ سے اسحاق اور ہاجرہ کے پیٹ سے اسماعیل جو سب سے بڑے تھے۔ زمران، یسقان، مدان، مدیان، اسباق، سوخ۔ ۱۲ تورات

بہت سے اولوالعزم انبیاء اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے یہ خاندان روئے زمین پر متبرک اور مشہور ہوگیا۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مدینہ اور اس کے اطراف خیبر وغیرہ مقامات میں بنی اسرائیل رہتے تھے۔ ان بارہ فرقوں میں سے آج کل چند باقی ہیں ان کو یہود کہتے ہیں۔

اوفوا بعهدی: عہدِ باہمی قرارداد کو کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب بندہ کو عقلِ سلیم عطا کی اور اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیوں میں غور وفکر کرنے کی طاقت بخشی تو ایک بارِ امانت اس کے سر پر دھر دیا اور تمام نیک عمل کرنے اور خدا اور اس کے ذات وصفات وانبیاء پر ایمان لانے کا اس سے ذمہ لے لیا اور بندہ نے اس کا اقرار کرلیا۔ اس کے صلہ میں اس نے دنیا وآخرت میں نیک نتیجہ مرتب کرنے کا اپنی رحمت سے ذمہ لے لیا۔ پس دونوں طرف سے یہ قول وقرار اور یہ عہد قرار پایا' اسی کو عالمِ ارواح میں قائم کیا تھا اور اسی کو انبیاء وقتاً فوقتاً یاد دلاتے اور تجدید کرتے رہے اور اس عہد کے پورا کرنے کے بیشمار مراتب ہیں بندہ کی طرف سے اول مرتبہ یہ ہے کہ توحید اور رسالت کا اقرار کرے کلمہ لا الٰہ الا اللہ الخ صدقِ دل سے پڑھے اس کی طرف سے اول مرتبہ یہ ہے کہ دنیا میں اس کی جان ومال کو آسمانی محاسبہ سے مامون اور آخرت میں عذابِ ابدی سے محفوظ ومصئون رکھے اور بندہ کی طرف سے اخیر مرتبہ یہ ہے کہ اس کی محبت اور یاد میں ہمہ تن غرق ہو جائے۔ کسی کی بھی خبر نہ رہے اس کی طرف سے یہ ان کو ہمیشہ دربارِ قدس میں اپنے دیدارِ فرحت آثار سے مسرور رکھے جس نے یہ کہا کہ اس عہد سے مراد وہ عہد ہے کہ جو بنی اسرائیل سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کی بابت لیا گیا تھا۔ جیسا کہ انجیل سے اب تک سمجھا جاتا ہے تو وہ کوئی اور بات نہیں وہ بھی اسی عہد کی شاخ ہے۔

مصدقا لما معكم: سے یہ مراد نہیں کہ یہود کے جمیع عقائد اور کل کتابوں کی تصدیق قرآن مجید کرتا ہے بلکہ اصولِ مذہب اور مضامینِ کتبِ الہامیہ کے کہ جن کو اپنی کتابوں میں مخلوط کر رکھا تھا اور اس مجموعہ کو وہ تورات کہتے تھے۔ یہاں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نزولِ قرآن کے وقت ان کے پاس بلاکم وکاست حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات تھی بلکہ ایک مجموعہ کہ جس کو علماءِ یہود نے مرتب کیا تھا جس کو وہ اپنی اصطلاح میں تورات کہتے تھے۔

نکات: (١) چونکہ مقصود یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم کیا جاوے اور بنی اسرائیل کو نہایت شاق تھا کہ وہ غیر خاندان کے نبی پر ایمان لائیں۔ یہ انسان کا ایک جبلی خاصہ ہے کہ وہ دوسرے خاندان کو بمشکل مانتا ہے بالخصوص جبکہ وہ جاہ وریاست دل میں پیوست ہو۔ اس لیے خدا نے اول تو بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں یاد دلا کر نرم کیا۔ نعمتوں سے انسان کا مطیع ہونا طبعی بات ہے اور اس میں اشارہ کردیا کہ غیر خاندان پر حسد کرنا عبث ہے تم کو کیا کم نعمتیں دی ہیں۔ اس بات پر خیال نہ کرو قرآن پر ایمان لاؤ۔ دوم اپنا عہد یاد دلایا اور اس کے ثمرہ اوف بعهد کم کی طرف اشارہ کردیا۔ سوم اس نرمی کے ساتھ گرمی اور چشم نمائی بھی کردی۔ ایای فارهبون کہ مجھ سے ڈرو ورنہ پھر میں یوں بھی سیدھا کر دیتا ہوں۔ پس ان تینوں کے بعد مقصد اصلی آمنوا بما انزلت کو ادا کیا اور اس کے بعد بھی تین تاکید کردیں۔ اول وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ دوم وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيَاتِي الخ سوم اِيَّايَ فَاتَّقُونَ۔ اس میں ان کی خراب عادتوں کی طرف بھی اشارہ کردیا۔

(٢) آمنوا بما انزلت کے پہلے تو اِيَّايَ فَارْهَبُونَ فرمایا کیونکہ یہود میں جو خداترس تھے ان کو راہب کہتے تھے یعنی پہلے تم اپنے دین پر تو قائم ہو جاؤ اس کے بعد اِيَّايَ فَاتَّقُونَ فرمایا۔ کس لیے کہ امتِ محمدیہ میں خداترس کو متقی کہتے ہیں اور جب قرآن پر ایمان لائیں گے تو امتِ محمدیہ میں داخل ہو جاویں گے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاَقِيْمُوا

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

اور سچ میں جھوٹ نہ ملایا کرو اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتے رہو

ترکیب: و حرف عطف بر کلامِ سابق اذکروا لاتلبسوا الحق جملہ فعل فاعل ومفعول سے مرکب بالباطل متعلق ہے فعل مذکور سے وتکتموا فعل ضمیر انتم فاعل عطف ہے تلبسوا پر مجزوم ہے لانہی سے الحق اس کا مفعول وانتم تعلمون جملہ اسمیہ حال ہے۔ اقیموا الصلوۃ جملہ انشائیہ معطوف اور معطوف علیہ و آتوا الزکوٰۃ معطوف اور معطوف علیہ وارکعوا معطوف اور مع الراکعین ظرف متعلق ہے ارکعوا سے۔

تفسیر: جبکہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اصولِ ایمان اعنی نظریات سے مخاطب کیا اور ایمان لانے کا حکم دیا تو اس کے بعد عملیات کا بھی حکم دیا اور جو باتیں بری تھیں پیشتر ان سے منع کر دیا۔ علماءِ یہود کا قدیم دستور اور جبلی عادت تھی کہ وہ کتبِ انبیاء میں کبھی عمداً کسی عقیدہ اور غرض ثابت کرنے کے لیے کچھ گھٹا بڑھا دیتے تھے اور حوادث میں جو کتابیں تلف ہوگئی تھیں یا ان میں کچھ نقصان واقع ہوتا تھا ان ہی کے نام سے اپنے طور پر تصنیف کر کے اس میں ملا دیتے تھے اور کبھی شرح کے طور پر کچھ اس میں لکھ دیتے تھے اور لطف یہ کہ متن اور شرح مزید اور مزید علیہ اور قدیم وجدید کتاب میں امتیاز کے لیے کوئی علامت اور نشانی بھی نہ کرتے تھے اور قوم بھر میں کوئی بھی اصلی کتابوں کا حافظ نہ ہوتا تھا نہ کوئی حفظ سنانے کا دستور تھا۔ اس پر کاغذ اور کتابت کی قلت سے نہ کوئی ایسا کتب خانہ تھا کہ جس میں کل دینی کتابیں محفوظ رہتی تھیں۔ نہ کوئی سوسائٹی تھی بلکہ ہر کاہن یا راہب کے پاس جو کچھ تھا سو تھا اس کو مقابلے سے کیا غرض؟ چنانچہ آج تک یہ بات مجموعۂ عہدِ عتیق وجدید سے پائی جاتی ہے۔ محققینِ اہلِ کتاب اس کے مقر ہیں۔ پس ان وجوہ سے کتاب میں گھٹانا بڑھانا یا کچھ کا کچھ پڑھ دینا بالخصوص مقابلہ میں کسی دنیاوی غرض کے لیے ایک آسان سی بات تھی۔ جب تک آنحضرت علیہ السلام ظاہر نہ ہوئے تھے تو کتبِ انبیاء میں آپ کی بشارتیں دیکھ کر آپ کے آنے کے منتظر اور آپ کے محامد بیان کیا کرتے تھے۔ پھر جب آپ ظاہر ہوئے اور مدینہ میں تشریف لائے تو رشکِ خاندانی اور دیگر اغراضِ دنیویہ سے آپ سے حسد کرنے لگے اور ان بشارتوں کو الٹنے پلٹنے لگے اور کچھ کا کچھ کہنا شروع کردیا اور اپنے تقوے اور طہارت کے مسائل میں بھی تاویلات اور توجیہات کر کے ٹالنے لگے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حق میں باطل اپنی طرف سے نہ ملایا کرو اور جان بوجھ کر حق نہ چھپایا کرو کیونکہ تمہاری گمراہی سے اور ہزاروں ان پڑھ گمراہ ہوتے ہیں اس کے بعد تقویٰ وطہارت کا حکم دیتا ہے کہ نماز کو اچھی طرح قائم کرو تاکہ تمہارے دل ملائم ہوں اور دلوں کی سیاہی دور ہو پھر خداترسی کر کے اپنے مال میں سے کوئی حصۂ معین بھی فقراء غرباء کو دیا کرو۔ اس لیے پہلے نماز کا ذکر کیا، پھر زکوٰۃ کا اس میں بدنی اور مالی دونوں عبادتیں آگئیں اور اکیلے اپنے گھروں میں نماز پر بس نہ کرو، بلکہ خدا کی جماعت میں شامل ہو کر نماز پڑھو رکوع کرو تاکہ دین کی تمام برکات وانوار حاصل ہوں۔

متعلقات: فارکعوا: رکوع کے معنی جھکنا ہے چونکہ نماز کا یہ ایک جزو ہے تو کل کو بھی اس جزء کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور کبھی سجدہ کے ساتھ اور یہاں اس جزء کے ساتھ تعبیر کرنے میں ایک نکتہ ہے۔ یہود کی نماز میں صرف رکوع ہے اس لیے بھی صرف ارکعوا فرمایا۔

زکوٰۃ کے معنی زیادہ ہونے اور بڑھنے کے ہیں، بولتے ہیں زکاء الزرع جب کھیتی بڑھتی ہے اور چونکہ خدا کے نام پر دینے سے مال میں برکت ہوتی ہے اور اس عمل کی تاثیر سے مال بڑھتا ہے اس لیے مال میں سے حصۂ معین سال تمام پر دینے کو زکوٰۃ کہنے لگے۔ بعض کہتے ہیں کہ زکاء سے مشتق ہے جس کے معنی پاکی کے ہیں، چونکہ زکوٰۃ سے مال پاک ہو جاتا ہے اس لیے زکوٰۃ کہنے لگے اور اسی لیے ذبح کرنے سے

نجس خون نکل جاتا ہے مذبوح جانور کو مزکی کہتے ہیں یہود میں جس طرح نماز فرض تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی مگران کی نماز اور زکوٰۃ کا قاعدہ اور تھا۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

کیا لوگوں کو تم (اے بنی اسرائیل) نیکی کرنا بتلاتے ہو اور اپنی خبر نہیں رکھتے حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو پھر کیوں نہیں سمجھتے اور صبر کرنے اور نماز پڑھنے سے مدد لیا کرو۔ بلاشبہ نماز مشکل ہے مگران پر کہ جو عاجزی کرتے ہیں (اور) جو یہ سمجھتے ہیں کہ ضرور ہم کو اپنے پروردگار سے ملنا ہے اور ہم کو اس کے پاس پھر کر جانا ہے (پس یہ نماز کچھ بھی ان پر مشکل نہیں)

ترکیب: اَ استفہامیہ داخل ہے جملہ تَاْمُرُوْنَ النَّاسَ الخ پر اور یہ استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہ کرو تَاْمُرُوْنَ النَّاسَ الخ جملہ معطوف علیہ وتنسون الخ دوسرا جملہ اس پر معطوف وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ جملہ اسمیہ حال ہے ضمیر فاعل تنسون سے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ جملہ استفہامیہ بمعنی توبیخ یہاں تک یہ جملہ معترضہ سا تھا اس کا شانِ نزول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں منقول ہے کہ علماءِ یہود اپنے ان اقارب سے جو مسلمان ہو گئے تھے یہ کہتے تھے کہ اسی دین پر قائم رہو کیونکہ یہ حق ہے اور از خود اسلام میں داخل نہ ہوتے تھے (جلالین) بعض کہتے ہیں کہ اوروں کو صدقہ اور خیرات کا حکم دیتے تھے اور خود نہ کرتے تھے (بیضاوی) وَاسْتَعِيْنُوْا الخ معطوف ہے اذکروا پر یا آمنوا پر بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ معطوف علیہ اور معطوف متعلق ہیں اسْتَعِينوا سے وانہا ای الصلوٰۃ لکبیرۃ جملہ مستثنیٰ منہ الا حرف استثنا علی الْخٰشِعِيْنَ موصوف الذین الخ صلہ وموصول اس کی صفت یہ سب مستثنیٰ۔

تفسیر: اے بنی اسرائیل باوجودیکہ تم کتاب یعنی تورات پڑھتے ہو اور اس میں خود اعمالِ صالحہ کرنے کی تاکید اور کلامِ انبیاء میں آپ عمل نہ کرنے، دوسرے کو نصیحت کرنے پر بڑی تہدید بھی ہے تم خود عمل نہیں کرتے اور لوگوں کو وعظ و تدریس کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہو۔ تمہارے نفس سرکش ہیں کہ ان اعمالِ صالحہ اور قیدِ شریعت اور روحانی صفائی کو اختیار نہیں کرتے۔ سو اس کا علاج روحانی طور پر یہ ہے کہ تم روزہ اور نماز سے مدد لو نفس کو مشقت کشی کا عادی بناؤ کس لیے کہ روزہ میں باوجود ہر طرح کے سامانِ اکل و شرب و جمال مہیا ہونے کے صبر کرنا اور اس کی خواہش سے رو کنا ہوتا ہے اور پھر نماز میں مشغول ہو کر ہاتھ پاؤں تمام جسم کو اس کی عبادت میں مصروف کرنا' زبان اور روح کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور تسبیح و تقدیس کرنا قرآن پڑھنا ہے ان سب کا مجموعہ روح کو نہایت تازہ کرتا ہے جس سے نفس کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے اور حبِ جاہ و مال اور ہر قسم کی نفسانی خواہش کہ جو عمل سے مانع آتی ہے پژمردہ ہو جاتی ہے صبر و نماز سے مدد لینے کے یہ معنی ہیں (اور واقعی جسمانی ریاضت سے جو تزکیۂ نفس کہ سالہا سال میں حاصل نہیں ہوتا وہ روحانی تقرب سے دم بھر میں حاصل ہو جاتا ہے۔ تھوڑی سی دیر اس

ل اس کے شانِ نزول کے یہ معنی ہیں کہ یہ آیت ان یہودی علماء پر صادق آتی ہے یا اس میں ان کی طرف تعریض اور اشارہ ہے کہ جو خود اچھے کام نہیں کرتے تھے اوروں کو وعظ و پند کرتے تھے جیسا کہ عموماً علماءِ بے عمل کیا کرتے ہیں ورنہ خاص اس آیت کا ان لوگوں کے لیے اور اس حال پر متنبہ کرنے کے لیے جداگانہ نازل ہونا جب تسلیم کیا جائے کہ جب کسی سندِ صحیح سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ آیت الگ ہو کر نازل ہوئی ہے اور اس سے اگلا پچھلا کلام جداگانہ نازل ہوا ہے۔ ۱۲ حقانی

کی طرف مراقب اور متوجہ ہونے سے کسی قدر نفس کو پژمردگی اور روح کو تازگی حاصل ہوتی ہے) اور یہ نماز بھی فی نفسہ ایک بھاری بات ہے اس کے بھی وہی متحمل ہوتے ہیں کہ جو خدا کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو اس کے پاس جانا ہے۔ امام احمد وغیرہ نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی رنج و غم لاحق ہوتا تھا تو نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اس سر کے لیے امت محمدیہ پر پنج وقتہ نماز فرض ہوئی اور اس لیے اس کی نسبت فرمایا اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ کہ نماز ہر قسم کی برائی اور گناہ سے روکتی ہے۔ نماز کے فضائل اور اس کے تارک پر جو کچھ تہدید احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے اس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

فائدہ: اس آیت سے اس شخص کی برائی ثابت ہوئی کہ جو ان کو نصیحت کرتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا کس لیے کہ اس کا یہ فعل ایسا ہے کہ جیسا کوئی جاہل یا احمق کرتا ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کلام کا اس کو اعتقاد نہیں ورنہ خود بھی عمل کرتا، اسی لیے صحاح ستہ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی زبان کو جہنمی فرشتوں کو آگ کی مقراضوں سے کاٹتے دیکھا تو جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کیا ہے؟ کہا یہ وہ لوگ ہیں کہ جو خود عمل نہ کرتے تھے اور لوگوں کو نصیحت کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ فاسق کو وعظ کہنا منع ہے۔ کس لیے کہ انسان پر جس طرح عمل کرنا فرض ہے دوسروں کو سمجھانا بھی فرض ہے۔ ایک فرض کے ترک کرنے والے کو کیا ضرور ہے کہ دوسرے فرض کو بھی ترک کرے۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو کہ جو میں نے تم کو دی تھیں اور میں نے تم کو جہان پر فضیلت دی اور اس دن سے بھی ڈرو کہ جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ ان کے لیے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس کے عوض میں کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ترکیب: یا حرف ندا بنی اسرائیل مضاف اور مضاف الیہ منادی اذکروا فعل ضمیر انتم فاعل نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ صفت و موصوف معطوف علیہ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ تمام جملہ اسمیہ ہو کر معطوف یہ دونوں اذکروا کے مفعول یہ فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ اسمیہ انشائیہ ہو کر ندا ہوا و اتقوا فعل انتم ضمیر فاعل یوماً مفعول بہ موصوف و لاتجزی نفس الخ اور لایقبل اور لایؤخذ الخ ولاھم الخ چاروں جملے معطوف بر یکے دیگر اس کی صفت اور سب میں عائد محذوف ہے ای لاتجزی فیہ وقس علیہ البواقی۔ اس جملہ اتقوا کا عطف اذکروا پر ہوا عن نفس موضع نصب میں ہے تجزی سے اور ممکن ہے کہ حال ہو کر موضع نصب میں ہو تقدیرہ شیئاً عن نفس منہا دونوں جگہ میں ممکن ہے کہ یقبل اور یؤخذ کے متعلق ہو اور ممکن ہے شفاعۃ اور عدل کی صفت ہو۔

تفسیر: پہلا انعام : یہاں سے نصائح و اوامر و نواہیِ سابقہ ذکر فرما کر بنی اسرائیل کو اپنے انعام و احسان جو وقتاً فوقتاً ان پر اور ان کے بزرگوں پر ہوئے یاد دلاتا ہے۔ یہ پہلا احسان ہے کہ ان کو دنیا پر فضیلت دی تھی مگر بنی اسرائیل کو اپنے اہلِ علم اور انبیاء زادے ہونے کی وجہ

ل اور جو ملحد ہیں نہ ثواب کے قائل نہ خدا کے مقرر وہ تو اس کو عبث سمجھتے ہیں اس لیے ان پر بھاری ہے اور کیسا ہی بھاری کام ہو جب انسان اس کا نتیجہ نیک یقین کر لیتا ہے تو اس کو اس امید میں سب تلخیاں شیریں معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۲ منہ

سے دوچند غرور اور تعصب تھا۔ اس لیے خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کو اور ان واقعات کو کہ جن میں ان پر وقتاً فوقتاً انعام الٰہی ہوئے۔ یکے بعد دیگر بیان فرماتا ہے۔ اول یہ نعمت و انعام ذکر فرماتا ہے کہ تم کو دنیا پر فوقیت دی تھی۔ نبوت اور سلطنت دونوں تمہارے خاندان میں تھیں جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ. اس پر شکر کرو تکبر اور سرکشی سے باز آؤ۔ ہماری اطاعت کرو نہ کہ الٹا تکبر اور سرکشی کرو۔ اگر تم اپنی سرکشی اور تعصب سے باز نہیں آتے اور ہماری نعمتوں کا حق ادا نہیں کرتے اور تم کو اس بات پر بھی عبرت نہیں (کہ میں نے تمہارے فسق و فجور پر حسبِ وعدہ تم پر اپنا قہر نازل کیا تھا، بخت نصر اور انٹیوکس وغیرہ بادشاہوں نے تمہاری عزت و شوکت خاک میں ملا دی تم کو غلام بنا لیا تھا) تو آخر ایک روز مرنا بھی ہے قیامت میں ہمارے پاس آنا اور حساب دینا ہے اس دن سے ہی ڈرو کہ وہاں کوئی وجہ عذاب الٰہی کے دفع کی نہیں۔ کس لیے کہ مخلصی کا طریق یا تو یہ ہے کہ دوسرا شخص اس کی جگہ آپ ذمہ دار ہو جائے اور اس کے جمیع حقوق اور محاسبہ کو اپنے سر پر لے لے۔ سو وہاں یہ بھی نہیں لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا۔ اس دن کی سختی ایسی ہوگی کہ ہر کوئی نفسی نفسی پکارے گا کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ (الآیہ) یا کسی کی وجاہت سے مفت چھوڑ دیا جائے۔ تم کو اپنے باپ دادا انبیاء علیہم السلام پر بڑا بھروسا ہے سمجھتے ہو کہ وہ تم کو چھوڑا لیں گے سو وہاں یہ بھی نہیں کیونکہ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اس روز یہ سفارش بھی کام نہ آوے گی اس کی مرضی بغیر کوئی نبی یا بزرگ کسی کے لیے لب کشائی بھی نہیں کر سکتا یا اپنا مال دے کر معاوضہ یا جرمانہ بھگت کر نجات پا جاوے تو وہاں یہ بھی نہیں کس لیے کہ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ خدا کو مال و دولت کی کچھ پروا نہیں اور اس روز کسی کے پاس ہوگا کیا۔ نہ مال نہ دولت کسی سے مالی معاوضہ نہ لیا جاوے گا۔ یا یہ کہ یار و انصار برادری و اقارب اپنے زور سے چھڑا لیں سو وہاں یہ بھی نہیں کیونکہ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ خدا سے مقابلہ کرنے کی کس کو مجال ہے۔

متعلقات: فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ : عالم کا اطلاق اگرچہ ماسوی اللہ جمیع مخلوقات پر ہوتا ہے اور جب بلفظ عالمین اس کو جمع کر لیا جاتا ہے تو اور بھی شمول اور عموم کا فائدہ دیتا ہے مگر جس طرح ہمارے عرف میں دنیا کو بول کر اکثر لوگ مراد لیا کرتے ہیں اسی طرح عرب میں محاورہ تھا اور جس طرح ہمارے عرف میں لفظ کل بولتے ہیں اور اکثر چیزیں اس سے مراد لیا کرتے ہیں اسی طرح عرب میں محاورہ تھا۔ بلقیس کی نسبت وارد ہے و اوتیت من کل شیء کہ اس کو ہر چیز سے حصہ ملا تھا حالانکہ بہت سی چیزیں اس کو نہ ملی تھیں۔ پس اس توجیہ پر مطلب آیت کا صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو خدا نے ایک زمانہ میں اکثر لوگوں پر فضیلت دی تھی اور یہ واقعی بات ہے۔

بعض مفسرین نے عجب موشگافی کی ہے۔ عالمین سے جمیع مخلوقات مراد رکھی ہے پھر دیکھا کہ اس سے ملائکہ اور جمیع انبیاء اور جناب محمد ﷺ پر فضیلت ثابت ہوتی ہے تو آنحضرت ﷺ کو دلائل سے مستثنیٰ کیا اور بے سروپا دلائل سے ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے اسی طرح بنی اسرائیل سے ہر فرد بشر مراد لے کر الجھاوے میں پڑ گئے کہ بنی اسرائیل کے فساق اور کفار کو جمیع عالم پر کیونکر فضیلت تھی؟ اسی طرح اکثر مقامات پر عرف اور محاورۂ عرب سے غافل ہو کر الفاظ کے معانی لغویہ یا علماءِ کلام و علمائے اصول کے مقرر کردہ معنی مراد لے کر سیدھی بات کو مشکل کر دیتے ہیں۔

شفاعۃ: شفع بمعنی جفت ہے یعنی طاق کا خلاف گویا کہ شفاعت کرنے والا اپنے آپ کو اس کے ساتھ (کہ جس کی یہ شفاعت کرتا ہے) ملا کر اس اکیلے کو جوڑا کرتا ہے۔ معتزلہ اس آیت اور اس آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ سے استدلال کرتے ہیں کہ قیامت کو انبیاء گناہ گاروں کی شفاعت نہ کریں گے۔ مگر ان کا یہ قول صحیح نہیں۔ کس لیے کہ ان آیات کا یہ منشاء ہے کہ اس کی مرضی کے برخلاف اپنی وجاہت سے کوئی سفارش نہ کر سکے گا اور چونکہ اس کی مرضی کفار اور مشرکین کی نسبت نہ ہوگی تو ان کے لیے کوئی شفاعت نہ کرے گا جیسا کہ ان آیات کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے اور لفظ اِلَّا بِاِذْنِهٖ باآوازِ بلند بتلا رہا ہے کہ گناہ گار مسلمانوں کے لیے رحمتِ الٰہی انبیاء اور اولیاء اور صلحاء

کے دل میں ان کی شفاعت کا شوق پیدا کرے گی اور وہ نہایت عجز و انکسار سے اس کی جناب میں عرض کریں گے۔ وہ اپنی رحمت سے قبول فرمائے گا۔ ع رحمتِ حق بہانہ می جوید، آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا ہے شفاعتی لاهل الکبائر من امتی اور احادیثِ صحیحہ میں آنحضرت کی شفاعتِ کبریٰ کی تفصیل ہے۔ آنحضرت عالم کے شفیع اعظم ہیں ﷺ۔ اور یہ آیات کفار کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کس لیے کہ کلام یہود سے چلا آتا ہے۔

عدل : عدل کے معنی برابری کے ہیں چونکہ معاوضہ اور فدیہ دے کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں اس لیے معاوضہ اور فدیہ اور بدل کو بھی عدل کہنے لگے اور اسی لیے انصاف کو بھی عدل کہتے ہیں۔

نکات: (۱) جو نکرہ حیزِ نفی میں ہوتا ہے تو وہاں کثرت سمجھی جایا کرتی ہے اور لا تجزی نفس سے نفس نکرہ ہے معرفہ نہیں اور لا نفی کے پیچھے آیا ہے تو یہاں بھی عموم مراد ہے پس یہ کثرت جو یہاں مفہوم ہوتی تھی اس کو وَهُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ میں اس نکتہ کے لیے ظاہر کر دیا کہ عادتاً جب کسی کو ایسے شخص کے پنجے سے چھڑاتے ہیں کہ وہ نہ وجاہت اور لحاظ کو خیال میں لاتا ہے تاکہ سفارش قبول کرے نہ وہ معاوضہ سے راضی ہوتا ہے نہ کسی دوسرے شخص کی ضمانت مانتا ہے تو وہاں ایک جماعت اور جمعیت سے کام لیا جاتا ہے کہ ایک جماعت بزور چھڑا لیتی ہے۔ پس لفظ ھم میں ان کی کثرت کے فائدہ مند نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد خدائے تعالیٰ اپنی نعمتوں کی تفصیل کرتا ہے اور ہر ایک واقعہ کو یاد دلاتا ہے تاکہ سن کر عبرت اور رغبت ہو اور بنی اسرائیل کے دل ملائم ہوں اور راہِ راست پر آویں۔ مگر یہ واضح رہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصود صرف اپنی نعمتوں اور نافرمانیوں پر عقوبتوں کا یاد دلانا ہے نہ بترتیبِ تاریخِ آدم اور تاریخ بنی اسرائیل بیان کرنا جیسا کہ اہلِ کتاب کی تورات وغیرہ کتبِ تواریخ میں ہے کہ جن کو وہ الہامی کہتے ہیں اس لیے کبھی مقدم واقعہ کو مؤخر اور کبھی بالعکس اور کبھی بطورِ اجمال اور کبھی بطورِ تفصیل بیان کرتا ہے اور کچھ عہدِ موسیٰ کے واقعات ہی بیان نہیں ہوئے بلکہ ان سے پہلے اور پچھلے واقعات بھی ہیں بلکہ ملکِ مصر کے واقعات اور وہاں سے نکل کر ملکِ کنعان میں آتے وقت کے اور وہاں پہنچ کر جو کچھ گزرا سب کا بیان ہے نہ بترتیبِ وقوع بلکہ جس واقعہ کا ذکر مناسب مقام تھا اس کا ذکر کیا۔

وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) کہ جب ہم نے تم کو فرعونیوں سے نجات دی وہ تم کو بری طرح عذاب دیا کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔

ترکیب: واذ موضع نصب میں ہے معطوف اذکروا نعمتی پر اور اسی طرح و اذ فرقنا و اذ واعدنا اور اذ قتلتم یاموسیٰ وغیرہ نجینا فعل بافاعل کم مفعول من آل فرعون متعلق ہے نجینا سے یسومون فعل هم ضمیر راجع آل فرعون کی طرف کم مفعول اول سوء العذاب مفعول ثانی یہ تمام جملہ حال ہے آل فرعون سے یا ضمیر نجینا کم سے یا دونوں سے یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ اور یَسْتَحْیُوْنَ الخ دونوں جملے بیان ہیں یسومونکم کے اور اسی لیے عطف نہ ہوا بلاء موصوف من ربکم اور عظیم صفت مبتداء موخر فی ذلکم خبر۔

تفسیر: انعام دوم : یہ دوسرا انعام یاد دلاتا ہے اسرائیلیوں پر جو فرعونِ مصر اور اس کی قوم کی طرف سے ہر روز ایک تازہ مصیبت کا سامنا تھا یہاں تک کہ لڑکے قتل کئے جاتے اور لڑکیاں باقی چھوڑی جاتی تھیں۔ اس میں بنی اسرائیل پر بڑی سخت مصیبت تھی۔ اول نسل اور قوم کا کم

ہونا پھر لڑکیوں کا غیر اقوام کے استعمال میں آنا، پھر زندہ اولاد کا قتل دیکھنا، ان سب مصائب سے خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سبب نجات دی۔ یہ کس قدر احسان اور کیسی نعمتِ الٰہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام تک ان کی اولاد کنعان ہی میں آباد رہی۔ پھر بھائیوں کے حسد اور بغض کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام غلام بن کر مصر میں آئے۔ یہاں ان کا بادشاہِ مصر کے پاس بڑا عروج ہوا۔ جب کنعان میں سخت قحط پڑا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد مصر میں آ رہی اور ان کو خدا نے بہت بڑھایا اور کئی سو برس تک مصر میں ان کے لاکھوں آدمی ہو گئے اور اس عرصہ میں یوسف علیہ السلام اور وہ فرعون سب مر کھپ گئے۔ دوسرا فرعون تخت نشین ہوا جس کا نام مصعب یا ولید تھا اس کو بنی اسرائیل سے سخت عداوت تھی اور دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ مبادا یہ لوگ ہماری سلطنت پر قابض ہو جاویں۔ اس لیے اس نے ان کو سخت سخت تکلیفیں دینی شروع کیں۔ ان پر خراج کے لیے محصل بٹھا دیے اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔ (۲۲) اور فرعون نے اپنی قوم کے لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو اسے مار ڈالو اور جو بیٹی پیدا ہو اسے جینے دو (تورات) خدائے تعالیٰ کو بنی اسرائیل کی مصیبت پر رحم آیا ان میں عمران کے گھر میں ایک حسین لڑکا پیدا کیا، جس کی پرورش اور سرگزشت عبرت کا باعث ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ انہوں نے طرح طرح کے فرعون کو معجزے دکھائے اور تمام بنی اسرائیل کو مع یوسف علیہ السلام کی ہڈیوں کے ان کے وطنِ قدیم ملک کنعان میں لے گئے ان کے پیچھے جو فرعون پکڑنے چلا تھا دریائے قلزم میں مع لشکر ڈوب مرا اور بنی اسرائیل دریا میں سے خشک نکل گئے۔ مصر سے کنعان یعنی ملکِ شام تخمیناً چالیس روز کا رستہ شمال کی جانب ہے مگر رستہ میں جو بنی اسرائیل نے خدا کی نافرمانیاں کیں چالیس برس تک ٹکراتے پھرے۔ اسی عرصہ میں من وسلویٰ نازل ہوا اور دھوپ سے ابر نے سایہ کیا اور دیگر ذبح بقرہ وغیرہ کے واقعات پیش آئے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور جو جوان مصر سے نکلے تھے سب اسی رستے میں مر گئے پھر موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع بن نون نے ملکِ کنعان فتح کیا اور وہاں بنی اسرائیل کی سلطنت قائم ہوئی۔ اس قصہ کا مجملاً خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے اور آئندہ اور قصوں کو ذکر کرتا ہے۔

وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

اور اس وقت کو بھی یاد کرو جبکہ ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا پس تم کو تو بچا لیا اور تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو ڈبو دیا۔

ترکیب: فرقنا فعل بافاعل بکم موضع نصب میں مفعول ثانی ہے اور البحر مفعول اول ہے اور ب بمعنی لام ہے فانجیناکم جملہ فعلیہ معطوف علیہ واغرقنا الخ جملہ فعلیہ معطوف وانتم تنظرون حال ہے اغرقنا سے۔

تفسیر: انعام سوم: یہ تیسرا انعام ہے جو خروجِ مصر کے بعد بنی اسرائیل پر خدا نے کیا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی قید سے چھڑا کر کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو فرعون اور اس کے لشکر نے قلزم کے پاس تعاقب کر کے بنی اسرائیل کو آ لیا اب پیچھے تو فرعون اور اس کا خونخوار لشکر جس کی ہیبت نے بنی اسرائیل کو ہوش باختہ کر دیا اور سامنے سمندر، نہ آگے جا سکتے ہیں نہ پیچھے پھر سکتے ہیں۔ اس وقت بنی اسرائیل کی عجب ہوشربا حالت تھی مگر خدا نے اپنا فضل کیا۔ بنی اسرائیل کے لیے دریا میں خشک رستہ کر دیا۔ دونوں طرف پانی کی دیواریں بن کر کھڑی ہو گئیں۔ جب بنی اسرائیل سوکھے پار اتر گئے ان کے پیچھے جو فرعون کا لشکر نکلنے لگا تو پانی مل گیا۔ سب ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب مرے۔ بنی اسرائیل یہ تماشا پرلے کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ادھر اپنا ایسی خوفناک حالت سے نجات پانا، دوسرے اپنے دشمن کو جس کی تباہی کا خیال بھی نہ جاتا تھا مع ساز و سامان غرق ہوتے دیکھنا کیسی خوشی اور کیسا انعامِ الٰہی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ

جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر ملک شام کی طرف چلے تو بحیرۂ قلزم کی طرف راہ پڑ لیے ان کے پیچھے فرعون بھی مور و ملخ کی طرح لشکر لے کر گرفتار کرنے پہنچا۔ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ اب ہم کیا کریں، سامنے سمندر کی ایک شاخ ہے کہ جس کو قلزم کہتے ہیں اور پیچھے فرعون کا لشکر چلا آتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں التجا کی، حکم ہوا کہ اپنے عصا کو دریا پر مار اس کی وجہ سے یہ معجزہ ظہور میں آیا کہ سمندر پھٹ گیا اور جس طرح پہاڑ میں گھاٹیاں ہوتی ہیں اسی طرح پانی کے بستہ ہونے سے خدا نے گھاٹیاں کر دیں جن میں سے بنی اسرائیل بخوبی مع اپنے جانوروں اور اسباب کے نکل گئے اور چونکہ پانی ایک لطیف جسم ہے اس کی گھاٹیوں میں سے ایک طرف کا آدمی دوسری طرف کو نظر آتا تھا۔ فرعون نے ان کے پیچھے اسی راستہ سے عبور کرنا چاہا تو پھر سمندر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا سارا لشکر ڈوب مرا اور پرلے کنارے پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے فرعونیوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے تھے۔

متعلقات: اصل آل کی اہل ہے کس لیے کہ اس کی تصغیر اہیل آتی ہے اس کے معنی گھر والے کے ہیں جن کو عرف میں کنبہ کہتے ہیں یا خاندان ہاں اس قدر فرق ہے کہ لفظ آل کا اطلاق اس خاندان پر آتا ہے کہ جن کو دینی یا دنیاوی عزت و شرف حاصل ہو اور کبھی اس لفظ سے مطیع و مطبع بھی مراد ہوا کرتے ہیں اول تقدیر پر آلِ نبی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کنبہ بیٹی نواسے، چچا اور بیبیاں وغیرہم، دوسری تقدیر پر تمام صحابہ مراد ہوتے ہیں اور کبھی یہ لفظ زائد آتا ہے۔ آلِ فلاں میں وہ فلاں ہی مراد ہوا کرتا ہے۔

ہم پیشتر ابتدا سے انتہا تک مختصر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ[1] بیان کرتے ہیں اور تورات اور قرآن کو مدنظر رکھتے ہیں تا کہ ہر واقعہ خوب بہ ترتیب وقوع سمجھ میں آ جائے۔

تاریخ بنی اسرائیل: موسیٰ مصر میں عمران کے گھر میں (جو قہات کا بیٹا لاوی بن یعقوب علیہ السلام کا پوتا تھا) حضرت مسیح علیہ السلام سے تخمیناً پندرہ سو اکہتر برس پیشتر منوچہر شاہِ ایران کے زمانہ میں پیدا ہوئے اس زمانے میں فرعون نے بنی اسرائیل پر سختیاں کر رکھی تھیں بڑے سخت کام لیتا اور بیگار میں رکھتا تھا اور یہ عام حکم تھا کہ جوان کے خاندان میں بیٹا پیدا ہو اس کو قتل کر ڈالو لڑکی کو جیتی رہنے دو کیونکہ اس کو بنی اسرائیل کی کثرت سے خوف تھا یہ ان کو مٹانا چاہتا تھا یہ لوگ اپنی مصیبت پر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آہ و زاری کرتے اور درد سے روتے تھے مگر اس موذی کو رحم نہ آتا تھا لیکن خدائے ارحم الراحمین کو رحم آیا۔ اس نے اس کے پنجے سے چھڑانے کے لیے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا جب یہ پیدا ہوئے تو کئی مہینے تک ان کی والدہ ماجدہ نے ان کو چھپا کر رکھا جب دیکھا کہ راز فاش ہوا جاتا ہے کوئی دم فرعونی جلاد آتے اور اس معصوم بچے کو ذبح کرتے ہیں تو باالہامِ الٰہی یہ تدبیر سوچی اس کو کسی صندوق میں کہ جس میں پانی اثر نہ کرے ڈال کر دریائے نیل میں چھوڑ دیجئے۔ جہاں اس کی تقدیر ہو گی چلا جائے گا پس ایک صندوق میں چوطرفہ رال لگا کر اور خوب مضبوط کر کے اس چاند سی صورت کو چھپا دیا اور خدا کے نام پر دریا میں ڈال دیا۔ ڈال تو دیا مگر دل کا اللہ ہی مالک تھا۔ زار زار روتی اور یہ کہتی تھی ؎

میروی و میرود جانم بتو
خوش برو فاللہ خیرٌ حافظا

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو بیس سورتوں میں کہیں اجمال اور کہیں تفصیل سے بیان فرمایا ہے سورہ بقر۔ نساء۔ مائدہ۔ انعام۔ اعراف۔ یونس۔ ہود بنی اسرائیل۔ کہف۔ مریم۔ طہٰ۔ مومنین۔ شعرا۔ نمل۔ قصص۔ صافات۔ مومن۔ زخرف۔ دخان۔ نازعات۔ بعض واقعات توریت میں ہیں قرآن نے ان کو بیان نہیں کیا بعض قرآن میں ہیں توریت میں نہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں گو مصنف تورات ابتدا سے انتہا تک بہ ترتیب قصہ لکھتا ہے۔ مگر عادتاً ہر مورخ سے سینکڑوں واقعات اس شخص کے کہ جس کی تاریخ وہ لکھتا ہے رہ جایا کرتے ہیں پس اگر وہ کسی دوسری جگہ ہوں یا ان کو کوئی اور بیان نہ کرے تو وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا اور قرآن کی غرض تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ نصیحت و عبرت مقصود ہے۔ ۱۲ منہ

مگر اپنی بیٹی سے یہ کہہ دیا کہ کنارے کنارے تو بھی دیکھتی جا کہ صندوق کہاں جاتا ہے۔ وہ صندوق کے ساتھ اس طرح جاتی تھی کہ کوئی نہ جانے کہ یہ اسی صندوق کے ساتھ ہے۔ وہ صندوق جب فرعون کے محل کے پاس بہ کر آیا تو اس کی بیوی آسیہ نے کہ جو بڑی خداترس اور پاکباز عورت تھی دیکھا کہ ایک صندوق بہا چلا آتا ہے اس کے ساتھ اس کی بیٹی اور خواصیں بھی تھیں۔ جب اس امرِ عجیب کے دریافت کی طالب ہوئیں حکم دیا کہ صندوق نکالا جاوے۔ نکال کر کھولا گیا تو اس میں کیا دیکھتی ہیں کہ ایک چاند سی صورت کا بچہ بسورر ہا ہے اور ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور انگوٹھے چوستا جاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب کا دل بھر آیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے، وہ دشمنوں کے گھر میں پرورش کراتا ہے۔ فرعون کی بیٹی نے کہا اس کو بیٹا بنا لو اور ابا جان کو بھی اس کی خبر کردو۔ فرعون کی بیوی نے بچہ دکھایا اور اپنا مطلب ظاہر کیا مگر موذی نے کہا غالباً یہ کسی کنعانی کا بچہ ہے ہمارے خوف سے دریا میں ڈال دیا ہے اس کو قتل کر ڈالو۔ فرعون کی بیوی اوپر گر پڑی اور کہا کہ اس کو نہ مارو، اس کو بیٹا بنا لو شاید یہ کسی وقت کام آئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے لیے انا کی تلاش ہوئی۔ دو ایک انائیں آئیں مگر موسیٰ علیہ السلام نے کسی کا بھی دودھ نہ پیا۔ اس کے رونے سے سب بے چین ہو گئے تب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جو فرعون کی بیوی اور بیٹی کے پاس آیا جایا کرتی تھی کہا میں تم کو ایک ایسی انا بتاؤں کہ جو اس کو نہایت دردمندی اور خیر خواہی سے دودھ پلائے اور اپنے گھر میں نہ لے جا کر پرورش کرے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں لا ادھر موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا حال سنئے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی ہر ایک چیز کو دیکھ کر زار زار روتی اور اس کی صورت یاد کر کے دل میں دھواں اٹھتا تھا قریب تھا کہ چیخیں مار مار کر روئے اور یہ راز کھل جائے مگر خدا نے اس کے دل کو صبر دیا اور وعدہ کیا کہ رنج نہ کر ہم اس کو پھر تیرے پاس پہونچاویں گے۔ اتنے میں پھر بیٹی دوڑی آئی کہا اماں جان مبارک ہو بھائی کو فرعون کی بیوی نے بیٹا بنا لیا چلو تم کو دودھ پلانے کو بلاتے ہیں۔ وہ خوشی کے مارے جامہ میں نہ سماتی تھی وہاں جا کر بیٹے کو دیکھ کر دلِ بیتاب قابو سے نکل چلا تھا مگر سنبھالا اور اس کو دودھ پلایا۔ فرعون کی بیوی نے اس کی تنخواہ اور مصارفِ پرورش مقرر کر کے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا پس ایک مدت موسیٰ ایوانِ شاہی میں پرورش پاتے اور شہزادے کہلاتے رہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام خوب جوان ہو گئے تو فرعون کی زیادتیوں اور اپنی قوم کی پریشانی دیکھ کر نہایت غمگین رہتے تھے۔ آخرش ایک روز بازار میں ایک قبطی کسی بنی اسرائیل کو کارِ بیگار پر سخت مار رہا تھا اس نے موسیٰ علیہ السلام کو سامنے سے آتے دیکھ کر پکارا اور دہائی دی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ارے کیوں مارتا ہے۔ اس پر اس نے نہ مانا تو موسیٰ نے اس کو مکا مارا اور وہ اتفاقاً مر گیا۔ موسیٰ اور اس اسرائیلی نے اس کو ریتے میں دبا دیا۔ اگلے روز حسبِ اتفاق جب موسیٰ علیہ السلام بازار میں گئے تو اسی اسرائیلی کو پھر کسی قبطی سے لڑتے دیکھا۔ پھر اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر چلانا اور دہائی دینا شروع کیا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے خفا ہو کر فرمایا کہ تو بڑا بے ہودہ ہے اور اس کے دشمن کو ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ یہ احمق اسرائیلی یہ سمجھ کر کہ مجھے مارتے ہیں موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگا لو صاحب جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکے ہیں آج اسی طرح مجھ کو بھی مارا چاہتے ہیں۔ اے موسیٰ تو بڑا سرکش اور مفسد ہوا چاہتا ہے۔ اس سے وہ راز فاش ہو گیا۔ آخر فرعون کے دربار میں بھی خبر پہونچی کہ لیجیے وہ موسیٰ کہ جس کو تم نے فرزند بنایا ہے آخر اپنی قوم کا حامی بنا اور ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ ہر چند بعض وجوہ سے فرعون پہلے ہی سے موسیٰ علیہ السلام سے بدگمان تھا مگر اب تو جوش میں آ کر قتل کا حکم دے دیا۔ کسی نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس راز سے مطلع کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اول ہی قتل سے ہراساں تھے اب تو بہت ڈر گئے اور مصر سے مشرق کی طرف بھاگ کر چلے گئے۔ بحرِ قلزم کے پاس مدین ایک شہر تھا وہاں پہونچے بھوکے پیاسے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے یہ کہہ رہے تھے کہ الٰہی میں تیرا بندۂ فقیر ہوں کچھ مجھ کو عطا کر۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ دیکھا کہ چرواہے چرس کھینچ کر اپنی بکریوں اور جانوروں کو پانی پلاتے ہیں اور دو لڑکیاں آنکھیں نیچی کئے کھڑی ہیں۔ ان سے موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں پلاتیں۔ وہ بولیں کہ ہمارے والد بوڑھے ہیں ہم سے چرس کھینچ نہیں سکتا۔ جب یہ پلا کر چلے جاتے ہیں تو بچا بچایا پانی ہم بھی اپنی بکریوں کو پلا لیتے ہیں۔ موسیٰ کو رحم آیا۔ بفضلِ الٰہی شہ زور جوان تھے جس ڈول کو کئی شخص مل کر کھینچتے تھے اکیلے نے کھینچ کر ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا اور پھر نیچی نگاہ کر کے درخت کے سایہ

میں آبیٹھے۔ ان لڑکیوں نے جا کر اپنے بوڑھے باپ حضرت شعیب علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کا حال بیان کیا۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کو بھیجا کہ جاؤ اس مسافر کو بلا لاؤ۔ وہ آئی اور نہایت شرم سے یہ کہا کہ چلئے آپ کو ہمارے ابا جان بلاتے ہیں تاکہ آپ کو اس پانی پلانے کا بدلہ دیں۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے اور سب قصہ بیان فرمایا۔ انہوں نے سن کر فرمایا کہ بیٹا کچھ خوف نہ کر تو ظالموں کے پنجہ سے بچ گیا۔ ان میں سے ایک بولی کہ ابا جان آپ ان کو نوکر رکھ لیں۔ کس لیے کہ آپ کو قوی اور امانت دار آدمی درکار ہے۔ شعیب نے (کہ جس کو تیرو[1] بھی کہتے ہیں) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے ایک کا تمہارے ساتھ نکاح کر دوں بشرطیکہ تم ہمارے ہاں آٹھ برس تک رہو اور دس پورے کر دو تو تمہاری مہربانی اور خدا چاہے تو میں تم کو کوئی تکلیف نہ دوں گا۔ تم مجھ کو بہت اچھا پاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بہتر مگر جب میں ان دو مدتوں میں سے کوئی پوری کر دوں تو پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں خدا اس کا گواہ ہے۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کا ان میں سے ایک کے ساتھ کہ جس کا نام صفورا تھا نکاح ہو گیا اور مدتِ مقررہ تک اپنے خسر کی بکریاں چراتے رہے۔ اس عرصہ میں ان کے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا کہ جس کا نام جیرسوم تھا ایک بار موسیٰ علیہ السلام کو وطن کا خیال آیا۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر چلے، سردی کا موسم تھا، شب میں بیوی کو سردی محسوس ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور[2] کی طرف آگ کا شعلہ سا دیکھا۔ موسیٰ نے بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں جا کر آگ لاتا ہوں۔ جب وہاں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک درخت آگ کا شعلہ بن رہا تھا مگر جلتا نہیں۔ اس پر خدائے تعالیٰ کی تجلی تھی وہ درحقیقت آگ نہ تھی۔ جب موسیٰ اس کے پاس آئے تو اس پاک درخت میں سے آواز آئی کہ جو اس آگ کے پاس اور جو اس کے اندر ہے وہ مبارک ہے۔ اے موسیٰ میں اللہ رب العالمین ہوں۔ میں تیرا خدا ہوں۔ تو جوتا اتار دے۔ کس لیے کہ یہ جگہ مقدس ہے (درخت نہیں بولا تھا اور نہ وہ آواز حروف وصوت کے ساتھ تھی دراصل وہاں تجلیِ ذاتی ہو کر اس حالت میں موسیٰ علیہ السلام خدا سے ہم کلام ہوئے) اے موسیٰ میں نے بنی اسرائیل کی آوازِ دردناک سنی اور ان کی آہ وزاری پر مجھ کو رحم آیا تو ان کے پاس جا اور فرعون سے کہہ تو ان کو ان کے ملک میں جانے دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا الٰہی میری کون سنے گا۔ فرعون مجھ کو کب مانے گا۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے۔ عرض کیا میرا عصا ہے جس سے میں بکریاں ہانکتا ہوں اور بہت سے کام لیتا ہوں۔ فرمایا اس کو زمین پر تو ڈال۔ موسیٰ نے ڈال دیا۔ ڈالتے ہی سانپ بن کر پھن پھنانے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام ڈر کے بھاگے۔ خدا نے فرمایا کہ مت ڈر تجھ کو اس سے کچھ خوف نہیں۔ رسول میرے پاس خوف نہیں کھاتے تو اس کو پکڑ لے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ لگایا وہ وہیں عصا بن گیا۔ پھر فرمایا اپنا ہاتھ کرتے کے گریبان میں ڈال کر باہر کو لاؤ وہ باہر لائے تو نہایت سفید[3] اور روشن ہو کر چمکنے لگا۔ کہا پھر اس کو گریبان میں ڈال۔ ڈال کر نکالا تو پھر اصلی حالت پر آ گیا۔ خدا نے فرمایا جا میں نے تجھ کو یہ دو معجزے دیے۔ تو فرعون اور بنی اسرائیل کو دکھائیو تاکہ وہ تیری تصدیق کریں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی مجھ سے ایک فرعونی مارا گیا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھ کو اس کے قصاص میں نہ مار ڈالیں۔ دوم میری زبان میں لکنت ہے میں اچھی طرح بات نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ میرے بھائی کو مقرر کر وہ مجھ سے فصیح ہے۔ خدا نے فرمایا تیرے بھائی کو تیرا قوتِ بازو بنائیں گے اور ہم تم کو غلبہ دیں گے۔ تمہارے پاس کوئی آنے نہیں پائے گا۔ جاؤ تم کو اور تمہارے تابعداروں کو میں غالب کروں گا وہاں سے موسیٰ علیہ السلام چلے۔ رستہ میں ان کے بھائی ہارون علیہ السلام جوان کی پیشوائی کو کھڑے تھے،

---

1. عبرانی محاورہ ہے۔۱۲
2. یہ جگہ کہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام آ کر رہے تھے ملکِ عرب کے شمالی ومغربی کنارے میں واقع ہے کیونکہ ملک عرب ومصر کے بیچ میں بحیرۂ قلزم فاصل ہے اس کے مشرق کی جانب عرب کا پرلا کنارہ ملک مصر سے اور عرب ہی میں ملکِ مدین اور کوہِ طور اور کوہِ حویرب ہے چنانچہ جب مصر سے موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو ادھر سے گزرے تھے۔
3. یدِ بیضا اسی کو کہتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تھا۔۱۲ منہ

ملے۔ بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ دونوں معجزے دکھائے خدا تعالیٰ کا پیغام بشارت التیام سنایا سب سن کر سجدے میں گر پڑے۔ نہایت خوش ہوئے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بڑی کوشش کر کے فرعون کے پاس گئے اور کہا ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغام لائے ہیں، آپ مانیے اور خداوندِ عالم سے ڈر کر راہِ راست پر آیئے اور بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیجئے ان بیکسوں کو تکلیف نہ دیجئے۔ فرعون نے کہا خداوندِ عالم کون ہے؟ میں اس کو نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا وہ ہے کہ جس نے آسمان و زمین ہر چیز کو پیدا کیا۔ فرعون کو تعجب ہوا اور اپنے درباریوں سے کہا ذرا اپنے رسول کی بات تو سنیئے کیا محال بات کہتے ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بلکہ تم سب کا اور تمہارے سب باپ دادوں کا رب ہے۔ یہ سن کر فرعون نے کہا یہ دیوانہ ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا بلکہ مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کا رب ہے۔ اس پر فرعون نے نہایت ناراض ہو کر یہ کہا کہ اگر تو نے میرے سوائے کسی اور کو خدا کہا تو حبسِ دوام کر دوں گا اور درباریوں سے کہا دیکھو میرے سوائے اور بھی کوئی تمہارا خدا ہے۔ اے ہامان پکی اینٹوں کا ایک بڑا اونچا برج بنائیں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں گا کہ وہ ہے کہاں۔ اور میں تو اس کو سرے سے جھوٹا اور جادو کا مارا ہوا ہی جانتا ہوں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کہنے لگا کہ تو وہی ہے نا کہ جو مدت تک میری روٹیاں کھا کر بڑا ہوا اور میرے ہاں رہا اور پھر وہ کام کر کے یہاں سے بھاگا کہ جس کو تو خود جانتا ہے۔ میں تجھ پر ایمان لاؤں اور تیری قوم ہمیشہ سے ہماری غلامی کرتی رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ کیا احسان جتاتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔ خیر اچھا اگر میں آپ کو کوئی معجزہ دکھاؤں تب بھی آپ تصدیق کریں گے۔ اس نے کہا وہ معجزہ کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو ڈال دیا پھر وہ اژدہا بن کر فرعون کی طرف لپکا۔ فرعون اور تمام ارکانِ دولت پریشان ہو کر بھاگنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ لیا پھر وہ عصا ہو گیا۔ فرعون اور اس کے مصاحب پھر بدستور بیٹھے تو موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر نکالا تو آفتاب کی طرح چمکنے لگا۔ پھر ڈالا تو بدستورِ سابق ہو گیا۔ یہ دیکھ کر فرعون نے اپنے اہلکاروں اور امیروں سے مخاطب ہو کر کہا یہ بڑا جادوگر ہے اس حیلہ سے چاہتا ہے کہ تم کو اس ملک سے باہر کر دے تمہاری کیا صلاح ہے۔ انہوں نے کہا آپ بھی اپنے ملک کے بڑے بڑے جادوگروں کو جمع کیجئے اور ایک روز مقرر کر کے مقابلہ کرا دیجئے اور ان کو بھی ایسا ہی کرشمہ دکھا دیجئے۔ تب فرعون نے ہر ایک شہر میں اشتہار بھیج دیا اور جادگروں کو بلایا وہ سب روزِ مقررہ پر جمع ہوئے اور حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام بھی مقابلہ میں آئے اور ایک خلقِ خدا تماشائیوں کی جمع ہوئی۔ جادوگروں نے فرعون سے عرض کیا کہ اگر ہم غالب آجائیں تو آپ ہم کو کیا انعام دیں گے اس نے کہا تم کو اپنا مقرب بناؤں گا۔ تب جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا آپ پہلے کچھ کرشمہ دکھایئے گا یا ہم دکھائیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا پہلے تم ہی کچھ دکھاؤ۔ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں اور جو کچھ اسبابِ طلسم تھا فرعون کا نام لے کر زمین پر ڈال دیا۔ ہر طرف سے سانپ ہی سانپ دکھائی دینے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جھجکے۔ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ کیا دیکھتا ہے تو بھی اپنے عصا کو ڈال دے وہ ڈالتے ہی اژدہا بن گیا[1] اور ان کے سانپوں کو لقمہ کر گیا۔ تمام تماشائی اور فرعون ڈر کے مارے تربتر ہو گئے اور ایک غل مچ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ لیا وہ پھر عصا ہو گیا۔ جادوگروں نے جب دیکھا کہ یہ کام جادو کی طاقت سے بڑھ کر ہے، وہ خدا سے دل میں ڈر گئے اور سجدہ میں زمین پر گر گئے اور کہنے لگے ہم رب العالمین پر کہ جو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا رب ہے ایمان لائے۔ فرعون کو اس معاملہ سے بڑی خجالت ہوئی۔ غصہ میں آکر جادوگروں سے کہا تم میری اجازت سے پیشتر کیوں ایمان لائے؟ بے شک یہ (موسیٰ علیہ السلام) جادو میں تمہارا استاد ہے تم نے باہم اتفاق کر کے یہ مکر بنایا ہے تا کہ یہاں کے باشندوں کو باہر

[1] رسیوں اور عصا کا سانپ بن جانا خلافِ عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ہزار ہا اسرارِ قدرت ایسے ہیں کہ جن کے اسبابِ خفیہ تک عقولِ عام کو رسائی نہیں۔ اس لیے حیرت خیز معلوم ہوتے ہیں انکار کی کوئی بات نہیں۔ لطف یہ ہے کہ جیسا ساحروں کا فعل تھا اُن کے مقابلہ میں اسی قسم کا مگر اُن سے بڑھ کر قوتِ روحانیہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کام کیا اور یہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کی غرض سے تھا۔ ۱۲ منہ

نکال دو اب دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ تمہارا ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پاؤں کاٹ کر درختوں پر لٹکاتا ہوں تا کہ تم کو معلوم ہو کہ ہم میں سے کون زیادہ اور دائمی عذاب کر سکتا ہے وہ بولے کچھ پروا نہیں۔ آخر ہم کو اس کے پاس جانا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس وجہ سے کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے گناہ معاف کر دے گا اور ہم تجھ کو اس سے کہ جس نے تم کو پیدا کیا اور جس نے ہم کو اپنی نشانیاں دکھائیں عزیز نہیں جانتے ہیں۔ فرعون نے ان ایمان داروں کو بڑی تکلیف سے قتل کیا مگر وہ بڑی ثابت قدمی سے قائم رہے اور یہ دعا کرتے تھے الٰہی ہم کو صبر دے اور ایمان سے ہمارا خاتمہ کیجیو۔ اس کے بعد فرعون نے غصہ میں آکر اور بھی بنی اسرائیل کو تکلیفیں دینی شروع کیں۔ پہلے تو اینٹوں کے لیے بھس بھی ملتا تھا اب تو یہ بھی موقوف کیا اور کہا جاؤ تم خود کہیں سے بھس تلاش کر کے لاؤ اور اسی قدر اینٹیں بنا کر دو۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ! ہم کو تو تیرے آنے سے پیشتر ہی بہت کچھ ایذائیں دی جاتی تھیں اب تو اور بھی مصیبت میں پڑ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صبر کرو، ملک اللہ کا ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور انجام کار خدا ترس فلاح پاتے ہیں۔ عنقریب تمہارا رب تم کو وہ زمین عطا کرے گا کہ جس میں برکت ہے اور طرح طرح کے میوے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر فرعون سے کہا کہ دیکھ بنی اسرائیل کو جانے دے اور ان کو تکلیف نہ دے ورنہ خدا تعالیٰ مصر کے پانی کو خون کر دے گا تو اور تیری رعیت بڑی تکلیف پاوے گی۔ اس نے نہ مانا اور موسیٰ علیہ السلام نے ہارون سے فرمایا کہ دریائے نیل پر اور ہر ایک نہر اور تالاب پر عصا مار انہوں نے مارا تو وہ سب پانی خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور سات روز تک یہی تکلیف رہی مگر اس سنگدل پر اثر نہ ہوا اور اس کے بعد پھر بحکمِ خدا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پیغام بھیجا کہ دیکھ اب بھی بنی اسرائیل کو چھوڑ دے خدا پر ایمان لاؤ ورنہ خدا مینڈکوں کی مصیبت تم پر بھیجے گا اس نے اس کو بھی نہ مانا تو موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام سے کہا کہ دریا اور نہروں اور تالابوں پر اپنا عصا مار۔ انہوں نے مارا تو بیشمار مینڈک چڑھ آئے اور مصر کی زمین چھپا دی۔ کھانے، پانی، بستر پر ہر جگہ مینڈک ہی مینڈک دکھائی دیتے تھے۔ فرعون نے تنگ ہو کر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بلا کر منت کی کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اس بلا کو دفع کرے اگر ایسا ہوا تو میں بنی اسرائیل کو جانے دوں گا اور خدا پر ایمان لاؤں گا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی وہ سب مر گئے اور ان کے تودے لگا دیے گئے اور زمین سڑ گئی۔ جب فرعون کو مہلت ملی تو پھر برگشتہ ہو گیا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ خدا ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنا عصا زمین پر مار۔ انہوں نے مارا تمام جگہ جوئیں ہی جوئیں ہو گئیں۔ سب لوگ عاجز آگئے مگر اس سنگدل نے پھر بھی نہ مانا۔ پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ کل صبح فرعون دریا پر آئے گا تو رستہ میں اس سے مل کر یہ کہہ کہ خدا فرماتا ہے میرے بندوں کو چھوڑ دے ورنہ میں تیرے ملک پر مچھروں کو مسلط کروں گا اور سوائے زمینِ جشن کے کہ جہاں بنی اسرائیل رہتے ہیں سب تکلیف پائیں گے۔ اس نے نہ مانا اور خدا نے یوں کیا جس سے فرعون اور اس کے گھر والے اور تمام اہلِ مصر چیخ اٹھے۔ تب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بلا کر کہا کہ اچھا باہر جا کر کیا کرو گے جس لیے تم باہر جانا چاہتے ہو یعنی قربانی سو تم اپنے خدا کے لیے یہیں کر لو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ نہیں ہو سکتا کس لیے کہ اہلِ مصر گائے اور بیل کو پوجتے ہیں اگر ہم اسی جگہ ان کی اپنے خدا کے لیے قربانی کریں گے تو وہ ہم پر پتھراؤ کر ڈالیں گے ہم تین دن کی راہ بیابان میں جا کر جس طرح خدا فرماتا ہے قربانی کریں گے۔ تب فرعون نے کہا اچھا یوں ہی سہی مگر بہت دور نہ جانا اور میرے لیے اپنے خدا سے دعا کرو کہ وہ اس بلا کو ٹالے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی وہ سب دفع ہو گئے۔ فرعون مہلت پا کر پھر پھر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی پھر فرعون سے درخواست کی اور کہا اگر نہ مانے گا تو خدا تعالیٰ تمہارے مواشی میں موت بھیجے گا چنانچہ اس نے نہ مانا تو خدا نے ایسی مری بھیجی کہ مصریوں کے تمام جانور مر گئے۔ گھوڑا، گدھا، اونٹ، بیل، کچھ نہ بچا، مگر بنی اسرائیل کا ایک جانور بھی نہ مرا، اس پر بھی فرعون نہ مانا پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بھٹی کی تھوڑی سی راکھ لے کر آسمان کی طرف اڑا دو۔ انہوں نے اڑا دی جس سے ملک مصر میں تمام آدمیوں اور جانوروں کے بدن پر پھوڑے پھنسیاں اس کثرت سے پیدا ہوئیں کہ الامان، مگر پھر بھی فرعون نے نہ مانا۔ پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ

فرعون سے جا کر کہہ کہ وہ تجھے رستہ میں ملے گا کہ بنی اسرائیل کا خدا تجھ کو فرماتا ہے تو ایمان لا اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دے ورنہ میں سخت وبا بھیجوں گا تو اب تک اپنے تکبر سے باز نہیں آتا۔ دیکھ کل میں بڑے بڑے اولے برساؤں گا کہ آج تک ابتدائے مصر سے کبھی نہیں برسے۔ اے موسیٰ! تو اپنے لوگوں کو خبر کر دے میدان میں جو کچھ ان کا مال اور جانور ہیں ان کو گھر میں لے آئیں پس وہ لائے اور فرعون کے نوکروں میں سے جو خدا سے ڈرتے تھے وہ بھی لائے پھر موسیٰ علیہ السلام نے بحکم الٰہی اپنا عصا آسمان کی طرف اٹھایا تو ابر نمودار ہوا اور ہیبت ناک کڑک اور بجلی نمودار ہوئی اور ایسے بڑے بڑے اولے پڑے کہ جس سے چرند پرند، انسان، حیوان، درخت اور کھیتی سب کا ستیاناس ہو گیا مگر جشن میں اولے نہ پڑے تب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بلا کر کہا بیشک میں نے گناہ کیا، خدا عادل ہے تم دعا کرو کہ پھر اس طرح نہ گرجے نہ اولے برسیں تب میں تمہیں جانے دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی وہ بلا دفع ہو گئی۔ مگر فرعون سرکش ہو گیا۔ پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون کو کہہ کہ دیکھ اب بھی باز آ اور میرے بندوں کو جانے دے اور میرے آگے عاجزی کر ورنہ میں تمام مملکتِ مصر میں ٹڈیاں بھیجوں گا کہ جو کچھ اولوں سے باقی رہ گیا ہے اس کو بھی چاٹ جائیں گی۔ جب وہ یہ کہہ کر وہاں سے نکلے تو قَالَ رَجُلٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ، فرعون کی قوم اور نوکروں میں سے بعض لوگوں نے فرعون کو سمجھایا کہ جانے دیجئے دیکھئے مصر اجڑ گیا بالخصوص ایک دیندار نے کہ جو اپنا ایمان مخفی رکھتا تھا یہ کہا کہ تم ایسے شخص کو (کہ جس کے بہت سے معجزات دیکھ چکے ہو اس گناہ پر) قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خدا کو اپنا رب کہتا ہے۔ صاحبو! اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا وبال اس پر پڑے گا ورنہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بلا تم پر نازل ہو گی اور آج تم کو خدا نے ملک اور زور دے رکھا ہے۔ اگر تم پر کوئی عذابِ الٰہی نازل ہو گیا تو مجھ کو کوئی اس کا رفع کرنے والا بھی نہیں دکھائی دیتا۔ فرعون نے کہا کہ جو کچھ میری رائے میں آتا ہے وہی صواب ہے اور میں تم کو بھلائی کا راستہ بتاتا ہوں اس دیندار نے کہا کہ مجھ کو تو اس قوم کی بربادی دکھلائی دے رہی ہے جس طرح کہ عاد و ثمود اور قومِ نوح وغیرہم تباہ و برباد ہو گئے تم بھی برباد ہو گے اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا اور مجھ کو ایک شدنی بربادی کا خوف ہے جس دن کہ تم پس پا ہو کر بھاگو گے پھر کوئی خدا کے ہاتھ سے بچانے والا نہیں اور تمہاری سمجھ میں میری نصیحت نہیں آتی کس لیے کہ جن کو خدا برباد کرنا چاہتا ہے تو پھر ان کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح فرعون کی بیوی بھی دیندار فرعون کی حرکات سے نالاں تھی آخر اس نے یہ دعا کی کہ الٰہی مجھ کو فرعون اور اس کی تکلیف سے نجات دے اور اپنے پاس بلا کر جنت میں رکھ، چنانچہ خدا نے اس کی دعا قبول کی۔ القصہ فرعون نے کہا کہ اچھا مرد چلے جائیں اور جا کر قربانیاں کریں اور سب کچھ یہیں رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یوں نہیں بلکہ سب کچھ لے کر جائیں گے۔ اس پر فرعون خفا ہوا اور دھکے دے کر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو دربار سے نکلوا دیا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ خدا اپنا عصا اٹھایا تو خدا نے تمام دن اور تمام رات پُروا آندھی چلائی۔ اگلے روز صبح ہوتے ہی بیشمار ٹڈیاں آئیں اور تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا اور تمام ملکِ مصر میں کسی درخت پر اور میدان کی گھاس میں سبزی نہ چھوڑی۔ تب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو جلد بلایا اور کہا میں تمہارے خدا کا اور تمہارا گناہ گار ہوں سو میں نیت کرتا ہوں کہ اس مرتبہ میرا گناہ بخشوا دو اور اپنے خدا سے دعا کرو کہ اس بلا سے نجات دے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور تمام ملک میں ایک ٹڈی نہ رہی لیکن فرعون پھر سرکش ہو گیا۔ پھر خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف لمبا کر تا کہ ملکِ مصر میں تاریکی ہو ایسی تاریکی کہ ایک کو دوسرا نظر نہ آئے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کیا اور تین روز تک روئے زمین پر سخت اندھیرا رہا تب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بلا کر کہا کہ تم اور تمہارے بچے جاویں اور گلے اور گائے بھینسیں سب یہیں رہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ منظور نہیں بلکہ ایک جانور بھی نہ چھوڑا جائے گا۔ اس پر فرعون بہت خفا ہوا اور کہا میرے سامنے سے چلا جا پھر کبھی مجھے منہ نہ دکھانا ورنہ مارا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا بہتر اب میں تیرا منہ نہ دیکھوں گا۔

پھر خدا تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہ العالمین آپ نے تو فرعون اور اس کی قوم کو وہ مال اور زینت دنیا میں دے رکھی ہے کہ جس

سے وہ اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ الٰہی ان کے مال کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں پر سخت صدمہ پہنچا۔ یہ بغیر اس بات کے کہ کوئی عذابِ الیم دیکھیں ہرگز ایمان نہ لاویں گے خدا نے فرمایا تمہاری دعا مقبول ہوئی۔ اس نے بہت سے معجزے دیکھے اور ایمان نہ لایا دیکھو میں اب ان پر ایک ایسی بلا نازل کرتا ہوں کہ جس سے کلیجہ تھام کر رہ جائیں اور اس کے بعد خود بخود تمہیں یہاں سے نکالیں مگر تم اس مہینے کی دسویں تاریخ اپنے گھروں کو قبلہ[1] بناؤ اور فی گھر ایک بکرا بے عیب لے کر چودھویں تک رکھ چھوڑ اور شام کو اس کو ذبح کر کے خدا کے نام پر بھون کر کھا جانا۔ یہ تمہاری عبادت اور عید فسح ہے اور اس بکرے کے خون سے دروازوں پر نشان کر دیجئو اور اس سے پیشتر ہر ایک شخص اور ہر ایک عورت اپنے ہمسایہ سے چاندی اور سونے کے برتن اور زیور عاریتاً لیوے اور میں مصریوں کی آنکھوں میں تمہیں عزیز کروں گا۔ وہ تمہیں دیویں گی پس اس رات کو خدا تعالیٰ کا فرشتہ مصر میں گزرے گا جس کا گھر قبلہ نہ ہو گا یعنی عید فسح کا نشان خون نہ ہو گا اس گھر میں ہر ایک انسان اور حیوان کا پہلوٹھا مرے گا۔ چنانچہ سب بنی اسرائیل نے ایسا کیا اور آدھی رات کو خدا کا فرشتہ ملک الموت مصر میں آیا جس سے امیر سے لے کر فقیر اور انسان سے لے کر حیوان تک سب کا پہلا بچہ مر گیا اور مصر میں گھر گھر ایک سخت ماتم برپا ہو گیا کہ نہ ایسا کبھی ہوا تھا اور نہ ہو گا۔ تب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو رات ہی کو بلایا اور کہا کہ اٹھو اور میرے لوگوں میں سے نکل جاؤ اور تمام بنی اسرائیل جائیں اور اپنے گلہ اور مویشی بھی لے جائیں اور اپنے خدا کی قربانیاں کریں اور میرے لیے بھی برکت چاہیں۔ یہ سمجھ کر کہ اگر یہ یہاں سے نہ جاویں گے تو ہم سب مر جاویں گے۔ ان لوگوں کے نکالنے میں بڑی سختی کرتے تھے اس لیے ان لوگوں نے آٹا گندھا ہوا پیشتر اس سے کہ وہ خمیر ہو آٹے کو لگنوں سمیت کپڑوں میں باندھ کر اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔

فصل ۲: اور یوسف علیہ السلام کی ہڈیوں کو ساتھ لیا کیونکہ انہوں نے تاکید کر دی تھی کہ میری ہڈیوں کو بھی ساتھ لے جانا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کی اسی اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کی تراسی برس کی عمر ہے پس بنی اسرائیل نے رعمیس[2] سے سکات تک اول منزل کی اور سیدھا رستہ فلسطین کا کہ جو شرق و شمال کی طرف سے تھا چھوڑ دیا اور قلزم کی طرف مشرق کے رخ بیابانوں میں پڑ گئے۔ بنی اسرائیل مرد و زن کئی لاکھ آدمی تھے۔ پھر سکات سے روانہ ہوئے اور ایتام میں اتر پڑے اور وہاں سے کوچ کر کے فی الحیرت میں بعل صفون کے مقابل کہ جو بحرِ قلزم پر واقع تھا مقام کیا۔ اس میں شاہ مصر کو خبر دی گئی کہ وہ لوگ بھاگ گئے تب اس نے اپنی گاڑیاں جوتیں جو چھ سو تھیں اور مصر کی عمدہ گاڑیاں لیں اور ان پر سرداروں کو بٹھایا اور لشکر پیادہ و سوار بیشمار لے کر ان کے پیچھے دوڑا اور بنی اسرائیل کو خیمے کھڑے کرتے ہوئے جا لیا۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا تو بڑے ہراساں ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو وہاں سے ہم کو بیابان میں مرنے کے لیے لایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا خوف نہ کرو خدا تمہارے ساتھ ہے۔ تب خداوند نے کہا اے موسیٰ تو کیوں میرے آگے نالہ کرتا ہے؟ بنی اسرائیل سے کہہ کہ وہ آگے چلیں تو اپنا عصا اٹھا اور دریا پر مار اور اس کو دو حصہ کر بنی اسرائیل دریا کے بیچوں بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر جاویں گے اور فرعون کے لشکر اور بنی اسرائیل میں خدا نے ایک بدلی بھیجی کہ جس سے اندھیری ہو گئی ایک لشکر دوسرے کے نزدیک نہ آیا اور موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ خدا نے فرمایا تھا، کیا دریائے قلزم کے دو حصے ہو گئے اور بنی اسرائیل دریائے قلزم کے بیچ سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے اور پانی کی ان کے بائیں

---

[1] وَجَعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اس کے یہی معنی کرتے ہیں کہ بکروں کے خون سے دروازوں کو رنگ دو۔ جیسا کہ توارت میں ہے۔ اس تقدیر پر قبلہ کے معنی علامت کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اپنے گھر کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے قائم کرو تا کہ خدا پرستوں کی جماعت کی یکجہتی معلوم ہو بعض کہتے ہیں اس تاریخ اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لو کس لیے کہ باہر نکل کر مجتمع ہو کر عبادت کرنے میں فرعونیوں کے حملہ کا اندیشہ ہے۔ واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ

[2] یہ قدیم شہر تھا کہ جہاں بنی اسرائیل اور فرعون رہتے تھے آج کل یہ برباد ہے کچھ نشان باقی ہیں۔ ۱۲ منہ

اور دائیں بڑی دیوار تھی اور فرعون اور اس کا لشکر پیادہ اور سوار پیچھا کئے ہوئے دریا کے بیچوں بیچ تک آئے اور خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ پھر دریا پر اپنا عصا مار انہوں نے مارا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور پانی نے سب کو چھپا لیا اور سب ڈوب مرے (تورات) (ڈوبتے میں فرعون نے کہا میں خدائے بنی اسرائیل پر ایمان لایا۔ فرشتہ نے کہا اب ایمان لاتا ہے) فرعون اور اس کے لشکر کی لاش بحرِ قلزم کے کنارہ پر بنی اسرائیل نے دیکھی۔

واضح ہو کہ ملکِ مصر اور عرب کے بیچ میں سمندر کی ایک شاخ سی ہے جس کو بحیرہ قلزم کہتے ہیں اس کے مشرق کی طرف جو ملک ہے اس کو عرب کہتے ہیں اور جو مغرب کی طرف ہے اس کو مصر وافریقہ کہتے ہیں۔ یہ شاخ شمال کی طرف دور تک چلی گئی ہے۔ جدہ اور مکلہ اور ینبوع وغیرہ بندر اسی مشرقی کنارہ پر ہیں آخر جا کر پھر اسی کی دو شاخیں ہوگئی ہیں ایک مغرب کی طرف جھک گئی ہے اور وہ لمبی ہے اور اس کے آخر پر سویز اور اسکندریہ وغیرہ شہر آباد ہیں دوسری شاخ مشرق کی طرف مائل ہے وہ چھوٹی ہے بڑی شاخ کو کھود کر شمال کی طرف جو ایک اور سمندر ہے جس کو بحرِ روم کہتے ہیں اس میں ملا دیا گیا ہے اس کو نہرِ سوئز کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل اگر شمال کی طرف سیدھے جا کر پھر گوشۂ مشرق وشمال کی طرف ہو لیتے تو قلزم رستہ میں نہ ملتا اور مہینہ دو مہینہ میں ملک کنعان میں پہنچ جاتے۔ مگر خدا کو تو کوہ طور پر اپنا جلوہ دکھانا اور تورات دینا منظور تھا اس لیے بنی اسرائیل نے اس طرف رخ کیا۔ القصہ بنی اسرائیل قلزم کو عبور کر کے اس بیابان میں پڑ گئے کہ جو مثلث کے طور پر آپ کو نقشہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اس میں حوریب اور طورِ سینا پہاڑ ہیں اور یہ جنگل لق ودق بیابان تھا۔ پس قلزم سے کوچ کر کے تین دن تک سور کے میدان میں چلے اور پانی نہ ملا اور جب وہ مارہ میں آئے تو وہاں کا پانی تلخ تھا۔ اس کو پی نہ سکے سب مضطر ہو گئے۔ تب خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک درخت بتایا کہ اس کو پانی میں ڈال دے یہ شیریں ہو جائے گا۔ چنانچہ شیریں ہو گیا اور ایک قوم کو بت پرستی کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا جس طرح ان کے معبود ہیں ہمارے لیے بھی بنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خفا ہو کر فرمایا تم بڑے نادان ہو پھر وہاں سے کوچ کر کے ایلیم میں آئے جہاں پانی کے بارہ چشمے اور ستر درخت کھجور کے تھے پھر وہ وہاں سے روانہ ہو کر خروج سے دوسرے مہینے کی پندرہویں تاریخ کو سین کے بیابان میں آئے اور بنی اسرائیل بھوک کے مارے چلائے کہ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ ہم مصر ہی میں مارے جاتے جہاں گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور من بھر کے روٹیاں کھاتے تھے۔ تب خدا تعالیٰ نے بٹیریں بھیجیں کہ جن کو سلویٰ کہتے ہیں وہ ان کے خیموں کے پاس بیشمار آ پڑیں اور صبح کو اوس پڑی جس سے گول گول سفید برف کی مانند چھوٹے دانے پڑے ہوئے نظر آئے کہ جو کھانے میں نہایت شیریں تھے کہ جن کو من کہتے ہیں پس خدا نے فرمایا کہ یہ تمہارے لیے روٹیاں ہیں اور وہ گوشت، ہر شخص اپنے لیے ہر روز کی خوراک جمع کرے اور جمعہ کو دو دن کی کیونکہ ہفتہ کے روز کہ جس کو سبت کہتے ہیں کوئی نہ جمع کرے اس دن کی تعظیم واجب جانے مگر بنی اسرائیل نے نہ مانا۔ اس پر خدا ناراض ہوا۔ یہ من وسلویٰ بنی اسرائیل چالیس برس تک کہ جب تک ملک کنعان میں نہ بسے کھاتے رہے اور خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک مرتبان میں کچھ من بھر کر ایک صندوق میں رکھ چھوڑے تاکہ پچھلی نسلوں کے لیے یادگار رہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے رفیدیم میں ڈیرا کیا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ تو نے ہمیں لا کر کیوں خراب کیا؟ تب موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے فریاد کی خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ حوریب پہاڑ کی ایک چٹان پر اپنا عصا مار چنانچہ سب لوگوں کے روبرو اپنا عصا اس پر مارا تو بارہ چشمے بہ تعداد اسباط بنی اسرائیل اس سے بہ نکلے۔ اسی جگہ قومِ عمالیق[1] بنی اسرائیل پر چڑھ آئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بحکمِ خدا یوشع کو حکم دیا کہ تو بنی اسرائیل کے مردانِ جنگی کو لے کر مقابلہ میں جا اور خود ہارون اور حور کو لے کر دعا کرنے کو پہاڑ پر

[1] عمالیق انفر کا بیٹا اور عیص کا پوتا تھا اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا پڑپوتا ہے اور حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ عمالیق اور دیگر اولادِ ابراہیم ملک کنعان اور اس کے اطراف میں بڑے شہ زور تھے۔ عمالیق کی نسل بھی بڑی جنگجو تھی جن کو عمالقہ کہتے ہیں۔

چڑھے۔ جب تک دعا میں ہاتھ اٹھے رہتے تھے تو فتح پاتے تھے اور جب لٹکا دیتے تھے تو عمالیق غالب ہو جاتے تھے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ بھاری ہو گئے آخر بنی اسرائیل نے فتح پائی اور موسیٰ علیہ السلام نے وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔ موسیٰ علیہ السلام کے سسرے تیرو کو کہ جن کو شعیب اور عوامل بھی کہتے تھے یہ خبر ملی تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی بیوی صفورا اور دونوں بیٹوں جیرسوم اور الیعذر کو ساتھ لے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔ موسیٰ علیہ السلام استقبال کو گئے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو صلاح دی کہ تم جو دن بھر آپ بنی اسرائیل کی عدالت کرتے ہو، تھک جاؤ گے، کس لیے اپنے نائب مقرر نہیں کر دیتے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے ویسا ہی کیا۔ تب موسیٰ علیہ السلام کے سسرے چلے گئے۔ پھر خروج سے تیسرے مہینہ میں بنی اسرائیل سینا کے بیابان میں آئے جہاں کہ کوہ طور ہے کہ جس کو کوہ سینا اور طورسین بھی کہتے ہیں اور پہاڑ کے آگے خیمہ کھڑا کیا گیا اور موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر بلائے گئے وہاں خدا نے ان سے کلام کیا کہ تو بنی اسرائیل سے کہیو کہ تم نے دیکھا کہ میں تم کو کس طرح ظالم کے پنجے سے نکال لایا اور میں نے مصریوں کے ساتھ کیا کیا۔ اگر تم میرے حکموں کو مانو گے اور میرے عہد پر ثابت رہو گے تو میں تمہیں برکت دوں گا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے آ کر یوں ہی لوگوں سے کہا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ہم عیاناً خدا کو نہیں دیکھیں گے کبھی اس بات پر ایمان نہ لاویں گے۔ تب خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ دو روز تک نہائیں دھوئیں، پاک صاف بنیں، تیسرے روز میں کوہِ طور پر تجلی کروں گا مگر کوئی شخص پہاڑ پر نہ چڑھے ورنہ ہلاک ہو جائے گا۔ تیسرے روز پہاڑ پر کالی گھٹا اُمڈی اور اس زور شور سے کڑک ہوئی اور بجلی آئی کہ سینکڑوں دم فنا ہو گئے اور جلالِ الٰہی شعلہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ لوگوں نے ڈر کر عاجزی کی کہ اے موسیٰ! تو جو کچھ خدا کے احکام لاوے گا ہم مانیں گے خدا نے ان مردوں یا بے ہوشوں کو زندہ یا ہوشیار کر دیا۔ اپنا فضل کیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر گئے خدا نے فرمایا کہ دیکھ میں تجھ کو یہ دس احکام دیتا ہوں: (۱) کسی جاندار کی صورت نہ بنانا، نہ اس کو سجدہ کرنا (۲) خدا کے نام کی تعظیم کرو بے فائدہ نام نہ لو۔ (۳) سبت کے دن کی تعظیم کرنا، چھ روز کام کرنا مگر ساتویں روز کوئی کام نہ کرنا۔ (۴) ماں باپ کی تعظیم کرنا (۵) خون نہ کرنا (۶) زنا نہ کرنا (۷) چوری نہ کرنا (۸) اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی نہ دینا (۹) اپنے ہمسایہ کے گھر کا لالچ نہ کرنا (۱۰) اپنے ہمسایہ کی جورو اور اس کی لونڈی اور اس کے مواشی اور دیگر چیز کا لالچ نہ کرنا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے احکامِ عبادت وسیاست دے کر موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے بھیجا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ پہاڑ پر ستر آدمی لے کر آوے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام ہارون اور ندب اور ابیہو وغیرہ ستر بزرگ اسرائیلی کو خدا تعالیٰ کے ملانے کو پہاڑ پر گئے اور وہاں پر انہوں نے تجلیِ الٰہی کو ملاحظہ کیا جس سے ان کا دل یقین اور ایمان سے منور زیادہ ہو گیا اور بنی اسرائیل سے آ کر انہوں نے بیان کیا اور خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور تیس رات یہاں آ کر گزار ہم تجھ کو تورات عنایت کریں گے۔ تب موسیٰ علیہ السلام وہاں گئے اور ہارون کو کہہ گئے کہ میرے بعد میری طرف سے نیابتاً سب کام کیجیو۔ وہاں جا کر موسیٰ علیہ السلام کو چالیس رات رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس چالیس روز میں جب تمام ظلماتِ ہیولانی دور ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دیدار کا سوال کیا تو خدا نے فرمایا مجھے تو ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ میں اس پہاڑ پر اپنی تجلی کرتا ہوں اگر وہ قائم رہا تو تو مجھ کو دیکھے گا۔ پھر جب خدا نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو کہا الٰہی توبہ تو پاک ہے اور سب سے پہلے میں تجھ پر ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے لوحیں ملیں کہ جن میں احکامِ الٰہی تھے یا خاص احکامِ عشرہ یا اور بھی اور اس کے ساتھ جانوروں کی حلت اور حرمت اور قربانی کے دستورات اور ہارون کے لیے امامت اور لباس کے قیودات اور سونے کے چمچے وغیرہ لوازمات کا تیار کرنا اور دیگر احکامات عطا ہوئے اور یہ مجموعہ ایک کتابِ الٰہی تھی کہ جس کو تورات کہتے ہیں دراصل یہی تورات تھی اور اب جو کچھ ہے وہ کسی مؤرخ کی تاریخ معلوم ہوتی ہے جس میں بعض باتیں غلطی سے خلافِ عقل ونقل بھی مندرج ہیں یہ نہیں معلوم کہ تورات کا ہے پر لکھی ہوئی تھی کچھ تعجب نہیں کہ کپڑے یا کسی اور چیز کاغذ وغیرہ نرم چیز پر تھی کہ جس کو تہ کر کے صندوقِ شہادت میں رکھ دیا تھا والعلم عند اللہ۔ ادھر تو پہاڑ پر موسیٰ علیہ السلام کو یہ کچھ ملا ادھر ایک شخص نے کہ

جس کا نام سامری تھا، لوگوں سے سونے کا زیور مانگ کر ایک بچھڑا ڈھالا اور چونکہ مصر کے لوگ بیل اور بلی وغیرہ جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور اس کو اپنی زبان میں ایبس کہتے تھے اس خیال سے بنی اسرائیل بھی اس بچھڑے کو پوجنے لگے۔ جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں گانے بجانے کا جو بچھڑے کے آگے گایا جا رہا تھا، غل وشور تھا یہ دیکھ کر غصہ میں آگ ہو گئے اور لوحیں ڈال دیں اور ہارون کی ڈاڑھی پکڑ لی اور کہا تم نے یہ کیا خرابی کی ان کو کیوں منع نہ کیا۔ ہارون نے عذر کیا کہ یہ ساری بدعت سامری بد بخت کی ہے اور مین کچھ بولتا تو لوگ مجھے مار ڈالتے۔ جب غصہ فرو ہوا تو ان لوحوں کو لیا اور بچھڑے کو ریتوا کر دریا مین پھینکوا دیا اور خدا کی طرف سے یہ توبہ ان کے لیے مقرر ہوئی کہ باہم ایک دوسرے کو قتل کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور پھر موسیٰ علیہ السلام کا دل بھر آیا۔ خدا کے پاس پہاڑ پر جا کر دعا کی کہ معاف کرے اس کے بعد سخت وبا بنی اسرائیل پر آئی جس سے صدہا مر گئے اس کے بعد ایک بڑا خیمہ اور اس کے سامان تیار ہوئے دوسرے سال کے اول مہینے مین۔ پھر وہاں سے بنی اسرائیل نے کوچ کیا۔ دن کو ایک بادل سایہ کرتا اور رات کو وہ روشنی بن جاتا تھا۔ دوسرے برس کے دوسرے مہینے کی بیسیوین تاریخ بدلی مسکنِ شہادت سے اٹھی تو بنی اسرائیل نے بیابانِ سینا سے کوچ کر کے دشت فاران میں مقام کیا اور وہین بدلی جا کر ٹھہر گئی اور کوہ سینا سے تین دن کی راہ دور جا پڑے وہاں جا کر بنی اسرائیل نے اپنے اپنے خیموں میں رونا شروع کیا کہ ہم سے ایک کھانے یعنی من پر صبر نہیں ہو سکتا ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور خربوزے اور وہ گندنا اور پیاز و لہسن وغیرہ اے موسیٰ خدا سے کہہ کر ہم کو ترکاریاں اور گیہوں اور کھیرے اور لکڑیاں و دال پیاز دلوا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نہایت غصہ اور غمگین ہو کر خدا سے کہنے لگے کہ تو اپنے بندہ کو کیوں دکھ دے رہا ہے؟ اور تو نے کیوں مجھ پر مہربانی نہ کی کہ جوان سب کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا کیا یہ سب لوگ میرے پیٹ میں پڑے تھے یا میں ان کا باپ ہوں۔ تب خدا نے فرمایا ان سے کہہ دے آگے کسی شہر میں چلو تم کو سب کچھ ملے گا اور کل تم کو گوشت ملے گا۔ تب خدا کی طرف سے ایک ہوا اٹھی اور دریا سے بٹیریں اس قدر اڑا لائی کہ خیمے کے اردگرد ایک دن کی راہ تک ڈھیر لگ گیا۔ پس وہ گوشت کھا ہی رہے تھے کہ خدا کا غصہ ان پر بھڑکا اور ان کو بڑی مری سے مارا اور اس مقام کا نام اسی لیے قبرات التہاوا رکھا گیا پھر وہ وہاں سے کوچ کر کے حصیرات میں آئے اس جگہ پر کچھ لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے گلے شکوے کر کے ان کو ایذا دی فبراہ اللہ مما قالوا لیکن خدا نے ان کو ان کے الزام سے بری کر دیا۔ پھر دشتِ فاران سے موسیٰ علیہ السلام نے ملک کنعان کی جاسوسی کے لیے ہر ایک قوم بنی اسرائیل سے ایک آدمی تیار کیا وبعث اثناعشر نقیباً اور بارہ شخصوں کو روانہ کیا جس میں کالب اور یوشع بن نون تھے یہ قادس کے میدان سے روانہ ہو کر ملک کنعان میں آئے اور وہاں کے سب احوال دریافت کر کے اور انگور وغیرہ میوہ جات لے کر چالیس روز بعد پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا اور اس زمین کی بڑی خوبی بیان کی مگر سوائے کالب اور یوشع کے سب نے یہ کہا کہ وہاں کے باشندے قد آور اور جنگجو ہیں ان سے مقابلہ کرنا سخت مشکل ہے۔ جب بنی اسرائیل نے یہ سنا تو گھبرائے اور روئے پیٹے بہت چلائے اور کہا کہ جب تک وہ لوگ وہاں سے خارج نہ ہونگے ہم ہرگز نہ جائیں گے اگر وہ نہ جائیں گے تو ہم وہاں داخل نہ ہوں گے۔ اے موسیٰ تو اور تیرا خدا جا کر لڑے ہم تو یہیں ٹھہرے رہیں گے۔ کالب اور یوشع نے تسلی دی کہ ان لوگوں کا اقبال جا چکا وہ زمین کہ جس کا تم سے اور تمہارے بزرگوں سے خدا نے وعدہ کیا ہے نہایت عمدہ ہے خدا پر توکل کر کے جاؤ فتح پاؤ گے پس موسیٰ علیہ السلام نے کہا الٰہی میں اور میرا بھائی تیری بندگی کو حاضر ہیں اور باقی اس فاسق قوم سے مجھ کو کچھ سروکار نہیں ہم کو ان سے جدائی نصیب کر۔ تب قہرِ الٰہی نمودار ہوا اور یہ فرمایا کہ مجھے اپنی حیات کی قسم جس طرح اس قوم نے باوجودیکہ ہزارہا معجزات دیکھ چکے ہیں میری نافرمانی کی میں ان کو اس بیابان میں ہلاک کر دوں گا۔ وقتِ خروج سے جس کی ۲۰ برس کی عمر تھی یا اس سے اوپر ان میں سوائے کالب اور یوشع کے کوئی بھی ملکِ کنعان میں نہیں پہنچا۔ وہ تمام لوگ چالیس برس تک فاران کے جنگل میں مقام اور کوچ کرتے رہے تخمیناً بیس بار کوچ کیا کئی کئی برس ایک جگہ گزار دیے جب یہ سب مر چکے تو نئی نسلِ بنی اسرائیل نے ملک کنعان کا رخ

کیا۔ تورات سفر عدد کے ۱۶ باب میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص قارح کہ جس کو قارون بھی کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا قرابتی تھا یعنی چچازاد بھائی تھا قہات کا اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ خدا نے اس قدر اس کو مال و دولت دیا تھا کہ چند قوی آدمی اس کی کنجیاں اٹھایا کرتے تھے۔ اس کو موسیٰ علیہ السلام پر رشک آیا اور بہت سے بنی اسرائیل کے سرداروں کو موسیٰ کے مقابلہ میں اٹھایا موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بلایا وہ نہ آیا آخر یہ ہوا کہ وہ بڑے تجمل کے ساتھ اپنی قوم کے روبرو جماعت کے خیمہ کے پاس آیا۔ پس غضبِ الٰہی بھڑکا جوان کے نیچے کی زمین تھی پھٹی اور زمین نے اپنا منہ کھولا اور انہیں اور ان کے گھروں اور ان سب آدمیوں کو جو قارح کے تھے اور ان کے سب مال کو نگل گئی (۳۲ورس) فخرج علیٰ قومه في زينتها الآیۃ فخسفنابه وبداره الارض الآیۃ اس واقعۂ عبرت خیز سے تمام لوگ ڈر گئے اور جو اس کے مال و جاہ کی حسرت کرتے تھے حذر کر گئے اس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے موسیٰ کی شکایت کی اور ان کے مارنے کا الزام لگایا تو ان پر وبا آئی جس میں چودہ ہزار بنی اسرائیل مر گئے اور پھر موسیٰ کی دعا سے دور ہوئی۔ تورات سفر عدد کے ۱۹ ویں باب میں یہ قصہ بھی ہے کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو (بعد حجت بسیار قرار پایا کہ) وہ سرخ رنگ بے داغ بے عیب ہو جس پر جوا نہ رکھا گیا ہو۔ (۲) اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ الآیۃ مگر تورات میں صرف یہ ہے اس گائے کے ذبح کرنے سے یہ مقصود تھا کہ جلا کر راکھ کریں اور دستور بنی اسرائیل کے موافق یہ راکھ خیمہ گاہ کے باہر دھری جاوے کہ جو بنی اسرائیل پر کاہن یعنی امام چھڑکتا تھا اور قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس گائے کا ایک ٹکڑا لے کر اس میت کے بدن پر مارا جائے کہ جس کو اس کے وارثوں نے قتل کیا تھا اور قاتل کا پتا نہ ملتا تھا کہ یہ شخص زندہ ہو کر قاتل کو بتا دے چنانچہ ایسا ہوا۔ یہ اختلافِ قلیل ہے غالباً مشائخ یہود کے سہو سے ظہور میں آیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل نے قادس مین قیام کیا۔ ہارون کی بہن مریم کا یہیں انتقال ہوا۔ چونکہ یہاں پانی نہ ملتا تھا اس لیے پھر بنی اسرائیل نے غل مچایا اور کفر بکنا شروع کیا۔ تب خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اس چٹان کو جوان کے سامنے ہے اپنا عصا مار۔ چنانچہ انہوں نے عصا مارا پانی چٹان سے نکلا کہ سب نے پیا اور ان کے چارپائے بھی سیراب ہو گئے لیکن خدا تعالیٰ ان سے سخت ناراض ہوا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ادوم کے بادشاہ پاس ایلچی بھیجا کہ آپ کے ملک میں سے ہمارا راستہ ہے ہم راہ راست چلے جائیں گے تمہاری گھاس اور باغوں اور کھیتوں کو ہرگز نہ چھوئیں گے اور جو کچھ لیں گے تو قیمتاً لیں گے مگر اس نے منظور نہ کیا۔ تب ساری جماعت بنی اسرائیل کو ہِ طور پر آئی اور اس کے ملک کو چھوڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم آیا کہ اس پہاڑ پر ہارون کا انتقال ہو گا تو اس کے کپڑے اس کے بیٹے الیعذر کو پہنا دے چنانچہ ہارون نے پہاڑ کی چوٹی پر رحلت کی اور بنی اسرائیل نے تیس روز تک ماتم کیا۔ خروج کے چالیسویں سال بنی اسرائیل ملک ادوم کے کنارے سفر کرتے ہوئے ملک کنعان کے قریب پہنچے تو وہاں کے بادشاہ عراد نے جس کا پایہ تخت دکھن کی طرف تھا یہ سنا تو آمادۂ جنگ ہوا اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو گرفتار کر کے لے گیا۔ بنی اسرائیل نے خدا سے عاجزی کر کے منت مانی اور اس سے پھر لڑائی کی تو کنعانیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کی بستیوں کو نابود کر دیا۔ وہاں سے کوچ کرتے کرتے مواب میں پہنچے اور وہاں حسبون کے رہنے والے سیحون نام بادشاہ سے کہلا بھیجا کہ ہم کو اپنے ملک کی سرحد سے گزر جانے دے مگر اس نے نہ مانا۔ لڑائی ہوئی بنی اسرائیل نے فتح پائی اور حسبون اور اس کے گردو نواح کے سب شہر قبضہ میں آئے (اس وقت ملکِ شام میں طوائف الملوکی تھی چھوٹے چھوٹے رئیس تھے) وہاں سے بنی اسرائیل یعزیر کو فتح کرتے ہوئے بسن میں پہنچے وہاں بمقام اداراعی وہاں کے بادشاہ عوج سے سخت مقابلہ ہوا اور اس کا قد لمبا ہو گا جو یہود میں مشہور ہوا اور پھر قارون کے مال اور رستم کی شجاعت حاتم کی سخاوت کی طرح عام میں شہرت ہو گئی اور قصہ گویوں نے مبالغہ کرنے شروع کر دیے۔ انجام کار بنی اسرائیل نے اس کو مع زن و فرزند قتل کر کے اس کا ملک لے لیا اور اب بنی اسرائیل پھیلتے چلے یہاں سے بڑھ کر نہر یردن کے پاس شہر

ریحو کے مقابلہ میں جس کو اریحا بھی کہتے ہیں مقام کیا وہاں کے بادشاہ بلق بن صفوان کو بڑا خوف پیدا ہوا اور تمام موابی ڈر گئے اور اس نے شہر فتور میں بلعم بن عور کے پاس جو اس زمانہ میں ایک بڑا بابرکت شخص مشہور تھا پیغام بھیجا کہ مصر سے ایک قوم مور و ملخ کی مانند آئی ہے اور سب ملکوں پر پھیلتی جاتی ہے آپ آیئے اور ان کے حق میں بد دعا کیجئے۔ خیر وہ بڑی حیل و حجت کے بعد آئے مگر رستہ میں ان کی سواری کا خچر بیٹھ گیا۔ بہت مارا پیٹا مگر نہ اٹھا۔ پھر خدا نے خچر کا منہ کھول دیا اس نے کہا تو مجھ کو کیوں مارتا ہے خدا کا حکم نہیں تو فرشتہ کو نہیں دیکھتا جو مانع آ رہا ہے۔ الغرض بلعم بادشاہ پاس آئے اور بد دعا کرنے سے عذر کیا مگر بادشاہ نے نہ مانا بد دعا کی جگہ دعا منہ سے نکلتی تھی آخر بادشاہ ناراض ہوا۔ بلعم واپس پھر گیا آخر بنی اسرائیل سے مقابلہ کر کے شکست فاش پائی اس ملک پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل نے سطیم پر خیمہ قائم کیا۔ بنی اسرائیل کی شکست کا ایک سامان پیدا ہوا کہ انہوں نے موابی عورتوں سے حرام کاری کی اور ان کے بت پوجنے شروع کئے جس سے ان پر سخت وبا آئی کہ چوبیس ہزار آدمی مر گئے مگر ہارون کے پوتے فینحاس نے بڑی ہوشیاری کی کہ کزبی کو کہ جس کے خیمہ میں وہ فاحشہ تھی اور اس فاحشہ کو قتل کر دیا۔ وبا دفع ہو گئی۔ بنی اسرائیل کی شکست کی تدبیر مدیانی لوگوں نے نکالی تھی۔ اس لیے بارہ ہزار لشکر بنی اسرائیل ان پر جا چڑھا۔ مدیان کے بچوں اور عورتوں کو اسیر کیا اور بلعم بن عور کو بھی قتل کیا۔ (غالباً جب دعا کا اثر نہ ہوا بلعم نے زنا کی تدبیر بتائی ہو گی) اس کے بعد خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم کیا کہ تیری وفات کے دن قریب آ پہنچے تو اباریم کے اس پہاڑ پر چڑھ کہ میں تجھ کو وہ ملک دکھاؤں جو میں نے بنی اسرائیل کو عنایت کیا ہے تب موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون کو اپنا قائم مقام کیا اور الیعذر ہارون کی جگہ امام ہوا اور صندوقِ شہادت کہ جس کو تابوتِ سکینہ کہتے ہیں اور جس میں من کا مرتبان اور ہارون کی چھڑی اور تورات رکھی تھی بنی لاوی کو سپرد کیا اور بہت کچھ بنی اسرائیل کو وصیت اور نصیحت کی اور سب کچھ ذکر کر کے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد آنے والا یاد دلایا کہ میری مانند ایک اور نبی اولوالعزم آئے گا ایسا نہ ہو کہ اس کی نافرمانی کر کے مصیبتِ ابدی میں گرفتار اور ہمیشہ کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤ۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سب سے رخصت ہو کر نیو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے اور دریائے یرون کے پرلے پار پر کچھ ملک خدا نے بنی اسرائیل کو دینا کیا تھا دیکھا اور وہاں جاں بحق ہو کر اپنے لوگوں میں مل گئے اس وقت ان کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے لیے سواب کے میدانوں میں تیس دن تک رویا کئے۔

فصل : موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں یرون پار کا ملک فتح نہ ہوا تھا۔ یرون شام میں ایک دریا جاری ہے جس میں حضرت مسیح علیہ السلام نے غوطہ لگایا تھا۔ پس یوشع نے بنی اسرائیل کو آمادہ کیا اور اس وقت بنی اسرائیل سے ان لوگوں سے جو مصر سے بیس برس کی عمر میں نکلے تھے کوئی باقی نہ رہا سوائے کالب اور یوشع کے اس زمانہ میں دریائے یرون کا پل نہ تھا جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے قلزم سے لوگوں کو پار کیا تھا اسی طرح دریا بیچ سے خشک ہو گیا اور تمام بنی اسرائیل اتر گئے اور جا کر شہر یریحو پر حملہ کیا۔ رفتہ رفتہ وہ تمام ملک فتح کر کے بنی اسرائیل کو تقسیم کر دیا اور نابلس کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیوں کو دفنا دیا۔ یہیں پر حضرت یوسف علیہ السلام کی بیع بھی ہوئی تھی یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے اٹھائیسویں برس وفات کر گئے۔ ان کے بعد فنیحاس ہارون علیہ السلام کے پوتے تختِ حکومت پر بیٹھے اور کالب بھی سرداری کرتے رہے۔ سترہ برس تک یہی معاملہ رہا پھر بنی اسرائیل نے خدا کی نافرمانی کی تو ان پر کوشان جزیرہ قبرص یا ارمن کا بادشاہ چڑھ آیا جو عیص کی نسل سے تھا۔ پس آٹھ برس تک اس کی حکومت رہی تب بنی اسرائیل نے گریہ وزاری کی تو خدا نے غیثال کے بھائی کالاب کو ہمت عطا کی اس نے بنی اسرائیل کو کوشان کے پنجہ سے چھڑایا۔ اس کی چالیس برس تک حکومت قائم رہی پھر یہ سن بانوے موسوی میں مر گئے ان کے بعد پھر بنی اسرائیل نے بت پرستی شروع کی تو خدا نے غفلون بادشاہ مواب کو مسلط کیا۔ یہ نسلِ لوط سے تھا پھر جب بنی اسرائیل نے گریہ وزاری کی تو آہوذ کو بنی اسرائیل میں قائم کیا۔ اس نے پھر بنی اسرائیل کی حکومت قائم کی اور اسی برس تک اس کی حکومت رہی۔ پس جب یہ سن ایک سو نوے موسوی میں مر گیا تو

شنکار بادشاہ ہوا اور ایک سال کامل بھی اس کی حکومت نہ رہی کہ یہ مر گیا اس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے بت پرستی اور گناہ گاری کی جس لیے اس پر ملک شام کا بادشاہ یابین نام مسلط ہوا اور بیس برس اس کی حکومت بنی اسرائیل پر رہی۔ پھر جب تائب ہوئے تو بنی اسرائیل میں سے ایک شخص باراق نام اور ایک عورت جس کا نام دیورا تھا دو سو گیارہ موسوی میں قائم ہوئے اور انہوں نے یابین سے بنی اسرائیل کو چھڑایا اور چالیس برس تک خوب حکومت کر کے مر گئے۔ ان کے بعد پھر بنی اسرائیل نے خدا کی نافرمانی کی تب ان پر سات برس تک ان کے دشمن اہلِ مدین کا قبضہ رہا۔ پھر جب تائب ہوئے تو خدا نے دو سو اٹھاون موسوی میں بنی اسرائیل میں سے کذعون کو بادشاہ کیا۔ اس نے ان کو مخلصی دی اور چالیس برس تک خوب انتظام بنی اسرائیل کیا۔ پھر اس کی وفات کے بعد دو سو اٹھانوے موسوی میں اس کا بیٹا ابی مالخ تخت نشین ہوا اور تین برس حکومت کر کے مر گیا اس کے بعد یواویر جرشی بادشاہ ہوا اور بائیس برس حکومت کر کے مر گیا۔ ۲۲۴ م میں۔ اس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے سرکشی کی تو ان پر موابیوں میں سے امونیطو بادشاہ اٹھارہ برس تک مسلط رہا۔ پھر بنی اسرائیل خدا کی طرف ملتجی ہوئے اور روئے تو ان میں سے یفتح جرشی ۳۴۱ م میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور بے شمار موابیوں کو قتل کیا۔ آخر چھ برس حکومت کر کے مر گیا۔ اس کے بعد ابصن بادشاہ ہوا اور سات برس حکومت کر کے ۳۵۴ م میں مر گیا۔ اس کے بعد الون حاکم ہوا اور دس برس کے بعد مر گیا۔ اس کے بعد عبدون آٹھ برس تک حکومت کرتا رہا اور ۳۷۲ موسوی میں مر گیا اس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے بے دینی اختیار کی تو خدا نے ان پر فلسطین والوں کو چالیس برس تک مسلط رکھا۔ تب بنی اسرائیل روئے چلائے تو خدا نے ان میں سے شمسون جبار کو قائم کیا اس نے بنی اسرائیل کو ۴۱۲ م میں ان کے ہاتھ سے رہائی دلائی اور بیس برس تک حکومت کی اس پر اہلِ فلسطین غالب آئے اور اس کو پکڑ لے گئے اور اپنے کنیسہ کی ستون سے باندھ دیا چونکہ یہ بڑا زور آور تھا اس نے جو زور کیا تو وہ ستون اکھڑ گیا اور چھت گر پڑی وہ بھی اور بڑے بڑے سردار اہلِ فلسطین سب دب کر مر گئے۔ اس کے بعد دس برس تک بنی اسرائیل بے سردار رہے پھر ۴۴۲ م میں ایک شخص جس کا نام عالی تھا بنی اسرائیل میں بادشاہ ہوا یہ بڑا نیک بادشاہ ہوا اس کی تخت نشینی کے اول سال حضرت صموئیل علیہ السلام گیارہ برس تک بنی اسرائیل کا انتظام کرتے رہے اب تک بنی اسرائیل کے جو حاکم یا بادشاہ تھے تو بمنزلہ قاضیوں کے تھے جس طرح قوم یا بستی کے چودھری اور سردار فیصلہ جات اور سب کاروبار کرتے ہیں یہ لوگ کرتے تھے۔ یہ زمانہ ۴۹۳ م تک رہا اس کے بعد سلطنت کا طور قائم ہوا اور اس کا یہ بیان ہے۔

فصل : بنی اسرائیل نے حضرت صموئیل علیہ السلام سے یہ کہا کہ آپ ہم میں کوئی بادشاہ قائم کر دیجئے کہ ہم اس کی مدد سے اپنے مخالفوں سے جنگ کریں۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ انہوں نے ساول کو کہ جنہیں طالوت بھی کہتے ہیں بادشاہ مقرر کیا۔ یہ بنیامین کی اولاد میں سے تھا چونکہ یہ شخص خاندانی نہ تھا تو بنی اسرائیل نے کہا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ کہ اس کو مال و دولت میں کچھ وسعت نہیں اس سے تو ہم مستحق زیادہ ہیں کہ بادشاہ بنائے جائیں۔ صموئیل نے فرمایا خدا نے اس کو علم اور جسم میں وسعت دی ہے اور اس کی سلطنت کی یہ علامت ہے کہ صندوقِ شہادت کہ جس کو اہلِ فلسطین لڑائی میں لوٹ کر لے گئے تھے از خود واپس آ جائے گا۔ چنانچہ وہ تابوتِ سکینہ[۱] کہ جس میں موسیٰ اور ہارون کے تبرکات اور الواح اور من کا مرتبان تھا انہوں نے از خود واپس کر دیا۔ ملائکہ نے بنی اسرائیل میں لا کر دھر دیا اور ساول چونکہ خوبصورت اور دانا بھی تھا پس ان وجوہ سے بنی اسرائیل نے ان کو بادشاہ بنا لیا۔ پھر طالوت نے عمالیق پر فتح پائی اور کئی شہر اپنے قبضہ میں لایا اور فلسطینیوں سے بھی مقابلہ کی ٹھہرائی۔ ان کا سردار جالوت بڑا قد آور اور بہادر تھا اس کے مقابلہ میں کسی کی طاقت نہ پڑی۔ پھر صموئیل نے فرمایا اس کو ایک شخص قتل کرے گا کہ جس کی

---

[۱] یہ صندوق بنی اسرائیل کے ہاں نہایت سخت وقت پر خیمۂ جماعت سے باہر نکالا جاتا تھا بلکہ جب کہ غنیم نہایت طاقتور ہوتا تھا تو اس کے مقابلہ میں اس کو بھی ساتھ لے جاتے تھے پھر اس کی برکت سے فتح پاتے تھے۔ اس صندوق کو بھی لوٹ کر لے گئے مگر اس سے ان کو نحوست معلوم ہوئی تو واپس کر دیا۔

خدانے علامات مجھ کو بتائی ہیں چنانچہ سموئیل نے موضع بیت اللحم میں جا کر بیشا بن عوفید بن بوغر بن سلمون سے کہا کہ تو اپنے بیٹوں کو دکھا اس نے سات بیٹے علاوہ داؤد کے بلائے۔ مگر سموئیل کے پسند نہ آئے کہا کوئی اور بھی بیٹا ہے؟ کہا ہے، باہر بکریاں چراتا ہوگا اس کو بلایا تو سموئیل نے اس کو پسند فرمایا اور اس کے سر پر تیل ڈالا پھر داؤد بھی لشکر میں شریک ہوئے اور لشکر میں یہ حکم ہوا کہ جو کوئی اس ندی سے جو راستہ میں حائل ہے ایک چلو سے سوا پانی پئے گا وہ میرا نہ ہوگا اور جو نہ پیوے گا وہ میرے ساتھ آوے[۱]۔ چنانچہ بہت نے پیاس کا صبر نہ کیا اور پانی پی لیا ان بے صبروں کو دور کیا اور چند خاصانِ خدا کو ساتھ لے کر مقابلہ ہوا جب جالوت کا لشکر اور شوکت دیکھی تو سب گھبرا اٹھے مگر داؤد نے سب کو تسلی دی اور جالوت سے مقابل ہوئے اور اللہ کا نام لے کر جو گوپیے میں دھر کر ایک پتھر مارا تو جالوت کے سر پر پڑا۔ وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ پھر اسی کا تیغہ لے کر سر قلم کر دیا۔ تمام بنی اسرائیل میں اس جوانمردی کی دھوم ہوگئی اور بادشاہ طالوت نے اپنی بیٹی حسب وعدہ داؤد علیہ السلام سے بیاہ دی مگر دل میں اس کی شہرت پر رشک و حسد ہوا کئی بار داؤد کا قتل کروانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر یہ بادشاہ مع اپنے کئی لڑکوں کے فلسطیوں کی جنگ میں مارا گیا۔ داؤد علیہ السلام بادشاہ ہو گئے مگر بنی اسرائیل کے گیارہ فرقوں پر طالوت کے بیٹے ایش بوست (انسبت) کی حکومت ہوگئی۔ چھ برس کے بعد ایش بوست نے وفات پائی۔ تمام حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے حصہ میں آئی اس وقت ان کی عمر چھتیس برس کی تھی۔ اس کے بعد داؤد علیہ السلام نے فلسطین اور گان اور مواب اور ارمن وغیرہ بہت سے ملک فتح کئے۔ مصر تک اور ادھر دمشق تک ملک کو وسعت دی اور ان کی حیات میں ان کے بیٹے ابشاوم نے ان پر بغاوت کی مگر وہ ناکام رہا۔ انہوں نے اپنی حیات میں شہر یروشلم میں خدا تعالیٰ کے لیے مسجد یعنی بیت المقدس بنانے کی تیاری کی مگر اتمام نہ ہو سکا۔ آخر ساٹھ برس کی عمر میں ۵۳۵م میں وفات پائی اور ان کی جگہ ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام تخت نشین ہوئے اور سات برس تک اپنے باپ کی وصیت بموجب بیت المقدس کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ صرف کر کے اس کو نہایت شان و شوکت سے تیار کیا۔ اس مسجد کا طول ۶۰ گز عرض ۲۰ گز اور بلندی ۳۰ گز تھی اور اسی کو اہلِ کتاب ہیکل کہتے ہیں۔ اس کے تمام مکانات کی کیفیت کتابِ تاریخ میں بہ تفصیل مذکور ہے اور سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا ایسا شہرہ دنیا میں پھیلا کہ روئے زمین کے بادشاہ ان سے ڈرنے لگے۔ ملکِ یمن کی بیگم بلقیس ان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ چالیس برس سلطنت کر کے باون برس کی عمر میں ۵۷۵م میں جاں بحق ہو گئے ان کے بعد ان کا بیٹا رحبعام جو بدشکل اور بے وقوف تھا، تخت نشین ہوا اس کی سختی سے بنی اسرائیل کے دس اسباط اس کی اطاعت سے نکل گئے۔ صرف سبطِ یہود اور سبطِ بنیامین پر حکومت باقی رہ گئی اور ان دس اسباط کا بادشاہ یربعام ہو گیا۔ یہ شخص کافر بدکیش تھا اس زمانہ میں سلطنتِ بنی اسرائیل کے دو حصے ہو گئے۔ اس بڑے حصہ کی سلطنت کا پایہ تخت شہر جبرون ہوا اور اسرائیلی سلطنت نام ہوا۔ دوسرے کا پایہ تخت شہر یروشلم قرار پایا۔ ان دونوں سلطنتوں میں باہم جنگ و جدال اور حرب و قتال ہوا کرتے تھے اور ان میں سے کوئی بادشاہ دیندار ہوا کرتا تھا تو شریعت اور تورات کی پابندی کرتا تھا ورنہ بت پرستی اور معصیت کو رواج دیتا۔ علماء و انبیاء کو چن چن کر قتل کرتا تھا۔ سلطنت اسرائیل کے دو سو اکسٹھ برس میں یکے بعد دیگرے سترہ بادشاہ ہوئے پھر ۸۳۷م میں یہ سلطنت حزقیا بادشاہ پر تمام ہوگئی۔ اس نے صرف چھ برس سلطنت کی۔ رحبعام کے بعد اس کا بیٹا ابیاہ تخت پر بیٹھا اس کے بعد اس کا بیٹا آسا تخت پر بیٹھا یہ بھی دیندار تھا اس کے عہد میں عزیاہ نبی تھے اس کے بعد یہوسفط اس کا بیٹا بادشاہ ہوا یہ بھی دیندار تھا اس کے عہد میں ایلیا یعنی حضرت الیاس علیہ السلام تھے جو آسمان پر چلے گئے اور میکیاہ علیہ السلام کا بھی یہی زمانہ ہے جس نے اخی اب کے حق میں قتل کی خبر دی تھی۔ الیاس کے شاگرد الیسع نبی تھے اور زکریا کے بیٹے یعزی ایل بھی اسی عہد میں تھے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یہورام تخت پر بیٹھا یہ بھی بیدین تھا اس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا اخزیاہ تخت پر بیٹھا یہ بھی بے دین تھا۔ اس کے باپ کو فلسطیوں اور عربوں نے غارت کیا تھا اس کو بھی دشمن نے قتل کیا اس کے بعد اس کا بیٹا یوآس بادشاہ ہوا خوب سلطنت کی بیت المقدس کی

۱ ان کو یسی بھی کہتے ہیں اور ان کے باپ کو عابد۔۱۲

مرمت از سرِ نو کی۔

اس کے بعد اس کا بیٹا امصیاہ بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا عزیاہ بادشاہ ہوا اس نے حضرت زکریا علیہ السلام کے قول پر عمل کر کے بڑی مراد پائی۔ سلطنت کو قوت دی آخر کار بگڑ گیا اور ۷۹۹م میں مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا یوتام تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ملک کو ترقی دی اور دیندار تھا یونس علیہ السلام اسی کے عہد میں تھے۔ اس کے بعد اس کا آخز تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ملک کو ترقی دی اس لیے اس پر مصیبتیں آگئیں۔ بیت المقدس میں اس نے بت پرستی کرائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ تخت نشین ہوا اس نے بیت المقدس کو نجاستوں اور بتوں سے پاک کیا اور خدا پرستی کو رواج دیا یہ بڑا نیک بادشاہ اور با اقبال تھا۔ حضرت یسعیاہ علیہ السلام جو عاموص کے بیٹے ہیں اسی عہد میں تھے اس کے بعد اس کا بیٹا منسی تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا بے دین اور بت پرست تھا۔ اس نے پھر بیت المقدس میں بت پرستی کو رواج دیا مگر جب وہ اس کی شامت سے بابل میں گرفتار ہو گیا تو تائب ہوا جس سے پھر اپنے ملک میں آیا اس کے بعد اس کا بیٹا آمون بادشاہ ہوا تو یہ سب سے زیادہ نالائق ہوا۔ بت پرست تھا چنانچہ اسی کی نحوست سے مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یوسیاہ تخت نشین ہوا۔ بڑا دیندار اور با اقبال تھا اس نے پھر بیت المقدس کو پاک و صاف کیا۔ بتوں کو توڑا، تورات کو تلاش کیا۔ تخمیناً اٹھارہ برس تک کہیں پتا نہ ملا کیونکہ وہ بیشمار حوادث میں تلف ہو چکی تھی مگر خلقیاہ کاہن نے کہیں سے تورات کو بہم پہنچایا۔ غالباً یادداشت کے طور پر احکام و قصص جمع کر کے ان کا نام تورات رکھا ہوگا۔ والعلم عند اللہ۔ اس پر شاہِ مصر نے چڑھائی کی یہ اس معرکہ میں مارا گیا اور اس کے عہد میں ارمیاہ علیہ السلام تھے اس کے بعد اس کا بیٹا یہوآخز تخت پر بیٹھا لیکن تیسرے مہینہ میں شاہِ مصر نے اس کو معزول کر کے اس کے بھائی الیاقیم کو اپنی طرف سے تخت پر بٹھایا اور بدل کر اس کا نام یہویقیم رکھا۔ یہ بڑا بدکار اور بت پرست تھا اس کی تخت نشینی کے چوتھے سال ملکِ عراق میں جو شہر بابل ہے وہاں بخت نصر ۹۵۲م میں تخت پر بیٹھا اور ملک شام پر حملہ آور ہوا۔ بعض کہتے ہیں یہ واقعہ ۹۷۸م میں تھا اور مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے چھ سو دس برس پہلے ہوا ہے۔ پس بخت نصر اس کو قید کر کے لے گیا اور اس کے ساتھ بہت سے مشائخ یہود بھی گرفتار ہو کر گئے۔ پھر اس کے بعد یہویکین اس کے ہشت سالہ لڑکے کو لوگوں نے تخت پر بٹھایا۔ سوا تین مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ بخت نصر نے اس کو بھی گرفتار کروا منگایا اور بیت المقدس کے وہ سونے چاندی کے اسباب و ظروف سب لوٹ کر لے گئے اور کچھ بھی اس میں نہ چھوڑ گئے اور اس لڑکے کی جگہ اس کے چچا صدقیاہ کو قائم کر گئے اور اب کے حملہ میں دانیال اور حزقیل علیہ السلام کو بھی اور لوگوں کے ساتھ مقید کر کے لے گئے۔ صدقیاہ بڑا بے دین اور سرکش نکلا اس کو یرمیاہ علیہ السلام بہت کچھ احکامِ الٰہی سناتے اور ڈراتے رہے مگر اس نے ہر قسم کی بدکاریاں کیں اور نبیوں کو ٹھٹھے میں اڑایا اور خدا کے گھر کو ناپاک کر دیا اور بخت نصر سے بھی بغاوت کی۔ پھر تو بخت نصر بڑے غصہ میں آ کر چڑھ آیا۔ بیت المقدس کو جلا کر مسمار کر دیا اور شہر کو بھی ڈھا دیا۔ تورات کا نسخہ جو بیت المقدس میں دھرا تھا اس کو بھی آگ لگا کر پھونک دیا اور ہزارہا بنی اسرائیل کو تہ تیغ کیا۔ پس آج بنی اسرائیل کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور یہ حادثہ ۹۹۹م میں گزرا اور ہزارہا بنی اسرائیل کو غلام بنا کر لے گیا اور ستر برس تک یہ مسجد اور شہر اجاڑ پڑا رہا اور ستر برس تک بنی اسرائیل بابل میں مقید رہے۔

اس عرصہ میں بخت نصر مر گیا اور ایران کا بادشاہ جس کا نام خورس تھا (یہ دارا سے پیشتر تھا غالباً یہ خسرو ہے یا کوئی اور) ملکِ بابل پر قابض ہوا اور یہودیوں کو مع سامان بیت المقدس ایک پروانہ دے کر ان کے ملک میں بسنے کے لیے روانہ کر دیا۔ ان میں عزرا، یعنی عزیر علیہ السلام بھی تھے۔ بنی اسرائیل کے چالیس ہزار سے زیادہ آدمی تھے جو اپنے ملک میں آئے اور بیت المقدس اور یروشلم کو برباد دیکھ کر آنسو بھر لائے اور ارمیاہ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ مقید ہو کر نہ گئے تھے۔ پیچھے ان کو حکم ہوا کہ بیت المقدس کو آباد کرو اور انہوں نے متعجب ہو کر کہا انی یحی ھذہ اللہ بعد موتہا۔ کہ اب یہ کیونکر آباد ہوگا۔ اس وقت وہ سو[۱] گئے تھے اور گدھے کو باندھ دیا اور ایک زنبیل میں کچھ کھانا پانی بھی تھا۔ اس میں سو

۱ سونے سے مراد مرنا ہے جس کو قرآن نے صاف لفظوں میں کھول دیا۔ اہل کتاب کی الہامی کتابوں میں سونا مذکور ہے۔۱۲ منہ

برس گزر گئے اور خدا نے ان کو بیدار کیا تو کھانا پانی ویسا ہی تھا اور گدھے کی ہڈیاں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ فرشتے نے پوچھا کس قدر سوئے، کہا ایک دن یا اس سے کم۔ کہا سو برس تجھ پر گزر گئے پس ان کے روبرو وہ گدھا زندہ ہوا۔ انہوں نے کہا مجھ کو یقین کامل ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پس جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ اتنے عرصہ میں بیت المقدس آباد ہو چکا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ صاحبِ قصہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔ واللہ اعلم الغرض حجی اور زکریا بن عبدو علیہما السلام کی اعانت سے دوبارہ داراشاہِ ایران کے عہد میں بیت المقدس بنایا گیا۔ جب بنیاد چننے لگے تو نوجوانوں نے بڑی خوشی کا نعرہ مارا اور جو بڈھے تھے جنہوں نے بیت المقدس کو پہلے دیکھا تھا وہ چیخیں مار کر رونے لگے۔ پس جب بن چکا تو شمعون صادق کو سردار بنایا اور حضرت عزیر علیہ السلام نے ان انبیاء کو جمع کر کے یادداشت کے طور پر تورات کے احکام اور دیگر قصص جمع کر کے گویا تورات کو تعمیر کیا اور پھر یہود کو نصائح و پند کرتے رہے، مگر حکومت بنی اسرائیل جاتی رہی۔ ایرانیوں کا صوبہ وہاں رہا کرتا تھا۔ چند سال کے بعد یونان کے لوگوں نے زور کیا اور سکندر بڑی فوج لے کر ایران پر چڑھ آیا تب ملکِ شام ان کی حکومت میں چلا گیا۔ پھر یونان کی عملداری کے کئی حصے ہو گئے اس کے بڑے حصے کا پایہ تخت شہر رومہ[۱] تھا۔ یہاں کے بادشاہ کی سلطنت نہایت وسیع تھی اس ملک میں جو نائب رہتا تھا اس کو ہیرودوس کہتے تھے اور بادشاہ کو قیصر۔ حضرت زکریا علیہ السلام ان دنوں بیت المقدس کے اماموں میں تھے ان کی بی بی الیسباع کے (کہ جس کو ایسبات[۲] بھی کہتے ہیں) کوئی اولاد نہ تھی اور الیسباع کی بہن حنہ تھی انہوں نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا تو میں بیت المقدس کی خدمت کے لیے چڑھاؤں گی کیونکہ یہود میں یہ دستور تھا لیکن قدرتِ خدا سے لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام مریم رکھا اور نذر پورا کرنے کے لیے ہیکل میں بھیج دیا۔ وہاں کے اماموں میں گفتگو ہوئی ایک کہتا تھا میں اس کی پرورش کروں گا، دوسرا کہتا تھا میں اس کو لوں گا۔ زکریا علیہ السلام کو جوان کے خالو تھے بسبب قرعہ اندازی کے اس کے مستحق ٹھہرے۔ پس زکریا نے بیت المقدس میں ان کے لیے ایک جدا جگہ مقرر کر دی کہ سوائے ان کے وہاں اور کوئی نہ جاتا تھا۔ وہاں ایک بار کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مریم بے موسم کے پھل کھا رہی ہیں۔ پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ کہاں خدا کی طرف سے۔ پس اس وقت ان کے دل میں خیال آیا کہ جو بے موسم پھل کھلا سکتا ہے مجھ بوڑھے کو بے موسم اولاد بھی دے سکتا ہے۔ اس لیے دعا مانگی اور تین روز تک بحکمِ الٰہی کسی سے کلام نہ کیا الخ اور فرشتے نے بشارت دی کہ تیرے گھر لڑکا پیدا ہوگا تو اس کا نام یوحنا یعنی یحییٰ رکھنا۔ چنانچہ اس بشارت کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ یہ رشتہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ایک روز حضرت مریم حیض سے پاک ہو کر غسل سے فراغت کر کے بیٹھی تھیں کہ آدمی کی شکل میں جبریل علیہ السلام ان کو دکھائی دیے انہوں نے دیکھ کر خدا کی پناہ چاہی اور کہا کہ تو کون ہے؟ انہوں نے کہا میں جبریل ہوں خدا کی طرف سے اس لیے آیا ہوں کہ تجھ کو بیٹا دوں۔ وہ بولی نہ تو میں بدکار ہوں نہ آج تک کسی مرد کے پاس گئی ہوں پھر بیٹا ہونے کی کیا صورت۔ جبریل نے کہا خدا تجھ کو یوں ہی بیٹا دے گا۔ پس جبریل نے پاس جا کر ان کے کرتے کے گریبان میں پھونک دیا وہ حاملہ ہو گئیں اور بیت اللحم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ یہود ان کے مارنے کو آئے کہ تو نے حرام کا بچہ جنا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لڑکپن میں کلام کرنا شروع کیا تو لوگ ڈر کر چلے گئے۔ یہود کو مریم کے بارے میں حضرت زکریا علیہ السلام پر بدگمانی ہوئی ان کے مارنے کو دوڑے۔ یہ بیچارے ایک درخت گنجان میں جا چھپے۔ یہود نے آرے سے درخت کو چیرا جس سے یہ بھی چر کر دو ٹکڑے ہو گئے اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کا نکاح ان کے چچازاد بھائی یوسف بن یعقوب بن نتھان سے ہوا تھا کہ جو بڑھئی تھے اور جب مریم ان کے پاس آئیں تو حمل دیکھ کر گھبرائے مگر خواب میں فرشتہ نے ان کو مطلع

[۱] یہ شہر اٹلی میں ہے۔ پوپ جو نائبِ عیسیٰ کہلاتے ہیں یہیں رہا کرتے تھے۔ قسطنطنیہ اس کے بعد آباد ہوا۔ ہرقل شاہِ روم کا یہی پایۂ تخت تھا۔ ۱۲منہ

[۲] جس کا مخفف ایلزبتھ ہے۔ ۱۲منہ

کر دیا تو یہ ان کی پاک دامنی کے مقر ہوئے (شاید یہ بھی ہوا ہو) مگر یوسف مریم کے پاس نہ گیا تھا اور یوسف اس بچہ اور ماں کو لے کر مصر میں چلے گئے۔ ایک عرصہ تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہاں پرورش پائی۔ پھر جب یہ سنا کہ یہ بادشاہ مر گیا تو پھر یوسف اپنے وطن میں آیا اور اپنے گاؤں ناصرہ میں رہا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ اب عیسیٰ علیہ السلام ہوشیار ہوئے اور طرح طرح کے معجزات لوگوں کو دکھا کر راہِ راست پر آنے کی ہدایت کرتے تھے مگر وہ سیاہ دل الٹے ان کے بدخواہ ہوتے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام اون کے کپڑے پہنے جنگلوں میں رہتے اور نصیحت کرتے پھرتے تھے۔ دریائے یردن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شاگردی کی اور ان کے ہاتھ سے غوطہ لیا جس کو نصاریٰ بپتسمہ کہتے ہیں اور اصطباغ بھی۔ یحییٰ علیہ السلام کو ہیرودوس نے اس لیے قید کر لیا تھا کہ وہ اس کو ایک عورت کے گھر میں رکھنے سے (کہ جس کا رکھنا اس کو جائز نہ تھا) منع کرتے تھے۔ آخر ایک روز ہیرودوس نے سالگرہ کا جلسہ کیا اور اس جلسہ میں اس عورت کی بیٹی نے ناچ کر سب کو خوش کیا۔ ہیرودوس نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے؟ اس نے بادشاہ سے پکا وعدہ کرا کے اپنی ماں سے پوچھا، اس نے کہا یحییٰ کا سر مانگ۔ بادشاہ نے جلاد کو بھیجا اور وہ ایک لگن میں یحییٰ کا سر کاٹ کر لایا اور اس قحبہ کو دیا اور اس نے اپنی ماں کو دیا جس سے وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بارہ حواریوں کے ساتھ جابجا وعظ کہتے پھرتے تھے اور یہود کو ملامت کرتے تھے جس سے یہود کو ان سے سخت عداوت پیدا ہوئی اور ان کے قتل کی تدبیریں کرتے رہے۔ آخر یہاں کے بادشاہ پلاطوس کو آمادہ کیا اور ایک جگہ سے حضرت کو گرفتار کر کے لے گئے۔ خدا کی قدرت کہ ان میں ایک کو خدا نے مسیح علیہ السلام کی صورت میں کر دیا اور ان کو صحیح سلامت آسمان پر بلا لیا وہ شخص یہود کے ہاتھ سے بڑی اذیت کے ساتھ مارا گیا اور سولی چڑھتے وقت اس نے بڑی جزع و فزع کی۔ عام لوگ بلکہ کل یہود و عیسائی یہی سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی دیے گئے۔ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام کی عمر ۳۳ برس کی تھی اور یہ واقعہ غلبہ سکندر کے ۳۶۶ برس بعد ہوا ہے اس کے بعد حضرت مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) اپنے حواریوں کو دکھلائی دیے اور ان کو اپنے دین کی اشاعت کی اور جناب رسول مقبول ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت کی۔ جیسا کہ انجیل برنباس میں مصرح مذکور ہے اور دیگر اناجیل میں لفظ فارقلیط ہے۔ ان کے بعد حواریوں نے ملکِ شام اور یونان اور افریقہ میں دینِ الٰہی کو رواج دیا اور اس وجہ سے نہ تھا یہود بلکہ شاہ روم جو وہاں کا حاکم اور بت پرست تھا اور جس کو قیصر کہتے تھے حواریوں کا دشمن جانی ہو گیا اور بہت کو شہید کیا اور تکلیف دے کر مارا۔ یروشلم میں سب سے اول استیفان کو شہید کیا مگر جوں جوں لوگ ان پر سختیاں کرتے تھے اسی قدر ان کے خوارقِ عادات سے دینِ حق پھیلتا جاتا تھا۔ لیکن ایک یہود نے عجیب فریب کیا کہ لوگوں میں مشہور کر دیا کہ مجھ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دیدار ہوا ہے اور انہوں نے مجھ کو ایک کتاب بھی دی ہے اس لیے وہ حواریوں میں مل گیا اور چونکہ وہ بڑا منہ زور تھا سب کو دبانے لگا اور سب کے برخلاف اس نے یہ مسئلہ جاری کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تھے خدا آدمی کی شکل میں نماہر ہوا تھا وہ سب کے گناہ اٹھا کر لے گئے۔ بس اس بات پر ایمان لانا کافی ہے۔ شریعت کچھ نہیں بلکہ شریعت پر عمل کرنے سے لعنتی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس بات پر شہر انطاکیہ میں حواریوں نے بحث بھی کی مگر اس کے مرید زیادہ ہو گئے تھے اس نے غلبہ پایا۔ قصہ مختصر اس نے دینِ عیسوی کو بالکل پلٹ دیا۔ اس کا نام پولوس ہے تین سو برس تک عیسائیوں کو کہیں امن نہ ملتا تھا۔ اس میں بارہا وہ حملے ان پر ہوئے کہ چن چن کر لوگ قتل کیے گئے، کتابیں جلائی گئیں چنانچہ انہیں حوادث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی انجیل بھی جاتی رہی۔ لیکن لوگوں نے حضرت کے حالات تاریخ کے طور پر لکھنے شروع کیے۔ عیسائی ان کتابوں کو اپنی اصطلاح میں انجیل کہتے ہیں۔ چنانچہ ۸۰ سے زیادہ جھوٹی سچی انجیلیں مشہور ہوئیں لیکن ان میں سے اب عیسائیوں کے نزدیک چار زیادہ معتبر ہیں۔ انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل متی، انجیل یوحنا، بلکہ اس پولوس اور دیگر اشخاص کے خطوط کو بھی جمع کر لیا ہے اور سب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کہتے ہیں۔

جس طرح کہ بیت المقدس کی بربادی کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دی تھی۔ اسی طرح ظہور میں آیا تخمیناً اس کے چالیس برس بعد

طیطوس[1] نے یہود کی سرکشی سے ان پر چڑھائی کی اور بیت المقدس کو جلا دیا اور شہر کو بالکل مسمار کر دیا اور ان کی تمام کتابیں جلا دیں اور تلاش کر کے یہودیوں کو قتل کیا اس کے بعد پولوس کا مذہب رواج پا گیا۔ روم کا بادشاہ قسطنطین کہ جو بڑا ظالم تھا اسی امید پر کہ میرے سب ظلم عیسیٰ علیہ السلام اٹھالیں گے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائی ہوا اور بزور لوگوں کو عیسائی بنایا اور بڑے سخت قانون جاری کیے جس سے روم اور یونان اور اٹلی میں اس مذہب کی زیادہ شہرت ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ اور ملکوں میں بھی یہ مذہب پھیلا۔ تخمیناً آٹھ سو نو سو برس سے انگلستان کے لوگ بھی کہ جو بت پرست تھے، عیسائی ہوئے اور روس و جرمن وغیرہ ملکوں میں بھی یہ مذہب رواج پا گیا لیکن اس میں سینکڑوں فرقے پیدا ہو گئے سب سے زیادہ دو گروہ ہیں۔ اول رومن کیتھولک جس میں روس اور فرانس وغیرہ ہیں۔ یہ مذہب پولوس کے قدم بقدم پرانے خیالات پر ہے۔ روم میں پوپ ایک پادری یا امام ہوتا ہے کہ جو عیسیٰ علیہ السلام کا نائب کہلاتا ہے۔ پولوس کی حکومت اور شوکت اول تو سب عیسائی سلاطین تسلیم کیا کرتے تھے مگر بعد میں وہ شوکت جاتی رہی۔ پوپ ہر ایک عیسائی سے اس کے گناہوں کا اقرار کرا کے خواہ مفت خواہ روپیہ لے کر اس کے لیے جنت کی چٹھی بھی دیا کرتے تھے اور جو جو وہ حکم جاری کیا کرتے تھے وہ خدا کا حکم خیال کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں کی کنواری لڑکیاں بھی جو اپنے نفس کو خدمات مذہبیہ کے لیے وقف کر دیتی تھیں پولوس اور ان کے خادموں کے پاس جلوت اور خلوت میں ساتھ رہتی تھیں۔ پوپوں کی بدعتیں اور بیہودہ باتیں اس قابل نہیں کہ اپنی تفسیر میں بیان کر سکوں۔ تخمیناً تین سو برس ہوئے کہ ایک شخص مارٹین لوتھر اس وقت کے پوپ سے برگشتہ ہو گیا اور اس کے شاگرد جان کالون وغیرہ اس کے مددگار ہوئے اور اس نے مذہب کی ترمیم کی ان کو پراٹسٹنٹ کہتے ہیں یہ مذہب انگلستان اور جرمن اور دیگر بلاد یورپ کا ہے۔

اب بیت المقدس کا حال سنیے وہ یہ کہ طیطوس کے بعد پھر لوگوں نے کسی قدر بیت المقدس کو آباد کیا اور اس کا نام ایلیاء رکھا (یعنی خانۂ خدا) مگر قسطنطین کی والدہ ہلانہ کو کسی پادری نے یہ پٹی پڑھائی کہ جس سولی پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام لٹکائے گئے تھے وہ لاؤ گی تو حیاتِ ابدی پاؤ گی۔ وہ شام میں آئی اور آ کر اس رہے سہے بیت المقدس کو بھی خراب کر گئی اور یہ حکم دے گئی کہ تمام شہر کا پاخانہ اور قاذورات یہیں پڑا کرے۔ سالہا سال تک یہی نوبت رہی اور کسی کی جرأت تعمیر کرنے کی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو از سرِ نو تعمیر کیا پھر ان کے بعد قدیم بنیادوں پر ولید بن عبدالملک نے تعمیرِ مستحکم کا حکم دیا بہت سے قبے بنائے کسی کا نام قبہ میزان اور کسی کا نام قبہ معراج رکھا اور یہ بناء اب تک قائم ہے۔

[illegible] : مگر سلاطینِ عثمانیہ کے عہد میں اس کی پھر تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد خاص اہلِ اسلام کے قبضہ میں ہے اور اس کے آس پاس یہود و نصاریٰ کے کئی قبے بنے ہوئے ہیں جیسا کہ نقشے سے معلوم ہوتا ہے۔ گو تمام عیسائیوں نے پیٹر گریڈ کے اغوائے بیت المقدس کے لینے کا قصد کیا اور کئی صدیوں تک لڑائیاں رہیں مگر آخرکار صلاح الدین مصری کو خدا نے غالب رکھ کر اپنا قدیم گھر سچے مذہب والوں کو دلایا۔ بحمد للہ اہلِ کتاب کے تمام معابد آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں والحمد للہ۔ یہ مختصر سا حال بنی اسرائیل کا ہے کہ جس کے جاننے پر قرآن مجید کا سمجھنا موقوف ہے اور تفصیلاً کتبِ تاریخ میں مذکور ہے۔ قرآن مجید میں مختلف اغراض سے ان قصوں کی طرف بالحاظ تقدیم و تاخیر اشارہ ہوا ہے۔ پس ناظر کو چاہیے کہ سب کو اس کے مقامات پر چسپاں کر لے۔

واضح ہو کہ بعض ملحدوں نے جس طرح اور معجزات کا انکار کیا ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے عبورِ قلزم کا بھی انکار کیا ہے اور یہ توجیہ کی ہے

---

1 یہ شاہانِ قیاصرہ میں سے ایک بادشاہ تھا۔ ۱۲ منہ

2 حضرت مسیح علیہ السلام نے بیت المقدس کے خراب اور برباد ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔ عیسائیوں کے نزدیک اس کا آباد ہونا اس پیشین گوئی کے خلاف تھا۔ اس

کہ جزر و مد تھا یعنی جب سمندر کا پانی اترا ہوا تھا اس وقت بنی اسرائیل کا گزر ہوا اور ان کے پیچھے فرعون کا لشکر آیا تو اس وقت دریا کا چڑھاؤ تھا وہ لوگ سب ڈوب مرے نہ یہ کہ موسیٰ کی عصا زنی سے سمندر کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اہلِ کتاب اور اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے اور اپنے اس دعویٰ پر اس نے ایک دلیلِ عقلی اور ایک نقلی پیش کی ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے قولہ

"انفلق ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ماضی جزا میں واقع ہوتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو اس وقت اس پر ف نہیں لاتے اور جب کہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں ہوتی تب اس پر ف لاتے ہیں جیسے کہ اس مثال میں ہے ان اکر متنی فا کرمتك امس الخ اس مثال میں جزا (یعنی گزشتہ کل میں تعظیم کا کرنا شرط کا معلول نہیں ہے) کیونکہ وہ اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ اسی طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا ضرب کا معلول نہیں ہو سکتا الخ"

اقول: اس کا جواب یہ ہے (۱) تو زبانِ عرب کا یہ قاعدہ نہیں اگر ہے تو کسی اہلِ زبان یا کتاب کا حوالہ دیجئے۔

(۲) بلکہ وہ قاعدہ یہ ہے کہ ماضی جزا میں واقع ہو تو اگر استقبال کے معنی میں ہے جیسا کہ درصورت نہ ہونے لفظ قد کے ہوتا ہے تو ف کا لانا لازم نہیں ورنہ ف اس پر داخل کرتے ہیں۔ واذا کان الجزاء ماضیا بغیر قد لفظاً او معنی لم یلزم الفاء (کافیہ) والضابطہ ان مدار اتیان الفاء وترکہ لتاثیر المعنوی اعنی قلب الجزاء الی الاستقبال فانھان فیہ اثر تاثیر اتاما فلاحاجۃ الی الفاء وان اثر تاثیرا ناقصاً فالوجھان وان لم یوثر فیہ اصلا فالفاء تکملۃ اب کہاں یہ قاعدہ کہاں وہ قاعدہ۔ اس ناواقفیت کا کچھ ٹھکانا ہے۔

(۳) نہ یہاں شرط ہے نہ جزاء اور نہ کوئی کلمۂ شرط ہے نہ کسی مفسر نے اس کو جزا قرار دیا ہے۔ صرف ف آنے سے معترض نے جزا سمجھ کر ایک منصوبہ باندھ لیا اور ف جزا کے سوا اور جگہ بھی آتی ہے بالخصوص تعقیب اور تفریع کے لیے اکثر مستعمل ہوتی ہے جیسا کہ سبب اور مسبب اور علت اور معلول کے درمیان واقع ہوتی ہے جیسا کہ کسرتہ فانکسر قتلتہ فمات اور اس جملہ کی بھی جلالین وغیرہ تفاسیر میں یوں تقدیر کلام کی ہے۔ ان اضرب بعصاك البحر فضربہ فانفلق (جلالین) جس طرح کہ ہماری زبان میں لفظ پس کا استعمال ہوتا ہے اور مسبب پر بیشتر اس کا استعمال آتا ہے جیسا کہ میں نے اس کو مارا وہ مر گیا۔ بارنا سبب اور مر جانا مسبب ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ضربِ عصا سبب اور پھٹ جانا مسبب ہے۔ افسوس کہ معترض کو زبانِ عربی سے کچھ بھی واقفیت نہیں ناحق زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔

دوسری دلیلِ نقلی:

وہ یہ ہے کہ گلاڈیس اٹالمی جس کو کہ حکیم بطلیموس[1] کہتے ہیں جو سن عیسوی کی دوسری صدی میں تھا اور مصر میں رہا کرتا تھا اس لیے وہ بحرِ احمر کے حال سے زیادہ واقف تھا اس نے بحرِ احمر کا نقشہ لکھا تھا۔ اصل زبان یونانی ہے مگر اس کا ترجمہ لیٹن جو ۱۶۱۸ء میں لوئیس سیزدہم شاہِ فرانس کے زمانہ میں چھاپا گیا تھا خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجود ہے اس میں تیس جزیرے بحرِ احمر میں مع نام بتائے ہیں اور اب وہ جزائر نہیں (کیونکہ علم جوالجی سے یہ بات ثابت ہے کہ جزائر بعض اسباب سے غرقاب ہو جایا کرتے ہیں اور کبھی دفعۃً نکل آتے ہیں) اس سے ثابت ہوا کہ بحرِ احمر کا اس زمانہ میں یہ زور و شور نہ تھا کہ جواب اہلِ اسلام کے زمانہ میں بارہ سو برس سے ہے۔ اس سے یہ یقین

---

1 حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بطلیموس میں تخمیناً دو ہزار برس کا فاصلہ ہے اگر اس نے بحرِ احمر کا حال اور نقشہ بنایا ہوگا تو اپنے عہد کا نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا۔ پھر اس عرصۂ دراز میں جوالجی کے اصول سے اس ماول نے یہ کیونکر ثابت کر لیا کہ کوئی بھی بحرِ احمر میں تغیر یا انقلاب پیدا نہیں ہوا اور بطلیموس کے عہد تک بحرِ احمر اسی صورت پر ٹھیرا رہا جو موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں تھا۔ پھر یہ مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ۱۲ منہ

کامل ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اترے بلا سبب جوار بھاٹے کے رات کو پایاب اور دن کو عمیق ہو جاتا ہو گا اور موسیٰ علیہ السلام کو پایاب اتر جانے کا رستہ معلوم تھا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سمیت بحرِ احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقطوں کا نشان دیا ہے، پار اتر گئے صبح ہوتے جو فرعون نے دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لشکر کو غلط رستے سے دریا میں ڈال دیا پانی بڑھ گیا جس سے وہ سب ڈوب مرے۔ یہودیوں کی تقلید سے مفسرین نے ایک سیدھی سی بات کو معجزہ خارج از قانونِ قدرت بنا دیا حالانکہ قرآن سے ایسا ثابت نہیں۔

جواب: اول تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ نقشہ بطلیموس کے نقشہ کے موافق اور مطابق ہے۔

(دوم) یہ کیا ضرور ہے کہ بطلیموس کے زمانہ میں جو موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد کا ہے، بحرِ قلزم بدستور ہو ممکن ہے کہ بقواعد جوا بھی اس وقت یہ نئی حالت پیدا ہوئی ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں نہ تھی اور اب پھر ویسی ہی ہو گئی۔

(سوم) اب بھی بحرِ احمر میں جزائر موجود ہیں اس تقدیر پر زمانۂ بطلیموس میں اور زمانۂ حال میں فرق ثابت کرنا مدعی کے ذمہ ہے۔

(چہارم) یہ سب کچھ تسلیم بھی کیا جائے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ بنی اسرائیل بحرِ قلزم کی نوک پر سے گزرے تھے جہاں کہ ایسا کنارہ تھا کہ پانی خشک ہو جاتا تھا جہاں کہ مدعی نے نقطے لگائے ہیں۔

(پنجم) اگر یہ تھا تو کیا فرعون کو اس کنارہ کا علم نہ تھا اور جب کہ اس کے ساتھ سینکڑوں اس ملک کے واقف تھے تو مقتضائے قانونِ فطرت یہ تھا کہ وہ کنارے سے بھی دو چار کوس ہٹ کر گاڑیوں کو خشک زمین سے لے کر نکلتا۔

(ششم) اگر کنارہ پاس تھا تو سینکڑوں بنی اسرائیل پر کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ اس مقام سے گزرتے کہ جہاں پانی پایاب ہو گیا تھا کس لیے کہ گارا اور کیچڑ تو پھر بھی باقی رہتا ہے کہ جس میں چلنا بالخصوص بھاگنے اور خوف کے وقت مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ مقتضائے عقل یہ تھا کہ اس نوک سے وہ ایک کوس کے فاصلے سے خشک زمین سے گزرتے۔ مدعی کہاں تک تاویل کرے گا۔

علاوہ اس کے قرآن مجید کے الفاظ سے پانی کا پھٹنا ثابت ہے۔ آیت اول فاوحینا الی موسی ان اضرب بعصاك البحر فانفلق فكان كل فرق كالطود العظيم۔ و اذلفنائم الاخرين۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارے اس نے مارا پس دریا پھٹ گیا اور ہر ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند ہو گیا اور لائے ہم اس جگہ دوسروں کو (شعراء) یہاں ضرب کے معنی چلنے کے کہنا اور فی مقدر ماننا اور اضرب بعصاك فی البحر عبارت بنانا نہایت نادانی ہے اول تو بحر مفعول بہ ہے اس کو مفعول فیہ کہنا پڑے گا۔ دوم پھر بھی اقرار لازم آئے گا اور موسیٰ عصا کے ذریعے سے دریا میں سے گزرے۔ سو یہ بھی خلافِ قانونِ قدرت ہے۔ تیسرے فانفلق الخ کے کیا معنی ہوں گے۔

(آیت دوم) فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقاً فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (طٰہٰ) ''کہ اے موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے لیے دریا کے بیچ میں سے خشک رستہ نکال۔'' الخ

(آیت سوم) وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ط کہ دریا کو خشک چھوڑ دو (دخان) وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (بقرہ) اور ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔ اسی طرح تمام کتبِ تاریخیہ بالخصوص تورات سفر خروج کے ۱۴ باب میں ہے (۲۲) اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے اور پانی کی ان کے دائیں اور بائیں دیوار تھی۔ ۱۶ تو اپنا عصا اٹھا دریا پر مار اور اسے دو حصے کر بنی اسرائیل دریا کے بیچوں بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کے گزر جائیں گے۔ تعجب ہے کہ مدعی کے نزدیک توریت میں تحریف نہیں ہوئی وہ تو معتبر نہ ہو اور لیٹن کا نقشہ معتبر مانا جاوے۔

واللہ الہادی

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جبکہ ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا پھر اس کے بعد تم نے بچھڑا بنا لیا حالانکہ تم ستم کر رہے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو اور (یاد کرو) جبکہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) اور قانونِ شریعت دیا تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

ترکیب: واذ واعدنا فعل بافاعل موسیٰ مفعول اول اربعین لیلة مفعول ثانی اتخذتم فعل انتم فاعل العجل مفعول اول الٰہا مفعول ثانی محذوف و انتم ظالمون جملہ اسمیہ حال ہے فاعل اتخذتم سے۔ عفونا فعل بافاعل من بعد ذالك متعلق ہے فعل سے۔ آتینا فعل ضمیر نحن فاعل موسیٰ مفعول اول الکتاب معطوف علیہ والفرقان معطوف دونوں مفعول ثانی لعل قرآن میں اکثر مفسرین کے نزدیک بمعنی کے آتا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ بعض کہتے ہیں ترجّی کے لیے مگر لوگوں کے محاورہ کے موافق خدا تعالیٰ بھی کلام کرتا ہے ورنہ اس کو ہر چیز کی ابتدا انتہا معلوم ہے اور اسی طرح اذا جو ظرف ہے ہر جگہ اکثر کے نزدیک اذکر کے متعلق ہے والقول ماقلنا فی المقدمہ۔

تفسیر: **چوتھا انعام**: ان آیتوں میں خدا تعالیٰ اپنا چوتھا انعام یاد دلاتا ہے کہ جو دریائے قلزم کے پار اترنے کے بعد ظہور میں آیا کیونکہ خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر انعام و عنایت کے لیے بلایا اور چالیس رات وہاں ان کو ٹھہرنا پڑا مگر بجائے شکر گزاری کے بنی اسرائیل نے بعد میں ایک بچھڑا سامری کا ڈھالا ہوا بجائے حقیقی خدا کے اپنا خدا بنا لیا۔ اس کی سزا میں اگر سب ہلاک کئے جاتے تو کوئی بڑی بات نہ تھی مگر اس پر بھی خدا نے ان کو معافی دی۔ یہ کس قدر انعام اور عنایت ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے قلزم کو عبور کیا اور کوہِ طور کے پاس پہنچے تو خدا نے فرمایا کہ چالیس رات تم ہماری جناب میں عبادت کرو تاکہ تم کو کلام اور احکامِ شریعت ملیں۔ یہ اس لیے کہ اس عرصہ میں جسمانی تعلقات کم ہو کر ملکیت کا ظہور ہو تو خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی صلاحیت ہو جائے اور اسی لیے اہلِ باطن چالیس روز کا چلہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر تشریف لے گئے اور بنی اسرائیل سے تیس رات کا وعدہ کر گئے کیونکہ اول میں یہی حکم ہوا تھا۔ پھر دس رات وہاں اور رہنا پڑا تو بنی اسرائیل میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ مشہور ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام مر گئے۔ بنی اسرائیل میں ایک شخص سامری نامی تھا اس نے کیا مکر کیا کہ بنی اسرائیل سے کہا اب تو موسیٰ علیہ السلام مر گئے اور تمہارے لیے خدا کا ہونا ضرور ہے تم مجھ کو زیور دو میں تمہارے لیے خدا بنا دوں۔ چونکہ مصر کے لوگ گائے بیل اور بلی کو پوجتے تھے۔ یہ بنی اسرائیل بھی ان کے صحبت کے خوگر تھے۔ اس لیے اس نے ایک بچھڑا بنایا۔ سب بنی اسرائیل اس کو سجدہ کرنے لگے۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جو پہاڑ سے لوحیں کہ جن میں احکامِ الٰہی لکھے تھے لے کر تشریف لائے تو بنی اسرائیل کی یہ حالت دیکھ کر بڑے ناراض ہوئے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام پر خفا ہوئے کہ میں تم کو اپنا نائب بنا کر گیا تھا، تو نے کیوں منع نہ کیا؟ انہوں نے عذر کیا کہ میں منع کرتا تو لوگ مجھ کو مار ڈالتے۔ یہ قصہ آگے بھی آوے گا اور ہم بیان بھی کر آئے ہیں۔ پس خدا کی طرف سے یہ حکم آیا کہ اس بچھڑے کو ریت کر دریا میں ڈلوا دو اور لوگ اس کی توبہ میں اپنے آپ کو قتل کریں چنانچہ ایسا کیا۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے رو کر التجا کی تب یہ حکم معاف ہوا اور خدا نے درگزر کیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر گئے اور بہت سے احکام لائے اور غالباً یہی مجموعۂ تورات تھا کہ جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ اس بچھڑا پوجنے کی کیفیت اگلی آیت میں بیان فرماتا ہے:

متعلقات : الکتاب سے مراد تو قطعاً تورات ہے مگر فرقان کہ جو بروزن غفران ہے جس کے معنی فرق کرنے والی چیز کے ہیں اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس سے بھی تورات مراد ہے یہ تورات کا وصف ہے کہ حق و باطل میں فرق کرتی تھی۔ بعض کہتے ہیں اس سے حجت اور معجزات مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

اور (یاد کرو) جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو بلاشک تم نے بچھڑا اپنا کر اپنی جانوں پر ظلم کر لیا پس اپنے پروردگار کے آگے توبہ کرو (اور وہ یہ ہے) کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرے پس یہ تمہارے پروردگار کے نزدیک بہت بہتر ہے۔ پھر تم کو خدا نے معاف کیا بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔

ترکیب : واذقال فعل، موسیٰ فاعل، لقومہ متعلق ہے قال کے یاقوم الخ یہ سب مقولہ ہے یا حرف ندا قوم منادیٰ مضاف ی متکلم مضاف الیہ محذوف کسرۂ میم اس کے قائم مقام ہے انکم الخ ندا باقی جملے صاف ہیں۔

تفسیر پانچواں انعام : یہ پانچواں انعام یاد دلاتا ہے کہ اس گوسالہ پرستی کی سزا میں تم کو اس سرے سے اس سرے تک ہلاک کیا جاتا تو کوئی بات نہ تھی مگر توبہ میں قتل کا حکم دے کر پھر اس کو بھی معاف کر دیا۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے تشریف لائے اور یہ حال دیکھا تو ان کو ملامت کی کہ تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا۔ اب تم توبہ کرو اور تمہاری توبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو قتل کرو اور ہر شخص اپنے قرابتی کو مارے کہ وہ اپنے نفس کا قتل کرنا ہے چنانچہ ایسا[1] ہوا جیسا کہ تورات سفر خروج کے بتیسویں باب میں لکھا ہے (۲۷) اور اس نے انہیں کہا کہ اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر ایک آدمی اپنے دوست اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ (۲۸) اور بنی لاوی نے موسیٰ علیہ السلام کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار مرد مارے گئے۔ پھر دوسرے روز موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا الخ اور سراس میں یہ تھا کہ شرک کر کے ان لوگوں نے اپنی حیات ابدی کو مٹایا پس اس کے کفارہ میں یہ حیاتِ مستعار مٹانی چاہیے۔ الغرض موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی حالت پر رحم آیا اور خدا سے سفارش کی اب نے ان کو معاف کیا کس لیے کہ وہ بڑا مہربان اور معاف کرنے والا ہے۔

متعلقات : لفظ برء جو باری کا مادہ ہے ایک چیز سے الگ ہونے کے لیے موضوع ہے یا کسی تنگی سے الگ ہونا جیسا کہ بولتے ہیں۔ برئ المریض من مرضہ والمدیون من دینہ۔ کہ "مریض نے مرض سے اور قرضدار نے قرض سے خلاصی پائی۔" یا ابتداءً کوئی کام کرنا جیسا کہ بولتے ہیں۔ برى الله الآدم من الطين یعنی آدم کو ابتداً مٹی کی آلودگی سے ممتاز کر کے پیدا کیا (بیضاوی و حاشیہ عصام وغیرہ) اس مقام پر لفظ بارئکم لانے میں یہ نکتہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اس درجہ کی جہالت نے گھیرا تھا کہ اپنے خالق کی پہچان بھی نہ رہی تھی یہاں تک کہ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے بچھڑے کو خدا سمجھ کر عبادت کرنے لگے اور ایک اور بھی باریکی ہے وہ یہ کہ جس نے اپنے باری یعنی خالق کا انکار کیا اس کی سزا اس نعمت کا واپس لینا ہے یعنی موت تاکہ وہ باری پھر زندگی جاودانی عطا کرے اور اسی لیے دو بار لفظ بارئکم بولا گیا۔

[1] اس مقام پر محرف قرآن کا یہ کہنا کہ قولہ اس آیت سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی نے اپنے آپ کو مار ڈالا تھا۔ الخ۔ نہ تنہا قرآن بلکہ روایات اور کتب تاریخ کا انکار بلا دلیل کرنا ہے جس کو کوئی عاقل پسند نہیں کرتا ۱۲ منہ

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور جب کہ تم نے (تمہارے بزرگوں نے) کہا اے موسیٰ جب تک کہ ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں گے آپ کا ہرگز یقین نہ کریں گے تب تم کو بجلی نے دیکھتے دیکھتے آ لیا پھر ہم نے تم کو تمہارے مرنے کے بعد جلا اٹھایا تاکہ تم شکر کرو۔

ترکیب : واذقلتم فعل یاموسیٰ فاعل الخ اس کا مقولہ لن نؤمن لك ای لاجلک اولن نقر لک نری فعل بافاعل لفظ اللہ مفعول ذی الحال جهرة حال اور ممکن ہے کہ فاعل سے حال ہو اور ممکن ہے کہ یہ مفعول مطلق ہو کر منصوب ہو۔ (بیضاوی)

تفسیر : چھٹا انعام : یہ چھٹا انعام ہے جو ان معافیوں کے بعد بنی اسرائیل کے جرمِ جدید پر وقوع میں آیا جس کی تفصیل یہ ہے علماء کا اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ کہاں کا واقعہ ہے محمد بن اسحاق جو فنِ سیرت کے امام ہیں یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ جب گوسالہ پرستی کی سزا میں بنی اسرائیل پر قتلِ نفس کی توبہ مقرر ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر شخصوں کو لے کر کوہِ طور پر معذرت کے لیے گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو اپنے رب سے کلام کر ہم سنتے ہیں اور اس ہم کلامی کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کا چہرہ ایسا منور ہوا کہ جس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ قوم نے کہا کہ ہم نے صرف باتیں سنی ہیں مگر ہم جب تک خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھیں گے ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ تب ان پر بجلی پڑی اور سب مر گئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا الٰہی میں ان کو بنی اسرائیل کی گواہی کے لیے ساتھ لایا تھا اب یہ تو مر گئے میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا؟ تب خدا نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان کو زندہ کر دیا اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ اور طرح پر بیان کیا ہے کہ جب قتلِ نفس کے بعد خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ تو ستر شخصوں کو لے کر ہمارے پاس آ جب وہ آئے تو کہنے لگے کہ جب تک خدا کو ہم عیاناً نہ دیکھیں گے تیری بات پر یقین نہ کریں گے۔ پس بجلی پڑی اور سب مر گئے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے رو کر عرض کی کہ اول تو قتل کا حکم ہو چکا ہے پھر جو کچھ باقی رہے تھے ان میں سے ستر آدمی لے کر آپ کے پاس آیا اب یہ بھی مر گئے تو بنی اسرائیل سے کیا کہوں گا۔ خدا نے فرمایا کہ یہ ستر وہ ہیں جو بچھڑا پوجنے میں شریک تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کی آزمائش ہے جس کو چاہتے ہیں آپ گمراہ کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اگر یہی تھا تو مجھ کو اور ان کو پہلے ہلاک کر دینا تھا الخ۔ پس خدا نے ان کو زندہ کر دیا اور ان کو نبی بھی بنایا (تفسیر کبیر ملخصاً) ان دونوں قولوں میں کچھ بڑا تفاوت نہیں ہے اول قول کے مضامین تورات سفر عدد کے ۱۱ باب اور سفر خروج کے ۳۴ باب سے سمجھے جاتے ہیں شاید اسی قصہ کو خدائے تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں ذکر کیا ہے۔ وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ الآیات کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے وعدے کے لیے ستر شخص پسند کیے۔ پھر جب ان کو زلزلہ نے آ لیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا کیا بیوقوفوں کے فعل سے آپ ہم کو ہلاک کرتے ہیں یہ تو صرف تیری آزمائش ہے الخ۔ میری رائے میں سورۂ بقر کا یہ واقعہ وہ ہے جو سفر خروج کے ۱۹ باب سے اشارۃً سمجھا جاتا ہے اور سورہ اعراف کا قصہ وہ ہے کہ جو سفر خروج کے ۲۴ باب سے سمجھا جاتا ہے۔ بعض ماول واقعہ سورۂ بقر کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ ستر شخص مرے نہ تھے بلکہ بجلی کے صدمہ سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس بے ہوشی کو موت سے تعبیر کیا ہے جس طرح کہ خواب کو موت کہتے ہیں اور اس سے بیدار ہونے کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوہ طور کے لرزنے اور وہاں عجائباتِ قدرت کے ظاہر ہونے کو بھی اس بات پر محمول کیا ہے کہ وہ پہاڑ آتش فشاں تھا۔ یہ تاویلات ملحدانہ خیالات کے ثمرات ہیں کہ جس پر اس کی تفسیر کا مدار ہے۔ فقط

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ
الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
ع ۱۲ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا (اور اجازت دی کہ) جو کچھ ہم نے تم کو پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ (پیو) اور انہوں نے ہمارا تو کچھ بھی نہیں بگاڑا بلکہ اپنا کچھ بگاڑتے رہے اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے کہا کہ اس شہر میں جاؤ پھر وہاں دل بھر کر جہاں سے چاہو کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے گھسنا اور معافی مانگتے ہوئے جانا تو ہم بھی تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور اچھے لوگوں کو اور زیادہ بھی دیں گے پھر ظالم اس بات کے سوائے جو ان سے کہی گئی تھی اور (بات) کہنے لگے پھر تو ہم نے بھی ان شریروں پر ان کی اس بدکاری کے سبب جو وہ کیا کرتے تھے آسمان سے ایک بڑی بلا نازل کی۔

ترکیب: ظللنا فعل بافاعل علیکم متعلق ہے فعل سے الغمام مفعول اور یہ جنس ہے اور جب واحد مراد ہوتا ہے تو ت زیادہ کرتے ہیں غمامہ بولتے ہیں۔ کلوا فعل بافاعل شیئاً مفعول محذوف من بیان ہے اس محذوف کا طیبات مضاف مارزقناکم مضاف الیہ انفسھم مفعول ہے یظلمون کا ای کانوا یظلمون انفسہم۔ واذ قلنا فعل نحن فاعل ادخلوا فعل انتم فاعل ھذہ موصوف القریہ صفت یہ مجموعہ مفعول فیہ ہوا ادخلوا کا اور کل مقولہ ہوا قلنا کا رغدا منصوب ہے۔ یا اس وجہ سے کہ مفعول مطلق ہے ای اکلا واسعا یا حال ہے فاعل کلوا سے سجدا جمع ساجد حال ہے فاعل ادخلوا سے ای متواضعین۔ حطۃ خبر ہے مبتداء محذوف کی ای سوالنا حطۃ پھر یہ مجموعہ مقولہ ہے قولوا کا نغفرلکم جواب امر ہے اور اسی لیے مجذوم ہے فبدل فعل الذین ظلموا جملہ فاعل بالذی قیل لھم مفعول اول محذوف قولاً موصوف غیر الذی الخ اس کی صفت مجموعہ مفعول ثانی (تبیان) من السماء متعلق محذوف ہو کر صفت ہے جزا کی۔

تفسیر: ساتواں اور آٹھواں انعام : یہ ساتواں اور آٹھواں انعام ہے جس کی تفصیل یہ ہے: بنی اسرائیل جب دریائے قلزم عبور کر کے بیابان میں آئے تو وہاں گرمی کی بڑی شدت تھی خدا نے اپنا فضل کیا کہ ایک بادل کا سایہ بنا کر ان کو دھوپ کی شدت سے بچایا یہ ساتواں انعام ہے۔ پھر کھانے کا یہ سامان کیا کہ من[1] اور سلویٰ یعنی بٹیریں نازل کرتا تھا کہ ان کے خیموں کے گرد بٹیریں جمع ہو جاتی تھیں۔

[1] من چنے کے دانوں کی طرح اوس جو بڑی شیریں ہوتی تھی جیسا کہ ترنجبیں، بنی اسرائیل کے خیموں کے آس پاس جم جاتی تھی اس کو اٹھا لیتے اور توے پر روٹیوں کی طرح پکا پکا کر کھاتے تھے (توریت) چونکہ وہ بے مشقت ملتی تھی اس لیے مفت اور بے مشقت چیز کو لوگ من وسلویٰ کہتے ہیں اور شیریں اور لذیذ بھی تھی اس لیے عمدہ غذا کو بھی من وسلویٰ سے تعبیر کرتے ہیں مگر بنی اسرائیل لذیذ اور بے محنت چیز کو روز اور مسلسل کھاتے کھاتے گھبرا گئے اور خرمستی میں پیاز اور ترکاریاں موسیٰ علیہ السلام سے مانگنے لگے گویا وہ فرعون کی قید سے کیا نکلے تھے خدا پر اور موسیٰ علیہ السلام پر احسان جتلاتے تھے۔ آرام طلب مفت خور قوموں کا یہی حال ہوتا ہے ان پر خرمستی سوار ہو جاتی ہے فسق وفجور اور فحش گوئی اور کاہلی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کفرانِ نعمت کا عذاب ان پر نازل ہوتا ہے ان میں اولوالعزمی، غیرت، جفاکشی کا مادہ باقی نہیں رہتا اور غیر اقوام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی بگڑی قوم کی اصلاح سے موسیٰ علیہ السلام بھی عاجز آ گئے تھے ایسے لوگوں کے قول وفعل کا اعتبار نہیں نہ ان میں اخوت اور وطنیت کا پاس رہتا ہے۔ یہ امتِ محمدیہ کو سنایا جاتا ہے۔

رات کو اندھیرے میں یہ لوگ پکڑ لیتے تھے اور پھر گوشت پکا کر کھاتے تھے جیسا کہ توراۃ میں مشرحاً مذکور ہے۔ یہ آٹھواں انعام ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ یاد دلاتا ہے اور تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل مشقتِ سفر سے گھبرائے تو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے یردن کے اس کنارہ تک پہنچا کر کنعان کی تمام سرزمین دکھائی اور خبر دی کہ تو اس ملک میں نہ جانے پائے گا بلکہ تیری موت یہیں ہو گی۔ مگر بنی اسرائیل کو کہہ دیجئے کہ میں تم کو یہ ملک دیتا ہوں اور عنقریب تم اس شہر یریحو کو (کہ جس کو اریحا کہتے ہیں) فتح کرو گے۔ پس جب تم ان شہروں میں جا داخل ہو تو خدا کی نعمتیں اور طرح طرح کے میوے کھانا مگر اس کے شکریہ میں یہ بات ضرور ہے کہ جب دروازے میں سے گزرو تو اپنی فتح اور بہادری پر نہ اترانا بلکہ سجدہ کرتے ہوئے یعنی عاجزی کرتے ہوئے اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جانا۔ اس پر ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور جو تم میں نیک ہیں ان کو اس کے معاوضہ میں ہم اور زیادہ عطا کریں گے۔ پھر جب حضرت یوشع بن نون کے عہد میں بنی اسرائیل نے یہ ملک اور یہ شہر فتح کئے تو بجائے تواضع اور استغفار کے سرکش اور بدکار بن گئے اور طرح طرح کی بدکاری اور بت پرستی کرنے لگے خدا نے ان پر آسمانی بلا نازل کی کہ وبا سے ہزاروں ہلاک ہوئے اپنے افعالِ بد کا نتیجہ پایا۔

فائدہ: یہ قصہ سورہ اعراف میں بھی یاد دلایا ہے۔ اس عنوان سے۔ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓــٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ۔ اب یہ نکات کہ اس سورت میں اسکنوا فرمایا اور بقرہ میں ادخلوا کہا اور وہاں یظلمون اور بقرہ میں یفسقون فرمایا (وغیرہ ذلک) تفسیر کبیر وغیرہ کتب میں ملاحظہ کرنے چاہییں۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ
اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی درخواست کی تو ہم نے کہا اے موسیٰ اپنے عصاء کو پتھر پر مارو (انہوں نے مارا) تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے ہر ہر شخص نے اپنا گھاٹ جان لیا (اجازت دی گئی) خدا کے دیے رزق میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔

ترکیب: واذا استسقی فعل موسیٰ فاعل لقومہ متعلق ہے فعل سے۔ ف تعقیب قلنا فعل نحن فاعل اضرب فعل انت فاعل بعصاك میں باء استعانت کے لیے جار مجرور متعلق اضرب کے ہوا۔ الحجر مفعول یہ سب جملہ مقولہ ہوا قلنا کا انفجرت فعل اثنتا عشرۃ فاعل ممیز عینا تمیز ای ضرب فانفجرت قد علم فعل کل اناس فاعل مشربھم مفعول۔ مفسدین خال مؤکدہ ہے لاتعثوا سے العثی فساد کرنا۔ الانفجار پھوٹ نکلنا پانی کا۔

تفسیر : نواں انعام : یہ نواں انعام ہے اس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑا احسان کیا تھا۔ جب بنی اسرائیل سین کا بیابان طے کر کے رفیدیم میں پہنچے تو اس میں پانی نہ تھا۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ ہم کو پانی دے کہ پیویں الخ۔ موسیٰ علیہ السلام نے خداوند سے فریاد کی اور کہا میں ان لوگوں سے کیا کروں الخ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو دریا پر مارتا تھا الخ اس چٹان پر مار یو اس سے پانی نکلے گا تا کہ لوگ پیویں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سامنے یہی کیا (سفر خروج باب ۱۷) تب اس چٹان سے بارہ چشمے بعدد اسباطِ بنی اسرائیل بہ نکلے اور ہر سبط

نے ایک چشمے کو اپنے لیے معین کر کے خوب پانی پیا اور خدا نے فرمایا میری نعمتیں کھاؤ پیو اور اس کا شکریہ ادا کرو نہ یہ کہ بغاوت اور سرکشی کر کے ملک میں فساد مچاؤ۔ یہ واقعہ کئی بار بنی اسرائیل پر گزرا۔ ایک بار تو یہاں پھر جب ایلیم میں آئے وہاں بارہ چشمے پانی کے اور ستر درخت کھجور کے ملے (خروج باب ۱۵) اور پھر جب بنی اسرائیل قادس میں گئے اور پانی نہ ملا تو یہی واقعہ پیش آیا چنانچہ سفر عدد کے ۲۰ باب میں یہ جملہ ہے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان کو دوبارہ اپنی لاٹھی سے مارا تو بہت پانی نکلا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو عصا مار کر پتھر میں سے پانی نکالا تھا کہ جو بسا اوقات خود بھی نکلا کرتا ہے۔ ہزاروں چشمے پتھروں سے نکلتے ہیں مگر سید المرسلین نے تو انگلیوں سے اس قدر پانی نکالا کہ جس کو سینکڑوں آدمیوں اور جانوروں نے شکم سیر ہو کر پیا جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کتب میں ہے اور کئی بار ایسا ہوا لیکن اس سورۃ میں جو ذکر ہے تو رفیدیم اور قادس کے واقعہ کا ہے واضح ہو کہ قدیم سے ظاہر بیں لوگ معجزاتِ انبیاء اور امورِ خوارقِ عادات کا انکار کرتے چلے آئے ہیں کیونکہ ان کا سِرّ ان کی عقلِ کوتاہ بیں میں جب نہیں آتا تو سوائے انکار کے اور کوئی تدبیر نہ سوجھی سو اس مقام پر بھی یہی تعجب کیا کہ لاٹھی کے مارنے سے اس قدر پانی نکلنا کہ جس کو لاکھوں آدمی پی کر سیراب ہوں قانونِ قدرت کے خلاف ہے حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ پتھروں میں عجیب وغریب تاثیرات خدا نے رکھی ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ وہ پتھر پانی کو زمین سے جذب کر کے نکالے یا ہوا کو ہر طرف سے جذب کر کے اپنی قوت تبرید سے پانی کر کے بہا دے مگر بعض مقلدینِ دہریہ نے یہ دیکھا کہ قرآن اور توراۃ میں یہ واقعہ موجود ہے تو ان کی یہ تاویل کی اضرب کے معنی چلنے کے ہوتے ہیں اور حجر سے مراد پہاڑی حصہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لاٹھی کے سہارے سے پہاڑ پر چڑھ یہ غلط ہے اول تو بقول ماول ضرب کے معنی جہاں چلنے کے ہوتے ہیں تو فی آتا ہے وہ یہاں نہیں۔ دوم اس کا کوئی قائل نہیں۔ سوم فانفجرت کے پھر کیا معنی؟ اور توراۃ کا جو حوالہ دیا وہ غلطی ہے کیونکہ جس مقام کا حوالہ دیا ہے وہ ایلیم ہے اور یہاں رفیدیم کا ماجرا بیان ہو رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا
مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ
اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا
سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور (یاد کرو) جب کہ تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم تو ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ پس ہمارے لیے اپنے رب سے مانگئے کہ وہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار میں سے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور و پیاز پیدا کر دے (موسیٰ علیہ السلام) نے کہا تم بری چیز کو اچھی چیز کے بدلے میں لینا چاہتے ہو؟ کسی شہر میں اتر پڑو بے شک جو تم مانگتے ہو تم کو ملے گا اور ان کی ان باتوں سے ان پر ذلت اور کنگلا پن ڈالا گیا اور انہوں نے غضب الٰہی کمایا یہ اس لیے کہ وہ خدا کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور ناحق نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے۔ (اور نیز) یہ غضبِ الٰہی اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کیا کرتے اور حد سے بڑھ جاتے ہیں۔

ترکیب: واذقلتم فعل انتم فاعل یاموسیٰ بصلها اس کا مقولہ یہ تمام جملہ معطوف ہوا اگلے جملے پر یخرج فعل ربك فاعل شیئاً

محذوف من بیانیہ ما موصولہ تنبت الارض جملہ اس کا صلہ من بقلها الخ اس کا بیان اور موضع اس کا نصب ہے حال ہونے کی وجہ سے ضمیر محذوف سے تقدیرہ مما تنبت الارض کائنا من بقلها۔ پس یہ تمام جملہ بیان ہوا شیئاً کا اور یخرج جواب امر ہے۔ یعنی ادع کا جواب ہے اس لیے مجزوم ہوا قال فعل موسیٰ فاعل آ استفہامیہ تستبدلون فعل انتم فاعل الذی ادنیٰ ای حقیر یہ مفعول بالذی ہیں با سے مقابلہ پس تمام جملہ استفہام انکاریہ ہو کر مقولہ ہوا قال کا اهبطوا مصراً جملہ انشائیہ فان لکم خبر ہے ان کی اور ما موصولہ سألتم جملہ صلہ یہ جملہ مجموعہ اسم ان وضربت جملہ مستانفہ من اللہ موضع جر میں صفت ہے غضب کی ذلك (اشارہ الی ما سبق من ضرب الذلة والمسكنة وباؤ بغضب) مبتدا بانهم الخ اس کی خبر بغیر الحق موضع نصب میں ہے بسبب حال ہونے کے ضمیر یقتلون سے تقدیرہ یقتلونہم مبطلین۔ ذلك اشارہ ہے جمیع امور مذکورہ کی طرف بتاویل ماذکر مبتدا بما عصوا الخ خبر۔

تفسیر: دسواں انعام: اس بڑی آیت میں اذقلتم سے لے کر ماسألتم تک یہود پر اپنا دسواں انعام جتلا کر وضربت سے آخر آیت تک ان پر ان کی بدکاری وظلم پر سرزنش فرماتا اور ان کے افعالِ بد کا بدنتیجہ بتلاتا ہے۔ یہ بھی ایامِ تیہ کا عہد موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل پر اس دشتِ پُر خار میں کہ جہاں کوئی سامان نہ تھا، خدا کی طرف سے من وسلویٰ اترنے لگا تو بجائے شکر گزاری کے اس جنگل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لڑنے جھگڑنے لگے کہ تو نے ہمیں مصر سے نکال کر اس وادی میں لا ڈالا کہ جہاں بجز من وسلویٰ کے اور کچھ نہیں۔ ہم مصر میں زمین کی ہر قسم کی پیداوار کھاتے پیتے تھے۔ ساگ، بھاجی، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز، لہسن، اب تو اپنے رب سے کہہ کہ اس جنگل میں ہم کو یہ چیزیں دے۔ اس گستاخی پر ان کا ہلاک ہو جانا کچھ بعید نہ تھا مگر خدا نے درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی معرفت فرمایا کہ اس جنگل کو طے کر کے کسی آبادی میں چلو وہاں تم کو یہ سب چیزیں ملیں گی کیونکہ مقصود ان کو حسبِ وعدہ ملکِ کنعان کا مالک کرنا تھا اور وہ آگے دشمنوں کے خوف سے پاؤں اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ سب کچھ ان ہی جنگلوں میں مانگتے تھے (یہ توراۃ سفر عدد کے دسویں باب میں بھی مذکور ہے) اهبطوا مصرا اس لیے فرمایا کہ وادی جہاں بنی اسرائیل تھے اس آبادی کے حصہ سے جہاں ان کو جانا تھا، بلندی پر تھی۔ مصر سے کوئی معین شہر یا گاؤں مراد نہیں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ شہر اریحا مراد ہے جو سب سے اول بنی اسرائیل نے یوشع علیہ السلام کے عہد میں فتح کیا، کیونکہ وہ شاداب جگہ ہے اور ہر قسم کی پیداوار وہاں ہے۔

فائدہ: انسان کی عجیب طبیعت ہے، آیندہ آنے والی بڑی سے بڑی نعمت کو جو قدرے کوشش اور عمل پر موقوف ہو موجودہ زائل نعمت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں سمجھتا اسی پر قانع ہو جاتا ہے جیسا کہ حیاتِ دنیا اور اس کی نعماءِ فانیہ بمقابلہ دارِ آخرت کچھ بھی نہیں اس آباد شہر کی طرف قدم نہیں اٹھاتا یہیں رہنا پسند کرتا ہے اور سب کچھ اسی دنیا کے دشتِ پُر خار میں مانگتا ہے۔ حضرات انبیا ہیں کہ اس کے آگے چلنے کی تاکید فرما رہے ہیں وہاں کی نعماء کی رغبت دلا رہے ہیں۔ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ۔ یہ جملہ نہ صرف بنی اسرائیل کی نادانی پر سرزنش ہے بلکہ انسانی حالت اور اس کی دنیاوی فریفتگی اور آخرت سے غفلت پر ایک تازیانہ ہے اور یہ جملہ ضرب المثل ہو گیا ہے۔ ان دس احکام کے بعد جو احکامِ عشرہ کی تعداد ہے، خدائے تعالیٰ بنی اسرائیل پر جو سرزنش ہوئی (اور ہونی بھی چاہیے کیونکہ جو ایک محسن کے متعدد انعام پا کر بھی پھر قریب آنے والی نعمتوں کی طرف رغبت نہ کرے اور موجودہ حالتِ ذلت میں مسرور و مغرور ہو، اس کے لیے قضا و قدر سے ایسا ہی مناسب سلوک ہوا کرتا ہے) اس کو بیان فرماتا ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ بنی اسرائیل پر ذلت وخواری ڈالی گئی۔ ایسی خسیس طبائع نفس پرست عاقبت نااندیش اسی کے مستحق ہوا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی ذلت، طبیعت کی دنائت، شکم پروری اور شہوت پرستی نے ان کو ہمیشہ کے لیے ذلیل وخوار کر دیا اس وقت سے اب تک خوار ہیں اور خوار ہی رہیں گے۔ آنے والے مسیح کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر وہ آ بھی چکا۔ ذلیل اس کی اطاعت کے سبب عزیز ہو چکے بقول شاعر

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے ۔ میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اور نہ صرف دنیا کی ذلت نصیب ہوئی سلطنت وشوکت جاتی رہی بلکہ بَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ اللہ کا قہر اور اس کی ناراضی بھی انہوں نے حاصل کی جس کی سزا ابدی جہنم ہے اور یہ کیوں ہوا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ آیاتِ الٰہی کا انکار کرتے تھے کتبِ منزلہ کو بھی نہیں مانتے تھے نہ آیاتِ قدرت میں غور کرتے تھے۔ سب کو لغو جانتے تھے۔ قوتِ نظریہ بالکل خراب ہو چکی تھی اور قوتِ عملیہ بھی بگاڑ چکے تھے کیونکہ یقتلون الخ انبیاء علیہم السلام کو بھی ناحق قتل کر ڈالتے تھے اور یہ دونوں قصور عصیاں اور حد سے متجاوز ہونے سے خوار ہوئے۔

فوم جس کے معنی گیہوں کے ہیں بعض اہلِ لغت اس کے معنی لہسن کہتے ہیں اور بعض روایات میں ثوم بھی آیا ہے اور توراۃ میں بھی لہسن لکھا ہے۔

مصر سے مراد کوئی معین شہر ہے نہ مصرِ فرعون۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

جو کوئی مسلمان اور یہودی اور نصرانی اور صابی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور اچھے عمل بھی کرتا رہے تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں موجود ہے اور نہ ان پر کچھ خوف طاری ہوگا اور نہ وہ کچھ غم کریں گے۔

ترکیب: ان مشبہ بفعل الذین آمنوا الخ صلہ موصول اس کا اسم من شرطیہ فی موضع ابتدا اٰمن باللہ الخ اس کی خبر فلھم اجرھم الخ جملہ جواب۔ پھر یہ تمام خبر ہوا ان کی اور عائد محذوف ہے تقدیرہ من آمن منھم لفظ من مفرد ہے مگر معنی جمع کے دیتا ہے۔ پس آمن میں لفظ کی رعایت کر کے صیغہ واحد لایا گیا اور معنی کی رعایت کر کے فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ الخ میں ضمیر جمع لائی گئی۔ اجرھم مبتدا فلھم خبر اور اخفش کے نزدیک اجرہم جار کی وجہ سے مرفوع ہے اور عند ظرف ہے اور عامل اس میں معنی استقرار ہے۔

تفسیر: گزشتہ آیت میں یہود کی ذلت اور ان پر قہرِ الٰہی کا نازل ہونا بیان ہوا تھا جس سے یہود کو مایوسی ہو سکتی تھی، اس لیے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں اس مایوسی کو مٹایا کہ ہمارے ہاں کسی شخص کی ذات سے عداوت نہیں۔ صرف ایمان اور اعمال پر دار و مدار ہے خواہ کوئی مسلمان ہو، خواہ یہودی، خواہ عیسائی، خواہ صابی[1] جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لا کر اچھے کام کرے گا اس کا اجر ضرور خدا کے پاس ملے گا اور نہ اس کو خوفِ عذاب رہے گا (دنیا میں) نہ مرنے کے بعد اس کو یہ رنج ہوگا کہ ہائے ہم نے کیوں عمر ضائع کی اور غلط مذاہب اور لغو خیالات کی پابندی کو نجات کا راستہ سمجھ کر جہنم کو پہنچے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہود اپنے دل میں غرہ نہ ہوں کہ ہمیں سے کچھ خدا کو ارتباط

---

[1] صابی ایک قدیم فرقہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں اس فرقہ کا بڑا زور شور تھا۔ شہر بابل اور نینوے کے لوگ بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کی ابتدا کب سے ہوئی، اس کا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ سے جو مجرد محض ہے بندہ کی جو مادی ہے کسی طرح رسائی ممکن نہیں اس کی پرستش اس کے مظاہرِ نیرات کی پرستش ہے پھر اس کے دو گروہ ہو گئے ایک وہ جو ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب اور عناصر کی پرستش کرتے تھے۔ دوم وہ جو اصنام کو نیرات کا مظہر سمجھ کر پوجتے تھے اسی لیے یونان میں زہرہ وغیرہ ستاروں کے نام سے معبد بنے ہوئے تھے پھر آگے چل کر اور بہت سی شاخیں ہو گئیں۔ ایران کے آتش پرست اور ہندوستان کے قدماء وید ماننے والے بھی اسی گروہ کی شاخ ہیں۔ پھر ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اس مذہب نے نیا رنگ اور نیا نام پیدا کیا۔ ۱۲ منہ

خاص ہے کیونکہ اس کے سب بندے برابر ہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے گا، درجہ پاوے گا، کوئی اپنے بزرگوں کی عظمت پر گھمنڈ نہ کرے۔ ان الذین سے ایک نیا بیان شروع ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہدایت کا دروازہ سب کے لیے کشادہ ہے کسی قوم اور کسی شخص کی کوئی خصوصیت نہیں جو ایمان لائے اور نیک کام کرے وہی دارِ آخرت اور حیاتِ ابدی کا مستحق ہے۔ بنی اسرائیل کا کوئی خاص حصہ نہیں۔ انہوں نے بھی ایک وقت ایمان اور نکوکاری سے دنیا پر فضیلت حاصل کی تھی۔ پھر وہی قوم بے ایمانی اور بدکاری کے سبب ذلیل اور مغضوب ہو گئی۔ بنی اسرائیل کی ترقی اور تنزل کے بعد یہ بیان ایک طبعی مناسبت رکھتا ہے جو ماہر سے مخفی نہیں۔

متعلقات: (۱) اس مقام پر اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے تو ایمان سمجھا گیا پھر من آمن باللہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب بعض یہ دیتے ہیں کہ الذین آمنوا سے وہ مراد ہیں کہ جو صرف زبان سے ایمان ظاہر کر چکے ہیں منافقین یعنی خواہ یہود ہو، خواہ وہ ہو جو ظاہری ایمان رکھتا ہے ان میں سے جو حقیقی ایمان لا کر اعمالِ صالحہ کرے گا خدا کے ہاں اجر پاوے گا مگر اصلی جواب یہ ہے کہ الذین آمنوا سے حقیقی اہلِ ایمان مراد ہیں کہ جو زمانۂ ماضی میں ایمان لا چکے اور آمن سے زمانۂ آئندہ میں ایمان پر ثابت قدمی مقصود ہے۔ یعنی خواہ یہود ہو خواہ حقیقی مومن ان میں سے جو ایمان پر قائم رہے گا الخ (تفسیر کبیر) مگر یہاں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ یہ بات تو سب کے نزدیک مسلم تھی کہ جو ایمان لا کر عمدہ کام کرے گا اجر پاوے گا لیکن خدا تعالیٰ اس وصف کو علی العموم بلا تعینِ قوم و شخص سب کے لیے ثابت کرتا ہے یعنی خواہ کوئی ہو جو ایسا کرے گا اجر پاوے گا۔ خواہ وہ مسلمان ہو خواہ یہودی یا نصرانی[1] تا کہ مسلمانوں کا راہِ راست پر ہونا برہان سے ثابت ہو جائے۔ ولطفه لا یخفی علی صاحب الذوق السلیم۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہِ طور بلند کیا اور کہا جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوط ہو کر لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تا کہ تم پرہیزگار بنو پھر تم اس کے بعد بھی پھر گئے پھر اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم تباہ ہو جاتے۔

ترکیب: اخذنا فعل نحن فاعل میثاقکم مفعول و حالیہ رفعنا فعل نحن فاعل الطور مفعول فوقکم ظرف متعلق ہے فعل سے قلنا محذوف خذوا ما اتیناکم الخ مقولہ بقوۃ حال ہے ضمیر خذوا سے۔ ای خذوا عازمین فضل اللہ الخ مبتداء خبر محذوف۔ ای لولا فضل اللہ حاضر کوفیوں کے نزدیک لولا کے بعد اس کا اسم ہے۔

تفسیر: گیارہواں انعام: یہ گیارہواں انعام ہے جس کا کسی قدر ذکر قانونِ ہدایت میں بیان فرمانے کے بعد یہ بھی بیان فرماتا ہے کہ ہم نے اے بنی اسرائیل تم پر یہاں تک عنایت کی تھی کہ جس طرح احمق مریض کو شفیق حکیم زبردستی دوا پلاتا ہے اسی طرح ہم نے تم سے کیا تم میں از خود تو اس قانونِ ہدایت لینے کی صلاحیت تھی نہیں ہم نے تم کو زبردستی سے اس عہدِ الٰہی پر تم کو کوہِ طور اٹھا کر اس کے لینے اور یاد کرنے

---

[1] یہود کے معنی تو ظاہر ہیں کہ بنی اسرائیل کو کہتے ہیں مگر وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ قوی یہ ہے کہ یہودا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے ان کے نام سے یہ قوم نامزد ہو گئی اور نصاریٰ عیسائیوں کو کہتے ہیں اس لیے کہ ناصرہ شام میں ایک گاؤں ہے وہاں آ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہے تھے اور یہ لفظ عیسائیوں میں سے ایک فریقِ خاص کے لیے بھی بولا جاتا ہے اعنی کلیسائے عرب کے لئے۔ ۱۲ منہ

پر مامور کیا مگر باوجود اس کے تم نے اس کو بھی توڑ دیا۔ اگر اس کی رحمت اور فضل نہ ہوتا تو اس عہد شکنی پر تم کو ہلاک کر دیا جاتا۔ یہ سفر خروج کے ۱۹ باب میں بھی ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی بنی اسرائیل پھر گئے اور طرح طرح کی بدکاری اور بت پرستی میں مصروف ہوئے جیسا کہ زمانہ سلاطین اور قضات میں واقع ہوا مگر خدا رحیم ہے اس نے اپنے فضل و رحمت سے پھر وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے کہ جو بنی اسرائیل کو ہر طرح کی ہلاکی اور بربادی سے بچاتے رہے ورنہ نیست و نابود ہو جاتے۔

فائدہ: سورۂ اعراف میں بھی خدا تعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ الآیۃ پس ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پہاڑ کو ان پر اٹھا کر خوف دلایا تھا۔ وہ قادر ہے اور بعض ماوّل اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ پہاڑ کا اوپر اٹھانا ثابت نہیں بلکہ اس پہاڑ کی جڑ میں یہود کھڑے تھے اور پہاڑ کے لرزنے سے ڈرتے تھے کہ اوپر نہ آپڑے اس خوف کے وقت ان سے کہا گیا کہ اس عہد یعنی توریت کو لو اور اس کو یاد رکھو اور اس پر عمل کیا کرو۔ اس خوف سے انہوں نے عہد کر لیا مگر پھر توڑ دیا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور بے شک تم کو وہ لوگ بھی معلوم ہیں کہ جنہوں نے تم میں اسی سبت کے دن زیادتی کی تھی پھر ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل پھٹکارے ہوئے بندر ہو جاؤ پس ہم نے اس واقعہ کو اس زمانہ کے لوگوں کے لیے ان سے پچھلوں کے لیے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

ترکیب: علمتم بمعنی عرفتم فعل انتم فاعل الذین اعتدوا الخ جملہ مفعول منکم حال ہے ضمیر اعتدوا سے ای المعتدین کائنین منکم فی السبت متعلق ہے اعتدوا سے خاسئین جو مشتق ہے خساء اذا ذل سے صفت ہے قردۃ کی اور ممکن ہے کہ خبر ثانی ہو یا کونوا کی فاعل سے حال ہو فجعلناھا ای العقوبہ نکالا مفعول ثانی ہے۔

تفسیر: جب خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنے انعام یاد دلا چکا تو اس کے بعد جو کچھ نافرمانی اور انعام پر ناشکری کرنے سے برے نتیجے پیدا ہوتے ہیں وہ یاد دلاتا ہے تا کہ لوگوں کو عبرت و نصیحت ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ اس قسم کے واقعات پر سوائے اس شخص کے (کہ تورات کیا بلکہ مجموعۂ عہدِ عتیق کا بڑا حاوی ہو) اور کوئی عادتاً واقف نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص وہ شخص کہ جو امی ہو اور جس نے یہود کے ملک میں پرورش بھی نہ پائی ہو چہ جائیکہ ان کی تعلیم و صحبت۔ پھر یہ حالت بیان کرنا صریح اس بات کی دلیل ہے کہ خدا علام الغیوب اس شخص کو خبر دے رہا ہے اور یہ اس کا سچا نبی ہے۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد یہود پر گزرا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں سمندر کے کنارہ پر ملک شام میں کوئی شہر یا قصبہ تھا (جس کو بعض نے ایلہ کہا ہے) ہفتہ کے روز کہ جس کو سبت کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کے دین میں شکار کھیلنے یا اور کاروبارِ دنیاوی کرنے کی سخت ممانعت تھی جیسا کہ تورات میں مذکور ہے۔ وہاں کے لوگوں نے حیلہ کیا کہ پانی کی نالیاں حوضوں میں ڈال دیں ہفتہ کے روز ان نالیوں کے ذریعہ سے حوضوں اور تالابوں میں مچھلیاں جمع ہو جاتی تھیں اور وہ نالیوں کو بند کر دیتے تھے پھر اتوار کو پکڑ کر کھاتے۔ جب یہ پشت گزر گئی تو نئی پشت کے لوگ تو خاص ہفتہ کے روز بھی مچھلیاں پکڑنے لگے۔ ہر چند انبیاء اور صلحاء سمجھاتے تھے مگر وہ نہ مانتے تھے۔ تب خدا نے ان پر قہر نازل کیا کہ طاعون میں مبتلا ہوئے اور شدتِ ورم سے ان کی شکلیں بگڑ کر بندروں کی سی ہو گئیں اور تین روز میں ہزاروں آدمی مر

گئے۔ چنانچہ سموئیل کی دوسری کتاب کے ۲۴[۱] باب میں مجملاً اس قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہود میں یہ واقعہ عبرت انگیز ہر شخص کے زبان زد تھا۔ چنانچہ آنحضرت علیہ السلام کے ہمعصر یہودِ مدینہ بھی اس کو خوب جانتے تھے۔ اس لیے فرمادیا ولقد علمتم۔ اس واقعہ کو سورہ اعراف میں بھی خدا تعالیٰ یاد دلاتا ہے۔ وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ الآیۃ مجاہد نے کہا ہے کہ خدا نے ان کو سچ مچ بندر ہونے کا حکم نہ دیا تھا جس طرح احمق اور بے شرم کو گدھا اور کتا کہتے ہیں اسی طرح ان کو بندر فرمایا مگر جب اس کلام کے حقیقی معنی جو ہم نے بیان کئے صحیح ہو سکتے ہیں تو مجاز کی طرف رجوع ہونے کی کیا ضرورت؟

فائدہ: ان بندروں کو ان کی نسل سمجھنا بیوقوفی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا
هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ
بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى
الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا
ربع وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور یاد (یاد کرو) جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم کو خدا حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کر ڈالو۔ وہ بولے کیا آپ ہم سے دل لگی کرتے ہیں۔ (موسیٰ علیہ السلام) نے کہا خدا کی پناہ کہ میں دل لگی کر کے جاہلوں میں شامل ہو جاؤں (بنی اسرائیل نے) کہا اپنے خدا سے پوچھو کہ وہ ہم کو بتائے کہ وہ کیسا ہو؟ (موسیٰ نے) کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک بیل ایسا ہو کہ جو نہ بوڑھا اور نہ بچھڑا اس کے بیچ کی راس ہو پھر اب تو جو تم کو حکم دیا گیا ہے کرو۔ وہ بولے اپنے رب سے پوچھو کہ وہ ہم کو بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے زرد ڈھڈھاتے رنگ کا بیل ہو کہ جو دیکھنے والوں کو خوش معلوم ہو۔ وہ بولے کہ اپنے رب سے پوچھو کہ وہ ہم کو بتا دے کہ وہ کیسا ہو اس لیے کہ ہم کو تو بیلوں میں چنداں امتیاز نہیں معلوم ہوتا اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ٹھیک پتا لگا لیں گے۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسا بیل ہو کہ جو نہ ہلوں میں جتا ہو نہ لاؤ کشی کی ہو

[۱] کیونکہ اس باب کے اول ورس میں ہے۔ بعد اس کے خداوند کا غصہ اسرائیل پر بھڑکا الخ اور پھر اخیر میں وبا کی بھی تشریح ہے۔

عمدہ ہو اس میں کوئی داغ دھبہ بھی نہ ہو۔ وہ بولے اب آپ نے ٹھیک بات بتائی پس اس کو ذبح تو کر دیا مگر کرنے والے نہ تھے۔

ترکیب: قال فعل موسٰی فاعل لقومہ متعلق ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ کے الخ مقولہ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً نزع خافض کی وجہ سے محلاً منسوب ہے۔ قالوا فعل ھم فاعل آ استفہامیہ تتخذ فعل انت فاعل نا مفعول اول ھزوًا ای ھزوابہ مفعول ثانی اور جوابِ استفہام معنی اعوذ باللہ کے ہیں کس لیے کہ ٹھٹھا کرنا جاہلوں کا کام ہے مراد یہ کہ میں دل لگی نہیں کرتا۔ ما مبتدا خبر جملہ مفعول یبین کا قال فعل بافاعل انہ یقول الخ مقولہ انھا میں ھا اسم بقرہ خبر موصوف لَافَارِضٌ وَلَابِکْرٌ عَوَانٌ تینوں اس کی صفت ما موصولہ تؤمرون بہ صلہ جملہ مفعول فافعلوا صفراء صفت اول بقرہ کی فاقع اسم فاعل لونھا اس کا فاعل مجموعہ صفت دوم تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ جملہ صفت سوم اِنْ شَاءَ اللہ شرط تقدیرہ انشاء اللہ ہدایتاً جواب اس کا لمھتدون شرط بیچ میں آ گئی اور مبرد کے نزدیک جواب محذوف ہے بقرۃ موصوف لاذلول صفت تثیر الارض حال ہے ضمیر ذلول سے تقدیر ولا تذل فی حال آ ثارتھا اور ممکن ہے کہ صفت بقرہ کی ہو وتسقی الحرث صفت بقرہ اور مبتداء محذوف کی خبر بھی ہوسکتی ہے اور اسی طرح مسلمۃ اور لَاشِیَۃَ فِیْھَا وشی یشی سے مشتق ہے اصل شینۃ کی وشیۃ ہے واو حذف ہوا الان میں الف لام زائدہ ہے زجاج کے نزدیک مبنی ہے اس لیے کہ اس کے معنی اشارہ کے ہیں جس کے معنی ہیں ہذا الوقت مبتداء جئت الخ خبر بالحق جائز ہے کہ مفعول بہ جہت کا ہو والتقدیر ذکرت الحق اور جئت کی ت سے حال بھی ہوسکتا ہے۔ ای جئت ومعک الحق۔

تفسیر: یہ نقضِ عہد اور عدولِ حکمی اور سرکشی کا دوسرا نتیجہ بیان ہوتا ہے اور بتلایا جاتا ہے کہ بار بار انعام اور سرکشیوں پر درگزر کر کے اور عہد مؤثق کرنے کے بعد بنی اسرائیل خود حضرت موسٰی علیہ السلام سے ایسی ایسی سرتابیاں اور معمولی حکم میں نکتہ چینیاں کر کے خود مشقت میں پڑتے تھے۔ ایک بیل ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا فوراً کسی بیل یا گائے کو ذبح کر دیتے بس ہو جاتا۔ مگر بار بار شقیں نکالتے گئے اور پوچھتے گئے کہ اے موسٰی علیہ السلام اپنے رب سے پوچھ کہ کیسا ہو، رنگت کیا ہو، ویسی ہی قیدیں لگتی گئیں۔ پھر ان قیود کا بیل تلاش کیا گیا تو بڑی گراں قیمت کو مشکل سے ملا جس کا ذبح کرنا ان پر مشکل ہو گیا۔ (وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ) اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان لوگوں سے جو احکام میں ایسی ایسی کرید کرتے تھے سخت ناراض ہوتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ ان اہلِ کتاب کی اس پیغمبر سے کہ جس کو مانتے تھے اور جس کے صدہا معجزات دیکھ چکے تھے یہ سرتابی تھی۔ اب اگر نبیِ آخر الزماں سے جس قدر وہ سرتابی کریں اور ایمان لانے میں حیلہ بہانہ پیدا کریں کچھ بھی بعید نہیں ان کی جبلت ہی ایسی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی شخص نے اپنے مورث مال دار کو قتل کر کے خود ڈال دیا اور خون کا دعویٰ اوروں پر کیا۔ یہ مقدمہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے روبرو پیش ہوا۔ حضرت نے حکم دیا کہ ایک بیل کو ذبح کر کے اس کا کوئی پارچہ اس میت پر رکھ دو۔ یہ آپ بول اٹھے گا اور اپنے قاتل کو ظاہر کرے گا۔ لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا اور یہ سمجھے کہ موسٰی علیہ السلام دل لگی کرتے ہیں۔ آپ نے کہا استغفر اللہ دل لگی جاہلوں کا کام ہے۔ پھر وہ یہ سمجھے کہ جانے وہ بیل کس قسم کا ہے کہ جس کے پارچہ رکھنے سے مردہ بول اٹھے گا (حالانکہ یہ بات معجزہ سے تھی نہ بیل کی تاثیر سے) اس لیے موسٰی علیہ السلام سے اتے پتے پوچھنے لگے۔ آخر اس صفت کا ایک بیل بڑی گراں قیمت سے خرید کر ذبح کیا اور اس کا ایک ٹکڑا میت پر رکھا۔ اس نے اپنا قاتل بیان کر دیا کہ جو قصاص میں مارا گیا اور حصہ سے بھی محروم رہا۔ اس جگہ صرف بیل ذبح کرنے کا قصہ ہے اور اگلی آیت وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا میں میت کے بدن پر گوشت مارنے کا ذکر ہے ہر چند یہ دونوں باتیں ایک ہی قصہ سے متعلق ہیں مگر چونکہ دونوں میں ایک جداگانہ نکتہ ہے اس لیے دونوں کو جدا جدا بیان کیا۔ اول میں یہ نکتہ ہے کہ بنی اسرائیل کو چونکہ نبی کے قول میں تردد ہوا اور زیادہ نکتہ چینیاں کیں تو وہاں سے قیدیں لگتی گئیں۔ آخر بدشواری ان اوصاف کا بیل نہایت گراں قیمت سے دستیاب ہوا۔ چاہیے کہ جس بات کا نبی حکم دے اس کو بے تامل عمل میں لائے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جس بیل کو چاہتے بنی اسرائیل ذبح کر

دیتے کافی تھا۔ مگر انہوں نے تشدد کیا تو ان پر تشدد ہوتا گیا۔ (رواہ مسلم وغیرہ) اور اس لیے احکامِ الٰہی میں زیادہ تر استفسار کرنے کو برا سمجھتے
تھے۔ کیونکہ لوگ پوچھیں گے اس پر قیدِ شرعی لگ جائے گی۔ مطلق مقید ہو کر خواہ مخواہ دقت واقع ہو گی بلکہ قرآن مجید میں خدا نے بھی اس بات
کو منع کر دیا۔ لاتسئلوا فرما دیا اور یہ بھی اس میں اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل اولادِ ابراہیم ہونے کا دعویٰ کر کے زبردستی سے جنت اور نجات کے
وارث بنتے ہیں اور ان کے بزرگوں کی یہ حالت تھی کہ نبی کے فرمانے سے ایک بیل بھی بمشکل ذبح کیا اور وہ خود ایسے فرمانبردار تھے کہ خواب
میں اشارہ پا کر بیٹے کی قربانی پر آمادہ ہو گئے۔ پھر جب بزرگوں کی پیروی نہیں تو بزرگ زادہ ہونے سے کیا فائدہ؟

دوسرے قصہ میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح خدا نے اس مردے کو زندہ کر دیا کہ جس کے بنی اسرائیل مقر ہیں تو اے عرب کے مشرکو! تم کو قیامت کے روز مر کر زندہ ہونے میں کیوں شک ہے؟

فائدہ اول: علماءِ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بیل ایک شخص کا تھا مرتے وقت اس نے ایک لڑکا یتیم اور یہ بیل چھوڑا اور خدا تعالیٰ سے عرض کیا کہ میں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ لڑکا اپنی والدہ کا نہایت فرماں بردار تھا۔ پھر جب بنی اسرائیل میں یہ قصہ پیش آیا تو یہ تمام صفات اس ہی بیل میں پائی گئیں۔ بنی اسرائیل نے اس سے خریدنا چاہا۔ اس نے اپنی والدہ کی اجازت پر منحصر رکھا اس کی والدہ نے اس قدر قیمت لی کہ جو مدت العمر اس فرزندِ سعادت مند اور اس بیوہ کو کافی ہو گئی۔ خدا تعالیٰ نے اس نیک مرد کے توکل اور اس فرمانبردار فرزند کی اطاعت کا ثمرہ دکھایا۔

فائدہ دوم: بیل کے ذبح کرنے میں ایک تو یہی سر تھا اور دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل اس کی پرستش کرتے تھے اس لیے اس کی قربانی سے ان کے دلوں میں اس جانور کی عظمت کا دور کرنا بھی مقصود تھا۔

فائدہ سوم: علماء نے یہاں بہت کچھ موشگافی کی ہے کہ آیا ابتداءً بیل معین تھا یا غیر معین۔ پھر ماھی کیوں کہا کیف کیوں نہ کہا؟ وغیرہ ذلک۔ اب خدا تعالیٰ اس دوسری بات کو جداگانہ بیان فرماتا ہے:

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی ۙ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور (یاد کرو) جب کہ تم ایک شخص کو قتل کر کے اس میں جھگڑنے لگے اور اللہ تو اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے ظاہر کرتا تھا۔ پھر ہم نے حکم دیا کہ اس (میت پر اس بیل) کا کوئی ٹکڑا رکھ دو اور اللہ یوں ہی مردوں کو زندہ کر دیا کرتا ہے اور تم کو اپنی نشانیاں دکھایا کرتا ہے تا کہ تم سمجھو۔

ترکیب: واوٌ حرفِ عطف ایک جملہ کا پہلے جملہ پر عطف ہوتا چلا آتا ہے۔ اذکر محذوف عامل اللہ مبتدا مخرج الخ جملہ اس کی خبر ما موضع نصب میں ہے بسبب مخرج کے اور یہ الذی کے معنی میں ہے اور عائد محذوف ہے کذلک کاف موضع نصب میں ہے کس لیے کہ نعت ہے مصدر محذوف کے تقدیرہ یحیی اللہ الموتی احیاءً مثل ذٰلک، ادّٰرءتم کی اصل تدارئتم ہے بروزن تفاعلتم تخفیف کے لیے ت کو د سے بدل کر دال کو دال میں ساکن کر کے ادغام کر دیا۔ چونکہ ابتدا بسکون متعذر تھی ہمزہ وصل اول میں لائے اور ادّٰرءتم ہو گیا۔

---

[1] مفسر نیچر نے بیل کے کسی ٹکڑے کو میت پر مارنے سے زندہ ہو جانے کو خلافِ قانونِ قدرت سمجھ کر اس آیت کی تاویل کی اور اس پر جو عربی قاعدہ سے اعتراضات ہونے لگے آپ ہی ان کا جواب دینا شروع کر دیا۔ ان جوابوں کو اس مفسر نے غلط ثابت کر دیا اور مؤول کی تاویل پر اعتراضات قائم رکھے جس سے وہ تاویل غلط ہو گئی اور پھر ماول نے جو جمہور کی مراد پر اعتراض کیا تھا اس کو بھی اس مفسر نے اٹھا دیا جس سے جمہور کے معنی ہی صحیح ثابت ہوئے۔

تفسیر: یہ اسی پہلے قصہ کا باقی ٹکڑا ہے جس میں خدا تعالیٰ نے نبی کے ہاتھ سے ایک معجزہ دکھایا اور یہ کہ حکم دیا کہ ایک بیل کا پارچہ (بعض کہتے ہیں زبان بعض کہتے ہیں دم) اس میت پر دھر دو یہ جی اٹھے گا۔ چنانچہ ایسا کیا اور اس نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیا۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم مردوں کو اس طرح زندہ کر دیا کرتے ہیں اور تم کو اپنی نشانیاں دکھایا کرتے ہیں تا کہ تم ایمان لاؤ اور خدا کو قادرِ مطلق سمجھو یہ تو سرِ مخفی ہے کہ بیل کے ذبح کرنے کی کیوں مشقت ڈالی یوں ہی اس کو کیوں زندہ نہ کر دیا۔ اس کو وہی جانتا ہے مگر دو فائدے اس کے ظاہری ہیں۔ اول حشر کا ثبوت، دوم ان کی سرکشی پر تازیانہ۔

واضح ہو کہ دہریے ایسے خوارق کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اہلِ ادیان بالخصوص مسلمان بھی منکر ہو جائیں اس لیے بعض نے ان آیات کے معانی کو بدلا اور بے تک بہت سی باتیں اور پھر اپنی توجیہ باطل پر آپ ہی اعتراضات کر کے ان کو اٹھانا چاہا مگر اٹھا نہ سکا۔ اول شبہ کا جواب یہ دیا کہ اضربوہ کی ضمیر میت کی طرف اور بعضہا کی ضمیر موتِ نفس کی طرف پھرتی ہے سو یہ جواب غلط ہے اس لیے نفس کا اطلاق جسم مردہ پر نہیں آتا زندہ کو کہتے ہیں اور ٹکڑا بھی نفس کا نہیں ہوتا بلکہ جسم کا۔ پھر اس کی طرف ضمیر کس طرح سے راجع ہو سکتی ہے۔ دوسرا شبہ موتیٰ اور یحیی کے معنی پر ہے کیونکہ موتی کے معنی نا معلوم اور یحیی کے معنی ظاہر کرنے کے ماول نے لیے ہیں۔ اس کا خود جواب دیتے ہیں کہ آیت و کنتم امواتاً فاحیاکم میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور لفظ مخرج اور تکتمون جو مقابلہ میں پڑا ہے اس معنی کے لیے قرینہ ہے یہ جواب بھی غلط ہے اول تو آیت مذکور میں یہ معنی مراد نہیں اور جو ہوں تو ایک جگہ مجاز تسلیم کرنے سے ہر جگہ حقیقی معنی متروک نہیں ہو سکتے اور نہ یہ قرائن اس معنی کے لیے ہو سکتے ہیں (دوم) مخرج اور تکتمون تو یہی چاہتا ہے کہ یحیٰ کے معنی زندہ کرنا اور موتیٰ میت کی جمع کے معنی مردے لیے جاویں تا کہ ان کی خفیہ خیانت کا اظہار پایا جاوے۔ تیسرا شبہ کذلک کے معنی درست نہیں ہوتے اس کا جواب یہ ہے کہ فاظہرہ اللہ مقدر مان کر تشبیہ درست ہو جاوے گی اور مقدر ماننا نہ خلافِ عقل ہے نہ نقل۔ یہ جواب بھی غلط ہے کیونکہ يُرِيكُمْ آيٰتِهٖ کہ وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے صریح دلیل ہے کہ یہ فعل خارقِ عادت ہے کہ غیر محسوس خدا تعالیٰ کے وجودِ کامل کی دلیل بنایا گیا ہے ورنہ اس طرح کے ٹوٹکے اور شعبدے آیاتِ الٰہی نہیں ہو سکتے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ
وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ
مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا کہ وہ پتھر ہیں یا سختی میں ان سے بھی زیادہ تر اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں کہ جن سے نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ پھٹتے ہیں پھر ان سے پانی جھرتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جو خدا کے خوف سے نیچے گرتے ہیں اور اللہ تمہارے کام سے بے خبر نہیں ہے۔

ترکیب: ثم استبعاد قسوۃ کے لیے نہ کہ تراخی کے لیے قست فعل قلوبکم فاعل مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ متعلق ہے فعل سے ھی مبتدا کالحجارۃ مستقر کے متعلق ہو کر خبر۔ اور ممکن کہ کاف اسمیہ بمعنی مثل ہو اور متعلق نہ ہو اور بمنزلہ اس او کے ہو کہ جو کصیب میں۔ اشد معطوف ہے کاف پر تقدیرہ او ہی اشد قسوۃ تمیز ہے لما میں ل تاکید اور ما موصولہ موضع نسب میں ہے کیونکہ اسم ان ہے اور يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ جملہ فعلیہ

اس کا صلہ اور مِنَ الْحِجَارَةِ خبر ان ہے اور اسی پر وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ کو قیاس کرنا چاہیے۔ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ موضع نسب میں ہے يَهْبِطُ سے کما تقول يَهْبِطُ خَشْيَةِ اللّٰهِ باقی صاف ہے۔

تفسیر: خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو فرماتا ہے کہ ان واقعات اور عجائباتِ قدرت کے دیکھنے کے بعد تم کو مساواتی ہو گئی اور چکنے گھڑے کی طرح ہو گئے اور گناہ کرتے کرتے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے جس طرح پتھر میں اثر نہیں ہوتا اسی طرح تمہارے دلوں میں انبیاء علیہم السلام کی نصیحت اثر نہیں کرتی بلکہ پتھروں سے تو کچھ فائدہ بھی ہے اور وہ کچھ اثر بھی قبول کرتے ہیں کس لیے کہ بعض میں سے تو پانی کے چشمے پھوٹ کر نکلتے ہیں کہ جن سے خلق اللہ فیض پاتی ہے اور بعض میں سے پانی جھرتا ہے جبکہ وہ ابخرات کے زور سے پھٹ جاتے ہیں اور بعض پتھر پہاڑ کی چوٹی سے زمین پر گرتے ہیں گویا کہ ہیبتِ الٰہی سے لرز کر سجدہ میں گرتے ہیں اور تمہارے دلوں میں تو یہ بھی وصف نہیں۔ پس وہ پتھروں سے بھی سخت تر ہے۔ اگر یہ لوگ خاتم النبیین ﷺ کو نہ مانیں یا ان کے معجزات اور پراثر وعظ پر قہقہہ اڑائیں تو ان سے کچھ تعجب نہیں۔ اس سے کوئی عرب یا اور قوم یہ نہ سمجھے کہ نبی علیہ السلام کی نبوت اور فیضِ ہدایت کا قصور ہے بلکہ ان کی استعداد میں فرق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہود کی سخت دلی کی مذمت فرمائی اور ان کو سانپوں کے بچے کہا۔

متعلقات: قساوہ: غلظت اور سختی کو کہتے ہیں جیسے کہ پتھر میں ہوتی ہے اور دل کی قساوت یہ ہے کہ اس میں خوف و عبرت کی جگہ نہ رہے۔

فجر: کھل جانا، پھوٹ پڑنا، چونکہ پہاڑوں میں تو بعض جگہ بڑے زور سے پانی نکل کر اس سے دریا اور نہریں بہتی ہیں۔ جیسا کہ دریائے گنگا اور جمنا کا منبع اور بعض پہاڑوں میں ابخرات کی شدت سے پتھر پھٹ کر ان سے تھوڑا تھوڑا پانی رسنے لگتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو جدا جدا بیان فرمایا اور جو دونوں کو ایک سمجھ کر کلامِ الٰہی پر اعتراض کرتا ہے وہ جاہل ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ
ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ
عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

(مسلمانو) کیا تم کو یہ توقع ہے کہ (یہود) تمہیں مانیں گے حالانکہ ان میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہو گزرا ہے کہ جو کلامِ خدا سنتا تھا پھر اس کو سمجھنے کے بعد دیدہ و دانستہ بدل ڈالتا تھا اور جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لے آئے اور جب ایک دوسرے سے تنہا ملتا ہے تو کہتے ہیں کیا تم مسلمانوں کو وہ بات کہہ دیتے ہو کہ جو خدا نے تم پر ظاہر کی ہے تا کہ وہ اس سے تم کو تمہارے رب کے روبرو الزام دینے لگیں، کیا تم نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہودی) نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ پوشیدہ اور ظاہر کرتے ہیں سب کو اللہ جانتا ہے۔

ترکیب: ان یؤمنوا میں حرفِ جر محذوف ہے تقدیرہ فی ان یؤمنوا وقد کان جملہ حالیہ ہے تقدیرہ افتطمعون فی ایمانھم و شانھم الکذب و التحریف منھم موضع رفع میں ہے صفت ہے فریق کی اور یسمعون الخ جملہ کان کی خبر اور فریق اسم ہے اذا حرفِ شرط لقوا الخ شرط قالوا آمنا جواب شرط اور اسی طرح اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ الخ شرط قالو الخ جوابِ شرط بما فتح اللہ میں ما موصولہ ہے اور ممکن ہے

کہ موصوفہ او رمصدر یہ ہو۔

تفسیر: خدا تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دیتا ہے کہ تم ان یہودیوں سے کیا امید رکھتے ہو کہ وہ دینِ اسلام قبول کریں گے ان سے یہ امید نہ رکھو کس لیے کہ وہ شریر قوم ہے کہ جس میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جو کلامِ خدا سن کر اور خوب سمجھ کر پھر اپنی خواہشِ نفسانی سے بدل ڈالتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فعل سخت گناہ ہے۔ بس جس کلام کو یہ برحق سمجھتے تھے اور جس نبی پر یہ ایمان لائے ہوئے تھے اس کی نسبت ان کی یہ کارروائی تھی تو اور کا کیا ذکر ہے؟ علماء کے اس میں مختلف قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روبرو یہود یہ حرکت کرتے تھے کہ تورات کو سن کر اور سمجھ کر پھر اس کے برخلاف عمل کرتے تھے اور کلامِ الٰہی کو نہ مانتے تھے یہی ان کی تحریف تھی بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد علماءِ یہود نے اپنے اغراضِ نفسانیہ سے تورات میں تحریف کی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کو تاویلات اور الفاظ کی کمی زیادتی کر کے بدل دیا اس لیے حواری عہدِ عتیق کے حوالہ دیتے ہیں حالانکہ ان میں وہ حوالہ نہیں پائے جاتے۔ کسی کتاب عہدِ عتیق میں نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام ناصری کہلائے گا حالانکہ حواری کہتے ہیں کہ انبیاء یہ بات فرما گئے ہیں اور بہت سے شواہد ہیں اور اسی طرح جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات میں تصرف بیجا کیا اور یہی قول صحیح ہے اور اس بات کا ثبوت علمائے اسلام نے کتبِ مناظرہ میں بڑی شد و مد سے کر دیا ہے۔ اب خدائے تعالیٰ یہود کی بدخصلتوں سے مطلع کر کے نبی علیہ السلام کو تسلی دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ ان یہود کی بے دینی یہاں تک ہے کہ ایمان اور کفر کو ایک سرسری بات سمجھ رکھا ہے۔ پس جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ تم تورات اور دیگر کتبِ انبیاء سے مسلمانوں کے روبرو وہ باتیں کیوں پیش کیا کرتے ہو کہ جن سے ان کے دین کا برحق ہونا پایا جاتا ہے کس لیے کہ جس طرح وہ تم کو اور باتوں سے الزام دیتے اسی طرح عند اللہ بھی تم کو ملزم کریں گے اور خدا کے سامنے تمہارے پاس کوئی حجت اسلام قبول کرنے کی نہ رہے گی۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا سے کوئی بات مخفی نہیں خواہ وہ ظاہر کریں خواہ چھپاویں۔ بہرحال وہ ہر بات جانتا ہے وہ خود اپنے نبی کی زبانی اور اس کے علماء کی معرفت ان باتوں کو ظاہر کر دے گا وہ ہر حال میں خدا کے نزدیک اسلام قبول نہ کرنے پر ملزم ٹھہریں گے کیا وہ اس بات کو نہیں جانتے؟ عند ربکم کے معنی میں علماء کی مختلف توجیہات ہیں مگر قوی اور صاف یہ ہے۔ ای فی الحکمہ۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ عام یہود کی بیدینی اور جہالت ظاہر کرتا ہے۔

النصف

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾
فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا
يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى
مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا
خٰلِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا

خٰلِدُونَ ﴿٨٢﴾

اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہی ہیں جن کو اپنے دلی منصوبوں کے سوا کتاب کا علم نہیں اور وہ محض اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے ہیں۔ سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ کچھ روپیہ کمائیں پھر تف ہے ان کے ہاتھوں کے لکھنے پر اور تف ہے ان کی کمائی پر اور یہ یہی کہا کرتے ہیں کہ بجز چند گنتی کے دنوں کے ہم کو آگ (دوزخ) کی نہ چھوئے گی (اے نبی) ان سے پوچھ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ پھر وہ اپنے عہد کے خلاف ہرگز نہ کرے گا یا تم اللہ پر وہ باتیں بناتے ہو کہ جن کو تم خود ہی نہیں جانتے۔ ہاں جس کسی نے برائی کمائی ہوگی اور اس کو گناہوں نے ہر طرف سے گھیر لیا ہوگا وہی دوزخی ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہا کریں گے اور جنہوں نے کہ ایمان لا کر اچھے کام کیے ہوں گے وہی جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ترکیب: امیون مبتدا موصوف لایعلمون الکتٰب صفت منھم خبر مقدم الا امانی استثنا منقطع ہے بمعنی لکن امانی امنیہ کی جمع ہے جس کے معنی دلی منصوبہ ہیں اور اس لیے اس کا اطلاق جھوٹ اور آرزو اور جو پڑھنے میں آتا ہے اس پر ہوتا ہے۔ ان بمعنی ما یظنون الا د التقدیر ان ھم الا قوم فویل فویل للذین یکتبون مبتداء و خبر ہیں۔ الکتٰب مفعول بہ ہے بمعنی مکتوب اور جس نے مصدر سمجھا ضعیف کو اختیار کیا بایدیھم ایدی جمع ہے جس کی اصل میں یدی کفلس ہے اور جمع قلت ہے باوجودیکہ ہاتھوں سے لکھتے ہیں نہ پاؤں سے پھر اس کو جو ذکر کیا تو تاکید کے لیے جیسا کہ بولتے ہیں اپنی آنکھ سے دیکھا لیشتروا میں لام یقولون کے متعلق ہے مما کتبت میں ما بمعنی الذی یا نکرہ موصوفہ یا مصدر یہ ہے اور اسی طرح مما یکسبون میں قالوا فعل ھم ضمیر فاعل لن تمسنا الخ جملہ مفعول بہ الا ایاما میں ایام کو بوجہ ظرف ہونے کے نصب ہے نہ الا کی وجہ سے کس لیے کہ فعل اس ظرف سے پہلے کسی اور ظرف کی طرف متعدی نہیں ہوا (تبیان) ایام اصل میں ایوام یوم کی جمع تھا واؤ کو یا بنالیا اور ی کو ادغام کر دیا۔ اتخذتم ہمزہ واسطے استفہام کے ہے اور ہمزہ وصل محذوف ہے بلیٰ کلمہ ایجاب ہے من بمعنی الذی اور ممکن ہے کہ شرطیہ ہو اور دونوں تقدیر پر یہ مبتدا اصحاب النار خبر جملہ جواب شرط یا خبر من۔ ام ہمزہ استفہام کے معنی میں ہے ای الامرین کائن یعنی ام متصلہ یا اس کو منقطعہ کہا جاوے بمعنی بل ہے۔

تفسیر: یعنی ان کے حامیوں کی یہ کیفیت ہے کہ تورات یا کسی اور کتاب کو تو جانتے نہیں صرف چند خیالی ڈھکوسلے اپنے دل میں جما رکھے ہیں: اول یہ کہ تمام مخلوق سے علیحدہ خدا کو ہم سے ایک اختصاصِ خاص ہے کیونکہ اس نے ہم کو بیٹا کیا ہے اور محبوب بنایا ہے پس ہمارا ہر گناہ معاف ہے۔ دوم یہ کہ ہمارے باپ دادا انبیاء تھے ان کو قدرت ہے کہ بغیر مرضیٔ خدا ہم کو دوزخ سے چھڑا لیں گے (جیسے کہ آج کل جاہل پیرزادوں کے خیالاتِ فاسدہ ہیں)۔ سوم یہ کہ یہود کو اگر عذاب بھی ہوا تو چند روز کا ہوگا۔ چہارم استحقاقِ نبوت ہمارے خاندان کو حاصل ہے اور کسی خاندان کا شخص نبی نہیں ہو سکتا (جیسے ہندوؤں میں برہمنوں کے خیالاتِ فاسدہ ہیں)۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بے اصل خیالات ہیں ان کے علماء کا یہ حال ہے کہ غلط مسائل اور امراء کی خواہش کے موافق روپیہ لینے کے لیے اپنے ہاتھوں سے جھوٹی روایات لکھ کر پیش کر دیا

1 ویل۔ زبانِ عرب میں ناراضی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ہماری زبان میں تف اور چھے منہ بولتے ہیں۔ پس وہ جو امام احمد اور ترمذی اور ابو یعلی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ویل جہنم میں ایک کنواں اور ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ وہ جہنم میں پہاڑ ہے سو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ چیزیں خدا کے کلمہ ویل کا مظہر ہے یعنی اُس کی ناراضی ان صورتوں میں ظہور کرے گی سو یہ سب سچ ہے۔

2 اس آیت سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ قرآن مجید کی اجرتِ کتابت اور لکھ کر بیچنا جائز نہیں مگر صحیح یہ ہے کہ جائز ہے اور اسی پر علماء کا فتویٰ ہے (تفسیر عزیزی)

تے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی تورات کی عبارت ہے۔ اگر کسی پرانے نوشتے کو حسنِ ظن سے من اللہ کہہ دیتے تو بات تھی غضب یہ کہ خاص اپنے ہاتھ کے نوشتہ کو من اللہ کہتے ہیں۔ اس لیے یَکْتُبُوْنَ بِاَیْدِیْھِمْ کی قید لگائی ورنہ لکھا تو ہاتھوں سے ہی تے ہیں اور آنکھوں اور کانوں سے کون لکھتا ہے؟

فرماتا ہے۔ تف ہے اس لکھنے پر اور تف ہے اس کمائی پر اس کے بعد وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ الخ ان کے امانی اور خیالی منصوبوں کو ن فرما کر اس کا رد کرتا ہے کہ کیا خدا نے تم سے اس کا کوئی عہد کر لیا ہے کہ وہ تمہارے گناہوں پر عذاب بھی دے گا تو چند روز کے لئے، ہرگز ں جزا و سزا کا عام قاعدہ ہے کوئی ہو جو ہر طرح سے گناہوں میں آلودہ ہوگا وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جو ایمان لاوے گا نیک کام کرے گا شہ جنت میں رہے گا۔

ذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا
الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور بیکسوں سے سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا پھر بجز چند آدمیوں کے تم میں سے منہ موڑ کر سب پھر گئے۔

کیب: اذ ظرف متعلق ہے اذکر کے اخذنا فعل با فاعل میثاق بمعنی عہد مفعول لا تعبدون الیٰ آخرہ جوابِ قسم ہے جو اخذنا سے مستفاد ہے۔ ای احلفنا ھم وقلنا لھم باللہ لاتعبدون دوم یہ کہ ان مراد ہو والتقدیر اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ پس حرفِ جر ذف ہوا پھر ان حذف ہو گیا پھر مضارع مرفوع ہو گیا۔ جیسا کہ اس مصرعہ میں لا ایھذا الزاجری احضر الوغی۔ اور بعض قرأت میں ان لاتعبدو ھی آیا ہے۔ پس اس تقدیر پر میثاق سے بدل ہو جاوے گا یا بحذفِ جار اس کا معمول ہو جاوے گا۔ نافع اور ابن عامر اور ابو عمرو اور عاصم اور یعقوب نے لاتعبدون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی لوگوں نے ی کے ساتھ[1] اور بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا متعلق ہے مضمر کے ساتھ۔ ای احسنو حسانا وذی القربی اس کا عطف الذین پر ہے وقولوا ای قلنا لھم قولوا قولا حسنا بضم الحا و سکون السین و بفتحھا جیسا کہ حَزَن اور حُزن دونوں رست ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ثانی صورت میں صفت ہے مصدر محذوف کی اور اول میں مضاف محذوف ہے۔ ای ذا حسن وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ملہ حال مؤکدہ ہے۔ فاعل تولیتم سے۔

تفسیر: یہود کو جو خدا تعالیٰ نے بتاکید شدید احکام دیے تھے جن پر عمل کرنے سے ان کو دنیا کی فضیلت دی گئی تھی اور ان پر کیا منحصر ہے جو کوئی ان احکام پر عمل کرے گا فضیلت اور سیادت کا مرتبہ پائے گا۔

ان احکام کی دو قسم ہیں اول وہ جو خود عامل کے لیے مکارمِ اخلاق اور ذاتی خوبی ہو جاتے ہیں۔ دوم وہ جو تمدن کی اصلاح اور قومیت کے قیام کا باعث۔ قسم اول کی بھی دو قسمیں ہیں۔ خدا کی تعظیم اس کی مخلوق پر رحم کرنا۔ فقال لَا تَعْبُدُوْنَ الخ اول تو تعظیمِ الٰہی کا ذکر فرمایا یہ اس لیے کہ تمام حسنات کی بنیاد توحید ہے اور یہ توحید دراصل منعمِ حقیقی کا شکر بھی ہے اس لیے اس کے ساتھ شکرِ منعمِ مجازی بھی تاکیداً ذکر فرمایا۔

[1] بعض علماء لا تعبدون کو خبر بمعنی انشاء کہتے ہیں اور خبر کے پیرایہ میں حکم مؤکد ہوتا ہے۔ ۱۲ منہ

وبالوالدین احسانا کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا گویا توحید کے بعد ماں باپ کی تعظیم و حرمت دوسرے درجہ کا حکم ہے اور صرف ماں باپ ہی نہیں بلکہ ان کے سبب سے جو رشتۂ قرابت پیدا ہوا ہے ان اہلِ قرابت کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا خواہ وہ ماں کے اہلِ قرابت ہوں یا باپ کے، چچا، پھوپھی، دادا، دادی، چچا اور پھپھیوں کی اولاد، خالہ، ماموں اور ان کی اولاد یہ قرابتِ نسبی ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ قرابت سببی اور رضاعت اور قرابت صحبت و محبت بھی بموجبِ آیۃ ملحوظ رکھی جائے۔ اب جس طرح ماں باپ کی تعظیم کا جزء اہلِ قرابت کی تعظیم تھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا جزء اس کی مخلوق پر رحم کھانا ہے گویا یہ اس کے عیال ہیں بالخصوص ان میں سے دو گروہ والیتمٰی والمساکین سے سلوک کرنا عام ہے کہ قرابت دار ہوں یا نہ ہوں۔ اگر قرابت دار ہیں تو اور زیادہ قابلِ ترحم ہیں اور زیادہ ثواب ہوگا۔ یتیم اس نابالغ کو کہتے ہیں جس کا باپ مر جائے۔ مسکین وہ مفلس ہے جو صاحبِ زکوٰۃ نہ ہو۔ عام ہے کہ تندرست ہو یا بیمار اور عموماً بنی نوع کے لیے عمدہ بات کہنا وقولوا للناس حسنا عمدہ بات اچھی صلاح دینا، کوئی دنیاوی اخروی تعلیم دینا، فحش اور بد کاموں سے بہ نرمی و اخلاق منع کرنا اور کم سے کم میٹھی بات اخلاق سے بولنا، ترش روئی اور کج ادائی سے پیش نہ آنا۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کی عبادت و طاعت کا حکم ذکر فرمایا۔ اقیموا الصلوۃ کہ اس کے لیے نماز پڑھنا، دعا کرنا، سجدہ کرنا، مصائب میں اسی سے التجا کرنا یہ بھی نماز کا جزء ہے اور دل میں اسی کا تصور کرنا یہ بھی نماز ہے مگر ہیئتِ مخصوصہ جو نماز جملہ شرائط کے ساتھ ہو ان سب کو شامل ہے۔ اس لیے وہ فرض ہے مسلمانوں پر رات دن میں پانچ وقت یہود پر جو نماز جس ہیئت سے فرض تھی اس کی تشریح ان کی کتابوں میں ہے اب فرائض و نوافل سب اس میں آ گئے۔ یہ بدنی اور روحانی عبادت تھی۔ اس کے بعد واتوا الزکوٰۃ مالی عبادت کا حکم صادر فرمایا۔ مال کی جڑ بنی آدم کے دل پر ہوتی ہے جب تک اس منعمِ حقیقی کی راہ میں اس کو صرف نہ کرے گا نماز بھی ایک رسمی بات سمجھی جائے گی اور اگر زکوٰۃ دے گا تو یتامیٰ اور مساکین کا بھی حق ادا ہوتا رہے گا ورنہ ماں باپ اور اقارب کے ساتھ سلوک تو شائستہ انسانوں کا فطری شیوہ ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ فرض ہے مال کی سال بھر کے بعد چالیسواں حصہ اس کے مستحقوں کو دینا چاہیے اور جو زیادہ دے ثواب ہے۔ یہود میں بھی یہی زکوٰۃ فرض تھی اس کی مقدار اور دیگر احکام ان کی کتابوں میں ہیں وہ یہ احکام ہیں جن کی خوبی میں کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور اس لیے یہی احکام اسلام میں بھی ہیں کیونکہ توریت کے جس قدر احکام قرآن میں نقل کیے گئے ہیں اگر منسوخ ہونا ثابت نہ ہو تو ان کا حکم باقی ہے۔ مگر بجز چند لوگوں کے یہود نے ان سے منہ موڑ لیا۔ اس پر یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے محب ہیں۔ قسم دوم کے احکام اگلی آیت میں بیان فرماتا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ
يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝٨٥ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝٨٦ ع

اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خون ریزی نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو جلاوطن کرنا پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس کی) شہادت بھی دیتے ہو پھر تم ہی تو ہو جو اپنے لوگوں کو آپ قتل کرتے ہو اور اپنے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے باہر نکالتے ہو۔ ان پر گناہ اور زیادتی سے چڑھائی کرتے ہو اور اگر (وہی لوگ غیر قوموں کے) قیدی ہو کر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔ پھر کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو پھر جو تم میں سے ایسا کرے اس کی یہی سزا ہے کہ دنیا میں بھی رسوا ہو اور قیامت کے روز بھی سخت عذاب میں ڈالا جائے اور اللہ تمہارے کام سے غافل نہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلہ میں دنیا کی زندگی کو خرید لیا پس نہ ان کے عذاب میں کمی ہوگی اور نہ ان کی مدد کو کوئی پہنچے گا۔

ترکیب: وعطف کے لیے کہ جو ایک جملہ کا دوسرے جملہ پر چلا آتا ہے۔ اخذنا فعل بافاعل میثاقکم مفعول لا تفسکون الخ بدل ہے میثاق سے انتم مبتداء ھؤلاء علٰی حذف مضاف خبر ای مثل ھؤلاءِ اور تقتلون اور تخرجون حال ہیں اور عامل ان میں معنی تشبیہ۔ تظاھرون الخ جملہ موضع نسب میں ہے۔ اس لیے کہ یہ حال ہے فاعل تخرجون سے۔ تظاھرون اصل میں تتظاہرون تھا ایک ت حذف ہو گئی اور بعض ت ثانی کو ط سے بدل کر ظ کو ظ میں ادغام کر کے مشدد پڑھتے ہیں۔ عدوان مصدر ہے بروزن کفران بمعنی ظلم۔ اسارٰی جمع اسیر ہے۔ فاعل یاتو سے اور بعض نے اس کو اسریٰ بھی پڑھا ہے۔ تفادوھم جواب شرط ہے وھو ضمیر شان مبتدا محرم خبر اخراجھم مرفوع بسبب محرم کے اور یوں بھی ہوسکتا ہے کہ اخراجھم مبتدا اور محرم خبر مقدم اور جملہ خبر ہو اور ھو اخراج کی طرف بھی رجوع ہوسکتا ہے اور یہ جملہ معترضہ ہے ما نافیہ جزا الخ اسم خزی خبر فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا صفت و موصوف کا مجموعہ خزی کی صفت ہے اور ممکن ہے کہ ظرف ہو۔

تفسیر: یہ قسم دوم کے احکام ہیں۔ ان کو بھی بتاکید شدید یہود پر فرض کیا تھا جس کو بلفظ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ اور پہلے لفظ بنی اسرائیل ذکر فرمایا تھا۔ اس عنوان کے بدلنے میں نکتہ یہ ہے کہ اول آیت میں اگلے بنی اسرائیل کا ذکر کیا تھا اور اس میں موجودہ یہود کی طرف خطاب ہے۔ اگرچہ یہ دونوں قسم کے احکام فرض تو اگلے ہی بنی اسرائیل کے عہد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت ہوئے تھے جیسا کہ توریت میں ذکر ہے۔ گزشتہ آیت میں قسم اول کے پانچ حکم تھے خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ سے' اہل قرابت سے' یتیموں سے' مسکینوں سے سلوک کرنا، لوگوں سے عمدہ بات کہنا، نماز قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اسی طرح ان آیات میں قسم دوم کے دو حکم ذکر فرمائے۔ آپس میں خونریزی نہ کرنا' اپنی قوم کو ناحق باہر نہ نکال دینا یعنی جلاوطن، ظلم و زیادتی سے نہ کرنا۔ کس لیے کہ تمدن خراب ہو جائے گا۔ قومیت کا قوام باطل ہو جائے گا۔ قوتِ اجتماعیہ زائل ہو جانے سے مخالفوں کو تم پر حملہ کرنے کی جرأت ہوگی۔ وہ تمہارے ملک کے بادشاہ ہو جاویں گے' تم کو محکوم اور غلام بنالیں گے' تمہارا ناموس' تمہارا مذہب بھی تمہارے ہاتھ میں نہ رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہ حکم مسلمانوں پر بھی بقاعدہ مذکورہ فرض ہیں۔ ان پر بھی آپس کی لڑائی' مار دھاڑ' جلاوطن کر دینے سے جو جو مصائب نازل ہوئے اور اب تک ہیں کسی تاریخ داں پر مخفی نہیں۔ ان دونوں حکموں کو بنی اسرائیل نے خیمۂ شہادت کے پاس حاضر ہو کر قبول کیا تھا۔ اب اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود اور ان کے بزرگوں سے خطاب کر کے الزام دیا جاتا ہے۔ بقولہ ثُمَّ اَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ کہ پھر تم وہ ہو کہ باوجود اس اقرار کے آپس میں خونریزی بھی کرتے ہو اور ایک گروہ دوسرے کو جلاوطن بھی کرتا ہے اور عجب تر یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے اگر کوئی دوسری قوم کے ہاتھ میں اسیر ہو جاتے ہیں تو اسرائیلی کا آزاد

کرانا کارِ ثواب جان کر مال دے کر انہیں اسیری سے رہا کراتے ہیں۔ حالانکہ جلاوطن کرنا ہی حرام تھا۔ جس کے سبب وہ اسیر ہوئے۔ فرماتا ہے کیا توریت کے ایک جز پر تو ایمان رکھتے ہو کہ اسیروں کو رہا کراتے اور ایک جز جلاوطن نہ کرنے اور ناحق چڑھائی نہ کرنے کے حکم سے انکار ہے۔ یہ خوب ایمان ہے؟ پھر ایسی نفس پرست قوم کی یہی سزا ہے کہ دنیا میں رسوا اور ذلیل ہوں اور آخرت میں اشد عذاب ہو۔ تاریخِ بنی اسرائیل میں معلوم ہوا ہوگا کہ بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کیسا اختلاف ہوا اور باہم کیا کیا خونریزیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حکومت برباد ہوگئی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں ذلیل رعایا بن کر رہتے ہیں۔ مدینے کے قریب جو یہود کے دو گروہ بنی نضیر و بنی قریظہ رہتے تھے وہ بھی آپس میں اپنے اپنے حلیفوں انصارِ مدینہ کے دو قبیلوں بنی اوس اور بنی خزرج کے ساتھ ہو کر لڑتے تھے ان انصاری قبیلوں میں سو برس سے شعلۂ جنگ مشتعل تھا باہم لڑا کرتے تھے۔ یہ شعلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آ کر بجھا دیا اور سب کو برادرِ دینی بنا دیا۔ مدینہ کے یہود آخر اپنی نالائق حرکات سے مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جلاوطن کئے گئے۔ اس سے زیادہ اور کیا دنیا کی رسوائی ہوگی۔ اس آیت میں یہ پیشین گوئی ہے جو بہت جلد صادق ہوئی۔ آخر کار عذاب اور ابدی جہنم تو ان کے لیے باقی ہے۔ یہ دونوں حکم گویا احکامِ خمسہ کا تتمہ ہیں، کس لیے کہ اہلِ قرابت پر چڑھائی کرنا' قتل کرنا، جلاوطن کر دینا اس سلوک اور احسان کے منافی ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے آخرت کی کچھ پروا نہ کی۔ اس جہان کے عیش و آرام کے بدلہ میں دنیائے فانی کو حاصل کرنا مقدم سمجھا۔ سو یہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی نہ کوئی ان کی مدد کر سکے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝٨٧

اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور اس کے بعد بھی پے در پے رسول بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی، کیا (یہی کرنا تھا کہ) جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ حکم لائے کہ جس کو تمہارا دل نہ چاہے تو تم اکڑتے جاؤ۔ پس ایک گروہ کو جھٹلانے اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگو۔

ترکیب: آتینا فعل بافاعل موسیٰ مفعول اول۔ الکتاب مفعول ثانی۔ قفینا میں ی واو سے بدل گئی بولتے ہیں قفا یقفو اذ اتبعہ چونکہ واو چوتھے مرتبہ میں واقع ہوا ی سے بدل گیا بالرسل بذریعہ ب مفعول قفینا کلما حرف شرط استکبرتم جواب شرط فریقا مفعول مقدم کذبتم۔ اسی طرح تقتلون کا فریقاً مفعول مقدم ہے۔

تفسیر: اب جو کچھ بنی اسرائیل نے رسولوں کے ساتھ سلوک کیا تھا اور کر رہے ہیں اس کا ذکر ان آیات میں اور اگلی آیات میں بیان فرماتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ نہ صرف قوتِ عملیہ ہی خراب ہوگئی تھی بلکہ قوتِ نظریہ بھی جاتی رہی تھی اور انسان کی نجات انہی دو قوتوں کی اصلاح پر موقوف ہے۔ پھر ان خرابیوں پر یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے دوست اور اس کے بیٹے ہیں چند روز جہنم کے بعد ہماری نجات یقینی ہے اور جب اپنے خاندان کے اس قدر انبیاء کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ رہا ہے تو نبیِ عربی علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ ان کی بدسلوکی ہو متوقع ہے فقال وَلَقَدْ آتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اس میں اہلِ اسلام اور اہلِ کتاب کا اتفاق ہے کہ اس کتاب سے مراد توریت ہے گو اہلِ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اور کتابیں بھی منسوب کرتے ہیں جیسا کہ توریت موجودہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس فرمانے سے یہ مطلب کہ

موسیٰ علیہ السلام کے مرنے سے دینِ موسوی نہیں مر گیا تھا تا کہ بنی اسرائیل کو اپنی بدعہدیوں اور بداعتقادیوں کی نسبت کوئی عذر ہو سکے بلکہ موسیٰ کی کتاب موجود تھی اور اس کتاب کی ترویج اور تعلیم کے لیے وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ان کے بعد پے درپے رسول بھی بھیجے اور ان سب کے بعد وآتینا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ عیسیٰ بن مریم کو معجزات دے کر بھیجا اور روح القدس کے ساتھ ان کی تائید کی۔ اس لیے وہ مردوں کو زندہ، بیماروں کو تندرست، اندھوں کو آنکھ والا کر کے دکھا دیتے تھے جس سے تمام بنی اسرائیل میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ حاصل یہ کہ وہ ہدایت کا مدرسہ موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عہدِ عیسیٰ علیہ السلام تک قائم رہا بڑے بڑے معلمین آئے مگر بنی اسرائیل کی ازلی بدبختیوں نے یہ کیا اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ کہ جب کوئی رسول ان کی خواہش کے برخلاف کوئی حکم لایا تو اس سے اکڑ گئے، منہ پھیر گئے پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ بہت کو تو صاف صاف جھٹلا دیا اور بڑی بے عزتی سے پیش آئے اور بہت کو قتل کر ڈالا پھر ایسے بیمار جو خلافِ مرضی نسخہ نہ پیویں طبیبوں کو جھٹلائیں اور مار ڈالیں شفا پا سکتے ہیں؟ پھر اس روحانی مرض کی سزا موتِ ابدی یعنی دائمی جہنم نہیں تو اور کیا۔

فائدہ ۱: موسیٰ کو توریت دی اس سے ثابت ہوا کہ اب جو کتاب اہلِ کتاب میں نام نہاد توریت موجود ہے جس کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور شخص نے موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ میں لکھی ہے اصل توریت نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل جو انبیاء کو قتل کیا کرتے تھے انہوں نے توریت کو بھی قتل کر دیا اور اس کو کھو بیٹھے۔

فائدہ ۲: روح القدس سے مراد بعض علماء کے نزدیک جبریل علیہ السلام ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جبریل کے سوا ایک اور فرشتہ ہے جس کو روح الاعظم کہتے ہیں۔ عیسائی روح القدس کو بھی خدا اور مجموعۂ خدائی کا ایک جزیا رکن کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا ایک اقنوم اس کو باپ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، بیٹا یعنی عیسیٰ علیہ السلام جس کو یسوع کہتے ہیں دوسرا اقنوم روح القدس تیسرا اقنوم تینوں خدا پھر تینوں مل کر ایک خدا نہ تین اس کو وہ تثلیث فی التوحید کہتے ہیں اور اس اعتقادِ باطل پر نجات کا مدار ٹھہراتے ہیں۔ یہ غلط خیال عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کئی سو برس بعد پیدا ہوا ہے اس کا قرآن اور عقلِ سلیم نے ابطال کر دیا۔ قدیم اور جدید فلسفہ بھی اس کو ایک جاہلانہ خیال بتلاتا ہے اور دراصل ہے بھی یہی۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ
یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ښ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾

اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں (نہیں) بلکہ ان پر ان کے کفر کے سبب اللہ نے لعنت کر دی جو بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں اور جب کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب ان کے اصولِ مذہب کی تصدیق کرتی ہوئی آئی حالانکہ اس سے پیشتر (اس کی برکت سے) کافروں پر فتح یابی بھی چاہا کرتے تھے لو پھر جب ان کے پاس وہ قرآن کہ جس کو پہچان لیا تو اس کے منکر ہو گئے سو منکروں پر خدا کی مار ہے۔

ترکیب: قالوا فعل ھم ضمیر فاعل قلوبنا مبتداء غلف بضمِ لام جمع غلاف اور لام کا سکون بھی ہو سکتا ہے کیونکہ مضموم کو ساکن بعض مواقع میں عرب کر دیتے ہیں (جیسا کہ کُتُبْ اور کُتُب) خبر جملہ مقولہ ہے۔ بل اضراب کے لیے۔ بکفرھم کی ب لعن سے متعلق ہے فقلیلاً منسوب

ہے، اس لیے کہ صفت ہے مصدر محذوف کی اور ما زائدہ ہے۔ ای فایمانا قلیلا یؤمنون لما حرف شرط جاء فعل ھم مفعول کتب موصوف من عند الله مصدق صفتِ دوم اور بعض نے مصدقاً بھی پڑھا ہے۔ اس تقدیر پر یہ حال ہے پس یہ مجموعہ فاعل جواب شرط انکر وہ محذوف ہے و کانوا فعل ضمیر فاعل من قبل متعلق ہے فعل سے۔ یستفتحون الخ جملہ خبر کانوا یہ سب جملہ حال ہے ضمیر ھم سے یا جملہ معترضہ ہے فلما جاء الخ شرط کفروا جواب شرط ہے۔

تفسیر: اس سے پہلے تک تو بنی اسرائیل کا وہ معاملہ جو اسرائیلی انبیاء اور ان پر منزل کتابوں کے ساتھ تھا بیان ہوا، اب یہاں سے جو کچھ ان بدبختوں کا معاملہ نبیِ آخر الزمان علیہ السلام اور قرآن کے ساتھ تھا اس کو بیان فرمایا جاتا ہے۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے یہود قرآن مجید اور نبوتِ نبی علیہ السلام قبول نہ کرنے کا یہ سبب بیان کرتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں یعنی وہ جو کچھ ہم کو اپنے بزرگوں سے پہنچا ہے اسی پر ہم مستحکم ہیں۔ نئی بات قبول نہیں کر سکتے۔ یہ ایک محاورہ ہے نئی بات قبول نہ کرنے کی بابت یعنی ہم جس بات پر ہیں بڑے پکے ہیں۔ اپنی خوبی بیان کرتے ہیں حالانکہ حق کی روشنی قبول نہ کرنا کوئی خوبی اور استحکام نہیں۔ بلکہ دلوں میں زنگ اور آلودگی اس قدر ہے کہ ان پر انوارِ ہدایت کا اثر نمایاں نہیں ہوتا جس طرح زنگ آلود آئینہ پر نورِ آفتاب نہیں نمایاں ہوتا۔ اسی بات کو بطور استعارہ کے خدا تعالیٰ اس جملہ میں بیان فرماتا ہے۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ کہ ان کے کفر اور ضلالت کے سبب جو ان کے انبیاء اور کتابوں سے سرکشی و انکار سے پیدا ہوئی ہے خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے اس قدیم لعنت کا زنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں جس طرح زنگ آلود آئینہ میں بہت کم نورِ تاباں ہوتا ہے ہاں کبھی کچھ دھندلی سی روشنی کا عکس دکھائی دے جاتا ہے اور جو کچھ انکار اور سرکشی ہے تو عمداً ہے اور جان بوجھ کر ہے کس لیے کہ قرآن اور نبی آخر الزمان کے ظاہر ہونے سے پہلے ان بشارات کی وجہ سے جو ایک آنے والے اولوالعزم نبی اور ایک نئے قانونِ آسمانی کی بابت تھیں ان کو اشد انتظار تھا اپنے مقاصدِ دینی و دنیاوی اسی پر منحصر سمجھے بیٹھے تھے۔ کس لیے کہ بموجب بشارتِ تورات سفر استثناء باب ۱۸ و دیگر کتب انبیاء مثل صموئیل و حزقیل و دانیال کے ان کو ایک نبیِ آخر الزمان کا انتظار تھا جس پر مخالفوں کے مقابلہ میں اپنی ترقی اور فتح مندی کو منحصر جانتے تھے اور مدینہ کے یہود بنی اسد اور بنی غطفان وغیرہ قبائلِ عرب سے جب شکست کھا کر عاجز ہوتے تو اپنے علماء کی تعلیم سے یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اللھم ربنا انا نسئلك بحق احمد ن النبی الامی الذی و عدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان و کتابك الذی تنزل علیه آخر ما ینزل ان تنصرنا علیٰ اعدائنا کہ الٰہی ہم کو برکتِ نبیِ آخر الزماں احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور برکتِ قرآن مجید کے ہمارے دشمنوں پر فتح یاب کر (رواہ الحاکم والبیہقی) امام احمد اور طبرانی نے سلمہ بن قیس سے روایت کی ہے کہ ہمارے محلہ بنی عبدالاشہل میں ایک یہودی رہتا تھا اس نے ہم سے عالمِ آخرت کے عذاب اور ثواب کا ذکر کیا تو ہم نے اس سے دلیل پوچھی۔ اس نے کہا عنقریب مکہ کی طرف سے ایک نبی مبعوث ہوگا وہ اس بات کو ثابت کر دے گا۔ ہم نے پوچھا وہ کب ظاہر ہوگا؟ اس نے میری طرف نظر کر کے کہا اگر یہ لڑکا عمرِ طبعی تک جیتا رہے گا تو دیکھ لے گا۔ سلمہ کہتے ہیں چند روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مشہور ہوئی پھر جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے اس یہودی سے کہا اب تو ان پر کیوں ایمان نہیں لاتا؟ اس نے خجل ہو کر کہا یہ وہ شخص نہیں فَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آئی یعنی قرآن مجید اور کتاب بھی وہ کہ جو مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ان کے اصولِ مذہب کی تصدیق کرتی ہوئی تھی کیونکہ جو کچھ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے واقعات، فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا ماجرا بعد کے واقعات اور اسی طرح احکامِ اخلاقی و روحانی اور دیگر عقائد کے بابت ذات و صفات اور دوزخ و جنت و انبیاء و ملائکہ بیان کئے اب وہی تو ہیں کہ جن کو مانتے اور ان کے معتقد تھے۔ بجز حذفِ زوائد و اتمامِ بعض نقصانات ہو بہو وہی ہیں اور ان کے آنے کے بعد یہود نے جان بھی لیا کہ یہ وہی کتاب اور وہی نبی تھے کہ جس کے ہم منتظر تھے مگر بجائے ایمان لانے کے کیا کیا کفروا به منکر ہو گئے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى

الْکٰفِرِیْنَ ان منکروں پر خدا کی لعنت ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ
وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ
بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ
مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

انہوں نے اپنی جانوں کو بہت ہی بری چیز کے لیے بیچ ڈالا (وہ یہ) کہ اللہ کی نازل کی ہوئی چیزوں کا اس ضد میں آ کر انکار کرنے لگے کہ وہ اپنے فضل (وحی) کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں نازل کر دیتا ہے پس انہوں نے غصہ پر غصہ کمایا اور کافروں کو ذلت کا عذاب ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس کے سوا سب کے منکر ہیں حالانکہ وہ (کہ جس کے منکر ہیں یعنی قرآن) وہ برحق جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے (اے محمد) ان سے پوچھو اگر ایماندار تھے تو خدا کے رسولوں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے۔ اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ معجزے لے کر آئے پھر اس کے بعد بھی تم نے بچھڑا ابنا لیا حالانکہ تم بڑا ستم کر رہے تھے۔

ترکیب : بئس فعل ذبہ نکرہ موصوفہ اشتروا بہ انفسھم جملہ اس کی صفت یہ سب اسم بئس ان یکفرو الخ بتاویل مصدر خبر مبتدا محذوف جملہ مخصوص بالذم (یہاں اور بھی احتمالات ہیں) بغیًا مفعول لہ ہے یکفروا کا ان ینزل الخ ای لان ینزل الخ یہ جملہ بغیًا کا مفعول لہ ہے یعنی ان کی ضد اس لیے ہے کہ خدا اپنے فضل سے جس پر چاہتا ہے کیوں نازل کرتا ہے بنی اسرائیل کا مقید کیوں نہیں رہتا۔ اذاقیل الخ شرط قالوا الخ جواب شرط و یکفرون الخ جملہ حال ہے اس ضمیر سے جو قالوا میں ہے وراءہ ضمیر ما کی طرف رجوع ہے وراء کی ہمزہ ی سے بدل گئی ہے لانہ یقال تورات اور ابن جنی کے نزدیک ہمزہ اصلی ہے وراء اصل میں مصدر ہے ظرف بنایا گیا مصدقا حال مؤکدہ ہے اور عامل اس میں معنی حق ہیں اور اس میں ضمیر مستر ذوالحال ہے۔ ان کنتم الخ شرط جواب محذوف دلالت کرتا ہے اس پر جملہ قبل وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ حال ہے اور فاعل اتخذتم سے یا الگ جملہ۔

تفسیر : یہ پہلی آیت کا تتمہ ہے یعنی یہود نے جو قرآن مجید کا انکار کیا ہے تو اس ضد سے کہ خدا تعالیٰ کیوں جس پر چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے وحی نازل کر دیتا ہے کس واسطے ہمارے ہی خاندان میں سے نبی آخر الزماں مبعوث نہ کیا۔ ان کے اس انکار اور ضد کو تجارت سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کس لیے کہ انسان جو دنیا میں آیا ہے گویا ایک تاجر ہے جس کا راس المال اس کی عمر ہے اور جو کچھ نیک و بد وہ کر رہا ہے یہ وہ مال ہے کہ جن کو عمرِ گرانمایہ دے کر لے رہا ہے۔ یہود نے جو اپنی جانیں یعنی حیاتِ دنیا کے مال سے جو کچھ خریدا یا کھویا حیاتِ ابدی برباد کر کے جو کچھ کمایا وہ یہی کہ خدا کی منزل چیزوں کا انکار کیا۔ سو یہ بہت برا سودا ہے اور ما انزل اللہ کا انکار اس ضد اور عناد سے کیا کہ اللہ اپنے فضل و

کرم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں وحی نازل کر دیتا ہے۔ کیوں بنی اسماعیل یعنی محمد ﷺ پر قرآن نازل کر دیا؟ ہم کو خدا کے نازل کئے ہوئے سے انکار نہیں بلکہ اس تعیم سے حالانکہ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کس لیے کہ جب خدا کسی کی معرفت کوئی چیز نازل کرے تو باوجود حق ہونے کے اس کے انکار کی کیا وجہ بالخصوص جب وہ منزل ان کے پاس جو کچھ ہے اس کی تصدیق کر رہا ہو۔ ان کا یہ دعویٰ بھی کہ جو کچھ ہم پر یعنی ہمارے نبیوں پر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں غلط ہے کس لیے کہ انبیاءِ بنی اسرائیل کا قتل کرنا ان کے دعوائے ایمانی کے منافی ہے اور خود موسیٰ علیہ السلام پر توریت میں غیر اللہ کی پرستش کی ممانعت تھی مگر اس پر بھی بچھڑا ابنا کر پوجا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ
وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۚ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ
بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۵﴾
وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ یَوَدُّ
اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ
ع ۱۰ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہ طور اٹھایا کہ جو تم کو ہم نے دیا ہے (تورات) اس کو مضبوطی ہو کر لو اور سنو انہوں نے کہا سن تو لیا لیکن مانیں گے نہیں اور ان کے دلوں میں تو ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑا سرایت کر گیا تھا (اے نبی) کہہ دو اگر تم ایماندار ہو تو تمہارا ایمان تم کو بہت ہی برا حکم دے رہا ہے کہہ دو اگر آخرت کا گھر خدا کے نزدیک اگر سب کے علاوہ خاص تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو اور وہ تو اس کی ہرگز ہرگز کبھی بھی آرزو نہ کریں گے۔ اپنے اعمال کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے کیے ہیں اور اللہ تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اب ان کو زندگی کا سب لوگوں سے زیادہ (خاص کر) مشرکوں سے بھی زیادہ حریص پائیں گے۔ ان میں ہر ایک آرزو کرتا ہے کہ کاش ہزار برس کی عمر دی جائے اگر (اتنی) عمر بھی دی جائے تو بھی وہ عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ اور جو کچھ بھی وہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔

ترکیب : قالوا فعل بافاعل سمعنا وعصینا مفعول واشربوا فی قلوبھم العجل ای حب العجل بکفرھم ای بسبب کفرھم یہ جملہ بہ تقدیر قد حال ہے ضمیر قالوا سے۔ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ الخ جواب ہے ان کے قول سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کا۔ قل فعل بافاعل ان کانت الخ جملہ شرطیہ مقولہ الدار موصوف الآخرۃ صفت مجموعہ اسم کان لکم متعلق ہے کانت سے خالصۃ خبر کان عنداللہ ظرف خالصۃ ہے من دون الناس بسبب خالصۃ کے موضع نصب میں ہے کہتے ہیں خلص کذا من کذا یہ سب جملہ شرط اور فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ شرط اول اور ان کنتم

صادقین [1] شرط ثانی (دونوں کا جواب ہے) (جلالین) ابدًا ظرف ہے بِمَا قَدَّمَتْ کا وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا [2] میں دو وجہ ہیں ایک یہ کہ یہ بمعنی الناس پر معطوف ہے ای احرص من الناس الذین فی زمانھم واحرص من الذین اشرکوا یعنی بہ المجوس دوم یہ کہ جملہ مستانفہ مانا جاوے ای من الذین اشرکوا قوم یود احدھم لویعمر میں لو بمعنی ان ہے ماھو بمزحزحہ ما نافیہ ھو ضمیر راجع احد کی طرف اور بمزحزحہ خبر ما ای و ذلک المتمنی بمزحزحہ من العذاب متعلق ہے مزحزحہ سے ان یعمر موضع رفع میں ہے بسبب مزحزحہ کے ای وما الرجل بمزحزحہ تعمیرہ سنۃ کی اصل سنو ہے بدلیل سنوات جس کے معنی سال اور برس کے ہیں۔ الزحزحہ دور کرنا۔

تفسیر : اب یہاں یہ بات ظاہر فرماتا ہے کہ تمہارا دعویٰ نؤمن بما انزل علینا بھی صریح غلط ہے اول تو تم نے خود موسیٰ علیہ السلام کے معجزاتِ بیّنات کا انکار کیا اور انبیاء کو قتل کیا۔ دوم جس کتاب کو تم اپنا ایمان سمجھتے ہو اس کو بھی تو تم نے نہ مانا حالانکہ جب وہ تم کو دی گئی تھی تو اس وقت کوہِ طور کو تم پر بلند کیا تھا اور تم نے یہ جان لیا تھا کہ اگر اب اس کو نہیں لیتے ہیں تو ہم پر پہاڑ آ پڑتا ہے۔ اس وقت بھی تمہارا یہ حال تھا کہ زبان سے تو تم نے سمعنا کہا یعنی مان لیا اور دل میں عصینا یعنی نہیں مانا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ باوجود معجزات وکراماتِ بے شمار دیکھنے کے تم نے بچھڑا بنا کے پوجا وہ خباثت تمہارے دلوں میں اس طرح رچ گئی تھی کہ جس طرح زمین پانی کو پی لیتی ہے۔ پھر حسبِ استعداد نبات اگاتی ہے۔ اسی طرح تمہارے دل کی زمین میں خدا کی نافرمانی اور انبیاء کا قتل کرنا اور دل میں عصینا کہنا اور خدا کی منزل کتابوں کا انکار کرنا اور نبیِ آخر الزمان اور قرآن کو حق جان کر معاندانہ انکار کرنا اور خدا کی عبادت وصلہ رحمی کو توڑنا وغیرہ وغیرہ خبیثت اور ناپاک خاردار اور پُر زہر جڑی بوٹیاں اگتی ہیں جن کا کڑوا پھل تم کو دنیا اور آخرت میں اٹھانا پڑے گا اور اگر تمہارے ایمان کا یہی فتویٰ ہے کہ تم ایسی باتیں کرو تو اے نبی ان سے کہہ دو کہ یہ بہت برا فتویٰ ہے۔

منجملہ اور امانیِ باطلہ کے یہود کو ایک یہ بھی سودائے خام تھا کہ جنت خاص ہمارے لیے ہے۔ بہر حال ہم اس میں جائیں گے اس کے رد میں فرماتا ہے کہ اگر دارِ آخرت تمہارے لیے ہے تو موت کی آرزو کرو کہ اس کے وسیلہ سے دارِ آخرت میں اپنے درجات حاصل کرو کس لیے کہ جن کو وہاں کے ثواب اور نعماء کا یقینِ کامل یا روحانی مشاہدہ ہو جاتا ہے تو وہ اس عالم کا ازبس مشتاق ہو کر موت کی آرزو کیا کرتا ہے مگر یہود اپنے اعمالِ بد کی سزا سے ڈر کر موت سے بھاگتے ہیں اور ہزار برس کی عمر چاہتے ہیں کہ اعمالِ بد کا نتیجہ پیش نہ آئے اور وہ ضرور آنا ہے معلوم ہوا کہ ان کا دعویٰ غلط ہے۔

---

[1] حیاتِ دنیا ہر چند انسان کو طبعًا مرغوب ہے موت کے نام سے کوسوں دور بھاگتا ہے مگر ایک وقت یہی موت مرغوب ہو جاتی ہے۔ کبھی دنیاوی مصائب سے عام ہے کہ امراضِ شدیدہ ہوں یا اقارب کی موت ہو یا افلاس ہو یا عزت وآبرو جانے کا غم ہو اس لیے اکثر نادان خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مر کر اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے مگر یہ معلوم نہیں کہ روح نہیں مرتی۔ ہاں اس پر اس سے بھی زیادہ مصائب ہیں اور پھر وہاں موت بھی نہیں اور کبھی اعضائے جسمانی کبرسنی کی وجہ سے بیکار ہو جانے سے موت کی آرزو کیا کرتے ہیں یہ بھی نادانی ہے۔ اس لیے ہادیِ برحق معلمِ روحانی حضرت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب صورتوں میں موت کی آرزو اور دعا مانگنے سے منع فرمایا ہے چہ جائیکہ خودکشی لایتمنین احد کم الموت لضرر نزل بہ اور کبھی موت کی آرزو آخرت کے نعیم اور عالمِ روحانی کے شوق میں کیا کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ یہ بندِ قفس ٹوٹ جاوے اور یہ طائرِ قدس اس عالمِ روحانی کے باغ بے خزاں میں چلا جائے۔ اس کو وہاں کے طائرانِ خوش الحان کی صدائیں بھی کبھی سنائی دیتی ہیں اور وہاں کے نعیم اس کو دکھائی جاتے ہیں۔ یہ آرزو ابرار و صلحاء کی آرزو ہے چونکہ یہود ابرار نہ تھے اس لیے وہ اس کی آرزو نہ کرتے تھے۔

[2] و من الذین اشرکوا کے دو معنی ہیں۔ اول یہ جو تفسیر میں بیان ہیں۔ دوم یہ کہ اے نبی ان کو سب سے زیادہ حیاتِ دنیا کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ۔

فائدہ : بما قدمت ایدیھم کے لفظی معنی یہ ہیں۔ بسبب اس چیز کے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے مگر مراد یہ ہے کہ جو کچھ اعمال انہوں نے کئے اس کے سبب سے زبانِ عرب میں انسان کے افعال کو اس کے ہاتھوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کس لیے کہ غالبًا اعمال و افعال کا ذریعہ انسان کے ہاتھ ہیں اور اسی طرح انسان کو اس کے جزوِ اعظم سے بھی تعبیر کیا کرتے ہیں۔ رقبہ یعنی گردن بول کر انسان مراد رکھتے ہیں۔

یہاں اس بات سے یہ بھی بتلا دیا کہ انسان پر آخرت میں جو کچھ مصیبتیں نازل ہوں گی طوق وزنجیر اور گرزِ آتشین، آگ میں جلنا یہ سب اس کے اعمالِ بد ہیں جو اپنی مناسب صورتوں میں ظہور کریں گے اور متشکل ہو کر ایذا پہنچائیں گے جس طرح کہ عالمِ خواب انسان کے خیالات اور دیگر معانی اپنی مناسب صورتوں میں متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں اور یہ کچھ تعجب نہیں اس عالمِ حسی میں کس درجہ کے انقلابات و استحالات ہوتے ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

کہہ دو جو کوئی جبریل کا دشمن ہے (تو وہ خدا کا دشمن ہے) کس لیے کہ اس نے تو اس (قرآن) کو آپ کے دل پر خدا کے حکم سے اتارا ہے وہ اپنے سے پہلی باتوں کی تصدیق کر رہا ہے وہ مومنوں کو ہدایت اور خوشخبری دے رہا ہے اور جو کوئی خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ ہی کافروں کا دشمن ہے اور بے شک ہم نے آپ کے پاس کھلی ہوئی آیتیں بھیج دی ہیں اور ان کا بدکار لوگ ہی انکار کیا کرتے ہیں۔

ترکیب : قل من کان من شرطیہ اور جواب اس کا فھو عدو اللہ وغیرہ محذوف باذن اللہ موضع حال میں ہے ضمیر فاعل نزل سے جو جبرئیل کی طرف پھرتی ہے والتقدیر نزلہ ومعہ الاذن وماذونا۔ مصدقا حال ہے نزلہ کے ہاء سے اور اسی طرح ہدی وبشری۔

تفسیر : منجملہ یہود کے قبائح کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کہتے تھے قرآن بہت ٹھیک، اس میں جو کچھ ہے وہ بھی صحیح، مگر جو اس کو لے کر آتا ہے یعنی جبرئیل ہم کو اس سے عداوت ہے۔ عداوت کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہود کو بے حد عداوت تھی اور وہ روح القدس سے مؤید تھے۔ حق سبحانہ ان کے ایمان کی بے وقعتی بیان فرماتا ہے کہ انبیاء کو قتل کیا کتبِ منزلہ جو عہدِ مؤثق کے ساتھ دی گئی تھیں ان کو پسِ پشت ڈال دیا ان کے احکام کو چھوڑ دیا ان میں اپنی طرف سے ملا کر لوگوں کو دنیا کمانے کے لیے دھوکے دیے۔ اب رہے ملائکہ مقدسین جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان سے دشمنی۔ اب یہ کیا ایمان ہے اس پر دارِ آخرت کا استحقاق ہے بعض مفسرین نے ان آیات کی بابت یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ میں تشریف لائے اور یہود کو ہدایت کرنی شروع کی تو یہودیوں نے اپنے چند علماء کو (جن کا سرغنہ عبداللہ بن صوریا ساکن فدک تھا) آپ کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم آپ سے چند باتیں پوچھتے ہیں جن کو سوائے انبیاء کے اور کوئی نہیں جانتا اگر آپ نے صحیح جواب دیا تو آپ قطعی وہ نبی ہیں جن کی خبر موسیٰ علیہ السلام نے دی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوال کئے اور آپ نے صحیح جواب دیے اور ان علماءِ یہود نے وہ جواب تسلیم بھی کر لیے۔ تب آپ نے پوچھا اب کیوں مجھ پر ایمان نہیں

لاتے؟ انہوں نے کہا ایک وجہ ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے پاس جو وحی لاتا ہے وہ جبرئیل فرشتہ ہے اس سے ہم کو سخت دشمنی ہے کیونکہ اس نے کئی بار ہم پر عذابِ الٰہی پہنچایا ہے (رواہ ابن جریر و حاتم و طبرانی و احمد وغیرہم)۔ خدا تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ جبرئیل جو کچھ کرتا ہے حکمِ الٰہی سے کرتا ہے۔ اس نے یہ قرآن جو حضرت کے قلب پر نازل کیا ہے تو ہمارے حکم سے۔ اب جو اس کا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے۔ دوم تم خود اس قرآن میں غور کرو کہ یہ کیسا ہے؟ اس سے کوئی صاحبِ عقلِ سلیم انکار نہیں کرسکتا۔ کس لیے کہ جو لوگ اگلے انبیاء کے مقلد ہیں تو یہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ہے کہ سب اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اس کے اصول اور عمدہ مطالب حرف بحرف ان کے مطابق ہیں۔ اس صورت میں اس کا انکار سابقہ کتبِ الٰہی کا انکار ہے اور جو کسی سابق نبی یا کتاب کا مقلد نہیں بلکہ جو دلائل عقلِ سلیم کے موافق ہو اور جس میں تمام باتیں مصالحِ دین و دنیا ہوں اس کو مانتے ہیں تو ان کو بھی اس سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ یہ ہدیٰ یعنی ہدایت ہے اور جو صاحبانِ قلبِ سلیم ہیں خدا سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے شوق اور تسلی بخش باتوں کے طالب ہیں ان کو بھی اس کا ماننا ضروری ہے کیونکہ یہ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ہے کہ اہلِ ایمان کو تسلی اور خوشخبری اس سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تین اوصاف جب قرآن میں ہیں تو پھر اس وجہ سے انکار کرنا کہ اس کو جبرئیل لائے ہیں محض حماقت ہے۔ یہ بات کہ جبرئیل ہمارے دشمن ہیں کل یہود کا مقولہ نہ تھا بلکہ ان کا کہ جو مدینہ اور اس کے اطراف میں رہتے تھے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ۔ ہم مقدمۂ کتاب میں بیان کرچکے ہیں کہ بندہ کو علاقۂ جسمانی کی وجہ سے ہر وقت خدا سے وہ اتصالِ روحانی نہیں رہتا کہ جو بسبب تجرد کے ملائکہ بالخصوص اخص المقربین حضرت جبرئیل کو ہے۔ اس لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے الفاظِ مخصوصہ میں جبرئیل حضرت نبی ﷺ کے قلب پر وحی القا کرنے کے لیے مامور تھے۔ عام دستور تو یہ ہے کہ پیشتر کوئی مضمون کانوں تک پہنچتا ہے پھر اس کے بعد قلب میں جاتا ہے مگر خاصانِ خدا کے قلب میں بلا ذریعہ سماعتِ کلام کی رسائی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بڑی بڑی سورتوں کو جبریل سے سن کر نہ بھولتے تھے۔ باقی وحی کے اقسام اور اس کے اسرار ہم مقدمہ میں بیان کرچکے ہیں۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ یہود کو الزام دیتا ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسولوں اور ملائکہ بالخصوص جبریل و میکائیل کا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے یہ بات علماءِ یہود بھی مانتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں کہ ملائکہ پر ایمان لانا ضرور ہے۔ اس بناء پر جو ملائکہ بالخصوص اعظم ملائکہ جبرئیل یا میکائیل کا دشمن ہے قطعی کافر ہے۔ یہود کے اقرار سے ان کا کفر ثابت ہوگیا ملائکہ کے بعد جبرئیل و میکائیل کا نام لینا تخصیص بعد تعمیم ہے کہ جو ان کے شرف و فضل کی دلیل ہے اور یہ تخصیص فصحا و بلغا کے کلام میں بلکہ ہر زبان میں بکثرت مستعمل ہے۔ پس وہ جو بعض ناسمجھ پادریوں نے اس پر اعتراض کرکے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر عیب لگایا ہے ان کی نادانی ہے۔

فائدہ: بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہود سے اس بارہ میں کچھ کلام ہوا۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہود سے کہا کہ جبریل جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں پھر جو ان کا دشمن ہے خدا کا دشمن ہے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے حضور میں حاضر ہوئے تو اسی مضمون کی یہ آیت نازل ہوئی اس پر بعض ناسمجھ پادری یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ جملہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سن کر قرآن میں درج کیا۔ اول تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سن کر یہ جملہ نہیں پڑھا۔ دوم اگر کسی جملہ میں اتفاقاً چند لفظوں میں موافقت ہوجائے تو اس سے کیا شاگردی یا مساوات ثابت ہوسکتی ہے۔ سوم مقدمہ میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ کبھی مرشد کا فیضِ صحبت شاگرد میں اثر کرجاتا ہے کہ جو بات استاد کہنی چاہتا ہے وہی شاگرد کے منہ سے پیشتر نکل جاتی ہے۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰۰)
وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ

الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۰۱) ز

اور کیا (یہ نہیں کہا) کہ جب انہوں نے کوئی عہد باندھا تو انہیں میں سے ایک فریق نے اس کو توڑ کر) پھینک دیا بلکہ ان میں سے اکثر تو اس کا اعتبار ہی نہیں کرتے تھے اور جبکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وہ رسول آیا کہ جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے تو اہل کتاب کے ایک فریق نے خدا کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے ایسا پھینکا کہ گویا اس کو جانتے ہی نہیں

ترکیب: او واؤ عطف کے لیے اور ہمزہ استفہامِ انکاری کے لیے ہے اور یہ عطف کلام مقدم کے لیے ہے یعنی افکلما جاء کم بعض کہتے ہیں واو زائدہ ہے بعض کہتے ہیں یہ او ہے واو کو متحرک کردیا۔ عهدا مفعول مطلق من غیر لفظ مذکور اور ممکن ہے کہ مفعول بہ ہو نبذہ الخ جملہ جواب کلما اسی طرح لما جاء جملہ شرط مصدق صفتِ رسول نبذ فعل فریق الخ فاعل کتب اللہ مفعول وراء ظرف یہ سب جملہ جواب شرط کانھم الخ موضع حال میں ہے۔

تفسیر: یعنی یہ عذر کہ اس قرآن کو جبریل لائے ہیں اس لیے ہم اس پر ایمان نہیں لاتے، بے ہودہ عذر ہے کس لیے کہ فی نفسہ اس کی آیات واضح اور روشن ہیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کو عقلِ سلیم نہ مانے۔ پس اس کا انکار کرنا نافرمانوں کا کام ہے کہ جن کی عادت ہمیشہ سے نافرمانی چلی آتی ہے کس لیے کہ ان یہود نے جب کوئی عہد خدا سے رسول کی معرفت باندھا یا لوگوں سے عہد کیا ہے تو ان میں سے ایک فریق نے جھٹ اس کو توڑ دیا اور ہلکا سمجھ کر پھینک دیا اور ایک فریق کی کیا خصوصیت ہے بلکہ ان میں سے اکثر کا تو اس پر اعتبار ہی نہ تھا نہ اس پر ایمان تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اب جو ان کے پاس خدا کا وہ رسول آیا (محمد ﷺ) کہ جو توراۃ و زبور و انجیل کی تصدیق کرتا ہے اور جس کی خبر توراۃ میں ہے تو ان اہلِ کتاب نے اس کتاب پر بھی عمل نہ کیا بلکہ اس کو پسِ پشت ڈال دیا کہ گویا اس سے خبر ہی نہیں ہے۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اہلِ کتاب نے کتابِ الٰہی یعنی توراۃ کو سچ مچ پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا تھا بلکہ اس سے مراد بے التفاتی ہے۔ یہ عرب کا محاورہ ہے کہ جس چیز کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا تو کہتے ہیں اس نے اس کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا
تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ
بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا
یَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۱۰۲)

اور یہود اس چیز کے پیچھے پڑ گئے کہ جس کو شیاطین سلیمان کے عہد میں پڑھا کرتے تھے اور سلیمان تو کافر نہیں ہوئے تھے بلکہ خود وہ شیاطین ہی کافر تھے

جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور اس کے بھی (پیچھے پڑ گئے) کہ جو شہر بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا اور وہ کسی کو سکھاتے نہ تھے جب تک کہ یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں تو کافر نہ بن۔ پس ان سے وہ بات سیکھتے تھے کہ جس سے خاوند اور بیوی میں جدائی ڈالیں حالانکہ وہ اس سے کسی کو بجز حکمِ خدا کے کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے اور (یہود) سیکھتے تھے کہ جو ان کو ضرر دیتی تھی نہ نفع اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جس نے جادو خریدا اس کے لیے آخرت میں کچھ بھی حصہ نہیں اور جس کو انہوں نے اپنی جانوں سے خریدا وہ بہت ہی بد تھا کاش وہ جانتے بھی تو۔

ترکیب : واتبعوا عطف ہے اشربوا پر یا نبذ پر علیٰ ملك ای علی زمن ملک فحذف المضاف والمعنی فی زمن **ولکن** مشدد شیاطین اس کا اسم کفروا خبر بعض نے مخفف پڑھا ہے اس تقدیر پر اسم مرفوع ہوگا علی ابتداء یعلمون الخ جملہ موضع نصب میں ہے۔ کس لیے کہ یہ حال ہے ضمیر کفروا سے وما انزل معطوف ہے ماتتلوا پر بعض کہتے ہیں بالسحر پر ان صورتوں میں ما موضع نصب میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ما نافیہ ہے معطوف ہے ما کفر پر (اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ نہ سلیمان کافر ہوئے نہ بابل میں کچھ سحر ہاروت و ماروت پر نازل ہوا جیسا کہ یہود گمان کرتے ہیں) ملکین کو جمہور نے بفتح لام پڑھا ہے اور بعض نے بکسر لام جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ ببابل ظرف ہے انزل کا۔ ھاروت و ماروت عطف بیان ہے۔ حتیٰ بمعنی الی ان فیتعلمون معطوف ہے یعلمان پر اور نفی میں شامل نہیں منهما کی ضمیر ملکین کی طرف پھرتی ہے لمن اشتری الخ جملہ مفعول علموا ولبئس جملہ جواب قسم محذوف لو کانوا کا جواب محذوف ہے ماعلموہ وغیرہ اگرچہ وہ جانتے تھے مگر جب کہ انہوں نے اپنے علم پر عمل نہ کیا تو ان کو لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ سے خطاب کیا۔ یہ کمالِ بلاغت ہے اس میں مقتضی حال کی پوری رعایت ہے۔

تفسیر : ان آیات میں کتاب اللہ کو پسِ پشت پھینک دینے کی مزید توضیح ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر واہیات کی طرف متوجہ ہو گئے تھے یعنی وہ جو شیاطین سلیمان کے عہدِ حکومت میں جادو سکھایا کرتے تھے اور اس کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے (اور دراصل سلیمان اس کفر کے مرتکب نہ ہوئے تھے بلکہ وہی شیاطین اس کفر کے مرتکب ہوئے کہ جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے) یہ لوگ اس کے تابع اور معتقد ہو گئے[1] اور اس پر بھی بس نہ کی بلکہ جب بخت نصر کے عہد میں یہ لوگ شہر بابل میں گئے تو وہاں بجائے اس کے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے نادم ہوتے شریعت کو یاد کرتے الٹے وہاں کی شعبدہ بازیوں میں مصروف ہو گئے یعنی وہ جو وہاں ہاروت و ماروت دو شخصوں کو سحر معلوم تھا اس کے سر ہو گئے اور ان کو سیکھ کر اپنی دینی و دنیاوی ترقی کا باعث سمجھنے لگے حالانکہ وہ جس کو سکھاتے تھے پیشتر کہہ دیتے تھے کہ یہ کفر کا کام ہے اس کو سیکھ کر کافر نہ ہو اس پر بھی وہ اس کو سیکھتے تھے اور اس سے سوا اس کے کہ میاں بیوی میں مخالفت پیدا ہو اور کوئی بڑی بات حاصل نہ ہوتی تھی اور جادوگر بغیر حکمِ الٰہی کسی کو کیا ضرر دے سکتے ہیں؟ اور لطف یہ کہ یہود یہ بھی جانتے تھے کہ جو کوئی اس جادو کو سیکھے گا آخرت کی نعمتوں سے محروم رہے گا (کیونکہ توراۃ میں جادو کی ممانعت مذکور تھی) باوجود اس کے ایک مضر چیز کو سیکھتے تھے کہ جس کا کچھ بھی نفع نہ تھا سو اس سحر کو جو انہوں نے اپنی جان کو دے کر (یعنی حیاتِ ابدی کے بالعوض) خریدا تھا بہت ہی بری چیز تھی۔ کاش ان کو علم ہوتا یعنی علم پر عمل نہ تھا وہ علم علم ہی نہ رہا۔

ابحاث : (۱) سحر کیا چیز ہے؟ اس کا اثر بھی ہے کہ نہیں؟ سحر اسبابِ خفیہ سے بے توسلِ جنابِ الٰہی افعالِ عجیبہ پر قدرت حاصل کرنے کو کہتے ہیں اور وہ اسبابِ خفیہ یا تاثیرِ روحانیات ہے یا تاثیرِ جسمانیات۔ پھر روحانیات یا کلیہ مطلقہ ہیں جیسا کہ کواکب وافلاک وعناصر کے روحانیات یا جز۔ یہ خاصہ جیسا کہ امراض وجن وشیاطین ونفوسِ مفارقہ بنی آدم کہ جن کو ہندی میں بیر کہتے ہیں۔ پھر جسمانیات کی تاثیر یا بسببِ ترکیب و اجتماعِ کیفیات کے ہے کہ جس سے عجیب وغریب باتیں ظہور کرتی ہیں جیسا کہ خصوصیتِ صورتِ نوعیہ سے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ پھر ان

[1] یعنی صرف سلیمان کے عہد میں جو شیاطین پڑھا کرتے تھے اُسی کے تابع نہ ہوئے تھے بلکہ شہرِ بابل میں جو کچھ ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اُترا تھا اس کے بھی تابع ہو گئے تھے۔۱۲ منہ

روحانیات کی تاثیر حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ بعض شرائط کو ملحوظ رکھ کر ان کے نام پڑھتے ہیں، بعض ان کی تصویریں بنا کر ان کے سامنے نذر بھینٹ ان کے مرغوب کام کرتے ہیں، شراب چڑھاتے ہیں، مینڈھا بکرا ذبح کرتے ہیں یا کوئی کلام ایسا مع شرائط پڑھتے ہیں کہ جن میں ان روحانیات کی از حد ثناء وصفت مذکور ہوتی ہے جیسا کہ رگوید کے منتر اندر وغیرہ کی مدح میں ہیں اسی لیے قدماءِ ہنود مصائب کے وقت پنڈتوں کو بٹھا کر جگ اور پاٹ کراتے تھے دراصل رگوید کی سنہتا کو جادو کے لیے جمع کیا گیا تھا ورنہ اس میں کوئی ہدایت اور تلقین کی بات نہیں۔ اب رہی یہ بحث کہ اس میں فی نفسہ کچھ تاثیر بھی ہے یا محض توہماتِ فاسدہ اور خیالاتِ باطلہ ہیں[1] اور جو کچھ اثر محسوس ہوتا ہے تو وہ قوتِ وہمیہ کا مغلوب ہو جانا ہے جو رسی کا سانپ بنا کر دکھاتی اور چوہیا کے گزند سے سانپ کا اثر پہنچاتی ہے۔

(۲) متکلمین کی ایک جماعت کا یہی عقیدہ ہے[2] مگر دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ بے شک فی نفسہ ان اسبابِ خفیہ سے ایک تاثیر پیدا ہوتی ہے اور اس کا انکار بدیہیات کا انکار ہے۔ آنحضرت ﷺ پر بھی مدینہ میں ایک یہودی نے جادو کیا تھا جس سے آنحضرت ﷺ کسی قدر علیل ہو گئے تھے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کتب میں مذکور ہے۔ توراۃ سفر خروج کے ساتویں باب میں جادوگروں کی لاٹھیوں کا سانپ بن جانا مذکور ہے (چنانچہ مصر کے جادوگروں نے بھی اپنے جادو سے ایسا ہی کیا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا عصا پھینکا اور وہ سانپ ہو گیا الخ) اس کا جواب بھی اول گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ قرآن نے اس راز کو کھول دیا يُخَيَّلُ لَهُمْ کا لفظ بتلا رہا ہے کہ وہ بھی ڈھٹ بندی تھی۔

(۳) سحر کرنا شرع میں حرام بلکہ کفر ہے جیسا کہ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ سے مفہوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں غیر اللہ سے استمداد اور اس کی نذر و نیاز پائی جاتی ہے کہ جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے منافی ہے۔ علاوہ اس کے یہ فعل عبث ہے نہ اس سے سلطنت کے کاموں میں خلل واقع ہوتا ہے نہ انسان کے لیے معاد و معاش کی کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہے اور نہ کچھ ذاتی۔ کسی کے لیے کوئی ضرر یا نفع نہیں اور جو کبھی کسی پر کوئی اثر نمایاں بھی ہوا تو وہ ہر وقت جادو کے بس میں نہیں بغیر اذنِ الٰہی پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اب اس آیت کے متعلق دو اور بحث باقی ہیں۔ اول یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں شیاطین جادو پڑھتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ دوم یہ ہاروت و ماروت کون تھے؟ اور ان پر سحر نازل ہونے کے کیا معنی (۱) شیاطین سے مراد جنوں کے بدلوگ ہیں جنوں کی عادت تھی کہ ادھر ادھر کی خبریں لا کر کاہنوں کو دیا کرتے تھے وہ ان باتوں کو کتابوں میں جمع کر لیتے تھے اور پھر لوگوں کو سکھایا کرتے تھے یہاں تک کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا عہدِ خروجِ سلطنت آیا تو یہود ان کو نبی تو جانتے نہ تھے اپنے اس فن کے رواج دینے کے لیے ان لوگوں نے یہ مشہور کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی دولت وحشمت کا یہی علم باعث ہے اور ان کے پاس ایک انگشتری ایسی ہے کہ جس کی وجہ سے تمام جن وانس ان کے تابع ہیں (اور نقشِ سلیمانی بھی آج تک اسی بناء پر مشہور ہے) اس طمع میں آ کر یہود نے توراۃ کو تو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کفریات کی تعلیم وتعلم میں سرگرم ہو گئے پھر سلیمان علیہ السلام کے شہرت کے لیے ہر سحر و ہر عمل سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ہونے لگا۔ جس پر خدا فرماتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام ساحر و کافر نہ تھا بلکہ وہ شیطان جو جادو لوگوں کو سکھاتے تھے اور اس تقریر پر شیطان سے شیاطینِ انس یعنی معلمینِ سحر بھی مراد لیے جاویں تو ممکن

[1] یعنی سحر کا فی نفسہ کوئی بھی اثر نہیں صرف یہ ہے کہ مسحور کی قوتِ وہمیہ مغلوب ہو جاتی ہے اور جو خیال ساحر اس میں نقش کرنا چاہے وہ اس کو قبول کر لیتی ہے۔۱۲ منہ

[2] گروہِ اول اس کا یہ جواب دیتا کہ اگر یہ خبرِ احاد صحیح بھی مان لی جاوے تو اس یہودی کے سحر سے آنحضرت ﷺ کا بیمار ہونا ثابت نہیں ہوا بلکہ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کسی کام کو کر کے بھول جایا کرتے تھے گویا نہیں کیا یا جو کام نہیں کیا اس کو خیال کرتے تھے کہ کر چکا ہوں۔ یہی تو وہ قوت موہومہ پر اثر ہے جس کے ہم بھی قائل ہیں اور یہ بھی تو ہوتا ہے کہ کبھی انسان کسی خیال کو پکا لیتا ہے تو اس کا اثر جسم پر بھی نمایاں ہونے لگتا ہے اور اگر اس سبب سے مرض پیدا ہو جائے تو یہ ممکن ہے۔

ہے ایک زمانہ تو تعلیمِ سحر کا یہ تھا دوسرا وہ کہ جو ہاروت و ماروت کے عہد میں واقع ہوا۔

(۲) ہاروت و ماروت شہر بابل میں دو شخص تھے کہ جن کو ان کے ان عجائب افعال اور نیک چلنی کی وجہ سے فرشتہ کہتے تھے اور ان کا یہ لقب مشہور ہو گیا تھا (اور اس بات کو وہ قراۃ مؤید ہے کہ جس میں ملکین کو بکسرِ لام پڑھا ہے اور حسن بصری کا بھی یہی قول ہے[1]) (بیضاوی و تفسیر کبیر) یہ شخص اس فن سے واقف تھے مگر اس کو برا سمجھتے تھے یہاں تک کہ جو ان کے پاس سیکھنے آتا ان سے یہ کہہ دیتے تھے کہ بھائی خدا نے یہ علم ہم کو تمہاری آزمائش کے لیے دیا ہے کہ تم ایمان پر ثابت قدم رہتے ہو یا نہیں۔ اس کو نہ سیکھو ورنہ ایمان جاتا رہے گا مگر یہود ایمان کی کیا پروا کرتے تھے سیکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ پس ان پر نازل ہونے سے یہ مراد کہ خدا نے ان کو اس فن میں ماہر و عالم ہونے کی قدرت عطا کی تھی نہ یہ کہ کتابِ آسمانی کی طرح ان پر خدا نے جادو نازل کیا تھا کہ وہ اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے لفظ انزال سے یہ سمجھ لیا کہ وہ دو فرشتے تھے جو حضرت ادریس علیہ السلام کے عہد میں زین شہر بابل میں آئے تھے پھر ایک حسین عورت زہرہ پر عاشق ہو گئے تھے اس کے کہنے سے شراب پی کر اس کے خاوند کو قتل کیا اور بت کو سجدہ کیا اور زہرہ نے اسمِ اعظم ان سے سیکھ لیا جس سے وہ تو آسمان پر چلی گئی اور یہ بابل کے کنوئیں میں الٹے لٹکتے ہیں اور وہاں آگ سے ان کو عذاب ہوتا ہے پھر جو کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے جاتا ہے پہلے اس کو سمجھا دیتے ہیں پھر سکھا دیتے ہیں چنانچہ ایک شخص عبدالملک بن مروان کے پاس ان سے مل کر آیا تھا الخ یہ بے اصل کہانیاں ہیں۔

ع ۱۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ
مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ
وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾

[1] جبکہ ما انزل میں لفظ ما کو نفی کے لیے تسلیم کر لیا جاوے جیسا کہ بعض مفسرین کا قول ہے تو معنی ہی الٹ جاویں گے کس لیے کہ اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ وہ جو یہود کو یہ خیال تھا کہ بابل میں ہاروت ماروت سے جادو سیکھ کر آتے ہیں اور ان پر جادو نازل ہوا تھا یہ خیال غلط ہے۔ کس لیے کہ ما انزل علی الملکین ببابل هاروت و ماروت بابل میں ہاروت ماروت فرشتہ خصال دو شخصوں پر جادو وادو نازل ہی نہیں ہوا تھا اور خود ان کو جو اس علم میں دخل تھا تو وہ بھی کسی کو بغیر انجامِ کار بتائے نہ سکھاتے تھے کہ اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے اس کو قضاء و قدر کے مقابلے میں اپنے کام پر اعتماد ہو جاتا ہے اور وہ جاننے لگتا ہے کہ میں بھی ایک فاعلِ مستقل ہوں یہ کفر ہے مگر یہود پر ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بابل کی اسیری میں سوجھا تو یہ سوجھا نہ توبہ نہ توسل الی ←

اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو البتہ خدا کے ہاں کا اجر ان کے لیے بہتر تھا کاش ان کو علم بھی ہوتا (مسلمانو! نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ) داعنانہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو اور سنا کرو اور کافروں کو تو دکھ دینے والا عذاب ہے۔ اہلِ کتاب کے کافر اور مشرکین نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھی بات نازل ہو اور اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے ہم جو کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر لاتے ہیں کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے کیا آپ نہیں جانتے کہ خدا ہی کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت ہے اور تمہارے لیے خدا کے سوا نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مددگار

ترکیب : لو کلمۂ شرط انهم ان اور جس میں کہ اس نے عمل کیا مصدر ہے موضع رفع میں بسببِ فعلِ محذوف کے۔ کس لیے کہ لو کے بعد فعل ہوتا ہے تقدیرہ لو وقع۔ منهم انهم آمنوا سب جملہ شرط لمثوبة مبتداء موصوف من عند الله صفت خیر خبر جملہ جوابِ لو راعنا امر ہے لیکن موضع نصب میں ہے کس لیے کہ یہ مفعول ہے لاتقولوا کا یود فعل الذین الخ فاعل ولا المشرکین موضع جر میں ہے کس لیے کہ معطوف ہے لفظ اہل پر ان ینزل جملہ مفعول یود من خیر میں من زائدہ ہے من ربکم میں من ابتدائیہ ہے ماننسخ ماشرطیہ جازمہ مگر محلاً منصوب ہے۔ نات بخیر الخ جملہ جوابِ شرط ننسها معطوف ہے ننسخ پر له مُلْكُ السَّمٰوٰتِ مبتداء و خبر جملہ خبر ہے ان کی من ولی زائدہ ہے اور ولی موضع رفع میں ہے بسبب مبتدا ہونے کے اور لکم خبر اور نصیر معطوف ہے لفظ ولی پر اور مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بسبب حال ہونے کے ولی سے محلِ نصب میں ہے والتقدیر مالکم من ولی من دون الله۔

تفسیر : خدا تعالیٰ یہود کے افعالِ ذمیمہ بیان فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ اب بھی ان کے لیے وقت باقی ہے اگر وہ نبیِ آخرالزمان پر ایمان لاویں اور اچھے کام کریں تو ان کو آخرت میں بہت کچھ اجر ملے گا۔ (۲) اس کے بعد مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ یہود کی یہ حالت ہو گئی تم ان کی صحبت اور ان کے رویہ سے پُرحذر رہا کرو۔ منجملہ اور باتوں کے ایک یہ کہ یہود جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اپنی جبلی شرارت سے اثناءِ کلام میں حضرت سے راعنا کہتے جیسا کہ ہماری بول چال میں کہتے ہیں ذرا ادھر متوجہ ہو جیے یا ادھر خیال فرمائیے اور اس کلمہ میں اپنے نزدیک وہ یہ مراد رکھتے تھے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو احمق اور چرواہا کہہ آتے ہیں۔ کس لیے کہ راعنا ظاہر میں تو مراعات سے مشتق ہے اور وہ اس کو رعونت سے لحاظ کر کے یا راعی بمعنی چرواہے سے خیال کر کے حضرت کو گالی دے جاتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع کر دیا کہ تقلید کر کے تم یہ کلمہ نہ کہا کرو۔ اگر ضرورت پڑے تو اس کی جگہ انظرنا کہہ دیا کرو کہ ہماری طرف خیال کیجئے کیونکہ یہ کلمہ ذو معنیین نہیں ہے اور اس کی بھی تمہیں کیا ضرورت ہے تم اول سے ہی حضرت کی بات کان لگا کر سنا کرو۔ (۳) اس کے بعد ان کے اتباع نہ کرنے کی وجہ بیان فرماتا ہے کہ یہود اور مشرکین تمہارے دلی دشمن ہیں وہ یہ نہیں چاہتے کہ خدا کی رحمت (وحی) تم پر نازل ہو مگر خدا کا چاہا ہوتا ہے جس پر وہ چاہتا ہے اپنی رحمتِ خاصہ کو نازل کرتا ہے اس کا فضل بے نہایت ہے اس کو کسی خاندان اور قوم کی پابندی نہیں کہ خواہ مخواہ ہمیشہ سلطنت یا نبوت اسی خاندان میں رکھے اس کے بعد خدا تعالیٰ یہود کے شکوک و شبہات کا جواب دیتا ہے جو وہ اہلِ اسلام پر پیش کر کے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتے تھے وہ کہتے تھے کہ اگر تم پر خدا کی طرف سے خیر یعنی وحی اور شریعت نازل ہوتی ہے تو خیر کے منسوخ

→ اللہ اور جس قدر جاہل اور مدبر قومیں ہیں ان میں بجائے ترقی علوم و فنون کے اسی جادو کا بڑا زور شور ہے اور ان کے مدبر فرماں روا بجائے تدبیر مناسب کے ان ہی جادو پر تکیہ کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ وقت پر ندامت اٹھاتے ہیں۔
مسلمانوں کو خدا یہود کا حال بیان کر کے متنبہ فرماتا ہے مگر وہ جادو اور بابل اور ہاروت اور ماروت کا لفظ سن کر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں۔ افسوس یہ کتاب و سنت سے جہل کا سبب ہے جہاں علم آیا یہ جاہلانہ خیال کافور ہوئے۔ اب بھی ہندوستان میں جاہل اور کمینہ اقوام میں اس کا بڑا رواج ہے۔

کرنے کے کیا معنی؟ خدا تعالیٰ کے احکام اور شریعت ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں سے ایک شوشہ بھی بدل نہیں سکتا۔ پھر اگر یہ قرآن اور شریعت منجانب اللہ ہے تو احکامِ تورات کو کیوں منسوخ کیا اور پھر خود اس شریعت ہی میں بعض احکام کو ایک وقت قائم رکھ کر موقوف (منسوخ) کردیا، کیا خدا تعالیٰ کو پیشتر اس حکم کی قباحت کا علم نہ تھا؟ آج کل کے پادری بھی ان یہود کے مقلد ہو کر مسلمانوں سے یہی شبہ پیش کیا کرتے ہیں چنانچہ بعض نے تو اس بارے میں رسالے اور کتابیں لکھ ڈالیں۔ اس شبہ کا جواب خدا نے اشارتاً تو مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں دے دیا تھا کہ یہ لوگ یہ سب باتیں رشک وحسد سے کرتے ہیں کہ خدا نے ہمارے خاندان میں نبوت کو کیوں ختم کردیا اس لیے تم کو شبہات میں ڈالتے ہیں تاکہ تم اس فیضِ نبوت سے محروم رہو مگر اس جگہ اس شبہ کو خوب کھول کر رد کر دیا کہ اگر ہم کسی حکم کو کسی مصلحت سے موقوف کرتے ہیں یا موخر کرتے ہیں تو اس میں بندوں کے لیے سراسر بہتری ہوتی ہے ہم اس سے بہتر یا اس کے مانند اور سہل العمل اور کوئی حکم دیتے ہیں۔ [1] واضح ہو کہ نسخ لغت میں ایک شے کے مٹانے پر یا نقل وتحویل پر (عند القفال) اطلاق ہوتا ہے بولتے ہیں نسخت الریح آثار القوم کہ ہوا نے لوگوں کے پاؤں کے نشان مٹا دیے اور اسی طرح بولتے ہیں نسخ الكتاب الى كتاب آخر کہ ایک جگہ سے کتاب کو دوسری طرف کو نقل کیا اور اصطلاحِ علماء میں نسخ ایک ایسے حکمِ شرعی کا قائم کرنا ہے کہ جس کے بعد اس سے پیشتر کا حکمِ شرعی جو مؤقت تھا اٹھ جائے اول حکم کو منسوخ دوسرے کو ناسخ کہتے ہیں۔ یہود اور عیسائی نسخ کے مطلقاً منکر ہیں اور یہ انکار صرف اس لیے ہے کہ قرآن مجید کا حکم نہ ماننا پڑے اور دینِ اسلام پر اعتراض کی گنجائش رہے مگر ان کا یہ انکار بالکل بیجا ہے۔ (۱) اس لیے کہ تورات میں بہت سے احکام ایسے ہیں کہ جن میں نسخ پایا جاتا ہے اور عیسائیوں نے ختنہ اور سبت اور دیگر احکامِ مؤکدۂ تورات کو منسوخ کردیا بلکہ بفتوائے پولوس تمام شریعتِ موسوی کو بالائے طاق رکھ دیا اور اس پر عمل کرنے کو موجبِ لعنت قرار دیا چنانچہ اس کی تشریح معہ حوالہ فصل و باب مقدمہ میں ہو چکی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر کیا نسخ ہوگی۔ (۲) اس لیے کہ عقلاً بھی اس قسم کی نسخ میں کوئی قباحت یا جنابِ باری کی نسبت کوئی عیب نہیں کیونکہ اعتقادیات اور اخبار کی نسبت تو کوئی مسلمان بھی نسخ کا قائل نہیں۔ تورات وانجیل ودیگر کتبِ انبیاء کو اس بارہ میں کوئی منسوخ نہیں کہتا۔ باقی رہے احکام سو ان کی بھی دو قسم ہیں ایک اصولِ شرائع جیسا کہ عبادت، بت پرستی کی ممانعت، صلہ رحمی وعدل وانصاف ظلم وتکبر اور بدخصائل کی حرمت وغیرہا سو اس قسم کے احکام میں بھی ہم نسخ کے قائل نہیں، تمام شریعتوں اور کل انبیاء کے احکام ابدی ہیں۔ دوم فروعاتِ شریعہ کہ چور کی یہ سزا اور زانی پر اس قدر تہدید اور پاکی اور ناپاکی کی طہارت اس طور پر نماز اور اس کی عبادت اس مکان میں اور اس طرف منہ کر کے وغیرہ ذلک سو اس قسم کے احکام میں نسخ واقع ہوا ہے اور ضرور ہونا چاہیے کیونکہ خدا علام الغیوب کا مقصد شریعت سے اپنے بندوں کی بھلائی اور ان کے حال پر

[1] بعض مفسرین آیت ماننسخ من آية او ننسها کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ یہ آیت کلامِ سابق کا تتمہ ہے اس سے پہلی آیات میں یہود کے خصائلِ بد کی تشریح تھی جو ان کے تنزل کا باعث ہوئیں آخیر ہر مرض کا موت ہے ان کا اقبال ان کی آئندہ ترقی سب کا خاتمہ ہوا ایک نئی قوم اور نئے ملک میں ایک خاتم الانبیاء پیدا ہوا جس پر یہود کو رشک وحسد ہونا ایک معمولی بات تھی جس کا جواب دیا گیا۔ خدا کی نعمت کسی قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ اس پر خیال پیدا ہوتا تھا کہ خدا تعالیٰ ایک قوم کو رفعت میں آسمان تک پہنچا کر پھر جلد یا دیر میں کیوں ذلت وادبار کے عمیق گڑھے میں پھینک دیا کرتا ہے۔ اس خیال کا دفعیہ اس آیت ما ننسخ میں کردیا گیا لفظ آیت سے قرآن مراد نہیں نہ اس کا کوئی محلِ وقوع ہے نہ سیاق نہ سباق مقتضی ہے۔ جب آیتِ قرآن مراد نہیں بلکہ آیاتِ قدرت، قوموں کی بلندی وپستی، کسی کا طلوع کسی کا غروب تو نسخ سے مراد بھی نسخِ اصطلاحی نہیں بلکہ یہ معنی کہ اگر عالم میں ہم کوئی اپنا آثارِ قدرت (جیسا کہ کسی رفیع قوم کی پستی) مٹا ڈالتے یا اس کو نسیاً منسیاً کر دیتے ہیں کہ صفحۂ ہستی پر اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں چھوڑتے تو ایسی ہی یا اس سے بہتر کوئی اور آیت قدرت ظاہر کر دیتے ہیں۔ مخاطب کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہمارے لیے ہے اور ہم ہر چیز پر قادر ہیں۔ بنی اسرائیل کو مٹایا جو اس کی ایک بڑی آیت قدرت تھی تو اس سے بڑھ کر قومِ عرب کو جو ایک بڑی آیتِ قدرت ہے ظاہر کر دیا جن میں صدہا ملوک اور لاکھوں حکیم پیدا ہوئے۔ ۱۲ منہ

رحمت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زمانہ اور اقوام اور بلاد کا ہمیشہ ایک طور نہیں رہتا۔ وقتاً فوقتاً مصلحتوں میں انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً جب قوم شراب کی عادی ہو تو اس کی رسم مٹانے کے لیے نہ تنہا شراب کو حرام کیا جاوے بلکہ اس کی دواعی اور یاد دلانے والی باتوں کو منع کر دیا جاوے اور شراب کے برتنوں کا مطلقاً استعمال ہی ناجائز کر دیا جائے پھر جب ان کی عادت جاتی رہے تو ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دے کر اب ان پر سہولت کر دینی ضروری ہے۔ اب اس میں خدا کے علم میں کیا قصور لازم آتا ہے۔ اس پر بھی اعتراض کرنا اور پھر مواقعِ استدلال میں اول قسم کے احکام کو پیش کرنا یا اعتقادیات کو لانا انصاف کی گردن پر چھری پھیرنا ہے۔ معاذ الله من ذلك۔ اب رہا نسخِ قرآنی کہ آیا اس کی آیات میں نسخِ تلاوت یا نسخِ حکم یا دونوں کا نسخ خواہ دوسری آیت یا کسی حدیث سے واقع ہوا ہے یا نہیں۔ ابو مسلم بن بحر وغیرہ اس کا مطلقاً انکار کرتے ہیں اور اکثر علماء اس کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ بعض آیات کا آنحضرت ﷺ کے عہد میں صرف حکم منسوخ ہوا۔ جیساوَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ اس آیات میں سال بھر کی عدت وفات تھی پھر چار مہینے دس روز رہ گئی وغیرہا من الایات اس کو منسوخ الحکم کہتے ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کے الفاظ منسوخ التلاوۃ اور حکم باقی ہے جیسا کہ الشيخ و الشيخة اذا زنيا فار جموهما نكالا من الله والله عزيز حكيم وغیرہ ذلك۔ یہ تنسیخ میں داخل ہیں اور بعض آیات ایسی بھی تھیں کہ جو حضرت ﷺ اور تمام صحابہ کے دل سے بھلا دی گئیں۔ چنانچہ بیہقی اور ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ ایک صحابی شب کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے اور ایک سورۃ کو پڑھنا چاہا ہر چند یاد کیا مگر ایک حرف بھی یاد نہ رہا صبح کو خود حضرت ﷺ سے اور دیگر اشخاص سے بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سورہ منسوخ التلاوۃ ہوگئی ہے سب کے دلوں سے بھلا دی گئی اور اس کے نقوش بھی مٹا دیے گئے اور اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ آیت عشر رضعات معلومات یحرمن قرآن میں پڑھی جاتی تھی مگر اس کا ماقبل اور مابعد اور اس کا محل بالکل نسیاً منسیاً کر دیا اور اسی طرح کی بہت سی روایات ہیں یہ سب ننسہا کا مصداق ہیں مگر اس سے قرآن میں کوئی تحریف وتغیر نہیں ہو سکتا۔ کیوں یہ سب باتیں مصلحتِ الٰہیہ سے آنحضرت ﷺ کے عہد میں ہو چکی تھیں۔ آپ کے بعد پھر ایک حرف کی کمی زیادتی ظہور میں نہ آئی اور دلیل اس مذہبِ جمہور پر آیت ماننسخ الآیہ ودیگر آیات ہیں۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ نہ احکام میں نسخ ہوا ہے کس لیے کہ جس کو تم منسوخ کہتے ہو وہ اور جہت سے تھا اور جو ناسخ ہے اور جہت سے ہے اور نسخ میں اتحادِ جہت شرط ہے اور نہ تلاوتِ آیات میں جن آیات کو تم منسوخ التلاوۃ کہتے ہو یہ دراصل قرآن مجید کی آیات نہ تھیں کیونکہ قرآن منقول بنقلِ متواتر ہے اور یہ روایات خبرِ احاد ہیں اور بعض تو موضوع یا ضعیف اور وجہِ اشتباہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تفسیر کے طور پر یہ جملہ کہ جن کو لوگ منسوخ التلاوہ سمجھ گئے ہیں اثنائے تلاوت میں پڑھے اور حاضرین نے ان کو آیت سمجھ لیا مقدس سمجھ کر اپنے مصاحف میں لکھ لیا مگر جب آنحضرت ﷺ نے تمام قرآن شریف حفاظ کو یاد کرایا اور متفرق اجزاء میں کاتبوں سے لکھوایا اور راویوں نے ان جملوں کو قرآن میں نہ پایا تو منسوخ التلاوہ سمجھ لیا اور اس آیت سے استدلال صحیح نہیں کس لیے کہ اس سے مراد توریت و انجیل کے احکام ہیں اور لفظ آیت کچھ آیاتِ قرآنیہ کے لیے بھی مخصوص نہیں بلکہ احکام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح اور آیات سے بھی استدلال صحیح نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ
الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝١٠٩ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ

مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

کیاتم بھی (اے مسلمانو!) یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے ویسے ہی سوال کیا کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کئے گئے تھے اور جس نے کفر کو ایمان سے بدلا تو وہ سیدھے رستے سے بہکا اکثر اہلِ کتاب تو اپنے حسد سے حق ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے تم کو بھی ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا کرلے جائیں۔ پس تم اس وقت تک کہ اللہ اپنا حکم لائے معاف کرو اور درگزر کرتے رہو۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ترکیب: ام اس جگہ منقطع ہے والتقدیر بل اتریدون ان تسالوا کما میں کاف موضع نصب میں ہے مصدر محذوف کی صفت ہے ای سوالا کما اور ما مصدریہ ہے سواء السبیل بمعنی وسط السبیل ظرف ہے ضل کا وَدَّ فعل کثیر من اھل الکتاب فاعل لو مصدریہ یردونکم جملہ بتاویل مصدر مفعول کفارًا حال ہے کم سے جو یردونکم میں ہے اور ممکن ہے کہ مفعول ثانی ہو کس لیے کہ یرد بمعنی یصیر ہے حسدًا مفعول لہ ہے فاعل ود سے یا یردونکم سے مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کائن کے متعلق ہو کر صفت ہوا حسدًا کی۔

تفسیر: یہودی اہلِ اسلام کو طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا کیا کرتے تھے تاکہ یہ لوگ دین سے برگشتہ ہو جائیں اور باوجودیکہ ان کو آنحضرت علیہ السلام کی نبوت کا بشاراتِ کتبِ انبیاء و معجزات سے یقین ہو چکا تھا مگر حسد کے مارے پھر بھی یہ باتیں کرتے تھے جس پر بعض سیدھے سادھے مسلمان آنحضرت علیہ السلام سے الٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے کوئی یہ سمجھ کر کہ نسخِ احکام تو ہوتا ہی ہے یہ سوال کرتا تھا کہ فلاں احکام قائم ہونے چاہییں اور یہ احکام باعثِ مشقت ہیں اٹھ جانے چاہییں۔ بعض پوچھتے تھے کہ اس حاملہ کے پیٹ میں بیٹا ہے یا بیٹی اور اسی قسم کے لغو اور محال باتوں کو پیش کرتے تھے اس لیے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا کہ کیا تم بھی اپنے رسول سے ایسے ہی سوالات کیا چاہتے ہو کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے ان یہود کے بزرگوں نے کر کے غضبِ الٰہی اپنے اوپر ڈھایا تھا۔ سو تم ایسا نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے اور جو ایمان چھوڑ کر کفر میں پڑتا ہے وہ نجات اور حیاتِ ابدی کے سیدھے راستہ سے بہکتا ہے اور یہ یہودی تو اپنے جبلی حسد سے تم کو پھر کفر میں لانا چاہتے ہیں حالانکہ اسلام کا حق ہونا ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ اس حسد کے مقابلہ میں تم ان سے حتی المقدور درگزر کرو یہاں تک کہ دنیا یا آخرت میں جو کچھ خدا کی طرف سے ان پر عذاب مقرر ہے وہ نازل ہو جائے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور جو کچھ تم نیکی اپنے لیے آگے بھیجو گے تو اس کو خدا کے پاس موجود پاؤ گے۔ بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

ترکیب: و اقیمو الخ جملہ انشائیہ معطوف ہے فاعفوا پر ماتقدموا میں ما شرطیہ من خیر بیان ہے ما کا یہ سب جملہ شرط تجدوہ الخ جواب شرط

تفسیر: یہ کلامِ سابق کا تتمہ ہے یعنی تم کسی مشکک اور مغوی کے بہکانے میں نہ آؤ ایمان پر ثابت قدم رہ کر عالمِ آخرت کے لیے کہ جہاں تم

حقانی (حصہ اول دوم) کاپی نمبر 29/29

کو ہمیشہ رہنا ہے روح کو منور کرو۔ بدنی عبادتوں میں سب سے اعلیٰ نماز ہے اس کو یاد کرتے رہو اور مالی عبادت سے بھی غافل نہ رہو، زکوٰۃ دو اور علاوہ زکوٰۃ کے ہر قسم کی نیکی کرو خلقِ خدا سے بھلائی اور اپنے بیگانوں کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آؤ جو کچھ کرو گے وہ ضائع نہ جائے گا۔ انسان کے سب اعمال عالمِ مثال میں موجود رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد سب کو وہاں جا کر ضرور پاوے گا کسی عمل کی جزا سے خدا غافل نہیں تم جو کچھ کر رہے ہو وہ سب دیکھ رہا ہے۔

فوائد: ام تریدون سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ تک ایک مضمون متصل تھا اس کا اصل شانِ نزول تو وہی ہے کہ جو ہم نے بیان کیا کہ لوگ یہودیوں کے بہکانے سے آنحضرت علیہ السلام سے بیجا سوالات کرتے تھے جن میں نہ نفعِ دنیا نہ نفعِ آخرت بلکہ ضررِ ایمان تھا۔ اس لیے منع کر دیا گیا۔ مگر بعض مفسرین نے ان تسئلوا کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد بیان فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی نے مع چند قریش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہا کہ ہم آپ پر جب ایمان لائیں گے کہ آپ ہمارے لیے مکہ کے خشک پہاڑوں میں سے چشمہ جاری کر دیں یا کوئی وہاں انگور یا کھجور کا باغ پیدا کر دیں یا کوئی سونے کا گھر بنا دیں یا آپ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں یا ہم پر کوئی خدا کی کتاب اترے کہ جس میں یوں لکھا ہو کہ اے عبداللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا۔ اصم اور جبائی اور ابی مسلم کہتے ہیں کہ یہ خطاب اہلِ اسلام کے ان لوگوں سے ہے کہ جو بیجا سوالات کرتے تھے اور یہی صحیح ہے۔

(۲) حسد: کسی کی نعمتِ خداداد کا زوال چاہنا خواہ وہ نعمت اپنے لیے چاہے جیسا کہ کسی کا باغ یا مکان یا روپیہ یا عورت اپنے لیے چاہے یا اپنے لیے نہ چاہے یہ حسد حرام ہے۔ اس آیت و دیگر آیات و احادیث سے یہ وہ مرضِ بد ہے کہ جو انسان کی تمام برائیوں کا سرچشمہ اور نیکیوں کا جلانے والا شعلہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح جلاتا ہے کہ جس طرح آگ لکڑیوں کو، ابلیس کو اسی مرض نے ہلاک کیا تھا اور غبطہ حلال ہے وہ یہ کہ کسی کی برائی تو نہ چاہے مگر خدا سے اس طرح کی نعمت اپنے لیے بھی مانگے اور اسی کو مناقشہ بھی کہتے ہیں اور اس پر بھی مجازاً کبھی اطلاقِ حسد ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے لاحسد الافی الاثنین رجل اتاہ اللہ مالا الحدیث۔

(۳) یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ جن باتوں سے مسلمانوں کے عقائد میں شبہ پڑے ان کا سننا بھی حرام ہے۔ اس بناء پر مستورات کا پادریوں کے مدارس میں تعلیم کے لیے جانا اور ان کے مدارس کی ملازمت کرنا یا ان کی ان امور میں اعانت کرنا حرام ہے بلکہ تبدیلِ کفر بالایمان۔ اور یہی حال دیگر مذاہب کا ہے نعوذ باللہ منہ۔[1]

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ
عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ
قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

[1] پادریوں کے مدارس میں مسلمانوں کے عورات واطفال کا جانا حرام ہے۔ ۱۲منہ

اور (اہلِ کتاب) کہتے ہیں کہ بجز یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا یہ تو ان کے ڈھکوسلے ہیں (اے محمد ﷺ ان سے) کہہ دو کہ تم (اس بات پر) اپنی دلیل تو لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس کسی نے اللہ کے سامنے اپنا منہ جھکا دیا اور وہ نیکی کرنے والا بھی ہو تو اس کے لیے اس کا بدلہ اس کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہود کہتے ہیں کہ عیسائی ٹھیک راہ پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی راہِ حق پر نہیں حالانکہ وہ سب کتاب بھی پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی باتیں وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو بے علم ہیں (بعض مشرکینِ عرب) پھر اللہ قیامت کے دن ان باتوں کا کہ جن میں وہ جھگڑ رہے ہیں خود فیصلہ کر دے گا۔

ترکیب: وقالوا فعل بافاعل لن يدخل الجنة الخ جملہ مفعول فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ تامہ خبریہ ہو کر معطوف ہوا ود پر۔ الا محلِ رفع میں ہے بسبب یدخل کے هود جمع ہائد کی ہے جیسا کہ عائد کی عود بعض کہتے ہیں کہ اس جملہ کا مفرد نہیں وفیہ مافیہ، نصاریٰ، جمع نصران کی ہے جیسا کہ سکاری سکران کی تلك مبتدا امانيهم خبر قل فعل اَنت ضمیر فاعل هاتوا امر حاضر معروف معتل اللام تصریفہ ہاتا یہاتی مہاتاۃ مثل رامٰی یرامی مراماۃ وہاتو مثل رامو اور اصل اس کی ہاتیو تھی تعلیل ہوگئی۔ برهان مضاف كم مضاف الیہ مجموعہ مفعول ہوا ہاتوا کا پھر یہ سب جملہ مقولہ ہوا قل کا من شرطيه اسلم فعل ضمیر راجع من کی طرف وہ فاعل ذی الحال وجهه مفعول لله متعلق فعل وهو محسن جملہ اسمیہ حال یہ تمام جملہ شرط فله اجره الخ تمام جملہ اسمیہ جواب شرط وقالت فعل اليهود فاعل ليست النصارى الخ جملہ اس کا مقولہ وقس علیہ وهم يتلون الخ جملہ خبریہ حال ہے قالت سے كذلك کاف موضع نصب میں ہے کیونکہ صفت ہے مصدر محذوف کی مثل قولهم یابدل ہے محل کاف سے یا مفعول ہے لا يعلمون کا۔

تفسیر: پہلی آیتوں میں مذکور تھا کہ اہلِ کتاب دلی آرزو کرتے ہیں کہ کسی طرح پھر تم کو کفر میں مبتلا کر دیں اور اسی لیے تمہارے دل میں شکوک و شبہات ڈالتے ہیں یہاں تک تو یہود کی کجرویوں کا بیان ہے اس کے بعد یہود و نصاریٰ دونوں کی کجرویوں کا بیان ہوتا ہے کہ وہ اور کسی کو جنت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ یہود کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہونے کا تفاخر تھا اور سمجھتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کی نسل کے لیے مغفرت کا وعدہ ہو چکا ہے۔ آتشِ جہنم ان پر حرام ہے۔ خواہ وہ کچھ ہی کریں۔ عیسائی کہتے تھے کہ ہمارے اگلے پچھلے سب گناہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اوپر لے لیے اور ہماری طرف سے وہ کفارہ ہو گئے اب ہم پر آتشِ جہنم حرام ہے اور جنت ہمارا مقام ہے۔ مسلمانوں کے روبرو ایسی باتیں اس لیے کرتے تھے کہ وہ اسلام کو باعثِ نجات اور تسلی بخش نہ سمجھ کر اسلام میں داخل ہونے سے احتراز کریں۔ یہ نادان عربوں کے خیالات میں لغزش پیدا کرنے والا شبہ تھا۔ اس کو خدا تعالیٰ رد کرتا ہے۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ کہ یہ ان کے دلی منصوبے یعنی بے اصل خیالات ہیں اور اگر کوئی اصل ہے تو قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اے نبی ان سے کہہ دو کہ ان پر کوئی دلیل تو پیش کرو۔ عقلی یا نقلی۔ حالانکہ کوئی بھی دلیل نہیں۔ کہیں توریت یا انجیل میں یہ بات نہیں اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم جملہ بنی آدم کا خدا ہے ہر ایک قوم اور ہر ملک سے اس کی یکساں نسبت ہے بلکہ معیارِ نجات جس کو عقلِ سلیم تسلیم کرتی، یہ ہے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کہ جو کوئی یہودی نصرانی عرب عجم ہندی حبشی جس نے اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیا ہو جن چیزوں پر اس نے ایمان لانے کو فرمایا ہو بے چون و چرا ان چیزوں کو مان لیا ہو ان پر ایمان لے آیا ہو (اس میں تکمیلِ قوتِ نظریہ ہوگئی) مگر اس کے ساتھ وَهُوَ مُحْسِنٌ وہ نیکوکار بھی ہو جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہو ان کو بجا لاتا ہو اور جن سے اس نے منع کیا ہو ان سے دور رہتا ہو۔ (یہ تکمیلِ قوتِ عملیہ ہے)۔ فله اجره اس کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں افزائشِ مال و اولاد و تندرستی و اقبال اس کا بدلہ ہے جس کو یہ حاصل نہ ہو بد اعتقاد ہو جائے کیونکہ یہ سب چیزیں فانی ہیں ایسا بدلہ پورا نہیں بلکہ عند ربه اس کے خدا کے پاس عالمِ باقی میں مرنے کے بعد جہاں سدا رہنا ہے وہ کیا ہے جنت اور وہاں کے نعیم باقیہ جن میں سے ایک بات یہ ہے وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کہ وہاں ان کو کسی آنے والی مصیبت کا خوف ہی نہ رہے گا نہ اپنے مرنے کا نہ اپنے دنیاوی اقارب و احباب مغفور

کے مرنے کا' نہ ان کی جدائی کا' نہ ان کے بڑھاپے کا اور امراض کا' نہ کسی قسم کے افلاس کا' نہ جنت سے باہر نکالے جانے کا، نہ کسی دشمن یا بادشاہ کا نہ خود خدا تعالیٰ کی ناراضی کا۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ نہ ان کو دنیا میں عمر رائیگاں کرنے کا غم ہوگا کہ ہائے کچھ نہ کیا۔ لذات و شہواتِ فانیہ میں عمر گنوائی جواب خواب و خیال ہیں۔ ہائے رات دن مال و دولت جمع کرنے میں عمدہ مکان اور باغ بنانے میں سرگرداں رہا وجاہت و عزت کا طالب رہا جن میں سے اب کچھ بھی ساتھ نہیں' نہ اس کا کہ غلط مذاہب کی پابندی سے کیا کیا محنتیں اٹھائیں خدا کی حلال نعمتیں چھوڑ دیں۔ گنگا جمنا میں سالہائے دراز غسل کرتا رہا' دھونی رمائی، بتوں کو سجدہ کیا کسی قبر اور معابد کو نہ چھوڑا کہ جن پر سجدہ نہ کیا ہو ہزاروں روپیہ تقرب الی اللہ سمجھ کر برباد کئے جن کا نتیجہ برعکس پایا۔ ثواب کے بدلے عذاب۔ الغرض اس قسم کا ان کو کوئی غم بھی وہاں نہ ہوگا۔ یہ ہے وہ نجات اور یہ ہے وہ تسلی بخش مذہب۔ اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے قول کو ایک عجیب برہان سے باطل کیا جاتا ہے۔ فقال قالت اليهود الخ کہ اہلِ کتاب کے بڑے بھائی یہود کہتے ہیں نصاریٰ کا کوئی بھی دین و مذہب نہیں چند ڈھکوسلے ہیں جو ان کے پیشواؤں نے بنائے ہیں توریت میں' خدا کو واحد لاشریک لہ بتایا ہے یہ خدا کی تجزی کرتے ہیں۔ تین اجزا سے ملا کر معجونِ مرکب کی طرح ایک خدا کہتے ہیں اور اس کو تفاخر میں آ کر سرِ روحانی اور باعثِ حیاتِ جاودانی بتلاتے ہیں حالانکہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے صد ہا رسول آئے۔ کسی نے بھی اس کی تعلیم تو کیا اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ یہ ان کی تثلیث ہے اور اسی طرح کفارۂ مسیح بھی ایک جاہلانہ خیال ہے توریت اور صحفِ انبیاء میں صد ہا آنے والی چیزوں کی خبریں دی گئی ہیں مگر اس کا کہیں ذکر تک نہیں اور بھلا خدا کے ہاں یہ کیا اندھیر ہے کہ گناہ تو کرے کوئی اور اس کے عوض میں عذاب پائے اور لعنت اٹھائے کوئی۔ یہ دوسرا عقیدہ تھا۔ اب رہا مسیح علیہ السلام کا خدا کا بیٹا ہونا، خدا کا تقدس اس سے بری ہے کہ وہ کسی کو جورو بنائے اور بیٹا جنائے اور پھر وہ بیٹا ہمارے ہاتھ سے کس بے کسی سے صلیب پر چڑھا دیا جائے اور اس سے کچھ بھی نہ ہو سکے اگر بیٹے کا لفظ محبت اور تعظیم کی راہ سے ان پر اطلاق کرتے ہو تو عہد نامہ قدیم میں بہت لوگوں پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مذہب باطل ہے۔ نصاریٰ کہتے ہیں یہود نے پچھلے آنے والے نبی کو نہیں مانا اور توریت میں دھرا کیا ہے احکامِ عشرہ اور دیگر رسمی احکام کے سوا روحانی کوئی بھی حکم نہیں بقول پولوس مقدس توریت ظلمت کا پردہ ہے اور موسیٰ جلادوں کا استاد تھا ہم کو اس سے کوئی کام نہیں یہ رسمی مذہب مسیح کے آنے سے بیکار ہو گیا وغیرہ۔ الغرض یہود کے نزدیک نصاریٰ کا مذہب باطل اور نصاریٰ کے نزدیک یہود کا مذہب غلط۔ دونوں سچے اذ تعارضا تساقطا دونوں غلط اور باطل اور عجب تر یہ کہ هم يتلون الكتب دونوں گروہ تورات اور صحفِ انبیاء کو پڑھتے ہیں اور مانتے ہیں پھر ان کی کس بات کا اعتبار کیا جائے۔ ذرا ٹھہریں۔ قیامت کے دن خدا تعالیٰ اپنی عدالت میں ان کے مقدمہ کا فیصلہ کر دے گا۔ ہر ایک گروہ کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ ؎

باش تابندروی بکشایند   باش تاباتو در حدیث آیند

تاکیانرا نشائندۂ دربر   تاکیاں را گرفتۂ در بر

پھر یہ بھی فرما دیا کہ ان پر کیا موقوف اس قسم کی باتیں ان سے پہلے کے جاہل بھی کہا کرتے تھے۔ مذہب صابی کے لوگوں کا یہی دعویٰ تھا۔ ہنود جو اپنا زمانہ لاکھوں کروڑوں برس کا بتاتے ہیں وہ بھی چار برن، برہمن، چھتری، بیش، شودر کے سوا سب مخلوق کو ملکش اور ناپاک کہتے تھے۔ اب بھی آریہ فریق کے نزدیک نجات کا مدار ایک تقویمِ پارینہ ہے یعنی وید پر ہے اور دنیا بھر کی ہدایت و تعلیم اس میں بھری ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ دنیاوی صنائع اور علوم کا بھی یہی مخزن ہے۔ حالانکہ چند لوگوں کے پرانی زبانوں میں مختلف مضامین کے اشعار ہیں جن کا وزن بھی ان کے مضامین کی طرح وہی جاہلانہ کہ جہاں تمدن نے جنم بھی نہ لیا ہو اور بیشتر تو دل غیر مرئیہ دیوتاؤں اور عناصر کی مدح میں ہیں جو ان کے مصنفوں نے ان کی تسخیر کے لیے بنائے تھے اور جھومنتر میں کام آتے تھے جن کی آج کھینچ تان کر آریہ تاویلات کرتے ہیں مگر چول جب

بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی۔

متعلقات: (١) خدا تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے جھوٹے دعوے کو رد کر دیا اور اس کے بعد معیارِ نجات بتلا دیا اور یہ نہ کہا کہ خاص مسلمان جنت میں جائیں گے کیونکہ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص کہہ سکتا تھا کہ تمہارا بھی یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ہر شخص اپنے مذہب و ملت کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کو غلط سمجھا کرتا ہے بلکہ ایک ایسی بات کہی کہ جس کا کوئی بھی اہلِ عقل انکار نہیں کر سکتا اور جس کو ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگ بالاتفاق مانتے ہیں وہ یہ کہ نجات خدا تعالیٰ کی فرماں برداری اور نیکوکاری پر منحصر ہے اور اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ اس قسم کے کلام کو کہ مخالف کا دعویٰ رد کر کے اپنا دعویٰ مسلمہ مقدماتِ خصم سے ثابت کر دے کلام مدلل کہتے ہیں جو نہایت بلاغت کا کلام ہے۔ (٢) اسلام لغت میں جھکنے اور مطیع ہونے کو کہتے ہیں اور جہاں زیادہ اطاعت اور فرماں برداری مطلوب ہوتی ہے تو منہ جھکانا یا سر جھکانا بولتے ہیں اور چونکہ مذہبِ اسلام میں خدا تعالیٰ کی بے حد فرماں برداری ہے جان سے مال سے تو اس لیے اب مذہب کا نام بھی اسلام قرار پایا۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ
أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا
فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا کہ جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے کی بھی ممانعت کر دی اور اس کے اجاڑ دینے کی کوشش کی ہو ان کو تو یہی لائق تھا کہ ان میں ڈرتے ہوئے جاتے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ان کو آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے پھر جدھر پھر جاؤ ادھر اللہ کا رخ ہے خدا وسعت والا دانا ہے۔

ترکیب: من استفہامیہ انکاریہ محل رفع میں ہے بسبب مبتدا ہونے کے اور اظلم اس کی خبر ہے یعنی اس سے کوئی زیادہ ظالم نہیں ممن میں من نکرہ موصوفہ یا بمعنی الذی ہے ان یذکر موضع نصب میں ہے اس لیے کہ یہ مساجد مفعول منع ہے بدل الاشتمال ہے تقدیرہ ذکر اسمہ فیہما خراب بمعنی تخریب اولئک مبتداء ما کان لھم الخ جملہ اس کی خبر الاخائفین حال ہے ضمیر یدخلوھا سے للہ خبر مقدم المشرق والمغرب مبتداء موخر جملہ مستانفہ فاینما کلمہ شرط تولوا مجزوم بشرط فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جملہ خبریہ جواب شرط۔

تفسیر: عرب میں یہود و نصاریٰ پڑھے ہوئے اور باعلم خیال کئے جاتے تھے قریشِ مکہ اور دیگر بت پرست قومیں اسلام کے مقابلہ میں انہیں سے مدد لیتی تھیں۔ یہ بزرگوار بھی ان کے ورغلانے اور نکتہ چینیاں سکھانے میں کوئی کمی نہ کرتے تھے اور لطف یہ کہ اسلام کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے ان کے مذہبِ بت پرستی کو صحیح کہہ دیا کرتے اور ان کو ان ظلم اور زیادتیوں کی وجہ سے جو وہ وقتاً فوقتاً غریب ایمانداروں پر کیا کرتے تھے جنت اور نجات کا مستحق بھی بنا دیا کرتے تھے۔ اس لیے یہود و نصاریٰ کی گمراہیاں بیان کر کے ان آیات میں روئے سخن ان جاہل اور بت پرست عربوں کی طرف کیا جاتا ہے اور ان کو بھی انہی کے مسلمات سے الزام دیا جاتا ہے۔

قریشِ مکہ خانہ کعبہ کی ایامِ جاہلیت میں بڑی تعظیم کیا کرتے تھے اور قبائلِ عرب بھی کعبہ کا احترام بجالاتے تھے مگر جب اسلام کا نور کوہِ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا تو ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اسلامیوں کو کعبہ میں جا کر خدا پرستی اور اس کے نام لینے سے منع کر دیا جو ان

کے اصولِ مسلمہ کے نزدیک بھی بہت ہی برا کام تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ بھی بڑے ظالم اور بدکردار ہیں۔ فقال وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ کہ تمہیں بتاؤ اے قریشِ مکہ جو اپنے مذہب بت پرستی کو حق سمجھتے ہو کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظالم ہے کہ جو خدا کی مسجدوں میں اس کے نام لینے سے منع کرے؟ بظاہر نزولِ آیت کے وقت عرب بالخصوص مکہ میں ایک ہی مسجدِ ابراہیمی یعنی کعبہ تھا پھر جمع کا صیغہ لانے سے یا تو یہ غرض ہے کہ جس نے کعبہ میں یادِ الٰہی کرنے سے منع کیا تو اس کو اور مسجدوں میں منع کرنے سے کیا تامل ہوگا گویا وہ ایک مسجد سے منع نہیں کرتا بلکہ بہت سی مسجدوں سے روکتا ہے اگر وہ پائی جائیں یا کعبہ سے ممنوع ہونے کے بعد ایمانداروں نے اپنے گھروں میں نماز کے لیے چبوترے بنائے تھے یہ کمبخت وہاں بھی یادِ الٰہی کرنے سے روکتے تھے وہ بھی مساجد اللہ ہی تھیں۔ مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے قریب نماز کے لیے ایک چبوترا بنا لیا تھا وہیں نماز ادا کرتے تھے اور پُرسوز لب و لہجہ میں قرآن کی وہ آیات پڑھتے تھے کہ جو روح پر بشرطیکہ اس میں حیات کا کوئی حصہ باقی ہو کوڑے مارتی تھی، وہی آنے جانے والوں کا راستہ تھا۔ جانے آنے والے کھڑے ہو جاتے تھے اور سن کر سر دھنتے تھے جس سے مکہ میں ایک نیا جوش برپا ہو گیا۔ اس لیے قریشِ مکہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو وہاں بھی نماز اور قرآن پڑھنے سے روک دیا۔ کعبہ کی تعمیر اور مرمت کو قریش بڑا کارِ خیر سمجھتے تھے۔ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا حالانکہ مساجد کی آبادی میں نمازیوں کا جمع ہونا ہے ان کو منع کرنا مساجد کا برباد کرنا ہے مسجد گو چونہ پتھر سے لاکھ آراستہ ہو مگر جب نمازی نہیں تو اس کو اجاڑ ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک فعل قریش کا کعبہ کی نسبت تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ خود جو وہاں جاتے بجائے نماز کے تالیاں اور سیٹیاں بجا کے بتوں کے آگے ناچتے کودتے تھے۔ یہ بھی مسجد کی بڑی بے ادبی ہے بلکہ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ وہاں خدا سے ڈر کر ادب سے جانا چاہیے۔ جب یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نمازیوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کرنا حرام ہے اسی طرح مساجد میں عبادت کے سوا اور لہو و لعب کے اشغال بھی حرام ہیں جو مساجد اللہ کے ساتھ ایسی بے ادبی کرے گا لَهُمْ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی اور ذلت ہے جیسا کہ قریش کو بدر وغیرہ معارک میں ہوئی اور آخرت میں بھی ایسے لوگوں کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ اب اس پر قریشِ مکہ اپنے آپ کو حق پرست اور مستحقِ نجات سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان دنوں میں مسلمانوں کو کعبہ سے روکے جانے سے غم تھا کس لیے کہ جہتِ عبادت اور محلِ عبادت کعبہ ہی کو سمجھتے تھے۔ اس کے بابت تسلی کر دی کہ مشرق و مغرب سب خدا کا ہے وہ کافر تمہاری عبادت نہیں روک سکتے جدھر چاہو ادھر منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ وہیں وجہ اللہ خدا حاضر و ناظر ہے ہر سو اس کی ذات کا جلوہ ہے

فائدہ: اس وقت کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ضروری نہ رہا تھا اور اب بھی اگر کعبہ کا رخ معلوم نہ ہو یا کسی عذر سے اس طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے تو تکبیر کے وقت ادھر منہ کر لے اگر ہو سکے باقی نماز فرض و نوافل جس طرف چاہے پڑھے کس لیے کہ اسلام میں کعبہ پرستی نہیں ہے بلکہ خدا پرستی ہے۔ اس آیت کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرنا بشرطِ قدرت واجب ہو گیا کس لیے کہ یہ مسجد محلِ قبولیت ہے اگر وہاں جا نہ سکے تو اس طرف منہ کر کے ہی نماز پڑھا کرے۔

مفسرین کے اس کے شانِ نزول میں متعدد اقوال ہیں۔ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ ہم جہاد میں ایک اندھیری رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں مشغول ہوئے اندھیرے کی وجہ سے قبلہ نہ معلوم ہوا کسی نے کسی طرف اور کسی نے کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ پھر صبح کو معلوم ہوا کہ قبلہ رخ نماز نہ پڑھی گئی اور ہم نے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو یہ آیت نازل ہوئی کہ مشرق و مغرب سب خدا کے لیے ہے ہر طرف میں اس کا جلوہ ہے۔ ایسے عوارض میں تعلقِ جہت کچھ شرط نہیں۔ (تفسیر کبیر) ترمذی و ابن ماجہ نے بھی ایسا ہی مضمون نقل کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نمازِ سفر کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ سفر میں جو شخص سواری میں بیٹھ کر نوافل پڑھنا چاہے اور اس کی سواری کا منہ قبلہ کی طرف نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے اس کو بھی ترمذی اور نسائی اور ابن ابی حاتم نے

روایت کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور حسن اور قتادہ وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس کے نازل ہونے کا یہ سبب ہوا تھا کہ جب آنحضرت ﷺ کو بیت المقدس کی طرف سے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو یہود نے طعن کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہر طرف اسی کا جلوہ ہے اور مشرق و مغرب اسی کا ہے کچھ وہ مجسم نہیں کہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف یا جنوب یا شمال کی طرف۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت تحویلِ قبلہ کے لیے تمہید ہے جس کا بیان آگے آتا ہے۔

فائدہ: ثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے یہ معنی نہیں کہ وہاں خدا تعالیٰ منہ مصلے کی طرف کئے بیٹھا ہے بلکہ ادھر سے اس کی ذات اور اس کی توجہ اور تجلی ہے وہ مکان سے پاک ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور کہتے ہیں خدا نے بیٹا بنایا ہے حالانکہ وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے سب اسی کے فرمان بردار ہیں (وہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور جب کوئی چیز کرنا چاہتا ہے تو صرف یہی کہہ دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتی ہے

ترکیب: وقالوا فعل ھم ضمیر فاعل اتخذ فعل اللہ فاعل ولدًا مفعول بہ جملہ مل کر مقولہ ہوا سبحانہ جملہ معترضہ بدیع بمعنی مبدع مضاف السموات والارض مضاف الیہ مجموعہ خبر مبتدا محذوف کی ای ہو واذا قضٰی الخ شرط فانما یقول الخ جواب شرط۔

تفسیر: یہاں سے عیسائیوں کے خیالاتِ فاسدہ کا رد شروع ہوتا ہے۔ عیسائیوں کا اول عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے فرزند ہیں۔ یہ خیال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روبرو حواریوں میں نہ تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا۔ قدیم عہد نامہ میں یہ لفظ محبت اور پیار کی راہ سے بعض اور بندوں پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو کبھی خدا تعالیٰ کو محبت میں باپ کہا ہے تو نادان عیسائیوں نے ان کے ظاہری باپ نہ ہونے سے ان کو سچ مچ خدا کا بیٹا ہی سمجھ لیا۔ اس بات کو خدا تعالیٰ کس دل پسند تقریر سے رد کرتا ہے۔ اول تو یوں کہ سبحانہ وہ توالد و تناسل سے جو ممکنات اور حیوانات و نباتات کی صفت ہے پاک ہے۔

دوم بیٹا بنانے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ وقت پر کام آوے سو نہیں یہ بھی نہیں، کس لیے کہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی ملک ہے سب اس کے آگے سرنگوں ہیں اس کو کسی کی حاجت کیا ہے اس میں اس دلیل کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے اور جملہ کائنات کہ جس میں عیسیٰ علیہ السلام بھی داخل ہیں اس کے مملوک ہیں نہ مالک پھر مخالفت کہاں رہی۔ تیسرے وہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ بتاؤ عیسیٰ علیہ السلام نے اس مخلوق میں سے کون سی چیز بنائی ہے؟ باپ سے زائد نہیں تو برابر ہی بناتا۔ چہارم اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا الخ جس کام کو کرنا چاہتا تو صرف اس کہنے سے کہ ہو جا ہو جاتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام میں یہ قدرت کہاں تھی وہ تو اپنی جان بھی یہود کے ہاتھ سے نہ بچا سکے، دشمنوں پر غلبہ نہ پا سکے۔ الغرض عیسیٰ علیہ السلام میں امکانِ محض اور خدا سراسر واجب الوجود جس کے لیے یہ جملے بیان کئے گئے۔ واجب الوجود اور ممکن الوجود میں کون سی شرکت ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ پھر جب بیٹا باپ کے کسی وصف میں بھی شریک نہیں تو بیٹا کیسا؟ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معمولی توالد ہوا نو مہینے پیٹ میں رہے پھر دودھ پیتے رہے۔ رفتہ رفتہ جوان ہوئے۔ خدائے قادر کو ان باتوں کی کیا حاجت، وہ تو فی الفور کرتا ہے کن کہتے ہی ہر چیز ہو جاتی ہے۔

پھر اور بھی ان مدعیوں کے لغو اعتقاد بیان فرما کر ان کو شرماتا ہے کہ ان مدعیوں نے یہ بھی اعتقاد کر رکھا ہے کہ خدا نے بیٹا جنا ہے اگرچہ تمام یہود اس کے قائل نہیں اور نہ تھے مگر مدینہ کے یہود میں سے کعب بن اشرف اور کعب بن اسد اور وہب بن یہود یہ کہتے تھے کہ عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں (وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ) اور نصاریٰ تو باستثنائے چند فریق تمام کلیسا حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور اب بھی اس نجس اعتقاد کو موجبِ نجات جانتے ہیں اور پولوس نے اس کا رواج دیا ہے۔ اس پولوس اور اس کے شاگردوں کی کتابوں میں کہ جن کو عیسائی انجیل اور کلامِ خدا کہہ کر دل خوش کرتے ہیں یہ کفر اب تک موجود ہے اور عرب کے مشرک فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ (الکم الذکر ولہ الانثٰی)

(۱) باپ بیٹے میں مجانست اور مماثلت تو ضرور ہے لائق بیٹے تو باپ کے کمالات وصفات میں برابر حصہ دار ہوتے ہیں اور نالائق کم اور خدا تعالیٰ میں تین باتیں سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں۔ اول آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا کہ جو بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں مذکور ہے۔ دوم اس کے احکامِ تکوینی کا ہر چیز پر نافذ ہونا ہر بات پر قادرِ مستقل ہونا جو اِذَا قضی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ سے سمجھا جاتا ہے۔ سوم مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کا اس کے مسخّر ہونا جو کل لہ قانتون میں مذکور ہے۔ حالانکہ یہ تینوں باتیں ان کے سوا کسی میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام اور فرشتوں نے آسمان و زمین تو کیا ایک پہاڑ کے پتھر کو بھی پیدا نہیں کیا اور ہر بات پر ان کی قدرت نہ تھی خود حضرت مسیح علیہ السلام بقول نصاریٰ دار پر کھینچے جانے کے وقت کس آہ و زاری کے ساتھ چلاتے رہے مگر مخالفوں سے نجات نہ پا سکے۔ اسی طرح عزیر علیہ السلام بخت نصر کا کچھ نہ کر سکے اور ایران کے بادشاہوں کی مدد و حکم بغیر بیت المقدس کی مرمت نہ کر سکے۔ یہی حال فرشتوں کا ہے اور اسی طرح عالم کی ہر چیز ان کے آگے مسخر نہیں وہ خود اپنے ہی وجود و عدم اور صحت و مرض پر حکمران نہیں یا یوں کہو: (۲) عالم میں دو قسم کے تصرفات ہیں ایک یہ کہ ابتداءً کسی چیز کا پیدا کرنا سو یہ کامل تصرف ہے یا پیدا کی ہوئی چیزوں میں الٹ پھیر کر کے ایک نئی صورت پیدا کر دینا تصرفِ ناقص ہے اگر بغور دیکھا جائے تو یہ دونوں تصرف خدا کے قبضہ میں ہیں۔ اول میں کسی کو کچھ بھی حصہ نہیں مگر دوسری قسم میں کسی قدر مشابہت سی پائی جاتی ہے جیسا کہ معمار اور بڑھئی اینٹوں اور لکڑیوں میں تصرف کر کے ایک مکان یا تخت بنا دیتا ہے یا کمہار مٹی اور گارے میں تصرف کر کے عمدہ عمدہ برتن اور مورتیں بناتا ہے اور باپ اور بیٹے میں جو کچھ تصرف ہے تو از قسم ثانی ہے بلکہ وہ بھی از حد ناقص۔ کس لیے کہ باپ کا صرف یہی کام ہے کہ وہ بچے کی ماں کے رحم میں منی ڈالتا ہے جس سے پھر بہ تدریج بچہ پیدا ہوتا ہے سو جس کو اول اور دوم قسم کی قدرتِ کاملہ حاصل ہو وہ اس تیسری قسمِ ارزل کی طرف کیوں محتاج ہونے لگا وہ تو بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے کہ ہر ایک آسمان و زمین کو ابتداءً پیدا کر دیا۔ (۳) علاوہ اس کے جو کوئی بیٹے کا خواستگار ہوتا ہے تو دو بات کے لیے ایک یہ کہ کوئی اس کا اپنا اور حکم بردار ہو سو لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی مخلوق و مملوک ہے بیٹا تو مخلوق و مملوک بھی نہیں ہو سکتا اور ہر چیز اس کی فرماں بردار اور اس کے آگے مسخر ہے پھر ایک یا دو یا دس پانچ کو بیٹا بنا کر فرمان بردار کرنا کیا فائدہ؟ دوم یہ کہ بوقتِ ضرورت کام آوے اور اس کی پیری میں اس کا نائب بن کر کام کرے سو یہ بھی نہیں، کس لیے کہ وہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے ایسا قادرِ قدیم ہے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اس کو ضرورت اور پیری کب لاحق ہو سکتی ہے وہ ازلی ابدی ہے اس پر ضعف اور ناتوانی کا کیا دخل ہے اور نائب بنا کر اس کو کام لینے کی کیا حاجت ہے اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اس کے حکم سے فوراً ہر چیز موجود ہو جاتی ہے اور ایک دلیل بیٹا نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ ولد اور والد میں مجانست ضرور ہے اور خدا کے لیے اگر کوئی ولد ہو تو مجانست لازم آوے اور یہ محال ہے تو ولد کا ہونا بھی محال ہے۔ مجانست کا محال ہونا اس طرح پر ہے کہ جب دو چیز باہم ہم جنس ہوتی ہیں تو ان میں ایک فصلِ ممیّز بھی ضرور ہوتی ہے تو ہر ایک کے لیے دو جز حقیقت قرار پاویں گے۔ ایک جنس اور دوسری فصل اور جو مرکب ہوتا ہے تو حادث ہوتا ہے۔ پس خداوند تعالیٰ کا

حادث ہونا ثابت ہو جائے گا اور یہ محال ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں اس دلیل کے دوسرے مقدمہ کے بطان پر (یعنی مجانست کے بطان پر) اس آیت میں اشارہ کر دیا لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کہ خدا کی ہر چیز مملوک و مخلوق و مسخر ہے پھر اس کا ہم جنس کون ہے۔ پھر اس آیت بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اور بھی مباینتِ کلی بیان کر دی کہ کوئی مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے یہ نہ سمجھ لے کہ خود آسمان و زمین قدیم اور واجب الوجود ہوں بلکہ یہ آسمان اور زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے سب حادث اور ممکن ہے سب کا وہ خالق ہے۔ پس ولدیت کیسی اور مجانست کیسی، اس کے بعد صفات میں بھی تفاوتِ صریحہ بیان کر دیا ہے وہ یہ کہ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ کہ اس کو یہ قدرت ہے کہ جو کسی دوسرے میں نہیں یعنی جب وہ کن کہتا ہے اسی وقت وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص اس آیت سے اور بھی دلائل نفیِ ولدیت پر مستنبط ہو سکتے ہیں۔

فوائد : (۱) بعض عیسائی جب ان دلائل سے عاجز ہو جاتے ہیں تو لاچار ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری مراد بیٹے ہونے سے اس قسم کا بیٹا نہیں یعنی اس کے حقیقی معنی مراد نہیں۔ مسلمان حقیقی معنی خیال کر کے اعتراضات کرتے ہیں مگر جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ آیا مجازی معنی لیتے ہو یا کچھ اور۔ اول شق میں تو اس کے معنی محبوب اور معزز کے ہیں پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت اور بھی انبیاء پر بائبل میں لفظ ابن اس معنی سے بولا گیا ہے مگر ادباً شریعتِ محمدیہ میں اس کی ممانعت ہو گئی ہے اور اگر کچھ اور مراد ہے تو اس کو بیان کرو مگر الوہیت میں شریک کرو گے تو پھر انہیں دلائل سے رد کیا جائے گا۔ کس لیے کہ دو الٰہ نہیں ہو سکتے۔ بعض پادری لاچار ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سرِّ الٰہی ہے ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے جیسا کہ آیاتِ متشابہات مگر یہ عذر بدتر از گناہ ہے۔ کس لیے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ایک خاص معنی تجویز کر کے اس کے ماننے کو باعثِ نجات تو نہیں کہتے بلکہ مجملاً تسلیم کرنے پر بس کرتے ہیں اور تم لفظ ابن اور اَب کی نسبت ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کے معنی باپ اور بیٹا قرار دے کر سب کو سمجھاتے اور اسی کو موجبِ نجات ٹھہراتے ہو پھر اس پر قیاس کرنا بڑی غلطی ہے۔ فی الحقیقت یہ ایسا لغو اور غلط عقیدہ ہے کہ جس سے ہر دانش مند کو تنفرِ طبعی ہے۔ اس لیے آج کل یورپ میں لاکھوں آدمی اس عقیدے سے بلکہ مذہبِ عیسوی سے نفرت کر کے اسلام کی طرف اور کچھ الحاد کی طرف مائل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ صرف پادری اور مشن کے ملازم یا چند سادہ لوح عیسائی باقی ہیں جو ان باتوں کو مانتے ہیں واللہ الہادی وبیدہ ازمتہ المقاصد والمبادی۔

(۲) ابداع لغت میں ایسی چیز پیدا کرنے کو کہتے ہیں کہ جو نئی ہو اور اسی سے بدعت ہے یعنی دین میں کوئی نئی بات نکالنا اور اسی لیے قرآن میں مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ آیا کہ میں انوکھا رسول نہیں ہوں اس جگہ جو بدیع السمٰوٰت الخ کہا موجد السمٰوٰت نہ کہا اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے اور آدم کو بے ماں باپ کے اس نے پیدا کیا تو اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے۔ ہمیشہ سے خدا نئی اور طرح طرح کی چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ
اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

اور بے علم (مشرکینِ عرب) کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہیں۔ ان کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔ یقین کرنے والوں کے لیے تو ہم آیتیں بیان کر چکے ہیں ہم نے تم کو (اے نبی) دینِ حق دے کر خوشی اور ڈر سنانے کو بھیجا ہے اور تم سے (اے نبی) جہنمیوں کی کوئی پرسش[1] نہ ہو گی۔

ترکیب : قال فعل الذین موصول لا یعلمون صلہ مجموعہ فاعل لولا کلمۂ تخصیص یکلمنا اللہ جملہ معطوف علیہ او تاتینا آیہ معطوف مجموعہ مقولہ ہوا قال فعل الذین من قبلہم صلہ و موصول فاعل کذلک مفعول مقدم مثل مضاف قولہم مضاف الیہ مجموعہ بدل یا بیان ہے کذلک سے تشابہت فعل قلوبہم فاعل جملہ محل حال میں ہے۔ بحذف قد رالذین سے بالحق جار مجرور موضع حال میں ہے تقدیرہ ارسلناک ومعک الحق بشیرًا و نذیرًا دونوں حال ہیں کاف ارسلناک سے۔

تفسیر : عیسائیوں کا جاہلانہ اعتقاد بیان کر کے عرب کے جاہلوں کے اقوال نقل کرتا ہے جو ان کی تعلیم سے رسول کریم ﷺ اور قرآن مجید کے بارہ میں کیا کرتے تھے تاکہ معلوم ہو کہ پیر اور مرید دونوں ہدایت اور علم سے کس قدر دور پڑے ہوتے تھے اور دنیا میں کس قدر جہل اور گمراہی کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اہلِ کتاب جو اہلِ علم و کمال تھے جن کو اگلے انبیاء اور ان کی کتابوں کا خزانہ دار سمجھا جاتا تھا ان کی تو یہ حالت اور عرب کے جاہلوں کی یہ کیفیت تھی۔ قریشِ مکہ آنحضرت ﷺ کے مقابلہ میں دو اعتراض کیا کرتے تھے ایک یہ کہ خود ہم سے اللہ کیوں کلام نہیں کرتا اور کیوں بالمشافہ نہیں کہہ دیتا کہ ہم نے فلاں کو رسول بنا کر بھیجا ہے لولا یکلمنا اللہ، دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر ایسا نہیں کرتا تو کیوں کوئی آیت یعنی ایسی نشانی ہمارے پاس نہیں بھیج دیتا جس سے رسالت کی صداقت ہو جاتی او تاتینا آیۃ پہلے اعتراض کا جواب بلکہ دوسرے کا بھی یہ دیتا ہے کذلک قال الذین من قبلہم الخ کہ یہ ان کی نادانی ہے اگر ہر شخص میں خدا تعالیٰ سے کلام کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہوتی تو دنیا میں انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر شخص خدا سے پوچھ کر حرام و حلال' عبادت و ریاضت کے امور طے کر لیا کرتا۔ خدائے تعالیٰ نور ہے جہاں مادہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔ انسان مادی ہے جس کی ہیولانیت کے ظلمات اس پر ہر طرف سے محیط ہیں۔ ہاں انہیں انسانوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے ان ظلمات سے نورانی عالم میں لاتا اور اس سے بواسطہ ملائکہ یا بلاواسطہ ہزاروں نورانی پردوں کے اندر سے کلام کرتا ہے۔ دنیاوی معاملات میں کیا ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ مجھے حکیم کی کیا ضرورت ہر ایک کیوں نہیں حکیم ہو جاتا یا بادشاہ اور حکمراں کی کیا ضرورت، ہر شخص بادشاہ یا حکمراں کیوں نہیں بن جاتا۔ یہ نادانی اور جہل ہے پہلے جاہل بھی انبیاء کے مقابلہ میں ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے اور ان کے دل جہل میں یکساں ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب دیتا ہے قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ کہ ایک نشانی نہیں ہم بہت سی نشانیاں بیان کر چکے ہیں مگر کس کے لیے لقوم یوقنون یقین کرنے والوں کے لیے جن میں قضاء و قدر نے یقین کا مادہ ہی نہیں رکھا۔ ان کے روبرو ہزاروں معجزات دکھاؤ' سینکڑوں نشانِ قدرت رات دن ان کے سامنے پیش آئیں اور آتے ہیں مگر ان کو ان سے کوئی بھی نفع نہیں۔ بہرے کے سامنے ہزاروں نغمات دلکش گائے جائیں مگر اس کو کیا؟

فائدہ : لفظ آیت سے اس مقام پر آیتِ قرآنی مراد نہیں۔ کس لیے کہ ایک آیتِ قرآنی کیا بہت سی ان کے پاس آ چکی تھیں پھر کسی ایک آیت کی کیا درخواست کیا کرتے۔ بلکہ آیت سے نشانِ قدرت یعنی معجزات وغیرہا مراد ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضراتِ انبیاء کی روحانی طاقت سے اس قسم کے سینکڑوں حیرت خیز کام ظہور میں آئے جن کا فلسفہ انکار کرتا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہنوز فلسفہ کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ وجدانی خوارق و معجزات تو ایسے روحانی بزرگوں سے سینکڑوں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ دل کی کشش قلبی لذت جس کا انکار نہیں ہو سکتا

---

[1] کہ وہ کیوں ایمان نہیں لاتے تمہارا کام صرف حکم پہنچا دینا ہے۔

آنحضرت ﷺ میں وہ تھی اور اب بھی ہے۔ جس کے مقابلہ میں لوگوں نے جان و مال فدا کر دی۔ شہواتِ لذات ترک کر دیے مگر اس کا احساس توقوم یوقنون ہی کو تھا اور اب ہے۔

اس کے بعد ان کے شبہات کو لاشے بنا کر ارشاد ہوتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا کہ خود ہم نے نہ کہ کسی اور نے آپ کو دینِ حق دے کر بھیجا ہے تا کہ ماننے والوں کو بشارت دے اور منکروں کو آنے والی مصیبت سے خوف دلائے اور اے نبی اگر کسی بدبخت بدنصیب نے تمہاری بات کو نہ مانا تو آپ کے فرضِ منصبی میں کوئی قصور نہیں۔ آپ سے ان جہنمیوں کی بابت کوئی پرسش نہ ہوگی۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

وقف منزل

اور یہود آپ سے ہرگز خوش نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ بھی راضی ہوں گے تاوقتیکہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہوں گے۔ کہہ دو ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے اور اگر آپ اس کے بعد بھی کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو آپ کے لیے اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (قرآن) وہ تو اس کو جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے ویسا ہی پڑھتے ہیں وہی اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور جو اس کے منکر ہیں سو وہی نقصان پانے والے ہیں۔

ترکیب: وَلَنْ تَرْضٰى فعل عنك اس کے متعلق الیهود والنصارى فاعل حتى تتبع فعل انت فاعل ملتهم مفعول جملہ غایۃ قل فعل انت فاعل ان هدى الله اسم ان هو ضمیر فصل الهدى خبر جملہ مقولہ ولئن میں لام تاکید ان شرطیہ اتبعت الخ شرط مالك الخ جواب شرط الذین موصول آتینهم الكتاب جملہ خبریہ صلہ یتلون حق تلاوته حال مقدرہ ھم سے یا کتاب سے حق منصوب بوجہ مفعول مطلق ہونے کے تقدیرہ، یتلون تلاوته حقا اولئك مبتدا یؤمنون به جملہ خبریہ مجموعہ خبر الذین ومن شرطیہ یکفر به جملہ شرط فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جواب شرط۔

تفسیر: اس جگہ خدا تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو یہ بات بتلاتا ہے کہ گو یہ دینِ حق ہے اور اس کی اندرونی و بیرونی خوبیاں اس کی حقانیت کی روشن دلیلیں ہیں جن سے دل میں مخالف بھی قائل ہیں اگر ضد اور تعصب سے یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک کہ آپ خود ان کی جہالت و ضلالت کے جس کو انہوں نے مذہب ملت بنا رکھا ہے تابع نہ ہو جائیں گے دینِ حق ماننا تو درکنار آپ سے خوش بھی نہ ہوں گے آپ ان ازلی بے نصیبوں سے کوئی طمع ہدایت پر آنے کی نہ رکھیں اور ان کی طمع کاریوں کو ہدایت نہ سمجھیں۔ کس لیے کہ ہدایت تو وہی ہے جو منجانب اللہ ہے نہ ان کے تراشیدہ خیالات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مشائخ و علماء نے پیدا کئے ہیں' آپ ہرگز ان کی خواہشوں پر نہ چلیں۔ آپ سے یہود درخواستیں کیا کرتے تھے کہ اگر فلاں امر میں ہمارا کہنا مان لیں تو ہمارا آپ کا اختلاف جاتا رہے۔ کبھی تحویلِ قبلہ کی درخواست ہوتی تھی، کبھی جانوروں کی حلت و حرمت میں اتفاق چاہتے تھے، کبھی اور احکام میں تبدل و تغیر کی درخواست کرتے تھے چونکہ آنحضرت ﷺ کو گمراہوں کی ہدایت پر آنے کی از حد حرص تھی ممکن تھا کہ آپ مصلحتِ وقت کا لحاظ کر کے جزئیاتِ احکام میں ان کا کہا مان

لیتے کہ وہ اصولِ مذہب میں آپ کی پیروی کرتے مگر اس بات سے بھی خدا تعالیٰ نے بہت مؤکد پیرایہ میں آپ کو منع کر دیا کہ آپ ہرگز ایسا نہ کریں کیونکہ آپ کے پاس علم آ چکا' حقائق الامور منکشف ہو گئے۔ اگر ایسا کرو گے تو تم پر سے سایۂ فضلِ الٰہی اٹھ جائے گا۔ وہی زہر تم میں بھی سرایت کر جائے گا پھر تمہارے لیے جو ولایت اور حمایتِ الٰہی غیب سے مقرر ہو چکی ہے باقی نہ رہے گی۔ حقیقت میں بدبخت قوموں میں اختلاط اور ان کی رسوم میں شرکت زوالِ برکات اور حمایتِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے، اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب کہ لشکرِ اسلام ممالکِ عجم پر غالب آیا ایک نامہ لکھا جس میں مفتوح قوموں سے اختلاط کرنے اور اپنے عربی خواص چھوڑنے سے سخت ممانعت کی۔ جب تک مسلمانوں میں یہ بات رہی فتح و نصرت' ہیبت و شوکت' اقبال و دولت بھی ان کے قدموں کے ساتھ لگی رہی اور جب سے یہ بات باقی نہ رہی ان کا اقبال بلکہ مذہب بھی مدبر قوموں کے ساتھ پامال ہو گیا۔ اس کے بعد اہلِ کتاب کی طرف روئے سخن متوجہ کر کے فرمایا جاتا ہے کہ یہ جو اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے اور تفاخر کرتے ہیں یعنی موجودہ یہود و نصاریٰ وہ کیا اہلِ کتاب ہیں ان کا اپنی کتاب پر ایمان ہے نہ اس کو پڑھتے ہیں' پس پشت ڈال رکھا ہے اگر اپنی کتاب کو پڑھتے ہوتے اور اس پر ایمان رکھتے تو نبیِ آخر الزمان پر ایمان لاتے اور ان کی ہدایت قبول کرتے جیسا کہ عبداللہ بن سلام اور نجاشی وغیرہا رضی اللہ عنہم باانصاف یہود و نصاریٰ نے کیا کیونکہ ان کی کتابوں میں بہت سی بشاراتِ نبیِ آخر الزمان علیہ السلام کی بابت موجود ہیں گویا یہ اہل کتاب نہیں اگر ہوتے تو اس کا جو حقِ تلاوت ہے اس طرح پڑھتے معانی میں غور کرتے' اس پر عمل کرتے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یتلونه ومن یکفر به کی ضمیریں الکتاب کی طرف پھرتی ہے جس سے مراد قرآن مجید ہے۔ اب آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جن کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے یعنی مومن وہی اس کو خوب پڑھتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں یہ سعادت انہی کو نصیب ہے اور جو اس کے منکر ہیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ وہ زیاں کار دنیا و آخرت میں بے نصیب ہیں۔ گویا اہلِ کتاب کے خطاب کے مسلمان مستحق ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ الکتاب سے مراد توریت وغیرہا ہی ہیں مگر یؤمنون به کی ضمیر بطور صفت استخدامِ قرآن کی طرف پھرتی ہے کیونکہ اس پر بھی شروع الم میں کتاب کا اطلاق ہوا ہے یعنی اصلی اور سچے اہلِ کتاب قرآن پر ایمان لاتے ہیں اس کے مطالب علیہ کو موافق پا کر مگر بدبخت نام کے اہل کتاب رہبان اور قسیسوں کے بندے وہ منکر ہیں اس لیے زیاں کار ہیں واللہ اعلم بمرادہ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو تو یاد کرو کہ جو میں نے تم کو دی تھی اور یہ بھی کہ میں نے تم کو جہان پر فضیلت دی تھی اور اس دن سے ڈرو کہ جس دن کوئی بھی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے بدلہ قبول ہوگا نہ سفارش فائدہ دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

ترکیب: یا حرف ندا بنی مضاف اصل میں بنین ابن بمعنی پسر تھا ن اضافت سے ساقط ہو گیا اسرائیل مضاف الیہ مجموعہ منادیٰ اذکروا فعل امر حاضر معروف ضمیر انتم فاعل نعمتی موصوف التی موصول انعمت علیکم جملہ صلہ عائد محذوف مجموعہ معطوف علیہ وَ اِنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ جملہ معطوف پھر سب مل کر مفعول ہوا اذکروا کا۔ اذکروا اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ ندائیہ ہوا۔ واتقوا الخ اس کی ترکیب بیان ہو چکی وہاں دیکھ لو۔

تفسیر : اس سورہ میں خداتعالیٰ نے جب بنی اسرائیل سے کلام شروع کیا تھا تو وہاں بھی یہی فرمایا تھا کہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الآیہ اور پھر جب ان کی نصیحت اور ان کے مکائد پر فضیحت سے فراغت پائی تو پھر کلام کو تمام کرتے وقت بھی یہی فرمایا کہ اے بنی اسرائیل تم احسانات کو یاد کرو کہ میں نے تمہارے ساتھ مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں کیا کیا احسان کئے یہاں تک کہ تمہارے خاندان کو ایک وقت میں دنیا کے تمام خاندانوں سے افضل اور اشرف کر دیا تھا اور تم نے پھر جس قدر نافرمانیاں کیں ان کے برے نتائج دنیا میں بھگتے۔ اب اگر تم اپنی نافرمانی اور سرکشی سے باز نہیں آتے تو یہ بھی یاد رہے کہ میں جس طرح کریم و رحیم غصہ کا دھیما ہوں اسی طرح قہار و جبار بھی ہوں پھر تم روزِ قیامت سے ڈرتے رہو کہ جہاں نہ کسی کی سفارش کام آتی ہے نہ کچھ معاوضہ لیا جاتا ہے نہ کوئی مددگار مدد کر کے چھڑا سکتا ہے۔ یہ کمالِ بلاغت ہے کہ اول میں موردِ نزاع کو قائم کر کے اس پر بہت کچھ دلائل لائے جائیں اور پھر نتیجہ میں وہی دعویٰ ذکر کیا جائے اور نیز نصیحت قبول کرانے کے حق میں یہ بات (کہ منافع اور رحمت سے امید دلائی جائے اور پھر انجام کا خوف بھی دلایا جاوے) اکسیر کا اثر رکھتی ہے۔

اس کے بعد خداتعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کسی قدر حالات بیان فرماتا ہے کہ جن کی نسل سے ہونے پر یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ عرب کو بڑا ناز تھا کہ خود ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی کیفیت معلوم ہو جاوے اور انہی کے بیان سے نبی آخر الزمان کا برحق ہونا ثابت ہو جاوے اور خود ان کا ابراہیم علیہ السلام کے عہدۂ نبوت سے محروم ہونا معلوم ہو جاوے:

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

اور (یاد کرو) جبکہ ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے ان کو پورا کر دیا خدا نے کہا کہ ہم تم کو لوگوں کا پیشوا کیا چاہتے ہیں۔ وہ بولے اور میری اولاد میں سے بھی (خدا نے) فرمایا میرا اقرار ظالموں تک نہیں پہنچتا۔

ترکیب : واذا محل نصب میں ہے اذکر محذوف سے ابتلی فعل ابراھیم مفعول ربہ فاعل بکلمٰت متعلق ہے ابتلی کے فاتم فعل ضمیر ہو راجع ابراہیم کی طرف فاعل ھن مفعول راجع **کلمات** کی طرف قال فعل ضمیر ہو راجع **رب** کی طرف فاعل انی الخ جملہ مقولہ انی میں ی اسم ان جاعلك الخ جملہ خبر ك مفعول اول جاعل کا اماما مفعول ثانی للناس متعلق جاعل کے یہ تمام جملہ ابتلی کا بیان ہے یا جملہ مستانفہ ہے ومن ذریتی اس کا عطف کاف ہے ای وبعض ذریتی کما تقول وزیدا فی جواب سا کرمک ای واجعل فریقا من ذریتی اماما لاینال فعل عھدی فاعل الظلمین مفعول سب جملہ مقولہ ہوا قال کا جو جواب ہے سوالِ ابراہیم کا۔

تفسیر : مکہ بلکہ عرب کے لوگ اور یہود و نصاریٰ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے (بلکہ اب بھی مانتے ہیں) اور ہر فریق کو اس بات پر بڑا غرہ تھا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہیں اور ان کے طریقے کے پیرو خدا نے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے برکت کا وعدہ کر لیا ہے۔ سو وہ ہم کو ہر حال میں کافی ہے۔ خداتعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کے طریق پر نہیں وہ ہمارا نہایت فرمانبردار بندہ تھا، ہم نے اس کو کئی باتوں میں آزمایا وہ سچے نکلے۔ بیٹے کی قربانی کا حکم دیا وہ ہمہ تن آمادہ ہو گئے اور ستارہ پرستوں کی محبت اور برادری بلکہ وطن چھوڑنے کو کہا انہوں نے ویسا ہی کیا۔ سب کو چھوڑ کر ملکِ شام میں آ رہے۔ ریگستانِ عرب میں خدا کے لیے عبادت خانہ بنانے اور اس کی محافظت کے لیے اپنی اولاد بسانے کو کہا اس نے اپنے پیارے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو وہاں بسایا اور خانہ کعبہ بنایا۔ نمرود نے آگ میں ڈالا، ایمان پر قائم رہ کر اس میں گرنا منظور کیا۔ یہ تھیں وہ باتیں کہ جن میں خدا نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تھی۔ حسن کہتے ہیں کہ وہ باتیں توحید

پر قائم رہنا، نماز و زکوٰۃ، طہارتِ ظاہریہ و باطنیہ ختنہ وغیرہا دس باتیں تھیں اس کے صلہ میں ہم نے ان سے کہا کہ ہم تم کو تمام عالم کا پیشوا یعنی نبی بنانا چاہتے ہیں، اس نے کہا کہ الٰہی میری اولاد میں سے بھی انبیاء اور بابرکت لوگ پیدا کیجیو تاکہ تیری خدمت گزاری اور فرمانبرداری ہمیشہ میرے خاندان میں رہے، ہم نے کہا البتہ ایک گروہ تیری اولاد میں سے ایسا ہوگا جو بدکار ہوں گے ان کے لیے میرا اقرار نہیں۔ ان کو یہ برکت نصیب نہ ہوگی۔ پس اے بنی اسرائیل اور اے عرب کے مشرکو تم کو لازم ہے کہ اپنے مسلّم الثبوت بزرگ کی پیروی کرو، خدا کی اور اس کے نبی آخر الزماں کی اطاعت بجالاؤ جس کے لیے خود ابراہیم نے دعا کی۔ ومن ذریتی اگر تم دل سے دینِ ابراہیمی کے مطیع ہو تو تم کو لازم ہے کہ اس نبی ابراہیم کا اتباع کرو اور اے اہلِ کتاب تم اس بات کا خیال نہ کرو کہ نبی ہمارے خاندان سے کیوں نہیں۔ کس لیے کہ ابراہیم نے صرف اپنے بیٹے اسحاق ہی کے خاندان کے لیے برکت نہ چاہی تھی بلکہ اسماعیل کے لیے بھی۔ چنانچہ سفر پیدائش کے سترہویں باب میں ہے اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا اگر تم اطاعت نہ کرو گے تو تم کو ابراہیم کی برکت سے کچھ حصہ نہ ملے گا۔

فوائد : (۱) بکلمات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ قوی وہی ہے جو ہم نے بیان کیا مگر کلمات سے عجائبِ صنعِ باری اس جگہ مراد لینا خلافِ عقل و نقل ہے۔

(۲) امام کے معنی پیشوا کے ہیں جس کا فردِ کامل نبی ہے اور خلیفہ اور قاضی اور جماعت کے امام پر بھی صادق آتا ہے مگر مراد نبی ہے تورات سفر پیدائش کے بارہویں باب میں بھی اس کا ذکر ہے اور خداوند تعالیٰ نے ابراہام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور اپنے قرابتیوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھاؤں گا نکل چل اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک بابرکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کروں گا اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پاویں گے۔ بلاشک یہود اور عیسائی اور مسلمان اور مجوس حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیشوا جانتے ہیں۔

(۳) ذریت بمعنی نسل بوزن فعّیلہ ذرء بمعنی خلق سے مشتق ہے اور ممکن ہے کہ ذرء بمعنی تفریق سے مشتق ہو کیونکہ انسان کی نسل مخلوق اور پھیلتی بھی ہے۔

(۴) لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ سے انبیاء علیہم السلام کا فسق و فجور سے بری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دو وجہ سے، وجۂ اول یہ کہ عہد سے مراد امامت ہے اور ہر نبی امام ہے اور امام فاسق نہیں ہوتا جیسا کہ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ پس نبی بھی فاسق نہیں ہوگا۔ وجۂ دوم اگر عہد سے مراد نبوت ہو تو کوئی ظالم یا فاسق نبی نہ ہونا چاہیے اور اگر امامت ہے تو ہر نبی امام ہے اور امامت فاسق کو پہنچتی نہیں۔ رہی یہ بات کہ فاسق کیوں ظالم ہے۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ ظلم وضع شئ فی غیر محلہ یعنی بیجا کرنا، سو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے کہ جو گناہوں کی وجہ سے اس کو سعادتِ اخرویہ سے محروم رکھتا ہے اس بیجا حرکت سے وہ ظالم ہے۔ خلاصہ یہ کہ کچھ حقوق العباد ہی میں تعدی کرنے کا نام ظلم نہیں بلکہ حقوقِ الٰہی میں تعدی کرنا بھی ظلم ہے اس جگہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہیں تو پھر انبیاء علیہم السلام نے کیوں اپنے آپ کو ظالم کہا جیسا کہ یونس علیہ السلام نے کہا اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ اور حضرت آدم علیہ السلام کہتے ہیں رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا اس کا جواب یہ ہے کہ اس ظلم سے مراد معصیت ہے کہ جو منافی عصمتِ انبیاء ہے اور کبھی اچھے لوگ ذرا سی لغزش اور بھول چوک کو بھی عاجزی اور استغفار کے موقع میں ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مقام پر انبیاء اس ذلت کو ظلم کہہ رہے ہیں یہ وہ ظلم نہیں کہ جو منافی عصمت ہو۔ شیعہ اس آیت سے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی امامت یا خلافت کا ابطال اس طرح پر کیا کرتے ہیں کہ بقول اہلِ سنت بھی یہ لوگ معصوم نہ تھے پس فاسق ہوئے اور فاسق کے لیے امامت پہنچتی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عصمت شرط ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فاسق یا ظالم ہو صدہا مومن صالح ہیں کہ جو فاسق اور ظالم نہیں حالانکہ

ان کے معصوم ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اسی طرح یہ بزرگوار تھے اور جن روایتوں میں ان کی نسبت معصیت مذکور ہے وہ سب غلط اور متعصب لوگوں کی بندش ہیں ایسے بے بنیاد شبہ پر شیعہ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بعض لوگوں کو معصوم مان کر نبوت بلکہ خدائی کے درجہ پر پہنچا دیا ہے جس پر محققینِ شیعہ سخت تاسف کرتے ہیں۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور جبکہ ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔

ترکیب: واذ معمول ہے عامل محذوف کا البیت مفعول اول جعلنا کا مثابۃ مفعول ثانی وامنا اس پر معطوف اتخذوا امر حاضر معروف انتم فاعل من بمعنی فی و یجوز ان یکون للتبعیض ویجوز ان یکون زائدۃ مصلی ظرف مفعول ہے اتخذوا کا وعھدنا فعل بافاعل الی ابراھیم و اسماعیل متعلق ہے عھدنا سے ان طھرا الخ میں ان مفسرہ ہے بمعنی ای اس تقدیر پر یہ عہد کی تفسیر ہے اور ممکن ہے کہ مصدر یہ ہوا ی بان رکع راکع کی جمع اور السجود ساجد کی۔

تفسیر: پہلی آیت میں اس بات کا ذکر تھا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کئی باتوں میں آزمایا تو پورا پایا چونکہ اور باتوں کو اہلِ کتاب بھی تسلیم کرتے تھے مگر منجملہ ان کے ایک بڑی بھاری بات کعبہ کی تعمیر اور اس کا حج مقرر کرنا تھا اس کے اہلِ کتاب منکر تھے اور حج کو ایک لغو حرکت جانتے تھے کہ یہ صرف عرب کے جاہلوں کا طریقہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ نہیں اور نہ اس کعبہ کو ابراہیم علیہ السلام نے بنایا ہے نہ حاجیوں اور طواف کرنے والوں کے لیے مقرر کیا ہے سو اس کو جہتِ عبادت اور قبلہ بنانا بھی رسمِ مشرکین ہے۔ محمد ﷺ مشرکین کی رسم کو حبِ ملک اور حبِ قوم سے نباہ رہے ہیں اور اس لیے دل سے چاہ رہے ہیں۔ پس ان آیات میں خدا تعالیٰ ان کے اس خیالِ باطل کو رد کرتا ہے کہ خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے ثواب حاصل ہونے کی جگہ اور مرجع اور امن کی جگہ ہمیں نے بنایا ہے ہم حکم دیتے ہیں کہ سب لوگ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو مصلیٰ بنائیں یعنی وہاں نماز پڑھیں اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے پہلوٹھے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو بڑی تاکید سے یہ کہا تھا کہ تم میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور نمازیوں کے لیے پاک اور صاف رکھیو۔ یعنی یہ بھی منجملہ ان باتوں کے ہے کہ جن میں ابراہیم علیہ السلام آزمائے گئے تھے۔ اس میں مشرکینِ عرب پر بھی تعریض ہے کہ تم باوجودیکہ ملتِ ابراہیمی کی پابندی کا دعویٰ کرتے ہو اور خانہ کعبہ کی تعظیم بھی کرتے ہو مگر تم ملتِ ابراہیمی کے خلاف ہو۔ کس لیے کہ ابراہیم کو ہم نے جو اس گھر کے بنانے کا حکم دیا تھا تو نماز و طواف و اعتکاف و عبادتِ الٰہی کے لیے حکم دیا تھا نہ یہ کہ اس میں بت رکھ کر اس کی پرستش کی جائے اور تعظیم میں بھی تم پورے نہیں کیونکہ یہ جگہ جائے امن ہے۔ تم مسلمانوں کو یہاں امن سے آنے نہیں دیتے اور نیز پاک رکھنے کا حکم دیا تھا تم نے بت رکھ کر ناپاک بنا رکھا ہے۔ اس مقام پر چند تحقیقات قابلِ غور ہیں: تحقیق اول مثابۃ ثاب ثیوب مثابۃ سے مشتق ہے جس کے معنی رجوع کرنا یا رجوع کی جگہ عرب بولتے ہیں ثاب الماء جبکہ وہ پھر نہر میں آکر مجتمع ہو جائے اور اسی سے ثواب ہے یعنی نیکی کرنے والے کی نیکی لوٹ کر آتی ہے کیونکہ وہ اس کا اجر پاتا ہے۔ اس مقام پر مثابۃ ظرف ہے ت زائد ہے جیسا کہ مقام و مقامۃ میں یہ قول فراء اور زجاج کا ہے اور قفال کہتا ہے کہ ت مبالغہ کے لیے ہے جیسا کہ نسابۃ

اور علامۃ میں مثابۃ کے معنی مرجع کے ہیں کہ خدا نے اہلِ ایمان کے دل میں خانہ کعبہ کا شوق جذبِ مقناطیسی کی طرح ڈال دیا ہے۔ اس لیے لاکھوں آدمی دور دراز سے وہاں آتے ہیں اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ مگر یہاں آکر ثوابِ آخرت نصیب ہوتا ہے اس لیے اس لفظ کے معنی ثواب پانے کی جگہ کے ہیں البیت سے مراد خانہ کعبہ ہے (۲) واتخذوا کو نافع اور ابن عامر نے بفتح خاء بلفظِ ماضی پڑھا ہے اس کا عطف جعلنا پر قرار دیا ہے یعنی لوگوں نے مقام ابراہیم کو مصلی بنایا اور جمہور بلفظِ امر پڑھتے ہیں۔ مقام ظرف کا صیغہ ہے یعنی کھڑے ہونے کی جگہ۔ مقامِ ابراہیم بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما وہ پتھر ہے کہ جس پر چڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی دیواریں چنتے تھے اور جوں جوں دیواریں بلند ہوتی جاتی تھیں وہ پتھر بھی بلند ہوتا جاتا تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نیچے سے پتھر اور گارا دیتے اور یہ دعا کرتے جاتے تھے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (تفسیر کبیر) اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نشان بھی تھا جو لوگوں کے کثرت سے ہاتھ پھیرنے سے اب بخوبی معلوم نہیں ہوتا۔ بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ یہ پتھر جنابِ رسول خدا ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کعبہ سے متصل تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو سیلاب آیا کہ جس کو ام نہشل کہتے ہیں یہ پتھر بہہ گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو منگا کر کعبہ کے پاس ایک جگہ رکھ دیا اور اس کے اردگرد پتھروں کی دیوار چن دی۔ چنانچہ اب تک وہ پتھر وہی ہے اور اس کے گرداگرد جالیاں بنی ہوئی ہیں اس تقدیر پر آیت کے یہ معنی ہیں کہ اس پتھر کو نماز کی جگہ بناؤ، اس لیے امام اعظم اور امام شافعی وغیرہما علماء یہ فرماتے ہیں کہ طوافِ کعبہ کے بعد دو رکعت نماز اس پتھر کے سامنے پڑھنی چاہییں کہ یہ بمنزلہ امام کے آگے ہو اور جواز دھام ہو تو اس کے متصل پڑھ لے۔ چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ کتبِ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے کعبہ کا طواف کر کے مقامِ ابراہیم کی طرف قصد کیا اور اس کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھ کر یہ آیت پڑھی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اور کتب صحاح ستہ میں یہ بھی ہے کہ اس امر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے استدعا کی تھی سو یہ آیت نازل ہوئی چونکہ یہ پتھر متبرک ہے اس لیے ایسے مقامات پر یا اس کے متصل عبادتِ الٰہی کرنا باعثِ قبولیت ہے یہ دو رکعت امام اعظم کے نزدیک واجب ہیں اور امام شافعی سنت یا فرض کہتے ہیں مگر استحبابِ مؤکد میں سب کا اجماع ہے۔ (تفسیر عزیزی)

مجاہد وغیرہ علماء کہتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد کل حرم ہے اور مصلی بنانے سے مراد دعا کرنا ہے کچھ اس پتھر کی خصوصیت نہیں۔

(۳) یہ جگہ خدا کی تجلیات اور برکات کا مظہر ہے ایسے مقامات کی محبت اور عظمت اسی کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں پڑ جاتی ہے علاوہ اس کے کبھی غیرتِ الٰہی ایسے مقاماتِ مقدسہ کی گستاخی کرنے والے کو سزا بھی دے دیتی ہے کہ جس سے لوگوں کے دلوں میں ہیبت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک بلکہ اب تک لوگوں نے بارہا ان باتوں کا مشاہدہ کیا ہے اساف اور نائلہ دو مرد و عورت تھے انہوں نے اس جگہ حرکتِ بیجا کی، اس کی شامت سے پتھر ہو گئے چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں ان کی صورت مسخ شدہ کعبہ کے دروازہ پر عبرت کے لیے کھڑی کر رکھی تھی اسی طرح ابرہہ ہاتھی لے کر کعبہ کو گرانے آیا معہ لشکر ہلاک ہوا۔ ان وجوہ سے عرب مشرکین بھی اس گھر کی تعظیم کرتے تھے اور ایامِ حج میں کوئی کسی کو مارتا لوٹتا نہ تھا بلکہ شہر مکہ کی بھی عزت و حرمت کرتے تھے۔ اس لیے اس جگہ کو خدا نے امن کی جگہ فرمایا اور مثابۃ کے بعد امنا کا لفظ آیا کیونکہ جو زیارت گاہ ہے تو وہاں امن بھی ضرور ہے۔

(۴) اگرچہ دنیا کے سب گھر خدا کی ملک ہیں اور وہ گھر اور مکان سے پاک ہے مگر اس وجہ سے کہ یہ گھر خاص اس کی عبادت کے لیے بنایا گیا اور اس کے حکم سے اس کا دربار اور محلِ تجلیات قرار پایا تو اپنی طرف مضاف کر کے بیتی یعنی میرا گھر فرمایا۔

کعبہ کی اصلیت: واضح ہو کہ خدا نے انسان میں دو قوتیں ودیعت رکھی ہیں۔ ایک عقل دوسرے شوق و محبت۔ یہ دونوں قوتیں اس کے لیے بمنزلہ دو پاؤں کے ہیں جو اس کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہیں نہ تنہا عقل کافی ہے نہ تنہا شوق۔ طریقِ انبیاء اور طریقِ حکما میں یہی فرق تو ہے

کہ حکماء صرف عقل کے پابند ہیں انبیاء عقل کے ساتھ شوق سے بھی کام لیتے ہیں جو منازل عقل سے سالہا سال میں طے نہیں ہوتے ان کو شوق یا عشق دم بھر میں طے کرا دیتا ہے۔ نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مذہب میں جس قدر عقل کو معتبر رکھا ہے (اس لیے کوئی حکم شرعی خلافِ عقل نہیں بخلاف اور ادیان کے) اسی طرح عشق پر بھی مدار رکھا ہے اگر آپ بغور دیکھیں گے تو ہر عبادتِ اسلامیہ کو دونوں جزوں سے مرکب پائیں گے۔ نماز میں اس کی ثناء وصفت' سوالِ استعانت عقل کے متعلق ہیں اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا دست بستہ کھڑا ہونا، شوق کے متعلق ہے اسی طرح حج میں اس کی ثناء وصفت دعا و استغفار عقل کے متعلق ہے۔ عاشقانہ ہیئت بنا کے جس کو احرام کہتے ہیں اس کے گھر کے اردگرد قربان ہونا منیٰ اور عرفات وغیرہا مقامات میں با آوازِ بلند لبیک پکارنا سب حضرتِ عشق کا جلوہ ہے۔ مگر کلام اس میں ہے کہ اس مکان کو حج و جہتِ نماز کے لیے کیوں مخصوص کیا، سو اس کی چند وجوہ ہیں: وجہ اول: یہ ہے کہ یہ مسجد ان بزرگواروں کے ہاتھ سے خدا نے تعمیر کرائی ہے جو تمام بنی آدم اور کل موحدین کے پیشوا ہیں یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ پس جو یہاں آ سکے اس کو ضرور ہے کہ آ کر خدا تعالیٰ کی عبادت اور اس سے دعا و استغفار کرے کیونکہ ایسے معابد کا مشاہدہ ان بزرگوں کے وقایعِ گزشتہ کی یادگاری کے لیے بڑا بھاری وسیلہ ہے اور ان واقعات کا دل پر نقشِ حجر ہونا ان کی پیروی کرنے کا سبب ہے۔ بالخصوص جبکہ ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہو اور اگر وہاں نہیں آ سکے تو حتی المقدور اس طرف منہ کر کے ہی عبادت کرے کیونکہ عبادت کے وقت اس طرف منہ کرنا بھی اس معبد اور ان بزرگوں کے خلوص کو یاد دلاتا ہے جس سے نفس کو عبادت کی طرف کامل توجہ ہوتی ہے۔ وجہ دوم: ہر جگہ کی ایک خاصیت ہوتی ہے دیکھئے جس جگہ خدا کے نافرمانوں کا مجمع ہوتا ہے وہاں مدتوں تک قہر کے آثار نمایاں رہتے ہیں اور فرمانبرداروں کی جگہ میں آثارِ رحمت نمایاں رہتے ہیں۔ اسی لیے جنگِ تبوک میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا ان بستیوں کے پاس سے گزر ہوا کہ جن کو خدا نے برباد کر دیا تھا تو فرمایا کہ یہاں سے جلدی نکل چلو پس جس جگہ اس کے مقدس لوگوں نے اس پر جان فدا کی ہو اور وہاں اس کی تجلیات اور نزولِ برکات کا بھی از حد ظہور ہو چنانچہ تورات سفر استثناء کے ۳۳ باب میں یہ ہے خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور فاران مکہ کو کہتے ہیں جیسا کہ تورات سفر پیدائش کے بائیسویں باب میں اسماعیل علیہ السلام کی نسبت یہ لکھا ہے اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور یہ متفق علیہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام مکہ میں رہتے تھے۔ پس جب فاران مکہ ہے اور وہاں خداوند تعالیٰ جلوہ گر ہوا تو خدا کے طالبوں اور اس کے عاشق صادقوں پر لازم ہے کہ ایک بار تو ہیئتِ عاشقانہ بنا کر اس کے دربار میں باریاب ہوں اور جو وہاں نہ جا سکیں تو وہ اپنا شوق ظاہر کریں اس تجلی گاہ کی طرف بوقتِ عبادت منہ کریں تا کہ انوار و برکات کا حصہ پاویں۔ وجہ سوم: کعبہ چونکہ اسلام کا مبداء ہے اور ملتِ اسلامیہ کا حیزِ طبعی اور ہر چیز کا اپنے مبداء اور حیزِ طبعی کی طرف میلان طبعی امر ہے (ارضی چیزیں خود بخود اوپر سے نیچے آیا کرتی ہیں) پس اسلام کو ادھر رجوع کرنا ضرور ہوا منجملہ اور دینیات کے حج اور نماز اسلام کے رکن ظاہر ہیں۔ بخلاف روزہ اور کلمہ کہنے اور زکوٰۃ دینے کے اور زیادہ تر ہر مذہب سے امتیاز انہی دو باتوں سے ہوتی ہے۔ اسی لیے ان دونوں چیزوں کا کعبہ کی طرف رجوع ہونا ضرور ہوا مگر چونکہ پانچ وقت نماز کعبہ کے پاس پڑھنا نہایت مشکل امر تھا اس لیے اس میں حتی المقدور اس کی طرف منہ کرنا ہی کافی سمجھا گیا اور حج چونکہ عمر میں ایک بار ہوتا ہے تو یہ بغیر کعبہ کے جائز قرار نہ دیا گیا۔

تحقیق پانچویں کعبہ کی تاریخ میں: بیہقی نے شعب الایمان میں اور ارزقی نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر آئے تو وحشتِ تنہائی سے گھبرا کر عرض کی کہ بارِ خدایا اس جگہ نہ کوئی مسقف مکان ہے نہ مل کر عبادت کرنے کا سامان۔ وہاں سے حکم ہوا تو ہماری عبادت کے لیے ایک گھر بنا کہ یہ سب گھروں سے اول گھر ہو۔ کس لیے کہ اس کے بعد تو تیری اولاد بہت سے مکانات بنائے گی۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا کس جگہ؟ جبریل نے کعبہ کی جگہ بتائی۔ آدم علیہ السلام نے پتھروں کی بنیاد زمین تک چنی اس پر ایک خیمہ

نورانی (جو ملاءِ اعلیٰ میں ملائکہ کا طواف گاہ ہے اور جس کو بیت المعمور کہتے ہیں) رکھا۔ پس آدم علیہ السلام وہاں طواف کرتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ طوفانِ نوح میں وہ سب مفقود ہو گیا اور ایک سرخ ٹیلہ سا بعد طوفان کے باقی رہا لیکن اچھے لوگ وہاں آ کر اکثر عبادت اور دعا کرتے تھے تو آثارِ قبولیت پاتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے آئے تو انہوں نے اسی بنیاد پر بحکمِ الٰہی اس مکان کو بنایا اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد پھیلی تو مسیح سے تخمیناً دو ہزار دو سو سنتالیس برس پیشتر شہر بابل اور اس کے برج کی بنیاد ڈالی گئی یہ شہر ملک عراق میں دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان دوآب میں بقول بعض فرات کے کنارہ پر تھا اور اس کے قریب دریائے دجلہ کے کنارہ پر شہر نینوا تھا جہاں کہ حضرت یونس علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اس شہر کو نینوس بادشاہ نے آباد کیا تھا یہ بھی بابل کی طرح بڑا شہر تھا پچیس فرسخ کے دور میں اس کی شہر پناہ تھی۔ اسی طرح بابل تھا اس کی شہر پناہ تیس گز چوڑی اور سو گز بلند تھی بخت نصر بھی اسی شہر کا بادشاہ تھا۔ ان لوگوں کو کلدانی اور کسدی بھی کہتے ہیں۔ طوفان کے بعد یہیں سے مختلف زبانیں پیدا ہوئی ہیں اور یہاں کے لوگوں میں بڑے علوم وفنون تھے مگر اب یہ شہر بالکل اجاڑ ہے سیاحوں کو بجز ٹیلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آج کل یورپ کی کمپنیوں نے باجازت حضرت سلطان کھود کر عجائبِ آثارِ قدیمہ برآمد کئے ہیں جو یورپ کے عجائب خانوں میں رکھے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تارح کے بیٹے ہیں جن کو آزر بھی کہتے ہیں اور آزر ناحور کے بیٹے ہیں اور ناحور ساروغ کے، جن کو سروج کہتے ہیں اور سروج رعو کے بیٹے ہیں اور رعو فاتع کے جن کو فلجم کہتے ہیں اور فلج عابر (عبر کے) اور عابر شالح (سلح) کے اور شالح ارفحشذ (ارفکسد) کے اور یہ سام کے بیٹے ہیں اور سام حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے ہیں (تورات سفر پیدائش باب ۱۱) مگر صحیح یہ ہے کہ شالح کا باپ قینان اور قینان کا باپ ارفحشذ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام قصبہ اہواز میں پیدا ہوئے تھے جو عراق میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خاص بابل میں پیدا ہوئے تھے واللہ اعلم عند اللہ۔ کلدانی لوگ عموماً مذہب صابی رکھتے تھے، بت پرست تھے وہ لوگ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو بھی پوجتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ابتدائے عمر سے ابراہیم علیہ السلام کو نورِ نبوت سے منور کیا تھا۔ انہوں نے بت پرستی اور ستارہ پرستی سے انکار کیا کہ یہ نہ کسی کو نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔ یہ قابلِ پرستش نہیں، اسی طرح ستارے طلوع و غروب کرتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ متغیر اور مخلوق ہیں نہ خالق۔ اس امر میں بہت کچھ جھگڑے ہوتے رہے آخر الامر نمرود نے جو شاہِ ضحاک کی طرف سے عراق کا حاکم تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ مستقل بادشاہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلتی آگ میں ڈال دیا لیکن وہ فضلِ خدا سے صحیح سلامت آگ سے نکل آئے پھر تو چند آدمی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے اور خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بی بی سارہ اور اپنے بھتیجے لوط بن حاران کو لے کر ملکِ فلسطین میں آئے اور حران میں ٹھہرے پھر جب قحط پڑا تو وہاں سے مصر گئے۔ مصر کے بادشاہ نے جو سارہ کے حسن و جمال کا شہرہ سنا اس کو اپنے پاس بلایا مگر جب قصد کیا تو خدا نے اس کو شل کر دیا۔ آخر اس نے سارہ کو مع ساز و سامان ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور ان کے ساتھ اپنے خواصوں میں سے ایک نوجوان عورت ہاجرہ بھی دی۔ ابراہیم علیہ السلام وہاں سے لوٹ کر پھر ملکِ فلسطین میں آئے۔ حبرون کے پاس مقام کیا، سارہ کے اولاد نہ ہوئی تھی اس نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم ہاجرہ کے پاس جاؤ، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ پس جب ہاجرہ حاملہ ہوئیں تو رشک سے سارہ نے اس پر سختی کی۔ ہاجرہ بھاگ کر اور جگہ چلی گئیں وہاں فرشتے نے ظاہر ہو کر اس کو بشارت دی کہ غم نہ کر تو ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھنا۔ تو ہاجرہ نے اسماعیل علیہ السلام کو جنا اور ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت چھیاسی برس کی تھی پھر ننانوے برس کی عمر میں ابراہیم علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی اپنا اور اپنے تمام نوکروں کا اور اسماعیل علیہ السلام کا کہ اس وقت ان کی عمر تیرہ برس کی تھی ختنہ کیا اور سو برس کی عمر میں خود سارہ کے پیٹ سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کا نام اسحاق رکھا اور ان کے دودھ بڑھنے کی شادی میں کسی بات پر خفا ہو کر سارا نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ لونڈی اور اس کا بیٹا میرے بیٹے کے ساتھ ہرگز وارث نہ ہوگا اس کو اور اس کی ماں کو کسی جنگل میں چھوڑ آ، مگر یہ بات

ابراہیم علیہ السلام کو نہایت بری معلوم ہوئی۔ خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تو اس بات سے برا نہ مان۔ آخر الامر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو لے کر منزل بہ منزل اس جگہ پہنچے کہ جہاں اب کعبہ ہے جس جگہ اب چاہِ زمزم ہے وہاں ایک درخت تھا وہاں ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کو بٹھا دیا اور ایک مشک پانی کی بھر کر اور کچھ کھجوریں اور روٹیاں ان کے پاس رکھ کر چلے مگر دل اس صدمہ سے چور چور تھا، مجبور آنکھوں میں آنسو اور دل میں آہ و نالہ لے کر واپس پھرے اور جب ان کی نظر سے غائب ہو گئے تو ایک جگہ ٹھہر کر گریہ وزاری کے ساتھ خدا سے یہ دعا کی رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ الخ ''کہ اے الٰہی میں نے تیرے گھر کے پاس کہ جہاں کھیتی نہیں اپنی اولاد کو آباد کیا تا کہ تیری عبادت کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو ہر طرح کے سامانِ خورد و نوش بہم پہنچا اور اب جو کچھ میرے دل کا حال ہے تجھ کو خوب معلوم ہے۔ اس وقت وہاں نہ آبادی تھی نہ پانی، نہ کوئی سبزہ و ترکاری بلکہ دو خشک پہاڑوں میں چٹیل میدان تھا۔ حضرت ہاجرہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی تھیں کہ الٰہی اگر تیرے حکم سے میں اس بیابان میں ڈالی گئی ہوں تو مجھ ضعیفہ اور بیکس کا تو ہی والی ہے۔ (روایاتِ صحیحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچہ تھے) پس ابراہیم علیہ السلام تو چلے آئے ادھر جب تک مشک میں پانی رہا تو یہ ہاجرہ اس کو پی کر اسماعیل کو دودھ پلاتی رہیں پس جب پانی ختم ہو چکا اور پیاس کا سخت غلبہ ہوا اور بچہ پیاس کے مارے زمین پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا تو ہاجرہ بیقرار ہو کر پانی کی تلاش میں اٹھیں اور قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی کہ جس کو صفا کہتے ہیں اس پر پانی دیکھنے کو چڑھیں کہ لڑکا نظر سے غائب نہ ہو وہاں ادھر ادھر بہت کچھ دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر وہاں سے اتریں اور اس کے محاذی دوسری پہاڑی مروہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور رستہ میں یہ خیال آیا کہ مبادا کوئی درندہ آ کر میرے بچہ کو نہ لے جائے۔ اس خیال سے کہ اس میدان کے نشیب میں کہ جس کو بطن الوادی کہتے ہیں جلدی جلدی دوڑنا شروع کیا اور دامن اٹھا کر تیزی سے چلیں جبکہ نشیب سے کہ جو اس پہاڑ کے نیچے تھا نکل کر ہموار جگہ پر آئیں تو دوڑنا موقوف کیا، کس لیے کہ اس جگہ سے لڑکا نظر آتا تھا پس جب مروہ پر پہنچیں تو اسی قدر بلندی پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا مگر کچھ نظر نہ آیا پھر صفا کی طرف متوجہ ہوئیں اور اسی نشیب میں پھر اسی طرح دوڑ کر چلیں۔ اسی طرح صفا سے مروہ تک سات بار اس بیقراری کے ساتھ آمد و رفت کا اتفاق ہوا۔ اس مقام پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حج میں جو صفا مروہ پر سات بار سعی کرنے کا حکم ہے اس لیے ہے کہ لوگ ہاجرہ کی بیکسی اور اضطراب اور خدا کی فریادرسی کو یاد کریں اور اپنے تئیں خدا تعالیٰ کے آگے ایسی حالتِ بیچارگی میں پیش کریں کہ رحمت نازل ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ بے کسوں کی صورت بنانی اور ان کی طرح گریہ وزاری کرنی بھی نزولِ رحمت کا باعث ہے۔ اس لیے بوقتِ مصائب استسقاء وغیرہ میں امرا اور بادشاہوں کا فقیرانہ حالت بنا کر دعا کرنا باعثِ حلِ مشکلات ہوتا ہے اور یہ تمام خدا پرست قوموں کا دستور ہے اس پر طعن کرنا عقل کا قصور ہے۔ آخر مروہ پر آواز آئی کہ کچھ اندیشہ نہ کر پھر یہی آواز سنی تو لوٹ کر بچہ کے پاس آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بچہ کے پاس سے ایک پانی کا چشمہ جاری ہے۔ زمین میں سے پانی خود بخود نکل رہا ہے۔ ہاجرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور اس پانی کے اردگرد مٹی اور پتھروں سے آڑ بنا کر حوض کی طرح اس کو جمع کر لیا اور اپنی مشک کو بھر لیا کہ مبادا یہ پانی تمام نہ ہو جائے اور ہم پھر پیاسے مرنے لگیں۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا ہاجرہ پر رحم کرے اگر وہ اس وقت بند نہ لگاتیں تو زمزم جاری چشمہ ہو جاتا) اس کے بعد فرشتے نے ان کو تسلی دی کہ تم خاطر جمع رکھو یہاں خانۂ خدا ہے اس کو یہ لڑکا جوان ہو کر باپ کے ساتھ تعمیر کرے گا اور اس جگہ رہنے والوں کو خدا ضایع نہیں کرتا۔ اس جگہ ایک ٹیلا تھا اس کے آس پاس برساتی پانی کے نالے بہا کرتے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ تنہا وہاں رہنے لگے۔ اتفاقاً قومِ جرہم کا ایک قافلہ ملکِ یمن سے ادھر آ نکلا۔ دور سے دیکھتا ہے کہ ایک جگہ بہت سے پرند اڑ رہے ہیں آپس میں کہنے لگے کہ جہاں یہ جانور اڑ رہے ہیں یہاں ضرور پانی ہوگا ہم کئی بار ادھر سے آئے گئے ہیں پہلے تو کبھی یہ بات دیکھی نہ تھی۔ ایک شخص کو بھیجا، دیکھتا ہے کہ ایک عورت اور اس کا بچہ بیٹھا ہے اور پانی کا چشمہ زمین سے جاری ہے۔ قافلہ وہاں آیا اور ہاجرہ سے وہاں رہنے

کی اجازت مانگی۔ انہوں نے تنہائی سے بچنے کے لیے ان کے رہنے کو غنیمت جانا مگر یہ شرط کی کہ اس پانی میں تمہارا کوئی حق اور حصہ نہ ہوگا۔ انہوں نے اس شرط کو تسلیم کر لیا اور وہیں رہنے لگے اور اب ایک چھوٹا سا گاؤں بس گیا اور کچھ لوگ اور بھی آ رہے۔ اسماعیل علیہ السلام نے ان لوگوں سے عربی زبان سیکھی اور نوعمری میں اپنی لیاقت اور کرامتِ موروثی کو لوگوں کے دل میں تہ نشین کر دیا کہ جس سے وہاں کے سردار نے نہایت آرزو سے اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کیا۔ اس عرصہ میں ہاجرہ کا انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں سارہ کے ہاں اسحاق جو پیدا ہوئے بڑے ہوئے تو ان کا کچھ رشک کم ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی اجازت سے اسماعیل علیہ السلام کے دیکھنے کو عرب میں آئے اور شرط یہ تھی کہ اسماعیل علیہ السلام کے گھر میں شب باش نہ ہوں۔ پس جب آئے اور پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور وہ باہر شکار کو گئے ہیں کیونکہ ان کی یہی گزر اوقات تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام کے گھر پر آئے، ان کی بیوی سے حال پوچھا اس نے اثنائے کلام میں تنگیِ معاش کا بھی ذکر کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھ کر کہ اب اور ٹھہرتا ہوں تو شب باش ہونا پڑے گا وہاں سے واپس آئے اور چلتے ہوئے یہ کہہ آئے کہ اپنے خاوند سے میرا اسلام کہہ دیجیو اور کہنا کہ تمہارے گھر کا سردا اچھا نہیں اس کو بدل دو۔ جب شام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو حال معلوم ہوا۔ سمجھ گئے کہ میرے والد ابراہیم علیہ السلام تھے۔ عورت نے پیغام ادا کیا انہوں نے فی الفور اس عورت کو چھوڑ دیا اور دوسری عورت سے نکاح کیا۔ دوبارہ پھر اسی شرط پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے ملنے کو آئے۔ دوسری بیوی نے نہایت خاطر تواضع کی، معاش کے بارہ میں شکر گزاری کی اور ان سے کہا کہ حضرت آپ ٹھہریئے۔ انہوں نے عذر کیا اور چلتے وقت یہ کہا کہ اپنے خاوند سے میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ سردا اچھا ہے اس کو رہنے دو۔ شام کو اسماعیل علیہ السلام آئے تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور اس معماء کے معنی بتلائے کہ تجھ کو میں ہمیشہ رکھوں گا۔ تیسری بار کچھ عرصہ تک رہنے کی اجازت لے کر پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور گھر میں ٹھہرے اور اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ باپ بیٹے گلے لگ کر بڑی دیر تک روتے رہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ خدا نے مجھ کو کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اگر تو مجھ کو مدد دے تو بہتر۔ انہوں نے عرض کیا بسر و چشم۔ پس ابراہیم علیہ السلام کو تعین اس جگہ کی معلوم نہ تھی۔ خدا کی طرف سے ایک ابر اسی مقدار کا کہ جس قدر تعمیرِ کعبہ مقصودِ الٰہی تھی نمودار ہوا اور وہ ایک جگہ پر ٹھہر گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسی مقدار پر کعبہ بنایا۔ یعنی ایک لمبا چوکھونٹا مکان بنایا جس کا چوڑان مشرقی جانب سے یعنی حجرِ اسود سے رکن یمانی تک بیس گز تھا اور مغربی جانب رکن یمانی سے لے کر رکن غربی تک بائیس گز اور طول میں شمالی دیوار حجر اسود سے رکن شامی تک تینتیس گز لمبی اور جنوبی دیوار رکن غربی سے لے کر رکن یمانی تک اکتیس گز تھی۔ سب ہیئتِ مجموعی بشکل مستطیل مگر نہ عرض کے دونوں سرے برابر نہ طول کی دونوں دیواریں برابر تھیں اور بلندی اس مکان کی نو گز تھی اور دروازے کی کچھ کرسی نہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارا دیتے جاتے تھے اور یہ پتھر کہ جس کو مقامِ ابراہیم کہتے ہیں بطور پاڑ کے تھا اور اس پر چڑھ کر چنتے تھے اور یہ شکل تھی۔ واضح ہو کہ رکن خانہ کعبہ کے گوشوں کا نام ہے اس چوکھونٹے مکان کے چار گوشے ہیں اور ہر ایک گوشہ یا گوشے یا کونہ کا ایک نام ہے جنوب و مشرق کے رخ باہر کی جانب دو ڈیڑھ گز بلندی پر ایک کونہ میں ایک سیاہ پتھر مدور توے کے برابر لگا ہوا ہے اس کو حجرِ اسود کہتے ہیں اور جنوب و غرب میں بلندیِ قدِ آدم پر ایک سرخی نما پتھر کا ٹکڑا ہے اس کو رکنِ یمانی کہتے ہیں اور شرقی و شمالی کونہ کا نام رکنِ شامی ہے اس لیے کہ بجانبِ ملکِ شام ہے اور دوسرے کو غربی کہتے ہیں جب ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا مکان پہاڑی نالہ کے سبب سے گر گیا تو بنی جرہم نے پھر اس کو اسی طور سے تعمیر کیا پھر ایک عرصہ کے بعد عمارت گر گئی تو عمالیق نے اس کو پھر تعمیر کیا (عمالیق بنی حمیر کا ایک قبیلہ تھا) اس کے بعد جب یہ عمارت بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تو قصی بن کلاب

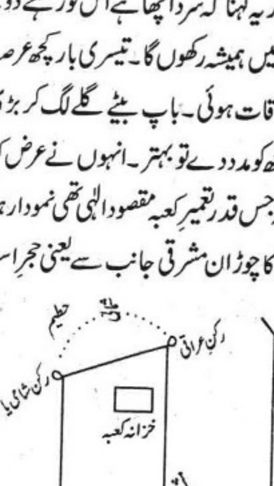

نے اس کو بنایا اور اس کی چھت لکڑیوں سے پاٹ دی اور اس پر غلاف سیاہ ڈال دیا۔ یہ عمارت مدت تک رہی یہاں تک کہ نبی علیہ الصلوٰۃ کی عمر دس بارہ برس کی ہوگی کہ ایک عورت نے پردۂ کعبہ کے پاس بخور روشن کرنا چاہا تو پردہ میں آگ لگ گئی اور تمام عمارت جل گئی پھر قریش نے چاہا کہ اس عمارت کو پھر تعمیر کریں۔ ان دنوں میں قحط سالی تھی قریش نے کعبہ تو بنایا مگر کئی تصرف اس میں کر دیے اول یہ کہ حطیم کی جانب سے کئی گز زمین چھوڑ کر کعبہ کی دیوارِ غربی اٹھائی۔ دوم یہ کہ دروازے کی چوکھٹ تخمیناً دو گز اونچی کر کے لگائی تا کہ ان کی مرضی کے بغیر ہر شخص کعبہ میں اچھی طرح نہ داخل ہو سکے۔ سوم یہ کہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صف قائم کیں ہر ہر صف میں تین تین ستون تھے چنانچہ جب مکہ کو آنحضرت ﷺ نے فتح کیا اور کعبہ کے اندر جا کر نماز پڑھی تو انہی ستونوں کے بیچ میں پڑھی تھی۔ چہارم یہ کہ دیواروں کو دو چند بلند کر دیا۔ پنجم یہ کہ رکنِ شامی کے قریب کعبہ کی چھت پر چڑھنے کے لیے زینہ بھی بنایا جب نبی ﷺ مدینے سے مکہ معظمہ میں غلبہ وشوکت کے ساتھ تشریف لائے تو جس قدر اہلِ مکہ نے کعبہ کے اندر اور اس کے آس پاس ابراہیم ؑ اور اسماعیل ؑ اور دیگر اشخاص کی مورتیں رکھ چھوڑی تھیں سب کو نکال کر پھینک دیا اور توڑ دیا۔ یہ بت ہمیشہ سے نہ تھے بلکہ عمرو بن لحی کے عہد سے جو آنحضرت ﷺ سے تخمیناً تین سو سال پیشتر تھا اور اس وقت کعبہ بنائے قریش پر قائم تھا۔ ایک بات رہ گئی وہ یہ کہ جب قریش کعبہ کی تعمیر کر چکے اور حجرِ اسود کو لگانا چاہا تو باہم اختلاف ہوا۔ ہر شخص کہتا تھا کہ میں اس کو اپنے ہاتھ سے قائم کروں سب نے متفق ہو کر یہ امر آنحضرت ﷺ کے سپرد کیا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ اس کو ایک چادر پر رکھ لو اور اس کو ہر رئیس ہاتھ سے اٹھاوے چنانچہ سب اس بات پر بڑے راضی ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک بار عائشہ ؓ سے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کعبہ کو پھر قدیم بنیادِ ابراہیم پر بناؤں اور دروازہ زمین سے ملا دوں اور دو دروازے رکھوں۔ ایک سے لوگ داخل ہوا کریں دوسرے سے خارج، اس عرصہ میں آنحضرت ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے پھر عبداللہ بن زبیر ؓ خلیفہ ہوئے اور انہوں نے یہ حدیث اپنی خالہ عائشہ ؓ سے سنی تو حضرت کے ارادہ کو پورا کر دیا۔ یعنی بدستور قدیم کعبہ کو از سرِ نو بنایا اور دو دروازے رکھے۔ ستائیسویں رجب سنہ چونسٹھ ہجری میں اس تعمیر سے فراغت پائی۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد بنی امیہ کا دور دورہ ہو گیا اور حجاج بن یوسف نائب عبدالملک بن مروان کو تعمیرِ عبداللہ بن زبیر ناپسند ہوئی کعبہ کو گرا کر پھر بنیادِ قریش پر بنایا اور صرف ایک دروازہ مشرقی جانب میں رکھا اور اندر سے قدِ آدم بھرت کر کے اونچا دروازہ لگایا اور ایک ٹکڑا طولانی جانب میں سے اسی طرح باہر رکھا کہ جس کو حطیم کہتے ہیں یہ تعمیر ۷۴ ہجری میں ہوئی (بعض کہتے ہیں کہ حجاج نے کل کو نہیں گرایا بلکہ عبداللہ بن زبیر کے تصرفات میں تصرف کیا تھا) پھر بنی عباس کے عہد میں ہارون رشید نے قصد کیا کہ بنائے عبداللہ بن زبیر پر کعبہ کو بنائے مگر علماء نے منع کیا کہ بار بار بنانا اور گرانا کھیل ہو جائے گا۔ بنائے حجاج سلطان مراد بن احمد خان سلطانِ قسطنطنیہ کے عہد تک قائم رہی اور شاہانِ اسلام اسی عمارت کی مرمت کرتے رہے مگر یہ عمارت جب بہت کہنہ ہو گئی تو سنہ ایک ہزار چالیس ہجری میں سلطان مراد نے کعبہ کی تعمیر کا ارادہ کیا اور سوا اس کونہ کے جس میں حجرِ اسود لگا ہوا ہے سب کو گرا کر پھر نئے سرے سے بنیادِ حجاج کے موافق اسی طور سے کعبہ کو بنایا اور اندر سنگِ مرمر کا فرش بچھایا اور اندر کی دیواروں میں بھی اکثر سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور کسی عمدہ لکڑی کے دو صف ستونوں کے ہیں ایک ایک صف میں تین تین ستون ہیں اور اندر سے چھت پر نفیس مخملی چھت گیری ہے اور اوپر سے گچ ہے اور باہر کی دیواریں سنگِ خارا سے چونے میں چنی ہوئی ہیں۔ ان کی لپائی نہیں ہوئی ہے مگر نہایت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام کعبہ پر پڑا رہتا ہے جس پر بخطِ ثلث کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہوتا ہے اور نصف طول سے اوپر کئی بالشت چوڑا پٹکا کارچوبی حرف سے لکھا ہوا ہے اس میں سلطانِ وقت کا نام بھی ہوتا ہے یہ پردہ ہزار ہا روپیہ کی تیاری سے مصر میں بنتا ہے اور ہر سال بڑے تجمل کے ساتھ آتا ہے جو دیکھنے سے متعلق ہے اور سالِ گزشتہ کا پردہ شریفِ مکہ اور دیگر اراکین کو مل جاتا ہے ان سے اہلِ اسلام تبرکاً لاتے ہیں۔ کعبہ کا وہ ٹکڑا کہ جو تعمیر میں قریش نے چھوڑ دیا تھا اب تک چھٹا ہوا ہے اور ایک قوسی شکل سے سنگِ مرمر کی دیوار تخمیناً گز بھر اونچی

بطور نمونہ بنیادِ قدیم پر بنی ہوئی ہے اور اس کو لوگ حطیم کہتے ہیں۔ یہ تھوڑی سی جگہ ہے اسی طرف کعبہ کا سنہری پرنالہ پڑتا ہے کہ جس کو میزاب کہتے ہیں یہاں انسان کی دعا اکثر قبول ہوتی ہے اور اس میں ایک سر ہے کہ جس کے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں چونکہ زمین اکثر بلند ہو جایا کرتی ہے بالخصوص آبادیوں میں جس لیے سو دو سو سال بعد بہت سی کرسی دینے کی ضرورت پڑتی ہے مگر کعبہ کو اب تک اسی قدیم زمانہ کی زمین پر قائم رکھا ہے۔ کعبہ کے آس پاس دس بارہ قدم کے فاصلہ تک ہموار زمین ہے اس پر بھی سنگ مرمر کا فرش ہے اس کو مطاف کہتے ہیں یعنی اس فرش پر لوگ کعبہ کے اردگرد طواف کرتے ہیں اور اس کے اخیر میں بیشمار ہانڈیوں کا حلقہ ہے وہ رات کو روشن کی جاتی ہیں اس کے بعد چوطرفہ بڑا صحن کشادہ ہے اور اس میں سیاہ کنکریوں کا فرش ہے مگر یہ زمین گاؤ دم ہے یعنی جوں جوں یہ صحن پھیلتا جاتا ہے اتنا ہی اونچا ہوتا جاتا ہے پھر اس کے اخیر میں چوطرفہ کئی کئی درجہ کے دالان بنے ہوئے ہیں جن کے سنگِ مرمر کے ستون ہیں اور اوپر چھوٹے چھوٹے قبے بنے ہوئے ہیں پھر ان دالانوں کے باہر کی دیواریں اور دروازے بازار کی طرف بھی ہیں مگر باہر کے دروازہ سے جو اندر کی طرف دیکھو تو تمام حرم ایک حوض یا تالاب سا پستی میں معلوم ہوتا ہے اس تمام عمارت کو حرمِ کعبہ کہتے ہیں۔ یہ لاکھوں روپیہ کی عمارت سب سلطان مراد کی بنائی ہوئی ہے مع خانہ کعبہ کے جو لوگ اس عمارتِ کعبہ کو عمارتِ حجاج سمجھ گئے ہیں وہ تاریخِ کعبہ سے بیخبر ہیں۔ اب ہم کعبہ کے ان مقاماتِ مشہورہ کو بیان کرتے ہیں کہ جن کے جاننے سے بہت سے مسائلِ شریعہ موقوف ہیں۔

(۱) میقات: وہ مقامات ہیں کہ جب کوئی باہر سے وہاں آوے اور مکہ میں حج وغیرہ کے لیے آنا چاہے[۱] (شافعی) یا اس کی بھی قید نہیں بلکہ کسی کام کے لیے آئے (ابوحنیفہ[۱]) تو بغیر احرام باندھے نہ آئے یہ اس لیے کہ بیت اللہ کی تعظیم وعظمت مدنظر رہے کیونکہ جب دنیا کے بادشاہوں کے دربار میں بغیر عجز وانکسار و آداب نہیں آ سکتا تو وہ تو اللہ جل جلالہ کا دربارِ عام ہے وہاں کے آداب ضرور ملحوظ ہونے چاہئیں اور وہ مقامات یہ ہیں۔ ذوالحلیفہ ان کے لیے جو مدینہ کی طرف سے مکہ میں آنا چاہیں عام ہے کہ اہلِ مدینہ ہوں یا نہ ہوں یہ مقام مدینہ سے مکہ کی طرف دو فرسخ پر ہے۔ جحفہ (کہ جو ذوالحلیفہ کے محاذی ہے) ان کے لیے جو شام کے رستہ سے آنا چاہیں قرن نجد کے رستہ پر ہے ان کے لیے کہ جو اس رستہ سے آنا چاہیں۔ یلملم یمن کے رستہ پر ہے یہ سمندر کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو لوگ کہ ہندوستان یا ایران سے عدن ہو کر جدہ میں جاتے ہیں تو جدہ یا عدن کے بیچ میں یہ پہاڑی مشرقی کنارہ پر دکھائی دیتی ہے ان کو بھی وہیں سے احرام باندھنا پڑتا ہے جیسا کہ اہلِ یمن کے لیے ذاتِ عرق۔ یہ ایک جگہ مکہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے یہ اہلِ عراق کے لیے ہے اور جو اس راستہ سے آویں ان مقامات کی تصریح نبی ﷺ نے بالہامِ الٰہی فرمائی ہے عن جابر عن رسول الله ﷺ قال مهل اهل المدينة من ذى الحليفة و الطريق الآخر الجحفة و لاهل الشام الجحفة۔ (بخاری) و مهل اهل العراق من ذات عرق و مهل اهل النجد قرن و مهل اهل اليمن يلملم رواه مسلم۔

مہل یعنی تلبیہ کہنے اور احرام باندھنے کی جگہ۔

(۲) حرمِ مکہ شہر مکہ کے چوطرفہ کئی کئی میل تک کی جگہ کا نام ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عہد میں صرف ٹیلوں کے نشان تھے۔ اب سلاطین نے اس کے ہر حدود پر مینار اور دروازے بنا دیے ہیں۔ جدہ کی طرف بھی مکہ سے کئی میل کے فاصلہ پر ایک بڑا دروازہ بنا ہوا ہے اسی طرح مدینہ کے رستہ میں بمقام تنعیم دروازے بنے ہوئے ہیں ان حدوں کو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقرر کیا ہے کہ ان کے اندر نہ کوئی

[۱] امام شافعی کی دلیل یہ حدیث ہے عن ابن عباس قال وقت رسول الله ﷺ لاہل المدينة ذا الحليفه الخ فمن لهن ولمن اتى عليهن بلن كان يريد الحج والعمرة رواه البخاری ومسلم کہ جو ان مقامات سے گزر کر مکہ میں حج و عمرہ کے لیے جائے امام اعظم کی دلیل یہ حدیث ہے لا یجاوز احد المیقات الا محرما کہ ان مقامات سے بغیر احرام باندھے کوئی تجاوز نہ کرے اس میں حج وغیرہ کی قید نہیں۔ لمعات ۱۲ منہ

شکار کھیلے نہ کوئی کسی کو قتل کرے، نہ لکڑی کاٹے نہ گھاس اکھاڑے۔ یہ امور تعظیم بیت اللہ کے لیے ہیں۔ ایامِ جاہلیت میں بھی عرب ادب کرتے تھے ان حدود کے باہر جو زمین ہے اس کو **حل** کہتے ہیں کہ یہاں یہ امور حلال ہیں اور کعبہ اور اس کے ارد گرد جتنے مکانات ہیں ان کو حرم کعبہ کہتے ہیں جو مسجد کا حکم رکھتا ہے یعنی کوئی ناپاک مرد اور عورت اس میں داخل نہ ہونا چاہیے نہ اس حالت میں خانہ کعبہ کا طواف کرے۔

(۳) **حجرِ اسود**: یعنی سیاہ پتھر، یہ گول پتھر تخمیناً دو ڈیڑھ فٹ کے دور میں ہے اس کا رنگ نہایت سیاہ ہے اس کو عقیق سیاہ تصور کرنا چاہیے۔ یہ کعبہ کے شرقی و جنوبی گوشہ میں باہر کی جانب گز بھر کی بلندی سے چاندی کے حلقہ میں جڑا ہوا ہے۔ خدا جانے کس صدمہ سے اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے تھے جن کو ملا کر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس پتھر کو نہ کوئی مسلمان پوجتا ہے نہ اس کو حاجت روا سمجھتا ہے مگر اس لیے کہ یہ پتھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قائم کیا ہوا ہے اس لیے اس کو مقدس سمجھتے ہیں اور چونکہ جناب خاتم النبیین ﷺ نے اس کو ان بزرگوں کی یادگار سمجھ کر محبت سے بوسہ دیا تھا جیسا کہ جب ہم اپنے محبوب کی کسی چیز کو پاتے ہیں تو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اور چومنا اور آنکھوں سے لگانا دراصل اس شخص کی محبت و عظمت کا اظہار ہے کہ جس کی یہ نشانی ہے بالخصوص طواف کے وقت حج و عمرہ میں کہ جو نہایت دنیا سے نفرت اور خدا اور اس کے برگزیدوں سے محبت کا وقت ہوتا ہے اس لیے تمام اہلِ اسلام میں اسی غرض سے طواف کے وقت بالخصوص ایامِ حج میں اس کا بوسہ دینا دستور ہو گیا اور ازدحام کی وجہ سے بوسہ نہ دے تو اشارہ ہی کر دے یہ دستور ایک عمدہ طریقہ اور اچھی سنت ہے کیونکہ اس میں نبی علیہ السلام کا اتباع اور اس کے بزرگوں کے ساتھ محبت اور اس کے طریقہ کو دل سے پسند کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ ایسی حالت میں خدا تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی کی امید بھی بجا ہے جس کا ثمرہ بندے کے گناہوں کی معافی ہے وہ جو اس بارہ میں احادیثِ صحیحہ وارد ہیں وہ سب برحق ہیں۔ ان پر اعتراض کرنا حماقت اور تعصبِ جاہلانہ ہے۔ عقلِ سلیم کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں یہ اور بات ہے کہ کوئی بیوقوف اس کو بت پرستی سمجھے یا خدائے غیر محسوس کا اس کو نشانِ حسی قرار دے کر برگزیدوں پر اعتراض کرے۔

(۴) **زمزم**: یہ وہی چشمہ ہے جس کو خدا نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ سے ظاہر کیا تھا۔ یہ چشمہ چند مدت کے بعد خشک ہو گیا لیکن اس کے انعام کی یادگاری اور تبرک کے لیے پھر اسی مقام پر کنواں کھودا گیا۔ یہ کنواں حوادثِ دہر سے کئی بار کھلا بند ہوا مگر اب اس زمانہ میں نہایت عمدہ کنواں کعبہ کے متصل حرم میں بنا ہوا ہے اس پر سنگِ مرمر کا قبہ ہے اور ارد گرد جالیاں ہیں۔ ایک دروازہ ہے اس میں سے جا کر لوگ پانی بھرتے ہیں۔ شب و روز پانی کھنچتا ہے مگر ٹوٹتا نہیں۔ یہ پانی ذرا کھاری ہے مگر شہرِ مکہ میں عام استعمال کے لیے نہر زبیدہ کا پانی استعمال میں آتا ہے۔ یہ نہر زبیدہ ہارون رشید بادشاہ کی بیوی نے بنائی تھی کہیں دور سے اس کا پانی آ کر مکہ میں بڑے بڑے حوضوں کو بھرتا اور ایک عالم کو سیراب کرتا ہے۔ یہ بہت چھوٹی نہر ہے ہمیشہ جاری ہے۔ اہلِ اسلام زمزم کے پانی کو اسی علاقہ سے متبرک سمجھتے ہیں بخلاف عیسائیوں اور ہنود کے وہ دریائے گنگ و جمن و یردن میں غوطہ لگانے اور بپتسمہ پانے کو معافیِ گناہ کے لیے صابن سمجھتے ہیں۔

(۵) **مقامِ ابراہیم**: بقولِ جمہور وہ پتھر ہے کہ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر کعبہ چنا تھا، اس پر نشانِ قدم بھی ہیں اور بقولِ بعض تمام حرم مسجد۔

(۶) **صفا**: حرم کے متصل جنوب و شرق میں ایک پہاڑی ہے اب اس کے اوپر اور ارد گرد آبادی ہو گئی ہے اور چند سیڑھیاں بنا دی گئی ہیں۔

(۷) **مروہ**: یہ اس کے مقابلے میں حرم سے شرق و شمال کی جانب چھوٹی سی پہاڑی ہے اب یہاں بھی آبادی ہے اور ان دونوں پہاڑیوں کے بیچ میں جس جگہ کہ حضرت ہاجرہ دوڑ کر چلی تھیں اور پہلے وہاں جنگل اور کنکر تھے اب نہایت عمدہ بازار ہے اور اس دوڑ کر چلنے کی جگہ دو منارہ سبز بنا دیے گئے ہیں جن کو میلین اخضرین کہتے ہیں۔

(۸) **منیٰ**: شہرِ مکہ دو پہاڑیوں کے بیچ میں بسا ہے پھر یہی سلسلہ پہاڑوں کا مشرق و شمال کی طرف دور تک چلا گیا۔ مکہ سے تین میل پر اسی سلسلہ کے میدان میں یہ مقام ہے یہاں اب بہت سے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ ایامِ حج میں تین روز تمام لوگ یہیں رہتے ہیں۔ اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا قصد کیا تھا اور یہیں شیطان نے مجسم دکھائی دے کر ان کو تین جگہ بہکانا چاہا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر کنکریاں ماری تھیں اب تینوں مقامات پر نشان کے لیے تین چھوٹے چھوٹے مینارے بنا دیے ہیں ان کو جمرات کہتے ہیں۔ ایک کو جمرۂ اولیٰ، دسرے کو جمرۂ وسطیٰ، تیسرے کو جمرۂ عقبیٰ۔ اب ایامِ حج میں مسلمان بھی دستورِ ابراہیم کو جاری رکھنے کے لیے ان کو سات سات کنکریاں مارتے ہیں تاکہ اس حالت کو یاد کر کے ہمیشہ نفس کے مقہور کرنے کا عہد کیا جاوے اور اسی مقام پر لوگ حج میں عرفات سے لوٹ کر دسویں تاریخ احرام کھولتے اور قربانیاں کرتے ہیں۔

(۹) **مزدلفہ**: یہ اسی مشرقی و شمالی سمت میں منیٰ سے دو تین میل آگے بڑھ کر ایک میدان ہے، پھر اس سے میل آگے عرفات ہے۔ عرفات سے لوٹتے وقت شب کو یہاں ٹھہرتے ہیں۔

(۱۰) **عرفات**: اسی سمت میں آگے بڑھ کر ایک لمبا چوڑا پہاڑوں کے بیچ میں میدان ہے۔ نویں ذوالحجہ کو یہاں سب حاجی آتے ہیں اور غروبِ آفتاب تک اسی میدان میں خیموں اور غیر خیموں میں رہتے ہیں۔ یہاں دعا مانگتے ہیں اور شام کے وقت امام ایک پہاڑی پر چڑھ کر خطبہ پڑھتا ہے جس میں خدا کی توحید و تقدیس اور گناہوں سے معافی اور اس کی حمد و ثنا اور احکامِ حج کا بیان ہوتا ہے۔ دن غروب ہوتے ہی یہاں سے تمام خلقِ خدا چل پڑتی ہے اور مغرب و عشاء کی نماز لوٹ کر مزدلفہ میں پڑھتے ہیں اور پھر صبح کو یہاں سے اٹھ کر منیٰ میں آ کر قربانی کرتے ہیں۔ شیعہ دسویں کو بھی عرفات میں رہتے ہیں۔

آگے چل کر ہم اسرار و احکامِ حج بیان کریں گے اب ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں کہ جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کا تعمیرِ کعبہ کرنا مذکور ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ
مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ
اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور جبکہ ابراہیم نے کہا اے رب اس کو امن کا شہر کر دے اور یہاں کے باشندوں کو میووں کی روزی دیجیو (اور) اس کو کہ جو اللہ اور قیامت پر ایمان لائے (اللہ نے) فرمایا کہ جو کافر ہوگا اس کو بھی میں کسی قدر فائدہ مند کروں گا پھر اس کو کھینچ کر آگ کے عذاب میں ڈالوں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

ترکیب: و عطف جملہ بر کلامِ سابق قال فعل ابراهيم فاعل رب اجعل الخ جملہ مقولہ اجعل بمعنی صیّر هذا مفعول اول بلدا مفعول ثانی موصوف آمنا صفت جملہ معطوف علیہ وارزق معطوف بر اجعل انت اس کا فاعل اهله مفعول من الثمرات متعلق ہے ارزق سے من الخ اہلہ سے بدل بعض ہے من موصولہ امن منهم بالله واليوم الآخر جملہ اس کا صلہ قال فعل الله اس کا فاعل و من كفر الخ جملہ اس کا مقولہ من بمعنی الذی کفر ای یکفر اس کا یہ صلہ محلاً منصوب ہے تقدیرہ قال وارزق من کفر پس ارزق فعل محذوف ہے اس پر فامتعه دلالت کرتا ہے۔

تفسیر: خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہ خیر و برکات اور یہ امن و عافیت چونکہ کافروں کو بھی حاصل ہے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت سے۔ جبکہ ابراہیم

علیہ السلام بنائے کعبہ سے فارغ ہوئے تو ہم سے دعا کی کہ الٰہی تو نے کعبہ کو مثابہ اور امن بنایا ہے تو اس جگہ ایک شہر دار الامن بھی بنا (تا کہ آنے والوں کے لیے ہر قسم کا آرام رہے اور یہ لوگ ہمیشہ اس گھر کی خبر گیری کیا کریں) اور یہاں کے رہنے والوں کو جو کہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں میوے بھی کھلانا کیونکہ یہ خشک پہاڑ ہے اگر ایسا نہ ہوگا تو یہاں قیام مشکل ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اول عہدۂ امامت کے بارہ میں اپنی ذریت کے لیے دعا کی تھی بلا لحاظ مومن و کافر اس پر خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ کافر اس کے مستحق نہیں۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خیال سے رزق و روزی کے بارہ میں سرے سے ایمانداروں کو دعا میں مخصوص کیا مگر امامت جو اعلیٰ کرامت ہے اس میں اور روزی میں فرق ہے۔ اہلِ بیت کا ہر شخص سزاوار نہیں بخلاف رزق روزی کے کہ وہ سب نیک و بد کو ملتی ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ چند روز کافروں کو بھی میں دنیا سے بہرہ مند کروں گا، یعنی تا حیاتِ دنیا پھر اس کے بعد تو وہ کھینچ کر عذابِ جہنم میں ڈالے جاویں گے کہ جو نہایت بری جگہ ہے۔

فائدہ: خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کر لی کہ شہر کو دار الامن بھی کر دیا۔ ہمیشہ یہاں کا ہر کوئی ادب کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے جس طرح بیت المقدس پر بادشاہوں کے ہاتھ سے مصائب پیش آئے یہاں نہیں آئے۔ حربِ صلیب اور چنگیز خانیوں کے جہانسوز حملوں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ مخالفوں کے ہاتھ سے محفوظ و مامون رہا اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا اور ثمرات کی یہ تدبیر کی کہ طائف میں جو مکہ سے قریب ہے وہ وہ میوے اور ترکاریاں پیدا کیں جو اور جگہ کمتر ملتی ہیں۔ اس ذکر سے قریشِ مکہ کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے فائدہ اٹھا رہے ہو اور اس مسجد کے طفیل عزت پا رہے ہو اس پر مذہبِ ابراہیم کی مخالفت اور اس مسجد میں آنے والوں پر یہ تشدد مگر یہ راحت و برکت تو چند روزہ ہے دائمی برکت تو خاص ایمانداروں کا حصہ ہے۔ اولادِ ابراہیم ہونے کا پھل تمہارے لیے یہی چند روزہ فائدہ ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

اور (یاد کرو) جبکہ ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسماعیل بھی (اور وہ یہ کہتے جاتے تھے) اے رب ہم سے یہ خدمت قبول کر بے شک تو ہی سنتا جانتا ہے اے ہمارے رب ہم دونوں کو فرمانبردار رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا فرمانبردار رکھنا اور ہم کو عبادت کرنے والوں کے دستور بتا اور ہم پر مہربانی رکھ، تو ہی معاف کرنے والا مہربان ہے اے ہمارے رب اور ان کے لیے انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیجیو کہ ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور پاک بنا دے اور تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

ترکیب: واذیرفع فعل ابراھیم فاعل القواعد جمع قاعدۃ بمعنی بنیاد مفعول من البیت کائنۃ کے متعلق ہو کر حال ہے قواعد سے واسماعیل معطوف ہے ابراہیم پر یہ دونوں ذی الحال اور یقولان محذوف فعل با فاعل ربنا تقبل منا الخ اس کا مفعول یرفع اپنے فاعلوں اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوا اجعلنا میں نا مفعول اول مسلمین مفعول ثانی لک متعلق مسلمین سے و حرفِ عطف۔ ذریتنا مفعول

اول امتہ موصوف مسلمۃ صفت لک متعلق مسلمۃ سے یہ سب مفعول ثانی یتلو اور یعلمھم اور یزکیھم سب رسولاً کی صفت واقع ہوئے ہیں۔

تفسیر: اس جگہ خدائے تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے خلوص اور ان کی دعا کا ذکر کرتا ہے کہ جس میں حج کے احکام کی طرف اور نبیِ آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی طرف مجملاً اشارہ ہے، فرماتا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں چنتے جاتے اور نہایت عجز و انکسار سے یہ دعا کرتے جاتے تھے کہ الٰہی ہماری اس سعی کو قبول کیجیو کیونکہ تو جو کچھ ہم زبان سے دعا کرتے ہیں خوب سنتا ہے اور دل کے حال سے بھی خوب واقف ہے۔ اے خدا ہم کو ہمیشہ اپنی فرمانبرداری میں رکھیو، کبھی کوئی کام تیری مرضی کے خلاف ہم سے سرزد نہ ہو اور ہمارے بعد بھی ہماری اولاد میں سے اپنے فرمانبردار لوگ پیدا کیجیو تا کہ تیری غلامی ہم میں ہمیشہ پائی جائے اور اس گھر کی خدمت گاری میری نسل میں رہے اور ہم کو ہمارے لیے جو کچھ آپ نے عبادت اور حج کے دستور قائم کئے ہیں وہ بھی تعلیم کر دے کہ اس کے مطابق ہم کریں اور جو کچھ ہم سے بمقتضائے بشریت اس میں فروگزاشت ہو جائے تو معاف کر دیجیو اور ہمیشہ مہربانی رکھیو، کس لیے کہ تو ہی بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے اور اے رب ہماری نسل سے ایک ایسا رسول مبعوث کرنا جو لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور اس پر بس نہ کرے بلکہ اس سلسلہ کے جاری رکھنے کے لیے لوگوں کو تیری کتاب تعلیم بھی کرے اور تعلیم کے بعد حکمت یعنی اسرارِ شریعت اور رموزِ احکام بھی بتلا دے تا کہ لوگوں پر جبر معلوم نہ ہو اور وہ اپنے فیضِ نبوت اور انوارِ معرفت سے لوگوں کو آراستہ بھی کرے کہ پھر وہ باطنی برکتوں کے لیے نبی کا نمونہ اور ہدایت کا سرچشمہ رہیں کیونکہ اس کی مصلحت اور فوائد کو تو ہی جانتا اور ہر چیز پر تو ہی قادر بھی ہے۔

فوائد: (۱) مناسک منسک کی جمع ہے اور منسک بہ فتح سین بمعنی فعل اور بکسر سین بمعنی موضع کے ہے۔ نسک کے معنی عبادت کرنا اور اس لیے عابد کو ناسک کہتے ہیں۔ پھر خدا کے نام پر قربانی کرنے کو بھی عبادت ہونے کی وجہ سے منسک کہنے لگے اور ذبیحہ کو نسیکہ اور اسی وجہ سے افعالِ حج کو بھی مناسک کہتے ہیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خذوا عنی مناسککم لعلی لاالقاکم بعد عامی ھذا اور اسی لیے جہاں اور جن مقامات میں افعالِ حج ادا کیے جاتے ہیں ان کو مناسک بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ اس جگہ بعض مفسرین مناسک سے شرائعِ حج مراد لیتے ہیں اور بعض عموماً عبادات مراد رکھتے ہیں والعلم عند اللہ۔

(۲) اس آیت میں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا کو یاد دلایا تا کہ یہ بات معلوم ہو: (۱) یہ کہ کعبہ کی تعمیر کوئی معمولی کام یا کارِ دنیا نہ تھا بلکہ نہایت دینی کام تھا کہ جس کے بعد وہ اپنی اس سعی کے مقبول ہونے کی دعا کرتے تھے۔ (۲) یہ کہ وہ خود اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے خدا کا فرمانبردار اور اس گھر کا خدمت گزار ہونا اور شرائعِ حج و اسلام کا برپا اور قائم رکھنا دل سے چاہتے اور واجعلنا مسلمین و ارنا مناسکنا کہہ کے دعا کرتے تھے۔ (۳) ان کی دلی آرزو اور خدا سے بڑی دعا یہ تھی کہ وہ ان کی نسل میں سے ایک رسول نہایت اولوالعزم پیدا کرے کہ جس کا مصداق سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں۔ کس لیے کہ ابراہیم اور اسماعیل کی نسل میں سے اور کوئی ایسا شخص نہیں ہوا ہے کہ جو تعلیمِ کتاب اور حکمت کرتا اور تزکیہ کرتا ہو اور آیاتِ الٰہی پڑھ کر سناتا ہو۔ تورات میں جو اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں برکت کا خدا نے وعدہ کیا ہے اور فاران سے خدا کا جلوہ گر ہونا فرمایا ہے اس کا مصداق بجز ذاتِ بابرکات کے اور کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کیسی بت پرستی اور ظلم و جہل کی تاریکیاں عرب پر عموماً محیط تھیں اور نسلِ اسماعیل میں مکہ یا اس کے اطراف میں ایسا کوئی نہیں گزرا کہ جس سے لوگوں نے علم و حکمت و تزکیہ حاصل کیا ہو، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انی عند اللہ فی ام الکتاب خاتم النبین و ان آدم لمنجدل فی طینہ و ساخبر کم عن بدء امری انا دعوۃ ابراھیم و ھو یرفع القواعد من البیت ربنا

و ابعث فیھم رسولا منھم و بشری عیسی و راء ت امی التی راء ت حین و ضعتنی ر ء ت انه یخرج منھا نور اضاءت له قصور الشام ببصری رواہ احمد والبیہقی عن کثیر الصحابۃ۔ ''کہ میں علمِ الٰہی میں اس وقت خاتم النبیین تھا کہ جب آدم کی سرشت بھی نہ ہوئی تھی اور میں تم کو اپنی ابتدا حالت سے مطلع کرتا ہوں وہ یہ کہ میرے لیے ابراہیم نے اس وقت دعا کی تھی کہ جب وہ کعبہ چن رہے تھے اور میرے لیے عیسیٰ نے بشارت دی ہے اور میرے حق میں میری والدہ ماجدہ نے بوقتِ ولادت یہ دیکھا تھا کہ ان سے ایک ایسا نور پھیلتا ہے کہ جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔'' پس جو شخص کعبہ اور حج اور اس کے شرایع کا انکار کرتا ہے اور وہ جو خاتم النبیین کو نہیں مانتا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے برگشتہ ہے گو ان کی نسل میں سے ہی کیوں نہ ہو اس میں یہود و عرب بلکہ عیسائیوں پر ایک لطیف انداز سے تعریض ہے۔

(۳) جس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دعائیں کعبہ کے بناتے وقت کی تھیں ربنا تقبل الخ، ربنا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ الخ، رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا اسی طرح تیسری دعا میں رسول کے لیے تین اوصاف کی بھی استدعا کی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اس کا سر یہ ہے کہ رسول کی امت میں مختلف استعداد کے لوگ ہوتے ہیں جن کے چار مرتبہ ہیں (۱) عام لوگ ہیں جن کو خدا تعالیٰ کی آیات اور اس کا کلام مقدس پڑھ کر سنایا جاتا ہے اس لیے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ کہا (۲) مرتبۂ خاص لوگوں کا ہے کہ ان کو وہ کتاب سکھائی جاتی ہے یہ عام علماء کا مرتبہ ہے (۳) اور بعض کو حکمت یعنی شریعت کے اسرار بتائے جاتے ہیں یہ مرتبہ علماءِ مجتہدین کا ہے ان دونوں گروہوں کے لیے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ فرمایا اور یہ اس لیے کہ نبی کی امت میں یہ دو گروہ نہ ہوں تو اس کی ہدایت کا سلسلہ بعد اس کے منقطع ہو جائے اور چونکہ جس رسول کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں وہ خاتم النبیین ہے اس کے بعد اور نبی کے آنے کی حاجت نہیں اس لیے اس کے علوم کے وارث علماء اور آئمہ مجتہدین ہونے چاہییں کہ آپ کے بعد اس سلسلۂ ہدایت کو قائم رکھیں اور اسی لیے آنحضرت علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے۔ علماء امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل۔

فائدہ: یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ظاہر الفاظ قرآن کے معانی کے علاوہ اور بھی کچھ اسرار قرآن میں ہیں کہ جو خاص لوگوں کا حصہ ہے اور یہ امرِ بدیہی ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اس دین کے حاصل کرنے میں مختلف حالات ہیں الخ (رواہ بخاری) پس وہ جو بعض جہلا صرف ظاہری مطالب پر انحصار کر کے ان لوگوں کی فضیلت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے سمجھنے کے لیے کیا چاہیے الخ وہ بے خبر ہیں۔ (۴) مرتبہ اخص الخواص لوگوں کا ہے کہ جن کا جوہرِ روح آئینہ کی طرح برکتِ نبی علیہ السلام سے پاک اور صاف ہے اور ان میں پورا پورا انوارِ نبوت کا انعکاس ہوتا ہے جس طرح کہ آئینہ میں ہو بہو باہر کی چیز دکھائی دیتی ہے یہ لوگ نبی کے قائم مقام ہوتے ہیں ان کو اولیاء اللہ کہتے ہیں سو ان کے لیے یزکیھم کہا۔ اس مرتبہ میں صحابہ تو اکثر تھے شام کے یہود و نصاریٰ نے سینکڑوں کرامات ان لوگوں کی مشاہدہ کی ہیں اگر میں ایک ایک صحابی اور تابعین کا حال لکھوں تو کتاب دراز ہو جاوے۔ شواہد النبوۃ اور حلیۃ الاولیا وغیرہما کتب محققین عیسائیوں کی کتابِ اعمال حواریین سے بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ اس کو انجیل مسیح کہہ کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں ہم ان کو قرآن نہیں کہتے مگر بعد میں بھی بہت سے پائے گئے اور پائے جاویں گے۔ پس جو شخص کعبہ اور اس کے حج و شرائع اور خاتم النبیین کا منکر ہے تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منکر اور ان کے دین سے برگشتہ ہے۔ اس لیے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ

اور کون ملت ابراہیم سے منہ پھیر سکتا ہے مگر وہ کہ جو احمق بن گیا ہو اور ہم نے تو ان کو دنیا میں بھی بزرگی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہوں گے جب ان کو ان کے رب نے کہا فرمانبردار ہو جاؤ (تو ابراہیم نے) عرض کیا کہ میں تمام جہان کے پروردگار کے آگے سرِ نیاز خم کر چکا اور اسی کی ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت بھی کی تھی کہ اللہ نے تمہارے لیے اے لڑکو یہ دین پسند کر لیا پھر تم مرو تو مسلمان ہو کر مرنا

ترکیب: ومن استفہامِ انکاری مبتداء یرغب عن ملۃ ابراھیم جملہ اس کی خبر الا من میں من محلاً منصوب ہے بجہت استثناء کے اور ممکن ہے کہ مرفوع ہو ضمیر یرغب سے بدل ہو کر پس یہ موصولہ ہے اور سفہ فعل ضمیر ہو مستتر اس کا فاعل نفسہ مفعول یہ جملہ صلہ فی الآخرۃ متعلق ہے صالحین سے اذ ظرف ہے اصطفینا کا اور اس کی علت ہے یا منصوب ہے باضمار اذکر وصی فعل بہا ای بالملۃ ابراہیم فاعل بنیہ مفعول ویعقوب معطوف ہے ابراہیم پر ای ووصی یعقوب بنیہ یابنی الخ یہ جملہ بیان ہے اس وصیت کا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ حال ہے فَلَا تَمُوْتُنَّ سے والمقدیر لا تفارقوا الاسلام حتی تموتوا وانتم مسلمون۔

تفسیر: یعنی تم جو امورِ مذکورۂ بالا کا انکار کرتے ہو تو درحقیقت ملتِ ابراہیمیہ کا انکار کرتے ہو (کس لیے کہ یہ امور جو اسلام کے اصول قرار دیے گئے ہیں ملتِ ابراہیمیہ کی اصل ہیں) اور ملتِ ابراہیم کا بجز اس شخص کے کہ جو از خود نادان اور احمق ہو جائے کون انکار کر سکتا ہے۔ کس لیے کہ ابراہیم وہ شخص ہیں کہ جن کو خدا نے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا ہے۔ سب موحدین ان کو پیشوا جانتے ہیں اور ہر جگہ ذکرِ خیر ان کا جاری ہے اور آخرت میں بھی خدائے تعالیٰ کے پاس ان کے مراتب بلند ہیں اور ان کی یہ بزرگی اس لیے ہے کہ جب خدا نے ان سے یہ فرمایا کہ ہمارے حکم بردار ہو جاؤ تو انہوں نے فوراً عرض کیا کہ میں اپنے جان اور دل سے تابعدار ہوں۔ پھر اے یہود اور اے عرب اور اے نصاریٰ تم کیوں ملتِ ابراہیمیہ سے انکار کرتے ہو، حالانکہ خود ابراہیم نے پھر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے بھی بوقتِ وفات اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ ہمیشہ اس دین پر قائم رہنا، ایسا نہ ہو کہ اس کے برخلاف ہو کر مرو۔

(۱) رغب کے بعد جب لفظ عن آتا ہے تو اس کے معنی نفرت اور کراہت کے ہو جاتے ہیں اور جب اس کے بعد فی یا الی آتا ہے تو اس کے معنی رغبت کے ہوتے ہیں۔

(۲) سفہ کہ جس کو سفاہت بھی کہتے ہیں لغت میں ہلکا پن اور خفت کا نام ہے چونکہ احمق خفیف الحرکات ہوتا ہے اس لیے اس کو سفیہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ لازمی اور متعدی دونوں طرح سے مستعمل ہوتا ہے اور از خود بیوقوف ہونے سے یہ مراد ہے کہ سب باتیں جان کر پھر غور نہ کرے اور عقلِ سلیم کے برخلاف عمل میں لاوے۔ عقلِ سلیم حکم کرتی ہے کہ ضرور اس گوناگوں عالم کا کوئی خالق و مالک ہے اور اسی لیے جہاں بھر کے شائستہ اور غیر شائستہ انسان خدا تعالیٰ کے وجود کو بغیر آنکھ کے دیکھے تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی عقل کا فتویٰ ہے کہ خدا نے جس طرح انسان کو امورِ دنیا میں سب حیوانات سے اشرف پیدا کیا اور اس کے تمام مہماتِ دنیویہ کا سرانجام فرمایا اسی طرح اس نے ان کے لیے آخرت کے رہنما بھی بھیجے ہیں کہ جنہوں نے دنیا کے وہ عقائد اور وہ اعمال جو مرنے کے بعد نفع دیتے ہیں یا ضرر پہنچاتے ہیں بیان کر دیے اور اس کے لیے ایک دستور العمل دے گئے جس کو ملت کہتے ہیں اس کے بعد جب عقل چاروں طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے کہ وہ کون کون سے لوگ ہیں جن کی معرفت خدا نے اس مہم کا اہتمام کیا ہے تو ان سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نظر پڑتی ہے۔ کس لیے کہ باستثنائے چند اقوامِ غیر مہذب تمام روئے زمین کے خدا پرست ان کو دینی بزرگ بلکہ تمام دینی بزرگوں اور مقدسوں کا جدِ امجد جانتے ہیں ولقد اَصْطَفَيْنٰهُ فِي

الدُّنْيَا کا یہ محصل ہے) اور ان کو عالم آخرت میں ہر طرح سے فائز المرام بھی مانتے ہیں (وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ کا یہی مطلب ہے) پس جو شخص باوجود علم ان امور کے پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے روگردانی کرتا ہے تو از خود احمق بنتا ہے اور یہ بات بیشتر بیان ہو چکی ہے کہ اس نبی آخر الزماں کے پیدا ہونے کی اور ملتِ ابراہیم کے مہتمم ہونے کی خود ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے دعا کی تھی کہ جس کے ظہور کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی تورات میں خبر دی ہے پھر جو ان کا انکار کرتا ہے وہ ملتِ ابراہیمیہ کا منکر ہے۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ بڑے اسماعیل علیہ السلام، ان سے چھوٹے اسحاق علیہ السلام، یہ نبی ہیں اور قتورہ کنعانیہ کے پیٹ سے زمران، یقان، مدان، مدیان، اسباق، سوخ پیدا ہوئے۔ مدیان کی اولاد میں سے حضرت شعیب علیہ السلام تھے اور یقان سے صبا اور ددان پیدا ہوئے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام مکہ میں اور اسحاق علیہ السلام شام میں رہے اور بیٹے دیگر اطراف و جوانب میں آباد ہوئے پھر اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے بڑے سے چھوٹے قیدار تھے کہ جن کی نسل سے جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اسحاق علیہ السلام کے بڑے بیٹے عیص اور جو ان کے عقب میں پیدا ہوئے یعقوب علیہ السلام ہیں ان کو اسرائیل بھی کہتے ہیں یہ تمام انبیاءِ بنی اسرائیل کے جدِ امجد ہیں ان کے بارہ بیٹے تھے لیاہ کے پیٹ سے روبن، شمعون، لاوی، یہودا پیدا ہوئے اس کے بعد اشکار اور زبلون پیدا ہوئے پھر بلہ راحیل کی لونڈی سے دان، نفتالی ہوئے پھر لیاہ کی لونڈی زلفہ سے جد، اشر پیدا ہوئے پھر خود راحیل کے پیٹ سے جو لیاہ کی چھوٹی بہن تھی، یوسف علیہ السلام، بنیامین پیدا ہوئے۔ خاتمہ کلام میں خدا تعالیٰ عرب اور تمام اہلِ کتاب کو فرماتا ہے کہ اگر تم ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کو مانتے ہو تو انہوں نے مرنے کے قریب بڑی تاکید سے اس ملت پر قائم رہنے کی اپنی اولاد کو وصیت کی تھی اب تم ان کی وصیت سے کیوں اعراض کرتے ہو؟

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

(بنی اسرائیل) کیا تم اس وقت موجود تھے کہ جب یعقوب کا اخیر آیا جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے انہوں نے عرض کیا ہم خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا خدا اور آپ کے بزرگوں اور اسحاق کا خدائے واحد ہے اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں اور یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی وہ جو کچھ کر گئے تو اپنے لیے اور ان کی تم سے کچھ پرسش نہ ہو گی۔

ترکیب: ام منقطعہ ای بل اکنتم علی جہۃ التوبیخ شھداء خبر کان اذ ظرف شہداء کا حضر فعل یعقوب مفعول الموت فاعل وقریٰ بالعکس اذ بدل ہے اذ سابق سے قال فعل ضمیر ہو راجع یعقوب کی طرف فاعل لبنیہ متعلق قال سے ما بمعنی من استفہامیہ معمول تعبدون قالوا کا فاعل بنین الھك واله ابآئك مفعول، ابراھیم الخ بدل آباء سے الھا واحدا صفت و موصوف بدل ہے الٰہ اول سے اور ممکن ہے کہ حال موطیہ ہو کقولک رأیت زیدا رجلا صالحا یہ سب جملہ جواب ہوا اذقال لبنیہ کا یہ اذ اپنے جواب سے مل کر بدل ہوا اذ اول کا اور پھر تمام جملہ استفہام توبیخی ہوا و نحن له مسلمون جملہ حال ہے فاعل نعبد سے یا معطوف ہے نعبد پر تلك مبتدا امۃ موصوف قد خلت صفت لھا ما کسبت صفت ثانیہ مجموعہ خبر ولا تسئلون الخ جملہ مستانفہ۔

تفسیر: پہلی آیت میں ذکر تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اس ملت پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی اس پر یہود نے یہ کہا کہ ہرگز یعقوب نے یہ وصیت نہ کی تھی بلکہ یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی اس پر خدا تعالیٰ ان سے بطور توبیخ کے پوچھتا ہے کہ تم یہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہو، کیا وصیت کے وقت کہ موت کا قریب زمانہ ہوتا ہے تم حاضر تھے جبکہ یعقوب علیہ السلام نے مصر میں جا کر لوگوں کو بت اور ستارے اور بیل اور بلی وغیرہ کو پوجتے دیکھا اور اس کا خوف پیدا ہوا کہ مبادا میرے بعد یہ بھی کہیں ان کی صحبت میں بت پرست نہ ہو جائیں تو سب اولاد کو بلا کر پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے خدا کی جو آپ کے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل و اسحٰق کا خدائے واحد ہے اور ہم تو ہمیشہ سے اسی کے فرمانبردار ہیں اور رہیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ تم اس وقت موجود نہ تھے پھر کس لیے انکار کرتے ہو؟ اور اس بات پر ناحق مغرور ہو کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں۔ ہم پورے پورے ان کے متبع ہیں، ہمارے اعمال سے باز پرس ہو گی تو ہم ان کے اعمال کو پیش کر دیں گے۔ اس پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے تم کو ان سے کیا علاقہ وہ پاکباز لوگ تھے، گزر گئے ان کے اعمال سے ان کو نفع ہو گا اور تم کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ ان کے اعمال کے تم جوابدہ نہ ہو گے۔

فوائد: ثبوتِ تقلید: (۱) اس مقام پر بعض ناسمجھ ایک سوال کیا کرتے ہیں، وہ یہ کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کا وقتِ موت آیا تو اس وقت وہ ملکِ کنعان میں تھے کیونکہ مرنے سے پیشتر ان کو حکم ہوا تھا کہ تو اس ناپاک جگہ سے چل دے اور تیری وفات کا وقت قریب آ گیا ہے تو اپنے باپ دادا کے ملک میں جا اور ان میں جا کر مل جانا چنانچہ وہ تمام اولاد سے رخصت ہو کر ملکِ کنعان میں آئے اور وہیں جاں بحق ہو گئے۔ پس وہاں اولاد کہاں تھی کہ جو ان سے وصیت کرتے وہ تو ملکِ مصر میں تھی، اس کا جواب بہت آسان ہے وہ یہ کہ جب فرشتے نے مصر میں ان سے پیامِ موت دیا تھا جب ہی موت کے حاضر ہونے کا زمانہ سمجھا گیا، سو اس وقت ان کی تمام اولاد موجود تھی ان سے وصیت کی اور ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کے ساتھ بھی آئے ہوں۔

(۲) جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو ان کو مناسب تھا کہ یوں کہتے اللہ کی یا جس نے آسمان و زمین پیدا کیا ہے اس کی، کیوں کہا کہ تیرے خدا اور تیرے بزرگوں ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے خدا کی عبادت کریں گے۔ اس میں یہ نکتہ ہے: یہ کہ وہاں کے لوگ عناصر اور ستاروں کو خالق جانتے اور ان کو الٰہ کہتے تھے اگر یہ بھی الٰہ یا آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا کہتے تو صاف معلوم نہ ہوتا کہ ان کی اس سے کون شخص مراد ہے جب کہا تیرا اور تیرے باپ دادوں کا خدا تو وہ احتمال جاتا رہا۔

(۳) اس سے دینی بزرگوں کی پیروی اور ان کی تقلید کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم بے چون و چرا ان بزرگوں کے طریقہ پر چلیں گے بلاشک از خود ٹکریں مارنے سے کسی کامل اور رسیدہ کا دامن پکڑ لینا اور اس کی تقلید کرنا باعثِ امن ہے۔ اسی طرح جزئیاتِ مسائل میں آئمۂ مجتہدین کی پیروی اور تقلید کرنا اور خود شتر بے مہار ہونے سے بہتر ہے۔ تقلیدِ مشرکین و جاہلین پر (کہ جس کی مذمت قرآن و حدیث میں ہے) اس تقلید کو محمول کرنا سخت بے انصافی ہے۔

(۴) حضرت اسماعیل علیہ السلام گو حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ نہ تھے مگر چونکہ حقیقی چچا تھے اور اس کو عرف میں باپ کہتے ہیں، اس لیے آباء میں ان کا بھی ذکر کیا یا یوں کہو کہ آباء کے معنی حقیقی مراد نہیں بلکہ بزرگ سو اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام بدرجۂ اولیٰ ہیں۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى

اِبْرٰهِمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور وہ کہتے ہیں یہودی یا نصاریٰ ہو جاؤ تب راہ پاؤ گے کہہ دو نہیں بلکہ ہم ملتِ ابراہیم کے پابند ہیں جو خالص اللہ کے ہو رہے تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ کہہ دو ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف نازل کیا گیا (قرآن) اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل ہوا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو کچھ دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے ہم ان میں سے کسی میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

ترکیب: قالوا فعل ضمیر ھم راجع یہود و نصاریٰ کی طرف فاعل کونوا فعل انتم فاعل ھودا او نصاریٰ خبر جملہ مفعول قالوا ای قال الیہود کونوا ہوداً و قالت النصاریٰ کونوا نصاریٰ تھتدوا جواب امر ملت منصوب ہے۔ تقدیر نتبع حنیفا حال ہے ابراہیم سے اور ممکن ہے کہ فاعل نتبع سے ہو وما کان من المشرکین جملہ مستانفہ قولوا فعل با فاعل آمنا باللہ الخ جملہ مفعول وما انزل معطوف ہے اللہ پر وقس علیہ احد چونکہ حیز نفی میں ہے اس لیے جمع کے معنی دیتا ہے اس لیے لفظ بین کی اضافت احد کی طرف درست ہوئی اور بعض کہتے ہیں احد بمعنی فریق ہے اور بین ہمیشہ غیر واحد کی طرف مضاف ہوتا ہے۔

تفسیر: پہلے انبیاء کا طریقِ ہدایت چھوڑ کر یہود و نصاریٰ نے نیا مذہب بنا رکھا تھا اس پر ان کو بڑا ناز تھا اسی کو نجات کا رستہ جان کر یہودی کہتے تھے قدیم مذہب ہمارا ہے بے اس کے ہدایت ممکن نہیں، اسی طرح عیسائی کہتے تھے نجات ہمارے مذہب بغیر ممکن نہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے جواب میں تعلیم فرماتا ہے کہ ان بزرگوں میں سب کے پیشرو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، کہہ دو بلکہ ہم خالص ملتِ ابراہیم پر ہیں اور وہ مشرک نہ تھے تمہارے مذاہب میں شرک کی آلائش ہے اور اس بزرگ کا طریقہ اسلام کا تھا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ان کا شیوہ تھا۔ اس سے قطع نظر صحیح اور ٹھیک راستہ ہدایت کا یہ ہے کہ انسان خدا پر بلاتفریقِ سب انبیاء پر ایمان لاوے۔ یہی اسلام ہے جس میں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی کوئی بھی تفریق نہیں۔ برخلاف ملتِ یہود و نصاریٰ و دیگر مذاہب کے وہ اور انبیاء کو نہیں مانتے پھر بتاؤ کہ قدیم اور حق مذہب اسلام ہے یا کہ تمہارے مذاہب جن پر نجات و ہدایت کا تم انحصار کرتے ہو اور لوگوں کو ان پر چلنے کا حکم دیتے ہو۔

متعلقات: حنیفاً حنیف بمعنی مستقیم اس لیے جس طرح تفاولاً اندھے کو بصیر اور سانپ بچھو کے ڈسے کو سلیم کہتے ہیں اسی طرح لنگڑے کو حنیف کہتے ہیں لہٰذا جو خدا کی فرمانبرداری میں مستقیم ہو ادھر ادھر نہ بھٹکے وہ حنیف ہے۔ بعض کہتے ہیں حنیف لغت میں میلان کرنے والے کو کہتے ہیں اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جمیع ادیان سے خدا کی طرف میلان کیا تھا اس لیے ان کا لقب حنیف ہوا اور اسی لیے ہر موحد کا یہ لقب ہے (تفسیر کبیر)

(الاسباط) سبط کی جمع ہے لغت میں سبط شاخدار درخت کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کا اطلاق خاندان اور قبیلہ پر ہوا (سبط پوتے اور اس کی اولاد کو کہتے ہیں اور چونکہ امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما قبیلۂ سادات حسنی و حسینی کا سرمنشاء ہیں اس لیے ان کو سبطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ کبیر) پس جس طرح عرب میں لفظ قبیلہ کا استعمال تھا اسی طرح بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو اسباط کہتے تھے۔ سبط فلاں سبط فلاں۔ اس جگہ مراد وہ انبیا ہیں کہ جو ان بارہ قبیلوں میں گزرے ہیں جیسا کہ عزیر اور شعیاہ اور یرمیا اور سموئیل علیہم السلام۔

واضح ہو: کہ ہر دین میں تین باتیں ہوتی ہیں اول اصولِ عقائد جیسا کہ خدا تعالیٰ کو وحدہ لاشریک جاننا اور اس کی تمام صفاتِ کمالیہ پر ایمان لانا اس کے انبیاء کو برحق سمجھنا قیامت کا اعتقاد کرنا وغیرہ۔

دوم قواعدِ کلیہ شریعت کہ جن کی طرف جزئیاتِ احکام اور فروع مسائل رجوع کرتے ہیں اور ہر حکم میں ان کلیات کا ضرور لحاظ ہوتا ہے گویا کہ وہ کلیات مقصودِ اصلی ہوتے ہیں اور یہ فرعیات اس کے محافظ۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ ایک حکمِ اصلی ہے کیونکہ یہ بدنی اور مالی عبادت ہے مگر نماز کی یہ صورت کہ پہلے اس سے وضو کرے اور اتنی رکعت پڑھے اور ان میں یہ اذکار ہوں۔ یہ سب باتیں اس حکمِ اصلی کی محافظ ہیں اس پر اور سب باتوں کو قیاس کر لیجئے۔ اگرچہ شارع کا حکم دونوں کے بجالانے کا برابر ہے مگر اصل شریعت انہیں قواعدِ اصلیہ کا نام ہے اور ان کے محافظات کے تغیر کا بھی نبی کے سوا اور کسی کو اختیار نہیں۔

سوم یہ احکامِ جزئیہ کہ جن کو محافظِ شریعت کہتے ہیں۔ اول قسم میں تمام انبیاء علیہم السلام اور کل خدا کے برگزیدہ متفق ہیں بلکہ جس قدر مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں اگرچہ ان کے بانی انبیاء تھے۔ لوگوں کی افراط و تفریط سے اس دین کی شکل بالکل بگڑ گئی ہے اس میں اگر اس افراط و تفریط کے تودے کو کھود کر دیکھو گے تو بلاشک اس کے نیچے سے بھی وہ جواہرات دبے ہوئے ملیں گے۔ یہ احکام نہ کبھی منسوخ ہوتے ہیں نہ زمانے کی رفتار سے بدلتے ہیں۔ ان میں ایک پچھلا نبی پہلے انبیاء کا متبع کہا جاوے گا، اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فبھداھم اقتدہ۔ کہ اگلے انبیاء کی ہدایت کا اقتدا کرو اور اسی لیے فرمایا قولوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ الخ تمام برگزیدوں کا ماننا دینِ اسلام میں فرض ہے یہ اس کی صداقت کی دلیل ہے قسم دوم کو ملت کہتے ہیں ان میں بھی تفاوت اور اختلاف بہت کم ہوتا ہے مگر بعض امور کسی قوم اور کسی زمانے کے لائق نہیں ہوتے ان میں تغیر و تبدل ہوتا ہے مثلاً حج کہ شریعتِ موسوی میں فرض نہ تھا، کس لیے کہ یہود کی استعداد میں قصور تھا وہ صرف اہلِ ظاہر تھے اسرارِ باطنیہ سے بے بہرہ بالخصوص محبت و فنا کے رستے سے ناواقف تھے۔ سوا خوف و طمع کے اور کچھ نہ جانتے تھے اس لیے ان کے لیے اسی قسم کے احکام صادر ہوئے۔ پھر جب اہلِ کمال پیدا ہوئے کہ جو ظاہر و باطن میں منور تھے اور ان کے قلوب میں محبت و وجد و شوق کی استعداد تھی تو پھر وہی احکام کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھے، قائم ہوئے۔ منجملہ ان کے حج ہے چونکہ ان امور میں حضرت ابراہیم اور جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نہایت متشابہ ہیں اس لیے حضرت کو حکم ہوا ملة ابراھیم حنیفا کہ ملۃ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو۔ قسم سوم ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتی ان کو ہمیشہ قائم رکھنا حکیمِ مطلق کی شان سے نہایت بعید ہے۔ اس قسم کو شریعت کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جس قدر انبیاءِ بنی اسرائیل تھے شریعتِ موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے مگر جناب خاتم النبین اس امر میں کسی شریعت کے متبع نہ تھے بلکہ آپ کی شریعت اس جلوۂ کمال کے زمانے میں مستقل تھی فاحفظ ھذا التحقیق۔ اس کے بعد بھی جو کوئی بے سمجھ پادری یا کوئی اور مخالفِ اسلام نسخِ شریعت پر اعتراض کرے تو استعدادِ فہم کا قصور ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

پھر اگر وہ بھی اسی طرح سے ایمان لے آئیں جس طرح کہ تم لائے ہو تو انہوں نے بھی یہ ہدایت پائی اور اگر وہ نہ مانیں تو ضد میں پڑے ہوئے ہیں پھر تم کو خدا ان کے شر سے بچانے میں کافی ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے اللہ کے رنگ میں رنگو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے اور (کہو) ہم تو اسی کی عبادت

کرتے ہیں۔

ترکیب: فان شرطیہ آمنوا فعل بافاعل بمثل میں ب زائدہ ہے مثل صفت ہے مصدر محذوف کی ما مصدر یہ ہے تقدیرہ ان آمنوا ایمانا مثل ایمانکم پس یہ جملہ شرط ہے اور یوں بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ مثل زائد ہو جیسا کہ لیس کمثلہ شیء میں ک زائد ہے جس سے مراد قرآن اور نبی ہے اور بہ کی ضمیر اس کی طرف پھرتی ہے تقدیرہ ان امنوا بما آمنتم بہ یعنی جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اگر اس پر یہ لوگ بھی ایمان لائے تو راہ پا لیں گے۔ فَقَدِ اهْتَدَوْا جواب شرط اور اسی طرح وَاِنْ تَوَلَّوْا صِبْغَةَ اللّٰهِ منصوب ہے فعل محذوف کی طرف [redacted] ومن استفہام...... کے لیے مبتدا احسن ممیز صبغۃ تمیز مجموعہ خبر۔

تفسیر: یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کا الزامی اور تحقیقی جواب دے کر خدا تعالیٰ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہدایت اسلام میں ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں بیان ہوا۔ پس اگر یہ لوگ مسلمانوں کی طرح ایمان لائیں گے تو ہدایت پاویں گے ورنہ ضدی ہیں۔ سو اب اے مسلمانو ان کے ضد اور دشمنی سے امرِ حق کے ظاہر کرنے میں کچھ تردد نہ کرو۔ خدا تم کو ان کے شر سے محفوظ رکھے گا وہ دانا بینا ہے (چنانچہ خدا نے اپنے وعدہ کو پورا کیا مسلمانوں اور حضرت ﷺ کو ان کے شر سے محفوظ رکھا یہ پیشین گوئی صادق ہوئی) عیسائیوں میں قدیم دستور ہے کہ جب کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے ہیں یا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو حوض میں غوطہ دیتے ہیں۔ بعض عیسائی جیسا کہ کلیسائے عرب اس پانی میں کچھ زردی وغیرہ رنگ کا بھی استعمال کرتے ہیں اور بجائے غوطہ کے صرف رنگین کرنے ہی پر بس کرتے تھے اس کو اصطباغ یعنی بپتسمہ کہتے ہیں۔

اس ظاہری رنگ پر ان کو بڑا اعتماد تھا اور اس کو نجات کی کنجی سمجھتے تھے۔ اس کے حق میں خدا فرماتا ہے کہ اس ظاہری رنگ سے کیا دل رنگین ہوسکتا ہے؟ کوئی کسی حوض میں ہزار غوطے لگائے اور سر سے پاؤں تک رنگ میں رنگا جائے مگر کیا فائدہ؟ رنگ تو خدائی رنگ ہے۔ یعنی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جو انسان کی روح اور دل کو رنگین کر دیتا ہے، خدا کے اس رنگِ باطنی سے کونسا رنگ اچھا ہوسکتا ہے۔ انسان اس رنگ میں رنگین ہو کر ہمیشہ اسی کی عبادت میں مستغرق رہتا ہے۔

فائدہ: یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے کا براہینِ مسلمہ سے ابطال کر کے اس کے برخلاف دعوے کو (کہ نجات اور حقیقی ہدایت دینِ اسلام میں ہے) نہایت پُر اثر اور عمدہ دلائل سے ثابت کر دیا اور یہ بات جتلا دی کہ اسلام کے مقابلہ میں اصطباغ وغیرہ رسومِ ظاہر یہ کچھ فائدہ مند نہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا

[1] ایک ناواقف پادری نے غلط فہمی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے مراد اللہ ہے جس سے لازم آیا کہ اللہ کے مثل پر ایمان لانا چاہیے حالانکہ اس کا کوئی مثل نہیں یہ پادری اگر کچھ بھی صرف ونحو پڑھ لیتا تو کبھی اس قسم کا بے جا اعتراض نہ کرتا۔

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

اے نبی ان سے کہو اللہ کے معاملہ میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو اس کے مخلص بھی ہیں کیا اب یہ کہو گے کہ ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور اسباط یہودی یا نصرانی تھے۔ ان سے پوچھو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ اور سے زیادہ ظالم کون ہے کہ جس کے پاس خدا کی طرف سے شہادت بھی ہو اور وہ اس کو چھپائے اور اللہ تمہارے کام سے بے خبر نہیں یہ ایک امت تھی جو گزر گئی وہ جو کچھ کر گئے ان کے لیے اور جو کچھ تم نے کیا تمہارے لیے اور تم سے ان کے اعمال کی پرسش نہ ہوگی۔

ترکیب: قل فعل بافاعل الہمزۃ استفہام انکاری اتحاجوننا الخ جملہ استفہامیہ اس کا مقولہ ام معادلۃ للہمزۃ فی قولہ تعالیٰ اتحاجوننا یعنی ان دونوں باتوں میں سے کون سی کرتے ہو۔ ہم سے خدا میں جھگڑا کرتے ہو کہ وہ خاص ہمارا ہی خدا ہے بغیر یہودی یا نصرانی ہونے کے نجات ممکن نہیں۔ اس پر کوئی دلیل یا برہان بھی رکھتے ہو یا محض تقلید اور افترا سے کام لیتے ہو یا یہ کہو کہ ابراہیم اور اسماعیل و اسحاق و یعقوب۔ و اسباط یہودی و نصرانی تھے ہم ان کے پیرو ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ام اللہ مبتدا والخبر محذوف ای ام اللہ اعلم ام متصلہ ہے۔ ای ایکم اعلم استفہام انکاری ہے۔ شہادۃ موصوف عندہ ثابت کے متعلق ہو کر صفت اول من اللہ کائنۃ کے متعلق ہو کر صفت ثانی ہوئی۔ ای لا احد اظلم ممن فعل کذا۔

تفسیر: یعنی یہود جو کہتے ہیں کہ ہدایت کا مدار یہودیت پر ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مدارِ ہدایت عیسائیت پر ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ جنت میں یہودی ہی جائیں گے، نصرانی کہتے ہیں ہم ہی اس کے مستحق ہیں۔ تو اے نبی ان سے یہ کہو کہ کیا تمہارا ہی خدا ہے کہ جس میں تم ہم سے جھگڑا کرتے ہو اور اس سے اپنی جداگانہ خصوصیت جتلاتے ہو حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا سب کا رب ہے اور ہر شخص اپنے اعمال کی جزا و سزا پاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ تم اس سے ناز و تکبر سے پیش آتے ہو اور ہم سراسر اس سے عجز و نیاز اور دلی اخلاص بھی رکھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ تمہارے خانہ ساز ڈھکوسلوں پر (کہ جن کو نہ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے نہ نقل) نجات اور ہدایت کا انحصار ہو اور اگر وہ اپنے دعویٰ کی دلیل سے عاجز ہو کر یہ کہیں کہ اس لیے یہودیت یا عیسائیت پر مدارِ نجات ہے کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب علیہم السلام و اسباطِ بزرگانِ دین یہودی یا عیسائی تھے تو یہ بھی غلط ہے۔ صدہا ہزارہا سال کی بات وہ جانتے ہیں۔ یا خدا خوب جانتا ہے حالانکہ وہی خوب جانتا ہے بلکہ یہ لوگ خود بھی واقف ہیں کہ ان بزرگوں سے صدہا ہزارہا سال بعد یہ مذہب قرار پائے ہیں۔ بھلا ان بزرگوں کے عہد میں سبت وغیرہ رسوم اور عقیدۂ تجسم و تشکلِ الٰہی کا کہ جو مذہبِ یہود میں ہے کہاں تھا۔ اسی طرح الوہیتِ مسیح اور تثلیث اور کفارہ اور عشاءِ ربانی اور بپتسمہ کو کہ جو مذہبِ عیسوی کے اصول ہیں کون جانتا تھا اور ان بزرگوں میں سے کس کا عقیدہ ایسا تھا۔ پھر اس پر یہ لطف ہے کہ یہ لوگ اس بات کا بھی یقین رکھتے ہیں اور ان کی کتابوں اور روایتوں میں بھی ہے کہ ان بزرگوں نے نجات حاصل کی تھی۔ اور وہ راہِ ہدایت پر تھے۔ پھر کس طرح سے اس شہادت کو چھپا کر کہتے ہیں کہ مدارِ نجات اور انحصارِ ہدایت یہودیت یا نصرانیت میں ہے۔ اس پر اس شہادت کو جو چھپائے اس سے کون زیادہ ظالم ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے تعصب و عناد اور شر و فساد سے بے خبر نہیں ان کو سزا دے گا۔ ان بزرگوں کا نام یہ لوگ عبث لیتے ہیں وہ اچھے لوگ تھے گزر گئے ان کے لیے ان کے اعمال ہیں ان کے لیے ان کے اعمال۔

تمت